ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب
سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

۱۹۴۰ء غلامان اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراط مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الہٰی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم "خلافت راشدہ"۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظام حکومت۔ سرمایہ۔ تاریخ ملت حصہ سوم "خلافت بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافت ہسپانیہ"۔ تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافت عباسیہ اول"

۱۹۴۹ء قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے) (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافت عباسیہ دوم"۔ بصائر۔

۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ"۔ تدوین قرآن۔ اسلام کا نظام مساجد۔
اشاعت اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافت عثمانیہ"۔ جارج برنارڈ شا۔

۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سر نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابت حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیر سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

جلد ۷۲ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۷۴ء شمارہ ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

گذشتہ ماہ نظرات میں ندوۃ المصنفین اور برہان کی صبر آزما اور حوصلہ شکن پریشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ لکھا گیا تھا کہ "اندازہ ہے کہ جنوری سنہ ۱۹۷۴ء سے برہان کی اشاعت ملتوی کرنی پڑے گی" اس جملہ نے برہان کے بعض قدر شناسوں کو بے چین و بے تاب کر دیا اور انھوں نے سخت اصرار کیا ہے کہ برہان کی اشاعت ہرگز ملتوی نہ کی جائے ساتھ ہی انھوں نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد ہی کوئی باقاعدہ اور منظم پروگرام بنا کر برہان کو مصائب و آلام کے منجدھار سے نکالنے کی کوشش کریں گے۔

اب اس حقیقت کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ان چند قدر شناسوں کے وعدہ اور یقین دہانی کے باوجود میری ذاتی رائے قطعی طور پر یہی تھی کہ برہان کی اشاعت نہ صرف یہ کہ ملتوی کی جائے، بلکہ اسے بالکل بند کر دیا جائے، کیونکہ حالات اس درجہ سخت اور بہت گسل ہیں کہ یہ قلب ناتواں ان کا حریف نہیں بن سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ سخت ہوش ربا گرانی اور اشیائے ضروری کی نایابی کے باوجود یہاں کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے اور کون سے کام بند ہو گئے ہیں، لیکن برہان کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس کا معیار گرا کر اسے مذاقِ عوام کا مجلہ نہیں بنایا جا سکتا اور اصحابِ برہان اپنی وضع خود داری کو خیر آباد کہہ کر حصول زر کے تیسرے درجہ کے پامال ذرائع کو اختیار نہیں کر سکتے، جس کی صداقت پر برہان کی سی و شش سالہ تاریخ گواہ ہے، ندوۃ المصنفین

کی کتابوں اور برہان کے قدر دانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ پاکستان میں ہے، ان سے ربط وضبط کا سلسلہ منقطع ہوجانے کے بعد ندوۃ المصنفین اور برہان دونوں کا دم گھٹ کر رہ گیا تھا، لیکن جس طرح بھی ہوا طلوعِ سحر کی امید پر شبِ تاریک کی صعوبتیں برداشت ہوتی رہیں اور

جس طرح بن پڑا ترے غم سے کیا نباہ
آنسو نہ جب رہے تو ہنسی اختیار کی

لیکن بھارت کے مسلمانوں کی بلند پایہ علمی اور دینی کاموں کی طرف سے افسوسناک بے توجہی بلکہ بے حسی ہی کچھ کم ابتلا نہیں تھی کہ اب کاغذ کی ہوش ربا گرانی نے رہی سہی طاقتِ صبر و برداشت ختم کردی۔ ان حالات میں اگرچند دوستوں نے کوئی جد وجہد بھی کی تو اس کا حاصل کس طرح برہان اور ندوۃ المصنفین کی مستقل بقا کا ضامن ہوسکتا ہے:

زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟

پس یہ خیال تھا جس کے باعث میں "برہان" کو جاری رکھنے کا حامی نہیں تھا۔ لیکن برادر محترم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کا مزاج اور ان کی طبیعت اس معاملہ میں مجھ سے مختلف ہے، ان کا اصول زندگی یہ ہے کہ "پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ" ۴۷ء کے عظیم حادثہ کے بعد بھی میری اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قطعی رائے وہی تھی جو آب ہے، لیکن یہ تنہا ان کا حوصلہ، عزم اور ولولہ تھا جس نے ادارہ اور برہان کے تنِ مردہ میں پھر از سرِنو جان پیدا کرنے میں مسیحائی کا کام کیا اور یہ دونوں اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے، ان کا یہی عزم اور حوصلہ اس وقت پھر بر روئے کار آیا اور وہ برہان کے عدم اجرا پر راضی نہیں ہوئے، اس لئے برہان آپ کی خدمت میں حاضر ہورہا ہے لیکن حالات اس درجہ غیر یقینی ہیں کہ کل کے لئے کوئی پیشں گوئی نہیں کی جاسکتی۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی جس کا تذکرہ گذشتہ برہان میں آچکا ہے۔ ابھی چند روز

ہوئے اس سوسائٹی کے صدر جناب ڈاکٹر پی کے عبدالغفور صاحب نے اپنے گرامی نامہ میں اطلاع دی ہے کہ انھوں نے برہان کے اڈیٹر کو سوسائٹی کی سنٹرل اکزکٹو کا ممبر منتخب کرلیا ہے، راقم الحروف نے شکریہ کے ساتھ اس پیش کش کو اس امید پر قبول کرلیا ہے کہ جیساکہ گذشتہ نظرات میں عرض کیا گیا تھا۔ یہ سوسائٹی نہایت فعال، متحرک اور پرجوش ہے، اس بنا پر اب تک وہ جو کام جنوبی ہند میں کرتی رہی ہے اب وہ شمالی ہند میں بھی کرے گی اور راقم کو اس سے وابستہ ہوکر مسلمانوں کے لئے تعلیمی منصوبہ کو پورا کرنے کا موقع ملے گا۔ وبہ التوفیق

عرب اور ان کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک کی سیاسی آزادی کا ایک نہایت مبارک اور حوصلہ افزا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ ان ممالک کو اسلام کے قدیم ورثہ، علمی و ادبی کی طرف توجہ ہوئی ہے چنانچہ تقریباً ہر ملک میں "احیاء التراث الاسلامی" کے نام سے نہایت عظیم الشان ادارے قائم ہیں، بڑے بڑے علمائے محققین ان سے وابستہ ہیں اور وہ قدیم کتابوں کو اڈٹ کرکے بڑے اہتمام سے طبع کر رہے ہیں چنانچہ گذشتہ چند مہینوں میں رباط (مراکو) بیروت، کویت، سعودی عربیہ، دمشق اور ایران سے ہم کو جو کتابیں موصول ہوئی ہیں وہ معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے اس درجہ اعلیٰ اور بلند ہیں کہ دیکھتے ہی دل و دماغ دونوں روشن ہوگئے، یہ کتابیں تاریخ، ادب، لغت اور حدیث وفقہ پر ہیں اور ان کی تحقیق، تہذیب و ترتیب اور تعلیق و تحشیہ کا معیار اتنا اونچا ہے کہ .... مغربی معیار تحقیق سے بھی سبقت لے گیا ہے، اس علمی بیداری کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ مستشرقین سے مرعوبیت ختم ہوگئی ہے اور خود مستشرقین بھی لب و لہجہ کے اعتبار سے زیادہ محتاط ہوگئے ہیں۔

قدیم مخطوطات کی طبع و اشاعت کے علاوہ علوم جدیدہ پر تالیف و تصنیف اور قدیم اسلامی علوم و فنون کی تحقیق و تنقید پر ان ملکوں میں جو کام ہو رہا ہے اور اس سلسلہ میں وہاں جو

مجلاتِ علمی شائع ہو رہے ہیں وہ بھی اس درجہ بلند معیار کے ہیں کہ انھیں دیکھ کر بے ساختہ احسنت اور مرحبا کے الفاظ زبان سے نکلتے ہیں، غرض کہ یہ زمانہ اسلامی ممالک میں علم و فن کے شباب کا زمانہ ہے، اور یہ اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے لئے ایک بڑی مبارک فال ہے۔

عہد نبوی کا تاریخی جائزہ

(۶)

از جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی

بدر کی فتح اور قینقاع کے اخراج سے رسول اللہ کی دھاگ میں نمایاں اضافہ ہوگیا۔ نبوت کے ساتھ وہ فاتح بھی ہو گئے، بدر و قینقاع .... کی غلیمت کے خمس اور قریشی قیدیوں کی زرِ خلصی سے ان کی مالی پریشانیاں کافی حد تک کم ہوگئیں، ہتیار، گھوڑے، اونٹ اور زر و سیم حاصل کرکے اپنے مخالفوں کو سرنگوں کرنے کے لئے ان کے ہاتھ نسبتہً مضبوط ہو گئے۔ حجاز کے سب سے طاقتور قبیلے قریش کی بدر میں شکست سے رسول اللہ کی دھاگ اتنی بڑھ گئی کہ اوس و خزرج کے دل میں اُن کی نبوت کا نقش گہرا ہوگیا، جن انصاریوں نے بدر میں شرکت کرکے مال غلیمت کے حصے پائے تھے، ان کی وفاداری رسول اللہ کے ساتھ گاڑھی ہوگئی اور ان کی خوشنودی حاصل کرکے ان کا مقرب بننے کا جذبہ ان کے دلوں میں زیادہ راسخ ہوگیا، نمائشی مسلمان اکابر کی نظر میں رسول اللہ کی بات میں پہلے سے زیادہ وزن پیدا ہوگیا، وہ طبقہ جو رسول اللہ کو نبی ماننے سے منحرف تھا زم پڑ گیا اور ان کی نبوت تسلیم کرنے کے لئے خود کو آمادہ کرنے لگا۔ بدر کے بعد مدینہ میں قتل کی پے در پے تین وارداتیں رسول اللہ کی بڑھی ہوئی دھاگ ہی کی مرہون تھیں، دو مقتول اوسی تھے، ان میں سے ایک عورت تھی عصماء نامی، اس کا تعلق اوس کے غیر مسلم خاندان امیہ بن زید سے تھا[1]، دوسرے

---

[1] ابن سعد ۲/۲۷

اوس کا نام ابو عفک تھا، تیسرا مقتول یہودی قبیلۂ نضیر کا مالدار کعب بن اشرف تھا، یہ تینوں شعر گو تھے، عصماء اور ابو عفک اشعار میں ایک اجنبی کو نبی اور لیڈر ماننے اور اس کی بے چون وچرا اطاعت پر اوس وخزرج کو غیرت دلایا کرتے تھے، کعب بن اشرف بدر کے بعد مکہ گیا، بدر کے مقتول قریشی اکابر کا مرثیہ کہا، ان کے اقارب کی تعزیت کی اور ان کا انتقام لینے کے لئے قریش کو بھڑکایا۔ ایک انصاری عرب رات کی تاریکی میں مسلح ہو کر عصماء کے گھر جا پہنچا جب وہ سوئی ہوئی تھی اور اس کا بچہ اس کے سینے سے چمٹا دودھ پی رہا تھا، اس نے عصماء کے سینے میں تلوار پیوست کر کے پیٹھ سے نکال دی، دوسرے انصاری نے رات میں سوتے ہوئے ابو عَفک کو اسی ڈھنگ سے ہلاک کر دیا، پہلے دو مقتولوں کی طرح کعب کو ٹھکانے لگانے کی تحریک بھی رسول اللہؐ کی طرف سے ہوئی[1]۔ قبیلۂ اوس کے تین جوشیلے جوان — ابونائلہ سلکان، محمد بن مسلمہ اور عباد بن بشر جو رسول اللہؐ کا تقرب حاصل کرنے کے آرزومند تھے کعب کو قتل کرنے کے لئے تیار ہو گئے، انھوں نے کہا:

رسول اللہؐ، قتل کے منصوبے میں کامیاب ہونے کے لئے جھوٹ بولنا ہوگا۔ رسول اللہؐ: جو چاہے کہدینا، تمھیں اس کی اجازت ہے۔ قولوا ما بدا لکم فانتم فی حل من ذلک[2]۔ ابونائلہ اور محمد، کعب بن اشرف کے رضاعی بھائی تھے، تینوں نے ایک عورت کا دودھ پیا تھا، کعب کی طرح ابونائلہ بھی شعر کہتا تھا اور دونوں کے تعلقات دوستانہ تھے۔ کعب بن اشرف بنو نضیر کی بستی میں جو مدینہ کے باہر تھی، ایک گڑھی میں رہتا تھا، ابونائلہ کعب کے گھر جا کر اس سے ملے اور بولے:

محمدؐ کے آنے سے ہم پر بڑی مصیبت آپڑی ہے، سارے عرب ہمارے دشمن ہو گئے ہیں اور مدینہ آنے جانے والے راستوں پر رہزنی کرنے لگے ہیں، ہم تجارت کے لئے شہر سے باہر نہیں جا سکتے، ہماری مالی حالت خراب ہو گئی ہے، کھانے تک کے لئے کچھ نہیں، بال بچے بھوکے مر رہے

---

[1] ابن ہشام ص۹۹۵، ۹۹۶، ۵۵۰، مغازی ص۱۸۶، ابن سعد ۲/۳۲

[2] ابن ہشام ص۵۵۱، طبری ۲/۴، مغازی ص۱۸۷

ہیں، ہم محمدؐ سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں، میرے ہم خیال اور لوگ بھی ہیں، وہ اور میں تم سے غلہ اور کھجور خریدنا چاہتے ہیں، ہمارے پاس پیسہ تو ہے نہیں زرہیں ہیں، وہ گروی رکھدیں گے۔[1] کعب اس کے لئے تیار ہوگیا۔ لین دین کے لئے دن اور وقت مقرر کرکے ابونائلہ گھر چلے گئے۔ حسب قرارداد ایک رات کو ابونائلہ، محمد بن مسلمہ اور عباد بن بشر زرہیں پہن کر اور تلواریں چھپاکر کعب کے گھر آئے، ابونائلہ نے کعب کو آواز دی، کعب اپنی بیوی کے پاس تھا، اس کی حال میں شادی ہوئی تھی، ابونائلہ کی آواز سن کر وہ جلد جلد بستر سے اٹھا اور جانے لگا، بیوی نے اس کی چادر پکڑلی اور کہا: مسلمانوں کی یہودیوں سے لڑائی ہے، ان کے پاس رات میں تن تنہا نہیں جانے دوں گی۔ کعب نے چادر جھٹکی اور یہ کہکر آگے بڑھ گیا: ابونائلہ میرا بھائی ہے، اس سے مجھے کوئی اندیشہ نہیں۔ کعب نے تینوں کی آؤ بھگت کی اور بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد نوواردوں نے کعب سے کہا چلو ٹہل کر چاندنی رات کا لطف اٹھائیں، کعب ان کے ساتھ ہوگیا، بستی سے کافی دور نکل کر تلواریں سونت کر تینوں کعب پر ٹوٹ پڑے، گھبراہٹ میں تلواریں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں، کعب کے کوئی ضرب نہیں لگی، وہ اپنے بچاؤ کے لئے ابونائلہ سے چمٹ گیا، ابونائلہ کے ساتھیوں کے لئے تلوار چلانے کی آزادی باقی نہیں رہی، محمد بن مسلمہ کے پاس ایک خنجر بھی تھا، انھوں نے اسے کعب کی ناف میں اتار دیا، اس کی آنتیں کٹ گئیں اور وہ چیختا ہوا زمین پر گر پڑا، حملہ آور اس کا سر اُتار کر رسول اللہؐ کے پاس لے گئے، وہ محظوظ ہوئے۔ نماز فجر کے بعد کعب کے سر کا مظاہرہ کرایا گیا۔ رسول اللہؐ نے نمازیوں سے کہا: جو بڑا یہودی تمھارے ہاتھ آجائے اسے قتل کردو۔ من ظفرتم من رجال یہود فاقتلوہ[2]۔

جنگِ اُحد

بدر کے بعد رسول اللہؐ کی اکابر قریش سے دوسری بڑی لڑائی بارہ تیرہ ماہ بعد اُحد میں

---

[1] مغازی ص۱۸۷ [2] ابن سعد ۲/۳۳، مغازی ص۱۹۱

ہوئی، اس اثنار میں ایک ایک دو دو ماہ کے وقفہ سے ان کے فوجی اقدامات ہوتے رہے جن میں سے بنو قینقاع کے محاصرہ اور اخراج کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ رسول اللہؐ نے تین مہیں مدینہ کے شمال مغرب اور شمال کے دو طاقتور قبیلوں سُلیم اور غطفان کے خلاف بھیجیں جن کے اکابر نے رسول اللہؐ کی نبوت و قیادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جو مدینہ کے خلاف معاندانہ حرکتیں کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے، ان میں سے ایک مہم میں رسول اللہؐ کے دو سو سواروں کو فی کس سات سات اونٹ غنیمت میں میں ملے۔ ایک مہم انھوں نے قریش کی اس فوج کا تعاقب کرنے بھیجی جو ان کے فوجی منصوبوں اور تیاریوں کا حال دریافت کرنے مدینہ کے آس پاس آپہنچی تھی، ایک اور مہم کا مقصد قریش کا تجارتی قافلہ پکڑنا تھا جو نجد کے راستے سے بڑی مقدار میں سامانِ تجارت اور خام چاندی لے کر عراق کی طرف جا رہا تھا، یہ مہم کامیاب ہوئی اور قریشی قافلہ کی ساری دولت رسول اللہ کے سَو سواروں نے چھین لی، ہر سوار کے حصہ میں ڈھائی ہزار روپے آئے اور رسول اللہؐ کو خُمس کی مد میں دس ہزار روپے ملے[۱]۔

بدر کے قریشی اکابر برابر رسول اللہؐ کے حالات کی ٹوہ لیتے رہے، انھوں نے دیکھا کہ رسول اللہؐ کی فوجی طاقت اور مدینہ نیز مدینہ کے باہر اُن کی جارحانہ سرگرمی بڑھتی جا رہی ہے، رسول اللہؐ کے سپاہی شام جانے والی شاہراہ پر ہر وقت منڈلاتے رہتے ہیں اور شاہراہ پر آباد قبیلوں کے رئیسوں سے انھیں مال غنیمت میں حصے دار بنا کر قریشی قافلوں پر چھاپے مارنے کے لئے معاہدے کر لئے ہیں جن کے نتیجہ میں ان کی شامی تجارت جو ان کی آمدنی کا سرچشمہ تھی، بالکل بند ہو گئی ہے۔ اپنے رزق کی یہ شہ رگ کٹ جانے کے بعد قریشی اکابر نے بدر کے نویں ماہ ایک تجارتی قافلہ نجد کے راستہ سے بھیجا، اس میں سامان کے علاوہ بڑی مقدار میں خام چاندی بھی تھی، رسول اللہؐ کو اس کی خبر ہو گئی، انھوں نے بلا تاخیر سَو آدمیوں کا ایک دستہ قافلہ لوٹنے کے لئے روانہ کیا، دستہ نے نجد کے مقام قَردَہ میں قافلہ جا پکڑا، قافلہ کے

---

[۱] ابن سعد ۲/۲۳، مغازی ص۱۹۷

محافظ اور دہ قریشی تاجر جن کا اس میں مال تھا، بھاگ گئے۔ قافلہ کی دولت کے پانچ حصوں میں سے چار فوجی دستے کے سو آدمیوں میں ڈھائی ہزار روپے فی کس کے حساب سے تقسیم ہو گئے۔ پانچواں حصہ دس ہزار روپے کی مالیت کا بطور خمس رسول اللہؐ کو دے دیا گیا۔ یوں تو قریشی اکابر نے جنگ بدر کے بعد ہی سے اپنے دو درجن اکابر کی موت کا بدلہ لینے، مکہ کے آس پاس اور حجاز کے قبیلوں میں اپنی ساکھ قائم کرنے اور اپنی تجارت کی بقا کے لئے رسول اللہؐ کا استیصال کرنے کے قصد سے ایک دوسری جنگ کی تیاری شروع کر دی تھی لیکن قردہ میں ان کے قافلہ پر رسول اللہؐ کی حالیہ ترکتاز نے ان کی جنگی تیاریوں کی رفتار تیز کر دی، پڑوسی قبیلوں کا تعاون حاصل کر کے قردہ کے دو تین ماہ بعد انھوں نے دو سو گھوڑے تین ہزار اونٹ اور اتنی ہی فوج لیکر مدینہ پر چڑھائی کر دی، اس بڑی فوج اور اس کے ساز و سامان کا رسول اللہؐ کو علم ہوا تو انھوں نے مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا کہ کس طرح ان کا مقابلہ کیا جائے، مہاجرین، بیشتر انصار اور سنائشی مسلمانوں کی رائے تھی کہ چونکہ ان کے پاس گھوڑے نہیں ہیں جنھیں سست رفتار اونٹ کے مقابلے میں اپنی پھرتی اور تیز گامی کے باعث میدان جنگ میں فیصلہ کن اہمیت حاصل تھی اور ہتھیار بھی کم ہیں اس لئے ضروری ہے کہ کھلے میدان میں لڑنے کی بجائے اپنے شہر میں دشمن سے نبرد آزما ہوں، عورتوں اور بچوں کو گڑھیوں میں بھیج دیں، مکانوں کی چھتوں پر پتھر جمع کر لیں، گلیوں اور سڑکوں پر مورچے بنالیں، ڈھب کی جگہوں پر تیر انداز کھڑے کر دیں۔ اس موقع پر عبداللہ بن اُبیّ بن سلول نے کہا کہ میرا اور میرے آبا و اجداد کا تجربہ ہے کہ جب بھی دشمن سے شہر کے باہر جنگ کی گئی ہے مدینہ والے ہارے ہیں اور جب شہر کے اندر مقابلہ کیا گیا ہے تو ہمیشہ جیتے ہیں[1]۔ رسول اللہؐ نے یہ رائے پسند کی لیکن اوس و خزرج کے نوجوان، جوشیلے اور ابھرنے کے آرزومند تیسرے درجہ کے لیڈروں کا مطالبہ تھا کہ مدینہ کے باہر جا کر جنگ کی جائے ان کی رائے تھی کہ شہر میں لڑنے سے ان کی کمزوری ظاہر ہو گی، دشمن سمجھے گا کہ اس سے ڈر کر انھیں باہر نکلنے کی جرأت نہیں ہوئی اور اس طرح پڑوس

---

[1] مغازی صـ۲۱۰

کے عرب قبیلوں میں ان کی ساکھ خراب ہوجائے گی، انھوں نے رسول اللہؐ کو اطمینان دلایا کہ ہمارے دلوں میں آپ کی وفاداری کا جذبہ اتنا مضبوط ہے اور ہمارے حوصلے اتنے بلند ہیں کہ دشمن کے رسالے اور بہتر ہتیار ہمیں زیر نہیں کرسکتے۔ مہاجرین وانصار کے پختہ کار اور نمائشی مسلمان اکابر کی سنجیدگی سے دی ہوئی پُراحتیاط رائے کے مقابلے میں اوس وخزرج کے جوان لیڈروں نے ایسا جوش وخروش دکھایا کہ رسول اللہ بہت متاثر ہوئے، ان کی رائے بدل گئی اور انھوں نے مدینہ سے باہر لڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ مہاجرین وانصار اور نمائشی مسلمانوں نے یہ دیکھ کر کہ رسول اللہ نے ان کی سوچی سمجھی رائے پرعمل نہیں کیا، باہر جاکر لڑنے سے جی چرانے لگے۔ مغازی واقدی: وکرہ المخرج کثیر من اصحاب النبیؐ۔ رسول اللہؐ کے بہت سے ساتھیوں کو مدینہ سے باہر جاکر لڑنا ناپسند تھا۔ اندریں حالات رسول اللہؐ کی فوج کی تعداد سات سو آدمیوں سے زیادہ نہ ہوسکی، ان میں دو سو سے اوپر وہ انصاری جوان بھی شامل تھے جو جنگ بدر میں شریک ہوچکے تھے۔

قریش نے اپنی فوج مدینہ کے شمال میں اُحد پہاڑی کے قریب ایک ایسی جگہ اتاری جہاں انصار کے کھیتوں کی شکل میں ان کے دو سو گھوڑوں اور تین ہزار اونٹوں کے لئے چارہ مہیا تھا۔ رسول اللہؐ اپنے سات سو سپاہیوں کے ساتھ مدینہ کے باہر پہنچے تو نمائشی مسلمانوں کے لیڈر عبداللہ بن اُبی بن سَلول تین سو متبعین کے مسلح دستے لیکر آگیا اور رسول اللہؐ کی فوج کے ساتھ اس جگہ تک گیا جہاں اُحد پہاڑی کی اوٹ میں انھوں نے دشمن سے لڑنے کے لئے اپنا کیمپ بنایا۔ جب صبح ہوئی اور دونوں طرف سے صفیں مرتب ہونے لگیں تو عبداللہ نے قریش کے رسالے، ہتیار، سات سو زرہ پوش اور تین ہزار سپاہی دیکھکر محسوس کیا کہ مسلمانوں کے لئے جیتنا مشکل ہے، وہ اپنے تین سو آدمیوں کو یہ کہتا ہوا واپس لے گیا کہ محمدؐ نے میری بات نہیں مانی اور خام کار جوانوں کے کہنے میں آکر ایک ایسے دشمن سے لڑنے شہر سے باہر آگئے جس سے عہدہ برآ ہونا اُن کے بس سے باہر ہے[۲]۔

---

[۱] ص۲۱۲ مغازی

[۲] انساب الاشراف ۱/۳۱۵، مغازی ص۲۱۸، ابن سعد ۲/۳۹

مسلمانوں کی پشت اُحد پہاڑی کی طرف اور منہ مدینہ کی جانب تھا، احد سے متصل بائیں طرف عینین نامی ایک دوسری پہاڑی تھی، اس پر رسول اللہؐ نے پچاس تیر انداز بٹھا دئے اور انھیں تاکید کردی کہ پہاڑی پر ڈٹے رہیں اور کسی حال میں چھوڑ کر نہ جائیں، دشمن کے رسالوں پر تیراندازی کرتے رہیں تاکہ اس کے گھوڑے بدکیں اور مسلمانوں کے کیمپ کی طرف نہ جاسکیں، انھیں حکم تھا کہ اگر دشمن کا دباؤ بڑھے یا رسول اللہؐ اور مسلمان قتل کئے جا رہے ہوں تب بھی وہ مدد کے ارادہ سے اپنی جگہ نہ چھوڑیں[1]۔ قریش کی فوج میں ابو عامر راہب اوسی بھی اپنے پچاس ہم قوموں کے ساتھ موجود تھا، وہ ہجرت کے بعد رسول اللہؐ سے مذہبی سوالات اور مباحثہ کیا کرتا تھا، ان کے جوابات اسے مطمئن نہیں کرتے تھے، وہ ان کی بے چون وچرا اطاعت کے لئے تیار نہیں ہوا اور پچاس اوسی ہمخیالوں کے ساتھ مدینہ چھوڑ کر مکہ چلا گیا۔ جنگ کی ابتدا ابو عامر اور اس کے ساتھیوں نے رسول اللہؐ کی فوج پر پتھراؤ کر کے کی، اس کے بعد شخصی مقابلے ہوئے، پھر فریقین کی صفوں نے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا، مسلمانوں کے دباؤ سے قریشی فوج کی ترتیب بگڑ گئی، ایک بار پھر دونوں طرف کے ممتاز لوگ شخصی مقابلوں کے لئے نکلے، قریش کے سات علمبردار جو ان کے اکابر تھے، ایک ایک کر کے شخصی مقابلوں میں مارے گئے تو قریشی پیادہ فوج پر ہراس طاری ہوگیا اور اس کے پیر اکھڑ گئے، مسلمان پیچھے سے ان پر حملہ کرتے انھیں ان کے کیمپ سے دور کھدیڑتے چلے گئے پھر وہ دشمن کا کیمپ لوٹنے میں مشغول ہو گئے، دشمن کے رسالوں کو عینین کے تیرانداز تیر باری کر کے رسول اللہؐ کے کیمپ کی طرف جانے سے روکے ہوئے تھے، انھوں نے دیکھا کہ دشمن کا کیمپ لٹ رہا ہے تو ان میں سے چالیس سے زیادہ آدمی رسول اللہؐ اور اپنے کمانڈر کے حکم کی خلاف ورزی کر کے لوٹ مار میں شرکت کے لئے دشمن کے کیمپ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے، پہاڑی پر مع کمانڈر آٹھ تیرانداز رہ گئے۔ خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل قریشی میمنے اور میسرے کے قائد تھے، موقع

---

[1] ابن سعد ۲/۴۰

پاکر وہ گھوڑ ا فوج کے ساتھ غنیمین پر چڑھ گئے اور باقی تیراندازوں کو قتل کر دیا. قریشی فوج پسپا ہونے کے بعد واپس آگئی اور رسالوں کے ساتھ مسلمان فوج پر ٹوٹ پڑی جو مال غنیمت سمیٹنے میں مشغول تھی، مسلمانوں کے ہاتھ پیر پھول گئے، وہ سامان چھوڑ کر بدحواس ہر طرف بھاگنے لگے، گھبراہٹ میں دوست دشمن کی تمیز باقی نہیں رہی، مسلمان مسلمان کو قتل کرنے لگے، قرشی رسالوں نے ان کا پیچھا کر کے کئی درجن آدمی مار ڈالے، بہت سے زخمی ہوئے اور بہت سے مدینہ بھاگ گئے اور ایک خاصی بڑی تعداد اُحد کی پہاڑی پر چڑھ گئی، رسول اللہؐ انھیں بآواز بلند پکارتے لیکن وہ دھیان نہ دیتے. بھاگنے والے زیادہ تر انصار کے وہ جوان، جوشیلے اور ابھرنے کے آرزومند لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہؐ کو جذبات کی رو میں اپنی جانبازی اور جانسپاری کا اطمینان دلاکر انھیں شہر سے باہر لڑنے پر مجبور کیا تھا[۱]. مسلمانوں کی بھگدڑ سے فائدہ اٹھاکر ایک قریشی ٹولی نے رسول اللہؐ کو گھیر لیا، . . . . . .

. . . . . . رسول اللہؐ دو زرہیں پہنے تھے اور سر پر اسٹیل کا خود تھا، ان کے پاس دو ڈھائی درجن اور بقول بعض آٹھ یا نو یا چودہ مقرب رہ گئے باقی سب حتیٰ کہ ان کے خسر عمر فاروق اور داماد عثمان غنی تک فرار ہو گئے، رسول اللہؐ اور ان کے ساتھی بہادری سے لڑے، ایک حملہ آور کو رسول اللہؐ نے اس بری طرح زخمی کیا کہ وہ بعد میں مر گیا، ایک حملہ آور چیخ چیخ کر کہنے لگا: محمدؐ مارے گئے، محمدؐ مارے گئے، یہ نعرہ سن کر ان مسلمانوں کے حوصلے بالکل پست ہو گئے جو میدان جنگ میں ڈٹے ہوئے تھے، وہ بھی میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے، ایک دوسرے حملہ آور نے رسول اللہؐ کے سر پر پتھر مارا جس سے ان کا خود ٹوٹ گیا، اُن کے متھے، چہرے اور ناک سے خون جاری ہو گیا، ایک دانت ٹوٹ گیا، خود کے دو حلقے ان کے گلے میں دھنس گئے، ان کے سیدھے کندھے میں سخت چوٹ آئی، گھٹنے چھل گئے اور وہ گڑھے میں گر کر بیہوش ہو گئے، ایک مقرب نے انھیں اٹھاکر محفوظ جگہ پہنچایا.

---

[۱] مغازی صفحہ ۲۱۲

لڑائی میں ستّر سے زیادہ انصاری ہلاک ہوئے، مہاجر صرف چار، قریش کے کل تیئیس ۲۳ آدمی مارے گئے۔ بدر میں مہاجر مقتولوں کی تعداد چھ تھی اور انصار کی آٹھ۔ اُحد کی فتح سے قریش کے تین مقصد میں سے صرف دو پورے ہوئے۔ انھوں نے بدر میں اپنے مقتولین کا انتقام لے لیا، بدر کی شکست سے عربوں کی نظر میں اُن کا گرا ہوا وقار پھر اونچا ہو گیا لیکن وہ رسول اللہؐ کو قتل کرکے اپنے تجارتی قافلوں کی سلامتی بحال نہ کرسکے جو اُن کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اُحد میں رسول اللہؐ کی شکست سے مدینہ کے یہودی، نضیر و قریظہ، اَوس و خزرج کے نمائشی مسلمان اور شہر سے باہر جنگ و قتال کے مخالف خوش ہوئے، یہودیوں نے کہا: محمدؐ نبی نہیں ہوسکتے، وہ حکومت کے طالب ہیں، کبھی کوئی نبی اس طرح زخمی نہیں ہوا جیسے وہ ہوئے، نہ کبھی کسی نبی کے چیلوں کو ایسی شکست ہوئی اور نہ اتنی بڑی تعداد میں ہلاک و زخمی ہوئے جیسے ان کے چیلے ہوئے[۱]۔ مدینہ سے باہر لڑائی لڑنے کے مخالف انصاریوں اور نمائشی مسلمانوں کے اکابر نے رسول اللہؐ کی جنگی پالیسی اور قیادت پر سخت نقد کیا۔ مغازی واقدی۔ رسول اللہؐ اپنے ساتھیوں کی شکست و ہلاکت نیز جسمانی طور پر خود مجروح ہونے کے بعد جب مدینہ واپس ہوئے تو عبداللہ بن اُبَیّ اور منافق ان کی مصیبت سے محظوظ ہوئے اور انھیں خوب برا بھلا کہا۔ ورجع رسول اللہ إلی المدینۃ عند نکبۃ قد أصابت أصحابہ واصیب فی نفسہ فجعل ابن اُبَیّ والمنافقون معہ لیشمتون ویُسّرون بما أصابھم ویُظھرون أقبح القول[۲]۔ نمائشی مسلمانوں کے اکابر نے اس شکست سے فائدہ اٹھاکر اس بات کی بھی کوشش کی کہ اَوس و خزرج کی وفاداری رسول اللہؐ سے مضمحل ہوجائے اور ان کی طرح وہ بھی رسول اللہؐ کی بے چون وچرا اطاعت کرنا چھوڑ دیں انھوں نے انصاری اعیان کو رسول اللہ سے منحرف کرنے کے لئے کہا کہ اگر تمھارے مقتول ہمارے ساتھ رہتے اور اُحد میں لڑنے نہ جاتے تو نہ مارے جاتے نہ گھائل ہوتے۔ اس مقصد میں اکا،

---

[۱] مغازی صہ ۳۰۹

[۲] ؍؍ صہ ۳۰۸

کو کامیابی نہیں ہوئی، رسول اللہؐ نے میدان جنگ سے بھاگنے والوں اور نافرمانی کرنے والوں کے خلاف کوئی تعزیری کارروائی نہیں کی اور وحی کے ذریعہ انھیں معافی دلوادی۔ ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعان انما استزلھم الشیطان ببعض ماکسبوا ولقد عفا اللہ عنھم (آل عمران)۔ تم میں سے جو لوگ جنگ کے دن بھاگ کھڑے ہوئے انھیں ان کی بعض بدعنوانیوں کے باعث شیطان نے سیدھے راستہ سے ہٹادیا تھا، تاہم خدا نے ان کا قصور معاف کر دیا۔ اُحد میں شکست کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ رسول اللہؐ کے پاس گھوڑا فوج کا فقدان تھا، جبکہ قریش کے پاس دو سو گھوڑے تھے، رسول اللہؐ کے پاس صرف دو بتلائے جاتے ہیں۔ اُحد اور آس پاس کا علاقہ پتھریلا تھا، ایسے علاقہ میں گھوڑا فوج کو اپنی پھرتی، تیز رفتاری اور غیر معمولی بل بوتے کے باعث پیادوں اور اونٹ پر غیر معمولی فوقیت حاصل تھی، گھوڑا سوار لمحوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے، دشمن پر جھپٹنے، حسب منشا حملہ کرنے اور اس کے حملہ کو باطل کرنے پر قادر ہوتا تھا جبکہ پیادہ اور اونٹ سوار کو نہ تو پھرتی سے تلوار چلانے کی سہولت حاصل تھی، نہ حسب منشاء حملہ کرنے، منہزم دشمن کو لمحوں میں آکر پکڑنے اور قتل کرنے کی۔ رسول اللہؐ نے دیکھا کہ قریش کے دو سو سواروں نے کس طرح ان کی منہزم فوج کا تعاقب کرکے، پہاڑی کے تیراندازوں پر باز کی طرح جھپٹ کر، ان کے کیمپ کے گارڈ پر عقابی شان سے ٹوٹ کر ان کے سپاہیوں کو بڑی تعداد میں قتل اور زخمی کرکے جنگ کا نقشہ ایسا بدلا کہ ان کی فتح شکست میں تبدیل ہوگئی۔ رسول اللہ کی نظر میں گھوڑا فوج کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور وہ اسے جنگی کامیابی کے لئے فیصلہ کن سمجھنے لگے، انھوں نے گھوڑے حاصل کرنے کی مہم چلادی اور مسلمانوں کو بھی گھوڑے رکھنے کی تاکید کی، وحی کے ذریعہ ان الفاظ میں تاکید کی توثیق ہوگئی۔ مخالفوں سے لڑنے کے لئے زیادہ سے زیادہ طاقت بڑھاؤ اور گھوڑے تیار رکھو۔ واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل (انفال)۔ رسول اللہؐ نے گھوڑے پالنے، چرانے اور ان کی نسل کشی کے لئے مدینہ سے باہر میلوں لمبی چوڑی ایک چراگاہ محفوظ کرلی جس کا نام نقیع[1] تھا۔

---

[1] بلاذری ص۱۵، یاقوت (معجم البلدان، مصر) ۳۱۸/۸ ہجری (معجم ما استعجم، مصر) ص۱۳۲۴، ۱۳۲۵

اُحد کے چند دن بعد میراث سے متعلق پہلا اسلامی قانون وضع ہوا۔ اُحد کا معرکہ ہجرت کے تیسویں ماہ واقع ہوا تھا، اس وقت تک میراث سے متعلق کوئی اسلامی قانون نہیں تھا، مدینہ کے مسلمان میراث کی تقسیم جاہلی دستور کے مطابق کیا کرتے تھے، احد میں رسول اللہؐ کے ایک نقیب سعد بن ربیع خزرجی ہلاک ہوئے، ان کی دو لڑکیاں اور ایک حاملہ بیوی تھی۔ جاہلی دستور کے مطابق سعد بن ربیع کے بھائی نے ان کا سارا مال ومتاع اپنے قبضہ میں لے لیا۔ سعد کی بیوی نے رسول اللہؐ کی دعوت کی اور انھیں بتایا کہ سعد کے بھائی سارا مال ومتاع لے گئے ہیں اور سعد کے بال بچوں کے گذارہ کے لئے گھر میں کچھ باقی نہیں چھوڑا ہے، چند گھنٹے بعد وحی آئی، رسول اللہؐ نے سعد کے بھائی کو بلایا اور ان سے کہا کہ وحی کے ذریعہ میراث سے متعلق قانون بن گیا ہے، اس کی رو سے تمہیں اپنے بھائی کی میراث کا دو تہائی حصہ ان کی لڑکیوں اور آٹھواں حصہ ان کی بیوی کو دینا ہوگا۔ رسول اللہ نے سعد کی بیوی کے پیٹ والے بچہ کو میراث میں داخل نہیں کیا لیکن جب عمر فاروق خلیفہ ہوئے تو انھوں نے پیٹ کے بچہ کو بھی میراث سے حصہ دلوایا[1]۔

سُلیمؓ[2] ایک طاقتور اور جنگجو قبیلہ تھا، اس نے اسلام لانے سے انکار کر دیا تھا، اس کے اکابر رسول اللہؐ سے لڑنے کے لئے ان کے دشمنوں سے سازباز کرتے رہتے تھے، رسول اللہؐ نے دو مہیں بنو سلیم کے خلاف بھیجی تھیں لیکن وہ ان کی سرکوبی کرنے میں کامیاب نہیں ہوئیں، قبیلہ کے لیڈروں کو ہر بار خبر ہوگئی اور وہ رسول اللہ کے دستے آنے سے پہلے پہاڑوں میں جا چھپے۔ رسول اللہ چاہتے تھے کہ یا تو اس قبیلہ کی جارحانہ طاقت کا بزور شمشیر خاتمہ کر دیا جائے یا اس سے کوئی معاہدہ ہو جائے تاکہ وہ ان پر دست درازی کرنے یا ان کے دشمنوں کی مدد کرنے سے باز رہے۔ اُحد کے تین چار ماہ بعد اس قبیلہ کی چار شاخوں عل، ذکوان، عُصَیَّۃ اور بنو لحیان کے کچھ نمائندے

---

[1] مغازی ص۳۲۲، انساب الاشراف ۱/۳۳۸

[2] شمال مغرب مدینہ، خیبر، وادی القریٰ، تیماء، صفۃ جزیرۃ العرب ہمدانی، لائڈن ص۱۳۱

رسول اللہؐ سے ملے اور اپنے دشمنوں کے خلاف ان سے مدد طلب کی، رسول اللہؐ نے یہ سوچکر کہ اگر ان کی مدد کردی گئی تو اس سے ان کی تالیف قلب ہوجائے گی اور وہ احسانمند ہوکر یا تو ان کے حلیف ہوجائیں گے یا ان کے دشمنوں کی مدد سے ہاتھ اٹھالیں گے، ستر انصاریوں کا ایک دستہ ان کے ساتھ کردیا، یہ سارے انصاری نوجوان تھے، غریب اور نادار، اتنے غریب کہ جنگل سے ایندھن کاٹکر اور کنوؤں سے پانی ڈھوکر گذارا کرتے تھے اور جو وقت بچتا اس میں نماز پڑھتے اور قرآن تلاوت کرتے[۱] مذکورہ چاروں شاخوں کے نمائندے انھیں لیکر جب اپنے علاقہ بئر معونہ[۲] پہنچے تو انھوں نے سب کو دھوکہ دیکر قتل کردیا۔ غالباً یہ قتل اس فوجی کارروائی کا انتقام تھا جو رسول اللہؐ نے ہجرت کے تیئیسویں اور ستائیسویں ماہ قبائل سُلیم کے خلاف کی تھی اور جس میں ان کے کئی سو مویشی اور متعدد چرواہے پکڑ لئے تھے۔

عربی روایت کے ایک دوسرے اسکول کی رائے ہے کہ ستر انصاریوں کا ایک دستہ بنو عامر کے ایک لیڈر عامر بن طفیل کے ایما پر سُلیم کی مذکورہ بالا شاخوں نے قتل کیا تھا، بنو عامر کہ جو بنو سلیم کے پڑوسی تھے، اسلام کی دعوت دینے اور رسول اللہؐ کی نبوت کا اقرار کرانے یہ قریب چھ درجن انصاری ایک عامری رئیس ابو براء کی فرمائش پر بھیجے گئے تھے، ان کے پہنچنے سے پہلے ابو براء کسی ضروری کام سے اپنے وطن بئر معونہ سے کہیں باہر چلا گیا تھا اور اپنے بھتیجے عامر بن طفیل نیز دیگر لیڈروں سے کہہ گیا تھا کہ جب رسول اللہؐ کے فرستادہ آدمی آئیں تو ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ عامر بن طفیل کو رسول اللہؐ اور اسلام دونوں سے بغض تھا، جب ستر انصاری بئر معونہ پہنچے تو عامر نے پہلے اپنے قبیلہ کے اکابر کو انھیں قتل کرنے کا اشارہ کیا لیکن ابو براء کی ہدایت

---

[۱] ابن سعد ۲/۵۲، مغازی ص ۳۴۸

[۲] شمال مشرق مدینہ کا ایک نخلستان

[۳] شمال مشرق مدینہ

کے پیشِ نظر جب وہ اس کام کے لئے تیار نہیں ہوئے تو عامر نے سُلیم کی مذکورہ چار شاخوں کے عربوں کو بلایا اور انھوں نے ایک کے سوا سارے انصاریوں کو قتل کر دیا۔ ہماری رائے میں پہلی روایت زیادہ قرینِ قیاس ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی فہائش کے لئے رسول اللہؐ کبھی اتنی بڑی تعداد میں مسلمان نہیں بھیجا کرتے تھے، اس کام کے لئے چار چھ یا دس بارہ آدمی مامور کئے جاتے تھے۔ ان ستّر جوانوں کی موت کی خبر پاکر رسول اللہؐ کو اتنا غصہ آیا کہ وہ پندرہ اور بقول بعض چالیس دن تک قاتل قبیلوں کو نماز فجر کی دوسری رکعت میں بد دعا دیتے رہے۔ رسول اللہؐ کے خادم انس بن مالک کا بیان ہے کہ ان جوانوں کے متعلق قرآن میں کئی آیتیں نازل ہوئیں جو ہم پڑھا کرتے تھے لیکن بعد میں منسوخ کر دی گئیں، ان میں سے صرف ایک آیت کے متن کی انس بن مالک نے تصریح کی ہے: بلّغوا قومنا أنا لقينا ربنا فرضي عنا و رضينا عنه[1]۔ مدینہ میں ہماری قوم کو یہ پیغام پہنچا دو کہ ہم اپنے رب سے ملے تو وہ ہم سے خوش ہوئے اور ہم ان سے۔

بئر معونہ کی مہم کے ایک ماہ بعد دوسرے یہودی قبیلہ بنو نضیر کی جلا وطنی عمل میں آئی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا بئر معونہ کے حادثہ میں صرف ایک انصاری عمرو بن اُمیّہ نامی زندہ بچے تھے، یہ مدینہ چلے آرہے تھے کہ راستہ میں انھیں قبیلۂ عامر کے دو عرب ملے جو رسول اللہؐ سے مل کر اور ان کی امان حاصل کر کے وطن جا رہے تھے، دوپہر کا وقت تھا، تینوں ایک درخت کے نیچے آرام کرنے لیٹ گئے۔ جب دونوں عامری سو گئے تو عمرو بن اُمیّہ نے اس دلیل سے دونوں کو قتل کر دیا کہ وہ دونوں غیر مسلم ہیں اور ان کا تعلق ایک ایسے قبیلے سے ہے جس کے لیڈر نے ان کے ساتھیوں کو قتل کرایا تھا۔ بنو عامر کے لیڈر عامر بن طفیل کو واقعہ کی خبر ہوئی تو اس نے رسول اللہؐ کو ایک خط بھیجا کہ ہمارے دو آدمیوں کو جو تمہاری امان میں تھے ایک مسلمان نے غداری سے قتل کر دیا ہے،

---

[1] مغازی ص ۳۴۱

اس کا خون بہا ادا کر دو تاکہ ہمارے تمہارے تعلقات خراب نہ ہوں ورنہ ہم انتقامی کارروائی کریں گے۔ رسول اللہؐ نے مقتولوں کی دیت کے دو سو اونٹوں یا ان کی قیمت کے مساوی روپے کے لئے چندہ کرنا شروع کر دیا۔ بنو نضیر کا بنو عامر سے باہمی مدد کا معاہدہ تھا اور اس اعتبار سے وہ ان کے حلیف تھے، عربی دستور کے مطابق ایک حلیف دوسرے حلیف کی دیت کے لئے چندہ دیا کرتا تھا، رسول اللہؐ آٹھ مہاجر و انصار مقربوں کے ساتھ بنو نضیر کے اکابر سے ملنے گئے جو مدینہ کے باہر یہودی بستی میں رہتے تھے۔ اکابر نے رسول اللہؐ کی آؤ بھگت کی اور کہا: ابو قاسم آپ جیسا کہیں گے ہم ویسا ہی کریں گے آئیے بیٹھیے ہم آپ کی کچھ خاطر تواضع کریں۔ نفعل یا أبا القاسم ما أحببت .... اجلس حتی نُطعمك[1]۔ اس کے بعد وہ الگ جا کر آپس میں مشورہ کرنے لگے، ان کے بڑے لیڈر حُیَیّ بن اخطب کی رائے تھی کہ رسول اللہؐ کو مارنے کا یہ نادر موقع ہے، اسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیئے تاکہ وہ خطرہ ہمیشہ کے لئے ٹل جائے جو مدینہ میں ان کی موجودگی سے یہودی مذہب اور سالمیت کو لاحق ہو گیا تھا، حُیَیّ کا خیال تھا کہ اگر رسول اللہؐ مارے گئے تو مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جائے گا، مہاجرین اپنے آبائی وطن مکہ واپس چلے جائیں گے اور اوس و خزرج سے پہلے کی طرح ان کے تعلقات خوشگوار ہو جائیں گے، ایک دوسرے لیڈر نے کہا کہ میں چھت پر جا کر محمد کے سر پر پتھر لڑھکا دوں گا، رسول اللہؐ ایک کمرہ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے، ایک تیسرے با اثر لیڈر سَلّام بن مِشکَم نے حُیَیّ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ محمد کو قتل کرنا معاہدہ کے خلاف ہے اور اس کا انجام خراب ہوگا، کیونکہ ان کا جانشین کوئی ضرور بنے گا اور وہ ان کے قتل کا انتقام لے گا اور وہ یہودیوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ ان سرگوشیوں سے رسول اللہؐ کو محسوس ہوا کہ ان کے خلاف سازش کی جا رہی ہے، وہ تیزی سے اٹھے اور چل دئے گویا کسی ضروری کام کو جا رہے ہوں، یہودی بستی سے نکل کر انہوں نے مدینہ کا رخ کیا۔ دیر تک انتظار کر کے ان کے ساتھی بھی مدینہ چلے گئے۔ مدینہ پہنچکر رسول اللہؐ

---

[1] مغازی ص ۳۶۴

نے نضیر کے اکابر کو پیغام بھیجا کہ تم نے میرے قتل کی سازش کر کے معاہدہ توڑا ہے اس لئے دس دن کے اندر اندر شہر چھوڑ دو، اس مدت کے بعد تمہارا جو آدمی مدینہ میں نظر آئے گا اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔[1]

بنو نضیر جلاوطنی کی تیاری میں مشغول تھے کہ اوس و خزرج کے غیر مسلم، متذبذب اور نمائشی مسلمان طبقوں نے انھیں شہر چھوڑنے سے روکا، عبداللہ بن اُبَی نے رسول اللہؐ کا حکم جلاوطنی غیر منصفانہ قرار دیکر نضری اکابر سے کہا کہ تم گھر بار نہ چھوڑنا، اپنی گڑھیوں میں محصور ہو جاؤ، میں اپنے ہم قوموں اور دوسرے عربوں پر مشتمل تین ہزار فوج تمہاری مدد کے لئے بھیج دوں گا، وہ تمہاری حفاظت کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہادے گی، تمہارے ہم مذہب بنو قریظہ بھی تمہاری مدد کریں گے اور غطفان[2] کے طاقتور قبیلے جن سے تمہارا معاہدہ ہے تمہاری پشت پناہی کے لئے آجائیں گے۔ ابن اُبَی نے قریظہ کے بڑے لیڈر کے پاس ایک قاصد بھیجکر اس کا عندیہ لیا تو اس نے معاہدہ توڑ کر نضیر کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔[3] حُیَی بن اخطب نضری اور اس کے متعدد ہم خیال عبداللہ بن ابی کی رائے سے متفق تھے اور گھر بار چھوڑنے کے خلاف لیکن ایک دوسرے با اثر لیڈر سلام بن مشکم کا اصرار تھا کہ یا تو اسلام قبول کر کے آبرو اور عافیت کے ساتھ مدینہ میں رہا جائے یا مقررہ میعاد کے اندر شہر چھوڑ دیا جائے، اسے اندیشہ تھا کہ اگر بنو نضیر رسول اللہ کے محاصرہ کے دوران جلاوطنی کے لئے تیار ہوئے تو رسول اللہؐ یا تو انھیں قتل کرا دیں گے یا ان کا سارا مال و متاع ضبط کر کے جلاوطنی کی اجازت دیں گے۔ نضیر کے اکثر ارباب رائے سلام کے ہمنوا تھے کیونکہ لڑائی اور مقابلہ کا انجام انھیں برا نظر آتا تھا۔ آخر کار حُیَی بن اخطب، عبداللہ بن اُبَی اور دوسرے

---

[1] مغازی ص ۳۵۸
[2] مدینہ کے شمال مشرق میں
[3] مغازی ص ۳۵۹

اوس وخزرجی مشیروں کی مرضی غالب رہی، حُیَی نے رسول اللہؐ کو کہلا بھیجا کہ میرے ہم قوم اپنا وطن مالوف چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ رسول اللہؐ ایک فوج کے ساتھ مسلح ہو کر آ گئے، تقریباً بیس دن نضیر کی بستی میں لڑائی ہوتی رہی[1]، وہ چھتوں، مورچوں، گھروں اور گڑھیوں میں لڑتے ہوئے پسپا ہوتے رہے لیکن ان کی مدد کے لئے نہ عبداللہ بن ابی کی فوج آئی، نہ غیرمسلم اوس کے دستے، بنو نضیر کے حوصلے پست کرنے کے لئے رسول اللہؐ ان کے چھوڑے ہوئے گھروں اور گڑھیوں کو برباد کرا دیتے اور ان کے نخلستانوں کے درختوں کو جلوا اور کٹوا دیتے[2]، یہ دیکھ کر نضری اکابر چلا چلا کر رسول اللہؐ کو طعنے دیتے: ایک طرف مصلح ہونے کا دعویٰ اور دوسری طرف یہ تخریبی کارروائی! کیا تمہارا خدا تمہیں فساد فی الارض کا حکم دیتا ہے؟ مسلح مدد سے محرومی اور اپنے گھروں اور نخلستانوں کی تباہی سے بنو نضیر کا دل ٹوٹ گیا، ان کے اکابر نے رسول اللہؐ کو پیغام بھیجا کہ ہماری جان، مال اور بچوں کو امان دی جائے تو ہم وطن چھوڑنے کو تیار ہیں۔ رسول اللہؐ نے اوس وخزرج کے غیرمسلم، متذبذب اور نمائشی مسلمانوں کی تالیف قلب کی خاطر نضیر کے بالغوں کی جان بخش دی اور ان کے بال بچوں کو غلام بنانے پر اصرار نہیں کیا، انھوں نے ہتیاروں کے علاوہ ہر قسم کا سامان لے جانے کی بھی اجازت دے دی لیکن منقولہ سامان کی مقدار اور باربرداری کے اونٹوں کی تعداد کم کرنے کے لئے یہ شرط لگا دی کہ ایک اونٹ پر تین آدمیوں سے کم نہیں سوار ہوں گے[3]۔ ایک قول یہ ہے کہ بنو نضیر کو ہتیاروں کی طرح سونا چاندی اور ہر قسم کا قیمتی سامان سوائے پرانی اور گھٹیا گھریلو چیزوں کے چھوڑنا پڑا جیسے توا، بیلکن، پتیلی، کنڈی، چوکھٹ، کواڑ۔ لیجاسکیں[4]۔ رسول اللہؐ کی بنو نضیر سے صلح کی شرط یہ تھی کہ وہ اپنا وطن چھوڑ دیں گے، انہیں

---

[1] مدینہ کے شمال اور مشرق میں
[2] ابن ہشام ص ۶۵۳، طبری ۳/۳۷، ابن سعد ۲/۵۸، بلاذری ص ۲۵
[3] مغازی ص ۳۶۱، طبری ۳/۳۸
[4] جلد ۲ صفحہ ۴۰

اس قسم کا گھٹیا پرانا گھریلو سامان لے جانے کا حق ہوگا جو اونٹ پر جا سکے لیکن چاندی سونا اور ہتھیار لے جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ فصالحھم علی ان یخرجوا من بلادھم ولھم ماحملت الابل من حرثی متاعھم، لایخرجون معھم بذھب ولا فضۃ ولا سلاح۔

بنونضیر چھ سو اونٹوں پر سوار ہو کر شام روانہ ہوگئے، ان کے چند سب سے زیادہ مالدار اور بارسوخ خاندان جو رسول اللہؐ کی مخالفت میں بھی پیش پیش تھے، حیی بن اخطب، سلام بن ابی حقیق اور کنانہ بن ربیع بن ابی حقیق کی قیادت میں، رسول اللہؐ سے انتقام لینے کے لئے، حجاز کی سب سے بڑی یہودی بستی خیبر میں ٹھہر گئے، باقی یہودی اپنے آبائی وطن شام جا کر اَذرِعات اور اَریحا میں بس گئے۔

بنونضیر کا پیشہ زراعت اور باغبانی تھا، انھوں نے منقولہ سامان، مکانات اور گڑھیوں کے علاوہ بہت سے زراعتی فارم اور نخلستان چھوڑے تھے، ان سب پر رسول اللہؐ کا قبضہ ہوگیا۔ ہر چند کہ بیس دن تک لڑائی ہوتی رہی تھی، ان کے املاک کی تقسیم مال غنیمت والی قرآنی آیت کے مطابق نہیں ہوئی جس کی رو سے غنیمت کے پانچ حصوں میں سے چار فوج میں بانٹنا لازم تھا رسول اللہؐ کے ساتھیوں نے ان کی توجہ اس آیت کی طرف مبذول کی تو انھوں نے کہا کہ خدا نے چند عرب بستیاں میرے لئے خالصہ کرنے کا وعدہ کرلیا ہے[1] اور بنونضیر کی بستی ان میں سے ایک ہے، اس موقع پر رسول اللہؐ کے قول کی توثیق کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ وَمَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبٰى فَرِيْضَةً۔ خدا اپنے رسول کو اہل قریٰ کے جو املاک بطور غنیمت عطا کرے گا ان کے مالکانہ حقوق لازمی طور پر خدا، رسول اور ان کے ہاشمی و مطلبی رشتہ داروں کو حاصل ہوں گے۔ بنونضیر کے مال و متاع زمینوں اور نخلستانوں سے رسول اللہؐ اور ان کے ہاشمی و مطلبی اقارب کی مالی حالت بہت بہتر ہوگئی، رسول اللہ نے بہت سا سامان، مکان، زمینیں، گڑھیاں اپنے

---

[1] مغازی ص ۳۷۴

اقارب میں بانٹ دیں اور بہت سے فارم اور نخلستان اپنے قبضہ میں رکھے، فارموں اور نخلستانوں سے انھیں بڑی مقدار میں غلہ اور کھجور ملنے لگی، اس کا ایک حصہ ان کے متعلقین اور بیویوں کے سال بھر کے خرچ کے لئے الگ کر دیا جاتا، باقی فروخت ہو جاتا اور اس کی قیمت سے ہتیار، دوسرا جنگی سامان اور گھوڑے خرید لیے جاتے۔ بلاذری — نضیر کی دولت رسول اللہ کے لئے خالصہ تھی، ان کے نخلستانوں میں رسول اللہ زراعت کراتے تھے، غلہ اور کھجور کا کچھ حصہ اپنے متعلقین اور بیویوں کو سال بھر کے خرچ کے لئے دیدیتے باقی گھوڑے اور ہتیار خریدنے پر صرف کرتے تھے۔ فکانت أموالُ بنی النضیر خالصة لرسول الله وکان یزرع تحت النخل فی أرضهم فیدخل من ذٰلك قوت اهله وأزواجه سنةً وما فضل جعله فی الکراع والسلاح[1]۔ بنو نضیر کی زمینوں سے رسول اللہ نے مہاجرین و انصار کو جائدادیں دیں، ان کے علاوہ جن غیر ہاشمی و مطلبی اقارب کو مزروعہ اراضی اور نخلستان عطا کیے ان میں سے ان چند ممتاز ناموں کا قدیم ماخذوں میں ذکر ہے: ابوبکر صدیق (خسر) بئر حجر (نخلستان)، عمر فاروق (خسر) بئر جرم (نخلستان)، عبدالرحمٰن بن عوف (ہم زلف) سوالہ (نخلستان)، زبیر بن عوام (پھوپی زاد بھائی) و ابوسلمہ (بن عبداللہ) بُویرہ (نخلستان) صہیب بن سنان رومی، ضراطہ (نخلستان)[2]۔

(باقی)

---

[1] فتوح البلدان ص۲۴

[2] ابن سعد ۲/۵۸، بلاذری ص۲۴

کتاب الام

از جناب الحاج ابوسلمہ شفیع احمد صاحب بہاری کلکتہ [۱]

یہ کتاب اس مقدس ذات کی طرف منسوب ہے جن کو ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عالم قریش ہونے کا شرف حاصل ہے اور جواہت محمدیہ (علی صاحبہا الف تحیۃ وسلام) میں خاص مقام کے مالک ہیں یعنی الامام ابوعبداللہ محمد بن ادریس الشافعی م ۲۰۴ رضی اللہ عنہ ورحمہ ؎

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

حضرت ابھی اس عالم آب وگِل میں تشریف نہیں لائے تھے کہ معبروں نے والدہ ماجدہ کے خواب کی بنا پر کہا تھا کہ انہ یخرج منہا عالم یخص علمہ اھل مصر ثم یتفرق فی سائر البلدان [۱]

حضرت امام احمد م ۲۴۱ اپنے صاحبزادہ عبداللہ م ۲۹۰ سے فرماتے ہیں کہ امام شافعی ایسے ہیں جیسے دنیا کے لئے سورج یا بدن کے لئے صحت وعافیت ۔ کیا ان دونوں کا کوئی بدل ہو سکتا ہے؟

تمام علماء ـــــــ یعنی اہل الحدیث والفقہ والاصول واللغۃ والنحو کا ـــــ آپ کے ثقہ وامانت، عدالت، زہد وورع، نزاہت ونظافت، عزتِ نفس، حسنِ سیرت، علوِ قدر اور جود وسخا پر اتفاق ہے۔

---

[۱] ابن خلکان ج ۳

زعفرانی م ۲۶۰ فرماتے ہیں کہ اصحاب الحدیث سوئے ہوئے تھے۔ امام شافعیؒ آئے اور سب کو بیدار کیا تو جاگ اٹھے۔

کلام عرب، لغت، عربیت و شعر پر — جو آپ کا خاص فن نہیں تھا۔ اتنا عبور و دسترس حاصل تھا کہ اصمعی م ۲۱۶ نے جلالتِ قدر و علوِ شان اور اشعارِ عرب اور اس کے آثار کے عالم و عارف ہونے کے باوجود۔ آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور اشعار ہذلیین آپ پر پڑھا۔ آپ خود بھی تحدیث بالنعمۃ کے طور پر فرمایا کرتے تھے ؎

ولولا الشعر بالعلماء یزری لکنت الیوم اشعر من لبید

عرب کا مشہور انشاء پرداز ابوعثمان عمرو بن البحر الجاحظ[1] م ۲۵۵ کی آپ کے ادب و بیان کے متعلق یہ شہادت کافی ہے کہ نظرتُ فی ھؤلاء النبغۃ الذین نبغوا فی العلم۔ فلم أر أحسن تالیفاً من المطّلبی کان لسانہ ینظم الدرّ۔ حضرت کی تمام تصانیف فقہ و اصول سے پہلے ادب و لغت و ثقافت کا نہایت قیمتی ذخیرہ ہے اس لئے کہ حضرت کی زبان اور ان کا کلام لحن، لکنت و لغزش سے مبرا ہے جیسا کہ خود جاحظ کی تصانیف کے متعلق مشہور ہے کہ

کُتُبُ الجاحظ تُعلِّم العقل اولاً و الادب ثانیاً

ابومحمد عبدالملک[2] بن ہشام النحوی صاحب السیرۃ ۲۱۳ — ۲۱۸۔ مدح و ستائش میں اپنے

---

[1] حضرت امام اور جاحظ کا سنہ ولادت ایک ہی ۱۵۰ھ ہے لیکن جاحظ کی وفات محرم ۲۵۵ھ ہے ۱۲

[2] ابن ہشام متعدد ہیں ایک تو یہی صاحب السیرۃ دوسرے صاحب مغنی اللبیب جمال الدین عبداللہ بن یوسف بن احمد بن عبداللہ بن ہشام الانصاری الخزرجی م ۷۶۱۔ مغنی اللبیب کی تالیف کے بعد کل چار سال زندہ رہے ابوحیان سے صرف دیوان زہیر بن ابی سلمی سن سکے۔ تیسرے محمد بن یحیی بن ہشام الخضراوی۔ اندلس کے جزیرۃ الخضراء کی طرف منسوب ہیں۔ چوتھے محمد بن احمد ابن ہشام اللخمی۔

جذبات ومعالف کی پوری پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

قَالت مجالستنا للشافعی فما سَمِعتُ لحنۃً قَطُّ ولا کلمۃً غیرھا احسن منہ

اور یہ قول تو ان کا بہت مشہور ہے

کلامہ لغۃ یحتج بہا

حافظ ذہبی وابن کثیر کا بیان ہے کہ جب ابن ہشام النحوی صاحب السیرۃ۔ جو نحو ولغت وعربیت کے امام ہیں۔ مصر آئے اور امام شافعی کے ساتھ اجتماع ہوا تو

تناشدا من اشعار العرب اشیاء کثیرۃ

علامہ زمخشری جو امام المفسرین اور اعجاز القرآن کے عالموں میں دوسرے ستون ہیں فرماتے ہیں کہ

انہ کان اعلی کعبا واطول باعًا فی علم کلام العرب[1]

غرض لغت، عربیت اور شعر وادب میں پایہ بہت بلند اور علم وسیع وعمیق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض الفاظ عام لغویین ونحویین کے مسلمہ اصول کے خلاف لیکن حجازی لغت کے مطابق استعمال کرتے ہیں اور وہ سکہ رائج الوقت کی طرح جاری و نافذ ہوجاتا ہے اور کوئی نشاندہی نہیں کی جاتی مثلاً

۱۔ طریق مذکر ومونث دونوں طرح مستعمل ہے لیکن حضرت الامام ایک ہی جملہ میں دونوں طرح استعمال کرتے ہیں وھوشی طریف۔ (کتاب الرسالہ بتحقیق احمد محمد شاکر ص ۲۵۳ رقم ۹۵۰)

۲۔ موصوف وصفت کے درمیان جملہ کا فصل لاتے ہیں (رقم ۲۵۵ — ۵۰۶)

۳۔ اخبرنا سفیان عن سالم ابو النضر (ص ۱۵)

احمد محمد شاکر پورے وثوق واطمینان کے ساتھ فرماتے ہیں کہ اصل نسخہ میں اسی طرح ہے لیکن

---

[1] کشاف سورۂ نساء

مصحح نے اسمائے ستّہ مکبرہ کے خلاف استعمال دیکھ کر تصحیح کر دی اور پھر اسے "لغت" ریکارڈ کر دیا۔ حالانکہ اصل میں جس طرح ہے اس کی بھی وجہ ہے گرچہ غیر مشہور ہے۔ چنانچہ ابن قتیبہ مشکل القرآن میں فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص کے اسم و کنیت دونوں ہوں اور کنیت اسم پر غالب آجائے اور اسی سے اس کا تعارف ہوتا ہو تو کنیت بکمالہا ایک اسم ہوجاتا ہے پھر اس کو اسی ہیئت پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور دونوں اسم کو ایک اسم سمجھا جاتا ہے جیسے علی بن ابوطالب، معاویہ بن ابوسفیان۔

۴۔ یا مثلاً فرماتے ہیں وحیث یزول ھذا، و یثبت وتختلف سنتہ وتاتفق (باب البیان الثالث) داخری موتفقۃ (متفقۃ) واخری مختلفۃ (ص ۳۱۔ باب العلل فی الاحادیث) فکل امرہ موتفق (متفق) صحیح۔ احمد محمد شاکر لکھتے ہیں کہ اصل میں تاتفق اور موتفقۃ، اور موتفق ہے لیکن کاتب نے اس کو بدل دیا اور تتفق اور متفق کر دیا۔ لان الشافعی یکتب ویتحدث بلغتہ لغۃ اھل الحجاز وفی جمیع النسخ المطبوعۃ تتفق وھو مخالف للاصل (ص ۳۱ بتحقیق احمد محمد شاکر[1]) لکھتے ہیں کہ چونکہ کتاب الرسالہ کا اصل نسخہ بہت صحیح ہے اس لئے اس میں عربی قواعد معروفہ کے خلاف جس کو میں نے پایا اس کو خطا پر محمول نہیں کیا بلکہ اس کی صحت پر اس کو اور مستعمل فیہ میں اس کو شاہد بنایا۔

غرض اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کلام صحابہ و آثار اور اختلاف اقاویل علماء ہیں، جن کو آپ اپنی حیاۃ طیبہ کا شعار و دثار بنائے ہوئے تھے کیا پایہ ہوگا۔ ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

حضرت امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ مجھے ناسخ ومنسوخ، خاص وعام، مجمل ومفصل کا علم امام شافعیؒ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فہرس الفوائد اللغویۃ المستنبطۃ من الرسالۃ مرتبہ احمد محمد شاکر

کی ہمنشینی سے حاصل ہوا۔ اس طرح آپ کی ذات جامع العلوم اور فنون متنوعہ کی مالک تھی رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔ نظر بہت وسیع اور اتنی عمیق و دقیق تھی کہ بعض بعض مہمات اور احادیث معانی کثیرہ پر کلام کرنے کا حق آپ کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے اور تمنائیں کی جاتی ہیں کہ کاش اس حدیث پر امام شافعی رح کلام کرتے تو امت کو کچھ حاصل ہوتا۔

لو تکلم علیہ نحو الشافعی لا غنی عن الایضاح (فیض الباری ج ۱ ص ۱۵۲)

حضرت کا مصر، بغداد، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ آنا جانا ہوا۔ اخیر عمر میں ۱۹۹ھ میں مصر تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ انہی اسفار میں حضرت کی تالیف و تصنیف کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس وقت امت کے ہاتھوں میں آپ کی تالیفات میں سے جو "آثار خالدہ" اور "الباقیات الصالحات" کے طور پر باقی ہیں وہ مصر کی تالیفات ہیں۔

گرچہ عام خیال یہی ہے کہ آپ کی تالیفات کا احصا مشکل ہے پھر بھی حافظ ابن حجرؒ م ۸۵۲ کے نزدیک ایک سو چالیس سے کچھ زائد ہی ہیں (سرکیس)

ربیع بن سلیمان المرادی م ۲۷۰ کا بیان ہے کہ میں نے اشہب بن عبدالعزیز کو دیکھا کہ وہ سجدہ میں سر رکھے ہوئے فرما رہے ہیں کہ اللّٰھمّ امت الشافعی والا یذہب علم مالک[1]۔ حضرت کو جب خبر پہنچی تو زیر لب تبسم فرما کر کچھ اشعار فرمانے لگے۔

چونکہ حضرت کا قلب و جگر اور بدن کا رواں رواں یعنی ظاہر و باطن عشق نبوی اور اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبہ سے سرشار تھا اس لئے جب نصرۃ سنت اور علماء کو وجوب اتباع سنت کی تعلیم پر کلام کرتے ہیں تو ایسے فقرات عالیہ رائد قلم سے ٹپکتے جاتے ہیں جو آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اہل مکہ نے آپ کو "ناصر الحدیث" کے معزز لقب سے نوازا ودّ اللہ مصلا قوا وبروبا۔

---

[1] طبقات الشافعیہ للسبکی

حضرت خود بھی فرماتے ہیں کہ سمیت ببغداد ناصر الحدیث۔

آپ نے خود بھی امید ظاہر کی ہے کہ کسی صحیح حدیث کی مخالفت کا الزام مجھ پر نہیں لگایا جاسکتا۔ واما ان نخالف حدیثا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثابتا عنہ فارجو ان لا یوخذ ذلک علینا ان شاء اللہ (کتاب الرسالۃ ص ۳۱)

آگے فرماتے ہیں اور مدافعت کا حق ادا کر رہے ہیں کہ ولیس ذلک لاحد ولکن قد یجھل الرجل السنۃ فیکون لہ قول یخالفھا لا انہ تعمد خلافھا۔ وقد یغفل المرء ویخطی فی التاویل۔

مسائل و ابحاث کو اتنی قوت و شدت سے بیان کرتے ہیں کہ مخالف مبہوت ہو جاتا ہے۔

حضرت کی تصانیف میں کتاب الرسالہ، کتاب احکام القرآن، اختلاف الحدیث[۲]، ابطال الاستحسان، کتاب جماع العلم، کتاب القیاس، کتاب المبسوط، کتاب الامالی، کتاب الحجۃ وغیرہا ہیں۔

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ قد کتبنا ھذا بالاختلاف فیہ وتبیین الحجۃ فی کتاب الصلوٰۃ وترکنا ذکر من خالفنا فیہ وفی غیرہ من الاحادیث الخ (الرسالۃ ص ۳۵ باب وجہ آخر من الناسخ والمنسوخ) لیکن یہ بحث نہ کتاب الام کے صلوٰۃ الخوف اور نہ اختلاف الحدیث میں ہے۔ اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ شاید حضرت کی کوئی تصنیف اس نام سے موسوم ہو مگر وہ ہم تک نہ پہنچ سکی۔ واللہ اعلم۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا

مزنی م ۲۶۴ کا بیان ہے کہ ایک روز ہم نے حضرت سے درخواست کی کہ کتاب السہو تصنیف فرمائیے تو فرمایا کہ اس باب میں بہت مشکل اور ادق مسائل ہیں پھر آپ نے فرمایا۔ فن پر پہلی کتاب اور اچھوتی ہے۔

---

[۱] دیکھئے کتاب الام ج ۱ ص ۱۸۶ و ۲۰۳ و اختلاف الحدیث ج ۷ ص ۲۲۱ تا ۲۲۶، بہامش الام ۱۲

اسی طرح ایک جگہ اور فرماتے ہیں کہ فلذکرت لہ بعض ما وصفت فی کتاب السنۃ مع القرآن۔ واللہ اعلم حضرت کی اس سے کیا مراد ہے۔ آیا اس نام سے کوئی کتاب ہے یا وہ مباحث مراد ہیں جو ام، رسالہ وغیرہا میں منتشر اور بکھرے پڑے ہیں۔

احمد بن محمد الاسفرائنی م ۴۰۶ھ نے مصر آدمی بھیج کر سو دینار میں حضرت کی امالی منگوائی[1]۔ کہا جاتا ہے کہ امام عالی مقام پہلے شخص ہیں جنھوں نے اصول فقہ پر کلام کیا اور اس کی تدوین فرمائی لیکن علمائے احناف اس شرف کو حضرت امام ابو یوسفؒ و حضرت امام محمدؒ کے ساتھ منسوب فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت امام ابو یوسفؒ اپنی مجلس میں محدثینؒ کو اصول فقہ کے بعض قواعد پر متنبہ کیا کرتے تھے اور حضرت امام محمدؒ کی الجامع الکبیر میں تو اس کا وافر حصہ موجود ہے لیکن اس شہرت کی وجہ یہ ہوئی کہ رسالۃ الامام الشافعیؒ لما کانت مدونۃ مطبوعۃ واذاعھا الشافعیۃ اشتھر انہ مدون اصول الفقہ والحنفیۃ لما لم یرفعوا الیھم راسھم خمل ذکر ابی یوسفؒ فی ھذا الباب[2]۔ یعنی چونکہ حضرت امام شافعیؒ کا الرسالہ مدون اور مطبوعہ ہے اور شوافع نے اس کا چرچا کیا تو مشہور ہو گیا کہ حضرت امام ہی اصول فقہ کے مدون ہیں اور حنفیہ نے ادھر نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اس لئے حضرت امام ابو یوسفؒ گوشۂ گمنامی میں پڑ گئے۔

حضرت کے تلامذہ کی طولانی فہرست میں ابو ابراہیم اسماعیل بن یحییٰ المزنی م ۲۶۴ اور ابو محمد ربیع بن سلیمان المرادی م ۲۷۰ مذہب کے ستون ہیں اول الذکر کے متعلق تو مشہور ہے کہ ولم یکن[3] فی اصحاب الشافعی افقہ من المزنی لیکن ان کی روایت اس لئے مرجوح ہو جاتی ہے کہ اپنی ذہانت و فطانت کے باعث تغیر و تبدل اور روایت بالمعنی کرتے ہیں جس سے غلطی ہو جاتی ہے

---

[1] طبقات الشافعیہ للسبکی ج ۳ ص ۲۶

[2] فیض الباری ج ۱ ص ۱۷۷

[3] ابن الندیم ۱۲

آپ کی تصانیف میں مختصر المزنی بہت ہی معروف مشہور ہے۔ خود ہی فرماتے ہیں:
اختصرت ھذا الکتاب من علم محمد بن ادریس الشافعیؒ (مختصر ص۲)
اس کے ہر مسئلہ پر دو رکعت نماز پڑھتے تھے جس کی برکت سے مذہب کی کتب مصنفہ میں اصل اور ام کی حیثیت ہو گئی۔ پھر اسی طرز و نہج پر علماء نے کتابوں کی ترتیب و تفسیر و شرح کی۔ ابوبکر محمد بن داؤد نے اس کی شرح کی جس کی صرف دو جلدیں علامہ سبکیؒ دیکھ سکے تھے۔ پھر چنا یات کا کچھ حصہ شعبان المعظم ۷۷۲ھ میں انھیں ملا جو ۴۱۲ھ کا مخطوطہ تھا۔[1]

ابو العباس احمد بن سریج فرماتے ہیں کہ یخرج مختصر المزنی من الدنیا عذراء لم یفتض[2] علامہ بیہقی م ۴۵۸ کی سنن کبری و صغری کے متعلق مشہور ہے کہ اسلام میں ان جیسی تالیف وجود میں نہ آسکی۔ لیکن ہر دو بر ترتیب مختصر مزنی اند (بستان المحدثین)
کتاب الام کے حاشیہ پر مزنی م ۲۶۴ کی مختصر کبیر مندرج ہے
ابو العباس محمد بن عبد الرحمٰن الدغولی م ۳۲۵ کو مزنی کی تصانیف سے عشق تھا فرماتے ہیں کہ اربع مجلدات لا تفارقنی سفرا ولا حضرا۔ کتاب المزنی وکتاب العین والتخاریج للبخاری کلیلہ ودمنہ (ص ۴۱)

ابو محمد ربیع[3] بن سلیمان المرادی م ۲۷۰ حضرت کے اکثر کتب کے راوی ہیں۔ ایک مجلس میں چند اصحاب کے متعلق حضرت امام نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔ ربیع کے متعلق فرمایا تھا کہ واما انت یا ربیع فانت انفعھم لی فی نشر الکتب (یعنی تم سے میرا علم پھیلے گا) چنانچہ یہ ایسی

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۲۔ ص ۶۲ مصر

[2] ابن خلکان ۱۲

[3] ایک اور ابو محمد ربیع بن سلیمان ہیں لیکن وہ الجیزی اور م ۲۵۶ھ ہیں نیز حضرت سے قلیل الروایۃ ہیں۔

صحیح اتری کہ کانہ ینظر الی الغیب من ستر رقیق (گویا آپ باریک پردہ کے آڑ سے دیکھ رہے تھے)

حضرت ربیع نے امام کی بعض ان تصانیف کو جن کا سماع عن الشافعی انھیں حاصل تھا، یکجا کردیا، اور کتاب الام نام رکھا، اصول محدثین اور دیانت و امانت، زہد وتقویٰ کا خیال کرتے ہوئے اگر بعض اجزاء کا سماع فوت ہوگیا یا بخط الشافعی پایا اور سماع نہ ہوا تو اسے بھی صاف صاف واضح کردیا ہے جس کو ہر اہل علم اچھی طرح جانتا ہے۔

کچھ دن پہلے مصر کے مشہور اہل قلم اور ادیب کبیر ڈاکٹر زکی مبارک نے بغیر کسی برہان وحجت کے اور کتب متقدمین کے مطالعہ و طرق تالیف سے واقفیت حاصل کئے بغیر ایک فتنہ برپا کردیا جس کی بنیاد صرف یہ تھی کہ "اُم" کے بعض کلمات ان پر مشتبہ ہوگئے اور اس کو بنیاد بناکر یہ کہنا شروع کیا کہ یہ کتابیں حضرت امام شافعیؒ کی تالیفات میں سے نہیں ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اور ان کو اپنی سند میں قوت القلوب ابو طالب مکی کے بعض جملے مل گئے جن کو امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں نقل بھی کیا ہے۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کتاب الام الفہ البویطی ثم اخذہ الربیع بعد موتہ فادعاہ لنفسہ۔

لیکن اس کے خلاف نفس کتاب کی شہادت موجود ہے اور اگر اس جیسی روایت کا اعتبار کرلیا جائے تو حق یہ ہے کہ لا تنفعت الثقۃ لکل کتب العلماء بل لا تنفعت الثقۃ بھولاء العلماء انفسھم (تفصیل مقدمہ کتاب الرسالۃ بتحقیق احمد محمد شاکر میں ملاحظہ کیا جائے)

البتہ حضرت ربیع نے کتاب اختلاف الحدیث وکتاب الرسالہ کو اُم میں شامل نہیں کیا اور ان دونوں کو مجموعہ سے علیٰحدہ رکھا ہے۔

اختلاف الحدیث تو اُم کے جزء سابع کے ہامش پر مطبع بولاق سے طبع ہوکر عام ہوچکا ہے۔

کتاب الرسالہ کی حضرت نے دوبار تالیف فرمائی، اسی لئے ان کی تالیفات میں دو کتابوں رسالہ قدیمہ، رسالہ جدیدہ کا شمار ہوتا ہے، رسالہ قدیمہ کی تالیف ۔ بقول احمد محمد شاکر۔ راجح یہ

ہے کہ مکہ معظمہ میں ہوئی۔ مشہور محدث حافظ عبدالرحمٰن بن مہدی م ۱۹۸ کی تحریک پر یہ مفید رسالہ جو صحت ونظر وقوۃ وحجۃ میں بے نظیر ہے۔ عالم وجود میں آیا۔

خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی نے امام موصوف کو لکھا کہ ان یضع لہ کتاباً فیہ معانی القرآن ویجمع قبول الاخبار فیہ وحجۃ الاجماع وبیان الناسخ والمنسوخ من القرآن والسنۃ

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کو اس رسالہ کی تصنیف میں — بصفائل نفسہ — کچھ تامل تھا اور شاید تالیف کرنا ناپسند فرماتے تھے اس لئے علی بن المدینی م ۲۳۴ نے ادھر توجہ مبذول کرائی اور فرمایا کہ قلتُ لمحمد بن ادریس الشافعی اجب عبد الرحمٰن بن مهدی عن کتابه فقد کتب الیك وهو متشوق الی جوابك[1]۔

اس وقت حضرت عراق میں تھے اور تصنیف کی طرف متوجہ ہوئے اور جب کتاب مکمل ہوگئی تو حارث بن سریج النقال الخوارزمی کی معرفت آپ نے اس کو عبدالرحمٰن بن مہدی م ۱۹۸ کے پاس روانہ کیا، اسی لئے ان کو نقال کہا جاتا ہے۔

لیکن فخر الرازی کتاب مناقب الشافعی میں فرماتے ہیں کہ امام نے اس رسالہ کو بغداد میں تصنیف فرمایا ولما رجع مصر اعاد تصنیف کتاب الرسالۃ وفی کل واحد منهما علم کثیر (ص ۵۷)

معاملہ کچھ بھی ہو۔ یا اصل کتاب میں حک وفک، ترمیم وتنسیخ کر کے نئے قالب میں ڈھال دیا ہو یا جدید تالیف ہو۔ الرسالۃ القدیمۃ تو ناپید ہوگیا اور اب لوگوں کے ہاتھوں میں یہی مصری رسالہ "الرسالۃ الجدیدۃ" ہے۔

امام الہمام کی موجودہ مصری تالیفات کے استقراء سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت اپنی یاد اور حفظ سے تالیف فرماتے تھے۔ کتابیں آپ کے پاس نہ ہوتی تھیں۔ چنانچہ اختلاف الحدیث میں فرماتے ہیں

---

[1] الانتقاء للحافظ ابن عبد البرؒ

والاصل یوم کتبت ھذا الکتاب غائب عنی (ص ۲۵۲)
غاب عنی بعض کتبی وتحققت بما یعرفہ اھل العلم مما حفظت فاختصرت خوف
طول الکتاب فاتیت ببعض ما فیہ الکفایۃ دون تقصی العلم فی کل امرہ (الرسالہ ص ۵۹)
الرسالہ کی تالیف حضرت کی اکثر ان تالیفات کے بعد جو کتاب الام میں ہیں۔ ہوئی ہے، اسی لئے
اسی پر محول کرتے جاتے ہیں مثلاً فرماتے ہیں
وقد فسرت ھذا الحدیث قبل ھذا الموضع (الرسالہ ص ۵۹)
یہ اشارہ کتاب الام کے جزء سادس ص ۷۷ باب میراث الدیۃ کی طرف ہے۔ اور جیسے فرماتے
ہیں۔ وھذا مکتوب فی غیر ھذا الموضع (الرسالۃ ص ۴۸) یہ اشارہ ج ۵ ص ۵۱، ۵۲
باب کتاب الصداق کی طرف ہے۔ اور مثلاً وھو مکتوب فی غیر ھذا الموضع (الرسالۃ ص ۴۹)
یہ اشارہ ج ۵ ص ۶۸، ۷۰ اور اختلاف الحدیث ص ۲۳۸، ۲۴۱، ۲۵۴، ۲۵۷ کی طرف
ہے۔ یا مثلاً وھما موضوعان فی غیر ھذا الموضع، ص ۸۔ اس کو الرسالہ کے مختلف ابواب،
باب العلم اور باب الاجماع اور اس کے بعد کے ابواب نیز کتاب جماع العلم ج ۷ ص ۲۵۰ میں بھی بیان
کیا ہے۔ راجح یہ ہے کہ حضرت نے الرسالہ کو ربیع پر املا کرایا حضرت رح اپنی اس تالیف کو الکتاب،
کتابی، کتابنا سے یاد فرماتے ہیں۔ کتاب الرسالہ اس لئے مشہور ہو گیا کہ حضرت نے عبدالرحمٰن بن
مہدی رح کے پاس ارسال فرمایا تھا۔

فخرالدین رازی فرماتے ہیں کہ آپ سے قبل علماء، مسائل اصول فقہ پر کلام، استدلال واعتراض
سب کچھ کیا کرتے تھے لیکن کوئی اصول اور قانون کلی موجود نہیں تھا جس سے لوگ دلائل شریعت کی معرفت
وکیفیت معارضہ وترجیحات سے واقف ہو سکیں۔

فاستنبط[1] الشافعی علم اصول الفقہ ووضع للخلق قانونا کلیا یرجع الیہ فی معرفۃ

---

[1] معارف بحوالہ مناقب الشافعی للرازی ص ۵۷

مراتب ادلۃ الشرع - یعنی امام شافعیؒ نے اصول فقہ کے علم استنباط کیا اور ایسا قانون کلی وضع کیا جس کی طرف لوگ رجوع کر سکیں۔

علامہ بدرالدین الزرکشی فرماتے ہیں کہ الشافعی اول من صنف فی اصول الفقہ صنف فیہ کتاب الرسالۃ وکتاب احکام القرآن واختلاف الحدیث وابطال الاستحسان وکتاب جماع العلم وکتاب القیاس (معارف بحوالہ البحر المحیط فی الاصول مخطوطہ)

ابن خلدون رقمطراز ہیں کہ امام شافعی نے اپنا مشہور رسالہ املاء کرایا اور یہ فن کی پہلی تصنیف ہے اس میں اوامر ونواہی، بیان وخبر، نسخ اور علت منصوصہ کا حکم بیان فرمایا ہے (مقدمہ ص ۴۸۱)

کتاب الرسالہ میں امام نے جن مسائل کو چھیڑا ہے اور اس پر کلام فرمایا ہے مثلاً شرائط صحت حدیث، عدالت رواۃ، خبر مرسل ومنقطع، ناسخ ومنسوخ، اجتہاد واستحسان وغیرہا یہ فن کے اعلیٰ، ادق اور اغلی مسائل میں سے ہیں اور حق یہ ہے کہ حضرت نے جو کلام فرمایا ہے وہ حرف آخر ہے۔ بل ان المتفقۃ فی علوم الحدیث یفھم ان ما کتب بعدہ انما ھو فروع منہ وعالۃ علیہ وانہ جمع ذلک وصنفہ علی غیر مثال سبق - للہ ابوہ (مقدمہ رسالہ بتحقیق احمد محمد شاکر) یعنی اس کے بعد جو کچھ لکھا گیا سب اسی کے محتاج ہیں - حضرت نے بغیر کسی نمونہ کے لکھا۔

یہی وجہ ہے کہ جب عبدالرحمٰن بن مہدی نے اس رسالہ کو دیکھا تو فرماتے ہیں اذھلتنی لانی رایت کلام رجل عاقل فصیح ناصح - اور ما اصلی صلاۃ الا وانا ادعو للشافعی فیھا۔ یعنی ہر نماز کے بعد امام شافعی کے لئے ضرور دعا کیا کرتا ہوں - پڑھکر بے ساختہ فرمایا۔

ماظننت ان اللہ خلق مثل ھذا الرجل (معارف بحوالہ مراۃ الجنان ج ۲ ص ۱۸)

یعنی میرا خیال نہیں تھا کہ اس جیسا آدمی بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے

مزنی صاحب الشافعی م ۲۶۴ کا یہ عجیب وغریب بیان سننے کے لائق ہے۔

قرات کتاب الرسالۃ للشافعی خمسمائۃ مرۃ - مامن مرۃ منھا الا واستفدت فائدۃ جدیدۃ لم استفدھا فی الاخری - یعنی کتاب الرسالہ کو پانچ سو بار مطالعہ کیا اور

ہر بار جدید فائدہ سے مستفید ہوتا رہا۔

نیز انہی کا اعتراف ہے ۔ انا انظر فی کتاب الرسالۃ عن الشافعی منذ خمسین سنۃ ما اعلم انی نظرت فیہ من مرۃ الا وانا استفید شیئًا لم اکن عرفتہ ۔یعنی پچاس سال سے الرسالہ زیر مطالعہ ہے۔ اور ہر بار جدید فائدہ سے مستفید ہو رہا ہوں۔ یعنی ؎

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

اس کے برعکس دور حاضر کے مصری فاضل شیخ محمد خضری بیگ اپنی تالیف اصول فقہ میں فرماتے ہیں کہ فن کی پہلی کتاب صرف چند ضروری اور ان مسائل پر مشتمل ہوتی ہے جن کی اس وقت ضرورت ہوتی ہے نہ اس میں نظم وضبط اور ترتیب ہوتی ہے اور نہ احصار و استیفار ۔ کذلک کانت ھذہ الرسالۃ بمنزلۃ اول حجر وضع فی اساس اصول الفقہ و نفثت فطاحل الفقہاء الی موالاۃ البحث و ترتیب الاصول[1] ۔یعنی اسی طرح سے یہ رسالہ بھی ہے گویا بنیاد کا پہلا پتھر ہے جس پر اصول فقہ کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے بعد ماہرین نے ادھر توجہ فرمائی اور ترتیب اصول میں مسلسل حصہ لیتے رہے۔

---

[1] اصول الفقہ ص ۵ اور ۶ طبع مصر

ایک غلطی کی اصلاح

برہان ماہ اکتوبر ۳۰ ۶۳ء (جلد ۷۱ شمارہ ۴) کے صفحہ ۲۸۰ پر حسب ذیل اصلاح فرمالیں۔

صفحہ ۲۸۰ سطر ۱۱ ۴۸ سال قبل غلط ہے۔ ۴۸ سال بعد ہونا چاہیے تھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تقسیم کے بعد

(۱۶)

از سعید احمد اکبر آبادی

فیکلٹی آف تھیالوجی کی ڈین شپ کا معاملہ!

کورٹ کی اسی میٹنگ (۲۵ راپریل ۱۹۶۵ء) میں ایک ایسا رزولیوشن بھی منظور ہوا جس کا اثر براہ راست مجھ پر پڑتا تھا۔ یہ بھی ایک دلچسپ روئداد ہے، آپ بھی سن لیجئے: یونیورسٹی میں پہلے سے یہ قاعدہ چلا آرہا تھا کہ جن شعبوں میں پروفیسر موجود ہوں گے وہ باری باری سے دو برس کے لئے اپنی فیکلٹی کے ڈین ہوں گے، لیکن جن شعبوں میں پروفیسر نہیں بلکہ ریڈر ہوں گے ان میں سے جو سینیر ریڈر ہوگا وہ فیکلٹی کا ڈین مستقل طور پر ہوگا اور جونیر ریڈر کبھی ڈین نہیں ہوگا۔ یہ قاعدہ یونیورسٹی کے دستور کی دفعہ (A) 18 کے ماتحت تھا۔ اور چونکہ فیکلٹی آف تھیالوجی میں اس وقت تک کوئی پروفیسر نہیں تھا اور سینیر ریڈر میں ہی تھا اس بنا پر اس دفعہ کی روشنی میں میں ہی مستقل ڈین تھا۔ مولانا سید علی نقی صاحب نقوی صدر شیعہ دینیات کے لئے ڈین ہونے کا کوئی موقع نہیں تھا اور زیدی صاحب اس کا حکم دے بھی چکے تھے۔ لیکن ۶۲ء کے عام انتخابات پارلیمنٹ و اسمبلی کے موقع پر ایسا ہوا کہ جرار حیدر صاحب ایڈوکیٹ جو یونیورسٹی کے مشیر قانونی بھی تھے وہ

اترپردیش اسمبلی کے لئے کانگرس کے ٹکٹ پر امیدوار تھے اور یونیورسٹی کا ترقی پسند طبقہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ ان کا حامی تھا۔ ان کے مقابلہ پر میرے مرحوم دوست ڈاکٹر محمد عبدالبصیر ریپبلکن پارٹی کے ٹکٹ پر اس سیٹ کے امیدوار کھڑے ہوئے تھے میں مرحوم کا حامی تھا اور میری وجہ سے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بھی ان کا حامی ہوگیا تھا۔ اور مسلمانوں نے اس سلسلہ میں غیر معمولی جوش وخروش اور کانگرس کے خلاف اپنی بیزاری کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں اگرچہ اصولاً کانگرس کا حامی رہا ہوں اور ہمیشہ اسی کو ووٹ دیتے ہیں، لیکن مسلسل فسادات اور اس سلسلہ میں حکومت کی بے عملی اور نااہلیت کا مجھ پر بھی اس درجہ اثر تھا کہ اپنے اس اصول کے خلاف میں نے دونوں سیٹوں پر ریپبلکن پارٹی کے امیدواروں کو ووٹ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور علانیہ اس کا اظہار بھی کردیا تھا۔ جرار حیدر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو میرا یہ فیصلہ سخت ناگوار تھا۔ ان کے بعض حامیوں نے جن میں بعض میرے عزیز دوست بھی تھے ہر چند کوشش کی کہ میں اپنا رویہ بدل دوں۔ لیکن جب میں نے ان کو مایوس کردیا اور ادھر الکشن میں ڈاکٹر عبدالبصیر نہایت شاندار طریقہ پر عظیم اکثریت سے کامیاب ہوگئے اور ان کے حریف جرار حیدر صاحب بہت بری طرح ناکام رہے تو ان کے دلوں میں میرے خلاف سخت غیض وغضب پیدا ہوگیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس واقعہ کے بعد یونیورسٹی کورٹ کی جو پہلی میٹنگ ہوئی اس میں جرار حیدر صاحب (جو پہلے سے کورٹ کے ممبر تھے ہی) نے مذکورہ بالا دفعہ (A) 8 میں ترمیم کی تجویز پیش کردی جس کا مقصد یہ تھا کہ ڈین شپ پروفیسروں کی طرح ریڈروں میں بھی دائر سائر رہے۔

مجھ کو اللہ تعالیٰ نے ان معاملات میں بڑا بے نیاز بنایا ہے، عہدہ اور منصب کی خواہش سے طبیعت ہمیشہ گریزاں رہی ہے، اس بنا پر کورٹ کی میٹنگ کے ایجنڈا میں جب میں نے یہ تجویز دیکھی تو یہ خیال تو ضرور ہوا کہ مجھ سے انتقام لیا جا رہا ہے، لیکن میں نے اس کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی، یہاں تک کہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی دونوں کورٹ

بر تھے میں نے ان سے بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میٹنگ میں یہ رزولیوشن
وحیدہ صاحب نے ایک پر زور تقریر کے ساتھ پیش کیا، متعدد حضرات نے اس کی تائید میں
ریریں کیں اور یہ تجویز منظور ہو گئی۔

قاعدہ کے مطابق اب اس تجویز کو مزید غور و فکر اور منظوری کے لئے اکزکٹو کونسل کے سامنے
ش ہونا چاہئے تھا۔ لیکن زیدی صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ دفعہ (A) ۱۸ میں ترمیم کا مقصد
ر آبادی سے انتقام لینے کے سوا کچھ اور نہ تھا اور انھیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ مولانا
سید علی نقی النقوی اپنے علم و فضل کے باوجود انگریزی سے ناواقفیت اور یونیورسٹی ایجوکیشن اور
منسٹریشن سے اجنبیت کے باعث ڈین شپ کا کام خاطر خواہ طور پر انجام نہیں دے سکیں گے
س بنا پر وہ اس کو پی کر بیٹھ گئے اور اکزکٹو کونسل کے سامنے اس کو نہیں رکھا یہاں تک کہ وہ
پنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر دہلی چلے گئے، میں ۱۹۶۲ء میں کنیڈا چلا گیا اور میری جگہ مولانا سید
ی نقی صاحب ڈین ہو گئے۔ جب میں ایک برس کے بعد کنیڈا سے واپس آیا تو مجھے یہ معلوم
ر کے حیرت ہوئی کہ کورٹ کی منظور کی ہوئی وہ تجویز اب تک کھٹائی میں پڑی ہوئی ہے اور
زکٹو کونسل کے سامنے پیش نہیں ہوئی، چنانچہ میں اب پھر ڈین ہو گیا، زیدی صاحب کے
ند بدر الدین طیب جی آئے، ان کے عہد میں بھی یہ تجویز یوں ہی پڑی رہی۔ لیکن اکزکٹو کونسل
ی وہ میٹنگ جو موصوف کے عہد کی آخری میٹنگ تھی اس کے ایجنڈہ میں یہ تجویز موجود تھی۔ اس
یٹنگ میں میں خود موجود تھا۔ جب بدر الدین طیب جی ایجنڈہ کی اس دفعہ پر پہونچے تو انھوں نے
س پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر منہ اٹھا کر فرمایا: "کورٹ نے یہ ترمیم ۱۹۶۲ء کے شروع میں منظور کی تھی
یکن اس وقت سے اب تک (۱۹۶۴ء کا آخر) یہ یوں ہی پڑی رہی اور اکزکٹو کونسل کے ایجنڈہ
پر نہیں آئی! معلوم نہیں یہ کیسے ہوا؟" اس کے بعد ذرا اپنی آواز کو بلند کر کے اور اپنی بات پر زور
یکر فرمایا: "اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟
یونکہ پوری یونیورسٹی میں اس کا اطلاق مولانا اکبر آبادی کے علاوہ اور کسی پر نہیں ہوتا۔" بعض

ممبروں نے اس کے خلاف بولنا چاہا مگر میں نے اشارہ سے ان کو منع کر دیا اور کہا کہ چلنے دیجئے، اس میں مضائقہ ہی کیا ہے؟ بدر الدین طیب جی کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے: "چونکہ یہ تجویز کورٹ میں مجھ سے پہلے کی ہے اس لئے میں خود کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں" اس کے بعد یہ تجویز منظور ہوگئی، اب قاعدہ کے مطابق اسے پھر کورٹ کی میٹنگ میں آنا تھا، چنانچہ نواب علی یاور جنگ کے چارج لینے کے بعد وہی ۲۵ راپریل ۶۵ء کو کورٹ کی جو میٹنگ ہوئی اور جس میں یہ سب کچھ ہنگامہ ہوا اسی کے ایجنڈہ پر یہ تجویز بھی تھی اور عجیب اتفاق ہے کہ ایجنڈہ کی کارروائی ابھی اس تجویز کے آئٹم تک پہونچی ہی تھی کہ یہ قیامت ٹوٹ پڑی اور کورٹ کی میٹنگ درہم برہم ہوگئی، لیکن بعد میں اس تجویز کو بھی منظور شدہ تسلیم کر کے ایجنڈہ کی کارروائی میں شامل کر لیا گیا۔

چونکہ یہ یونیورسٹی کے دستور کی ایک دفعہ میں ترمیم کا معاملہ تھا اس لئے اس کا نفاذ وزیٹر (صدر جمہوریہ) کی منظوری کے بغیر ہو نہیں سکتا تھا اسی بنا پر یہ تجویز وزیٹر کی خدمت میں روانہ کر دی گئی اور جب وہاں سے منظوری آگئی تو اب اس ترمیم شدہ دفعہ کے ماتحت اب مجکو از سر نو دو برس کے لئے پھر ڈین مقرر کیا گیا، یہ دو برس کی مدت ۶۷ء میں (غالباً اپریل یا مئی میں) پوری ہوئی، اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کا ذکر آئے گا۔

نواب صاحب کے اخلاق و عادات اور کارنامے

بدقسمتی سے مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً وزارتوں اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں اور مناصب میں ایسے مسلمانوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے جن سے اسلام کو اور مسلمانوں کو نقصان پہونچا ہے اور جو فکر و نظر اور کردار و عمل کے اعتبار سے "ننگ اسلام ہے ایسو کا مسلماں ہونا" کا مصداق ہیں۔ اگرچہ یہ کلیہ نہیں ہے، کیونکہ آزادی سے لے کر اب تک اگر آپ شمار کریں گے تو وزیروں، سفیروں اور حکومت کے دوسرے شعبوں اور صیغوں میں ایسے مسلمان بھی اچھی خاصی تعداد میں ملیں گے جن کا اسلام اور ایمان شک و شبہ سے بلند و بالا ہے، لیکن انسان کی فطرت ہے کہ وہ اچھے لوگوں کا اتنا شکر گذار اور مداح نہیں ہوتا جتنا برے لوگوں کا شکوہ سنج اور ان سے خائف ہوتا ہے اور چند افراد کے عمل پر ایک

یہ کا اطلاق کر دیتا ہے، اس بنا پر چونکہ نواب علی یاور جنگ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر رہ چکے تھے اس لئے ان کی نسبت بھی یونیورسٹی کے اسلام پسند حلقوں میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں اور انھیں مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن میرا اپنا تجربہ، مشاہدہ اور احساس یہ ہے کہ اصل حقیقت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ شعر:

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار 34092
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

پہلی بات تو یہ ہے کہ نواب صاحب لا مذہب ہرگز نہیں تھے، ان کا خاندان علم وفضل اور مشرقی و اسلامی روایات کے اعتبار سے ممتاز رہا ہے، تجدد کا رنگ کتنا ہی گہرا ہو، لیکن اصل خوبو مٹتے ہی مٹتی ہے، مجھ سے جب کبھی ملاقات ہوتی تھی، اکثر مذہب اور تاریخ اسلام پر گفتگو کرتے تھے، قرآن مجید اور تصوف کا ذوق اچھا تھا۔ انگریزی زبان میں "تبویب القرآن" کے طرز پر ایک کتاب بھی مرتب کر رہے تھے اور کبھی کبھی اس سلسلہ میں مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں جب مجھکو صدر جمہوریہ کی طرف سے عربی میں اوارڈ ملا اور ان کو اس کا علم ہوا تو فوراً ایک عنایت نامہ انگریزی میں لکھکر مجھکو گرمجوشی سے مبارک باد دی اور لکھا: میری رائے میں یہ اوارڈ آپ کو بہت پہلے ملنا چاہئے تھا، کیونکہ آپ اس کے بہمہ وجوہ مستحق تھے۔ مشہور یہ تھا کہ نواب صاحب جب جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کے وائس چانسلر تھے تو وہاں "شعبۂ دینیات" کا خاتمہ انھیں کے زمانہ میں ہوا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اول تو خاتمہ کی حقیقت کیا ہے؟ کیونکہ کلکتہ کے قیام کے زمانہ میں میں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات کے ماتحت ایک مرتبہ ایک پی ایچ۔ ڈی کے مقالہ کا ممتحن ہوا تھا اور زبانی امتحان کے لئے حیدرآباد بھی گیا تھا۔ اور اب تو وہاں اسلامک اسٹڈیز ڈپارٹمنٹ بھی ہے جو کافی ترقی یافتہ اور کامیاب ہے۔ اور اگر یہ شعبہ ختم بھی کر دیا گیا ہے تو اس میں نواب صاحب کا دخل کہاں تک ہے، بہرحال علی گڑھ یونیورسٹی کا تو میرا اپنا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ نواب صاحب نے فیکلٹی آف

تھیالوجی کے کسی کام میں نہ صرف یہ کہ کبھی کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی بلکہ اس کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے رہے اور اس کی ترقی کے لئے میں نے جس کسی چیز کا مطالبہ کیا انھوں نے خوش دلی اور فراخ حوصلگی سے اس کی تائید کی۔

فیکلٹی آف تھیالوجی میں پروفیسر شپ

چنانچہ فیکلٹی آف تھیالوجی میں پروفیسر شپ ان کے عہد میں ہی منظور ہوئی، لیکن کس طرح؟ اس کی روداد بھی دلچسپ ہے سن لیجئے! جب میں نے محسوس کیا کہ فیکلٹی اب یونیورسٹی کی دوسری فیکلٹیوں کی طرح کافی منظم، مرتب اور ترقی یافتہ ہوگئی ہے تو میں نے اس میں دو پروفیسر شپ کا مطالبہ کیا اور فیکلٹی کی دوسری تجویزوں کے ساتھ یہ تجویز وائس چانسلر کے پاس بھیجدی گئی۔ ضابطہ کی خانہ پری کرنے کے بعد وائس چانسلر نے حسب قاعدہ یہ تجویز یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو روانہ کردی۔ کچھ دنوں کے بعد پنج سالہ منصوبہ کے سلسلہ میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے مطالبات کی جانچ پڑتال کی غرض سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ایک تحقیقاتی کمیٹی آئی اور اس نے ہر فیکلٹی اور ہر شعبہ میں جاجاکر ان کے مطالبات پر گفتگو اور تحقیق کی، ایک روز یہ کمیٹی ہمارے ہاں بھی آئی اور میں نے ڈین کی حیثیت سے سنی اور شیعہ دونوں شعبوں کے اسٹاف کے ...... ساتھ کمیٹی سے بات چیت کی اور اس کو جو معلومات درکار تھیں وہ سب بہم پہونچائیں، کمیٹی نے طلبار کی تعداد، امتحانات اور ان کے نتائج پی ایچ ڈی کے طلبار کی تعداد، پیریڈ اور سالانہ بجٹ وغیرہ یہ سب دیکھنے کے بعد کہا کہ آپ کا پروفیسر شپ کا مطالبہ بجا ہے، لیکن کمیشن ایک ہی پروفیسر شپ دے سکتا ہے، دو کی گنجائش نہیں ہے، اب آپ یہ بتائیے کہ سنی یا شیعہ ان دونوں شعبوں میں سے کس شعبہ کو دی جائے۔ میں نے جواب دیا: اس معاملہ میں میری پوزیشن بہت نازک ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا، اس کا فیصلہ آپ خود کیجئے۔

اس گفتگو کے بعد کمیٹی رخصت ہوگئی، دوسرے دن وائس چانسلر صاحب نے ان کی موجودگی میں کمیٹی سے گفتگو کرنے کے لئے تمام فیکلٹیوں کے ڈین صاحبان کو مدعو کیا۔ میں بھی اس میٹنگ میں

موجود تھا، جب میری باری آئی تو میں نے فیکلٹی کی تجویز کے مطابق دو پروفیسر شپ پر ہی اصرار کیا۔ لیکن کمیٹی نے اب بھی وہی بات کہی جو مجھ سے پہلے کہی تھی اور دریافت کیا کہ یہ ایک پروفیسر شپ کس شعبہ کو دی جائے۔ میں نے اسی پہلے جواب کا اعادہ کیا تو وائس چانسلر نے مجھ سے فرمایا: آپ ڈین کی حیثیت سے بتا سکتے ہیں کہ دونوں شعبوں میں سے کونسا شعبہ پروفیسر شپ کے لئے قابل ترجیح ہے۔ میں نے عرض کیا: میں بتا سکتا ہوں لیکن بتانا نہیں چاہتا۔ مجکو اس امر میں بالکل معذور سمجھئے۔ میرے اس جواب کے بعد وائس چانسلر صاحب نے سرگوشی کے انداز میں کمیٹی کے ممبروں سے کوئی بات کہی جس کو میں فاصلہ پر ہونے کے باعث سن نہیں سکا اور اب میرا کام ختم ہوگیا۔ میٹنگ سے باہر نکلنے کے بعد کامرس اور قانون کے پروفیسر صاحبان جو میرے بے تکلف عزیز دوست تھے انھوں نے مجھ سے شکایت کی کہ میں نے متعین طور پر کسی شعبہ کا نام کیوں نہیں لیا، اور میں کیوں شرما گیا۔ میں نے کہا: آپ کی شکایت بجا ہے، لیکن میرا ضمیر اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

کمیٹی اپنا کام ختم کر کے چلی گئی اور اس نے اپنی سفارشات کے ساتھ رپورٹ کمیشن کو پیش کر دی، نتیجہ یہ ہوا کہ جب کمیشن کی طرف سے یونیورسٹی کی دوسری فیکلٹیوں کے مطالبات کے متعلق اس کے فیصلوں کا اعلان ہوا تو اس نے فیکلٹی آف تھیالوجی کو بھی ایک پروفیسر شپ دے دی اور کسی شعبہ کا خود کوئی تعین نہیں کیا۔ اسے یونیورسٹی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ اس طرح اللہ کا شکر ہے فیکلٹی کو پروفیسر شپ، علاوہ اور چند جگہوں کے مل گئی اور اس میں شبہ نہیں اس میں جناب نواب صاحب کی ہمدردی اور توجہ کو بڑا دخل ہے۔ لیکن ابھی معاملہ یہیں تک پہونچا تھا کہ میری ڈین شپ کے دو برس پورے ہو گئے اور مولانا سید علی نقی النقوی ڈین مقرر ہو گئے اور ادھر جناب نواب صاحب اپنے عہدہ سے قبل از وقت سبکدوش ہو کر علی گڑھ سے تشریف لے گئے اور پروفیسر عبدالعلیم وائس چانسلر ہو گئے۔ اب کمیشن کے فیصلہ کو بروئے کار لانے کا وقت آیا تو وائس چانسلر نے مولانا سید علی نقی صاحب کو لکھا کہ فیکلٹی آف تھیالوجی کے پروفیسر کی پوسٹ کا اعلان کرنا ہے، آپ

اس کے لئے ضروری شرائط لکھکر بھیجدیجئے۔ مولانا کو دوسرے بہت سے حضرات کی طرح اس بات کا یقین تھا کہ یہ پروفیسر شپ سنی دینیات کے حصہ میں ہی آئے گی، اسی بنا پر اصل بات کا جواب دینے کے بجائے انھوں نے لکھا کہ یہ پروفیسر شپ ایک ہی شعبہ کو مل سکتی ہے دوسرا شعبہ اس سے محروم رہے گا اور اس کی وجہ سے ملک میں سنی شیعہ کی بحث پیدا ہو جائے گی اور یہ چیز یونیورسٹی کی روایات اور اس کی شہرت و وقار کے منافی ہوگی، اس بنا پر بجائے ایک کے دو پروفیسر شپ ہونی ضروری ہیں" مولانا کا منشا یہ تھا کہ ہوں تو دو ہوں، ورنہ اس ایک جگہ کو خالی رکھا جائے گویا وہی مثل ہوئی: "یا کھائیں گے گھی سے، نہیں تو جائیں گے جی سے" مجکو معلوم تھا کہ کیا کاروائی ہو رہی ہے، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا۔ میں اس قسم کی چیزوں سے جو عہدۂ و منصب سے تعلق رکھتی ہوں کبھی دلچسپی نہیں لیتا۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی میں بالکل خاموش اور الگ تھلگ رہا۔ مولانا علی نقی صاحب سے اس موضوع پر کبھی کوئی بات ہی نہیں کی۔ اسی طرح علیم صاحب کو نہ کوئی تحریر بھیجی، نہ خط لکھا اور نہ زبانی کچھ کہا اور نہ کسی اور سے اس کا تذکرہ کیا۔

بہرحال علیم صاحب نے مولانا سید علی نقی صاحب کے خط کا اثر لیا —— اور ایک مرتبہ رجسٹرار صاحب سے گفتگو کے دوران میں یہ بھی کہا کہ میں کیا کروں! یہ سب کیا کرایا تو اکبر آبادی صاحب کا ہی ہے۔ اگر وہ یونیورسٹی گرانٹس کیشن کی کمیٹی سے یہ کہدیتے کہ پروفیسر شپ سنی دینیات کو چاہیئے تو یہ سارا خرخشہ ہی کیوں پیدا ہوتا مگر اس وقت وہ (اکبر آبادی) اپنے حسن اخلاق اور مروت کا شکار ہو گئے —— چنانچہ علیم صاحب نے یہ کیا کہ اب جو اکزکٹو کونسل کی میٹنگ ہوئی اس میں یہ تجویز پیش کر دی کہ اکبر آبادی اور مولانا علی نقی دونوں کو شخصی طور پر پروفیسر مقرر کیا جاتا ہے اور یہ تجویز باتفاق آرا منظور ہو گئی، لیکن جب یہ تجویز منظوری کے لئے گرانٹس کمیشن کو بھیجی گئی تو اس نے اس پر اعتراض کیا اور اس کی وجہ یہ لکھی کہ (۱) پروفیسر شپ تو ایک منظور ہوئی ہے، دوسری پروفیسر شپ کی تنخواہ کہاں سے آئے گی اور (۲) دوسری وجہ یہ لکھی کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی بالکل واضح ہدایت ہے کہ کسی پروفیسر کا تقرر اخبارات میں پوسٹ کے اشتہار

اور پھر اس کے بعد سلکشن کمیٹی کے بغیر ہرگز نہیں ہوسکتا۔ علیم صاحب کے سامنے جب کمیشن کا یہ خط پیش ہوا تو انھوں نے اس کے جواب میں رجسٹرار کو اس مضمون کا خط بھیجنے کی ہدایت کی کہ پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ آپ نے ایک پروفیسر کی تنخواہ کے لئے جو رقم منظور کی ہے ہم نے اسی رقم کو دونوں پر تقسیم کر دیا ہے اور ہم نے حساب لگا کر دیکھ لیا ہے کہ یہ رقم کافی ہو جائے گی، مزید درکار نہ ہوگی، اب رہا دوسرا اعتراض! تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں شخص غیر معمولی شہرت اور قابلیت کے لوگ ہیں چنانچہ جب ریڈر کی پوسٹ پر ان کا تقرر ہوا تھا تو اس وقت بھی ان کی درخواست کے بغیر ان کو یہ پوسٹ پیش کی گئی تھی، اس لئے اب بھی ان کو اس قاعدہ اور ضابطہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

یونیورسٹی کے اس خط کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو اطمینان ہو گیا، اس نے اپنا اعتراض واپس لے لیا اور اکزکٹو کونسل کے رزولیوشن کی منظوری بھیجدی۔ اب ہم دونوں پروفیسر ہو گئے تھے۔ لیکن میں اپنی بات کہتا ہوں کہ مجکو اس طرح پروفیسر ہونے کی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنا رنج اور افسوس اس بات سے ہوا کہ یہ پروفیسرشپ محض شخصی اور ذاتی تھی، یعنی ہم دونوں کی ریڈر کی پوسٹ کو بڑھا کر (up graded) پروفیسر کی پوسٹ کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک شخص کا ذاتی اعزاز و اکرام ضرور ہے لیکن اس سے سنی اور شیعہ دونوں میں کسی شعبہ کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ فائدہ اس وقت ہوتا جب کہ ہمارے پروفیسر ہو جانے سے ہماری ریڈر کی پوسٹ قائم رہتی اور ان پر کسی کا تقرر ہوتا۔ اور اس طرح ہر شعبہ کو ایک ایک ریڈر مل جاتا۔ بدرالدین طیب جی اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ ایک مرتبہ جب انھوں نے اسی طرح شخصی طور پر پروفیسر بنانا چاہا تو میں نے بلا تامل شکریہ کے ساتھ اس سے انکار کر دیا۔ اور عرض کیا کہ میں اپنا ذاتی فائدہ نہیں بلکہ فیکلٹی کا فائدہ چاہتا ہوں اس لئے آپ فیکلٹی میں پروفیسر کی مستقل پوسٹ قائم کرائیے۔ اگر وہ ہوتی ہے تو سبحان اللہ! ورنہ مجکو اس کی ضرورت نہیں۔ بدرالدین طیب جی اس سلسلہ میں تحریک کرنا چاہتے ہی تھے کہ وہ یہاں سے رخصت ہو گئے، اب دیکھ لیجئے ہم دونوں کے

شخصی طور پر پروفیسر ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہٹتے ہی فیکلٹی پھر وہیں لوٹ گئی جہاں پہلے تھی، یعنی سنی اور شیعہ میں ایک ایک ریڈر اور باقی سب لکچرر، پروفیسر ندارد۔ پوری یونیورسٹی میں تنہا یہی ایک فیکلٹی ہے جس کے اسٹاف کی یہ نوعیت ہے، ۱۹۷۲ء ایکٹ کے سلسلے میں گورنمنٹ کو اسلامیات نوازی کے بڑے بڑے بلند بانگ دعاوی ہیں، لیکن جب فیکلٹی آف تھیالوجی کا یہ عالم ہو تو پھر ان دعاوی میں کیا وزن باقی رہتا ہے؟ بہرحال مولانا سید علی نقی صاحب خوش ہوں گے کہ وہ دو برس کے لئے ڈین ہوئے تھے تو اس سے انھوں نے یہ فائدہ حاصل کر لیا کہ آئے تھے ریڈر ہو کر اور یہاں سے گئے پروفیسر ہو کر! لیکن میرے دل میں اس کی جو خلش ہے وہ اب تک دور نہیں ہوئی۔

وللناس فیما یعشقون مذاہب

نواب صاحب سے ۲۵ اپریل والے واقعہ کے سلسلہ میں جو غلطی یا بھول چوک ہوئی وہ ہوئی لیکن جہاں تک کہ یونیورسٹی کے اسلامی کردار کا تعلق ہے میں نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ نواب صاحب نے اس کو کلاً یا جزواً اس کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہو، یونیورسٹی کی جو روایات اب تک چلی آرہی تھیں وہ ان کے عہد میں بھی قائم اور برقرار رہیں اور یونیورسٹی کی ملازمت اور طلباء میں مسلمانوں کا جو تناسب پہلے تھا اس میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی، نواب صاحب صرف نام کے نہیں بلکہ حقیقۃً نواب تھے، زندگی بڑے ٹھاٹھ سے بسر کرتے تھے، لیکن تھے بڑے خلیق، ملنسار اور خوش طبع، ہر شخص ان کے پاس بے تکلف آجا سکتا تھا اور وہ ہر شخص سے اس کی طرف پورے طور پر متوجہ ہو کر گفتگو کرتے اور اس کی بات سنتے تھے، وائس چانسلر کی حیثیت سے اپنے مفوضہ فرائض و واجبات بڑی سوجھ بوجھ اور محنت و استقلال کے ساتھ انجام دیتے تھے، میں نے بارہا دیکھا ہے کہ رات کو دس گیارہ بجے تک کسی میٹنگ میں بیٹھے ہیں یا رجسٹرار وغیرہ کو لئے فائل دیکھ رہے ہیں۔

لازمین یونیورسٹی کے لئے ایوننگ کالج

نواب صاحب نے یونیورسٹی میں جو اصلاحات کیں ان میں ایوننگ کالج کا قیام خاص طور پر بہت اہم ہے، نواب صاحب نے یہ محسوس کیا کہ یونیورسٹی کے بنیادی طور پر عناصر ترکیبی دو ہی ہیں ایک اساتذہ اور دوسرا

انتظامیہ (Administrative staff) لیکن ان دونوں میں یہ فرق بہت نمایاں ہے کہ اساتذہ کے لئے ترقی کے بڑے سے بڑے مواقع ہیں، جو شخص آج لکچرر ہے کل وہ ریڈر اور پرسوں پروفیسر ہو سکتا ہے، کسی اور بڑی پوسٹ پر بھی جا سکتا ہے۔ لیکن انتظامیہ کے لوگوں کے لئے اس طرح کی ترقی کے لئے کوئی موقع نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جس قدر محنت اور جاں نشانی یہ لوگ کرتے ہیں تعلیمی اسٹاف نہیں کرتا۔ گویا یونیورسٹی اگر ایک مشین ہے تو اس کے کل پرزے یہی لوگ ہیں، لیکن محض تعلیمی سندات میں کمتر ہونے کے باعث ان کی آج وہ گت ہے جو قابل رحم ہے، ان امور کے پیش نظر نواب صاحب نے ان ملازمین کے لئے ایک ایوننگ کالج کا اجرا کیا جس میں آرٹس، کامرس وغیرہ سب کی تعلیم بی۔ اے تک ہوتی ہے، اس کے بعد اگر کوئی ایم اے یا ایم کام کرنا چاہے تو ملازمت کے ساتھ وہ بھی کر سکتا ہے، اس کالج کا فیض عام اور عظیم ہے۔ کل جو کلرک صرف ہائی اسکول تھے آج وہ ایم۔ اے، ایم کام، یا ال۔ ال۔ بی ہیں اور ترقی کے راستہ پر گامزن ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام رفاہ عام کا ہے، لیکن میں نے اس چیز کو کبھی پسند نہیں کیا اور ایک مرتبہ اکاڈمک کونسل کی میٹنگ میں میں نے اس کے خلاف تقریر بھی کی تھی، میرا خیال یہ ہے کہ اس کالج کے ذریعہ افراد و اشخاص کو فائدہ پہونچ رہا ہے، لیکن یونیورسٹی کا نقصان ہو رہا ہے، کیونکہ جو کلرک صبح ½ ۹ بجے سے شام ۵ پانچ بجے تک دفتر میں بیٹھ کر کام کرے گا اور اس کے بعد فوراً پانچ بجے سے رات کے آٹھ نو بجے تک کالج میں تعلیم حاصل کرے گا اس سے یہ توقع بمشکل کی جا سکتی ہے کہ وہ دفتر کا کام یکسوئی، محنت اور حاضر حواسی کے ساتھ کرے گا۔ میں نے بعض کلرکوں کو دیکھا ہے کہ وہ دفتر کے اوقات میں بھی کورس کی کتابیں لئے بیٹھے رہتے ہیں، علاوہ ازیں جب وہ اس قدر محنت کریں گے تو ان کی دماغی اور جسمانی صحت کا کیا عالم ہوگا؟ بلکہ میں نے اکاڈمک کونسل کے جلسہ میں یہ بھی کہا تھا کہ اس کالج نے کلرکوں کی ازدواجی زندگی کو بھی سخت متاثر کیا ہے، اور گھروں میں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔

سمسٹر سسٹم

نواب صاحب کی دوسری اہم اصلاح سمسٹر سسٹم کا اجراء ہے، یہ سسٹم امریکہ کی پیداوار اور وہاں کے نظام تعلیم کا جزو لاینفک ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم

کی واقفیت لگے بندھے چند مضامین کے دائرہ کے اندر محدود و مقید نہ رہے۔ بلکہ اس کے سامنے مضامین و موضوعات کا ایک نہایت وسیع میدان ہو اور اس کو اس امر کی پوری آزادی ہو کہ وہ اپنے رجحان اور فطری استعداد و صلاحیت کے مطابق جو مضامین چاہے اختیار کرلے۔ علاوہ ازیں آج کل کا زمانہ سائنس اور ٹکنالوجی کا ہے۔ ہر شخص کا رجحان انھیں کی طرف ہے، لیکن اب تجربہ کے بعد یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص صرف سائنس اور ٹکنالوجی کا ہو جائے اور علوم انسانیت (Humanities) میں سے کسی علم کے ساتھ اس کا واسطہ نہ ہو تو وہ صرف ایک مشین بن کر رہ جائے گا اور انسانیت کے اقدار عالیہ جن پر تہذیب و ثقافت اور زندگی میں شائستگی و خوش مذاقی کا دار و مدار ہے ان سے اس کو بُعد رہے گا۔ اسی طرح اگر ایک شخص محض علوم انسانیت کا طالب علم ہو اور سائنس سے بالکل لاعلم اور ناواقف ہو تو اس میں تہذیب اور ثقافت ضرور ہوگی، لیکن دنیا کی ترقی اور کائنات کی وسعت و گیرائی کا محرم راز نہ ہوگا۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ سائنس اور علوم انسانیت ان دونوں کو خلط ملط کر دیا جائے، چنانچہ کسی نے تعلیم کی بڑی اچھی اور جامع تعریف کی ہے کہ: To Know every thing abaut Something and Some thing abaut every thing

یعنی ایک چیز کے متعلق سب کچھ جاننا اور ہر چیز کے متعلق کچھ کچھ جاننا۔ سمسٹر سسٹم کی بنیاد اسی اصول پر ہے، چنانچہ اس کے ماتحت ایک مضمون خاص ہوتا ہے جس میں طالب علم کو تکمیل کرنی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ دوسرے مضامین بطور توابع (Subsidiary Subgects) کے ہوتے ہیں۔ پھر پرانا سسٹم حصولی (Receptive) زیادہ تھا اور تخلیقی (creative) کم۔ سمسٹر سسٹم اس کا الٹ ہے۔ اس سسٹم کے ماتحت طالب علم کو ہر مضمون سے متعلق بار بار کتابوں کا مطالعہ کر کے مضامین لکھنے ہوتے ہیں جن کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ ان پر اس کو نمبر دیے جاتے ہیں اور یہ نمبر سالانہ امتحانات میں محسوب ہوتے ہیں، اس سسٹم کے ماتحت امتحانات کا پرانا طریقہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے، ایک تعلیمی سال کو دو ٹرم پر تقسیم کرتے ہیں اور ہر ٹرم کے خاتمہ پر اس

کا امتحان ہوتا ہے، اس طرح پورا امتحان بیک وقت نہیں، بلکہ بتدریج ہوتا ہے اور ہر ٹرم کے امتحان کے بعد ہر طالب علم کو یہ معلوم رہتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور اس کی ترقی کی رفتار کیا ہے، اگر اس میں کوئی خامی یا کمی ہوتی ہے تو وہ باقی ٹرموں کے امتحان کے لئے زیادہ مستعدی اور توجہ سے تیاری کرتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر ٹرم کے سب پرچوں میں وہ شریک ہی ہو۔ اگر کسی ایک پرچے میں خاطر خواہ تیاری کے نہ ہونے یا کسی اور مجبوری کے باعث وہ شریک نہیں ہو سکا ہے تو اسے اختیار ہے کہ آیندہ سال کے یا اس کے بعد اس ٹرم کے اس پرچہ میں شریک ہو۔ اسی طرح ٹرموں میں ترتیب بھی ضروری نہیں ہے وغیرہ وغیرہ، غرض کہ اس سسٹم کے ماتحت مضامین میں غیر معمولی وسعت کے ساتھ امتحانات میں اس درجہ نرمی اور لچک ہے کہ اگر اب بھی کوئی طالب علم ناکام ہوتا ہے یا اس کا ڈویژن اچھا نہیں ہے تو اس کو طالب علم کی بد قسمتی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اس طالب علم سے آیندہ کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

ملک میں جو تعلیمی تجربے ہو رہے ہیں ان کی وجہ سے ماہرین تعلیم کا عام رجحان اس سسٹم کی طرف روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا، نواب علی یاور جنگ نے اس کو بھانپ لیا اور ان کو اس کا ارمان پیدا ہوا کہ ان کے عہد میں اور ان کی سربراہی میں یہ سسٹم جلد از جلد یونیورسٹی میں جاری ہو جائے، تاکہ اس معاملہ میں اولیت کا سہرا دو ایک یونیورسٹیوں کی طرح مسلم یونیورسٹی کے بھی سر رہے، چنانچہ انھوں نے اپنی تمام تر توجہات اس پر مرکوز کر دیں، اس مقصد کے لئے ہر فیکلٹی میں کمیٹیاں بنیں، ایک بڑی کمیٹی بنی جو سب پر مشتمل تھی اور ہر چیز میں نہایت عجلت سے کام لے کر اس اسکیم کو جھٹ پٹ نافذ کر دیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس اسکیم کا اصل مصنف امریکہ ہے اور وہاں اور کینیڈا وغیرہ میں یہ بہت کامیاب ہے۔ اس کامیابی کی وجوہ یہ ہیں کہ (۱) ان لوگوں کے پاس فنڈ کی کوئی کمی نہیں۔ یہ لوگ تعلیم پر بے تحاشا خرچ کرتے ہیں (۲) ان ملکوں کے طلبا صحیح معنی میں طالب علم ہوتے ہیں، دل لگا کر پڑھتے اور اپنے مضمون کا ذوق رکھتے ہیں، وہاں اعلیٰ تعلیم برائے فیشن نہیں (۳) وہاں کے اساتذہ بے حد محنتی، اپنے فن کے

ماہر اور مخلص ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ایماندار اتنے کہ امتحان میں ان کا بیٹا بیٹھا ہو یا دشمن کا بیٹا بہرحال اس کو نمبر اتنے ہی ملیں گے جن کا وہ حقدار ہے، اس سے نہ ایک نمبر کم اور نہ ایک نمبر زیادہ! اس کے برخلاف بدقسمتی سے ہمارے ہاں ان تینوں چیزوں میں سے ایک چیز بھی نہیں ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ کی نقالی میں اپنے ملک اور اپنے سماج کے حالات سے صرف نظر کرکے یہ سسٹم جاری تو کر دیا گیا ہے، لیکن بجائے فائدہ کے نقصان پہونچ رہا ہے، تعلیمی اسٹنڈرڈ گر گیا ہے، اور اس کا اعتبار کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس سسٹم کے ماتحت ہر مضمون کا امتحان داخلی بھی ہوتا ہے اور خارجی (Internal and External assesment) بھی، لیکن یہ بارہا دیکھا گیا ہے کہ جو طالب علم خارجی امتحان میں 30 فی صد نمبر حاصل کرتا ہے وہی داخلی امتحان میں 70 فی صد نمبر حاصل کر لیتا ہے، علاوہ ازیں اس سسٹم میں ابھی تک کچھ ایسی پیچیدگیاں ہیں جو اب تک دور نہیں ہو سکی ہیں، اس بنا پر اس اسکیم کے جاری ہونے کے دو برس بعد ہی یونیورسٹی کے اساتذہ کا ایک بڑا طبقہ اس کا سخت مخالف ہو گیا تھا اور وہ اکاڈمک کونسل میں اس کو ختم کرنے کا رزولیوشن لانے والا تھا۔ لیکن وائس چانسلر (ڈاکٹر عبدالعلیم) نے اپنا ذاتی اثر ورسوخ استعمال کرکے کسی مصلحت سے اسے رکوا دیا، علی گڑھ کے بعد اس سسٹم کا اجرا دہلی یونیورسٹی میں بھی ہوا اور وہاں بھی اس کا حشر وہی ہوا جو علی گڑھ میں ہو چکا ہے۔ دلی یونیورسٹی میں بھی اساتذہ اور طلبا کی ایک بڑی تعداد اس سسٹم کے ختم کر دینے کے حق میں ہے۔ اس شور وغوغا کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو یونیورسٹیاں اس سسٹم کو اپنے ہاں رائج کرنے کا ارادہ کر رہی تھیں وہ چپ سادھ بیٹھ گئی ہیں۔

دراوڑی دور میں تہذیب و ثقافت
اور
صنعت و تجارت کا تدریجی ارتقاء

(۲)

از جناب سید امین الدین صاحب جلالی شاہجہانپوری

دراوڑوں کی سماجی حالت اس عہد قدیم میں انسانی زندگی صحرائیت و بدویت چھوڑ کر مدنیت کے دائرہ میں قدم رکھ رہی تھی اس لئے سماجی کیفیت پر اس وقت کے ماحول کے مطابق نظر ڈالنی چاہیئے ایک قوم اور ایک ہی نسل گر صدہا مختلف تہذیبی ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ علاقائی قبیلہ کا سردار شہری ریاستوں کا حاکم اعلیٰ اور مذہبی پیشوا بھی ہوتا تھا جو عام آبادی سے کچھ فاصلہ پر کسی بلند جگہ پر رہا کرتا تھا اس حاکم اور اس کی کونسل کے فیصلے سرکاری قوانین کا درجہ رکھتے تھے لیکن وہ فیصلے رسم و رواج کی حدود سے باہر نہیں ہوتے تھے اس وقت کی سوسائٹی اس سے ہٹ کر کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتی تھی اس قسم کی شہری ریاستوں کی فرماں روائی کی تشبیہ پنچایت راج سے قریب ترین تشبیہ ہو سکتی ہے، یہ اندازہ بھی لگایا گیا ہے کہ پوری ریاست کے سماجی ماحول میں یکسانیت نہ تھی بلکہ ہر شہر و قصبہ کی سماجی کیفیت اور سوشل زندگی قدرے مختلف تھی، یہ فطری طور پر صلح جو اور امن پسند تھے چھوٹی چھوٹی علاقائی ریاستوں میں منقسم ہونے کے باوصف ان کے باہمی تعلقات اکثر و بیشتر خوش گوار رہتے تھے انفرادی طور پر بھی ہمسایوں سے ان کا سلوک اچھا ہی رہتا تھا یہاں تک کہ باہمی جھگڑوں سے بچنے

کے لئے مکانوں کے درمیان کافی فاصلہ رکھا جاتا تھا رقص و سرود کا مذاق ان کی گھٹی میں پڑا تھا بلکہ اس کو کسی قدر مذہبی تقدیس بھی حاصل تھی اس فرقہ نے خوش آہنگ ساز بھی ایجاد کرا دیئے تھے، قبرستانوں کے نشانات منظرِ عام پر آنے سے مردوں کو دفن کرنے کا اندازہ لگایا گیا ہے ایرین کا شروع دور بھی اسی کی نشاندہی کرتا ہے، مرد و زن کا لباس مختصر سا ہوتا تھا گھٹنے تک لہنگے، کمر پر پٹی اور سر پر ڈالنے کے لیے پنکھے کی شکل کی کوئی چیز ہوتی تھی، مرد صرف دھوتی باندھتے تھے ایرین میں دھوتی کا رواج ان سے اختلاط کا نتیجہ کہا جاتا ہے بالوں کے سنوارنے کا عام رواج تھا مردوں کے بال پیچھے نما ہوتے تھے چہروں پر داڑھی ہوتی تھی۔ ایرین میں ان کے اثر سے داڑھی رکھنے کا رواج بڑھ گیا تھا لیکن ان کی مونچھیں بڑی بڑی ہوتی تھیں، پردہ کا رواج نہ تھا۔ ؎

عام مجالس، تفریحات، سیر و شکار اور خصوصاً رقص و سرود میں عورتیں مردوں کے ساتھ شریک ہوتی تھیں، زیورات کے مرد و زن دونوں ہی دلدادہ تھے چوں کہ اس سے امارت و شخصیت کا اظہار ہوتا ہے اس لئے شہری اور ریاستی حکام کے لئے زیورات لازمی سے بن گئے تھے، دراوڑی تہذیب اور ماحول کے اثرات کی بنا پر ایرین راجاؤں میں بھی شخصیت و امارت کی نمائش کے لئے زیورات کا استعمال ترقی پر رہا، اور دربار کی شان و شوکت اور امارت و حیثیت قیمتی موتیوں و رنادر جواہرات کی مالاؤں اور بھاری بھرکم سونے کے سادہ اور مرصع زیورات سے کی جانے لگی کھدائیوں میں اگرچہ کانسہ کے ظروف بھی ملے ہیں مگر مٹی کے منقش برتنوں کا زیادہ رواج تھا، دعوتوں اور تقاریب میں علاحدہ علاحدہ پتوں پر کھانا پرسا جاتا تھا، باہمی اختلاط کی بنا پر ایرین نے اس رسم اور طریقہ کو ایسا اپنایا کہ آج بھی عوام میں وہی طریقہ مروج ہے مبصرین رسم و رواج کی یہ رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ہند کے بہت سے موجودہ رسوم و رواج دراوڑین کے سماجی رسوم کا مکمل عکس اور چربہ ہیں۔ ابتدائی کھدائیوں میں کسی مکتب و مدرسہ کی عمارت کے نشان نہ ملنے سے اہلِ قیاس نے اندازہ لگایا ہے کہ تعلیمی سلسلہ گھریلو انداز پر تھا مذہبی پیشوا، شہری ریاستوں کے حاکمِ اعلیٰ اور اُن کے مشیروں کے لئے زیورِ تعلیم سے آراستہ

؎ عہدِ قدیم مشرق و مغرب

ہونا ضروری تھا۔ طبی آلات کی دستیابی سے مبصرین نے ان کی ایجادی صلاحیت کے ساتھ حفظانِ صحت کی تعلیم کے خصوصی انتظام کا اندازہ قایم کیا ہے۔ ایرین دور میں بھی تقریبًا پانچ سو برس تک مدارس کا وجود نظر نہیں آتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے یہاں بھی گھریلو تعلیم کا طریقہ اس تمام عرصے میں جاری رہا، آزاد زندگی کی بنا پر یہ سیر و شکار، اور سیر و تفریح کے بڑے شوقین تھے، جانور لڑانے خصوصًا مرغوں اور تیتروں کی پالی سے خاص دلچسپی تھی، دوسرے جانوروں کی لڑائیوں کا اہتمام بھی میلوں ٹھیلوں کے انداز پر کیا جاتا تھا، پرندے بڑے شوق سے پالتے اور اُن کے پروں کو گوناگوں رنگوں سے رنگتے تھے جوا سماج کی نظر میں معیوب نہ تھا جو چوکور اور مکعبی پانسوں سے کھیلا جاتا تھا، پانسہ کے ہر حصہ پر ایک سے چھ تک نمبر پڑے ہوتے تھے اور ان ہی نمبروں کی اُلٹ پھیر یا ترتیب سے ہار جیت کا فیصلہ ہوتا تھا، گولیاں کھیلنے کا موجودہ رواج اسی دورِ قدیم کی یادگار کہا جاتا ہے، غذا میں ہر قسم کے جانور کا گوشت شامل تھا، مچھلی مرغوب ترین غذا تھی، چھوٹے موٹے شکار کے لئے شکاری کتے پالنے کا عام رواج تھا نشیلی چیزوں کے استعمال میں مرد و زن برابر کے شریک تھے، شادی بیاہ کا سلسلہ قریبی رشتہ داروں تک محدود نہ تھا اور خاندانی رسم و رواج کے مطابق انجام پاتا تھا عقد بیوگان معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا جس کے اثرات ابتداءً ایرین میں بھی موجود رہے ہیں، بیک وقت متعدد عورتیں رشتۂ ازدواج میں منسلک رہ سکتی تھیں لیکن داشتاؤں کا رواج قطعًا نہ تھا، ناپ تول پتھر کے اوزان سے ہوتی تھی۔ سکوں کی عدم موجودگی کے باعث جنس کا باہمی تبادلہ مروج تھا خرید و فروخت، لین دین اور ناپ تول میں یہ فطرتًا بڑے ایماندار تھے، ساتھ ہی صادق القول اور وعدہ کے پختہ بھی، چوری، ڈکیتی اور اغوا کے جرائم شاذ و نادر ہی ہوتے تھے، عورتیں وفاداری اور خدمت گزاری کے جذبہ سے اگرچہ معمور تھیں لیکن سماج میں اُن کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، عصمت فروشی اور بد چلنی کی سزا، دوسرے جرموں کے مقابلہ میں سخت تھی، غرض تمدن کی ابتدائیت پر نظر رکھتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ سماج میں اچھائیوں کا عنصر زیادہ تھا اور جو سماجی برائیاں اس قدیم عہد میں موجود تھیں ان سے آج کا سماج بھی محفوظ نہیں بلکہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی آسمان رسیدگی نے اُس

میں ایسی راہیں کھول دی ہیں کہ عیوب محاسن اور محاسن عیوب بن گئے اور خیر و شر کا معیار بدلنے سے انسانیت کا شرف وجود بھی بدل گیا۔

تمدنی اور معاشرتی تقسیم | معاشرت نام ہے ملک کے کسی طبقہ یا مختلف طبقات کے عمومی یا خصوصی حالات بود و باش، طرز فکر اور طریق عمل کا، معاشرت مقامی اور علاقائی حد بندی محصور و محدود بھی ہوتی ہے اور بین الملکی بھی اور صرف لسانی اور مذہبی تصورات کے تحت بھی ہو سکتی ہے۔

مبصرانہ نظر رکھنے والے مشاہدین آثار قدیمہ نے دراوڑی تمدن اور معاشرت کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے ما قبل تاریخی دور، نیم تاریخی دور، اور تاریخی دور، تامل زبان کی قدیم ترین اور مستند کتاب "تول کا پیم" کے بیان کے مطابق دراوڑوں کے قدیم لاہام سے ہر پانچ بڑے گروہ تھے جنھوں نے اپنی بود و باش کے لئے مختلف میدانی، کوہستانی، مرغزاری، ساحلی اور صحرائی علاقے منتخب کرلئے تھے اور یہ مختلف خطوں اور علاقوں میں آباد گروہ کسی ایک دیوتا کی پرستش نہیں کرتے تھے بلکہ ضرورت کے اعتبار سے ان کے دیوی دیوتا جداگانہ تھے۔ نیم تاریخی دور میں ہو پہنچے تک ان کے ذہنی شعور میں کافی پیش رفت ہو چکی تھی اور اسی کے ساتھ تہذیب و تمدن کے قدم بھی آگے بڑھ چکے تھے اس دور میں مختلف گروہوں کی بود و باش کے جداگانہ خطے اور علاقے دکھائی نہیں دیتے بلکہ ایک متحد اور ملی جلی زندگی نظر آتی ہے پھر بھی پیشہ ورانہ تقسیم کا آغاز ہو کر پورا معاشرہ آٹھ طبقات میں منقسم ہو گیا غالباً یہ تقسیم جنوبی ہند میں دراوڑوں کی مضبوط حکومتوں کے قیام سے پہلے کی ہے کیونکہ اس وقت تک فوجی طبقہ کو، کوئی خاص برتری حاصل نہ تھی لیکن جنوبی ہند میں متعدد چھوٹی بڑی حکومتوں کے قیام کے بعد فوجی طبقہ کو رفعت و سربلندی کا درجہ حاصل ہوا عقل و فہم اور ذہنی شعور کے قدم مزید آگے بڑھنے پر دراوڑوں نے تاریخی دور میں قدم رکھا تو یہ پیشہ ورانہ تقسیم آٹھ سے کم ہو کر چار حصوں میں محدود و محصور ہو گئی۔ حکمرانوں کا طبقہ، پوجاریوں کا طبقہ، تاجروں و صناعوں کا طبقہ، زرعی طبقہ۔

اگرچہ یہ تقسیم بھی ذات پات اور حسب و نسب کی بنا پر عمل میں نہیں آئی تھی لیکن اس کے اثرات

کسی قدر فرق کے ساتھ نیچ اونچ کی شکل میں ضرور نمودار ہوتے پھر بھی آریین ذات پات کی طبقاتی تقسیم کی طرح اس تقسیم میں علوم و فنون کے حصول میں ذات پات کی بنا پر کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری نہ تھی، ہر فرد اس کے حصول میں بالکل آزاد تھا۔ مختصر یہ کہ دراوڑی دور کے "ویلاروں" (گلہ بانوں اور زراعت پیشہ) کو آریین دور کے شودروں سے کوئی طبقاتی نسبت نہ تھی، بلکہ معاشرہ میں دوسروں کی طرح یہ بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے حتیٰ کہ ان کی لڑکیوں کا ازدواجی رشتہ شاہی خاندان کے افراد سے بھی ہو جاتا تھا، فوج کی سپہ سالاری کا منصب اعلیٰ بھی بغیر کسی اکراہ کے ان کے سپرد کیا جا سکتا تھا، اور کسی عمدہ کار گذار اور لائق منتظم "ویلار" کو "راسو" کا معزز ترین خطاب عطا کر کے کسی صوبہ کا حاکم اعلیٰ بھی بنا دیا جاتا تھا" اگر ذات پات کی بنا پر طبقاتی حد بندی ہوتی تو نہ مذکورہ اعلیٰ عہدے ان کو حاصل ہوتے اور نہ مختلف طبقوں کے درمیان رشتۂ ازدواج قائم ہوتا۔

طرزِ حکومت | ماقبل تاریخ اور نیم تاریخی دور میں ملک صدہا شہری ریاستوں میں تقسیم ہونے کے باعث جداگانہ طرزِ حکومت کا حامل تھا یعنی ہر تہذیبی ٹکڑے یا ہر شہری ریاست کا اپنا علاحدہ طرزِ حکمرانی تھا۔ تہذیبی اور تمدنی مدارج طے کرنے کے بعد تاریخی دور کے دراوڑوں نے ملکی نظم و نسق کی سہولت کے لئے سلطنت کو چھوٹے بڑے حلقوں میں تقسیم کیا تھا۔ سب سے چھوٹا حلقہ گاؤں تک محدود تھا جو تامل علاقوں میں آبادی کے لحاظ سے "پٹی کم" چیری اور کرو چی وغیرہ مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا، ہر گاؤں میں ایک سردار ہوتا تھا جو گاؤں کی پنچایت کے صلاح و مشورہ سے باہمی مناقشات کا تصفیہ کیا کرتا تھا، کئی گاؤں کا مجموعہ "کُرم" کہلاتا تھا جو ایک اعلیٰ حاکم کے زیرِ نگرانی ہوتا تھا۔ دراوڑ چوں کہ فطرۃً جمہوریت پسند تھے اس لئے موجودہ دور کی اسمبلیوں اور کونسلوں کی طرح اس حاکم کے صلاح و مشورہ کے لئے سمجھدار افراد کا انتخاب عوام کے ذمہ تھا اور یہ منتخب ممبر باہمی صلاح و مشورہ سے تمام معاملات اور جھگڑے طے کرتے تھے اور کئی "کُرم" مل کر ناڈو کہلاتے تھے، ہر "ناڈو" ایک صوبہ دار کے ماتحت ہوتا تھا، یہ صوبہ دار

دوسرے درجہ کا فرماں روا سمجھا جاتا تھا چار یا پانچ صوبیدار مل کر ایک " منڈلم" وجود میں آتا تھا جس پر ایک آزاد و خود مختار تاجدار حکومت کرتا تھا " منڈلم" کے شروع میں حکومت کا نسبتی نام بغرض تعارف لگا ہوتا تھا۔ تفصیلاً یوں سمجھئے کہ جنوبی ہند میں چار بڑی ریاستیں، چولا، چیرا، پانڈیا اور ٹونڈائی ناموں سے قائم تھیں ان میں سے ہر " منڈلم" اپنی ریاست کے نسبتی نام سے پکارا جاتا تھا مثلاً " چولا منڈلم" " چیرا منڈلم" " پانڈیہ منڈلم" اور " ٹونڈائی منڈلم" اس اعتبار سے " منڈلم" کا لفظ ریاست یا حکومت کے معنی پر دلالت کرتا ہے[1]۔ موجودہ دور کی پارلیمنٹ اور ایوانِ ڈاؤس کی طرح تامل ممالک کی مرکزی حکومت دو مجلسوں پر منقسم تھی مجلس اعلیٰ اور مجلس ادنیٰ، مجلس دل پوجاریوں، طبیبوں، جوتشیوں اور وزرا پر مشتمل تھی، وزرا میں ناظم الامور مذہبی، صدر محاسب، میر عدل، وزیر مالیات اور وزیر امور عامہ . . . مؤخر الذکر کو جسے وزیر داخلہ بھی کہہ سکتے ہیں شاہی کیبنٹ میں خاص اہمیت حاصل تھی، دوسری مجلس میں سپہ سالار افواج، فیل سوار فوج کا کمانڈر، اسپ سوار فوج کا کمانڈر، پیادہ فوج کا علمبردار، سفرا، جاسوس، انتظامی عہدہ دار، خزانچی، محافظ ایوانِ شاہی اور امرائے سلطنت شامل تھے۔ راجہ اگرچہ خود مختار اور غیر مسئول ہوتا تھا لیکن جمہوری روایات زندہ رکھنے کے لئے مذکورہ مجالس کے ممبران سے استشارہ و استفادہ کرتا رہتا تھا، بادشاہ یا راجہ کا منصب اگرچہ موروثی تھا لیکن بعض صورتوں میں انتخاب کے ذریعہ بھی منتخب ہوتا تھا، جب کوئی شاہزادہ یا سردار میدانِ جنگ میں غیر معمولی شجاعت کا مظاہرہ کرتا تھا تو امرا و اعیانِ سلطنت باہمی صلاح و مشورہ سے اس کو اپنا راجہ منتخب کر لیتے تھے لیکن ایسا موقع شاذ و نادر ہی پیش آتا تھا، بادشاہ یا راجہ کے ہاتھ میں نہ صرف ملکی انتظام و انصرام کی باگ ڈور رہتی تھی بلکہ مذہبی پیشوائی کا اعلیٰ منصب بھی اس کو حاصل ہوتا تھا، خشک سالی، قحط سالی اور وبائی امراض کے پھیلاؤ کے مواقع پر دیوتاؤں کے

---

[1] عہد قدیم مشرق و مغرب

سامنے بڑی دھوم دھام سے قربانی کی رسم ادا کرنا بھی اسی کے ذمہ تھا، میدان جنگ میں سپہ سالاری کے فرائض بھی اسی کو انجام دینے پڑتے تھے، فوجداری اور دیوانی مقدمات کی آخری اپیل کی وہی سماعت کرتا تھا، بدکردار مجرموں کو سخت ترین سزا دی جاتی تھی، چوری، زنا، جاسوسی بدترین جرائم میں شمار ہوتے تھے جن کی سزا پھانسی کے سوا کچھ نہ تھی۔ قزاقوں، راہزنوں کا سراغ لگانے اور عوام کی اخلاقی حالت کی نگرانی کے لئے محتسب و نگراں مقرر کئے جاتے تھے جو اپنے فرائض کی ادائگی میں بڑے چاق چوبند، دلیر اور مستعد کار ہوتے تھے تاریک راتوں، موسلا دھار بارشوں میں بھی شاہراہوں اور گلی کوچوں میں بدکرداروں اور چور اُچکوں کی تلاش میں گشت کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے جرائم کا ارتکاب نہ ہونے کے برابر ہو گیا تھا۔ قوانین جنگ میں رحم و عفو اور درگذر کے اصول کو خاص جگہ حاصل تھی۔ "پورو نانورد" نامی تصنیف سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مقررہ اصول و ضوابط کی بنا پر جب کوئی راجہ میدان جنگ میں فوج روانہ کرتا تو عبادت گاہوں کو ہاتھ لگانے، گوشہ نشینوں سے تعرض کرنے، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے، غیر مصافی آبادی میں لوٹ کھسوٹ مچانے اور قتل و غارتگری پھیلانے اور شب خون مارنے سے سختی سے منع کر دیتا تھا۔ بلکہ طبلِ جنگ بجانے سے پہلے مویشیوں کے محافظ، درویشوں، بوڑھوں ضعیفوں مریضوں، عورتوں بچوں کو جلد از جلد شہر کی فصیل میں داخل ہو کر پناہ گزیں ہو جانے کے لئے بار بار اعلان کرا دینا بھی ضروری تھا۔ کتاب مذکور کے مصنف کے بیان کے مطابق راجہ کا شجاعت جرأت، فیاضی، عدل و انصاف اور علم و فضل سے متصف ہونا لازمی تھا۔ ملک کی زرعی، صنعتی اور معدنی پیداوار کی ترقی بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ مزارعین سے پیداوار کا چھٹے حصے سے زائد لینا بڑا جرم سمجھا جاتا تھا خزانہ کو بھرا رکھنا اس کے حسنِ انتظام کی دلیل اور اس کو دوراندیشی سے خرچ کرنا دانشمندانہ فعل متصور ہوتا تھا۔ وزیروں کی صوابدید پر عمل پیرا ہونا اس کے صحتِ فکر کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ مصنف مذکور کے خیال میں راجہ کی عظمت و بزرگی اس کی فوجی طاقت اور دولت و زر کی فراوانی پر نہیں بلکہ اس کی قوت و طاقت کی اصل بنیاد اس کی نیک روی اور عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ اس لئے حاکم اعلیٰ یا راجہ میں آفتاب کی سی عظمت اور چاند جیسی نرمی اور بارش جیسی کبریائیت ہونی چاہئے۔ تامل ملک کے راجہ کے اوقات شبانہ روزی تین حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ دن کے

بارہ گھنٹوں میں پہلے چار گھنٹے وہ باری تعالیٰ کی ادائیگی کے لئے مخصوص تھے۔ بعد کو چار گھنٹے وہ محل میں بیوی بچوں کے ساتھ گذارتا تھا۔ اور آخری چار گھنٹے ملکی انتظام و انصرام کی دیکھ بھال یا تدبیر وزیروں اور درباری امراء سے صلاح و مشورہ کے لئے وقف تھے اور وقتِ شب جاسوسوں اور محتسبوں سے ملک اور رعایا کے حالات اور اشیاءِ ضروریہ کے نرخ دریافت کرتا تھا۔

تعمیراتی فن کاری | دراوڑوں کا فنی ارتقا کسی خاص علم و فن تک محدود نہ تھا۔ بلکہ اس میں ہمہ گیریت کے اوصاف نمایاں تھے۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ ان کی تعمیراتی فن کاری کے سامنے سمیریا اور مصر کے تعمیراتی انجینیرنگ کی بھی کوئی حقیقت نہ تھی۔ کھدائیوں سے بلدیاتی نظام کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مہنجوداڑو کا بلدیاتی نظام بتاتا ہے کہ یہاں کوئی مہذب و شائستہ قوم مقیم آباد تھی۔ جو اس بلدیاتی نظام کو انتہائی سلیقہ مندی سے چلا رہی تھی۔ تعمیراتی سلسلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بلدیاتی نظام کے اصول و ضابطے امیر و غریب سب کے لئے یکساں تھے۔ شاہراہوں پر رکاوٹ ڈالنے والی تعمیرات کی کسی صورت سے بھی اجازت نہ تھی۔ کھدائیوں سے شہری مکانات زیادہ تر پختہ اینٹوں کے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن کی لمبائی چوڑائی سے دگنی ہوتی تھی۔ اور چونہ سے اس پر کاری بھی کی جاتی تھی۔ متعدد منزلوں کے مکانات بھی تعمیر کیے جاتے تھے۔ بالائی منزل پر منقش اینٹیں لگائی جاتی تھیں۔ باہمی جھگڑوں سے بچنے کے لئے مکانات کے درمیان کافی فاصلہ رکھا جاتا تھا۔ لوگوں کی سہولت و آرام کے لئے مختلف مقامات پر حمام کا انتظام بھی بلدیہ کے ذمہ تھا۔ اور شہروں کے شمالی حصے میں تجارتی سامان کے ذخیروں کے لئے گودام وغیرہ بھی تعمیر کرائی تھی۔ شہروں کی حفاظت کے لئے اونچے اونچے مینار بھی تیار کیے جاتے تھے۔ اعلیٰ عہدیداروں اور مذہبی پیشواؤں کے لئے عالیشان عمارتیں تعمیر کی جاتی تھیں[1]۔ تمام تعمیرات میں حفظانِ صحت کے اصول کی پابندی سے اندازہ ہوتا ہے کہ جملہ تعمیرات شعبۂ حفظانِ صحت کے مطابق تعمیر کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ہزار سال پرانے آثار دیکھ کر مشہور اطالوی ماہر آثار قدیمہ رابرٹ ایکس نے روم سے شائع ہونے والے ایک سہ ماہی رسالے "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں ہند کے قدیم تعمیراتی ارتقا کے سلسلے میں لکھا ہے کہ

"ہند کے مختلف مقامات سے پتھر اور دھات کے زمانے کے جو تعمیراتی نشانات اب تک منظرِ عام پر آئے ہیں۔ وہ تعمیراتی منصوبہ بندی کی اعلیٰ صلاحیتوں کے روشن نمونے ہیں۔ اتنے قدیم زمانے میں تعمیراتی انجینئرنگ کے لیے بے مثال نمونے شکل ہی سے کسی اور جگہ نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں جب کہ انسانی شعور میں عام پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ سلسلۂ تعمیرات میں حقوقِ شہریت اور حفظانِ صحت کا مکمل عجائبات سے معلوم ہوتا ہے۔"

ڈراوڑوں کے ذوقِ تعمیرات نے استرکاری کے ایسے مسالے بھی تیار کر لیے تھے کہ دیواریں اور چھتیں مرورِ زمانہ کے باوصف نمی اور تری کے اثر سے محفوظ رہتی تھیں۔ خیال ہے کہ کوہستان ایڈر کے سنگ بیجھائی کا چونہ چھتوں اور دیواروں پر لگایا جاتا تھا۔ جس پر مسلسل رگڑنے سے استحکام کے آئینہ کی طرح جلا بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ دہلی کے لال قلعہ میں شاہجہاں نے بھی اسی کی استرکاری کرائی تھی[۱]۔ علمی ثبوت کے لئے اگرچہ ڈراوڑی دور کی اب کوئی عمارت باقی نہیں۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دراوڑ شروع ہی سے فنِ تعمیر سے بخوبی واقف تھے۔ اور اس وقت کا ہندوستان عمدہ عمارتوں سے بھرا پڑا تھا۔ رگ وید کے صفحات میں بھی اس دور کے بڑے بڑے شہروں، مضبوط قلعوں اور عالیشان عمارتوں کی موجودگی کے روشن اشارے ملتے ہیں۔ ان آباد شہروں کے علاوہ ڈراوڑوں کے حصار دار قلعوں، زرنگار دروازوں اور ایوانوں کا ذکر بھی ملتا ہے جنہیں نو وارد ایرین تعجب اور رشک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ رامائن میں مدورا شہر کے دروازوں کا اند جواہر سے مرصع ہونا بیان کیا گیا ہے۔ حالاتِ قدیم سے دلچسپی رکھنے والے علمائے فکر و تحقیق کا خیال ہے کہ ٹکسیلا، متھرا، پیٹھن، اجین، نگارا اور دھنیا کٹک وغیرہ شہروں کو ڈراوڑی معماروں نے ایرین کی آمد سے قبل تعمیر کیا تھا۔ میدھستر کے مشہور محل کی تعمیر ایرین دور کا ایک اہم

---

[۱] عہدِ قدیم مشرق و مغرب۔ [۲] تاریخ گجرات از مولانا ابوظفر ندوی

ترین تعمیراتی کارنامہ کہا جاتا ہے۔ جس کے حسن و زیبائش اور زیب و زینت کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ یہ تعمیر انسانی انجینئرنگ کے کمالات کا نمونہ نہیں بلکہ پریوں کے دستِ نازک کی فن کاری کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اور اس تشبیہ کو خواص بھی ایک صحت مند تشبیہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت کی تصویر مہابھارت کے مصنف کے اس اعتراف سے نظروں کے سامنے آجاتی ہے کہ

"یہ بہشت کا حسین ترین محل ایرین کی تعمیراتی فنکاری کا نمونہ نہیں۔ بلکہ ایک دلوا (ڈراوڑ) معمار کا تعمیراتی شاہکار تھا۔ جس میں اس نے تعمیراتی فنکاری کے جوہروں کی دل کھول کر نمائش کی تھی۔"

سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل آثارِ قدیمہ کے نزدیک بھی ایرین فنِ تعمیرات میں ڈراوڑوں کے زیرِ بارِ احسان ہیں۔ ایرین حقیقت میں حسن کاری کے رمز سے نابلد اور ناآشنائے محض تھے۔ وہ اپنے خیالات و جذبات کو سنگ تراشی و نقاشی یا رکھائی اور موٹے قلم کی جنبش و حرکت سے ظاہر کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ ڈراوڑوں سے باہمی ارتباط و اختلاط کے بعد ہی وہ اپنے جذبات حسیات کو مادی جامہ پہنانے کے لائق بن سکے۔ اس حقیقت میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ تعمیراتی آرائش و زینت کا فطری مذاق خود دستِ فطرت نے ڈراوڑوں میں ودیعت کیا تھا۔ اور ایرین ان کے مذاقِ تزئین اور ذوقِ آرائش کے خوشہ چیں اور منت کش ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّمہ ہے کہ بوتہ کاری اور نقاشی کا مادہ زمانہ مابعد کے لوگوں کو ڈراوڑوں ہی سے ورثہ میں ملا ہے۔ ڈاکٹر ٹیگور کے بیان کے مطابق ڈراوڑ فنونِ لطیفہ مخصوصاً موسیقی، بوتہ کاری، مجسمہ سازی اور فنِ تعمیرات میں ایرین سے کئی درجہ فوقیت و برتری رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر موصوف نے دوسرے موقع پر لکھا ہے کہ ایریا کی نازک خیالیوں، گہری فکروں اور ڈراوڑوں کی جذباتی و تخلیقی حسن کاریوں کے اختلاط و امتزاج سے جو خوبصورت بچہ پیدا ہوا وہ نہ ایرین تھا اور نہ ڈراوڑ

له۔ عہدِ قدیم مشرق و مغرب

بلکہ شہرہ آفاق ہندو تھا۔ ڈاکٹر فرگسن کے خیال میں ہند کی قدیم اور عظیم ترین ادبیات تمام تر آریائی ہیں لیکن یہاں کی عظیم الشان عمارتیں دراوڑوں کی اعلیٰ اقدار کی یادگار ہیں۔ ہند کی قدیم تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے ڈاکٹر سلیٹر کے نزدیک تاریخی دور کے دراوڑی عمارتوں کے جو کھنڈرات کھدائیوں کے ذریعہ منظرِ عام پر آئے ہیں۔ وہ تزئین وزیبائش اور منبت کاریوں سے مالامال ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے اندازے کے مطابق یہ گلکاریاں اور زیبائشی وتزئینی نقاشیاں صدیوں کے تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہوں گی۔ تدریجی ارتقا کے الفاظ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ دراوڑوں نے تاریخی دور سے ماقبل بھی تعمیراتی فن کاری میں دسترس ضرور حاصل کرلی ہوگی۔ آگے چل کر ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ اگرچہ حوادث دور نے قدیم دراوڑی عمارتوں کے تمام نشان یکسر مٹادیئے ہیں لیکن ان کی تعمیراتی مہارت اور چابکدستی پر روشنی ڈالنے کی بہت سی بالواسطہ شہادتیں موجود ہیں۔ قدیم دراوڑی عمارتوں کی تباہی ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے نزدیک مال مسالہ کی زوال پذیری گرم ومرطوب آب وہوا ملا جلا تخریبی اثر اور کیڑے مکوڑوں کی افراط ہے۔ بہرحال سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں تک دراوڑوں یا ان کے خالص اخلاف یعنی تاملوں نے جو عظیم الشان تعمیراتی کارنامے انجام دیئے وہ حقیقت میں سنہرے حروف میں لکھے جانے کے مستحق اور لائق ہیں[1]۔

جنوبی ہند کی ایک ترقی یافتہ دراوڑی یا تامل ریاست چولا کا اولین فرماں روا "کاری کلا" نام کا گذرا ہے۔ وہ ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ لنکا پر حملہ کرکے ہزاروں اسیرانِ جنگ کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ جن کی مدد سے اس نے دریائے کاویری پر تقریباً ایک میل لانبا سنگ بستہ ایک تاریخی بند تعمیر کرایا تھا۔ اور اسی دریا کے دہانے پر ایک عظیم شہر بھی آباد کیا تھا۔ جو اولاً پوہار اور بعد میں "کاویری پٹنیم" نام سے موسوم ہوا۔ اس نے اپنا پایہ تخت "یورایور" سے "کاویری پٹنیم" میں منتقل کردیا تھا۔ اور پھر اس نے دارالحکومت کے ساحل پر ایک مستحکم جہازی گودی تعمیر کرا کر

---

[1] ۔ تاریخ گجرات از مولانا ابوظفر ندوی

ایک زبردست بندرگاہ بھی بنا دیا تھا۔ جہاں متمدن ملکوں کے تجارتی جہاز لنگر انداز ہوتے تھے۔ جس سے ریاست کی بیرونی تجارت میں دو سو گنا اضافہ ہوگیا تھا۔ تجارتی اغراض کی ترقی کے لیے اس نے دوسرے بندرگاہوں اور گودیوں کی تعمیر و ترقی پر بھی بے دریغ روپیہ صرف کیا تھا۔ تامل ممالک میں آبپاشی کے لئے دریائے کاویری، پنار اور پالار سے نہایت وسیع و عریض نہریں بھی اسی راجہ نے نکالی تھیں۔ حتیٰ کے دریائے پالار کا رخ موڑ کر دوسری سمت کر دیا تھا۔ جس کو اس زمانے کی تعمیراتی انجینیرنگ کا ایک محیر العقول کارنامہ کہا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسرے تعمیراتی کام بھی اس عہدِ قدیم میں کوئی معمولی کام نہ تھے۔ بلکہ انتہائی دانشمندی اور عرق ریزی کا نتیجہ تھے بندرگاہوں سے اندرونی علاقوں کے بڑے بڑے شہروں اور معدنی مقامات تک آمدورفت کی سہولت کیلئے طول طویل سڑکوں کی تعمیر بھی اسی راجہ کی طرف منسوب ہے۔

آج کے مہندسوں اور انجینیروں نے جنوبی ہند کی قدیم عمارتوں کو ڈراوڑوں اور چالوکیہ طرز تعمیر میں تقسیم کیا ہے۔ چالوکیہ عہد سے پیشتر کی تمام عمارتوں کو ڈراوڑی انداز اور وضع کی بتایا ہے۔ چالوکیہ کا تعمیراتی انداز نفاست و نزاکت کے ساتھ منبت کاری پر مشتمل ہے اور ڈراوڑی نمونوں میں نفاست و نزاکت کے استحکام اور رفعت کی نمائش زیادہ ہے۔ غیر ڈراوڑی عمارتیں زیادہ تر میدانوں اور کھلی جگہوں پر تعمیر ہوتی تھیں لیکن ڈراوڑوں کو چونکہ پہاڑوں کے پہلو تراش کر مغاری مقادر بنانے میں خاص ملکہ اور کمال حاصل تھا۔ اس لئے ان کی تعمیرات کا زیادہ حصہ مغاری اور پہاڑی پھر کم ہے۔ اگرچہ کھلی جگہوں پر بھی کہیں کہیں ڈراوڑی مغادر دستیاب ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی یہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ ڈھلواں چٹانوں کو تراش کر کے بنائے گئے ہیں۔ جس کے بہترین مثالی نمونے مہابلی پور کے ہفت پگوڈا ہیں۔

ایرینلے ابتدائً ڈراوڑوں ہی سے فنِ تعمیرات میں درس و درک حاصل کیا تھا۔ بعد ازاں بودھ عہد میں یونانی اور ایرانی طرزِ تعمیر کے اثرات قبول کئے۔ یہی وجہ ہے کہ بودھ اور زمانہ مابعد کی تعمیرات میں یونانی اور ایرانی ثروت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن ڈراوڑی دور کی تعمیرات میں

بدیسی تخیل کا شائبہ تک نہیں۔ تمام تر تخیل ہندی اور صرف ہندی ہے۔ ایلورہ اور اجنتا کی مخار ی
نقاشیاں اور سنگ تراشیاں مختلف ازمنہ کے فن کار نقاشوں کی فن کارانہ چابکدستی کا نتیجہ ہیں
لیکن اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اس سنگی نقاشی کا بہت کچھ حصہ جنوبی ہند کے تامل نقاشوں کی
عرق ریزی اور ان کے کمالِ فن کا آئینہ دار ہیں۔ مہیلا پور کے سات پگوڈا اگرچہ پلاوا خاندان
کے عہد میں تعمیر ہوئے لیکن وہ سب کے سب دراوڑی طرزِ تعمیر کی خصوصیات کے حامل ہیں۔
اس لیے انکا شمار بھی ڈراوڑی طرزِ تعمیرات میں کیا گیا ہے۔ دکن کی قدیم آندھرا قوم بھی چونکہ
ڈراوڑی نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لیے اس کے تعمیراتی انداز کو بھی ڈراوڑی تعمیرات ہی کے
سلسلہ کی ایک کڑی سمجھا جاتا ہے۔

بعض مبصرینِ فن، جنوبی ہند کے مدورا اور تنجور کے مخروطی شکل کے منادر میں مصری اہراموں
کی کچھ مشابہت نظر آتی ہے۔ جس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آٹھویں صدی قبل مسیح جبکہ
جنوبی ہند اور بابل و مصر کے مابین تجارتی روابط بڑھے ہوئے تھے۔ اس وقت ڈراوڑی تاجر
مصر سے بعض تعمیراتی انداز دیکھ کر آئے۔ اور اپنی تعمیرات میں ان کا عکس قبول کر لیا۔ لیکن اس
خیال کو مشرقی اور مغربی محققین کی اکثریت نے واہمہ سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ بلکہ غور کرنے سے
حقیقت و اصلیت اس کے خلاف نظر آتی ہے۔ مصر و بابل سے تامل علاقہ کے ڈراوڑوں کے تجارتی
روابط مذکورہ سن و سال سے بہت پہلے سے قائم تھے۔ دونوں کی آمدورفت کا سلسلہ بھی جاری
تھا۔ تاملی دراوڑوں کی پہونچ زیادہ تر مشرقِ وسطیٰ کے علاقوں تک محدود رہی۔ اور مصر کے
مقابلہ میں دجلہ اور فرات کی زرخیز وادی میں ابھرنے والی قبائلی حکومتوں سے یہ تعلقات
زیادہ تھے۔ اور ان قبائلی حکومتوں کے انفرادی اور اجتماعی تجارتی بیڑے بھی جنوبی ہند کی
بندرگاہوں میں لنگر انداز ہوکر لایا ہوا سامانِ تجارت اتارتے اور یہاں کا خام و پختہ مال بار کر کے
مشرقِ وسطیٰ کے علاقوں اور مصر تک پہنچاتے تھے۔ مصر میں ہندی سامانِ تجارت زیادہ
تر فینشین عربوں اور خود مصری تاجروں کے ذریعہ پہنچا کرتا تھا۔ اور خود ڈراوڑی تاجروں کی

مصر تک پہنچ شاذ ونادر ہی بھی جا سکتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس شاذ ونادر پہونچ اور مصری تاجروں کی آمد اور مختصر قیام سے نا بل ممالک کے ڈراوڑی معماروں نے ایسے صحیح نقشے ان سے حاصل کر لیے کہ اپنے مخروطی شکل کے مناروں میں مصری اہراموں کا عکس اتار لیا۔ دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ آنے والے تاجروں میں تعمیراتی فن کاروں کی شمولیت کا آج تک کسی ایک نے بھی ذکر نہ کیا۔

زراعت و باغبانی اور صنعت و تجارت | زراعت و باغبانی وغیرہ کے اعتبار سے بھی ڈراوڑی عہد کو بہت کچھ ترقی پذیر اور ایجادی دور کہا جا سکتا ہے۔ مختلف النوع پھلوں میں نیبو کی پیداوار اور خربوزے کی کاشت کثرت سے تھی۔ پنجاب، سندھ، کاٹھیاواڑ، اور گجرات وغیرہ کے ڈراوڑ شروع ہی سے تجارت پیشہ تھے۔ ان کے تجارتی قافلے برابر یہ شہری ریاستوں کے لئے ضروری اشیا صرف برآمد کرتے تھے۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ ان علاقوں کی زرعی پیداوار ایران اور دوسرے علاقوں تک پہونچتی رہی ہو۔

دھان کی ابتدائی کاشت کے متعلق بردوان کی تحقیقی رپورٹ اور مغربی بنگال کی حالیہ کھدائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں چاول کی اولین کاشت صوبہ بنگال کی وادی اجے یا گرٹ میں ہوئی۔ سنہ ۱۹۵۰ء کی کھدائیوں کے دوران آبادی کی انتہائی نچلی سطح سے کاربونائزڈ، دھانوں کے ایسے پودے دستیاب ہوئے ہیں جن کا رنگ بھورا یا زرد و سُرخ ہے تحقیقات کے مرکزی ادارہ کے ماہروں نے اس کی جانچ پڑتال کے بعد یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ دریافت شدہ چیز دنیا کے اس انتہائی عہدِ قدیم کی یادگار ہے جس کا اب تک پتہ چل سکا ہے۔ حال ہی میں روسی علاقہ ازبکستان میں اس کے کچھ اعلیٰ نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ روسی ماہر آثار قدیمہ ایم سین نے دسمبر ۱۹۶۳ء میں تاشقند میں اسوقت کے ہندی سفیر ٹی۔ این کول کو ان کی دستیابی کی اطلاع دیتے ہوئے ان کی قدامت پانچ ہزار قبل مسیح بتائی ہے ملکہ کے ساتھ ماہرِ موصوف نے یہ انکشاف بھی کیا کہ ازبکستان میں چاول کا بیج اسی دور

کے لگ بھگ چین کے بجائے وادئ سندھ سے پہنچا۔ اس سلسلہ میں ماہنامہ "اسکول سائنس" کے
فاضل مقالہ نگار نے جو کچھ سپردِ قلم کیا ہے اس کی تلخیص یہ ہے کہ

"ہند میں اس کی کاشت انسانی تاریخ کی طرح قدیم ہے۔ ہند کی قدیم ترین تحریروں شاستروں اور ویدوں وغیرہ میں بھی اس کی کاشت کا ذکر ملتا ہے۔ اترپردیش کے مشہور ترین تاریخی مقام ہستناپور کی کھدائیوں کے درمیان قدیم ترین نمونے کاربونائزڈ ڈھالوں کی شکل کے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کی قدامت ایک ہزار قبل مسیح بتائی گئی ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کی کاشت چار ہزار قبل مسیح بیان کی گئی ہے۔ جب کہ دنیا اس کے نام سے بھی واقف نہ تھی۔ یونانیوں سے پہلے عربوں کو اس کا علم ہوا اور مغرب کے بعض علاقوں میں اُن عرب تاجروں کے ذریعہ یہ روشناس ہوا جو ہند کے ساحل پر تجارتی لین دین کی غرض سے آتے جاتے رہتے تھے"۔

نیشکر اور شکر | ایکھ کی کاشت، گُڑ اور شکر سازی کا آغاز بھی بڑی اوڑی دور کی بات ہے۔ پروفیسر کنگ سینج نے اپنی مشہور تصنیف "دنیا کی شکر سازی" میں اس کی ابتدائی پیداوار کے متعلق بڑی تحقیق سے لکھا ہے کہ

"یہ میٹھا درخت سب سے پہلے ہندوستان کے مقدس دریائے گنگا کے ساحل پر پایا گیا تھا اور اس کا بیج اور طریقہ کاشت بھی ہندوستان ہی سے دنیا کے اکثر حصوں میں پہونچا اور ہندی دیو مالا میں گنے کو کام دیو کی کمان کہا گیا ہے"۔

ہند کی قدیم ترین طبی کتابوں اور اتھروید میں اس کا ذکر موجود ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ ایکھ سے پہلے گنا سرزمین ہند میں موجود تھا۔ ہند کی بہت سی چیزیں بودھ بھکشوؤں کے ذریعہ جنوب مشرقی ایشیا خصوصاً چین خاص تک پہنچیں لیکن ایکھ کا پودا، ان سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے سرزمین چین پہونچ چکا تھا۔ چونکہ اہالیان چین گُڑ اور شکر سازی کے فن سے ناواقف تھے اس لئے حضرت مسیح سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے چینی تاریخ کے مشہور شہنشاہ تائی کنگ نے ایک وفد شکر سازی کی معلومات حاصل کرنے کے لئے ہندوستان بھیجا تھا جو یہاں سے پوری معلومات حاصل کرکے واپس ہوا تھا[۱]۔ جاوا وغیرہ کا علاقہ آج شکر پیدا کرنے میں

---

[۱] عہدِ قدیم مشرق و مغرب

مشہور ہے لیکن ہند کے محکمۂ خوراک و زراعت کی طرف سے جنوری ۱۹۴۷ء میں جو اطلاع نامہ اس سلسلہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں گنے کو ہند کا ایسا قدیم ترین تحفہ بیان کیا گیا ہے جو تمام دنیا کو ہندوستان کی طرف سے ملا ہے۔ دنیا کے اکثر حصوں خصوصاً عرب کے مختلف علاقوں میں شکر تیار ہوتی تھی لیکن گنے سے نہیں کھجور سے، اور عرب تاجروں کے ذریعہ مصر کے راستہ یورپ تک پہونچا کرتی تھی۔ بعد کو ہند کی صاف ستھری شکر بھی انہی عربوں کی معرفت مغرب میں پہونچنے لگی تھی جس نے اپنی صفائی اور رنگ ذائقوں کی خوبی کی بنا پر عربی شکر کو مغرب کے بازاروں سے باہر نکال دیا تھا۔ یورپ گنے کے نام اور شکل وصورت سے قطعاً ناواقف تھا۔ چنانچہ تین سو تائیس قبل مسیح سکندری فوجوں نے ایکھ کا درخت، اور اس کے رس سے گڑ اور شکر تیار ہوتے دیکھ کر بڑے تعجب کا اظہار کیا تھا اور اپنی ناواقفیت کی بنا پر سکندر کے سپاہی شکر کو میٹھا نمک یا ہندی نمک کہتے تھے۔ انہوں نے ایک نام ایکھ کا شہد بھی رکھ چھوڑا تھا۔ یونانیوں کے قدیم نوشتہ جات میں تحریر ہے کہ ہند کا یہ وہ درخت ہے جو مکھیوں کے بغیر شہد پیدا کرتا ہے۔ اہل روما کا بھی شکر اور نیشکر کے بارے میں کچھ اسی سے ملتا جلتا خیال تھا۔ اپنے ریکارڈوں کے علاوہ پروفیسر کنگسن کی بھی یہی تحقیق ہے کہ سکندر اعظم ہند سے واپسی پر گنے کے پودے اور طریقۂ کاشت یورپ لے گیا تھا۔ اس کی پہونچ کے بعد یورپ میں اس کی کاشت شروع ہوئی۔ اور یورپ سے امریکہ وغیرہ پہنچا۔ اور خصوصاً کیوبا، برازیل اور دوسرے ممالک میں اس کی کاشت کافی ترقی کر گئی۔

(باقی)

گذارش

خریداری برہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلے میں خط وکتابت کرتے یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ کے نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔ (منیجر)

ادبیات

غزل

از جناب سید حرمت الاکرام ایم۔ اے

جیسے جیسے درد کا پندار بڑھتا جائے ہے
اعتمادِ لذتِ آزار بڑھتا جائے ہے

دل امڈتا آئے ہے؛ مٹی ہوئی جاتی ہے نم
زندگی پر زندگی کا بار بڑھتا جائے ہے

یہ نہ پوچھو، دیکھتا جاتا ہے مڑ مڑ کر کسے؟
ایک دیوانہ کہ سوئے دار بڑھتا جائے ہے

کچھ نہ کچھ ہونا ہی آخر؛ تپ کے کندن جل کے راکھ
دل کی جانب شعلۂ افکار بڑھتا جائے ہے

آگہی کا صدقہ واجب ہے، اٹھاؤ جامِ زہر
لمحہ لمحہ وقت کا اصرار بڑھتا جائے ہے

سختیٔ راہِ طلب سے دل لرزتا ہے مگر
مجھ سے آگے جذبۂ بیدار بڑھتا جائے ہے

رفتہ رفتہ سوزِ حرماں ہوتا جاتا ہے فزوں
رفتہ رفتہ زندگی سے پیار بڑھتا جائے ہے

یہ جہانِ آب و گِل ہے امتحاں گاہِ شعور
غم بقدرِ عظمتِ کردار بڑھتا جائے ہے

کیا خبر حرمت کہ تکمیلِ سفر ہو کس طرح؟
التفاتِ وادیٔ پُرخار بڑھتا جائے ہے

تبصرے

بزم تیموریہ جلد اول جدید ایڈیشن از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب، ضخامت ۵۸۸ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت -/12، پتہ :- دار المصنفین اعظم گڈھ۔

یہ کتاب دار المصنفین اعظم گڈھ کی مشہور و مقبول کتاب ہے۔ لیکن کتاب کا یہ جدید ایڈیشن بہ نسبت پہلے ایڈیشن کے کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے اس درجہ اعلیٰ اور افضل ہے کہ اس کو ایک دوسری ہی کتاب اور " نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول " کا صحیح مصداق ہی کہا جا سکتا ہے پہلا ایڈیشن صرف دو سو سے بھی کم صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ دوسرا ایڈیشن چھ سو کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل ہے اور وہ بھی جلد اول! اندازہ ہے کہ پوری کتاب تین جلدوں میں تمام ہوگی، یہ تو کمیت کی بات تھی، کیفیت کی بات یہ ہے کہ اس میں فاضل مؤلف نے ایک دو نہیں بلکہ متعدد ایسے نادر یا عسیر الحصول ماخذ سے استفادہ کیا ہے جن سے پہلے نہیں کر سکے تھے۔ علاوہ ازیں زبان و انداز بیان بھی شگفتہ تر ہو گیا ہے، اس جلد میں بابر، ہمایوں اور اکبر اور ان کے عہد کے ارباب علم و ادب و شعر و فن کا تذکرہ ہے اور چوں کہ یہ صرف بزم ہے اس لئے اس میں رزمیہ کارناموں کا کوئی تذکرہ نہیں۔ چنانچہ تیمور کا نام سنتے ہی ظلم و سفاکی کا ایک پیکر ہمارے سامنے آجاتا ہے، لیکن اس بزم میں آپ کو وہ علم نوازی و علما پروری کرتا ہی ملے گا۔ اس حیثیت سے یہ کتاب ملک و قوم کی خدمت بھی ہے اور فن کی خدمت بھی، یوں ایک بلند پایہ علمی اور تحقیقی کارنامہ! مگر پڑھئے تو افسانہ اور ناول کا سا لطف، بعض مقامات پر قاری کو اطناب کا شکوہ ہو سکتا ہے، لیکن مصنف کی طرف سے معذرت یہ ہوگی کہ " لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم " اس بنا پر اطناب ہے۔ مگر اہل بلاغت

کی زبان میں "مثیل" نہیں ہے، ارباب ذوق کے لئے یہ نعمت غیر مترقبہ ہے۔ خدا کرے باقی جلدیں بھی جلد آئیں لیکن افسوس ہے کہ طباعت اور کتابت کی غلطیوں کی بہتات نے کتاب کو داغدار کردیا ہے اور آخر میں ایک طویل غلطنامہ بھی جامع نہیں مثلاً ص ۷ سطر ۶ میں "سیف الدین" کے بجائے غالباً "سعد الدین" ہوگا۔

مسلم پرسنل لا (انگریزی) | مرتبہ جناب مفضل الرحمٰن فریدی و محمد نجات اللہ صاحب صدیقی۔
تقطیع متوسط ضخامت دو سو صفحات۔ ٹائپ روشن قیمت -/8 پتہ:- اسلامک ریسرچ سرکل علی گڑھ۔

اسلامک ریسرچ سرکل۔ علی گڈھ کی طرف سے ۱۹۷۶ء میں ایک سیمینار مسلم یونیورسٹی میں منعقد ہوا تھا جس میں بیرونی حضرات علماء اور خود یونیورسٹی کے اساتذہ شریک ہوتے تھے، اس میں بندرہ مقالات پڑھے گئے اور بحث میں سب نے حصہ لیا۔ اس طرح موضوع بحث کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو سامنے نہ آگیا ہو، لائق مرتبین نے ان سب مضامین کو (جو اردو میں تھے ان کا انگریزی میں ترجمہ کرکے) سیمینار کی مفصل کارروائی کے ساتھ کتاب کی شکل میں چھاپ دیا ہے اور مقالات کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے: (۱) مسلم پرسنل لا کی اہمیت اور اس کی حقیقت۔ (۲) مسلم پرسنل لا ہندوستانی ماحول میں (۳) مسلم پرسنل لا اور اسلامی ممالک، اس کتاب کے مطالعہ سے مسلم پرسنل لا سے متعلق مختلف سوالات کا جواب خاطر خواہ ملے گا! امید ہے کہ ارباب ذوق اس کے مطالعہ سے شادکام ہوں گے۔

Approaches to the Study of Religion | مرتبہ جناب ہربنس سنگھ،
تقطیع متوسط ضخامت ۸۳ صفحات۔ کاغذ اور طباعت اعلیٰ مجلد قیمت درج نہیں۔ پتہ:- گرو گوبند سنگھ ڈیپارٹمنٹ آف ریلیجس اسٹڈیز، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ۔

چند برس ہوئے پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے ایک نہایت عظیم الشان ڈیپارٹمنٹ مذاہب کے درس و مطالعہ اور ان پر ریسرچ کے لئے قائم کیا تھا جو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اپنی نوعیت کا پہلا

اِدارہ ہے، اسی سلسلہ میں ڈپارٹمنٹ نے ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا جس کا موضوع تھا "مذہب کے درس و مطالعہ کے نقطہ ہائے نظر" یہ سیمینار تین دن چلا اور بہت کامیاب رہا (اس کی روداد انھیں دنوں میں برہان میں شائع ہوئی تھی) زیر تبصرہ کتاب انھیں مضامین کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر ہربنس سنگھ صدر شعبہ کی خیر مقدمی تقریر اور پروفیسر کرپال سنگھ وائس چانسلر پنجابی یونیورسٹی کی افتتاحی تقریر کے علاوہ اس مجموعہ میں بیس مقالات شامل ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔ (۱) "مذہب کا مطالعہ ایک علمی مضمون کی حیثیت سے" گربچن سنگھ طالب۔ (۲) "مورخ کی نگاہ میں مذہب" بدھا پرکاش (۳) "روایتی اور مابعد الطبیعیاتی مذہب" تارن سنگھ۔ (۴) "مذہب کا مطالعہ مذہبی طریقہ پر" انور علی فانی سوز۔ (۵) مذہب کا مطالعہ مذہبی نقطۂ نظر سے" ایچ مہیشوری۔ (۶) "مذہب کا مطالعہ معروضی نقطۂ نظر سے" پرمانند دیورکر۔ (۷) "مذہب کی تعلیم کیسے دی جائے" سعید احمد اکبرآبادی۔ (۸) "کیتھولک یونیورسٹیوں اور مدرسوں میں مذہب کی تعلیم کے طریقے" جے جیسپرٹ ساش۔ باقی مقالات۔ جین مذہب سیوا کا تصور، مذہب کا مطالعہ مذہبی تجزیہ کے نقطۂ نظر سے، نفسیاتی نقطۂ نظر، معاملاتی نقطۂ نظر، وغیرہ چند اور موضوعات پر ہیں۔ ایک سیمینار کا بڑا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ کسی ایک موضوع کی نسبت جو معلومات مہینوں مطالعہ کے بعد حاصل ہو سکتی ہیں وہ دو تین دن میں حاصل ہو جاتی ہیں اور ایک ہی مضمون کے بہت سے فاضل اور محقق اساتذہ سے سوال و جواب اور پوچھ گچھ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا۔ اس بنا پر اس کتاب کا مطالعہ دلچسپ، مفید اور پر از معلومات ہوگا۔

مسلمان اور عصری مسائل | از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، تقطیع متوسط ضخامت ۱۲۸ صفحات
کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت مجلد 5/50 پتہ:- مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵

"اسلام اور عصر جدید" اردو کا بلند پایہ سہ ماہی مجلہ ہے جو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی ادارت میں پابندی اور کامیابی سے نکل رہا ہے، اس میں عام مضامین و مقالات کے علاوہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے قلم سے جو اداریے ہوتے ہیں وہ ادبی اور معنوی حیثیت

سے ادب العالیہ میں شامل ہونے کے مستحق ہیں۔ وہ زبان وبیان کے لطف اور چاشنی کے ساتھ مسلمانوں کے لئے فکرانگیز بھی ہوتے ہیں اور بصیرت آموز بھی۔ یہ مجموعہ اسی قسم کے دس اداریوں پر مشتمل ہے، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جن حضرات کی نظر سے یہ مجلہ نہیں گزرتا وہ بھی اب تک کے سب اداریوں سے بیک وقت مستفید ہوسکیں گے۔

کتاب وسنت کے جواہر پارے | از مولانا جمال الدین اعظمی، تقطیع خورد، ضخامت ۱۱۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت 2/25 پتہ :۔ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

عرصہ ہوا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بچوں اور بچیوں کے لئے مولانا سعدالدین انصاری مرحوم نے قرآن وحدیث سے منتخبات کا ایک رسالہ مرتب کیا تھا۔ لیکن یہ عربی میں تھا۔ اب اسی رسالہ کو مولانا جمال الدین اعظمی نے جو خود جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسلامیات کے استاذ ہیں اردو میں منتقل کردیا ہے، زبان چست اور سلیس ہے، بچوں کے علاوہ عام قارئین بھی اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

فہرست کتب ادارہ کے قواعد و ضوابط مُفت طلب فرمائیے

مینجر۔ ندوۃ المصنفین۔ جامع مسجد دہلی ٦

سنہ ۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت ۔
تاریخ صقلیہ ۔ تاریخ ملت جلد نہم

سنہ ۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام ۔ تاریخ ادبیات ایران ۔ تاریخ علم فقہ ۔ تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند [illegible]
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

سنہ ۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید مع اضافہ و ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم ۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

سنہ ۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم ۔ صدیق اکبرؓ ۔ تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند ۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب ۔ ایران انقلاب کے بعد

سنہ ۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم ۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ۔ تاریخ گجرات ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

سنہ ۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ۔ مصائب [illegible]

سنہ ۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

سنہ ۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول ۔ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ۔ اسلامی کتب خانے ۔ [illegible]
تاریخ ہند پر نئی روشنی

سنہ ۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ۔ معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔

سنہ ۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم ۔ تاریخ ردہ ۔ سرکشی ضلع بجنور ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اول

سنہ ۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم ۔ حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ۔ عرب و ہند عہد رسالت میں ۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

سنہ ۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لادینی دور کا تاریخی پس منظر ۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

سنہ ۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ۔ [illegible] ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

سنہ ۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم ۔ تفسیر مظہری اردو جلد ششم ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

سنہ ۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ۔ تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

سنہ ۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم ۔ تاریخ الفخری ۔ حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

سنہ ۱۹۷۰ء حیات عبدالحی ۔ تفسیر مظہری اردو جلد نہم ۔ مآثر و معارف ۔ احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت

سنہ ۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم ۔ بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

سنہ ۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ [illegible]
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

Regd. N. D/(D)-231 Phone 262815 JANUARY 1974

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ سرمایہ۔ تاریخ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے) (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم"۔ بصائر۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ"۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ"۔ جارج برنارڈ شا۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

جلد ۷۲ | ماہ محرم الحرام ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۴ء | شمارہ ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

برہان میں گذشتہ چند مہینوں سے ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق کا جو مضمون مسلسل شائع ہو رہا ہے اس کے متعلق متعدد احباب میں سے بعض نے خط کے ذریعہ اور بعض نے زبانی وقتاً فوقتاً چند شکایتیں اور اس سلسلہ میں اپنی بے زاری کا اظہار کیا ہے۔ ارادہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے مضمون کے ختم ہونے کے بعد میں خود ایک مضمون لکھوں گا جس کی نوعیت ڈاکٹر صاحب کے مضمون کے اوپر ایک تبصرہ کی ہوگی اور اس میں ضمناً اس پر بھی گفتگو آتی کہ ہمارے متقدمین اور متاخرین اصحابِ تاریخ و سیر کی تاریخ نگاری کے انداز میں کیا فرق ہے اور کیوں ہے چنانچہ جن احباب سے گفتگو ہوئی ان سے یہ بات زبانی طور پر اور جنھوں نے خط لکھے تھے ان سے تحریراً اپنے اس ارادے کا اظہار کر بھی دیا تھا لیکن ابھی پچھلے دنوں روزنامہ الجمعیۃ دہلی مورخہ ۴۔ فروری میں ایک غائبانہ دوست نے نہایت اشتعال انگیز خط اس مضمون کے متعلق شایع کر دیا اس بنا پر ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں کچھ معروضات پیش کر دیے جائیں۔

---

(۱) ڈاکٹر خورشید احمد فارق قارئین برہان کے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ ان کی تین کتابیں[۱]

۱۔ حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط

---

[۱] تاریخ نگاری۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں اور عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان یہ تین کتابیں بھی فارقی

۔ حضرت ابو بکرؓ کے سرکاری خطوط۔

۲۔ حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط الگ الگ تین ضخیم جلدوں میں قارئین برہان کے حلقوں میں بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی ہیں اور اخبارات ورسائل میں ان پر بہت اچھے تبصرے ہوئے ہیں اسی طرح حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں فتنۂ ارتداد پر ڈاکٹر صاحب کی جو کتاب انگریزی میں شائع ہوئی ہے مسلمانوں کے علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی ہے۔ علاوہ ازیں جو شخص ڈاکٹر صاحب سے ذاتی طور پر واقف ہے وہ جانتا ہے کہ عربی کے عام پروفیسروں کی طرح انھوں مغربی لباس آج تک کبھی نہیں پہنا اور ان کا چہرہ خدا کے نور سے مزین بھی ہے اور اسی وضع قطع میں وہ مدت دراز سے اس علاقے میں رہتے ہیں جو مسلمانوں کی آبادی سے دور ہے اور جہاں اکّے دُکّے مسلمان ہی مل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے اخلاق وعادات کے اعتبار سے نہایت گوشہ نشین بے لوث اور بے غرض آدمی ہیں اور اپنے تجربہ کی بنا پر میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کو اپنے اور مفتی صاحب کے ساتھ نماز پڑھتے جمعہ کی نماز میں شریک ہوتے اور روزہ رکھتے بھی دیکھا ہے۔

---

(۲) برہان خالص علمی اور دینی ماہنامہ ہے اس میں جو مضامین شایع ہوتے ہیں وہ بغیر حوالہ کے نہیں ہوتے۔ بہت سے اچھے اچھے مضامین جو بغیر حوالہ کے دفتر برہان میں موصول ہوتے ہیں ان کو ناقابلِ اشاعت قرار دے کر واپس کر دیا جاتا ہے اس بنا پر اگر برہان کے کسی مضمون کے کسی حصہ سے کسی صاحب کو کوئی شکایت پیدا ہو تو ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ قابلِ شکایت عبارت کا حوالہ مضمون میں موجود ہے یا نہیں۔ اگر موجود ہے تو یہ حوالہ مسلمانوں کے نزدیک

معتبر کتاب کا ہے یا نہیں ۔ اگر کسی معتبر کتاب کا ہے تو پھر یہ دیکھنا چاہیئے کہ اصل عربی کی عبارت اور اردو کی عبارت میں مطابقت ہے یا نہیں۔ اگر مطابقت ہے تو اب معترض کا طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ مضمون نگار یا ایڈیٹر برہان کسی سے یہ دریافت کریں کہ اصل حوالہ کی کتاب میں یہ عبارت کیوں ہے اور اس کا کیا مطلب ہے اور اس پر جو اعتراض پڑتا ہے اس کا کیا جواب ہے اور اگر معترض کے ذہن میں حوالہ کی عبارت کے مقابل کسی اور کتاب کی کوئی عبارت ہے تو اس کو علمی انداز میں تحریر کر کے ایڈیٹر برہان کے پاس بھیج دیں ۔ ایڈیٹر کا یہ فرض ہوگا کہ وہ معترض کے اعتراض کو بھی برہان میں شایع کرے اور ایسا برابر ہوتا آیا ہے ۔

---

(۳) اب تک زبانی یا تحریری طور پر متعلقہ مضمون سے متعلق جو شکایات موصول ہوتی رہی تھیں ان سب کا حاصل ایک ہی بات تھی یعنی ان حضرات کو مضمون کے لب ولہجہ اور زبان سے شکایت تھی لیکن فاضل مکتوب نگار پہلے شخص ہیں جنھوں نے برہان اور مضمون کے متعلق ایسا شدید الزام لگایا ہے جس کو کوئی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا ۔ جہاں تک طرز بیان اور انداز تحریر کا تعلق ہے تو میں صاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ یہ انداز تحریر ہم لوگوں کو بھی قطعاً پسند نہیں ہے چنانچہ مفتی صاحب متعدد مرتبہ ڈاکٹر صاحب کو اس طرف توجہ دلا چکے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کا جواب یہ ہے کہ میں اردو اسی انداز میں لکھنا پسند کرتا ہوں جس انداز میں مورخین اسلام لکھتے ہیں ۔ مورخین اور محدثین صرف نام لکھتے ہیں اس کے ساتھ کوئی القاب یا آداب نہیں لکھتے ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ جب سے مسلمانوں نے اس راہ کو چھوڑ کر بزرگوں کے ناموں کے ساتھ القاب و آداب کی بھرمار کی ہے وہ صرف رسم پرستی کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں

اور حقیقت سے بہت دور ہو گئے۔ میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی یہ دلیل درست نہیں کیونکہ املاء اور انشاء کے آداب کا جہاں تک تعلق ہے اس زبان کی رعایت رکھنی ضروری ہے جو ترجمہ کی زبان ہے نہ کہ عربی یا اور کوئی زبان جس سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں سورج مؤنث ہے لیکن ہم اُردو میں لکھیں گے تو لازمی طور پر طلعت الشمس کا ترجمہ سورج نکل آیا کریں گے۔ یہ میرا پختہ اور قطعی خیال ہے چنانچہ آپ میرے کسی مضمون میں "قل" کا ترجمہ "توکہہ" نہیں دیکھیں گے۔

---

(۴) لیکن میں اپنے اس خیال میں پختہ ہونے کے باوجود اپنا فکر دوسروں پر تھوپنا پسند نہیں کرتا کیوں کہ برہان ایک علمی پرچہ ہے اس بنا پر اتنی رواداری اس کے لئے ضروری ہے اور خصوصاً اس لئے کہ طرزِ تحریر کے بارے میں ہمارے مفسرین و مترجمین مختلف رہے ہیں ایک طبقہ جو حضرت شاہ رفیع الدین اور اُن کے متبعین پر مشتمل ہے وہ قرآن کے صیغوں کے تتبع میں واحد مذکر حاضر کا صیغہ استعمال کرنا ہی مناسب سمجھتا ہے لیکن علماء اور مفسرین کا ایک اور طبقہ ہے جو اس کو پسند نہیں کرتا اور حضور کے لئے تثنیہ یا جمع مذکر حاضر کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ میں اگرچہ ذاتی طور پر موخر الذکر طریقہ کو پسند کرتا ہوں لیکن اول الذکر طریقہ کو بھی غلط یا نامناسب نہیں کہتا۔

---

(۵) جہاں تک میرے اپنے احساس کا تعلق ہے میں قارئین برہان کو یقین دلاتا ہوں کہ متعلقہ مضمون کے جس حصہ سے مجھ کو سخت تکلیف پہونچی ہے

وہ وہ ہے جس میں ان ھی الاثلث الغرانیق العلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والا واقعہ ڈاکٹر صاحب نے نقل کیا ہے میں کبھی اس واقعہ کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے اپنی طبیعت کو آمادہ نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ واقعہ شانِ نبوت اور مقامِ نبوت کے قطعاً خلاف ہے اور اسی بنا پر میں نے ارادہ کیا تھا کہ مضمون کے ختم پر میں خاص اس واقعہ کے متعلق ایک تحقیقی مضمون شائع کروں گا اور وہ مضمون میرے پاس موجود ہے لیکن جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ روایت صحیح بخاری میں موجود ہے اور حافظ ابن حجر کو فتح الباری میں اس روایت کی صحت پر اصرار ہے تو اب کوئی شخص اس واقعہ کو نقل کرتا ہے تو برہان کی علمی رواداری کو اس کے حک و فک کا کیا حق پہنچتا ہے۔

---

(۶) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات و سرایا کے باب میں تاریخ و سِیَر کی کتابوں میں متعدد واقعات ایسے نظر آتے ہیں جو میرے نزدیک صحیح نہیں ہیں یا مبالغہ آمیز ہیں اس لئے جب کبھی میں خود سیرت پر کوئی کتاب لکھوں گا تو ان روایتوں کو نظر انداز کر دوں گا۔ لیکن اگر کوئی شخص ان روایتوں کو امہاتِ کتب تاریخ و سِیَر کے حوالے سے نقل کرتا ہے تو میں اس میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ آخر کوئی شخص کتنا ہی بڑا مسلمان ہو ابن سعد۔ واقدی ۔ عروۃ بن زبیر۔ ابن ہشام اور طبری سے زیادہ بڑا مسلمان تو نہیں ہو سکتا۔

---

(۷) عالم اسلام میں اس وقت جو علمی ہما ہمی اور تحقیق و تنقید کی گرم بازاری ہے اس کی وجہ سے عالم اسلام کے محققین جملہ قدیم اسلامی علوم و فنون کی از سر نو تحقیق و تنقید کا کام کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس کے بعد پانی کا پانی اور دودھ کا دودھ الگ ہو جائے گا۔ بُرہان کی کی خواہش ہے کہ یہ کام ہندوستان میں بھی ہونا چاہئے اور اس کی صورت یہی ہے کہ جو کچھ رطب و یابس ہماری قدیم کتابوں میں موجود ہے اس کی تحقیق اور تنقید کر کے زرِ خالص کو ملاوٹ سے الگ کر دینا چاہئے یہ وقت کا بہت بڑا تقاضہ ہے اور علماء کا فرض ہے کہ وہ اس طرف متوجہ ہوں۔

---

(۸) آخر میں فاضل مکتوب نگار اور ادارہ الجمعیۃ دہلی سے یہ شکایت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ برہان اور ندوۃ المصنفین اور اس کے کارکن ان دونوں کے لئے اجنبی نہیں بلکہ جانے پہچانے لوگ ہیں اس بنا پر اگر فاضل مکتوب نگار اپنا خط اخبار میں اشاعت کے لئے بھیجنے سے قبل مفتی صاحب یا ایڈیٹر برھان کے نام یہ خط بھیج دیتے اور اسی طرح اگر اخبار الجمعیۃ اس خط کو شایع کرنے سے پہلے دفتر برھان میں مفتی صاحب یا میرے نام بھیج دیتا اور ہم سے وہ اس کا جواب طلب کرتا تو یہ زیادہ قرینِ صواب ہوتا۔ ایک موہوم خیال پر مکتوب نگار کا نہایت اشتعال انگیز خط لکھنا اور ادارہ الجمعیۃ کا اس کو نمایاں طور پر شایع کرنا بُرھان اور ندوۃ المصنفین جیسے مشہور نیک نام اور خادم ملت و دین اداروں کے ساتھ دوستی کا کوئی اچھا ثبوت نہیں ہے۔ واللہ شہید علی ما اقول۔

افسوس ہے کہ ایڈیٹر برہان کی علالت (فلو) کی وجہ سے اس مہینہ کا برہان علی گڑھ پر مضمون کی سترھویں قسط اور تبصروں سے خالی جارہا ہے۔ یہ مندرجہ بالا سطور بھی ایک دوست سے املا کرائی گئی ہیں خود لکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ انشاء اللہ آئندہ مہینے میں اس کی تلافی کردی جائے گی۔

بیان ملکیت وتفصیلات متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم قاعدہ ۸

۱۔ مقامِ اشاعت	اُردو بازار جامع مسجد دہلی	۴۔ ناشر کا نام	حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں
۲۔ وقفہ اشاعت	ماہانہ	۵۔ اڈیٹر کا نام	مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم۔ اے
۳۔ طابع کا نام	حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں		
قومیت	ہندوستانی	قومیت	ہندوستانی
سکونت	اُردو بازار جامع مسجد دہلی	سکونت	تغلق آباد۔ نئی دہلی
۶۔ مالک	ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۶		

میں محمد ظفر احمد خاں ذریعہ ہذا اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم واطلاع کے مطابق صحیح ہیں

مورخہ ۱۵ر فروری ۱۹۶۱ء

عہدِ نبوی کا تاریخی جائزہ

(۷)

از جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب پروفیسر عربی دلی یونیورسٹی

معرکۂ خندق

رسول اللہؐ کی قریش سے تیسری اور آخری بڑی لڑائی جو معرکۂ خندق کے نام سے مشہور ہے اُحد کے تقریباً دو ۲ سال بعد مدینہ کے شمال مغرب میں سَلع نامی پہاڑی کے قریب ذوالقعدہ ۵ھ میں واقع ہوئی۔ اُحد میں قرشی اکابر رسول اللہؐ کا خاتمہ کرنے میں ناکام ہو کر جو ان کا اولین مقصد تھا، تیسری فیصلہ کن جنگ کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ وہ آس پاس کے عرب قبیلوں کو جو ان کے حلیف تھے رسول اللہؐ کے خلاف اُکساتے رہتے تھے اور نجد کے طاقتور قبیلوں (اسد، فزارہ، سُلَیم، اَشجع، مُرّہ) کو جو مدینہ کے مضافات میں بیس ۲۰ پچیس سے پچاس ساٹھ میل شمال، شمال مشرق اور شمال مغرب میں آباد تھے۔ اس خطرہ سے آگاہ کر کے جو رسول اللہؐ کے وجود سے ان کے مذہب، سالمیت اور گھاس پانی کی تلاش میں آزادانہ نقل و حرکت کو لاحق تھا، متحد و مسلح ہو کر اُن کے خلاف جارحانہ کارروائی کے لئے بھڑکاتے رہتے تھے جس کے زیرِ اثر وہ وقتاً فوقتاً اپنے پڑوسیوں کے تعاون سے اور کبھی یکہ و تنہا مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے اپنی بستیوں سے نکل کھڑے ہوتے اور مدینہ کے باہر اہالی شہر کے ریوڑوں کو پکڑ لے جاتے یا مسلمان مسافروں کو لوٹ لیتے۔ ان قبیلوں کی سرکوبی کے لئے رسول اللہؐ برابر فوجی دستے (سَرایا)

بھیجتے رہتے تھے، یہ قبیلے بالعموم مدینہ کے دستوں کی خبر پاکر بھاگ جاتے اور پہاڑوں میں روپوش ہوجاتے۔ رسول اللہؐ کی فوج ان کے ادھر اُدھر چرتے ہوئے مویشی یا ان کی بستی کی عورتوں بچوں کو پکڑ کر مدینہ لے آتے تھے اور مالِ غنیمت کے پانچ حصوں میں سے ایک خمس کے نام سے رسول اللہ کو دے کر باقی آپس میں بانٹ لیتے، تقریباً ڈیڑھ سال پہلے بنو نضیر کا اخراج عمل میں آیا توان کے صفِ اول کے لیڈر۔ حیی بن اخطب، ابو یاسر بن اخطب، سلام بن ابی حقیق، ابو رافع کنانہ بن ابی حقیق، ربیع بن ابی حقیق، رافع بن ابی حقیق اور سلام بن مشکم مع اپنے خاندانوں کے خیبر میں مقیم ہوگئے تھے اور ان کے باقی ہم قوم شام چلے گئے تھے۔ یہ اکابر اوس کے غیر مسلم طبقہ کے متعدد اعیان اور خاص طور پر بنو عمرو بن عوف کے خاندان وائل کے ممتاز اشخاص کا ایک وفد لے کر مکہ آئے اور قریشی اکابر سے قینقاع اور نضیر کے ساتھ رسول اللہؐ کے سلوک کی شکایت کرکے درخواست کی کہ اپنے شایانِ شان ایک فوج لے کر چلیں اور مدینہ پر حملہ کرکے رسول اللہؐ اور ان کی فوجی مشین کا خاتمہ کردیں۔ قریشی اکابر نے مدینہ کے آخری یہودی قبیلہ قریظہ کے رجحانات کے بارے میں پوچھا تو وفد نے بتایا کہ وہ رسول اللہؐ کے زوال کے آرزومند ہیں، ان میں اتنی طاقت نہیں کہ رسول اللہؐ سے ٹکر لیں لیکن ان سے متصادم ہونے والوں سے تعاون کے لئے ضرور تیار ہوجائیں گے۔ اکابر نے وفد سے باہمی مدد کا عہد وپیمان کرکے رسول اللہؐ کے خلاف لڑائی کا وقت طے کرلیا۔ نضری اکابر مکہ سے خیبر واپس آکر پڑوس کے عرب قبیلوں کے سرداروں سے ملنے گئے، اُس سلوک کی ان سے شکایت کی جو رسول اللہؐ نے ان کے اور ان کے ہم مذہب قینقاع کے ساتھ کیا تھا، انھیں اس خطرہ سے آگاہ کیا جو رسول اللہؐ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے حجاز کے عربوں کی آزادی، مذہب اور معیشت کو درپیش تھا اور اس خطرہ کے استیصال کے لئے انھیں رسول اللہؐ سے لڑائی کے لئے اکسایا، جن قبیلوں نے اپنی ناداری یا کمزوری کا عذر پیش کیا انھیں خیبر کی ایک سال کی پیداوار یا اس کا کچھ حصہ دینے کا وعدہ کرلیا اور انھیں اطمینان دلایا کہ ان کی پشت پناہی کے لئے قریش نے ایک بڑی فوج لے کر آنے کا وعدہ کرلیا ہے، یہ قبیلے لڑائی کے لئے تیار ہوگئے۔ دو ڈھائی ماہ بعد قریشی اکابر چار ہزار فوج لے کر مدینہ روانہ ہوئے، اس میں تین سو گھوڑے

اور پندرہ سو اونٹ تھے، اس میں قریش کے حلیف قبیلوں مع احابیش، کنانہ اور ثقیف کے متعدد دستے بھی تھے۔ یہ فوج اُحد کے جنوب اور مدینہ کے شمال میں سلع نامی پہاڑی کے سامنے ایک وسیع میدان میں خیمہ زن ہوئی۔ یہاں خیبر میں مقیم نضری اکابر۔ حیّی بن اخطب، سلام بن ابی حُقیق، کنانہ بن ابی حُقیق وغیرہ اور نجدی قبائل۔ اسد، فزارہ، سُلیم، مُرہ، اشجع اپنے اپنے اکابر کی قیادت میں فوجیں لے کر آن سے آملے، ان میں قبیلہ اسد کے دستہ کا قائد مشہور رِدّہ لیڈر اور مدعی نبوت طلیحہ بن خُویلد بھی تھا۔ عربی روایت کے ایک اسکول کی رائے میں اتحادی فوجوں کی مجموعی تعداد دس[1] ہزار اور رسول اللہ کی فوج کی تین ہزار تھی، ایک دوسرے اسکول کے مطابق اتحادیوں کی تعداد چار ہزار اور مسلمانوں کی ایک ہزار[2] اور ایک تیسرے فریق کی رائے میں کل سات سو تھی[3]۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ رسول اللہؐ کے لشکر میں نمائشی مسلمانوں کا لیڈر عبداللہ بن اُبیؑ موجود تھا یا نہیں یا اس کے کتنے متبعین رسول اللہؐ کے ساتھ تھے، بس اتنا معلوم ہے کہ اس کے متبعین اور کچھ دوسرے مسلمان بھی رسول اللہؐ پر نقد کر کے ان کی فوج میں بد دلی پیدا کرنے والی باتیں کرتے رہتے تھے مثلاً یہ کہ محمدؐ کسریٰ، قیصر اور یمن کے محلوں کی فتح کی باتیں کرتے ہیں جبکہ ہماری بے بسی کا حال یہ ہے کہ قضائے حاجت کے لئے خیمہ سے نکلنا مشکل ہے، بخدا یہ سب دھوکہ کی باتیں ہیں[4]۔ رسول اللہؐ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ دشمن کے بڑے لشکر کا کس طرح مقابلہ کیا جائے ایک فارسی نژاد نو مسلم سلمانؓ نے رائے دی کہ مدینہ کے سامنے دشمن کے رُخ پر خندق کھود لی جائے تاکہ اس کی کثیر پیادہ اور رسالہ فوج کو مرضی کے مطابق مسلمانوں پر ہجوم کرنے کا موقع نہ مل سکے اور مسلمان خندق کی آڑ میں تیر اندازی اور پتھر باری کر کے اپنا دفاع کر سکیں۔ خندق کی تجویز منظور کر لی گئی، قبیلوں

---

[1] ابن سعد ۲/ ۶۶

[2] سمہودی ۱/ ۳۰۱

[3] یعقوبی ۲/ ۵۰

[4] طبری ۳/ ۴۷، مغازی ص۲۶۳، یعقوبی ۲/ ۵۱ -

کو اپنے اپنے محلوں کے سامنے خندق کھودنے کا کام سپرد کردیا گیا، بہت سے متذبذب اور منافق مسلمان خندق کھودنے کی مشقت سے جی چرانے لگے اور رسول اللہؐ کی بغیر اجازت کام چھوڑ کر اپنے گھروں کو چلے گئے، مناسب فاصلوں پر خندق میں کئی کئی گز چوڑی زمین بطور رہ گذر بے کھدی چھوڑ دی گئی تاکہ جب موقع ملے مسلمان ان راستوں سے ہو کر دشمن پر حملہ کر سکیں، راستوں پر مسلح پہرہ لگا دیا گیا۔ عرب خندقی جنگ کے آداب سے بالکل ناواقف تھے اور اس خندق نے ان کی پیادہ اور رسالہ فوج کو تقریباً معطل کر دیا، ان کے رسالوں نے چند کوششیں خندق میں گھسنے کی کیں لیکن راستوں کے پہرے داروں اور خندق میں محصور مسلمان فوج نے انھیں مار بھگایا، ہر روز زیادہ تر تیر باری اور پتھر اندازی کے بعد جنگ ختم ہو جاتی۔ اتحادی فوج کے اعلیٰ کمانڈر ابوسفیان بن حرب نے نضری اکابر کی معرفت بنو قریظہ کے پاس پیغام بھیجا کہ ان کا ایک دستہ مسلح ہو کر اتحادیوں سے آملے اور دوسرا مدینہ جا کر مسلمانوں کے بال بچوں پر حملہ آور ہو تاکہ رسول اللہؐ کی فوج میں گھبراہٹ پیدا ہو جائے اور وہ اپنے متعلقین کی حفاظت کے لئے خندق کا حصار چھوڑ کر بھاگ جائیں اور اتحادی فوج پیچھے سے آکر ان کا ستھراؤ کر دے۔ قریظہ کی بستیاں مدینہ کے جنوب مشرق میں واقع تھیں اور چوں کہ دشمن مدینہ کے شمال میں خیمہ زن تھا اس لئے ادھر خندق نہیں بنائی گئی تھی، نضری لیڈر قریظہ کے اکابر سے ملے اور انھیں ابوسفیان کا پیغام پہنچایا لیکن وہ مسلح تعاون کرنے کو تیار نہیں ہوتے، انھوں نے کہا کہ ہم محمدؐ کو زبان دے چکے ہیں کہ ان کے دشمن کی مدد نہیں کریں گے، ہم یہ معاہدہ نہیں توڑیں گے، اس کا انجام برا ہوگا، جنگ میں اتحادیوں کو شکست ہوئی یا وہ بغیر لڑے چلے گئے تو محمدؐ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ نضری اکابر نے اپنے کیس کی بڑے جوش اور مبالغہ آمیز الفاظ میں وکالت کی اور بتایا کہ رسول اللہؐ کی چھوٹی سی فوج کے مقابلہ میں اتحادی ایک عظیم لشکر لائے ہیں جس میں تین سو سے زیادہ رسالہ فوج ہے اور اس کی قیادت قریش کے لائق اکابر کے ہاتھ میں ہے جنھوں نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ محمدؐ کا استیصال کئے بغیر گھر واپس نہیں جائیں گے قرظی اکابر مطمئن نہیں ہوتے، بڑی قیل و قال اور نضری اکابر کی جذبات انگیز دلیلوں سے متاثر ہو کر اور عقل کا دامن چھوڑ کر قریظہ کے اکثر لیڈر بادل ناخواستہ مسلح تعاون کے لئے

آمادہ ہو گئے لیکن یہ چار خاندان معاہدہ پر ثابت قدم رہے۔ سعنہ، اسد، اُسید اور ثعلبہ اور ان کے نمایندوں نے رسول اللہؐ کے پاس جا کر اپنی وفاداری کی توثیق کر دی[1]۔

رسول اللہؐ کو خبر ملی کہ بنو قریظہ معاہدہ توڑنے کو تیار ہو گئے ہیں تو وہ اور صحابہ پریشان ہوئے، انھیں یہ اندیشہ دامنگیر ہوا کہ قریظہ اوس کے غیر مسلم یا نمائشی مسلمانوں کے ساتھ مدینہ کے جنوب سے جدھر خندق نہیں تھی ان کے بال بچوں پر حملہ کر کے عقب سے خود ان پر ہجوم کر دیں گے اور سامنے سے اتحادی موقع پا کر ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور ان کے لئے اپنا دفاع ناممکن ہو جائے گا۔ رسول اللہؐ کے کیمپ میں سخت بے چینی، ہراس اور اداسی چھا گئی جس کی جھلک قرآن کی اس آیت اور عربی روایت کے مندرجہ ذیل الفاظ میں نظر آتی ہے اذجاؤکم من فوقکم ومن أسفل منکم واذا زاغت الأبصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنون۔ جب نجدی فوج شمال سے اور قرشی فوج جنوب سے تمھارے مقابلہ کے لئے آئی، جب مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، ان کے دل بلیوں اُچھلنے لگے اور خدا کی طرف سے تمھارے دماغ میں بدظنی پیدا ہونے لگی۔ ونجم النفاق وفشل الناس وعظم البلاء واشتد الخوف وخيف على الذراري والنساء[2]۔ منافقت نے سر اُٹھایا، مسلمان لڑنے سے جان چرانے لگے، سخت آزمائش کا سامنا تھا، مسلمانوں پر خوف و ہراس چھا گیا اور انھیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ دشمن ان کے بال بچوں پر حملہ کر دے گا۔ رسول اللہؐ نے دو دو سو، تین تین سو آدمیوں کے دستے مامور کئے کہ جو شہر کے محلوں میں جا کر اللہ اکبر کے نعرے لگاتے رہیں تاکہ قریظہ کو معلوم ہو جائے کہ شہر میں دفاع کا انتظام ہے اور انھیں مسلمانوں کے بال بچوں یا عقب سے رسول اللہؐ کے کیمپ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو، اس ہیبت و ہراس کے ایام میں رسول اللہؐ نے اتحادی فوج کے بعض طاقت ور نجدی قبیلوں کو توڑنے کے لئے انصار کے نخلستانوں کی ایک تہائی پیداوار دینے کی پیشکش کی لیکن انصاری اکابر اس کے لئے تیار نہیں ہوئے[3]

---

[1] ابن کثیر ۴/ ۱۰۳ [2] ابن سعد ۲/ ۶۷

[3] ابن سعد ۲/ ۶۹

پے چینی کے انہی ایام میں ایک عرب رسول اللہؐ کے جنگی اُفق پر نمودار ہوا جس نے ایسی چالیں چلیں کہ اتحادیوں کے لشکر میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ ایک دوسرے سے بددل ہو کر رسول اللہؐ کے استیصال کی مہم ناتمام چھوڑ کر گھر لوٹ گئے۔ یہ عرب جس کا نام نُعیم بن مسعود تھا قبیلہ غطفان کی شاخ اَشجع کا ایک ممتاز شخص تھا، جنگِ خندق کے دوران مسلمان ہوا اور رسول اللہؐ سے بولا: میرے اسلام کا علم نہ میرے قبیلہ کو ہے نہ قریش کو، آپ کا جو حکم ہو بجا لانے کو تیار ہوں۔ انھوں نے کہا کوئی ایسی صورت نکالو کہ اتحادیوں میں پھوٹ پڑ جائے اور وہ ہمارے خلاف لڑنے سے باز رہیں۔ نُعیم اس کے لئے تیار ہو گیا، پہلے وہ قُریظہ کے اکابر سے ملا جن سے اس کے اچھے مراسم تھے، اس نے کہا: آپ لوگوں کو میری دوستی اور اخلاص کا علم ہے، میں اس کا حق ادا کرنا چاہتا ہوں، قریش اور غطفان (نجدی قبائل) باہر کے قبیلے ہیں، وہ اگر جنگ میں ہار گئے تو اپنے وطن واپس چلے جائیں گے، تم یہاں بے سہارا اور کمزور ہو کر رہ جاؤ گے اور مسلمان تمھارا استحصال کر کے تمھارے املاک پر قابض ہو جائیں گے اس لئے بہتر ہے کہ مسلح تعاون کے نتائج پر غور کر لو، میری رائے ہے کہ مدد کرنے سے پہلے قریش کے ستر بڑے آدمی بطور یرغمال لے لو اس شرط پر کہ وہ آخر دم تک محمدؐ سے لڑیں گے اور تمھیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے، قُریظی اکابر نے اس مشورہ کی قدر کی اور اس پر عمل کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد نُعیم قریشی لیڈروں سے ملا اور بولا: آپ لوگ میری دوستی اور خیراندیشی سے خوب واقف ہیں، آپ کے بھلے کی بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بنو قُریظہ اس بات پر نادم ہیں کہ انھوں نے محمدؐ سے معاہدہ توڑ کر تمھاری مدد کا وعدہ کر لیا ہے، انھوں نے محمدؐ کے پاس ایلچی بھیجے ہیں کہ ہم معاہدہ توڑنے پر نادم ہیں، کیا تمھارا دل ہماری طرف سے اس طرح صاف ہو سکتا ہے کہ ہم قریش و غطفان (نجدی قبائل) سے لڑیں اور ان کا استیصال کر ڈالیں، محمدؐ نے ہماری پیشکش قبول کر لی ہے اندریں حالات اگر قُریظہ کے اکابر تم سے یرغمال طلب کریں تو تم دینے سے انکار کر دینا۔ اس کے بعد نُعیم غطفانی سرداروں سے ملا اور بولا: تم میرے ہم قوم اور رشتہ دار ہو اور یقیناً میری نیت اور اخلاص پر شبہ نہیں کرو گے میں جو کچھ کہوں اسے اپنے تک ہی محدود رکھنا، اس کے بعد نُعیم نے وہ بات کہی جو قریشی اکابر سے کہی تھی

اور ان سے یرغمال نہ دینے کی تاکید کر دی۔ جمعہ کی رات کو قریش نے اپنے فوجی کمانڈر عکرمہ کی معرفت بنو قریظہ کو یہ پیغام بھیجا کہ جیسا تم لوگوں کو معلوم ہے یہ علاقہ ہمارے وطن سے بہت دور ہے، ہمارے گھوڑے اور اونٹ کافی تعداد میں خوراک کی کمی کے باعث مر چکے ہیں، کل صبح مسلح ہو کر آجاؤ تاکہ سب مل کر محمدؐ سے لڑیں اور ان کا استیصال کر دیں۔ قرظی اکابر نے کہلا بھیجا کہ کل سبت (ہفتہ) ہے اور اس دن ہم کوئی فوجی اقدام نہیں کر سکتے، ہم تمھارے ساتھ مل کر اسی وقت لڑ سکتے ہیں جب تم اپنے ستر بڑے آدمی بطور یرغمال ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہمیں اطمینان ہو جائے کہ تم محمدؐ سے آخر وقت تک لڑو گے ان سے سمجھوتہ نہیں کرو گے اور نہ میدان چھوڑ کر بھاگو گے ورنہ ہماری شامت آجائے گی اور اکیلا پاکر محمدؐ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ پیغام قریش کو موصول ہوا تو ان کے اکابر نے کہا کہ نعیم بن مسعود نے جو بات کہی تھی بالکل صحیح ہے، انھوں نے بنو قریظہ سے کہلا بھیجا کہ ہم تمھیں فرد واحد تک بطور یرغمال نہیں دے سکتے، اگر محمدؐ سے لڑنا ہے تو فوراً تیار ہو کر آجاؤ۔ یہ پیغام پاکر قریظہ نے کہا کہ نعیم نے سچ کہا تھا، قریش کے دل میں چور ہے، اگر محمدؐ کا دباؤ زیادہ بڑھا تو وہ چھوڑ کر وطن بھاگ جائیں گے اور اکیلا پاکر محمدؐ ہمارا صفایا کر دیں گے، انھوں نے قرشی اکابر سے کہلا بھیجا کہ بغیر یرغمال لئے ہم مدد نہیں کر سکتے، اس طرح اتحادی قریظہ کے تعاون سے محروم ہو گئے[۱]۔ اس محرومی کے علاوہ قریش کے لئے دو اور نامساعد حالات پیدا ہوئے جنھوں نے انھیں میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس سال بارش کے قحط کے باعث جانوروں کے چارہ اور خوراک کی بڑی کمی تھی، اکابر قریش کا خیال تھا کہ بدر اور اُحد کی طرح رسول اللہؐ سے تیسری جنگ بھی ایک دو دن میں ختم ہو جائے گی لیکن مدینہ پہنچ کر انھیں خلاف توقع کھلے میدان کی تیز رو جنگ کی بجائے محاصرہ کی دلدل میں پھنسنا پڑا اور یہ محاصرہ بغیر کسی فیصلہ کے تین ہفتے سے زیادہ چلتا رہا۔ اس اثنا میں ان کے گھوڑوں اور اونٹوں کی خوراک کا ذخیرہ ختم ہونے لگا، جانوروں کی ایک نامعلوم تعداد ہلاک ہو گئی اور جو بچے وہ کمزور اور لاغر تھے ایسے کہ اکابر قریش کو اندیشہ ہوا اگر وہ کچھ دن اور میدان جنگ میں ٹھہرے تو ان کے جانوروں

۱؎ ابن ہشام ص۶۸۳، مغازی ص۴۶۹

میں شاید اتنی توانائی بھی باقی نہ رہے کہ وہ مکہ تک انھیں پہنچا دیں، اس پریشانی کے عالم میں ایک نئی مصیبت یہ نازل ہوئی کہ جس دن قُریظہ نے بغیر یرغمال لئے مسلح مدد کرنے سے انکار کیا اس کے دوسرے روز پہلی آندھیاں چلنے لگیں جو ایسی تیز و تند تھیں کہ اتحادیوں کا سارا کیمپ تہ و بالا ہوگیا، سرد ایسی کہ جسم ٹھٹھرانے لگے، خاک بُری طرح آنکھوں میں بھرنے لگی، کھانے کی دیگیں ہوا کی شدت سے اُلٹ گئیں، آگ ٹھنڈی پڑگئی اور خیمے اکھڑ گئے۔ ان حوصلہ شکن حالات میں اکابر قریش نے بلاتاخیر وطن لوٹنے کا فیصلہ کر لیا جس کا ان کے کمانڈران چیف ابوسفیان بن حرب نے کیمپ میں اعلان کر دیا۔ چند گھنٹوں میں خندق کے پار رسول اللہؐ کے سامنے میدان اتحادیوں سے بالکل خالی تھا۔

قُریظہ کا استیصال

اتحادیوں کی واپسی کے اگلے دن رسول اللہؐ مدینہ واپس آگئے اور بعد دوپہر انھوں نے مہاجرین کی ایک فوج علی حیدرؓ کی قیادت میں قُریظہ کی بستیوں میں بھیجی جس نے قُریظہ سے مطالبہ کیا کہ خود کو ان کے حوالہ کردے، تھوڑی دیر بعد غسل سے فارغ ہوکر رسول اللہؐ خود بھی آگئے۔ قُریظہ کے دو[۲] قصور تھے: ایک یہ کہ وہ رسول اللہؐ سے کیا ہوا معاہدہ توڑ کر اتحادیوں کی مسلح مدد کے لئے تیار ہوگئے تھے اور دوسرے یہ کہ محاصرۂ خندق کے دوران جب رسول اللہؐ نے عہد شکنی کی تحقیق کرنے اور اس سے باز رکھنے کے لئے ایک وفد قُریظہ کے پاس بھیجا تو اُن کے اکابر نے وفد کے دو لیڈروں سعد بن مُعاذ اور سعد بن عُبادہ کے طرزِ عمل پر جو رسول اللہؐ کے سب سے بڑے انصاری مقرب اور اُوس و خزرج کے نقیب تھے سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم لوگوں نے ہمارا ایک بازو (یعنی بنو نضیر) توڑ ڈالا ہے، اسے واپس کردو، ورنہ ہم پر بھی معاہدہ کی پابندی لازم نہیں ہوگی، تم لوگ جھوٹے ہو، کہتے کچھ ہو کرتے کچھ ہو[۱] دونوں طرف سے تلخ لب و لہجہ میں الزامی باتیں ہونے لگیں، بنو قُریظہ نے انصار کو چھوٹا اس لئے کہا کہ قینقاع اور نضیر کا خزرج سے باہمی مدد اور ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ کارروائی نہ کرنے کا معاہدہ تھا

---

[۱] مغازی ص۴۵۸

جیسے خزرجی مسلمانوں نے رسول اللہؐ کے ساتھ دونوں قبیلوں کا محاصرہ کرکے توڑ دیا تھا، بنو قُریظہ اَوس کے حلیف تھے، انھیں اندیشہ تھا کہ وہ بھی آڑے وقت ان کی مسلح مدد نہیں کریں گے جیسا کہ یہ اندیشہ بعد میں حقیقت بن گیا، سعد بن مُعاذ تیز مزاج آدمی تھے، انھوں نے قُریظہ کو خوب بُرا بھلا کہا اور ان سے نفرت کرنے لگے، اِس موقع پر انھوں نے یہ دعا مانگی : اے خدا مجھے اس وقت تک نہ اٹھائیو جب تک قریظہ کا استیصال دیکھ کر میرا دل ٹھنڈا نہ ہو جائے[1] - وفد سے روداد ملاقات سن کر رسول اللہؐ نے بنو قریظہ کو عبرتناک سزا دینے کا فیصلہ کر لیا اور خندق سے واپس آکر ان کے استیصال کے لئے فوج بھیج دی، بنو قُریظہ گڑھیوں میں محصور ہو کر اپنے حلیفوں، ہمدردوں اور بہی خواہوں کی مدد کا انتظار کرنے لگے، کم و بیش دو ہفتہ تک طرفین میں وقتہً فوقتہً تیر اندازی ہوتی رہی جس سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا، اس اثنا میں اوس کے غیر مسلم عناصر اور نمائشی مسلمان اکابر قُریظہ کو پیغام بھیجتے رہے کہ ہم تمھاری مدد ضرور کریں گے، تم نہ تو ہتیار ڈالنا، نہ جلاوطن ہونا لیکن قَینقاع اور نَضِیر کی طرح قُریظہ سے بھی انھوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا، اس وعدہ خلافی کی تہ میں مدینہ کے اکابر کی طرف سے پڑنے والے وہ مختلف قسم کے دباؤ تھے جن پر ہمارے مراجع نے روشنی نہیں ڈالی ہے - پندرہ دن بعد ہر طرف مطلع تاریک دیکھ کر قُرظی اکابر نے رسول اللہ کو پیغام بھیجا کہ ہم جلاوطنی کے لئے تیار ہیں، ہمیں بسلامتی شہر چھوڑنے کی ضمانت دی جائے - رسول اللہ نے کہلا بھیجا کہ بلا شرط ہتیار ڈال دو، تمھاری قسمت کا فیصلہ میں خود کروں گا - اکابر نے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ ابو لُبابہ کو مشورہ کے لئے ان کے پاس بھیج دیں، یہ قبیلۂ اوس کے جن سے قُریظہ کا حلف تھا ایک ہمدرد اور خیر اندیش عرب تھے، ابو لُبابہ جب گڑھی میں پہنچے تو بچے اور عورتیں روتی ہوئی اور قُرظی اکابر تصویر غم بنے اُن کے سامنے آئے اور ان سے رائے لی کہ موجودہ حالات میں انھیں کیا کرنا چاہئے - ابو لُبابہ نے کہا کہ بلا شرط ہتیار ڈال دو، اکابر نے پوچھا ہمارے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جائے گا تو انھوں نے اپنے حلق پر انگلی پھیری یعنی رسول اللہؐ تمھارے سارے بالغوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں - چند دن اکابر نے اور انتظار کیا کہ شاید مدد کرنے

---

[1] مغازی ص ۵۱۲

والے آجائیں ان کے لئے اپنے وطن میں باعزت جینے کی کوئی راہ نکل آئے لیکن جب کوئی مددگار نہیں آیا تو اکیسویں دن انھوں نے اوسی اکابر کو پیغام بھیجا کہ معاہدہ کے مطابق تم ہماری مسلح مدد تو کر نہیں سکے، اب اتنا ہی کرو کہ جس طرح عبداللہ بن اُبی نے رسول اللہؐ سے سفارش کر کے اپنے حلیف قینقاع کی جان بخشوائی تھی اسی طرح تم بھی سفارش کر کے ہمیں جان کی امان دلوا دو، اوسی لیڈروں کی ایک جماعت نے رسول اللہؐ سے سفارش کی تو انھوں نے کہا کہ اس معاملہ میں اپنے بڑے لیڈر اور نقیب سعد بن مُعاذ کو حکم بنا دو، وہ قُریظہ کے حق میں جو فیصلہ دیں اس پر عمل کیا جائے، رسول اللہؐ کو معلوم تھا کہ سعد بن مُعاذ قُریظہ کے بد اندیش ہیں، اس وقت سعدؓ مسجد کے ایک خیمہ میں صاحب فراش تھے، خندق کی جنگ میں ان کے بازو پر تیر لگا تھا جس سے ان کی بڑی رگ کٹ گئی تھی، خیمہ میں ایک عورت اُن کی مرہم پٹی کرتی تھی، اوسی لیڈر سعد بن مُعاذ کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ رسول اللہ نے تمھیں حکم بنایا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ قُریظہ کی جان بخش دی جائے، سعد بن مُعاذ بھاری بھرکم آدمی تھے، ایک گدھے پر سوار ہو کر رسول اللہؐ کے پاس پہنچے تو انھوں نے ساتھیوں سے کہا: کھڑے ہو کر اپنے سید کا استقبال کرو۔ رسول اللہؐ نے سعد کو صورت حال سے مطلع کر کے کہا کہ قُریظہ کی قسمت کے بارے میں فیصلہ دیں۔ محاصرۂ خندق کے دوران جب سعد اکابر قُریظہ سے معاہدہ برقرار رکھنے کی اپیل کرنے گئے تھے تو اس وقت اکابر کی باتوں سے ان کے دل میں سخت کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے کہا میرا فیصلہ یہ ہے کہ قُریظہ کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا جائے، بال بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کی اراضی اور مکانات مہاجرین میں تقسیم کر دئے جائیں[1]

قُریظہ کے بالغ مردوں کو گرفتار کر کے ایک مکان میں اور ان کی عورتوں بچوں کو دوسرے مکان میں بند کر کے پہرہ لگا دیا گیا، بالغ مردوں کی تعداد چھ اور سات اور بقول بعض آٹھ اور نو سو کے درمیان تھی[2]۔ رسول اللہؐ نے مدینہ کے بازار میں گڑھے کھدوائے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں جا بیٹھے، قُریظہ کے

---

[1] یعقوبی ۲/ ۵۲، ابن سعد ۱/ ۷۷

[2] ابن کثیر ۴/ ۱۲۲، ۱۲۴، سمہودی ۱/ ۳۰۸

دس دس آدمی لائے جاتے اور گڑھوں کے کنارے قتل کر دیے جاتے ۔ . . . .

. . . . رسول اللہؐ کا سب سے بڑا مخالف حُیَیّ بن اَخطَب نَضری جس نے قُریظہ کو معاہدہ توڑ کر اتحادیوں کا ساتھ دینے پر مجبور کیا تھا گڑھے کے پاس لایا گیا تو رسول اللہؐ نے اس سے کہا: حُیَیّ دیکھا خدا نے تجھے کیسا ذلیل کیا، اس نے جواب دیا: ہر شخص کا انجام موت ہے، میں مقررہ عمر سے زیادہ نہیں جی سکتا، مجھے تمھاری عداوت پر نہ پشیمانی ہے نہ ملال، دنیا سے جاتے وقت میں شہادت دیتا ہوں کہ تم جھوٹے ہو[۱]۔ قُریظہ کی منقولہ دولت میں سے رسول اللہؐ کو یہ ہتھیار ملے: پندرہ سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے، ڈیڑھ ہزار ڈھالیں[۲]۔

بنو نضیر کی طرح قُریظہ کا پیشہ بھی زراعت اور باغبانی تھا، ان دونوں پیشوں میں انھوں نے اپنی محنت، لگن اور مہارت سے بڑی ترقی حاصل کر لی تھی، دور دور تک ان کے فارم اور نخلستان پھیلے ہوئے تھے۔ نضیر کے اَملاک کی طرح رسول اللہؐ نے قُریظہ کی منقولہ و غیر منقولہ دولت بھی اپنی تحویل میں لے لی، فوج میں تقسیم نہیں کی، عمر فاروقؓ نے اُن سے کہا کہ آپ نے بدر کے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ لے کر باقی قرآنی آیت کے بموجب فوج میں تقسیم کیا تھا، قُریظہ کا مالِ غنیمت اس طرح کیوں تقسیم نہیں کر رہے ہیں، وہ بھی تو لڑ کر حاصل کیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ نے جواب دیا کہ خدا نے چند عرب بستیاں مجھے دینے کا وعدہ کر لیا ہے اور قُریظہ کی بستی بھی انہی میں سے ایک ہے۔ رسول اللہؐ نے اپنے قول کی توثیق میں یہ آیت پڑھی: ما أفاء اللّٰہ علی رسولہ من اھل القُری فللّٰہ وللرسول ولذی القربٰی[۳] فریضۃ۔ رسول اللہؐ نے قُریظہ کے مکانات، گڑھیاں اور بہت سے فارم نیز نخلستان اپنے ہاشمی و مطلبی اقارب نیز دوسرے قریشی صحابیوں میں بانٹ دیے۔ بدر کے بعد سے رسول اللہؐ اور مہاجرین کے ہاتھ مدینہ سے باہر عسکری مہموں

---

[۱] ابن سعد ۷۵/۲، ابن ہشام صفحہ ۶۹۰، طبری ۵۶/۲

[۲] ابن سعد ۷۵/۲

[۳] مغازی صفحہ ۲۳۷

(سرایا) سے حاصل ہونے والی غنیمت سے جو روپیہ پیسہ، مویشی اور غلام حاصل ہوتے رہے تھے ان سے وہ مالی مشکلات بڑی حد تک دور ہو گئی تھیں جن سے ہجرت کے ڈیڑھ دو سال تک وہ دوچار رہے تھے لیکن قینقاع اور نضیر کے اخراج اور بنو قریظہ کے استیصال سے حاصل ہونے والی غیر منقولہ دولت (مکانات، دکانوں، اراضی، گڑھیوں، زراعتی فارموں اور نخلستانوں) نے ان کے لئے اقتصادی ترقی کی وسیع بنیادیں فراہم کر دیں، اس عظیم دولت کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ اور مہاجرین کے لئے مادی خوشحالی اور اُس پر مستزاد رسوخ وعزت اور ساکھ کے دروازے کھل گئے۔ ہجرت کے بعد مہاجرین کی رہائش انصار کے مکانوں میں تھی، انصار نے انھیں اپنی پیداوار میں بھی ساجھے دار بنا لیا تھا، بنو نضیر اور قریظہ کی غیر منقولہ املاک پر قابض ہوتے کے بعد مہاجرین نے انصار کے مکان واپس یا خالی کر دئے اور اپنے لئے الگ مکانات بنا لئے اور نخلستانوں کی پیداوار سے حصہ لینا بند کر دیا۔[1]

۶ھ میں رسول اللہ ﷺ نے جنگی نوعیت کی تقریباً ڈیڑھ درجن مہمیں روانہ کیں، ان میں سے دو کے وہ خود قائد تھے، ایک مہم کے علاوہ جو مدینہ کے جنوب میں مکہ سے پچاس ساٹھ میل شمال میں بمقام عسفان بھیجی گئی تھی، باقی ساری مہموں کا رخ مدینہ سے بیس تا ساٹھ ستر میل شمال، شمال مشرق اور شمالی مغرب میں وادی رمہ اور نجد کی سرزمین کی طرف تھا، ان مہموں کے دوران کوئی بڑی یا قابلِ ذکر جنگ نہیں ہوئی، نہ کوئی اراضی یا نخلستان رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ آیا، سات آٹھ ہزار اونٹوں اور بکریوں، کئی درجن غلاموں اور لونڈیوں نیز سامان کی ایک نامعلوم مقدار کا بس خمس ہی انھیں ملا۔ ان مہموں میں سے چند انتقامی تھیں اور اُن عربوں سے بدلہ لینے اور انھیں عبرتناک سزا دینے کے لئے بھیجی گئی تھیں جو مدینہ سے متصل چراگاہوں سے رسول اللہ ﷺ کی دودھ دیتی اونٹنیاں پکڑ لے گئے تھے یا مسلمان مسافروں کو قتل کر دیا تھا یا کسی مرسلہ مہم کے آدمیوں کو مار ڈالا تھا، نصف درجن کا نشانہ وادی رمہ اور نجد کے وہ مخالف قبیلے تھے جو رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں سے ساز باز کیا کرتے تھے یا مدینہ کے باہر اہالی شہر کے مویشی یا مسلمان تاجروں کو لوٹنے کا ارادہ رکھتے تھے، ایک

---

[1] فتح الباری (ابن حجر، مصر) ۳۵/۷، ۴۱۴/۸، قسطلانی (ارشاد الساری، مصر) ۳۶۵/۷

مہم مدینہ سے قریب چالیس میل شمال مغرب میں بمقام عیص قریش کا تجارتی قافلہ پکڑنے بھیجی گئی تھی جو شام سے آرہا تھا، اس قافلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مال دار تاجر داماد زینب کا شوہر ابوالعاص بھی تھا، یہ گرفتار ہو کر مدینہ لایا گیا، رسول اللہ نے اسے چھوڑ دیا اور اس کا سامان بھی واپس کرا دیا، قافلہ کا باقی مال و متاع خمس نکالنے کے بعد پکڑنے والوں میں تقسیم ہو گیا، معلوم نہیں خمس کی مالیت کیا تھی، قافلہ میں سامان تجارت کے علاوہ خام چاندی کی بڑی لیکن غیر متعین مقدار کی بھی تصریح کی گئی ہے[1]۔ ایک مہم کا رخ مدینہ کے شمال کا بڑا تجارتی مرکز، شام جانے والے راستوں کا ملتقی اور دور افتادہ نخلستان دُومۃ الجندل کا مضافاتی علاقہ تھا، دُومۃ الجَندل میں ایک کندی عیسائی خاندان کی حکومت تھی، شہر کے آس پاس دور تک ایک بڑا عیسائی قبیلہ کلب آباد تھا، ربیع الاول ۵ھ میں رسول اللہ نے دُومۃ الجندل پر اپنی قیادت میں یلغار کی تھی، ان کا مقصد قبیلۂ کلب کو تابع بنانا اور سرحدِ شام کے عیسائی حکمرانوں نیز نجد کے مطیع و غیر مطیع قبیلوں کو اپنی فوجی طاقت سے مرعوب کرنا تھا، ایک اطلاع کے مطابق اس یلغار کا محرک یہ خبر تھی کہ سرحد شام کے غسانی اور قضاعی عیسائی قبیلے دُومۃ الجندل کے قرب و جوار میں حجاز پر حملہ کے لئے جمع ہو رہے ہیں، رسول اللہ ایک ہزار منتخب فوج کے ساتھ اپنی نقل و حرکت مخفی رکھنے کے لئے دن میں چھپتے اور رات میں سفر کرتے دُومۃ الجنْدل کے قریب جا پہنچے، اُس وقت قبیلۂ کلب کے سارے خاص و عام غالباً پانی چارہ کی خاطر سرحد شام کی چراگاہوں کو گئے ہوئے تھے، رسول اللہ نے ان کے مویشی جو چرواہوں کی نگرانی میں وہ چھوڑ گئے تھے پکڑ لئے، اس کے بعد دُومۃ الجنْدل کے قلعہ بند شہر کا رخ کیا، یہاں کا حاکم ان کی خبر پا کر مع باشندگان شہر پہاڑوں میں جا چھپا تھا۔ رسول اللہ چند دن اُدھر تلاش کے بعد پکڑے ہوئے بہت سے مویشی لے کر مدینہ لوٹ آئے تقریباً ڈیڑھ سال بعد شعبان ۶ھ میں رسول اللہ نے اپنے ہم زلف اور بڑے قریشی تاجر عبدالرحمٰن بن عوف کو دُومۃ الجنْدل کے مضافات میں آباد قبیلۂ کلب پر چڑھائی کرنے کے لئے آمادہ کر لیا اور ایک رسالہ فوج دے کر انھیں بھیجا، عبدالرحمٰن کو تاکید تھی کہ اپنی نقل و حرکت حتی الامکان خفیہ رکھیں

---

[1] ابن سعد ۲/ ۷۸۔ ۹۱

دن میں چھپتے اور رات میں سفر کرتے اچانک کلب کی بستیوں میں داخل ہو گئے اور قبیلے کے عیسائی اکابر سے مطالبہ کیا کہ رسول اللہؐ کو نبی مان کر مسلمان ہو جائیں ورنہ اُن پر حملہ کر دیا جائے گا اور ہارنے کے بعد ان کے بالغ مردوں کو قتل اور بال بچوں کو غلام بنا لیا جائے گا۔ خوف زدہ ہو کر کلبی اکابر اوران کے بہت سے ہم قوم مسلمان ہو گئے، ایک اقلیت نے جزیہ دے کر جان مال کی امان حاصل کرلی، مہم پر بھیجتے وقت رسول اللہ نے عبدالرحمٰن بن عوف کو یہ ہدایت بھی کی تھی کہ اگر کلبی اکابر مسلمان ہو جائیں تو ان کے حاکم اصبغ بن عمرو کی لڑکی سے شادی کرلیں، اُس کی لڑکی کا نام تماضر تھا، عبدالرحمٰن اسے بیاہ کر مدینہ لوٹ آئے[۱]

چار مہمیں رسول اللہؐ نے اپنے چار مخالفوں کو قتل کرنے روانہ کیں۔ ان میں سے دو یہودی تھے، ایک بنو نضیر کا لیڈر ابو رافع سلام بن ابی حُقَیق، دوسرا خیبر کا حاکم اُسیر بن زارم، تیسرا رسول اللہ کا خسر اور قریشی زعیم ابوسفیان بن حرب، اور چوتھا قبیلۂ ہُذیل کا ایک رئیس سفیان بن خالد۔ ابو رافع یثرب سے جلاوطنی کے بعد خیبر میں مقیم ہو گیا تھا اور آس پاس کے عربوں کو رسول اللہؐ کے خلاف بھڑکایا کرتا تھا۔ اسے قتل کرنے پانچ خزرجی جوشیلے جوانوں کی ایک ٹولی خیبر گئی، رات کو دھوکہ دے کر اس کے کمرہ میں داخل ہو گئی اور اُسی طرح ابو رافع کو قتل کر دیا جس طرح کہ ان کے بشیر و اوسی جوانوں نے کعب بن اشرف، عصماء اور ابو عفک کو ہلاک کیا تھا، اُسیر بن زارم کے بارے میں رسول اللہ کو خبر ملی تھی کہ اُس نے غطفانی قبائل کے سرداروں کو ان سے جنگ کے لئے اکسایا ہے،

تیس انصاریوں کی ایک دوسری جماعت نے اُسیر بن زارم اور اس کے اُنتیس ساتھیوں کو خیبر سے چھ سات میل باہر ہلاک کر دیا۔ ہُذلی رئیس سُفیان بن خالد عرفات کے قریب وادی عُرنہ کے عربوں کو رسول اللہؐ سے لڑائی کے لئے متحد کرنے کی کوشش کر رہا تھا، رسول اللہؐ نے ایک شخص مامور کیا جس نے عُرنہ پہنچ کر خالد کو جب وہ سویا ہوا تھا مار ڈالا۔ ابو سفیان کے خلاف مہم ناکام ثابت ہوئی[۲]

معاہدۂ حُدَیبیہ

رسول اللہ کی قریش سے تین بڑی لڑائیاں ہو چکی تھیں لیکن ان کا مقصد وحید کہ قریشی اکابر ان کی نبوت و دعوت قبول کرلیں پورا نہیں ہوا تھا، اس کے برخلاف ان جنگوں سے دونوں طرف انتقامی اشتعال بڑھ

---

[۱] ابن سعد ۹۲/۲، ۸۹، انساب الاشراف ۱/۳۴۱، ابن کثیر ۹۲/۴، دیار بکری ۶۱/۲ [۲] ابن سعد ۹۱/۱-۹۴

گیا تھا اور ایک چوتھی لڑائی کے دوامی کو تقویت پہنچ رہی تھی، اِن جنگوں میں رسول اللہؐ کے بہت سے بزرگ، رشتہ دار اور دوست احباب اور طرفین کے بیسیوں کمانے والے مارے گئے تھے، بہت سی عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوکر معاشی و سماجی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان ساری تلخ حقیقتوں کے احساس سے رسولؐ آزردہ خاطر تھے، انھیں خوب معلوم تھا کہ اگر قریش سے پھر لڑائی ہوئی اور وہ ہارے یا جیتے بہرصورت وہ انھیں نبی تسلیم نہیں کریں گے، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قریش اکابر میں ان کی دولت مندی، صلہ رحمی اور رفاہی کاموں میں فراخ دلی سے روپیہ خرچ کرنے کے باعث مقامی و بیرونی عربوں میں غیر معمولی عزت و وجاہت سے پیدا ہونے والی رعونت انھیں لڑائی میں ہرا کر مسخر نہیں کی جا سکتی، نیز یہ کہ قریشی اکابر کو مطیع کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اپنی مادی طاقت اور عسکری دھاک اتنی بڑھالی جائے کہ انھیں دونوں کے سامنے جھکنا پڑے۔ اس پایہ کی توانائی حاصل کرنے کے لئے رسول اللہؐ چاہتے تھے کہ چند سال کے لئے قریش سے جنگ بند رکھنے کا کوئی سمجھوتہ کر لیا جائے تاکہ اس اثنا میں ان کی طرف سے مطمئن ہوکر وہ حجاز اور اس سے ملحق غیر مسلم علاقوں کی طرف متوجہ ہوں اور انھیں مسلمان بنا کر ان کے انسانی و معاشی وسائل سے قوت حاصل کر کے یا اسلام سے انکار کی صورت میں ان کے مال و متاع پر قابض ہوکر اپنی مادی طاقت اور عسکری دھاک اتنی بڑھالیں کہ اس کے سامنے قریش کو گھٹنے ٹیکنا پڑیں۔

اس مقصد کے پیش نظر رسول اللہ نے خندق کے ایک سال بعد ذوالقعدہ ۶ھ میں حج اور بقول بعض عمرہ کرنے کا اعلان کیا، مہاجرین و انصار کے علاوہ انھوں نے مدینہ سے باہر کے عربوں کو بھی اپنے ساتھ چلنے کی تاکید کی، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اتنی بڑی تعداد میں ان کے ساتھ ہوں کہ اکابر قریش انھیں دیکھ کر مرعوب ہو جائیں اور اگر انھیں قریش سے لڑائی لڑنا پڑے تو ان کے کثیر تعداد ساتھیوں کی مدد سے قریش کا خاطر خواہ مقابلہ کر سکیں۔ مدینہ سے باہر کے بیشتر عربوں اور مدینے کے بہت سے مسلمانوں نے مختلف بہانوں کی آڑ لے کر جانے سے گریز کیا۔ رسول اللہؐ کے ساتھیوں کی کل تعداد چودہ اور بقول بعض پندرہ سو تھی جس میں مہاجرین و انصار کا تناسب غالب تھا، احتیاطاً

رسول اللہؐ نے گھوڑے اور ہتیار بھی ساتھ لے لئے تھے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ جنگ وقتال کے ارادہ سے نہیں نکلے ہیں بلکہ کعبہ کی زیارت اور طواف ان کا مقصد ہے رسول اللہؐ اور ان کے ساتھیوں نے احرام باندھ لیا تھا اور قربانی کے لئے ستر اونٹ لے لئے تھے جن کی گردنوں میں پرانے جوتوں کے ہار پڑے تھے جیسے کعبہ پر قربانی کے جانوروں کی گردن میں ڈالے جاتے تھے۔

رسول اللہؐ ابھی مکہ سے دس بارہ میل دور تھے کہ اکابر قریش کو ان کی آمد کا علم ہوگیا، انھوں نے رسول اللہؐ کی پیش قدمی روکنے کے لئے بلا تاخیر چند رسالے خالد بن ولید، عکرمہ بن أبی جہل اور ابو سعید بن عاص کی قیادت میں بھیجے اور پیچھے پیچھے خود بھی ایک فوج لے کر روانہ ہوگئے۔ رسول اللہؐ کو جب قریشی رسالوں اور فوج کی خبر ملی تو انھوں نے کہا: آج میں قریش کے ساتھ اس طرح کا ہر سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں جس سے صلہ رحمی کے تقاضے پورے ہوتے ہوں۔ لا تدعونی الیوم قریش إلی خُطّة یسألونی فیها صِلة الرحم إلا أعطیتهم[1]۔ رسول اللہؐ قریش کے رسالوں سے بچ کر ایک دوسرے راستہ سے حُدیبیہ کی وادی میں خیمہ زن ہوتے جو مکہ سے نو میل کے فاصلے پر تھی۔ انھوں نے اپنا ایک قاصد بھیج کر قریشی اکابر کو مطلع کیا کہ ہم لڑنے کے لئے نہیں حج کے لئے آئے ہیں، تین دن بعد واپس چلے جائیں گے، ہمیں شہر میں آنے سے نہ روکا جائے۔ اکابر نے کہلا بھیجا کہ ہم ایک ایسے دشمن کو جس سے ہماری تین بڑی لڑائیاں ہو چکی ہیں اور جو ہم سے اور ہم جس سے انتقام لینا چاہتے ہیں شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے، قریش کا خیال تھا کہ حج کے بہانہ سے شہر میں داخل ہو کر محمدؐ ان پر حملہ کرکے لوٹ لیں گے۔ رسول اللہؐ کے قریشی مقربوں میں عثمان غنیؓ وہ واحد شخص تھے جن کی صلح جوئی اور جنگ وقتال سے گریز کی صفت قریشی اکابر کو پسند تھی، جن کے مکہ میں ایسے رشتہ دار موجود تھے جو ان کی سابقہ نیکنامی کے باعث ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو تیار تھے۔ رسول اللہؐ نے عثمان غنیؓ کو اکابر قریش کے پاس بھیج کر اطمینان دلایا کہ ہمارا مقصد لڑنا یا

---

[1] ابن ہشام ص ۷۴۱ - ۷۴۲، دیار بکری ۲/۱۸۔

دھوکہ دے کر کوئی جارحانہ کارروائی کرنا نہیں ہے، ہم صرف حج کرنے آئے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم حج کے لباس میں ملبوس ہیں اور قربانی کے بہت سے جانور ہمارے ساتھ ہیں۔ اس اثنا میں قبیلۂ خزاعہ کا جن کی بستیاں مکہ سے باہر تھیں ایک لیڈر بُدَیل بن ورقا جس سے رسول اللہؐ کے اچھے تعلقات تھے ان سے ملنے آیا۔ اس نے خبر دی کہ قریشی اکابر نے ان سے لڑنے کے لئے ایک فوج بھیجی ہے۔ رسول اللہؐ نے بُدَیل سے کہا: ہم حج کرنے آئے ہیں، لڑنے بھڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے، پچھلی تین جنگوں میں قریش بری طرح رگڑے گئے ہیں اور انھیں بھاری مالی وجانی نقصان ہوا ہے، اگر وہ چاہیں تو میں ایک مقررہ مدت کے لئے ان سے سمجھوتہ کرسکتا ہوں، اس مدت میں وہ مجھے عربوں سے نمٹنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں یا اسلام قبول کرلیں، اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو میں ان سے لڑوں گا۔ ان قريشا نهكتهم الحرب وأضرت بهم فإن شاؤا ماددتهم مدة يخلوا بيني وبين العرب وإن شاؤا دخلوا فيما دخل فيه الناس وإن هم أبوا فوالذي نفسي بيده لأقاتلنهم[1]۔ قریش نے اپنی طرف سے دو تین آدمی عثمان غنیؓ کے بیان کی توثیق کے لئے رسول اللہؐ کے پاس بھیجے، رسول اللہؐ نے ان سے بھی وہی بات کہی جو عثمان غنیؓ اور بُدَیل بن ورقاء سے کہی تھی، عثمان غنیؓ کو بعض رکاوٹوں کے باعث لوٹنے میں دیر ہوئی تو مسلمان کیمپ میں یہ خبر اڑ گئی کہ قریش نے انھیں قتل کرڈالا ہے۔ رسول اللہؐ نے ان کے انتقام کے لئے مستعد ہونے کا حکم دے دیا اور کیمپ کے لوگوں سے ایک درخت کے نیچے اس بات کی بیعت لی کہ وہ قریش کے ساتھ عثمان غنیؓ کی انتقامی جنگ میں میدان چھوڑ کر نہیں بھاگیں گے یا جیسا کہ دوسرا قول ہے رسول اللہؐ کے ساتھ جنگ میں اپنی جان دینے سے دریغ نہیں کریں گے[2]۔ بہت سے لوگوں کو عثمان غنیؓ کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانا پسند نہیں تھا، ان کی ایک جماعت بالفعل بیعت میں شریک نہیں ہوئی اور نمائشی مسلمانوں کا لیڈر عبداللہ بن اُبَی بن سَلُول علالت کا بہانہ کرکے بیعت کرنے نہیں آیا[3]۔ قریش

---

[1] دیار بکری ۲/۱۸

[2] انساب الاشراف ۱/۳۵۰

[3] مغازی صفحہ ۳۸۹

کو بیعت کا علم ہوا تو وہ گھبرا گئے، انھیں اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں رسول اللہؐ جنگ کا اعلان نہ کر دیں، وہ لڑائی کے لئے بالکل تیار نہیں تھے، انھوں نے مناسب سمجھا کہ رسول اللہؐ کی طرف سے سمجھوتہ کی جو پیشکش منظور کرلی جائے جو انھوں نے بدیل بن ورقاء کی معرفت بھیجی تھی۔ دونوں طرف سے معاہدہ کا مضمون طے کرنے کے لئے چند ایلچیوں کا تبادلہ ہوا، سمجھوتہ کی دستاویز کے شرائط یہ تھے کہ اس سال رسول اللہؐ حج نہیں کریں گے اور قربانی کے جانور اُسی جگہ ذبح کر دیں گے جہاں خیمہ زن تھے، اگلے سال صرف نیاموں میں بند تلواریں لے کر آئیں گے اور حج کر کے تین دن بعد لوٹ جائیں گے، جو قرشی مسلمان مدینہ چھوڑ کر مکہ چلا جائے اسے واپس نہیں کیا جائے گا لیکن جو قرشی اپنے سرپرست کی بلا اجازت مدینہ چلا جائے گا اسے واپس کر دیا جائے گا، معاہدہ دو[1] (اور بقول بعض چار[2] اور بقول بعض دس) سال تک نافذ رہے گا، اس اثنا میں کوئی فریق دوسرے کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی یا غداری کا کام نہیں کرے گا، عرب قبائل کو اس بات کی آزادی ہوگی کہ وہ اس معاہدہ میں جس فریق کی طرف سے چاہیں داخل ہو جائیں[3]۔ رسول اللہؐ کے بیشتر ساتھیوں کو اس معاہدہ سے سخت حیرت ہوئی، رسول اللہؐ نے مدینہ میں حج کا اعلان کرتے وقت تصریح کی تھی کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ اس سال حج کروں گا، بعد میں خواب کی بذریعہ وحی توثیق بھی ہوگئی تھی۔ وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ۔ انھوں نے کہا کہ جب رسول اللہؐ کا خواب سچا تھا اور وحی سے بھی اس کی توثیق ہوگئی تھی تو رسول اللہؐ اسے اگلے سال تک ملتوی کرنے کو کیوں تیار ہو گئے! رسول اللہؐ کے مقربوں کی ایک جماعت کو یہ قرارداد بھی کھٹکی کہ (اسلام قبول کر کے یا قبول کرتے) جو قرشی مکہ سے مدینہ آئے گا اسے رسول اللہؐ واپس کر دیں گے اور (اسلام چھوڑ کر یا چھوڑنے کے ارادہ سے) جو قرشی مکہ جائے گا اُسے

---

[1] مغازی ص۳۸۵

[2] انساب الاشراف ۱/۳۵۱

[3] ابن سعد ۲/۷۹، مغازی ص۳۸۵، انساب الاشراف ۱/۳۵۰

واپس نہیں کیا جائے گا، ان مقربوں کی رائے تھی کہ یہ قرارداد خاص طور پر مسلمانوں کے لئے باعث عار اور اسلام کے لئے باعث توہین ہے۔ رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ جانور ذبح کر کے سر منڈا دیں، ایک جماعت سر منڈانے کے لئے تیار ہی نہیں ہوئی، اس کے نمائندوں نے کہا: رسول اللہ خدا نے آپ کو حج کا حکم دے کر یہ بتادیا تھا کہ آپ اور آپ کے ساتھی بسلامتی مکہ میں داخل ہوں گے اور اب ہم بغیر حج کئے واپس جا رہے ہیں۔ ارأيت الله يا رسول الله حين أمرك بالحج أنه مُدل خلك مكة انت واصحابك آمنين محلقين رؤوسكم ومقصرين فرجع ولم يكن ذلك[1]۔ نہیں معلوم رسول اللہؐ نے اس اعتراض کا کیا جواب دیا۔ طبریؒ۔ رسول اللہؐ کے ساتھی مدینہ سے نکلے تو انھیں اس خواب کی بنا پر جو رسول اللہؐ نے دیکھا تھا حج کرنے کے بارے میں مطلق شک و شبہ نہیں تھا جب انھوں نے دیکھا کہ حج نہیں ہوا اور رسول اللہؐ نے بڑے ضبط سے کام لے کر سمجھوتہ کر لیا ہے اور وہ حج کئے بغیر مکہ سے واپس جا رہے ہیں تو انھیں ایسی مایوسی ہوئی اور اتنا غصہ آیا کہ قریب تھا کہ وہ ہلاک ہو جائیں۔ ۲) معاہدہ کرنے کے بعد رسول اللہؐ نے اپنے ساتھیوں کو قربانی کر کے بال منڈانے کا حکم دیا تو کسی نے ان کے حکم کی تعمیل نہیں کی، تین بار حکم دینے کے بعد بھی جب کسی نے قربانی نہیں کی تو رسول اللہ غصہ ہو کر اپنی بیوی ام سلمہ کے خیمہ میں چلے گئے اور ان سے مسلمانوں کی نافرمانی کی شکایت کی، ام سلمہ نے کہا: آپ جا کر اپنا اونٹ ذبح کر لیجئے اور بال منڈا لیجئے (پھر دوسرے لوگ بھی آپ کی پیروی کرنے لگیں گے) وہ خیمہ سے نکلے اور کسی سے ایک لفظ تک کہے بغیر اپنا جانور ذبح کیا اور حجام کو بلا کر سر منڈایا، لوگوں نے یہ دیکھا تو وہ بھی جانور ذبح کرنے اور ایک دوسرے کا سر مونڈنے لگے ایسی بے چینی (اور غصہ) کے ساتھ گویا ایک دوسرے کی گردن کاٹ دیں گے۔[2]

رسول اللہ کے ساتھی بالعموم حدیبیہ کے سمجھوتہ کو ایک بڑی ناکامی اور ہتک قرار دیتے تھے

---

[1] مغازی ص۳۰۶

[2] ۲/۷۹، ۸۰

گھر واپس ہوتے، اُن کی اداسی اور کوفت دور کرنے کے لئے راستہ میں انا فتحنا لك فتحاً مبیناً والی سورت نازل ہوئی۔ اس سورت میں درخت کے نیچے قریش سے لڑائی کی صورت میں فرار نہ ہونے یا جان دینے کی بیعت کرنے والوں کو یہودی بستی خیبر کی فتح اور اس سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کی خوش خبری دے کر ان کا غبارِ خاطر دور کیا گیا اور اُن مسلمانوں کو خیبر کی چڑھائی میں شرکت کی ممانعت اور اس سے حاصل ہونے والے مال و متاع سے محروم کر کے سرزنش کی گئی ہے جو بہانوں کی آڑ لے کر رسول اللہؐ کے ساتھ حج کرنے نہیں گئے تھے۔ لقد رضی اللہ عن المؤمنین إذ یبایعونك تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینۃ علیھم واثابھم فتحا قریبا ومغانم کثیرۃ یاخذونھا سیقول المخلفون إذا انطلقتم الی مغانم لتاخذوھا ذرونا نتبعکم یریدون أن یبدلوا کلام اللہ قل لن تتبعونا خدا خوش ہوا ان مسلمانوں سے جنھوں نے درخت کے نیچے تمھاری بیعت کی، ان کی بے چینی سے واقف ہو کر خدا نے ان کے دلوں کو سکون عطا کیا اور ایک فتح بھی جو عنقریب حاصل ہوگی اور جس میں انھیں بہت سا مالِ غنیمت ملے گا، رسول اللہؐ کے ساتھ مکہ جانے سے گریز کرنے والے زیرِ درخت بیعت کرنے والوں سے کہیں گے جب تم خیبر کا مالِ غنیمت لینے جاؤ تو ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دینا، اس طرح وہ خدا کا حکم بدلنا چاہتے ہیں، محمدؐ ان سے کہہ دو ہم ہرگز تمھیں اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔

إنا فتحنا لك فتحاً مبیناً سے حدیبیہ کا سمجھوتہ مراد ہے جو یقیناً رسول اللہؐ کی عظیم فتح تھا کیونکہ اس کے تحت اُن کے سب سے بڑے اور طاقت ور دشمن قریش نے کئی برس کے لئے ان کے خلاف لڑائی اور سازشوں سے باز رہنے کا وعدہ کر لیا تھا اور اس طرح انھیں یک سو ہو کر اپنی ساری توجہ حجاز سے سرحدِ شام نیز یمن تک عربوں کو مسلمان بنانے یا قبولِ اسلام سے انکار کی صورت میں ان کے مال و متاع اور وسائل پر قابض ہو کر اپنی اقتصادی توانائی اور عسکری طاقت بڑھانے کی طرف مبذول کرنے کا موقع مل گیا تھا۔　　(اس قسط کے ساتھ جائزہ ختم ہوا)

دیارِ پورب کا پہلا علمی دور

(از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ایڈیٹر "البلاغ" بمبئی)

بلادِ پورب کی سرزمین پر آفتابِ اسلام کی ضیا پاشی کب ہوئی اور اس ظلمت کدہ میں دین و ایمان کا نور کس زمانہ میں پھیلا؟ اس کی تعیین مشکل ہے، البتہ یہ بات یقینی ہے کہ سلطان محمود غزنوی کی مسلسل فتوحات کے زمانہ میں ہندوستان کا یہ علاقہ اسلام اور مسلمانوں سے آشنا ہو چکا تھا، خاص طور سے بنارس کی فتوحات نے ان اطراف میں بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی، اس کے بعد حضرت سالار مسعود غازی علوی (ولادت ۴۰۵ھ شہادت ۴۲۴ھ) اور ان کے رفقاء کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی وجہ سے یہاں اسلام اور مسلمانوں کا شہرہ ہوا،

سالار مسعود غازی علوی نے دہلی فتح کرنے کے بعد اودھ میں مقام ستر کھ (بارہ بنکی) کو مرکز بنا کر قنوج، کڑا، مانک پور، بہرائچ اور بنارس وغیرہ میں جہاد کیا کرایا، اور ۴۲۳ھ کے حدود میں اطراف و جوانب کی ہر بڑی بستی میں مہمات روانہ کیں، مولانا عبد الرحمٰن چشتی نے مرآۃ الاسرار میں لکھا ہے۔

وبعد ازاں ملک افضل را با اقرباء او بطرف بنارس و نواحی آں رخصت نمود، و آستانہ او با دیگر شہداء آنجا شہرت دارد، وبعد ازاں ملک عمر و ملک طغرل را با جماعت الیشاں بطرف پرگنات بیسواڑہ تعین کرد، دراں نواحی تردّد نمایاں کردہ بشرف شہادت

امیر مسعود نے ملک افضل کو ان کے رفقاء کے ساتھ بنارس کی طرف روانہ کیا، ان کا مزار دیگر شہداء کے مزارات کے ساتھ اس علاقہ میں مشہور ہے، اس کے بعد ملک عمر اور ملک طغرل کو ان کی جماعت کے ساتھ بیسواڑہ کے پرگنوں کی سمت بھیجا، جنھوں نے

فالتعض کشتند، چنانچہ مقابر ملک عمر شہید وطغرل شہید وغیرہ در قصبہ بلور ؟ در نواحی آں زیارت گاہ خلق است، و ملک عمر شہید بغایت مردانہ خفتہ است وتصرف صراحت راد، دہمیں .... در ہر شہرے وودر ہر قصبہ ملک دیہردیہے مردم اہل صلاح وصاحب شجاعت وکاردان جا بجا نصب نمودہ، چنانچہ دریں ملک ہر جا سید م اثرے از اصحاب الشہدار یافتہ ام وہمہ جا زیارت گاہ خلق است[1]	نے ان اطراف میں مجاہدانہ سرگرمی دکھا کر شہادت پائی، چنانچہ ملک عمر شہید اور ملک طغرل شہید وغیرہ کی قبریں بلور؟ اور اس کے اطراف میں زیارت گاہ ہیں، ان میں ملک عمر شہید بڑے رعب وجلال اور تصرف کے ساتھ آرام فرما ہیں اسی طرح ہر شہر اور ہر قصبہ میں نیک حضرات کو اور ہر قریہ میں مصلحوں اور بہادروں کو جا بجا متعین کیا، چنانچہ میں اس علاقہ میں جہاں جہاں گیا ہوں ہر جگہ ان شہداء کا نشان پایا ہے۔

مولوی محمد صادق نے خلاصۃ تواریخ مسعودی میں لکھا ہے کہ آپ (سالار مسعود) ۴۲۰ھ میں تشریف لائے، تمام ملک میں کوئی شہر وقصبہ ؟ کا ایسا نہیں کہ آپ کے ساتھ کا شہید نہ ہو، تمام ملک ہند میں غازیان اسلام منتشر تھے، ہر جگہ کو نور شہادت سے منور کیا، اسی وقت سے ہندوستان میں اسلام ہوا[2]۔ مولوی عنایت حسین نے غزانامۂ مسعود میں لکھا ہے کہ جس جس ملک میں حضرت کے نمک خوار تھے، بڑے بڑے سردار تھے، بعد آپ کے سب نے شہادت پائی، اسلام کی بیخ جمائی، ہر شہر و دیار میں ایک نہ ایک شہید لشکر سالار مسعود ہے، قبر اس کی موجود ہے، کوئی مقام خالی نہیں ہے، کل زیر نگیں ہے[3]۔

اور مولانا شاہ ابوالحسن قطبی مانک پوری نے آئینۂ اودھ میں بیان کیا ہے کہ کسی تاریخ میں سوائے لڑائی کڑا مانک پور کے اور کوئی لڑائی سید مسعود کی درج نہیں ہے، لیکن اکثر قبریں گنج شہیدان دیہات وقصبات متعلقہ اضلاع رائے بریلی، وسلطان پور، وفیض آباد، وپرتاب گڈھ، واعظم گڈھ، وجون پور،

---

[1] مرآۃ الاسرار قلمی جلد اول ذکر سلطان الشہداء امیر مسعود،

[2] خلاصۃ تواریخ مسعودی صہ مطبوعہ غالب الاخبار ۱۲۸۳ھ

[3] غزانامۂ مسعود صہ ۶ مطبوعہ نظامی پریس کانپور ۱۲۸۸ھ

وبنارس، وغازی پور میں برابر پائی جاتی ہیں اور جہاں جہاں قبریں ہیں باوجود تمادیٔ ایام کے عام طور پر بلا کسی اختلاف کے یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں یہاں معرکۂ مجاہدانہ غازی میاں ہوا ہے، اور یہ ان ہی کے ساتھی کی قبریں ہیں .... ناظرین کتاب کو خیال رہے کہ ممالک مغربی وشمالی اودھ میں جہاں مقابر شہیدانِ ہمراہیانِ غازی میاں کہا جائے اس کو باور کرنے میں تامّل نہ کیا جائے۔[1]

اور مولانا عبدالسلام مبارک پوری نے تاریخ المنوال وائلہ میں معتبر حوالہ سے لکھا ہے کہ بزمانۂ سید سالار مسعود غازی مَلِک افضل بغرضِ فتح بنارس، ومَلِک علوی نائب ان کے، ومَلِک طاہر بمقام متو، ومَلِک مردان بمقام شادی آباد غازی پور آئے، ذرات ان کے ان مقام پر ہیں، سترکھ (ملک اودھ) سے مَلِک حاجی بمقام ٹانڈہ متعین ہوتے تھے، مسعود غازی سترکھ سے پورب نہیں آئے، مَلِک طاہر کے ساتھ جو سپاہی تھے سب غزنین و اطراف تیراہ کے تھے، غالباً شنواری خیل کے مسلمان بھی مَلِک طاہر کے ساتھ تھے، اور حاشیہ میں ہے کہ مَلِک شدّنی کا مزار مبارک پور سے متصل ہے، غالباً یہ اس طرف بھیجے گئے تھے اور ان کے ساتھی یہاں آباد ہوئے۔[2]

چوں کہ سالار مسعود غازی اور ان کے رفقاء کی یہ مہمات وفتوحات اور شہادات دیارِ پورب میں بالکل ابتدائی تھیں، ان علاقوں میں مسلمانوں کی آبادیاں نہیں تھیں اور ان لوگوں کی شہادت کے بعد ایک زمانہ تک مسلمانوں نے ادھر کا رُخ نہیں کیا، اس لئے نہ اُن کے واقعات مرتب ہو سکے، اور نہ صحیح معلومات فراہم ہو سکیں، اور مرورِ زمانہ کے بعد جو روایتیں مشہور ہوئیں ان ہی پر اکتفاء کرنا پڑا، یہی وجہ ہے کہ سالار مسعود غازی اور ان کے رفقاء کے صحیح حالات و واقعات تاریخوں میں نہ ہونے کے برابر ہیں، اور جو کچھ درج کیا گیا ہے اس کی بھی تاریخی حیثیت یہی ہے۔

بہرحال بنارس سے بہرائچ تک کے علاقوں میں سالار مسعود غازی اور ان کی فوجوں نے

---

[1] آئینۂ اودھ ص۳ مطبوعہ نظامی کانپور ۱۲۹۷ھ

[2] تاریخ المنوال ج ۲ ص۱ مطبوعہ پٹنہ۔

نے جہاد کیا اور ۴۱۳ھ میں ان کی شہادت کے بعد سیکڑوں سال تک اس علاقہ میں یوں خاموشی رہی کہ غازیوں اور شہیدوں کے نام اور حالات بلکہ ان کی قبروں کا صحیح حال ملنا مشکل ہوگیا یہاں تک کہ سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی اور اجمیر کا نظم و نسق سنبھالنے کے بعد سلطان شہاب الدین غوری کو دعوت دی کہ وہ پھر اس دیار میں مجاہدانہ سرگرمی دکھائے۔ چنانچہ ۵۹۰ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے قنوج پر فوج کشی کی، اور راجہ جے چند راٹھور سے اٹاوہ کے قریب جنگ ہوئی، جس میں مسلمان فتح یاب ہوئے، اس کے بعد قنوج اور بنارس کے تمام علاقے مسلمانوں کے زیرِ تصرف آگئے اور بنارس سے نیپال کی سرحد تک قبضہ ہوجانے کے نتیجہ میں بنگال کا راستہ صاف ہوگیا، کہنا چاہیے کہ دیار پورب میں اسی دور سے اسلام اور مسلمانوں کا عمل دخل ہوا اور مسلمان اپنے دینی و ملی امتیازات وخصوصیات کے ساتھ ابھرے، اسی دور میں کڑا مانک پور اس دیار کا دار الحکومت قرار پایا بلکہ اس سے آگے مشرق میں لکھنوتی اور بنگال کو بھی مرکزیت حاصل ہوئی، اور ان مرکزوں میں دہلی سے حکام بھیجے جانے لگے، اسی غلام خاندان کی سلطنت (۶۰۲ھ تا ۶۸۹ھ) میں اس دیار میں علم وفضل اور علماء وفضلاء کا پہلا دور شروع ہوا۔

<u>غلام خاندان کا دورِ سلطنت</u> اس سلطنت کی ابتدا سلطان شہاب الدین غوری کے ترکی غلام قطب الدین ایبک سے ۶۰۲ھ میں ہوئی، صورت یہ ہوئی کہ وہ ۵۸۸ھ میں بلادِ ہند کی حکومت پر مامور ہوا اور ۶۰۲ھ میں دہلی فتح کر کے لاہور میں خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھی اور وہیں فوت ہوا، اسی کے دور میں پورب میں قنوج اور اودھ کے علاقے فتح ہوئے اور نیپال کے نیچے سے لے کر بنارس تک کا تمام علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں ہوگیا، اس خاندان میں حسب ذیل سلاطین گذرے ہیں جنھوں نے دہلی کے تخت پر بیٹھ کر دیار پورب اور بنگال و بہار تک حکومت کی ہے۔

(۱) سلطان قطب الدین ایبک (۲) سلطان شمس الدین ایلتمش (۳) سلطان رکن الدین بن سلطان شمس الدین ایلتمش (۴) سلطانہ رضیہ بنت سلطان شمس الدین ایلتمش (۵) سلطان ناصر الدین بن سلطان شمس الدین ایلتمش (۶) سلطان معز الدین بن ناصر الدین اس کے نائب فیروز شاہ خلجی نے

۶۸۹ھ میں اسے قتل کرکے خلجی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

پورب میں پہلا علمی دور ۶۰۲ھ میں سلطان ایبک کی سلطنت سے شروع ہوا اور خلجی دور سے گذرتا ہوا تغلق دور میں ۸۰۲ھ میں ختم ہوا، اس پونے دو سو سالہ دور میں بلادِ مشرق اور بہار و بنگال کے علاقوں میں دینی اور علمی سرگرمیاں جاری ہوئیں اور علمائے فحول اور مشائخ عظام پیدا ہوئے، میر غلام علی آزاد نے ماثر الکرام میں پورب کے علمی ادوار کا تجزیہ کرتے ہوئے پہلے دور کے بارے میں لکھا ہے

بر ملتقطانِ ایں اوراق، و حقائق جویانِ انفس و آفاق جلوہ پیرا باد کہ سرزمین پورب از قدیم الایام معدنِ علم و علما ست، سید محمد کرمانی صاحب سیر الاولیا کہ مرید سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی ست قدس سرہ می گوید کہ مولانا فرید الدین شافعی شیخ الاسلام اودھ بود، مولانا علاء الدین نیلی اودھی پیشِ شیخ الاسلام قاریِ کشاف بود، مولانا شمس الدین یحییٰ و دیگر علمائے اودھ سامع بودند .... اگرچہ جمیع صوبہ جات ہندیہ بہ وجود حاملانِ علوم تفاخر دارند سیما حصارِ پایۂ تخت ر بہ واسطۂ مرجعیت صاحبِ کمالان ہر قسم دران جا فراہم می آیند، و از تراکمِ افکار و اجتماع عقول اہلِ ہر عصر کمالاتِ نفسِ ناطقہ را چہ علم عقلی و نقلی وچہ غیر آن بہ پایۂ بالا تری رسانند، اما صوبۂ اودھ و الہ آباد خصوصیتے دارد کہ ہیچ صوبہ نتواں یافت[1] الخ

قارئینِ کتاب ہذا اور طالبانِ حقائق کو معلوم ہو کہ قدیم ایام سے پورب قدیم زمانہ سے علم و علماء کا گہوارہ رہا ہے سید محمد کرمانی مصنف سیر الاولیاء اور مرید حضرت نظام الدین قدس سرہ کا قول ہے کہ مولانا فرید الدین شافعی اودھ کے شیخ الاسلام تھے، مولانا علاء الدین نیلی اودھی ان کے سامنے تفسیر کشاف پڑھتے تھے اور مولانا شمس الدین یحییٰ اور دوسرے علمائے اودھ سنتے تھے، اگرچہ ہندوستان کے تمام صوبے حاملینِ علوم کے وجود پر فخر کرتے ہیں خاص طور سے دار السلطنت دہلی کہ یہاں ہر قسم کے اہلِ کمال جمع ہیں اور ہر زمانہ کے افکار و عقول انبوہ در انبوہ پائے جاتے ہیں اور علمائے علم عقلی و نقلی وغیرہ کا پایہ بلند کئے ہوئے ہیں مگر صوبۂ اودھ اور صوبۂ الہ آباد اس بارے میں وہ خصوصیت رکھتے ہیں جو کسی اور صوبہ میں نہیں مل سکتی، ہے۔

---

[1] ماثر الکرام ج ۱ ص ۲۲ ذکر ملا نظام الدین،

کے دورِ اول کی پوری مدت اس دیار میں علماء، فضلاء، مشائخ اور اربابِ فضل و فن کی آمد و رفت اور قیام کی ہے، اور جوں جوں وقت گذرتا گیا یہاں کے شہر و قصبات اور قریات علماء و فضلاء سے معمور ہوتے گئے یہاں تک کہ تغلق خاندان کے تیسرے حکمران سلطان فیروز شاہ نے ۷۷۲ھ میں جون پور کو آباد کرکے اسے دیارِ مشرق کا مرکز بنایا، اس کے بعد یہاں کے چپے چپے میں علوم و علماء کارواں در کارواں چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔

اب ہم غلام خاندان کے دور میں پورب کی علمی سرگرمی اور علماء کی خدمات کا سرسری جائزہ لیتے ہیں، شیخ الاسلام فرید الدین اودھی کا شمار اس دور کے نامور علماء میں ہوتا تھا، اودھ سے دہلی تک ان کے علم و فضل کی دھوم تھی، اور تشنگانِ علم و معرفت اس آبِ حیات سے سیراب ہوتے تھے ان کے تلامذہ و مسترشدین میں مولانا علاء الدین نیلی اودھی اور مولانا شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی خاص شہرت کے مالک ہیں جن سے دہلی میں ان کے فیوض و برکات تقسیم ہوئے، اور ان کے تعلیمی و تدریسی سلسلہ کو آگے چل کر بڑی ترقی ہوئی۔ سید حمزہ بن حامد واسطی سلطان شمس الدین ایلتمش کے دورِ سلطنت میں ہندوستان آئے اور کڑا اور کوڑہ کے درمیان سلطان پور نامی قریہ میں سکونت پذیر ہو کر خلق اللہ کو فیض پہنچایا، شیخ سلیمان بن عبد اللہ ہاشمی بھی اسی دور میں ہندوستان آئے، سلطان شمس الدین نے تعظیم و تکریم کی اور خطیر رقم نذر کرکے شاہی قیام گاہ میں ٹھہرنے کی درخواست کی، مگر انھوں نے دہلی سے نکل کر اودھ کے قصبہ کنتور میں سکونت اختیار کی اور وہیں ۶۵۰ھ میں انتقال کیا، شیخ قدوۃ الدین بن میرک شاہ اسرائیلی اودھی حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے مرید تھے، ہندوستان آکر اودھ میں مقیم ہوئے اور مفتوحہ علاقوں کے قاضی مقرر کئے گئے، ۶۰۰ھ میں فوت ہوئے، ان کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ اعز الدین قاضی اودھ ہوئے، مشہور ہے کہ اس دیار میں باون[۵۲] گاؤں قاضی قدوۃ الدین کی اولاد سے آباد ہیں، قدوائی خاندان ان ہی کی طرف منسوب ہے، شیخ قطب الدین بن محمد سلطان قطب الدین ایبک کے دور میں ہندوستان آئے اور کڑا مانک پور میں جہاد کرکے فتح یاب ہوئے، سلطان ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتا تھا اور اپنے ساتھ صدرِ مجلس میں بٹھاتا تھا، ۶۷۷ھ میں کڑا میں فوت ہوئے، مولانا ابو توامہ شرف الدین حنفی دہلوی نے سلطان ایلتمش کے زمانہ میں دہلی سے سنار گاؤں بنگالہ جا کر وہیں درس و تدریس کا سلسلہ

جاری فرمایا اور شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری نے ان سے تعلیم حاصل کی، قاضی شمس الدین بہرائچی والیٔ بہرائچ محمود بن التمش کے زمانے میں وہاں کے قاضی تھے، ان کے بعد ۱۵۱ھ میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے، شیخ بدرالدین علوی حسینی خواجہ عثمان ہارونی سے فیض حاصل کر کے ہندوستان آئے اور قصبہ دلمئو (رائے بریلی) میں سکونت اختیار کی اور یہیں ۶۲۲ھ میں فوت ہوئے۔ اسی زمانے میں مولانا تقی الدین بن محمود انہولوی اودھی انہونہ (رائے بریلی) میں قیام کرتے تھے۔ شیخ داؤد بن محمود چشتی اودھی کا مکان پالی مئو میں ہے۔ ان کے پیر و مرشد حضرت شیخ فریدالدین اجودھنی اودھ کے سفر میں دو بار ان کے گاؤں میں تشریف لائے تھے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مریدوں میں شیخ شہاب الدین بن محمد سہروردی کاشغری جگ جوت کے لقب سے مشہور ہیں انہوں نے پٹنہ کے قریب جیٹھلی نامی گاؤں میں آکر سکونت اختیار کی، سلطان شمس الدین التمش کے دور میں دو بھائی سید شمس الدین اور سید شہاب الدین شہر گردیز سے دہلی آئے اور سید شہاب الدین وہاں سے کڑا مانک پور آکر اقامت گزیں ہوئے، ان کی نسل سے سید راجہ حامد شاہ مبارک پوری ہیں جنھوں نے سلاطین شرقیہ جون پور کے زمانہ میں دیار پورب کو اپنا دینی و روحانی مرکز بنایا، اور ان کی اولاد نے آبادیاں قائم کیں چنانچہ راجہ سید مبارک بانیٔ مبارک پور اور راجہ سید خیراللہ بانی خیرآباد ان ہی کی اولاد سے ہیں، اسی دور میں دو بھائی شیخ نظام الدین فرغانی اور شیخ صمصام الدین فرغانی ہندوستان آئے اور انھوں نے سرزمین بنگال کو اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز بنایا، والیٔ بنگال محمد بن بختیار خلجی نے ان کو اپنے مقربین میں شامل کر کے، جنگ و جہاد میں حصہ لیا اور زر کثیر صرف کر کے دونوں بھائیوں کے ساتھ اس دیار میں اسلامی خدمات انجام دیں، شیخ نظام الدین کی وفات ۶۱۲ھ میں ہوئی۔

خلجی دور سلطنت جیسا کہ معلوم ہوا سلطان معزالدین بن ناصرالدین کے نائب جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے اسے ۶۸۹ھ میں قتل کر کے خلجی خاندان کی سلطنت قائم کی جو ۷۲۰ھ تک باقی رہی اور اس تیس سالہ دور میں حسب ذیل سلاطین ہوئے (۱) سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی (۲) سلطان علاء الدین محمد شاہ خلجی (۳) سلطان شہاب الدین بن علاء الدین خلجی (۵) سلطان ناصرالدین خسرو خاں

خلجی، اس کی سلطنت خسرو غازی نے ختم کی جو بعد میں سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے بادشاہ بنا اور تغلق خاندان کی سلطنت قائم کی، خلجی دورِ حکومت میں کڑا مانک پور کے سرکاری مرکز میں ایک سانحہ ہوا جس کے اثرات پورب پر پڑے، صورت یہ ہوئی کہ جلال الدین خلجی اور ان کے بھتیجے اور داماد علاء الدین خلجی کے درمیان کڑا مانک پور میں جنگ ہوئی جس میں بھتیجے نے اپنے چچا کو ملاقات کے بہانے سے دریائے گنگا کے بیچ میں بلا کر قتل کر دیا اور اپنی سلطنت کا اعلان کر دیا اس وقت علاء الدین کڑا مانک پور اور اودھ کا حاکم تھا، اس مختصر دورِ سلطنت میں پورب اور بہار و بنگال کی دینی اور علمی رونق بڑھتی رہی اور ان علاقوں میں علماء و مشائخ مدرسوں اور خانقاہوں کے ذریعہ اپنے اپنے انداز میں کام کرتے رہے، چنانچہ مولانا بدر الدین حنفی اودھی سلطان علاء الدین محمد شاہ خلجی کے دور میں اودھ کے علمائے کبار میں تھے، یہاں سے دہلی تشریف لے جاتے اور کئی کئی ماہ تک وہاں مقیم رہ کر وعظ و تذکیر کی خدمت انجام دیتے تھے، ان کی مجلسِ وعظ میں عوام و خواص میں سے ہر طبقہ کے لوگ جمع ہوتے تھے اور بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے، شیخ الاسلام حضرت شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری ۶۶۱ھ میں بعہد سلطان ناصر الدین محمود بن التمش پیدا ہوئے، انھوں نے خلجی دور میں بہار میں دین و ایمان کی بزم سجائی ۷۸۲ھ میں وصال فرمایا، ان کے فیوض و برکات سے خلجی دور خوب مستفید ہوا، مولانا صلاح الدین سترکھی کا وطن سترکھ (بارہ بنکی) تھا اور سلطان علاء الدین خلجی کے دورِ سلطنت میں دہلی میں تدریس و افادہ میں مشغول تھے، مولانا مؤید الدین کڑوی متوفی ۷۲۶ھ اپنے وقت کے باکمال علماء میں تھے اور سلطان علاء الدین خلجی جس زمانہ میں کڑا کا حاکم تھا مولانا موصوف اس کے ندیموں میں تھے، پھر علائق دنیا سے یکسو ہو کر حضرت نظام الدین بدایونی کی خدمت میں یوں رہے کہ سلطان علاء الدین نے اپنی سلطنت کے زمانہ میں ان کو طلب کیا مگر فقر و استغناء کو جاہ و حشم پر ترجیح دے کر صاف انکار کر دیا، مولانا نصیر الدین کڑوی بھی سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں دہلی میں رہ کر تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، مولانا نظام الدین ظفرآبادی متوفی ۷۳۵ھ اس دور کے مشہور علماء و مشائخ میں تھے، یہ اور ان کے صاحبزادے شیخ نصیر الدین سلطان علاء الدین کے دور میں غزنین سے

دہلی آئے تھے۔

ان حضرات کے علاوہ اس دور میں صدہا ارباب فضل و کمال دیارِ مشرق میں موجود تھے، جن کا تعلق بعد کے تغلق دورِ سلطنت سے بھی تھا،

<u>تغلق دورِ سلطنت</u> | جیسا کہ معلوم ہوا خلجی خاندان کے آخری حکمران سلطان ناصرالدین کی سلطنت خسرو غازی نے ختم کر کے سلطان غیاث الدین تغلق کے نام و لقب سے سلطنت قائم کی، جو ۷۲۰ھ سے ۸۱۶ھ تک رہی، اس کی مدت تقریباً ۹۶ سال ہے اور یہ حکمران گذرے ہیں (۱) سلطان غیاث الدین تغلق (۲) سلطان محمد بن تغلق (۳) سلطان فیروز شاہ تغلق اس کا نام جونا تھا (۴) سلطان محمود شاہ تغلق، تیسرے بادشاہ سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں اپنے نام پر جون پور آباد کر کے بلادِ پورب کو علم و معرفت کے نئے دور میں داخل کیا، اور تغلق دورِ سلطنت کے نصف ثانی میں مشرق میں علم کا دوسرا دور شروع ہوا۔

تغلق دورِ سلطنت میں بلاد مشرق اور اودھ کے کئی علماء و فضلاء دہلی میں اپنی مسندِ تدریس و تلقین سے علم و روحانیت کی سوغات تقسیم کر رہے تھے، اسی دور میں مولانا فریدالدین اودھی شیخ الاسلامی کے منصب پر فائز تھے، اور ان کا شمار دہلی کے نامور علماء میں تھا، اور اودھ سے دہلی تک ان کے علم و فضل کی دھوم مچی ہوئی تھی، اودھ کے دو مشہور عالموں نے دہلی ہی میں ان سے کسبِ فیض کر کے دوامی شہرت پائی، ایک مولانا شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی جو سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں ۷۴۷ھ میں فوت ہوئے، ان کے تلامذہ میں مولانا شیخ نصیرالدین محمود بن یحییٰ بن عبداللطیف اودھی علم و معرفت کی بزم میں "چراغ دہلی" کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں، انھوں نے ۷۵۷ھ میں دہلی میں انتقال کیا، ان کے تلامذہ میں شیخ محمد بن یوسف گیسو دراز، شیخ علاءالدین سندیلوی، شیخ علاءالدین الندی، قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی، اور مولانا خواجگی وغیرہ ہیں، موخرالذکر دونوں حضرات سے قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے تحصیل علم کی ہے، اور شیخ الاسلام فریدالدین اودھی کے دوسرے شاگرد رشید مولانا علاءالدین نیلی اودھی ہیں جو خاص شہرت کے مالک ہیں۔ اس دور میں یہ دو عظیم علماء و مشائخ دہلی کی علمی و روحانی فضا پر چھائے

ہوتے تھے، اور کفرستانِ اودھ کے ان ایمانی چراغوں سے دہلی کے بام و در روشن تھے، شیخ الاسلام شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری متوفی ۷۸۲ھ کے لئے سلطان محمد شاہ تغلق نے عظیم الشان خانقاہ تیار کرائی جہاں سے وہ بندگانِ خدا کو علم و روحانیت کی دولت تقسیم کرتے تھے، شیخ علاء الدین بن اعزالدین کنتوری کو محمد شاہ تغلق نے اودھ سے دہلی بلا کر اپنے یہاں قیام کی گذارش کی مگر انھوں نے انکار کرتے ہوئے اپنے دونوں صاحبزادوں شیخ اعزالدین اور شیخ جمال الدین کو سلطان کے پاس رہنے کی اجازت دی، اور خود کنتور چلے آئے، اس کے بعد محمد شاہ تغلق نے شیخ اعزالدین کو قتل کر دیا، اور شیخ جمال الدین نے دہلی میں رہ کر شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ اودھی سے استفادہ کیا اور کنتور آ کر اپنے والد کی جگہ سنبھالی، قاضی منظر الدین کڑوی بھی شیخ نصیر الدین اودھی سے فیض یافتہ تھے اور سلطان فیروز شاہ تغلق کے ندماء و مقربین میں اہم مقام رکھتے تھے، اس دور میں اودھ کی بزمِ علم و معرفت کے ایک چراغ نے سرزمین بنگال کو بقعۂ نور بنایا یعنی مولانا سراج الدین عثمان چشتی اودھی بنگال تشریف لے گئے اور ان سے خلق اللہ نے فیض اٹھایا، ان ہی میں حضرت شیخ علاء الدین عمر بن اسعد لاہوری پنڈوی متوفی ۸۰۰ھ بھی ہیں، جنھوں نے اپنے مرشد شیخ سراج الدین عثمان اودھی کے کام کو آگے بڑھایا اور پنڈوہ میں مستقل قیام کر کے ارضِ بنگال کو علم و معرفت کا گلستاں بنایا، ان کے والد بعض سلاطینِ بنگال کے وزیر تھے اور فقہ، اصولِ فقہ، ادب و عربیت کے عالم و فاضل مانے جاتے تھے، سید امیر ماہ افضل الدین بہرائچی متوفی ۷۷۲ھ مشہور بزرگ تھے، فیروز شاہ تغلق نے ۷۵۵ھ میں بنگال سے واپسی پر ان سے ملاقات کر کے چند دیہات جاگیر میں دئے۔

ان علماء و مشائخ کے علاوہ اس دور میں دیارِ پورب میں صدہا اربابِ فضل و کمال موجود تھے اور اپنے اپنے حلقہ میں خدمت انجام دیتے رہتے تھے، مثلاً مولانا نصیر الدین جونپوری مریدِ شیخ اشرف الدین منیری، مولانا کمال الدین سنتوسی بہاری، مولانا قاضی فخر الدین بن رکن الدین سترکھی بجنوری متوفی ۷۵۵ھ شیخ تقی الدین علی حسینی بھکری جھونسوی متوفی ۷۵۵ھ، شیخ علی بن محمد جھونسوی متوفی ۷۶۰ھ، شیخ ظہیر الدین بن تاج الدین حسینی ظفرآبادی، شیخ صدر الدین قرشی ظفرآبادی متوفی

[illegible] قاضی سماء الدین بن فخر الدین بجنوری متوفی در لکھنؤ [illegible]، شیخ زین الدین بن عبدالرحمن دہلوی اودھی، مولانا قاضی رکن الدین بن صدر الدین قرشی ظفر آبادی متوفی [illegible]، قاضی رکن الدین بن نظام الدین کڑوی، شیخ جمال الدین اودھی، شیخ جلال الدین اودھی، مولانا رکن الدین بہاری، شیخ زاہد بن محمد بہاری، شیخ اسد الدین بن تاج الدین حسینی ظفر آبادی متوفی [illegible] وغیرہ وغیرہ تعلق دورِ سلطنت میں آسمانِ مشرق کے شمس و قمر تھے، جن کی روشنی سے از دہلی تا بنگال روشن تھا۔

دیارِ پورب میں پہلے علمی دور کا یہ سرسری جائزہ ہے جو [illegible] سے شروع ہو کر [illegible] میں ختم ہوا اور اس کی مدت پونے دو سو سال ہے اس دور میں بنگال میں سنارگاؤں، اور پنڈرہ، بہار میں منیر اور پٹنہ اودھ اور اس کے اطراف میں کڑا، مانک پور، اجودھیا، کنتور، سترکھ، بجنور، سندیلہ، جھونسی، ظفر آباد، بہرائچ، دل مئو، پالی مئو، وغیرہ علم و فضل کے مرکز تھے، جہاں علماء و فضلاء اور مشائخ کی اچھی خاصی تعداد تھی۔

شمس العلماء مولانا عبدالرحمن
کی
خودنوشت سوانح حیات

مولانا عبدالرحمن غیر منقسم ہندوستان میں یونیورسٹیوں کے اساتذۂ عربی و فارسی کی اس پرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے نہ صرف ہندوستان میں عربی اور فارسی کے نامور فضلا اور اساتذہ پیدا کیے بلکہ ان کے علم و فضل کا طوطی یورپ میں بھی بولتا تھا پرنسپل مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر محمد اقبال (پنجاب یونیورسٹی لاہور) مولانا میمن عبدالعزیز اور ڈاکٹر ہادی حسن (علی گڈھ) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) ڈاکٹر وحید مرزا (لکھنؤ) ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی (کلکتہ) ڈاکٹر عظیم الدین (پٹنہ) ڈاکٹر عبدالحق (حیدرآباد) ڈاکٹر داؤد پوتہ (بمبئی) یہ سب حضرات اسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا عبدالرحمن صاحب دہلی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو تھے۔ مولانا کی کتاب مرآۃ الشعر جب شایع ہوتی ہے تو ملک کی علمی اور ادبی مجلسوں میں ایک مدت تک اس کا چرچا رہا اس کے علاوہ مولانا کے جو مقالات اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شایع ہوتے تھے علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ راقم الحروف نے عربی میں ایم۔ اے مولانا کی نگرانی اور رہنمائی میں کیا تھا اور اس تقریب سے جو تعلق

اور یہ تعلق سے پیدا ہوا اس کی وجہ سے آخر تک ہمیشہ نہایت مشفقانہ اور مربیانہ برتاؤ کرتے رہے مولانا کے انتقال کے بعد راقم الحروف نے برہان میں مولانا پر ایک مضمون بھی شائع کیا تھا۔ لیکن بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب مولانا کی خود نوشت سوانح حیات کا اصل مسودہ جو مولانا کے خود اپنے قلم کا لکھا ہوا ہے ہمیں مولانا نظام الدین صاحب جو مولانا عبد الرحمٰن صاحب کی پرنسپلی مدرسہ عالیہ رام پور کے زمانہ میں مولانا کے نہایت معتمد علیہ در لائق و فاضل ہیڈ کلرک تھے ان کی معرفت دستیاب ہو گیا ہے۔ ہم مولانا نظام الدین صاحب کے شکریہ کے ساتھ اس کو شایع کرتے ہیں۔ (اڈیٹر برہان)

بسمہ

میں ۲۳ فروری ۱۸۷۳ء میں، جے پور میں پیدا ہوا، وہیں پڑھا لکھا اور جوان ہوا، وہیں مہاراجہ کالج میں ایک مدرس یا ایک پروفیسر بنا۔

میں کسی علمی گھرانے میں نہیں ؟ ایک سپاہی کے گھر میں پیدا ہوا میرے والد فقہی بخیب میں نائب میجر تھے۔ کوارٹر ماسٹر کی خدمت بھی ان کے سپرد رہتی تھی۔ ریاست کے جاگیرداروں کے ہاں اُن کے گھوڑے بھی ملازم تھے۔ سواروں کی سلح داری دوسروں کے نام رہتی۔ فائدے، نقصان کے مالک والد رہتے تھے۔ گھوڑوں کی سوداگری بھی والد کا دل چسپ مشغلہ تھا۔ پشکر اور بالوترے کے سالانہ میلے ان سے کم ہی چھوٹتے تھے۔

میرے بچپن اور لڑکپن میں ہمارے ہاں اچھی خاصی آسودگی تھی۔ میں بڑا ہوا تو گھر کو تنگدستی نے آگھیرا تھا۔ مگر جلدی ہی میں مہاراجہ کالج کا ایک نے ظیفہ خوار طالب علم بن گیا۔ اور میرا وظیفہ گھر کے لئے ایک حد تک سہارے کا کام دینے لگا۔ اس زمانہ میں ڈھائی سیر کا گھی "واقعی گھی" بکتا تھا۔ ۲۶ سے ۲۸ سیر تک روپیہ کے گیہوں آتے۔ چنے، جو، جوار، مکا اور بھی سستے ہوتے تھے۔ آج کل کا سا حال نہ تھا کہ باجرا بھی آٹھ دس آنے سیر بکتا ہے۔ اس لئے آٹھ دس روپیہ ماہوار کا وظیفہ اُن دنوں ایک تنخواہ ہوتی تھی۔

میرے والد ۱۸۵۷ء کے کچھ بعد نوکری کی تلاش میں گھر (جھنولس) سے نکلے اور آخر جے پور جاکر نوکر ہوگئے۔ کوئی ۳۰ برس نوکری کی، مگر نائب بیجری سے آگے نہ بڑھے اُس زمانہ کا یہی حال تھا۔ بندھگیا سو موتی رہ گیا سو کنکر۔

صحیح ہے یا غلط یہ خدا جانے، مگر مجھے روایت یوں ہی پہنچی ہے کہ ہمارا نکاس جھکیڑے سے ہے۔ جھکیڑا کسی زمانے میں ایک متبرک جگہ تھی۔ یہاں بہت سے یگ "یگیہ" ہوئے تھے اسی لیے وہ جگہ یگ کھیڑا کہلاتی تھی۔ یہی لفظ کثرتِ استعمال سے رفتہ رفتہ جھکیڑا بن گیا۔ اس نام کا اچھا خاصہ بڑا گاؤں ضلع میرٹھ میں میرٹھ کے پاس اب بھی موجود ہے اور اس کی زمینوں سے پُرانی بستی اور یگ کی رسمی چیزیں اب تک نکلتی رہتی ہیں۔

جھکیڑا مُسلمانوں کے عہدِ حکومت میں بھی مدتوں خالص ہندوؤں کی بستی بنا رہا۔ البتہ مغلوں کا دور آیا تو ان کی فوجوں میں ہندو بھی سپاہی اور سپاہدار ہونے لگے۔ کہتے ہیں اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ تھا، اس کی فوجیں اُسی کی کمان میں دکن میں لڑ رہی تھیں۔ انھیں میں جھکیڑے کے ہندو بھی تھے۔ ان کی ایک جماعت ایک بزرگ کے مزار پر اُس بزرگ کی کچھ کرامتیں دیکھ کر ایسی متاثر ہوئی کہ مسلمان ہوگئی۔ جھکیڑے کی ہندو بھانپ کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی۔ مگر کیا کر سکتے تھے بِل بھر کر چپ ہو رہے اور موقعے کا انتظار کرنے لگے۔

مشکل سے ساٹھ ستّر برس گزرے تھے کہ زمانے نے پلٹا کھایا مرہٹوں نے زور باندھا۔ ملک میں ہندو گردی شروع ہوگئی اب جھکیڑے کے ہندوؤں نے دکن کے نومسلموں کی اولاد کو دبانا شروع کیا اور اتنا ستایا کہ وہ اپنے گھر بار اور جنم بھوم کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر تتر بتر ہوگئے اور پھر کہیں سر جوڑ کر بیٹھنے کے قابل نہ ہو سکے۔

جھکیڑے سے یہ دیس نکالا پانے والے مسلمان زیادہ تر تنوار (تنوَر تومر) نسل کے راجپوت تھے۔ تنوروں کی بہت سی تڑیں اور کھانپیں (شاخیں) ہیں ایک اِن میں بے کلیانی اور مُنڈے ہیں نے کھیں کے ہم نام لیوا ہیں۔ اور چوں کہ ہندی الاصل ہیں اس لئے شیخ اور شیخ زادے بھی کہلاتے ہیں۔

جھگڑے سے نکل کر ہمارے اسلاف کہاں کہاں گئے اور کیا کرتے رہے ۔ یہ قصہ یہاں دور از کار ہے ۔ کہنے کی بات صرف یہ ہے کہ بجولی میں ہمارے ایک چچا کو نی خون کر بیٹھے ۔ دادا کو اپنوں کی جان خطر میں دکھائی دی تو وہ بیٹوں کو ساتھ لے کر اپنی آخری عمر میں چھولس ضلع بلند شہر میں آ رہے یہیں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دیکھا ۔ اور راہی ملک بقا ہو گئے اسی لئے چھولس ہمارا جدی نہیں آبائی وطن ہے ۔ اور میں خود گویا جے پوری ہوں ۔ وہیں پیدا ہوا ۔ اور تیس برس کی عمر تک بیشتر وہیں رہا ۔ ہاں چھولس بھی آتا جاتا رہتا تھا ۔

پڑھنے کی عمر آئی تو قرآن مجید پڑھا ، عملی تجوید سیکھی ۔ حفظ قرآن کی سعادت مقدر نہ تھی ، کوشش بھی کی ، وہ حاصل نہ ہو سکی اب خالق باری اور کریما شروع کی ۔ اُس زمانہ کا یہی دستور تھا ۔ اُردو ابھی کھرمس اور مکتبوں میں نہ آئی تھی ۔ مدرسوں میں البتہ آ چکی تھی ۔ اور عام رجحان اُنھیں کی طرف بڑھ رہا تھا ۔ آخر ہم بھی مدرسے بھیج دئے گئے ۔ انگریزی سے ابھی اوساط الناس میں نفرت تھی ۔ سرسید کی تحریک نے اس وقت تک قبولِ عام نہ پایا تھا ۔ عربی سرکاری مدرسوں میں وہاں پڑھائی نہ جاتی تھی ۔ اس لئے ہم مدرسے کی اردو فارسی سائڈ میں داخل ہوئے ۔

ریاست میں دفتر فارسی کے بجائے اردو میں ہو چکا تھا ۔ مگر قدر ابھی فارسی ہی کی تھی ۔ ملازمت کے لئے اسی کی پوچھ ہوتی تھی اور ملازمت ہی عام طور پر تعلیم کی معراج سمجھی جاتی ہے ۔ مگر جے پور میں فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے مڈل پاس کرنا ضروری تھا تاکہ ادبی قابلیت کے ساتھ دفتری کاروبار کی صلاحیت بھی حاصل ہوتی رہے ۔

مدرسے میں ہمیں ریاضی نے بہت ستایا ۔ مڈل تک کی آٹھ جماعتیں ہمارے لئے ہفت خواں بن گئیں ، جب یہ مرحلہ طے ہو گیا تو آگے میدان صاف تھا ۔ اب ہم فارسی عربی کی طرف جھکے ۔ فارسی مدرسے میں پڑھتے اور عربی استادوں کے ہاں جا کر ۔

ان دنوں پنجاب میں یونیورسٹی بن کر مشرقی علوم کے امتحانات شروع ہو چکے تھے ۔ مہاراجہ کالج جے پور بھی اس سے الحاق ایفڈ تھا ہم بھی اس کے امتحانات میں بیٹھے منشی اور منشی فاضل میں اول

آتے نمبر بھی بہت پاتے تھے۔ مدرسے میں شہرت بھی ہماری اچھی تھی، پرنسپل "کالے پدو سنرجی" کو خیال ہوا کہ ہمیں کالج میں پروفیسر بنائے چنانچہ اس نے اس کی پروا نہ ڈالی۔
پرنسپل جانتا تھا کہ فارسی کی خاطر خواہ تکمیل عربی کے بغیر نہیں ہوتی۔ یہ بھی اسے معلوم تھا کہ ہم عربی پڑھتے رہے ہیں، اس لئے اس نے ایک طرف کالج میں عربی کی جماعتیں (رفتہ رفتہ) پڑھائیں اور دوسری طرف ہماری ناخن بندی کے لئے ہمیں ایک عوض خدمت مدرس بنادیا۔ یوں ہم معلم اور متعلم بن کر آخر مولوی فاضل بھی ہو گئے مگر عربی کے کسی امتحان میں اچھے نہ رہے۔ یہ کیوں؟ عذر اس کا بدتر از گناہ ہوگا۔ ناگفتہ بہی بہتر ہے۔
فارسی کے خلاف ہمارے عربی امتحانات کے نتیجے یقیناً پرنسپل کی توقعات کے خلاف تھے لیکن وہ اس کے اسباب بھی جانتا تھا اس نے اُس کی پروا نہ کی اور ہمیں منشی کی جماعت پڑھانے کو دے دی۔
ہم نے کئی سال منشی کو پڑھایا۔ اچھے اچھے نتیجے دکھائے۔ وقت کے پرنسپل نے بھی بہت زور مارا کہ ہمارے لئے نئی اسامی کی منظوری مل جائے۔ مگر کونسل نے نہ مانا۔ اسی بد دلی کے زمانے میں ایک دوست نے لاہور سے بلاوا بھیج دیا کہ آکر رنگ محل ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی بن جاییے۔ کالج سے اسکول جانا بُرا تو معلوم ہوا مگر تقاضائے وقت یہی تھا کہ چلے جائیں۔ چنانچہ گئے۔ اور اسکول میں فارسی عربی کے ہیڈ ہو گئے۔
ابھی بہت دن نہیں گزرے تھے کہ مہاراجہ کالج میں منشی عالم کی مدرسی خالی ہوئی۔ پرنسپل نے لکھا "لو اب جگہ ہو گئی ہے آنا چاہو تو آجاؤ" مگر ہم پھر نہ گئے۔ تین برس ہوئے تھے کہ دلی مشن کالج میں عربک پروفیسر کی مانگ ہوئی۔ درخواستوں کی کمی نہ تھی مقدمہ ابن خلدون کا ترجمہ ہمارا سفارشی بنا اور ہم منتخب ہو گئے۔ اور ۳۳۔۳۴ برس تک اسی کالج میں پروفیسر رہے۔ ایم، اے اور ایم، او، ایل تک پڑھایا بلکہ اس سے کچھ آگے بھی۔
دلی میں یونیورسٹی بنی تو عربی، فارسی اور اُردو ڈپارٹمنٹ کی ہیڈ شپ (صدارت) میرے

حصے میں آئی اور کوئی پندرہ برس یہ خدمت مجھ سے متعلق رہی۔ ۱۹۲۸ء میں آکسفورڈ میں انٹرنیشنل اورینٹل کانفرنس ہونے لگی تو صوبہ دہلی نے مجھے اپنا ڈیلی گیٹ بنایا اور میں حج کرتا، مصر و شام و قسطنطنیہ ہوتا ہوا یورپ چلا گیا یورپ کے سارے بڑے بڑے شہروں کی سیر کی اور آخر لندن جا پہنچا۔ تین مہینے وہاں رہا۔ وقت پر کانفرنس میں شریک ہوا۔ اور اس میں پروفیسر مارگولیوتھ کے نظریے پر اپنا تنقیدی مقالہ پڑھا۔

مارگولیوتھ اپنے وقت کا بڑا مستشرق عربی کا عالم مانا گیا ہے۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا۔ اور کہتا تھا کہ عربی کے جس شعر کو جاہلیت کا شعر کہا جاتا ہے وہ مطلق جاہلیت کا نہیں۔ تیسری صدی میں گھڑ کر جاہلیت کے سر تھوپ دیا گیا ہے۔ لکھنے والوں نے اس نظریے کے خلاف بہت کچھ لکھا اور خوب خوب لکھا۔ لیکن مری تحقیق و تنقید کا پہلو بالکل انوکھا تھا میں نے عربی ضرب الامثال سے عہد جاہلیت میں شعر اور اس کے اوزان کا وجود ثابت کیا تھا۔ اور پھر قافیانہ قلم فرسائی نہیں کی تھی۔ جو کچھ کہنا تھا مارگولیوتھ کے سامنے کہہ رہا تھا۔ مقالہ میرا تقاضائے اگرچہ مختصر رہتا۔ لیکن بہت پسند کیا گیا۔ اور نہ صرف آکسفورڈ میں بلکہ مصر و شام میں بھی۔ اور مارگولیوتھ جواب کا کیا مذکور ہے، کوئی تنقیدی سوال بھی پیش نہ کر سکا۔

میں کالج اور یونیورسٹی سے ریٹائر ہو چکا تھا کہ سید بشیر حسین خاں[1] بار ایٹ لا پرائم منسٹر ریاست علیہ رامپور یوپی نے مجھے ملنے کیلئے رام پور بلایا۔ رام پور میں ان دنوں کچھ عرصے سے مدرسۂ عالیہ کی پرنسپلی اور اصلاح کا مسئلہ درپیش تھا اور سید صاحب کی نگاہ میں یہ کام میں انجام دے سکتا تھا۔ اور وہ اس سے پہلے مجھے پرنسپلی کا پیغام دے بھی چکے تھے۔ لیکن میں اصلاح کی دشواری کو سمجھتا تھا۔ اس لئے اس سے بچنا چاہتا تھا مگر بچ نہ سکا۔ میں سمجھتا تھا کہ میری پہلوتہی پر سید صاحب اپنے خیال سے دست بردار ہو چکے ہیں مگر میرا یہ خیال صحیح نہ تھا۔ میں ان کے بلانے پر رام پور پہنچا تو وہ مجھے سرکار کے دربار میں لے پہنچے اور اعلیحضرت کا حکم ہوا کہ مدرسۂ عالیہ کی اصلاح کروں۔ اب مجھے سرِ تسلیم خم کرنا ہی چاہئیے تھا چنانچہ حکم کی تعمیل کی۔ اور مدرسۂ عالیہ میں پرنسپل بنکر جا بیٹھا۔ مدرسۂ عالیہ رام پور وہی مدرسہ ہے

[1] مسودہ میں اسی طرح ہے۔

جسکی مشیخت وصدارت کیلئے ایک دن مولینا عبدالعلی مرحوم بحرالعلوم کو بلایا گیا تھا۔ ملا حسن جس کی صدارت کرتے ہوئے رام پور ہی میں پیوندِ زمیں ہوئے تھے۔ کہاں اِس مدرسے کی صدارت اور کہاں میں۔ چہ نسبت خاک را باعالم پاک۔ لیکن ہمارے اِس وقت کا مدرسۂ عالیہ بھی وہ مدرسۂ عالیہ نہیں رہا تھا اِسی لئے اسکی اِصلاح کی ضرورت تھی۔

دنیا میں ہر اصلاح ایک گونہ فساد اپنے ساتھ لاتی ہے پھران میں سے جو غالب آجاتے یہی مجھے بھی مدرسۂ عالیہ میں پیش آیا۔ دیرینہ جمود وخمود میں ایک ارتعاشی حرکت ضرور پیدا ہوئی۔ مگر جو اصلاح ہونی چاہیئے تھی وہ نہ ہوسکی۔ یہ کیوں اسے جاننے والے جانتے ہیں نہ جاننے والوں کو جاننے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ابھی اصلاحی کشاکش جاری تھی کہ میری بیماری کا تقاضہ ہوا کہ رخصت کر استعفا چاہوں اور کام کو چھوڑ کر آرام کروں۔ چنانچہ یہی کیا۔ مگر غائبانہ استعفیٰ بھیجنا پڑا۔ اس کا مجھے اُس وقت بھی افسوس ہوا اور آج بھی ہے۔ استعفیٰ دینا میرے لئے لازمی ہوچکا تھا۔ لیکن مجھے رام پور پہنچ کر ہی دینا چاہیئے تھا۔

علمی تحصیل میری درس و مطالعہ دونوں کی ممنونِ منت ہے۔ میرے پڑھنے پڑھانے کے وقت میں درسِ نظامی اگرچہ جگہ جگہ کا مختلف ہوچکا تھا لیکن میں نے اُن میں سے کوئی بھی درسِ نظامی پورا نہیں کیا۔ اگرچہ میری طالب علمی لاہور کی مدرسی اور دلی کی پروفیسری کے زمانہ تک رہ رہ کر چلتی رہی۔

میرے اساتذہ رحمہم اللہ تعالیٰ خود یگانۂ روزگار اگرچہ بعض اوقات کہہ گزرتے تھے

؎ یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھو فسانہ ہیں ہم لوگ

لیکن اعیانِ روزگار کے یادگار تھے اُن کے تلمذ کا سلسلہ شاہ اسحاق دہلوی۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور مفتی محمد عباس لکھنوی تک پہنچتا تھا۔ اس لئے باہمہ ہیچ مدانی مجھے بھی یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔ گرچہ خُردیم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتاب تابانیم۔ رحمہم اللہ تعالےٰ۔

درسی تحصیل آدمی کو منزل کی راہ پر ڈالتی ہے۔ منزل تک اسے مطالعہ پہنچاتا ہے۔ مطالعہ

کا مجھے اول ہی سے شوق تھا۔ اتفاق سے سامان بھی اس کا میسر آتا رہا۔ اس لئے اس کی بدولت پایا جو کچھ پایا اور بفضلہ اتنا اور ایسا پایا کہ بہت سے مذہبی فضل و کمال اس تک نہیں پہنچے۔

۱۹۰۱ء میں دلّی، جے پور کے جنتر منتر اور رصد گاہوں کی مرمت ہونے لگی۔ زیج محمد شاہی درستی کی بنیاد قرار پائی۔ پنڈت چندر دھر گلہری اس خدمت پر مامور ہوئے۔ زیج محمد شاہی کا انھیں سمجھانا ہمارے ذمے آیا۔ ہمیں اس میں کوئی دقت بھی پیش نہ آئی۔ تصریح اور چغمینی اور ان کی شرحیں پڑھنے والے منہ ہی تکتے رہ گئے۔

اسی زمانے میں بعض عصری طبیعیات کی کتابوں کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ وہ بہت پسند آئیں۔ العروس البدیعیہ۔ فی علم الطبیعیۃ کا ترجمہ شروع کیا۔ کتاب بڑی تھی۔ کچھ ابواب کا ترجمہ کیا تھا کہ جے پور سے لاہور جانا پڑا۔ وہاں دوسرے مشاغل شروع ہوگئے۔ وہ ترجمہ ناتمام رہ گیا۔ چوں کہ پہلا کام تھا اس لئے بہت عزیز تھا وہ لاہور سے دلی بھی ساتھ آیا۔ وہاں ایک شاگرد دیکھنے کے لئے لے گئے۔ پھر وہ واپس نہ آیا۔

لاہور پہنچتے ہی ہم نے مقدمۂ ابن خلدون کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ کام اُجرت پر کیا۔ مگر اُجرت بالکل ہیچ تھی لوگ بڑی بڑی اجرتوں پر بھی راضی نہ تھے۔ ہم تو گرفتار نا آزمودہ کار تھے، اور ضرورتمند بھی۔ ہیچ ہی کو بہت کچھ سمجھ لیا۔ اور ترجمہ شروع کر دیا۔

بکے مفت میں ہم زمانے کے ہاتھوں یہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

کام لینے والے ہمیں وہ مہربان ملے تھے جو کہتے تھے کہ نام رکھ لو یا دام لے لو۔ ہم نے نام کو چھوڑ کر دام لینا پسند کیا۔ اسی لئے مقدمۂ ابن خلدون اور الحصون الحمیدیہ کے ترجموں کے سوا کسی کام پر ہمارا نام نہیں آیا۔ حالاں کہ وہ ان سے دو چند نہیں تو چہند در چند ضرور تھا۔

دہلی آکر ۱۹۰۶ء کے بعد بھی عرصہ تک لاہور اور امرتسر کے خریداروں کی خاطر ہم کچھ نہ کچھ لکھتے اور اس کا نعم البدل پاتے رہے لیکن اب وہ حاجت اور ضرورت نہیں رہی تھی جو اس سے پہلے تھی۔ اس لئے رفتہ رفتہ کام کو چھوڑ کر آرام پر کمر باندھ لی۔ اور قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔

سینٹ اسٹیفنس کالج میں مسٹر سی ایف اینڈروز انگریزی کے علاوہ ہندوستان کی

اسلامی تاریخ بھی پڑھایا کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ مجھے بھی اس میں کچھ درک ہے۔ کبھی کبھی اس عہد کی تاریخ کے کسی کسی مسئلے میں مجھ سے بھی گفتگو کرنے لگ جاتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ سینٹ سٹیفنس کالج چھوڑ کر ٹگور کے اسکول" شانتی نکیتن جانے لگے تو کالج کے پرنسپل سے کہہ گئے کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ ایم اے کی عبدالرحمن کو دینا، تمھارے کالج میں وہی اس کا اہل ہے۔

مسٹر سی۔ ایف اینڈ روز سینٹ سٹیفنس کالج میں محض ایک پروفیسر تھے، مگر سارے کالج میں محض ایک پروفیسر تھے، مگر سارے کالج کی روح رواں تھے۔ کالج ان کے اشاروں پر چلتا تھا۔ یہی جناب تھے جو ٹگور صاحب کو یورپ لے گئے۔ اور ان کو نوبل پرائز ملنے کا موجب ہوئے۔ یہی صاحب افریقہ جاکر گاندھی جی کو اپنے ساتھ لاتے اور ان کی سیاست کے حامی کار بنے۔ سارا ملک گاندھی جی کی مانتا تھا۔ مگر گاندھی سی ایف اینڈ روز کی بات کو نہ ٹالتے تھے۔

کالج کے پرنسپل مسٹر رورا نے اینڈ روز صاحب کا قول مجھے سنایا تو میں نے سنتے ہی دل میں کہا " سنگ آمد و سخت آمد" انکار بے کار تھا۔ اس لئے میں نے کہا۔ کہ دلی میں اوریجنل تاریخی مواد گویا نا پید ہے۔ میں انگریزی نہیں جانتا۔ ایم۔ اے کو پڑھانا اور اُردو میں پڑھانا یہ کیا بات ہوئی۔ پرنسپل نے کہا مواد جہاں سے ملے جاکر لاؤ۔ خرچ اسکا کالج دے گا۔ رہا ایم اے کو اردو میں پڑھانا۔ سین کو نہیں دیکھتے وہ کیا کر رہا ہے۔ تاریخ تو فلاسفی کی برابر ٹکنیکل (یعنی اصطلاحات) بھی نہیں ہے۔ جو ایم۔ اے میں آتے ہیں وہ انگریزی تو جانتے ہی ہیں انھیں علم چاہیئے۔ اس کے لئے اپنی زبان سے بہتر کوئی زبان نہیں ہو سکتی۔ اب میرے پاس کوئی عذر نہ تھا۔ خاموش ہو گیا۔

سین صاحب سینٹ سٹیفنس کالج میں فلاسفی کے پروفیسر تھے۔ اور مجھ سے صرف پندرہ دن سینیر تھے۔ فلسفہ پر بڑی اچھی نظر رکھتے تھے، فلسفہ کتابوں سے نہیں اپنی باتوں سے پڑھایا کرتے تھے۔ جو اُردو ہوتی تھی نہ ہندی۔ نہ انگریزی اور نہ بنگالی۔ ان کے پڑھانے کی دور دور دھوم تھی دور دور سے لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے۔ شمالی ہندوستان کے تمام کالجوں میں

ان کے شاگرد اب بھی پروفیسر ہیں۔ اور بعض بعض بنا بے استاد کی تقلید میں فلسفہ اردو ہندی بانوں میں پڑھاتے ہیں اور کامیاب پروفیسر ہیں۔

ہم نے اردو میں ایم۔ اے کو تاریخ پڑھانی شروع کی تو باہر والے بھی سننے آتے تھے۔ کئی سال یہ سلسلہ چلتا رہا پھر پنجاب یونیورسٹی نے اس پرچے کو تاریخی تھیسس (تحقیقی و تنقیدی مقالہ) سے بدل دیا۔ اس کی رہنمائی و نگرانی بھی اکثر میرے ہی ذمے رہی۔ مجھے بھی اس سے زیادہ دلچسپی ہوئی کہ اس میں تحقیق و تنقید کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ اس میدان میں کام کیا تو معلوم ہوا کہ تاریخ میں تحقیق و تنقید کی بڑی گنجائش ہے۔

ہمارے تحقیقی و تنقیدی مقالات کا یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ دلی یونیورسٹی بن گئی اور پنجاب سے دلی کا تعلیمی رابطہ ٹوٹ گیا۔ اور ہمارے کام کی نوعیت بدلنے لگی مگر اس وقت تک میں ان تاریخی تحقیقی کام کی وجہ سے دلی کی نئی یونیورسٹی بنانے والوں کی نگاہوں میں ایک نمایاں کارآمد شخصیت کا درجہ حاصل کر چکا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ مجھے عربی فارسی اور اردو کے یک جائی ڈپارٹمنٹ کا ہیڈ یا صدر بنا دیا گیا۔

جس زمانے میں میں سینٹ سٹیفنس کالج میں عربی کا پروفیسر یا لکچرار تھا ان زمانے تک عربی، فارسی کی پروفیسری کے لئے انگریزی لازمی نہ تھی اور جامع حیثیت کے لوگ ملتے بھی کم تھے۔ اس لئے ہمیں بہ خود انگریزی کا خیال آیا۔ نہ کالج کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوا لیکن جب دلی میں یونیورسٹی بنی اور ہمیں ڈپارٹمنٹ کا ہیڈ ہو کر فیکلٹی اور اکیڈمک کونسل کا ممبر بننا پڑا، جہاں سارا کام صلاح مشورے تک کا انگریزی میں ہوتا تھا۔ تو اب ہمیں انگریزی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور ہم نے لگ لپٹ کر جلدی انگریزی میں اتنی شُدبُد پیدا کر لی کہ یہ سمجھنے لگے کہ کہنے والے کیا کہہ رہے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہ استعداد کچھ اور بڑھ گئی۔ مگر بولنے کی مشق نہ ہوتی تھی وہ نہ ہو سکی۔ ٹوٹے پھوٹے مشکل ہی سے پڑھا کرتے ہیں۔

جو لوگ یونیورسٹی میں کسی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ یا ریڈر ہوتے تھے اور تھے کسی کالج کے آدمی۔ ان سے یونیورسٹی نے توقع کی کہ وہ کچھ ایکسٹرا (مزید) لیکچرز یونیورسٹی کے نام پر بھی دیا کریں جن کو چاہیں تو دوسرے کالج والے بھی آ کر سن لیا کریں۔ یونیورسٹی کی اس توقع پر جو مطالبے کی صورت پکڑ گئی تھی ہمیں بھی کچھ کرنا چاہئے تھا۔ ہمیں اس کام کے لئے کوئی تاریخی مضمون چننا چاہئے تھا کہ ذکر اس کا مسٹر سین سے آگیا جن کی جگت گروئی کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ انھوں نے

کہا کہ آپ کا موضوع کلام خاص کر اول اول میں خالص ادبی ہونا چاہئے۔ اور ہماری مانو تو شعر اور عربی شعر کو اپنا موضوع بنالو۔ بات معقول تھی، ہماری بھی سمجھ میں آگئی۔ اور دس گیارہ لیکچرز شعر اور عربی شعر پر دے ڈالے۔

اب بعض دوستوں کا تقاضا ہوا ان کو چھپوا دے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی اصرار کہ عربی کے ساتھ ساتھ فارسی، اردو کی مثالیں اور بڑھادی جائیں۔ اس کی میں نے تعمیل کی اور دس گیارہ میں سے سات لیکچر چھپوا دئے جو مرآۃ الشعر کے نام سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں اور بعض یونیورسٹیوں کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں داخل ہیں۔

ادائے فرض عین انسانیت ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو کام کے میدان میں فرض کی حد سے آگے بڑھ کر کام کرتے ہیں۔ مگر یہ بات ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ میں خود بھی انھیں لوگوں میں ہوں جو فرض کی حدود سے بمشکل ہی آگے بڑھتے ہیں۔ اس لئے میں نے جو کچھ بھی لکھا وہ کسی مصلحت یا مجبوری کی بنا پر لکھا۔ پھر جو کچھ کسی خاص مصلحت کے تحت میں نے لکھا اور کچھ لے دے کر یا بے لئے دئے لوگوں کو دے دیا۔ اور اس پر میرا نام نہیں آیا۔ وہ خواہ کتنا اور کیسا ہی کیوں نہ ہو اس کا اب نام لینا اور اسے اپنے کاموں میں گنوانا مناسب نہیں جانتا۔ میرا کام جو میرے نام چھپا وہ یہی مقدمہ ابن خلدون۔ الحصون الحمیدیہ کا اردو ترجمہ اور مرآۃ الشعر ہے یا وہ تحقیقی و تنقیدی مضامین جو کسی شوق یا اصرار کی بنا پر لکھے گئے، اور اس لئے کہ وہ بڑے پھیلاؤ کے تھے۔ پورے نہیں ہوئے تھے، ادھورے ہی پڑے رہ گئے۔ ان میں سے بعض بعض کا کچھ کچھ حصہ وقتاً فوقتاً بعض رسالوں میں شائع ہو گیا ہے۔ کچھ کچھ حصہ کالج کی ہسٹاریکل سوسائٹی میں بھی پڑھا جاتا رہا ہے۔ یہ ساری طویل طویل چیزیں ابھی مسودے ہی کی صورت میں تھیں۔ ابھی ان کی ترتیب و اشاعت کی نوبت نہ آئی تھی کہ ۱۹۴۷ء کا ستمبر اکتوبر آگیا اور جو کچھ اچھا برا عمر بھر کا کیا دھرا تھا۔ وہ ایک چشم زدن میں گاؤ خورد ہو گیا۔ اور ہم اِنّا للہ کہتے ہوئے ہندوستان سے پاکستان آگئے۔

ہم کیا ہیں کہ کوئی کام ہم سے ہوگا   کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے   جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ مَجَّانًا وَاَحْیَیْتَنِیْ مَجَّانًا وَرَزَقْتَنِیْ مَجَّانًا فَاغْفِرْ لِیْ مَجَّانًا۔
بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْن

"سائنس، مذہب اور ذہنی سکون"

از جناب سید محمد امتیاز الدین صاحب یعقوب انگلش لیکچرر بجنور انٹر کالج - بجنور

سائنس نظامِ کائنات میں غور و فکر اور مظاہرِ کائنات کی تحقیق و تفتیش کا نام ہے۔ کیمسٹری (علم کیمیا) میں مادہ اور تمام اشیاء کی بناوٹ اور ساخت و ترکیب سے بحث کی جاتی ہے۔ فزکس (طبیعیات) میں اشیاء کائنات میں پائی جانے والی قوتوں مثلاً حرارت، روشنی، آواز وغیرہ کے اصولوں پر غور و خوض کرکے ان توانائیوں کے اثرات مادہ پر دکھائے جاتے ہیں۔ بیالوجی (حیاتیات) میں حیوانات و نباتات کی ساخت پرداخت اور زندگی کے خصائص و لوازمات زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ جیالوجی (یعنی علم جمادات) میں زمین کے نیچے پائی جانے والی اشیاء مثلاً مٹی کی مختلف قسموں اور چٹانوں کے مختلف پرتوں وغیرہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور آسٹرانومی یعنی فلکیات اور فلکی طبیعیات (آسٹرو فزکس) میں ستاروں اور سیاروں کے نظامات، کہکشانی مادہ سے ان کی پیدائش و موت کے اصول و ضوابط سے بحث کی جاتی ہے، غرض یہ کہ سائنس کے کسی شعبہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جو بنی نوع انسان کے قلبی سکون و راحت کو پامال کرنے والی ہو، سائنس محض کائنات اور نظامِ کائنات کے حقیقت پسندانہ اور غیر جانبدارانہ تنقید و جائزہ اور نقد و نظر کا نام ہے۔ اس لحاظ سے سائنس اور علوم سائنس کا سرمایہ اپنی اصلی ماہیت کے اعتبار سے علمِ انسانی کا ایک قیمتی سرمایہ ہے جو کسی بھی دین و مذہب کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ آج سائنسی تحقیقات و انکشافات ہی کی بدولت قرآن کی آفاقی و انفسی دلائل، دینِ فطرت (اسلام) کے ابدی حقائق کے روپ میں جلوہ گر ہو رہے ہیں کیوں کہ خلاقِ فطرت نے مظاہرِ فطرت کے

اصول و ضوابط کو اپنی صنعت و حکمت کے تحت دین و شریعت کے اصولوں کے مطابق رکھا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُوْقِنِیْنَ یعنی اللہ نے زمینوں اور آسمانوں کو (مطابقت و سچائی کے ساتھ) پیدا کیا ہے بلاشبہ اس مطابقت میں اہل ایمان کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ (سورۂ عنکبوت) دوسری جگہ ارشاد فرمایا "لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی" مطلب یہ ہے کہ آسمانوں میں زمین میں اور ان دونوں کے درمیان جتنی بھی چیزیں ہیں اور گیلی مٹی کے نیچے یعنی پاتال میں جو کچھ بھی ہے سب اُسی خدائے بزرگ و برتر کی ملکیت ہے" اس آیت شریفہ کا دائرہ جمادات یعنی جیالوجیکل اشیاء سے لے کر افلاک تک وسیع ہے "لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ" میں نہ صرف تمام آسمانی ستارے و سیارے آجاتے ہیں بلکہ اُن میں موجودہ مخلوق بھی آجاتی ہے۔ "وَمَا فِی الْاَرْضِ" میں کرۂ ارض پر پائی جانے والی تمام چیزیں آجاتی ہیں۔ "وَمَا بَیْنَهُمَا" کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ فلائیات کے مظاہر اور اُن کی نیرنگیوں پر ہوتا ہے۔ اور "وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی" یعنی پاتال کے تحت جیالوجی کے تمام متعلقات آجاتے ہیں۔ اس طرح اس عالم رنگ و بو کی وہ کون سی چیز ہے اور وہ کون سا مظہر ہے جو ان چار کلیات سے باہر ہو کہ جن پر غور و فکر کے لئے توجہ دلائی جارہی ہے ظاہر ہے کہ ایمان بربّ العالمین کے ساتھ ہر سائنسی اختراع و ایجاد وجہ سکونِ قلب ہوگی نہ کہ باعثِ انتشار۔

جاپان کے مشہور شہر کیوٹو میں حالیہ ایک نہایت عظیم الشان مذہبی عالمی کانفرنس میں جو اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء میں منعقد ہوئی تھی امریکہ کے ورلڈ کونسل آف چرچیز کے سکریٹری جناب ڈاکٹر یوجن کارسن بلیک نے اظہار خیال فرماتے ہوئے کہا ...... "میرا پختہ عقیدہ ہے کہ مذہب" سائنسی ترقی" کا سب سے بڑا حامی اور مؤید ہے لیکن یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ "ترقی انسان کے لئے ہے اور انسان ترقی کے لئے نہیں" اس لئے روحانی اور مذہبی اقدار کو زندگی کے کسی مرحلے اور کسی منزل میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ "ترقی" کوئی بھی ہو بہر حال کسی نظریہ اور کسی فکر کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ کچھ نہ کچھ اقدار ہوتے ہیں جن پر ترقی کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اگر یہ روحانی اور مذہبی اقدار نہیں ہوں گے تو وہ اقدار ہوں گے جن کو موجودہ عہد کی فکری تحریکوں مثلاً کمیونزم، ہیومنزم اور نیشنلزم نے جنم دیا ہے لیکن اس صورت میں ترقی کا رخ غلط ہوگا۔

اور وہ انسانیت اور انسان کے لئے موجبِ ہلاکت و نقصان دہ ہوگی اور اس کے برخلاف اگر ترقی کی اساس روحانی و مذہبی اقدار ہوتے اور مذہب و ترقی دونوں ساتھ ساتھ چلے تو ان سے انسانیت اور انسان دونوں کو فائدہ ہوگا اور تہذیب و تمدن صحیح خطوط پر آگے بڑھتے رہیں گے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے لوگوں کی ایک جماعت ترتیب دی جائے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہونے کے باوجود زندگی میں مادہ پرستانہ نقطۂ نظر نہ رکھتی ہو۔" بالفاظِ دیگر انھوں نے "ساعیانِ امن و سلامتی" اسلام کے نام لیواؤں کو دعوتِ غور و فکر دی ہے کہ وہ سائنس و ٹیکنالوجی کو اپنا کر جن پر آج مادہ پرستوں اور ملحدوں کا قبضہ ہے دنیا کو "امن و سلامتی" کا راستہ دکھائیں۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ "امن" اپنے اصلی معنی اور ماہیت کے اعتبار سے صرف جسمانی تحفظ اور فقدانِ جنگ کا نام نہیں ہے اگرچہ یہ بھی بہت ضروری . . . . لیکن یہ امن کا محدود اور یکطرفہ مفہوم ہے۔ دراصل "امن" کے معنی ہیں ایک فرد کا ایک طرف اپنے خالق کے ساتھ اور دوسری طرف اپنے ابنائے جنس کے ساتھ ایسا تعلق اور ربط جو منفعت بخش اور موجب فلاح ہو، اس دائرے میں وہ تمام تعلقات آجاتے ہیں جو ایک فرد کے ساتھ یا قوم کے ساتھ یا ایک قوم کے دوسری قوم کے ساتھ ہوں، پھر امن کسی خاص قسم کا نہیں بلکہ جسمانی، ذہنی، اخلاقی و روحانی غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ اسلام اسی وسیع مفہوم میں امن کی ضمانت دیتا ہے جو توحید، رسالت اور یومِ آخرت پر یقین رکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآنِ پاک میں دی ہوئی آیات کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ تزکیۂ نفس، ضبطِ نفس، فضائل و رذائلِ اخلاق، وحدتِ انسانیت، وحدتِ دین اور قوم و وطن نیز رنگ و نسل کے امتیازات، فساد فی الارض، اصلاح ذات البین اور حسنِ معاشرت وغیرہ کے متعلق اسلام کی تعلیمات کیا ہیں؟ اور وہ کس طرح ایک انسان میں انابت الی اللہ پیدا کر کے اس کو دنیا کا بہترین شہری اور اعلیٰ انسان بنا دیتا ہے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جدید سائنس کی بنیاد قرونِ وسطیٰ کے مفکرین کی تحقیقات ہی پر مبنی ہے۔ بغداد و قرطبہ (اسپین) میں علوم و فنون کا جو دیپ انھوں نے جلایا تھا اور تحقیقات و

تجربات کی جو مشعل روشن کی تھی اس کی روشنی مغرب کے ایوانوں تک پہنچ گئی جس کی تجلیوں سے مغرب کا "تاریک خطہ" بقعۂ نور بن گیا، پھر یہ حقیقت بھی ناقابلِ فراموش ہے کہ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی کیا وہ قرآن مجید کی حیرت انگیز دعوت فکر و نظر سے متاثر ہو کر ہی کیا۔ وہ مہندس نے سائنس داں ہو کر بھی خدائے پاک سے اپنا تعلق وابستہ رکھتے تھے، قرآنِ کریم دراصل سائنسی تحقیقات کے ذریعہ اپنے پیش کردہ عقائد و تعلیمات کی حقانیت ثابت کرنا چاہتا ہے اسی بنا پر وہ نظامِ کائنات میں غور و فکر کرنے کی پُرزور تاکید کرتا ہے اور مظاہرِ فطرت سے عبرت و بصیرت حاصل نہ کرنے والوں کو بہائم اور چوپایوں سے تشبیہ دیتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہمارا یہ زمانہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا عہد ہے ان کی غیر معمولی ترقی نے عالمِ آب و گل کو طلسم کدۂ ایجادات و اختراعات بنا دیا اور انسان نے جب سے نوامیسِ فطرت پر قابو پالیا ہے، علم و فن، شعر و ادب، صنعت و حرفت، تہذیب و تمدن، اور معیشت و معاشرت غرض کہ ہر وہ چیز جس سے انسان کی حیات مادّی و جسمانی کا تعلق ہے اس میں عہدِ جدید نے وہ ترقی کی ہے کہ آج دنیا چشم کو ہر رنگ میں وا ہو جانے کی دعوت سراپا بن کر رہ گئی ہے لیکن اس ترقی کا سب سے زیادہ افسوس ناک اور تشویش انگیز پہلو یہ ہے کہ انسان قلب و روح کے سکون و اطمینان کی نعمت و دولت سے محروم ہو گیا ہے کیوں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی غیر معمولی پیش رفت نے ایک طرف انسان کے ہاتھ میں وہ محشر انگیز اسلحہ بھی دے دیئے ہیں جو کروڑوں انسانوں کی آبادی کو چشم زدن میں خاک سیاہ کر سکتے ہیں اور دوسری جانب اس نے اقوامِ عالم میں باہم رقیبانہ کشمکش، ہوسِ اقتدار و تغلب، خود غرضی، مطلب پرستی، ظلم و عدوان اور استحصال بالجبر کے جذبات کو برافروختہ کر کے انسان کو زندگی کے اقدارِ عالیہ سے بہت دور کر دیا ہے۔ ان دونوں چیزوں کا مجموعی اثر یہ ہے کہ ایٹمی جنگ کا خطرہ ہر وقت انسان کے دل و دماغ پر مسلط ہے اور اس کے باعث امن و سکون ایک جنسِ نایاب بن کر رہ گئے ہیں۔

اس صورتِ حال پر جو مفکرینِ عالم برابر غور کر رہے ہیں ان میں ایک جماعت اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے بجا طور پر یہ محسوس کیا کہ دنیا میں امن و سکون نہ سیاسی اور فوجی توازن برقرار رکھنے سے

حاصل ہو سکتا ہے اور نہ عدل و انصاف اور مساوات حقوق انسانی کا وعظ کہنے سے بلکہ اگر وہ قائم ہو سکتا ہے تو صرف مذاہب عالم کی متفقہ جدوجہد سے اس لئے کہ آج سیاست، معاشیات اور سماجیات پر قبضہ ان لوگوں کا ہے جو ارباب مذہب کی صف میں شامل نہیں ہیں۔ اس بنا پر بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن کے دل و دماغ کو بدلا جائے اور اُن کی اصلاح کی جائے اور یہ کام سوائے مذہب کے اور کوئی طاقت نہیں کر سکتی کیوں کہ مذہب انسان کو ایک عقیدہ دیتا ہے اور اُس کے ذریعہ زندگی کے اقدارِ عالیہ سے اُس کے دل و دماغ کو معمور کر دیتا ہے اور وہ عقیدہ ہے عقیدۂ توحید و رسالت پر ایمان اور یوم آخرت کو برحق سمجھنا، اس کے برخلاف آج ذہنیت یہ ہے کہ مادّہ اس کے مظاہر کا کوئی خالق و صانع اور ناظم و مدبر موجود نہیں ہے بلکہ پورا سلسلہ تخلیق بغیر کسی مقصد و غایت کے محض بخت و اتفاق کے تحت وجود میں آگیا ہے اور اس کا سارا نظام خود بخود اور آپ سے آپ رواں دواں ہے جس کا نہ کوئی خاص نتیجہ برآمد ہوگا نہ انجام۔

اس عقیدہ پر سورہ جاثیہ میں قرآنی تبصرہ یہ کہہ کر پیش کیا گیا وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ "یعنی ان مادہ پرستوں کا کہنا یہ ہے کہ اس دنیاوی زندگی کے علاوہ اور کوئی زندگی نہیں، ہم یہیں مرتے اور جیتے ہیں۔ ہمیں صرف زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے" بالفاظ دیگر جو کچھ ہے وہ سب زمانہ کے تغیرات ہیں نہ کوئی خدا ہے اور نہ کوئی خالق و مربی۔ آگے بتایا گیا کہ "در اصل ان مادہ پرستوں کو حقیقت کا صحیح علم نہیں ہے یہ تو محض ان کی قیاس آرائیاں ہیں" بلاشبہ الحاد و دہریت کا یہ عقیدہ زمانۂ قدیم سے خال خال طور پر پایا گیا ہے لیکن آج اس سائنٹفک دور میں وہ جس عالم گیر شکل میں نظر آ رہا ہے اس کی مثال کسی دوسرے دور میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج سائنس کی ہر نئی ایجاد سے تعمیر سے زائد تخریب کا کام لیا جا رہا ہے۔

موجوداتِ عالم میں ہر شے انسان کے لئے ایک بیش بہا نعمت ہے گو خامیٔ عقل کی وجہ سے کہ انسان اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے تو یہ دوسری بات ہے اور وہ خود بلاشبہ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ کے لحاظ سے بہترین مخلوق ہے لیکن عقل کو جذبات پر فتح مند بنانے کے آلہ

جب محسوس ہوجاتا ہے تو دَکذُ نا مھنوا آسفلَ سَافلِینَ کی حدود پر پہنچ کر دم لیتا ہے افسوس
ہے کہ سائنس اپنی تمام تر ترقیات کے باوجود عقل کو جذبات پر فہمند بنانے کے لئے اب تک کوئی
آلہ ایجاد نہیں کر سکی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آئے دن فطرتِ انسانی کو چیلنج دینے والے بے شمار مسائل
پیدا ہوتے رہتے ہیں اور زندگی میں رفتہ رفتہ ایسے جراثیم سرایت کرتے جا رہے ہیں جن کی وجہ سے
موجودہ سائنسی تہذیب بوسیدہ ہوتی جا رہی ہے اور تمدن خود تمدن کا دشمن بن رہا ہے اس لئے کہ
سائنس سے تعمیری کام کی بجائے تخریبی کام لیا جا رہا ہے۔

اس صورتِ حال کو ظاہر بیں اور سطحی نظریں اگرچہ محسوس نہ کریں لیکن حقیقت بیں نظروں سے
یہ پوشیدہ نہیں ہے اور وہ اس سے سخت مضطرب اور انجام سے نہایت خائف ہیں۔ یہ صورت
حال ناقابلِ برداشت ہے اور آج آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھی ہوئی انسانیت اپنے تحفظ و بچاؤ کی فکر میں ہے
اور ایسی رہنمائی کی طلب گار ہے جو جذبات کی سرمستیوں اور شعلہ باریوں کو روک سکے نیز عقل کو
قلب کی تربیت گاہ میں لے جا کر عمومی محبت و مروت کی چاشنی اس کو عطا کر سکے آج لوگ یہ سوچنے
پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اس قسم کی رہنمائی مذہب کے دامن میں پناہ لینے ہی سے میسر آسکتی ہے لیکن زندگی
میں مذہب کی ضرورت سے انکار انسانی معاشرے کے اُن رجحانات کی منطقی منزل ہے جو مادی ترقی
کے لئے سائنس کو اساس ماننے سے پیدا ہوتے ہیں۔ جو لوگ انکارِ توحید و رسالت نیز معاد کی اساس
پر زندگی کی تعمیر کرتے ہیں اور سطح بینی کی وجہ سے کہتے ہیں کہ ہمارا کوئی خالق و مالک نہیں اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج
نئی تہذیب خاردار پودوں کی طرح زمین پر پھیل چکی ہے، خدا بے زار فلسفوں اور نظریات کے کڑوے
کسیلے پھل اپنا اثر دکھا رہے ہیں اب ان کا زہر تلخیِ کام و دہن کے مرحلے سے گذر کر رگ و پے میں
سرایت کر چکا ہے اور انسانی اعصاب پر تشنج کے شدید دورے پڑنے لگے ہیں، انگلینڈ کے ایک رسالہ
دی پلین ٹرتھ (The Plain Truth) کی دسمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں آر۔ ای میسکنیر
(R. E. Mecneir) کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "تاریخ عالم
انسانی میں کبھی نوجوان نسل اتنی بڑی تعداد میں کاہلی، بے چینی، مایوسی اور بغاوت کے جذبات کا شکار

نہیں ہوئی تھی جیسا کہ آج دیکھا جارہا ہے۔ آج کی مادہ پرست سائنسی نسل کو نہ تو اس بات کا ہوش ہے کہ وہ کس چیز کے خلاف بغاوت کررہی ہے اور نہ وہ یہ جانتی ہے کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے" مقالہ نگار نے خصوصاً ہپیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ وہ دنیا کی ہر چیز کے مخالف ہیں، ہر شے سے ناراض ہیں، ہر اصول سے برگشتہ ہیں، ہر اخلاق سے منحرف ہیں اور ہر قانون سے بغاوت پر آمادہ ہیں، وہ خاندان سے دولت سے، سماجی نظام سے غرض ہر چیز سے مایوس بھی ہیں اور بیزار بھی" مقالہ نگار نے مزید لکھا ہے کہ اس رویہ کے لئے صرف نوجوانوں ہی کو ملزم قرار دینا صحیح نہیں ہے جب کہ بڑوں کا نمونہ بھی ایسا ہی کچھ ہے۔ یہی آوارگی، یہی بداخلاقی، یہی لاقانونیت، یہی جنسی ہوس رانی پورے سماج میں رچی بسی ہوئی ہو تو پھر نوجوانوں کو کیا کہا جاسکتا ہے۔ ۵ر جولائی ۱۹۶۹ء کو لندن کے ہائیڈ پارک میں ۵ لاکھ سے زائد ہپی لڑکے اور لڑکیوں کے اجتماع میں اور اسی طرح ۱۵ر اگست ۱۹۶۹ء کو نیویارک میں ۴ لاکھ سے زائد مجمع میں عریانی، فحاشی اور گندگی کو دیکھ کر امریکہ کا اخبار نیویارک ٹائمز پکار اُٹھا "آخر یہ کس طرح کی تہذیب ہے جو وجود میں آرہی ہے" لندن کے اخبار چیخ اُٹھے ہیں کہ "سوسائٹی کا کارواں کس غلط راہ پر چل پڑا ہے" لیکن آج کون ہے جو بڑھ کر سائنس کے غلط نظریات پر مبنی تہذیب جدید کے پرستاروں کو بتلائے کہ "تم نے اپنے خالق و مالک کے بتلائے ہوئے راستہ کو چھوڑ کر جن پُرفریب راہوں کو اختیار کیا تھا تو تمہارا اس منزل پر پہنچنا ناگزیر تھا" آزاد جنسی اختلاط، اخلاقی قدروں سے بغاوت اور خدا بیزاری کے جذبہ سے معمور معاشرہ کا انجام اور کیا ہوسکتا ہے؟ آج سائنس کی ترقی کے اس دور میں انسان اگر قلبی سکون وراحت سے محروم ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے! بڑھتی ہوئی فکری و ذہنی آوارگی نے دلوں کے سکون واطمینان کو ختم کردیا ہے تو پھر اس کی شکایت کیا!

گذارش

یاددہانی کے خطوط برابر ارسال ہورہے ہیں امید ہے جناب توجہ مبذول فرماکر ممنون فرمائیں گے۔

مینجر

دراوڑی دور میں تہذیب و ثقافت

اور

صنعت و تجارت کا تدریجی ارتقاء

(۳)

از جناب سید امین الدین صاحب جلالی شاہجہانپوری

صنعت پارچہ بافی ذہن ہندی کے ذوق صنعت و تجارت کی بنا پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ صنعت اور ہندوستان ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں اور اس کی تاریخ اتنی قدیم ہے جتنی خود باشندگان ہند کی جس میں بنیادی اولیت پارچہ بافی کو حاصل ہے۔ بقول مصنّف "عہدِ قدیم مشرق و مغرب" دنیا ابھی تن پوشی سے بھی واقف نہ ہوئی تھی۔ کہ یہاں عمدہ قسم کا کپڑا تیار ہوتا تھا اور اس اوّلیت کی وجہ کپاس کی اولین کاشت قرار دی گئی ہے۔ اس کی کاشت کے لئے ہند اور جنوبی ہند کی کالی مٹی والے

علاقہ اسی عہد سے مشہور چلے آرہے ہیں لیکن سندھی کپاس کو اس وقت بین الاقوامی شہرت حاصل تھی۔ سندھی پارچہ باف اس کے باریک ریشوں سے اعلیٰ قسم کا باریک سوت کات کر نہ صرف ملک کی ملبوساتی ضرورت کی تکمیل کرتے تھے بلکہ برآمد بھی کرتے تھے[1]۔ رگ وید میں جو مسیح سے تقریباً پندرہ سو سال پہلے مرتب ہوا تھا کپاس کا ذکر موجود ہے۔ جودڑا اور ڑی عہد میں اس کی کاشت اور ترقی کا بین ثبوت ہے۔ علاوہ ازیں کپڑوں کے اُن ٹکڑوں سے جو چاندی کے سکوں پر لپٹے ہوئے پائے گئے ہیں، پتہ چلتا ہے کہ اب سے پانچ ہزار سال پہلے موہنجوداڑو کے علاقہ میں نہ صرف کپاس کی کاشت ہوتی تھی بلکہ اس کے ریشوں سے اعلیٰ قسم کے پارچہ جات بھی تیار کئے جاتے تھے۔ جو عرب حلقوں میں ثوب ہندی کے نام سے موسوم تھے[2]۔ ایک اور قسم کا کپڑا بھی عربوں کے ذوقِ طبع کی مناسبت سے تیار کیا جاتا تھا جو سندھ، مسند یا مند کے نام سے عربوں میں مشہور تھا[3]۔ سوتی اور اونی دھاگا بھی تیار کیا جاتا تھا حتیٰ کہ کپڑا بُننے کے کارخانے امداد باہمی کے اصول پر قائم تھے[4]۔

قدیم پیرو دین مقبروں اور جنوبی امریکہ کی چٹانی تہذیب کے عہد میں پائی جانے والی کپاس کی بنی ہوئی چیزوں سے کچھ لوگوں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ٹلاوڑی تہذیب کے عروج کے لگ بھگ جنوبی امریکہ میں کپاس کی کاشت ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں قدیم مغربی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تاتار کے علاقوں میں ایسے درخت پائے جاتے تھے جن کے پکے پھلوں کے نرم و سفید ریشے کپڑا تیار کرنے کے کام آتے تھے۔ لیکن اس خیال کی بنیاد صرف ظن و تخمین پر مبنی ہے۔ بعض کے نزدیک مصری کپاس کو اولیت حاصل ہے لیکن یہ خیال بھی صحتِ فکر پر مبنی نہیں کیونکہ جس وقت سندھی کپاس کے ریشوں سے اعلیٰ قسم کا کپڑا تیار ہوتا تھا۔ اہل مصر اس وقت سن کے ریشوں سے کپڑا تیار کرتے تھے[5]۔ مصر میں اس کے زمانۂ کاشت کا تعین اگرچہ وثوق کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ مسلّمہ ہے کہ ایکھ کے بیج کی طرح، اعلیٰ قسم کی کپاس کا بیج اور اس کا طریقۂ کاشت بھی یہیں سے مصر پہنچا۔

---

[1] مجلہ نیا دور لکھنو۔ [2] ثقافت الہند۔ [3] عرب و ہند کے تعلقات۔ [4] انگریزی ماہنامہ اسکول سائنس۔ [5] عہدِ قدیم مشرق و مغرب

بہ روایت مختلفہ تین یا چار ہزار قبل مسیح اہلِ مصر نے فنیقی عربوں کے تجارتی توسل سے سندھی کپاس کا بیج حاصل کیا تھا اور اس حصول کو مصر و ہند کے مابین تجارتی تعلقات کی بنیادی ابتدا بھی کہا جاتا ہے۔ سرزمین فراعنہ اسکی کاشت کے لئے بہت ہی موزوں ثابت ہوئی۔ اس لئے سندھی کپاس کا بیج اپنے اصل مرکز سے بھی پیداواری اور خوبی کے لحاظ سے بہتر ثابت ہوا۔ کچھ مورخین نے مصر و سوڈان میں سندھی کپاس کی پہنچ اور کاشت کا زمانہ پہلی صدی عیسوی بتایا ہے جو کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ غالباً انہوں نے زمانۂ کاشت اور زمانۂ ترقی میں فرق محسوس نہ کرتے ہوئے عہدِ ترقی کو زمانۂ کاشت تصور کر لیا۔ اہلِ بابل نے بھی باوصف اپنی تمام تر ملکی ترقیوں کے کپاس کا بیج اور صحیح طریقۂ کاشت بجائے مصر کے سندھ ہی سے معلوم کیا تھا اور سندھی ساخت کا کپڑا بھی بری اور بحری راستوں سے بابل پہونچا کرتا تھا[۱]۔ "ہند کی پولیٹیکل اکانومی" اور "ہندوستان کی قدیم صنعت و تجارت" کے مصنفین نے پروفیسر ویبر کا ایک بیان نقل کیا ہے جس میں موصوف نے تین ہزار قبل مسیح بابل اور ہند کے درمیان تجارتی سلسلے کے قیام کو متعدد مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے۔ سندھی کپاس اور اس کے باریک دھاگے کی قدر و قیمت کا اندازہ مصر کے ایک قدیم بادشاہ راماسس RAMESESS کی ان دو خاص خلعتوں کے دینے سے لگایا جاتا ہے جو خاص سندھی روئی کے دھاگے سے تیار کر کے کسی خاص مقرب بارگاہ کو صلۂ خاص میں دی گئی تھیں[۲]۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے سابق جسٹس دھون نے الہ آباد یونیورسٹی کامرس ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسے میں "آریوں سے پہلے ہند کی بحری تجارت" کے عنوان سے ۱۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو تقریر کرتے ہوئے متعدد مستند حوالوں سے خصوصاً کوٹلیہ کی ارتھ شاستر کے حوالے سے ثابت کیا تھا کہ دراوڑی دور میں ہند کے باریک کپڑوں نے شہرت خاص حاصل کر لی تھی۔ کاشی کم (بنگال)، مدورام (مدراس) لوتھل (سوراشٹر) اور بعض دیگر مقامات کی صنعت پارچہ بافی نقطۂ عروج پر تھی اور مشرق و مغرب کے عوام ہی نہیں امراء اور اکابر بھی یہاں کے باریک اور نفیس کپڑوں کے بڑے قدردان تھے۔ لوتھل اس زمانہ میں نہ صرف دراوڑی تہذیب کا مرکز تھا بلکہ ہند کی بحری تجارت کا مخصوص بندرگاہ بھی تھا۔ جہاں سے خلیج فارس اور عرب اور افریقہ تک تجارت کے بحری قافلوں کی آمد و رفت جاری تھی اور ہر قسم کا خام و پختہ

---

[۱] عہدِ قدیم مشرق و مغرب [۲] ثقافت الہند

سامان برآمد ہوتا تھا" جسٹس موصوف کی رائے میں اہلِ فنیقیہ کے ممکنہ استثنا کے سوا ہندی تاجروں کی تاجرانہ قدامت کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ڈراوڑی تجارت کے اخلاقی ضابطوں کے ذکر میں جسٹس موصوف نے بتایا کہ ضروری اشیاء کی مناسب قیمتوں کو برقرار رکھنے کا کام سرکار کے سپرد تھا۔ کوٹلیہ نے ارتھ شاستر میں غالباً ڈراوڑوں کے اس تجارتی ضابطے سے متاثر ہوکر عوامی مفاد کے لئے اشیاء خاص کی سرکاری خریداری کا اصول وضع کیا تھا۔ یعنی سرکار کو بازار سے خریداری اس وقت کرنی چاہیے جب کوئی چیز ارزاں اور کافی مل رہی ہو تاکہ گرانی کے مواقع پر سرکاری ذخیرہ بازار میں لاکر قیمتوں کو مناسب سطح پر لایا جاسکے۔ موصوف کے اس بیان سے ہٹ کر مرکزی محکمۂ آثارِ قدیمہ کی حالیہ کھدائیوں کے نتیجہ میں نربدا اور تاپتی کی وادیوں میں ڈراوڑی عہد کی صنعت کاریوں کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان سے بھی اس دور کی صنعتی پیش روی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ موجودہ بھڑوچ، یہاں کی جملہ خام و مصنوعہ سامان کی برآمد کا مشہور ترین بندرگاہ تھا۔ اور انہی وادیوں کے درمیانی حصہ کو لوتھل کا علاقہ کہا جاتا تھا جس کی صنعتی ترقی کی شہرت وادیٔ سندھ سے زائد تھی۔ اعلیٰ قسم کے کپاس پیدا کرنے کی شہرت اگرچہ وادیٔ سندھ کو حاصل رہی ہے لیکن باریک ترین کپڑوں خصوصاً ململوں کے اعتبار سے کاشی کم (بنگال)، کو جو شہرتِ دوام حاصل ہوئی وہ وادی کے حصہ میں آئی اور جنوبی ہند کو نصیب ہوئی۔ کاشی کم کی ساختہ ململوں کی نفاست اور قدر و قیمت کا اندازہ ڈھائی ہزار قبل مسیح کے فراعنۂ مصر کی ان لاشوں سے لگایا جاسکتا ہے جو یہاں کی باریک ململوں میں لپٹی ہوئی پائی گئی ہیں[1]

فولاد و آہن | مختلف دھاتوں کو بھٹیوں میں صاف کرنے خام لوہے کو فولاد میں تبدیل کرنے اور آہنی اوزار سازی میں ڈراوڑوں نے اچھا نام پیدا کیا تھا۔ بقول پروفیسر ریس "یہ لوگ لوہا ڈھالنے کی صنعت اور اسپات بنانے کے فن سے بخوبی واقف تھے[2]۔ اہلِ قیاس کا اندازہ ہے کہ ہندی لوہا انسانی نقل مکانی کے ذریعہ سندھ کے راستہ ایران و عراق اور ساحلِ شام ہوتا ہوا مصر پہنچا تھا۔ اسی بنا پر بعض کے خیال میں مصر و ہند کا اولین تجارتی تعلق کپاس کے بجائے اسی کے ذریعہ قائم ہوا[3]۔

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات۔ [2] ہندوستان کی صنعت و تجارت۔ [3] عہد قدیم مشرق و مغرب

انسان نے دھاتوں کا استعمال کب شروع کیا۔ اس کے متعلق یقین وازعان سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اتنا یقینی ہے کہ جدید حجری دور کے خاتمہ پر ان کا استعمال شروع ہو گیا تھا۔ فلسطین کی کھدائیوں سے ایسے اوزار دستیاب ہوئے ہیں جن سے اہلِ قیاس نے یہ رائے قائم کی ہے کہ لوہے کا استعمال سب سے پہلے آشوری قبائل میں شروع ہوا چونکہ ان قبائل نے آہنی ہتھیاروں کی مدد سے دشمنوں کو مغلوب کیا تھا اس بنا پر اس خیال کو مزید تقویت پہونچی۔ بابلی تہذیب کے زوال پر ایشیا کوچک میں حطیوں کی ایک چھوٹی سی حکومت قائم ہو گئی تھی جس کے تہذیبی آثار میں لوہے کے اوزاروں کا استعمال سب سے پہلے بتایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک افریقہ میں روڈھیشیا کے علاقہ میں اس کا استعمال سب سے پہلے شروع ہوا اور بعض مورخین نے اس سلسلہ میں مصر کو اولیت کا درجہ عطا کیا ہے اور بعض نے فلسطین اور ایشیا کوچک کے سر اس کی دستیابی کا سہرا باندھا ہے۔ اگر مصر کو اولیت حاصل ہوتی تو اہراموں میں جن کی تعمیر کا سلسلہ دھات کے وسطی دور سے شروع ہو چکا تھا۔ کسی نہ کسی طرح یہ ضرور مستعمل ہوتا جب کہ اسی دور کے تمام اہرام سنگ وخشت کے بنے ہوئے ہیں۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مصر میں لوہے کا استعمال دھات کے بالکل آخری دور میں شروع ہوا۔ لوہے کی اولین دریافت کے متعلق حالیہ تحقیق و تلاش کا خلاصہ یہ ہے کہ

> "حجری دور کے باشندوں کو تجربہ سے جب یہ معلوم ہوا کہ پتھر اور ہڈی کے اوزار ضرب خفیف سے شکست و ریخت ہو جاتے ہیں تو ایسی دھات کی تلاش شروع ہوئی جو ان دقتوں اور خرابیوں کو دور کر سکے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ اس لئے تلاش و جستجو کے آخری سلسلہ میں وہ مفید مطلب چیز مل گئی جس کا نام لوہا ہے۔ اور جس کو آج کی صنعتی دنیا میں سونے سے زیادہ اہمیت حاصل ہے"۔

دنیا اس تاریخی حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ حجریاتی دور کے خاتمہ پر جنوبی ہند میں لوہے کا استعمال شروع ہو گیا تھا۔ جب کہ شمالی ہند کے باشندے ابھی تانبے ہی کا استعمال کر رہے تھے۔ اس سے دو باتیں صاف طور پر نظروں کے سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ اہلِ ہند کو لوہے کے استعمال میں صرف اولیت ہی کا درجہ حاصل نہیں بلکہ لوہے کی دریافت کا سہرا بھی جنوبی ہند کے قدیم ترین باشندوں یعنی دراوڑوں

کی تلاش وجستجو کے سر ہے۔ کیوں کہ یہاں اس کی درآمد کہیں سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ ابتدائی برآمد ہی کا پتہ چلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جنوبی ہند سے شمالی ہند میں اس کی رسائی ہوئی اور یہاں سے دوسرے ملکوں میں برآمد ہونے لگا، حجریاتی دور کے اختتام تک وادیٔ سندھ کا تمام علاقہ اگرچہ مکمل طور پر آباد ہوچکا تھا لیکن انسان کی نقل کا سلسلہ ہنوز جاری تھا اس سے اہلِ قیاس نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ اس سلسلہ کی معرفت سندھ کے راستہ ایران پہونچا، اور وہاں سے عراق ہوتا ہوا، آشوری قبائل (ساحل شام) کی زمین پر پہونچا اور وہاں سے مصر کا راستہ اختیار کیا اور مصر سے نکل کر افریقہ کے دوسرے علاقوں تک جا پہونچا۔ تورات کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح سے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل عرب تاجر بہت سی چیزوں کے ساتھ ہندی فولاد کی تلواریں مصر تک لے جاتے تھے[1]۔ قدیم ترین زمانے سے یمنی بندرگاہوں سے ہندی سامان کی درآمد کا سلسلہ جاری تھا۔ اس تمام علاقہ میں قوم سبا کے علاوہ حمیری اور عاد قوم کے قبائل موجود تھے۔ ان کا ہند سے تجارتی تعلق کسی نہ کسی نوع سے قائم تھا خصوصاً قوم سبا اس سلسلہ میں کچھ آگے تھی۔ اس تجارت پیشہ قوم کے ذریعہ ہندی سامانِ تجارت سرزمین عرب کے علاوہ مصر اور افریقہ کے دوسرے علاقوں تک پہنچا کرتا تھا حضرت یوسفؑ کو کنوئیں سے نکالنے والا قافلہ جس کے بخورات کے علاوہ ہندی فولاد کی تلواریں بھی تھیں۔ یمن میں بسنے والی قوم سبا سے تعلق رکھتی تھی۔ اسکے علاوہ اور بھی دسوں تجارتی قبائل ہند کا درآمد شدہ مال مصر کے اندرونی علاقوں تک پہنچایا کرتے ہیں[2]۔

تاریخی اوراق گواہ ہیں کہ مصر میں معدنیات کی کمی رہی ہے۔ اسی وجہ سے معدنی اشیاء کی تلاش وجستجو میں اہلِ مصر کو دور دراز علاقوں کا سفر کرنا پڑا ہے اور زبان تاریخ کے بموجب لوہا تمام تر ایشیا (عراق وہندوستان) سے مذکورہ راستوں کے ذریعہ پہنچا کرتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ آشوری قبائل اور ایشیا کو چک میں حطیوں نے اپنے دشمنوں پر آہنی ہتھیاروں کی مدد سے فتح پائی تھی لیکن اِن دونوں حکومتوں کی بنیاد حضرت مسیح سے تقریباً ایک ہزار سال قبل پڑی تھی۔ جبکہ ہندی لوہا اور فولاد ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے آہنی ہتھیار اس سے بہت پہلے ان ملکوں میں پہونچ چکے تھے اسی بنا پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہندی ساخت کے ہی ہتھیار تھے۔ جو ان دونوں ملکوں میں استعمال کئے

---

[1] عرب وہند کے تعلقات۔ [2] قصص القرآن

گئے[1]۔ اور اگر فلسطین میں ہتھیار سازی کی کوئی اجتماعی صورت ہوتی تو حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں اسرائیلی تاجر جنوبی ہند کے ساحلی علاقہ کیرالا سے ہندی تلواریں یمنی اور فلسطینی علاقوں تک نہ لے جاتے۔ لوہے کی دریافت کے سلسلہ میں جس طرح اہلِ ہند کو اولیت کا شرف حاصل ہے اسی طرح مختلف دھاتوں کو بھٹیوں میں صاف کرنے اور خام لوہے کو فولاد میں تبدیل کرنے اور اوزار و ہتھیار بنانے میں بھی ڈراوڑوں نے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ بقول پروفیسر ولسن "یہ قوم لوہا ڈھالنے کی صنعت اور اسپات بنانے کے فن سے بخوبی واقف تھی اور پروفیسر ڈی بیتھرکے بیان سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہند کے یہ قدیم ترین باشندے لوہا صاف کرنے اور اس کو فولاد میں تبدیل کرنے سے اچھی طرح واقف تھے اور جراحی وغیرہ کے نازک ترین اوزار بنانے میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔

آلاتِ جراحی جراحی آلات کی صنعت بھی ڈراوڑی دور میں اچھی حالت میں تھی۔ جدید تحقیق و تلاش کے نتیجہ میں تین ہزار قبل مسیح ہند میں آلاتِ جراحی کے استعمال کا پختہ ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ اگست ۱۹۶۲ء کو کولمبو میں آنجہانی پنڈت نہرو کے ہاتھوں آیورویدک ریسرچ سینٹر کا جو افتتاح ہوا تھا۔ اس میں بمبئی سے قدیم آلاتِ جراحی کے جو نمونے ہند کے مشہور وید پنڈت شیو شرما کے ذریعہ بھیجے گئے تھے۔ وہ قدیم آیورویدک لٹریچر کے بتائے ہوئے طریقوں کے عین مطابق تھے۔ پنڈت شرما نے ان آلاتِ جراحی کی تشریح کرتے ہوئے ڈراوڑی دور کے بیدوں کو سرجری کے فن میں باکمال بتایا تھا۔ اور اس سلسلہ میں ان کو خراجِ تحسین بھی پیش کیا تھا۔ آلاتِ جراحی کی اس نمائش کے موقع پر چین جاپان، برما، سعودی عربیہ اور مشرقِ وسطیٰ کے بعض دوسرے ممالک نے بھی ان آلات کو بھیجا تھا جو کسی نہ کسی طرح عہدِ قدیم میں ان ممالک میں پہنچے تھے۔

ظروف و زیورات ڈراوڑوں میں چونکہ بلا امتیاز مرد و زن زیور پہننے کا عام رواج تھا اور اس رواجِ عام کی بنا پر ڈراوڑوں نے زیور سازی میں کمال پیدا کیا تھا۔ مصر و بابل اور سمیریہ کے علاقوں کی کھدائیوں کے درمیان اس دور کے زیورات کے جو نمونے ملے ہیں ان سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ڈراوڑی کاریگر زیور سازی میں مذکورہ علاقوں کی زیور سازی سے بہت آگے تھے۔ ساتھ ہی زیوراتی میناکاری کے فن سے بھی بخوبی واقف تھے[2]۔ ظروف سازی

[1] عہدِ قدیم مشرق و مغرب۔ [2] عہدِ قدیم مشرق و مغرب

کو معیاری درجہ حاصل تھا۔ چنانچہ جنوبی ہند کے ضلع ساگر کے موضع ایریان کی کھدائیوں کے نتیجہ میں ایسے ظروف وزیورات بھی دستیاب ہوئے ہیں جن سے تین ہزار قبل مسیح اس صنعت کی پیش روی کا پتہ چلتا ہے اور ایسے آثار بھی پائے گئے ہیں جن سے جنوبی ہند کے ایران سے براہ راست تجارتی رابطہ کے ساتھ ہندی ظروف وزیورات کے برآمد کی بھی تصدیق ہوتی ہے[1]۔ روسی علاقہ ازبکستان میں بھی ان ظروف وزیورات کے کچھ نمونے حال ہی میں دستیاب ہوئے ہیں۔ روسی ماہر آثار قدیمہ نے دسمبر ۱۹۶۳ء میں ہند کے سفیر مسٹر ٹی این کول کو تاشقند میں ان کی دستیابی کی تفصیل بتاتے ہوئے ان کی قدامت پانچ ہزار قبل مسیح بتائی ہے[2]۔ ظروف وزیورات اور دوسرے آرائشی سامان کی اجتماعی صنعتوں کے علاوہ گھریلو صنعتیں بھی کثرت سے قائم تھیں۔ تاجروں کی انجمنیں تیار شدہ مال خرید کر اسٹاک کر لیتی تھیں۔ اور ضرورت پڑنے پر ان کو دوسرے علاقوں میں فروخت کرتی تھیں[3]۔

جہاز سازی دراوڑوں کا ذوق جہاز سازی اور جہاز رانی پردۂ خفا سے نکل کر منظر عام پر آ رہا ہے کھدائیوں کے دوران کشتیوں کے کچھ ایسے نمونے دستیاب ہوئے ہیں جن سے دراوڑوں کا جہاز سازی اور جہاز رانی کے فن میں ماہر ہونے کا پختہ ثبوت ملتا ہے۔ جسٹس دھون نے الہ آباد یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ میں ایک بڑی گودی کی تصویر بھی حاضرین جلسہ کو دکھائی تھی جو حال میں لوتھل (سوراشٹر) کی کھدائیوں کے دوران برآمد ہوئی ہے۔ موصوف کے نزدیک جہاز سازی اور جہاز رانی کا ذوق اسی عہد سے اہل ہند کو ورثہ میں ملتا چلا آیا ہے جس کا سلسلہ اٹھارویں صدی عیسوی تک باقی رہا۔ اس خیال کی تصدیق پروفیسر ڈنکو کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ اہل ہند مسیح سے ہزاروں سال پہلے جہاز سازی اور جہاز رانی میں بڑے ماہر اور یکتائے روزگار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ دراوڑوں نے اپنی جہاز رانی کے ذریعہ اس

---

[1] روزنامہ الجمعیۃ دہلی و قومی آواز لکھنؤ [2] سوویت دیس۔ [3] عہد قدیم مشرق و مغرب

وقت کے تمدن آشنا ممالک سے بہت سے رشتے قائم کئے جن سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا اور خود اہلِ ہند کو بھی ڈراوڑوں کو صنعت و تجارت کا جو ذوق فطرت کی جانب سے ملا تھا وہ ان کی سیاسی مرکزیت کے خاتمہ کے بعد بھی کم نہ ہوا۔ بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہی نظر آتا ہے۔ اگرچہ ایرین کے غلبہ اور اقتدار کی وجہ سے شمالی اور مغربی ہند میں ان کا سیاسی اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ لیکن جنوبی ہند میں انہوں نے متعدد حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ جن کی تجارتی شہرت عرب حلقوں سے آگے بڑھ کر بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں تک پہنچ چکی تھی۔ ان کی مصنوعات کا بڑا حصہ آبی شاہراہوں سے بیرونِ ہند جایا کرتا تھا۔ پہلی صدی عیسوی کے بعد تک ان کے تجارتی جہاز ہند کا خام و مصنوعہ سامان خلیج فارس کے راستہ جزیرہ نما کے جنوبی ساحل تک لے جاتے تھے۔ اہلِ روم کو دکھنی ہندوستان کی آبدار تلواریں اور منقش ظروف و زیورات اور چھپے ہوئے ریشمین اور سوتی کپڑے بہت ہی پسند تھے۔ انہوں نے اس دور میں بحرِ قلزم کے راستے دکھنی ہندوستان سے تجارتی تعلقات بھی قائم کر رکھے تھے۔ جس کی تصدیق قیصر اغوطس اور قیصر ٹائرس کے اُن طلائی اور نقرئی سکوں سے ہوتی ہے جو دکھنی ہند کے مختلف حصوں میں پائے گئے ہیں۔ قدیم رومی مصنفین کی مختلف کتابوں سے پانڈیہ سلطنت کے ایک راجہ پنڈیون کے قیصر روم کو ہند کی مختلف مصنوعات کے تحائف بھیجنے کی تصدیق ہوتی ہے[1]

ریشم سازی | ریشم کے کیڑے پالنے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آج سے تقریباً تین ہزار سال قبل چینیوں نے ریشم کا کیڑا اور اسکی پرورش کا طریقہ معلوم کیا تھا۔ لیکن سنسکرت کے قدیم ترین گرنتھوں میں اس طرح کا ذکر پایا جاتا ہے جس سے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایرین سے پہلے یہ صنعت سرزمینِ ہند میں موجود تھی۔ ہند میں ریشم کے کیڑے پالنے کی صنعت سب سے پہلے دریائے برہمپترا اور دریائے گنگا کے درمیان واقع خطہ میں قائم ہوئی تھی۔ اس لئے یہ خیال کر لیا گیا کہ ابتداء میں یہ صنعت باہر سے لائی گئی حالانکہ خود چین میں یہ صنعت ہندوستان ہی سے پہنچی یعنی دریائے گنگا کی وادی سے یہ صنعت آہستہ آہستہ پچھم کی طرف بڑھی گئی۔ اور جنوب مشرقی ایشیا کے اکثر علاقوں میں پھیل کر چین خاص تک پہنچ گئی۔ ٥٥٥٥٥٥

---

[1] عہدِ قدیم مشرق و مغرب

ایک مشہور گم نام کی وفات

از حفیظ الرحمن العمری

عقل من پروانہ گشت وہم ندید　　　چوں تو شمع در ہزاراں انجمن

فارسی کا ایک مشہور مصرعہ ہے کہ جب قضا آتی ہے تو طبیب بے وقوف ہو جاتا ہے یہ تو ایک سچی حقیقت تھی جسے شاعر کا ادراک پا گیا مگر اسی سے ملتی جلتی ایک حقیقت اور ہے جو شاید شاعر کی نظروں سے اوجھل ہے وہ یہ کہ طبیب کی جب قضا آجاتی ہے تو سارا ہی عالم ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی وفات پر پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے ان الفاظ سے مقالہ شروع کیا تھا "کسی کے مرنے کی خبر سننے میں آتی تھی تو سوال فوراً زبان پر آتا تھا ڈاکٹر انصاری کو بھی دکھایا تھا"

مجاہدِ جلیل حکیم مولانا فضل الرحمن صاحب سواتی کی وفات پر مقالہ بھی انھیں الفاظ کا اعادہ چاہتا ہے۔ موصوف بڑے ماہر اور نبض شناس حکیم تھے صرف تشخیص سے وہ بات بتا دیتے جو بعد میں ایکسرے سے ظاہر ہوتی تھی۔ ملک کے مشاہیر اطبا سے آپ کو شرفِ تلمذ یا دوستانہ تعلقات حاصل تھے۔

حکیم صاحب کہنے کو تو حکیم صاحب ہی کہلاتے تھے حالانکہ آپ صرف مریضوں کے لئے حکیم تھے۔ معقولات سے شغف رکھنے والوں کے لئے آپ بہت بڑے منطقی اور متکلم تھے منطق و فلسفہ کی ایک ایک کتاب پانچ پانچ چھ چھ اساتذہ سے سبقاً سبقاً پڑھ کر اس کے مطالب و راختلافات ازبر کر چکے تھے اور حافظہ بھی ایسا کہ پتھر کی لکیر۔ بحث و مباحثہ میں بے تحاشہ کتابوں کے حوالے دیتے چلے جاتے عبارتیں

فرفر پڑھتے جاتے کبھی کوئی کتاب اٹھا کے دیکھنے کی زحمت نہ فرماتے چاہے بحث و تکرار تقریر میں ہو یا رسائل میں تحریری شکل میں۔ دار السلام عمر آباد میں آپ معقولات ہی کے استاذ تھے،

تاریخی کام کرنے والوں کے لئے آپ کی ذات ایک ماخذ و مرجع کی حیثیت رکھتی تھی آپ کا دماغ تاریخی معلومات کا ایک خزانہ تھا۔ حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس کی ایک اہم کڑی آپ کی ذات سے ملتی تھی۔ سرگزشتِ مجاہدین اور سیرت سید احمد شہید کو مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے پچیس سال کے مطالعہ کے بعد تکمیل کو پہنچایا تھا۔ ملک کے کونے کونے سے مہر صاحب کو دادِ تحقیق دی جا رہی تھی۔ میری درخواست پر حکیم صاحب نے سیرت سید احمد شہید کا بالاستیعاب مطالعہ فرمایا۔ اور چھتیس ۳۶ صفحات پر مشتمل ایک تبصرہ میرے حوالے کر گئے جس میں مصنف کی غلط معلومات اور غلط فہمیوں کا ازالہ کرکے ان کی تصحیح کی گئی تھی۔ میں نے بڑے تأمل کے بعد اس کی ایک قسط مہر صاحب کو بھیج دی تو مہر صاحب تڑپ اٹھے۔ اور ذیل کا مکتوب میرے نام ارسال فرمایا۔

• برادرِ مکرم گرامی نامہ وسط فروری میں مل گیا تھا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ حکیم صاحب محترم کی تحریر بہ تفصیل پڑھ کر جواب لکھوں اس میں تاخیر ہوتی گئی۔ اور خود میری دوسری مشغولیتیں بھی حائل ہوئیں۔ قدرت کے کرشمے بھی عجیب ہیں خدا جانے میں نے سرحدِ آزاد کے مختلف حصوں میں کہاں کہاں کوہ پیمائی کی کہاں کہاں کی خاک چھانی، چملہ، بونیر، سوات، ضلع پشاور ضلع مردان، ضلع ہزارہ کے بیشتر مقامات دو دو تین تین مرتبہ دیکھے ایک ایک شخصیت کے حالات پوچھے۔ مگر حالات تو رہے ایک طرف بیشتر اصحاب ان شخصیتوں کے ناموں سے بھی آگاہ نہ تھے۔ حکیم صاحب محترم نے سرسری داستان سرائی میں اتنے حقائق بیان کردیے کہ جن کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ وہی مولانا روم والی بات ہوئی۔ ؏ یار در خانہ و من گردِ جہاں می گردم

مولوی عبدالحق آروی مصنف دُرِ مقال کے متعلق سید عبدالجبار شاہ نے بار ہا بتایا کہ وہ شافعیوں کی بستی میں مقیم ہوگئے تھے جس کا نام غالباً لواگئی تھا یا ناوہ گی تھا۔ بونیر سے کوہ کڑا کڑ کو عبور کرکے سوات کی جانب اتریں دامن کوہ سے ذرا بلندی پر یہ بستی بائیں ہاتھ ملتی ہے۔ میں نے خدا جانے کس ذوق و شوق سے اس بستی کو دیکھا تھا اب معلوم ہوا کہ مولوی صاحب الاڈنڈ میں فوت ہوگئے۔ تھا نہ میں نے دیکھا ہے الاڈنڈ نہیں دیکھا۔

بالکل اسی قسم کا واقعہ امام ابن تیمیہ کے سلسلہ میں پیش آیا ۔ میں دمشق گیا تو سیکڑوں اصحاب سے امام موصوف کی قبر کے متعلق پوچھا ۔ مختلف قبرستانوں میں پھرا ۔ ان کے نگہبانوں یا بعض قبروں کے مجاوروں سے پوچھا مگر کوئی کچھ بتا نہ سکا صوفیہ کے قبرستان کا پتہ بھی کہیں نہ ملا ۔ چونکہ میں زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتا تھا ۔ اس لئے میں بہت مایوس اور افسردہ لوٹا ۔ اب آپ کی بھیجی ہوئی کتاب سے یہ نکتہ حل ہوا ۔

حکیم صاحب محترم نے مولوی صاحب کے بیشتر حالات تحریر فرما دئے ۔ اور اپنے متعلق بھی بعض ایسی باتیں لکھ دیں جو کسی دوسرے سے معلوم نہیں ہو سکتی تھیں ۔ میری کتاب " سرگذشتِ مجاہدین " طبع ثانی کے لئے تیار ہو رہی ہے ۔ اس میں مولوی عبدالحق آروی کے وہ تمام حالات آجائیں گے جو حکیم صاحب محترم نے بیان کئے ہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ خود حکیم صاحب کے متعلق بھی ایک باب بڑھا دوں ۔ ایسے بے نفس ایثار پیشہ اور حقیقی مجاہد کہاں ملیں گے وہ دور ہی گذر چکا جس کی آغوش میں ایسی شخصیتیں پرورش پاتی تھیں ۔ حکیم صاحب محترم تو بہت ادیکھے ہیں ۔ انہیں پہچاننے والا کون ہوگا ؟

تاہم ایسی تصویریں کسی نہ کسی مرقع میں محفوظ ہونی چاہئیں ۔ شاید کبھی سازگار وقت آئے ۔ اور ایسی نگاہیں پھر پیدا ہو جائیں جو حقیقت شناسی کی میزان سے بہرہ مند ہوں ۔

" آپ نے مجھ پر جو احسان فرمایا خدا شاہد ہے کہ اس کا کوئی بدلہ دعا کے سوا میں نہیں دے سکتا ۔ مگر اسے اتمام پر پہنچائیے ۔ مسافر کو منزلِ مقصود پر پہنچائیے عرضِ راہ میں نہ چھوڑئیے ۔ اگر آمد و رفت میرے بس میں ہوتی اور وسائل بہ قدرِ ضرورت ساتھ دے سکتا تو ایک دن کا بھی توقف نہ کرتا ۔ اور وہاں پہنچ جاتا ۔ اب بے دست و پا ہوں تحریر مکمل کرائیے اور جلد بھجوا دیجئے ۔

حکیم صاحب محترم کی خدمت میں میرا سلام شوق پہنچا دیجئے ۔ مجھے ان کے ارشادات کا انتظار رہے گا ۔ سید احمد شہید کی اشاعت پر پانچواں سال گذر رہا ہے ۔ آپ یقین فرمائیں گے اس پوری مدت میں ایک صاحبِ نظر بھی نہ ملا جو کتاب کے بنیادی مطالب و مقاصد پر مجھے مفید مشورے دے سکتا ۔

حکیم صاحب محترم سے میں ایسے ہی مشوروں کا امیدوار ہوں ۔ نیز پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا " جماعت مجاہدین " اور " سرگذشتِ مجاہدین " ان کی دسترس میں ہیں ؟ انہیں بھی ایک نظر ملاحظہ فرمالیں اس لئے کہ پوری تحریک کے متعلق میری کاوشوں

کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکے گا ۔ اللہ تعالیٰ انہیں با صحت و عافیت رکھے ۔ عرض کیجئے کہ اپنی دعاؤں میں اس لڑکی کو بھی شامل رکھیں

والسلام ۔ مہر ۲۹ جنوری سنہ ۶۳ء

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بھی حکیم صاحب نے نمایاں کردار ادا کیا ۔ برسوں جیلوں میں رہے ۔ مصائب جھیلے، ترکِ وطن کر کے دو ایک بار افغانستان پہنچ گئے، مگر دماغ میں آزادیٔ وطن کے لئے جہاد کا جو لاوا سُلگ رہا تھا اُس نے چین سے بیٹھنے نہیں دیا ۔ پھر واپس آکے گرفتار ہوئے ۔ تین تین مرتبہ بنا بنایا ہزاروں کا مطب اجڑا مگر اس راہ کا ہر نقصان فتح و نصرت کا پرچم بن کر تصور میں لہرا رہا تھا ۔ ؏ درد میں لطف ہے ۔ ایذا میں مزا ۔ غم میں خوشی ۔

ہر میدان میں آپ کا کام انتہائی بے لوث اور بر بنائے اخلاص ہی ہوا کرتا تھا ۔ آپ نے ہر خدمتِ ملک و قوم کچھ دینے ہی کے لئے کی ۔ لینا آپ کی فطرت میں تھا ہی نہیں ۔ جنگِ آزادی کے دوران آپ کی ڈھارس بندھانے والی رفیقۂ حیات داغِ مفارقت دے گئیں ۔ جواں سال وحید لڑکے الطاف الرحمٰن نے سبھاش کی فوج میں سرگرمِ عمل رہ کر وطن کی راہ میں جامِ شہادت نوش کیا ۔ ملک جب آزاد ہوا تو بڑے مجاہدوں کی فہرست میں آپ کا بھی نام تھا ۔ ایک معقول جائداد آپ کے نام الاٹ ہوئی تو اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔

جنگِ آزادی کے مشاغل میں مطب سے آپ کا تعلق بالکل ہی ٹوٹ چکا تھا ۔ میدانِ کارزار سرد پڑنے کے بعد مطب کی طرف لوٹے تو وہ کسی طرح جم نہیں رہا تھا ۔ معاشی حالت پتلی ہوتی جا رہی تھی ۔ دوسری شادی کے بعد اولاد کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی ۔ احباب نے مشورہ دیا کہ پاکستان چلے جائیں جہاں ان کے خاندان کے بیشتر احباب خوشحال اور اربابِ اقتدار تھے ۔ خود آپ کے داماد پائندہ محمد خاں فوج کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے ۔ آپ کو بااصرار دعوت دے رہے تھے مگر سب کے جواب میں اس مردِ مخلص نے یہی کہا کہ ہم زندگی بھر پاکستان بننے کی مخالفت کرتے رہے اب پاکستان کس منہ سے جائیں گے ۔ مطب چلتا کیا تھا گھسیٹے لئے جا رہے تھے ۔ اور اس پر کچھ ایسے اصول اپنے اوپر عائد کئے ہوئے تھے کہ تنگی بڑھی آمدنی بھی کم سے کمتر ہونے لگی ۔ مسجد اور مدرسے کے کسی بھی ملازم سے چاہے اس کا علاج کیسا ہی اہم اور اس کی دوا کتنی ہی قیمتی ہو ایک پائی وصول نہیں کرتے تھے ۔ مدرسے کے ایک خوشحال استاد نے بتایا کہ حکیم صاحب نے کئی ماہ کے لئے قیمتی دوائیں انھیں دیں ۔ وہ جیب سے نوٹ نکالنے لگے تو حکیم صاحب نے منع کر دیا ۔ اور فرمایا کہ میں عہد کر چکا ہوں کہ مدرسہ اور مسجد کے ملازمین سے معاوضہ ہرگز وصول نہیں کروں گا ۔ ایک طرف سے اصرار دوسری طرف

سے انکار، اس تکرار کا تماشہ دیکھنے بچے گھر سے نکل آئے تو مولوی صاحب کو ایک ترکیب سوجھی، جھٹ سے نوٹ کر بچوں کو دیدیئے۔ اور کہا کہ میں عیدی دے رہا ہوں آپ مجھے اس سے نہیں روک سکتے۔ اور وہ عبد الفطر کا دو سرا یا تیسرا دن تھا۔ مولوی صاحب کا جملہ ختم ہونے بھی نہ پایا کہ حکیم صاحب ان سے لپٹ پڑے اور گلوگیر آواز میں کہنے لگے۔ واللہ تم رحمت کے فرشتے ہو۔ صبح سے گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

حکیم صاحب کی کتاب زندگی میں ایسے نادر روزگار ایک دو نہیں سیکڑوں واقعات ہیں چونکہ قارئین میں اکثر کے لئے موصوف اجنبی ہیں۔ اس لئے ان واقعات کی اہمیت ایک کہانی سے بڑھکر کیا ہو سکتی ہے۔

حکیم صاحب کا سترہ سالہ سرخ و سپید تندرست اور توانا بچہ عتیق الرحمٰن دوپہر کا کھانا کھاکر اسکول گیا۔ وہاں ایک حادثے میں اس کی موت ہوگئی۔ عصر کے قریب لاش گھر لائی گئی۔ بوڑھاپے کی اولاد کیسی عزیز ہوتی ہے مگر اس صبر و استقامت کی چٹان کی زبان سے جو الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ وہ سامعین کو دیوانہ کر دینے کے لئے کافی تھے۔ حکیم صاحب فرما رہے تھے۔ "اچھا ہوا مرگیا ذرا چوری کی عادت تھی اس میں"

مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ سے حکیم صاحب کو بڑی گہری عقیدت تھی۔ عقیدت تو بہتوں کو بہت ساروں سے ہوتی ہی ہے مگر اس درجہ کی عقیدت حکیم صاحب ہی کے حصہ میں آئی تھی۔ مولانا سے متعلق جس قدر باتیں آپ کو معلوم تھیں شاید ہی اس باب میں آپ کا حریف مل سکے۔ تفسیر ترجمان القرآن کے انتساب کے انکشاف فرماکر حکیم صاحب نے علمی دنیا کو چونکا دیا۔ مولانا آزاد کا نام عزت سے کوئی لیتا تو اسے حکیم صاحب اپنا عزیز ماننے لگتے۔ چاہے دوسرے امور میں کتنا ہی اختلاف ہو۔ مولانا آزاد کی شان میں کسی نے ذرا بھی توہین کی تو حکیم صاحب کا اس سے بڑا دشمن کوئی نہیں ہو سکتا ماہر القادری نے "پردہ اٹھنے کے بعد" لکھدیا تو حکیم صاحب کا غیظ و غضب دیکھنے کے قابل تھا۔ کئی دن گذر جانے کے بعد بھی بار بار یہی کہتے تھے کہ ایک ہی خواہش ہے کہ کراچی جاؤں اور ماہر القادری کا گلا گھونٹ دوں۔ حکیم صاحب مجاہد تھے جو کہتے وہی کرتے بھی تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ انہیں دنوں ۱۹۶۰ میں ماہر صاحب دار السلام عمرآباد تشریف لائے۔ حکیم صاحب کا مکان عمرآباد سے پانچ میل کے فاصلہ پر تھا۔ دار السلام کی ہر چھوٹی بڑی تقریب کے مہمانِ خصوصی حکیم صاحب ہی ہوا کرتے تھے۔ ارباب جامعہ نے عمداً حکیم صاحب کو ماہر صاحب کی تشریف آوری سے بے خبر رکھا۔ مبادا کوئی ناخوشگوار بات ہو جائے اور ادارے کے نام پر دھبہ لگ جائے۔ دار السلام میں آپ چند

سال استاذ رہے ۔ ان چند دنوں کے تعلق سے آپکو پورے عمرآباد ہی سے کہنا چاہیے جنون کی حد تک عشق ہو گیا تھا ۔ ہفتہ میں دو ایک بار عمرآباد کا چکر نہیں لگا لیتے تو چین نہیں آتا تھا ۔ ضعف بڑھا ، دماغی توازن بگڑا ، بینائی جواب دینے لگی ۔ ہر چیز ذہن سے نکل گئی ۔ احباب کی شناخت ناممکن ہو گئی ۔ مگر عمرآباد کی زیارت میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ بچے اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تو ان سے لڑ پڑتے ۔ بس میں جگہ نہیں ہوتی تو کنڈکٹر سے الجھ پڑتے ۔ یہ سب جھمیلے اٹھا کر اپنی تعلیمی پیاس بجھانے عمرآباد تشریف لاتے رہے ۔ دارالسلام کی ایک ایک درسگاہ سے رک رک کر گذرتے ۔ جی میں آیا کسی استاذ سے مصافحہ کر لیتے ۔ کسی کے پاس بیٹھ کر چائے پی لیتے ۔ پھر دوسری بس سے واپس ہو جاتے ۔ عمرآباد کے احباب گھر پر ملاقات کے لئے جاتے اپنا نام بتاتے ۔ حکیم صاحب پھر اجنبی بنے بیٹھے رہتے ۔ باتوں میں عمرآباد کا ذکر آجاتا تو چونک کر پوچھتے آپ عمرآباد سے تشریف لائے ہیں ؟ جواب اثبات میں سن کر جزاک اللہ جزاک اللہ فرما دیتے اور کبھی کھڑے ہو کر معانقہ بھی کر لیتے ۔ اگلے وقتوں کے لوگ بھی کیا خوب انسان تھے ۔ چاہتے تو لوٹ کر چاہتے ۔ نفرت کرتے تو ڈٹ کر کرتے نفاق ، تملق ، ریا اور نمود و نام کی کوئی چیز ان کی زندگیوں میں بھٹک کر بھی نہیں گذرتی تھی ۔ ان کا چہرہ دل کا آئینہ ہوتا اور زبان دل کی ترجمان ۔

لکیلا یعلم بعد علم شیا کی عملی تفسیر کرنے کیلئے بڑی طویل عمر مانگ کر لائے تھے ۔ شوال ۱۳۰۴ھ کی ولادت تھی ۱۳۹۵ھ ۷ محرم جمعہ کی شب میں گیارہ بجے انتقال ہوا ۔

زندگی تجربات سے بھرپور اور واقعات و حکایات سے لبریز تھی ۔ آئے خالی ہاتھ اور گئے بھی اسی طرح خالی ہاتھ ۔ لاکھوں کمائے اور کمائی کی کوئی نشانی بھی نہیں چھوڑ سکے ۔ زندگی بھر دھوپ چھاؤں دیکھتے رہے مگر دھوپ سے بچنے کے لئے ایک سائبان بھی اپنا نہیں بنا سکے

کس کی راہ میں سب کچھ لٹا دیا ہم نے
پہلا تو وہ بھی نہیں جو کفن کے کام آئے

سردی اور بارش کے موسم میں مسجد کی پہلی صف میں موذن کے داہنے ہاتھ کھڑی ہونیوالی شخصیت وفات سے کچھ روز قبل جماعت میں شریک ہونے سے محروم ہو گئی تو کیا ؟ اس کا دل تو مسجد ہی میں اٹکا رہتا تھا ۔ کسی بات کا ہوش نہیں رہتا لیکن اذان ہوتی تو جو آدمی ملتا اسے کھینچ لیتا تھا ۔ بیٹھے ہی بیٹھے نیت باندھ کر نماز شروع کر دیتے ۔ قرات میں جہری فرماتے تھے ۔ اکثر سورہ والفجر پڑھتے آہستہ آہستہ پڑھتے کوئی آیت چھوٹنے نہیں پاتی اور جب آخری آیت فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی پر پہنچتے تو آواز اتنی اونچی کر دیتے کہ گلی سے آدمی بخوبی سن لے ۔ گلی کے لوگ جب ان کی قرات سن کر ان کے جنتی ہونے کی بشارت دے سکتے ہیں تو پھر ان کی قرات سمیع و بصیر اور لطیف و خبیر کی بارگاہ میں کس مقام و مرتبہ کی مستحق ہو گی یہ ہمارے قیاس و گمان سے ماوراء ہے ۔ ع مرگ مجنوں پر عقل گم ہے میر کیا دیوانے نے موت پائی ہے ۔

۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔
تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید مع اضافہ و ترتیب)، جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبر، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب روس، ایران میں انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب و کوائف

۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹۔۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے، عرب و ہند
تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں، معارف الآثار۔
نیل سے فرات تک۔

۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم، تاریخ ردہ، سرکشی ضلع بجنور۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم۔ مرد عشق۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء حیات عبدالحی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج، خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، انتخاب الترغیب والترہیب۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

Regd. No. D. (D) 231 Phone 262815 FEBRUARY 197

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب
سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ -
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق و فلسفۂ اخلاق - فہم قرآن - تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" - صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال - تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ" -

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول - اسلام کا نظامِ حکومت - سرمایہ - تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت - مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ" - تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر -

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ" تدوینِ قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد -
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا -

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو ازسرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے - کتابتِ حدیث -

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت - قرآن اور تعمیرِ سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

برہان

جلد ۷۲ | ماہِ صفر المظفر ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۴ء | شمارہ ۳

نظرات

فروری کے برہان میں جو نظرات لکھے گئے تھے اُن کا مقصد یہ تھا کہ جہاں تک ڈاکٹر خورشید احمد فارق کے متعلقہ مضمون کی زبان اور اندازِ بیان کا تعلق ہے وہ بے شبہ قابلِ اعتراض ہے اور بعض بعض جگہ اوسکے ڈانڈے سوءِ ادب سے جا ملتے ہیں اس سلسلہ میں ایڈیٹر برہان کو ندامت کے ساتھ اپنے اس قصور کا اعتراف ہے۔ کہ مضمون نظرِ ثانی تو درکنار اسکے علم کے بغیر جوں کا توں شائع ہو گیا۔ لیکن جہاں تک مضمون میں درج واقعات کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں اختلافِ رائے ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کسی ایک واقعہ کو سطحی اور سرسری طور پر دیکھتا ہے اور اس بنا پر واقعہ کے مندرجات کو سیرت نبوی کی پاکیزگی کے خلاف تصور کر کے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں منقصت یا گستاخی قرار دیتا ہے۔ لیکن اسکے بالمقابل ایک اور شخص ہو سکتا ہے جس کے سامنے واقعہ کا پورا تاریخی پس منظر اور ماحول ہے۔ اور اس کو یہ معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ کا یہ عمل کن چیزوں پر مبنی ہے اس بنا پر اس کو یقین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ میں جو ایکشن لیا ہے وہ بالکل حق بجانب اور سرتا پا عدل و انصاف اور حقانیت پر مبنی ہے۔ اس بنا پر اس کے نزدیک یہ واقعہ سیرت نبوی کی پاکیزگی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہے بلکہ اس سے حضور کی دور اندیشی، تدبر اور معاملہ فہمی کا ثبوت ملتا ہے۔

قدیم مورخین سیرت مثلاً ابن سعد، ابن ہشام، واقدی، طبری اور ابن اثیر وغیرہم کے متعلق یہ کہدینا صحیح نہیں ہے کہ یہ سب ناقابلِ اعتبار و اعتماد ہیں کیونکہ سیرت کی روایات کا زیادہ تر دارو مدار انہیں حضرات پر ہے اور ہمارے علمائے کرام و مصنفین ان کی کتابوں کے سہارے سیرت نگاری کرتے رہے ہیں۔ ان حضرات کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے کسی واقعہ کو یہ جانتے ہوئے اپنی کتاب میں درج کیا ہو کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا کوئی پہلو مجروح ہوتا ہے۔

انہوں نے اگر اس قسم کا کوئی واقعہ درج کیا ہے تو یقیناً ان کے ذہن میں اس کی کوئی ایسی تاویل و توجیہہ موجود ہے جس کے باعث سیرت نبوی بالکل مجروح نہیں ہوتی۔ البتہ تحقیق و تنقید کا دروازہ کھلا ہوا ہے ایک محقق کو اس بات کا حق ہے کہ وہ ان مورخین کی کسی روایت کو دلائل و براہین کے ساتھ رد کردے اور اسے ناقابلِ قبول قرار دے۔ چنانچہ ہمارے ملک کے بلند پایہ سیرت نگار مورخوں، مصنفوں مثلاً مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری اور مولانا قاضی محمد سلیمان منصورپوری کا اپنی تصانیف میں یہی رویہ اور طریقہ رہا ہے۔ یہ حضرات قدیم مورخین سیرت کی روایات اپنے ہاں درج بھی کرتے ہیں۔ اور جو روایات ان کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہیں ان پر بحث و گفتگو کر کے انہیں رد بھی کردیتے ہیں۔

راقم الحروف نے فروری کے نظرات میں لکھا تھا کہ فارق صاحب کے مضمون کے ختم ہوجانے کے بعد اس کا ارادہ اس پورے مضمون پر تبصرہ لکھنے کا تھا۔ اس تبصرہ کا مقصد یہی تھا کہ فارق صاحب کے مضمون میں جو تشویش انگیز واقعات درج

میں ان کا تجزیہ و تحلیل کر کے یہ بتایا جائے کہ یہ واقعہ درست ہے کہ نہیں۔ اگر درست ہے تو اس کا تاریخی پس منظر اور ماحول کیا ہے۔؟ جس کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت مجروح نہیں ہوتی بلکہ اس کے برخلاف آپ کے کردار کی بلندی اور عزم و تدبر کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس مضمون پر ہنگامہ شروع ہو گیا اور اس تبصرہ کے لکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

بہرحال اس وقت جبکہ جذبات مشتعل ہیں علمی بحث و گفتگو کا کوئی موقعہ نہیں ہے اور میں بلا کسی شرط کے اپنی ندامت اور پشیمانی کا اظہار کرتا ہوں اور اپنے ان تمام بھائیوں سے معافی کا خواستگار ہوں جن کو اس سے دکھ پہنچا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی یہ بیزاری اسی جذبۂ عشق و محبت کی وجہ سے ہے جو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے۔ اور یقیناً یہ جذبہ ہر مسلمان کے لئے سرمایۂ افتخار ہے اب مضمون کی اشاعت روک دی گئی ہے فروری کی قسط اس کی آخری قسط سمجھنا چاہئے۔

اس شمارہ میں جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ کا ایک خط بھی شائع ہو رہا ہے۔ اس خط کی اشاعت کا مقصد اپنی طرف سے کوئی دفاع پیش کرنا نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ تنقید کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے جو لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا پر مبنی ہے۔

چنانچہ راقم الحروف مولانا کے اس خط کے جواب میں مولانا کا دلی شکریہ ادا کر چکا ہے۔ مولانا کا یہ مکتوب گرامی تنہا نہیں ہے۔ بلکہ اسی طرح کے سنجیدہ اور متوازن خطوط اور بھی متعدد ارباب علم کی طرف سے موصول ہوتے رہے ہیں۔ اور ان کے شکریہ کے ساتھ ان سب حضرات کو فرداً فرداً جواب لکھتا رہا ہے۔ اس شمارہ میں مولانا مفتی

عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی کا بھی ایک خط شائع ہو رہا ہے جس میں آپ کو مقالہ کی اشاعت کے سلسلہ میں صحیح صورت حال اور اس معاملہ میں ہم کارکنان ندوۃ المصنفین و برہان کے فکر کا اندازہ ہوگا۔

ایڈیٹر برہان ، ماہنامہ برہان اور ادارۂ ندوۃ المصنفین کے لئے کوئی بات اس سے بڑھکر شرم اور ندامت کا باعث نہیں ہو سکتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارک میں کسی قسم کی منقصت یا توہین کے معاملہ میں ان کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ملوث ہونا پایا جائے جیب کہ دنیا جانتی ہے اور ادارۂ ندوۃ المصنفین کی چھتیس ۳۶ سالہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ان اداروں کے قیام کا مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک اور اسلام کی سربلندی و عظمت کو نمایاں کرنا ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ جن بھائیوں نے جس جذبہ کے تحت احتجاج کیا ہے اسی جذبہ کے ماتحت قرآن و سنت کے احکام کے پیش نظر اس کوتاہی کو معاف فرمادیں گے۔

ایڈیٹر برہان کی علالت کی خبر فروری کے برہان میں دی جا چکی ہے اس خبر کو دیکھکر جن دوستوں نے عیادت اور پرسشِ احوال کے لئے خطوط بھیجے ہیں ایڈیٹر برہان ان سب کی محبت اور اخلاص کا تہہ دل سے شکر گذار ہے اور ساتھ ہی گذارش ہے کہ اب اگرچہ اللہ کے فضل و کرم سے صحت ہوگئی ہے لیکن اب بھی کمزوری اور طبیعت کے اضمحلال کا یہ عالم ہے کہ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق کوئی علمی کام نہیں کر سکتا چنانچہ سطور بالا بھی خود نہیں لکھی ہیں بلکہ املا کرائی ہیں اور اسی وجہ سے اس مہینہ کا برہان بھی علی گڑھ پر ستر ھویں قسط اور تبصروں سے خالی ہے۔

اسلام میں محکمۂ احتساب

اور

مفادِ صحتِ عامہ پر اس کا اثر

از جناب مولوی عبدالحئی صاحب فاروقی ایم۔ اے (عربی و معاشیات)

عہدِ حاضر کے مشہور فاضل مستشرق پروفیسر سامی خلوت حمارنہ (امریکہ) کا موضوع بالا پر ایک نہایت فاضلانہ مقالہ جو انگریزی زبان میں جرمنی کے مشہور بلند پایہ علمی مجلہ "زوڈ ہوفس آرشیف" کی ایک اشاعت میں میری نظر سے گذرا یہ مضمون بہت پسند آیا۔ میری درخواست پر لائق مترجم جو آج کل میرے رفیقِ کار ہیں انھوں نے اس کو اردو کا جامہ پہنایا ہے جو نذرِ قارئین ہے۔ آج کل ہمارا ملک اشیاء کی ہوش ربا گرانی ضروری اشیائے خورد و نوش کی نایابی اور ہلاکت انگیز ملاوٹ کے باعث جن ہنگامہ خیز حالات سے دوچار ہے ان کے پیشِ نظر امید ہے کہ یہ مقالہ عبرت انگیز بھی ہوگا اور سبق آموز بھی۔ (ایڈیٹر برہان)

قرونِ وسطیٰ کی اسلامی مملکتوں میں جو بہت سے اہم شعبے قائم کئے گئے ان میں ایک اہم شعبہ "حسبہ" کا تھا جس کا انتظام اور دیکھ بھال محتسب کرتا تھا، بازاروں اور منڈیوں کے معاملات اور شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں عوامی اخلاق و کردار کی نگرانی بھی اس کے ذمہ تھی۔ ہسپانوی زبان میں Almotacen کا لفظ بھی محتسب ہی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، آج کے دور میں اس شعبہ کے فرائض مختلف سرکاری محکموں کے ذریعہ انجام دیئے جاتے ہیں۔

احتساب کی تعریف[1] | لفظ حسبہ کے لغوی معنی شمار کرنے یا کسی چیز کی قیمت متعین کرنے کے ہیں۔ اس کا استعمال تدفینِ اموات کے ایک خاص طریقہ پر بھی ہوتا ہے، لیکن مذہبی اصطلاح میں کسی شخص کا کچھ پس انداز کرنا یا آئندہ کی زندگی میں کسی اچھے عمل کا بدلہ پانے کی آرزو کرنا ہے، تقریباً نویں صدی عیسوی سے اس کا مطلب ایک خاص مذہبی پوزیشن یا محکمہ سے ہونے لگا جس کا مقصد لوگوں کو قرآنی احکامات پر عمل پیرا کرنا تھا جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے[2] اور تم میں سے ایک ایسی جماعت پیدا ہونی چاہئیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے اور نیکی کا حکم دیوے اور لوگوں کو برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔ مسلم عوام کے اعمال کے نگراں اور ایک مذہبی ذمہ دار شخصیت ہونے کے اعتبار سے محتسب کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے عوام کی اخلاقی حالت سدھارے، غفلتوں اور فروگذاشتوں پر ان کی سرزنش کرے اور انھیں اعمال حسنہ کی ترغیب دے۔

احتساب کی اہمیت | جب دنیا میں اسلام کی نشر و اشاعت بڑھنے لگی اور اس کی شعاعیں سرزمین عرب سے نکل کر مشرق میں وادی سندھ اور مغرب میں بحر اٹلانٹک تک پھیل گئیں۔ نئے نئے شہر معرضِ وجود میں آنے لگے، آبادیوں میں اضافہ شروع ہوا، متعدد صنعتیں اور تجارتیں قایم ہوئیں۔ نقل و حمل اور مواصلات کے جدید ذرائع پیدا ہوتے تو مفادِ عامہ کی دیکھ بھال کرنے کے لئے ہر ریاست میں احتساب کا محکمہ قایم کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں مختلف علوم و فنون اور ثقافتی سرگرمیوں میں کافی اضافہ ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انتظامیہ کے عملہ کو ایک مہذب و شائستہ معاشرے کے گوناگوں مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور

---

[1] ذیلی عنوانات مترجم نے قایم کئے ہیں۔

[2] اصل آیۃ قرآنیہ یہ ہے وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ آل عمران پ ۴ ع ۱۰ - مترجم

اس بات کا احساس پیدا ہوا کہ خرید و فروخت اور متعدد صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے لئے کچھ قوانین وضع کئے جائیں اور ایک ضابطۂ اخلاق مرتب کیا جائے۔ محکمۂ احتساب کی اہمیت اور اس کی افادیت کا یہی بیّن ثبوت ہے کہ اس محکمہ نے صدیوں تک اسلامی دنیا میں بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں، مثلاً ایران میں سولھویں صدی تک محتسب کے اختیارات بے کم و کاست برقرار رہے اور ارضِ مصر میں بانی خاندانِ خدیوی محمد علی (۱۸۴۹ - ۱۸۰۵) کے عہد تک یہ شعبہ قایم رہا۔ مزید برآں ۱۸۵۹ء میں سلطنتِ عثمانیہ کے اندر اور ۱۹۲۶ء میں جمہوریہ شام میں بھی اس کی تجدید کی گئی۔ ابھی حال ہی میں مشہور محقق ولیم ہوئنر باخ Wilhelm Hoenerbach) نے (TETUAN) شہر کے ایک سروے میں جو موجودہ صدی کے ابتدائی پچاس سال کو سامنے رکھ کر کیا گیا تھا۔ محکمۂ احتساب پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنے سروے میں مقامی تجارتوں، بازاری انتظامات، مختلف پیشوں اور اوقاف وغیرہ کے ضابطے اور قوانین کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بازاروں کی تفصیلات اور ان کے محلِ وقوع کی بھی مکمل فہرست شامل کی تھی۔

صاحب کشف الظنون کا نظریہ احتساب حاجی خلیفہ (متوفی ۱۶۵۷ء) احتساب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ وہ شعبہ ہے جو ایک تہذیب یافتہ معاشرے سے تعلق رکھنے والے افراد یا اداروں کے آپسی لین دین کو ایک ضابطہ کے اندر انجام دے، ان کی رائے میں ایماندارانہ تجارت کے لئے عدل و انصاف اور اعتماد دونوں بنیادی ستون ہیں، احتساب کی بنیاد جن اصولوں پر ہے ان میں سے کچھ تو دینی اور مذہبی ہیں اور کچھ عام مشاہدات پر مبنی ہیں اور کچھ کا تعلق حاکم کے مناسب فیصلہ سے ہے۔ اس کا مقصد مسلم ریاستوں میں ہر ممکن طریقہ سے ترقی و خوش حالی لانا ہے لہٰذا اس عہدہ کے لئے ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو فہم و فراست کے ساتھ ساتھ برمحل فیصلہ بھی کر سکے اور اسے عوامی زندگی کا تجربہ بھی ہو کیوں کہ انسانی فطرت زمانے اور حالات کے تغیر و تبدل سے خود بھی نئے نئے روپ بدلتی رہتی ہے۔ حاجی خلیفہ کے قول کے مطابق حضرت عمر ابن خطابؓ

(۶۴۴ - ۶۳۴) وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کیا اور اس دینی واخلاقی نظام کو اپنے زیر نگرانی مدینہ میں نافذ کیا، انھوں نے اپنی بہترین انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر اس عہدہ کو ایک اعلیٰ اور باعزت مقام عطا فرمایا۔

محکمۂ احتساب کا قیام | اسلام کے اس ابتدائی دور میں مسلم معاشرہ اتنا پیچیدہ نہ تھا اور شہروں کی آبادیاں بھی اتنی وسیع نہ تھیں، چنانچہ عہد اسلامی کے ابتدائی ڈیڑھ سو سالہ دور میں مدینہ اور دمشق کی حکومتوں میں اس بات کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ احتساب کا محکمہ وہاں باقاعدہ قایم تھا یا نہیں۔ لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عہد اسلامی کے بالکل ابتدائی ایام میں اس کی ضرورت اور اہمیت یقیناً محسوس کی جانے لگی تھی اور کسی حد تک اس سمت میں بلا کسی منظم پروگرام کے کچھ اقدامات بھی کئے گئے تھے نویں صدی کے نصف اول یعنی سلطنت عباسیہ کے ابتدائی پچاس سال میں اس محکمہ کی باقاعدہ تنظیم کی گئی اور احتساب کو انتظامیہ میں ایک اہم مقام دیا گیا، غالباً خلیفہ مامون (۸۳۳ - ۸۱۳) اور خلیفہ معتصم (۸۴۲ - ۸۳۳) نے بغداد میونسپلٹی اور فوجی چھاونیوں میں جو قوانین نافذ کئے تھے وہی محکمہ حفظان صحت کے لئے سب سے پہلے سرکاری قوانین کی بنیاد بنے۔ خلیفہ مقتدر (۹۳۲ — ۹۰۸) کے دور میں عباسی پایہ تخت میں دو مشہور محتسبین کے نام ملتے ہیں۔ ایک ابو سعید حسن بن احمد اصطخری (۹۳۹ — ۸۵۷) جس کو بعد میں سیستان کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ اور دوسرے ابراہیم بن محمد بن بطحا جو اپنی دیانتداری، راستبازی اور بلند ہمتی میں مشہور تھے، ۹۳۱ء میں خلیفہ مقتدر سے یہ شکایت کی گئی کہ کوئی شخص کسی طبیب کی غفلت و نااہلی کی وجہ سے مرگیا جس کی بنا پر خلیفہ نے ابن بطحا کو مامور کیا۔ کہ وہ تمام اطبا اور معالجین کو مطب کرنے سے روک دے تاوقتیکہ افسر الاطبا ثابت ابن سنان ان سب کی جانچ نہ کرلے۔ اس کے بعد سے ثابت ابن سنان کے دستخطوں سے اطبا کو اجازت نامے جاری کئے جانے لگے۔

دسویں صدی عیسوی میں احتساب کا شعبہ مصر میں قایم کیا گیا اور پھر وہاں سے شمالی

افریقہ میں مقبول ہوا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مسلم اسپین میں جو سب سے پہلا محتسب خلیفہ کی جانب سے نامزد کیا گیا وہ ایک طبی محقق و معالج احمد بن یونس الحرانی (۹۹۰ء) تھا جسے قرطبہ میں "خطاط السوق" یا "صاحب السوق" کے لقب سے پکارا جاتا تھا (یعنی وہ شخص جو بازار کے نظم و نسق کا نگراں ہو) اس کے بعد یہ شعبہ تیرھویں صدی عیسوی میں (Almotacen) کے نام سے مسیحی اسپین میں بھی قائم کیا گیا۔

محتسب کا تقرر: ابتدا میں محتسب خلیفہ وقت کے حکم سے مقرر کیا جاتا تھا لیکن بعد میں اس عہدہ کا انتخاب خلیفہ کی منظوری لے کر قاضی وقت کرنے لگا۔ محتسب کو جو گوناگوں ذمہ داریاں اور فرائض سپرد کئے گئے تھے خاص کر شہری علاقوں میں، ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا عہدہ ایک جج کے عہدہ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس لئے جو احکامات اور قوانین قاضی کے عہدہ کے لئے وضع کئے گئے تھے وہی اس نئے عہدہ کے لئے بھی ضروری تصور کئے گئے اس طرح محتسب کی ذمہ داریاں اور فرائض متعین کر دئے گئے، ان تجارتوں اور کاروباروں کی بھی وضاحت کر دی گئی جن کی دیکھ بھال اسے کرنا تھی اسی طرح ان مذکورہ پیشوں کے محاسن اور ان میں جو دھوکے اور فریب اختیار کئے جاتے تھے ان کی تفصیلات بھی عیاں کر دی گئیں۔

احتساب پر علمی تحقیقات: اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب جس کو ابن ندیم (متوفی ۹۹۵ء) نے اپنی کتاب الفہرست میں ذکر کیا ہے وہ "فی صناعۃ الحسبۃ الکبیر" ہے جس کا مصنف احمد بن طیب السرخسی (متوفی ۸۹۹ء) ہے، اس نے ایک مختصر کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام صناعۃ الحسبۃ الصغیر تھا۔ سرخسی ۸۹۵ء کے دوران میں بغداد کا محتسب تھا۔ لیکن افسوس آج اس کی یہ دونوں کتابیں نایاب ہو چکی ہیں۔ امام غزالی (۱۱۱۱ - ۱۰۵۹) نے احیاء العلوم اور علی بن محمد الماوردی (متوفی ۱۰۵۸ء) نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ میں محتسب کے فرائض کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلے ایک مشہور طبیب اور قاضی وقت عبدالرحمٰن بن نصر بن عبداللہ العدوی التبریزی النبراوی معروف بالشیزری نے منفصل کتاب نہایۃ الرتبۃ فی طلب الحسبۃ لکھی تھی۔ شیزری

صلاح الدین ایوبی (۱۱۹۳-۱۱۶۹) کے عہد کا محقق اور طبیب تھا، یہ کتاب چالیس ابواب پر مشتمل تھی اور اسی کو بنیاد بناکر بعد میں علماء اور محققین نے اپنے ماحول اور تقاضہ کے مطابق اس موضوع پر مزید تصنیفات کیں مثلاً محمد بن احمد البسّام نے تیرھویں صدی میں اسی موضوع اور انہی عنوانات پر جنھیں شیزری نے قایم کیا تھا ایک مبسوط کتاب لکھی تھی، شیزری نے تو اپنی تصنیف کو صرف چالیس ابواب پر منقسم کیا تھا لیکن البسّام نے مزید اضافہ کرکے ۱۱۴ ابواب قایم کئے اسی طرح محمد بن اخوۃ القرشی نے ۱۳۲۶ء کے درمیان احتساب کے موضوع پر معالم القربۃ فی احکام الحسبہ کے نام سے ایک نہایت مفید رسالہ تحریر کیا، جو ۷۰ ابواب پر مشتمل تھا، اسپین میں بھی اس میدان میں جو کام کئے گئے ہیں وہ بھی شیزری کی کتاب کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اس سلسلہ کی مشہور کتاب محمد بن علی السقطی کی تصنیف فی ادب الحسبۃ ہے۔ شیزری نے اپنی کتاب کے افتتاحیہ میں اپنی تصنیف کی غرض و غایت اور مقصد و منشا پر بھی روشنی ڈالی ہے وہ لکھتا ہے کہ "میرا ایک دوست جس کو حال ہی میں محتسب مقرر کیا گیا ہے اور اس بات کا ذمہ دار بنایا گیا ہے کہ وہ مفاد عامہ کی دیکھ بھال۔ منڈیوں کی نگرانی مختلف تجارتوں اور پیشہ وروں کے کاموں کا معائنہ کرے۔ اس نے یہ فرمائش کی کہ میں اس کے لئے کچھ اصول و قوانین اور محتسب کے فرائض و ذمہ داریوں پر مشتمل ایک ایسی کتاب مرتب کردوں جسکی مدد سے وہ اس عظیم عہدہ پر رہتے ہوئے ان قوانین کو نافذ کرسکے۔ لہٰذا میں نے بڑی محنت سے یہ مختصر کتاب تصنیف کی ہے جسمیں تفصیلات میں جانے سے گریز کیا گیا ہے لیکن ان واقعات کی تفصیلات ضرور شامل کی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کس طرح خفیہ طریقہ سے مختلف اشیاء میں دھوکے اور فریب سے کام لئے جاتے ہیں اسی طرح مختلف پیشہ وروں کی ان بدعنوانیوں کی بھی نشان دہی کی ہے جسکے ذریعہ وہ زیادہ سے زیادہ نفع اندوزی کرتے ہیں۔"

مشاہرہ اور ضروری اختیارات | محتسب کو مفاد عامہ اور رفاہِ عام کی نگرانی کرنے کے سلسلہ میں بڑا

اہم رول ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے اس کو سرکاری خزانے سے تیس دینار ماہوار کا مشاہرہ مقرر تھا۔ بادشاہ یا قاضی شہر کی طرف سے محتسب کو نظم و نسق قائم کرنے کے لیے اور کسی بدمعاملگی کے جرم میں سزا دینے کے اختیارات حاصل تھے۔ مزید برآں چونکہ وہ قاضی کا دست راست خیال کیا جاتا تھا۔ اس لیے اس کے فیصلوں کا احترام بھی کیا جاتا تھا۔ اسے یہ بھی اختیار تھا کہ وہ لڑائی جھگڑے اور تشدد کے واقعات پر اپنا فیصلہ نافذ کرے۔ اور جب ثبوت مل جائے تو مظلوم کی حمایت اور ظالم کو سزا دے۔ حکومت اور شہری انتظامیہ کی طرف سے اس کو یہ بھی حق ہوتا تھا کہ وہ بد انتظامیوں اور عوامی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے ان معاملات میں مداخلت کرے۔ اور ضرورت پڑنے پر طاقت کا بھی استعمال کرنے سے گریز نہ کرے۔ محتسب ناپ تول کی بھی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ اور ان پیمانوں کو بھی چیک کرتا تھا جن کے ذریعہ ناپ تول ہوتی تھی۔

اہلیت و صلاحیت متعینہ قوانین کے ماتحت محتسب کو اعلیٰ اخلاقی قدروں اور بہترین علمی صلاحیتوں کا حامل ہونا ضروری تھا۔ تاکہ وہ اس معقول مشاہرے اور ذمہ دار عہدہ کے مہتم بالشان فرائض کو بخوبی انجام دے سکے۔ اس عہدہ کے لیے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہہ ہونا بھی ضروری تھا۔ اس کو فراخ دلی، بیدار مغزی، وسیع النظری، پُر وقار اور غیر جانبدار، قانون شکنی کرنے والوں کی سرزنش کرنے کا اہل اور عدل و انصاف قائم کرنے کی صلاحیتوں کا مالک ہونا چاہئے۔ محتسب کو منڈیوں اور تاجروں کے بارے میں بھی اچھی طرح واقفیت ہونا چاہیے۔ ملاوٹ اور دھوکہ دہی کے ان معاملات سے بھی باخبر ہو جو مختلف پیشوں میں اختیار کیے جاتے ہیں۔ اس کو ہر اس آدمی کی مدد کرنی چاہیے جس کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہو یا اسے کوئی ایذا پہنچائی گئی ہو۔ وہ اس بات کی بھی جانچ کرتا تھا کہ خریدار اور دوکاندار کے درمیان جو تجارتی و کاروباری معاملات ہوتے ہیں وہ مناسب معقول اور مبنی بر انصاف ہیں کہ نہیں۔ اور خرید و فروخت میں شرعی قانون اور قرآنی تعلیمات کے مطابق عمل کیا جا رہا ہے کہ نہیں۔

محتسب کا عملہ اور اس کا طریقۂ کار

محتسب کے ہمہ گیر فرائض کے پیش نظر اس کی امداد کے لئے کچھ مددگار بھی رکھے جاتے تھے۔ جن کو "اعوان" کہا جاتا تھا۔ انہیں بھی حکومت کی جانب سے معاوضہ ملتا تھا۔ ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ روزانہ منڈیوں کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔ اور محتسب کو مطلع کیا کریں۔ یہ اعوان رائج الوقت پیشوں کے افراد یا مقامی تاجروں کے طبقہ ہی سے منتخب کئے جاتے تھے۔ اور جس طبقہ اور کاروبار سے وہ تعلق رکھتے تھے اسی کی نگرانی ان کے سپرد کی جاتی تھی۔

سہولت کے پیش نظر سب سے پہلے محتسب کے دائرۂ اختیار میں آنے والی ان تجارتوں اور پیشوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق براہِ راست صحت عامہ سے نہیں ہے۔ اور آخر میں ان چیزوں کا ذکر کیا جائے گا جن کا تعلق طبی پیشہ اور حفظانِ صحت سے ہے

محتسب کا دائرۂ عمل

بازاروں کے نگراں کی حیثیت سے محتسب یا اس کے اعوان جن پیشہ وروں کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ ان میں گوشت فروش، حلوائی، چکی پیسنے والے، دودھ فروش، مکھن اچار مربے چٹنی اور کباب بنانے والے قابلِ ذکر تھے۔ اس کے علاوہ پارچہ باف، درزی، بزاز، نداف، سوت کاتنے اور ریشم کا کام کرنے والے، سنار لوہار، دلال، صراف، موچی، رنگریز اور نیلامی بولی بولنے والوں کی بھی چیکنگ کی جاتی تھی۔

عوام میں اخلاقی قدروں کو اجاگر کرنے اور خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے محتسب کے دائرۂ عمل میں یہ بھی تھا کہ وہ مختلف پیشوں اور کاروباروں کی جانچ پڑتال کرتا رہے جن میں جعل فریب، کھوٹ ملاوٹ عام ہے تاکہ عوام میں ان برائیوں اور بدعنوانیوں کا سدباب ہو سکے۔

احتساب اور حفظانِ صحت

اسلام میں سب سے پہلے حفظانِ صحت کے پیش نظر طبی پیشہ پر قواعد و قوانین نافذ کرنے کا رواج اسی محکمۂ احتساب کی وجہ سے ہوا چنانچہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے معاشرہ کو سدھارنے، معیارِ زندگی بلند کرنے اور ترقی پذیر ماحول پیدا کرنے کے لئے کس کس طرح اپنے مذہبی اصولوں کو اپنایا ہے

مندرجہ ذیل حصے سے پتہ چلتا ہے کہ محتسب کسطرح حفظان صحت کے لئے اپنے اثرات استعمال کرتا تھا
مثلاً وہ اس بات کی دیکھ بھال کرتا تھا کہ عوامی استعمال میں آنے والے تمام حماموں کی صفائی ہوتی
ہے کہ نہیں۔ وہ دریاؤں کے کنارے کچھ مقامات کو محفوظ رکھتا تھا تاکہ وہاں سے لوگ صفائی کے
ساتھ پینے کا پانی حاصل کر سکیں۔ سقوں کو اس بات کی ہدایت تھی کہ وہ اپنی مشکیں اور پانی پلانے
والے برتن صاف ستھرے رکھیں اور ان پا[illegible]۔ مقامات کی صفائی کا خاص طور پر خیال رکھیں
جہاں لوگ آکر پانی وغیرہ پیتے ہوں۔ سڑکیں، گلیاں اور عام گزرگاہیں صاف ستھری رکھیں۔ وہاں
مٹی اور کوڑے کے ڈھیر نہ لگائے جائیں۔ پیدل چلنے والوں کے لئے سڑکوں کے دونوں طرف الگ
راستے بنائے جائیں۔ دوکانداروں کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ حدود معینہ سے آگے اپنی
دوکانوں کو بڑھائیں۔ تاکہ خریداروں اور راہ گیروں کو کوئی دقت پیش نہ آئے۔ محتسب کو یہ بھی
اختیار تھا کہ وہ کسی دواخانے کے پاس کوئی ایسی دوکان کو قائم ہونے سے روکے جہاں آگ جلائی
جاتی ہو جیسے نانبائی وغیرہ کیونکہ صحت پر اس کے خطرناک اثرات پڑ سکتے ہیں۔ اسی طرح کوئلہ
جلانے کی لکڑی اور راکھ وغیرہ کی دوکانیں بھی عام بازاروں میں لگانے کی اجازت نہیں دی جاتی
تھی۔ کیونکہ اس سے عوام کی صحت اور ان کے لباس وغیرہ کے خراب ہونے کے امکانات
تھے۔ اس قسم کی دوکانوں کے لئے بازار سے کچھ دور ہٹ کر کچھ جگہیں مخصوص کر دی جاتی تھیں
جہاں انہیں اپنے گاہکوں کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ انہیں اپنے باربردار جانوروں کو دم لینے
اور سستانے کے لئے تھوڑی دیر کی چھوٹ دینی پڑتی تھی تاکہ پھر وہ جلد ہی چاق و چوبند
ہو سکیں۔ ہوٹلوں اور بیکریوں کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان میں ہوا کی آمد و رفت کا مناسب بندوبست
ہو۔ ان میں کام کرنے والوں پر یہ پابندی تھی کہ وہ بے آستین کی قمیص پہنیں۔ انھیں یہ بھی
ہدایت تھی کہ وہ اپنے پیروں، گھٹنوں اور کہنی کی مدد سے آٹا نہیں گوندھیں گے۔ گندھے
ہوئے آٹے کو پسینہ، تھوک وغیرہ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ آٹا گوندھنے
والے برتنوں کی بھی صفائی کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ تلی ہوئی اشیاء فروخت کرنیوالوں

کے لئے تاکید تھی کہ وہ اپنی گزرگاہوں کو پاک و صاف رکھیں۔ روزانہ ان کی صفائی کریں تاکہ ان پر کساؤ اور میل نہ جمنے پائے۔ باورچیوں کو ہدایت تھی کہ وہ برتنوں کو ڈھانک کر رکھیں تاکہ وہ مکھیوں اور کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہیں۔

محتسب اور درس و تدریس

محتسب کا حکم تھا کہ بچوں کو ایسے استادوں سے تعلیم دلائی جائے جو تندرست اور صحت مند ہوں۔ مدرسہ اور مکتب ان مقامات پر قائم ہوں جہاں ہر عمر کے بچے آسانی سے آجا سکیں۔ بھیڑ بھاڑ اور گھنی آبادیوں سے مکاتب کو دور ہونا چاہئے۔ استادوں پر پابندی تھی کہ وہ بچوں کی صحت اور جسمانی حفاظت کے پیش نظر سخت سزائیں نہ دیں۔ ڈسپلن قائم رکھنے کیلئے انہیں صرف اس بات کی اجازت تھی کہ وہ چمڑے کا کوڑا رکھ سکتے ہیں۔ لیکن چھڑی کا استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر سرین، کولھے، ران اور تلووں پر مارنے کی اجازت تھی۔ کیونکہ یہی وہ جگہیں ہیں جہاں مارنے سے کوئی خاص نقصان کا خطرہ نہیں ہوتا۔

ناپ تول پر احتساب

محتسب کا ایک اہم خدمت یہ بھی تھی کہ وہ ناپ تول کے پیمانوں کو وقتاً فوقتاً جانچ پڑتال کرتا رہتا تھا۔ خاص طور پر ان پیمانوں کی جو دواؤں کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ اس دیکھ بھال کا مقصد یہ تھا کہ کاروبار کی لین دین میں کوئی بدعنوانی نہ ہو سکے۔ اس معاملہ میں خود شریعت اسلامیہ میں بھی ممانعت وارد ہوئی ہے[1]۔ احتساب کے موضوع پر لکھی جانے والی جتنی بھی کتابیں ہیں ان سب میں ناپ تول کے پیمانوں اور اوزان چیزوں

---

[1] قرآن مجید میں ناپ تول میں خیانت کرنے والوں کے لئے متعدد مقامات پر وعید نازل ہوئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ (ترجمہ) کم تولنے والوں کیلئے پھٹکار ہے جو لوگوں سے لیتے ہوئے تو ناپ پورا لیتے ہیں مگر جب دیتے ہیں تو کم کرکے۔ (مترجم)

کا جن کے وہ بنائے جاتے ہیں ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پاؤنڈ اور آؤنس وغیرہ کے اوزان کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ لوہے کے بنائے جائیں۔ پتھر وغیرہ سے نہیں کہ ذرا سی بے احتیاطی میں خراب ہو جائیں۔ ان اوزان کو قانونی طور پر قابلِ قبول بنانے کے لئے ان پر محتسب کی مہر اور تصدیق بھی کندہ ہوتی تھی۔ پیمانوں کی طرح ترازو بھی صاف ستھری رکھنے کی ہدایت تھی۔ خاص طور پر دواؤں اور کھانے پینے کی اشیاء تولنے کے لئے کسی دوکاندار کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنی دکان میں دو طرح کے بانٹ ترازو رکھے۔ پاؤنڈ یا آؤنس کے ۱/۴ حصہ کا بانٹ بنانا ممنوع تھا۔ کیونکہ اس سے ۱/۲ حصہ کے بانٹ کا بھی دھوکہ ہو سکتا تھا۔ محتسب صرف اُن ترازوؤں کی منظوری دیتا تھا جن کی ڈنڈی دونوں طرف سے برابر ہو اور دونوں پلڑے آسانی سے توازن قائم کر سکیں

محتسب اور حفظانِ صحت

اب ہم ان چیزوں کا ذکر کریں گے جن کا تعلق براہ راست حفظانِ صحت سے ہے درحقیقت یہی وہ حصہ ہے جو اس وقت ہمارے اس مضمون کا اصل موضوع ہے۔ ایک مستند طبیب کو جن اخلاقی اصولوں پر عمل کرنا ضروری تھا انہیں ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کسی طبیب کو اس وقت تک مطب کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی تاوقتیکہ اس کی صلاحیت اور اہلیت کی جانچ نہ کر لی جاتی۔ اور اس سے "عہد نامۂ بقراط" کی تائید و توثیق نہ کرا لی جاتی۔ طبیب کو نسخہ لکھتے وقت دواؤں کے ساتھ ہی مرض کی تفصیل، اپنی تجویز اور پرہیز بھی لکھنا ضروری تھا۔ اسی طرح "افسر الاطباء" کا انتخاب بھی محتسب کے مشورہ سے ہوتا تھا۔ اس عہدہ کا انتخاب بیشتر طبیبوں ہی کے حلقے سے ہوتا تھا۔ تیرھویں صدی کے محقق الجوبری دمشقی نے ان عطائی حکیموں کے دغل و فریب پر سخت تنقید کرتے ہوئے ان کو "مٹرک چھاپ" یعنی (اطباء الطریق) کے لفظ سے مخاطب کیا ہے جو جابجا علاقوں اور شہر کے کونے کناروں میں اپنی "تیر بہ ہدف" دواؤں کا پٹارہ ساتھ لئے پھرتے تھے۔

اطبا اور معالجین پر احتساب

عام اطبا کے علاوہ معالجین چشم کا انتخاب محققین ابن اسحاق

([illegible]ء) کی مشہور تصنیف عشر مقالات فی العین کی بنیاد پر کیا جاتا تھا جو لوگ آنکھ
کی تشریح (Anatomy) امراض اور اس کے معالجہ میں کام آنے والے لیپ مرہم اور قطورات وغیرہ
بنانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ صرف انھیں کو مطب کی اجازت دی جاتی تھی۔ حسبہ پر لکھی جانے
والی کتابوں میں ان آلات جراحی کے نام اور تصویریں بھی ملتی ہیں جنھیں معالجین چشم اپنے
استعمال میں لاتے تھے۔ محتسب ان عطائی حکیموں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ جو اپنی نقلی اور
ملاوٹی دواؤں کے ذریعہ سیدھے سادے عوام کو لوٹا کرتے تھے۔ اسی طرح جو لوگ
ہڈی بٹھانے کا پیشہ کرتے تھے ان کے لئے محتسب کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ پولس الاجانیطی
(PAULUS AEGINETA) کی کتاب ششم پر جس میں سر عظم اور ہڈی بٹھانے کا مفصل
بیان ہے، گہری نظر رکھتے ہوں اور ہڈیوں کی شکل ان کے سائز اور جسم انسانی میں ان کی تعداد
سے پوری طرح واقف ہوں۔ انھیں شرطوں پر بڑے بڑے سرجنوں کا بھی معائنہ کیا جاتا تھا
ان کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ جالینوس کی تحقیقات کے مطابق جسم انسانی کی پوری تشریح
اور منافع الاعضاء (ANOTOMY & PHYSIOLOGY) سے اچھی طرح واقف ہوں تاکہ
ہڈی جوڑنے میں کوئی کمی اور نقص باقی نہ رہے۔ ان کے ساز و سامان میں تمام ضروری آلات جراحی
موجود ہونا چاہئے۔ جیسے زخم چاک کرنے والے مختلف سائز کے چاقو و نشتر، چیر پھاڑ کے
آلات، دھار دار قینچیاں، کترنیاں، ہڈی کاٹنے کی آری، کان صاف کرنے والی سلائیاں
زخم میں ٹانکے لگانے کے لئے سوئی، مرہم اور پلاسٹر چپکانے کی اشیاء وغیرہ۔ عطائی
جراحوں کی تعداد اس زمانے میں بھی بہت زیادہ تھی۔ محتسب ان کی گرفت کرتا اور انھیں
سخت سزائیں بھی دیا کرتا تھا۔ احتساب کے قانون کے مطابق فصد کھولنے کی اجازت صرف
انھیں لوگوں کو دی جاتی تھی جو جسم انسانی کی تشریحات سے اچھی طرح واقف ہوتے تھے۔ کیونکہ
ناواقفیت کی بنا پر ان سے کوئی بھی شریان یا ورید کٹ جانے کا خطرہ تھا۔ ایسے لوگوں سے
پہلے اس بات کی قسم لی جاتی تھی کہ وہ چودہ سال سے کم عمر والوں کی فصد نہیں کھولیں گے تاوقتیکہ

ان کے سرپرست اجازت نہ دیدیں۔ اسی طرح حاملہ یا حائضہ عورت، ضعیف دبلے پتلے یا حد سے زیادہ موٹے لوگوں کی فصد کھولنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ فصد کھولنے کے لیے ایسی جگہیں منتخب کی جاتی تھیں جہاں روشنی کا مناسب انتظام ہو۔ اس کام کے لئے تیز دھار دار چاقو کا استعمال ضروری تھا۔ نوآموز لوگوں کو سکھانے کے لئے یہ قانون تھا کہ وہ وریدوں اور شریانوں کو چیرنے کی مشق چقندر (BETA VULGARIS CICLA) کی پتیوں پر کریں کیونکہ اس کی پتیاں لمبی اور ڈنٹھل موٹے ہوتے ہیں۔ سینگی لگانا اگرچہ فصد کھولنے کے مقابلہ میں کم خطرناک ہے لیکن پھر بھی محتسب کی طرف سے اس کام کے لئے بھی صرف وہی لوگ اہل سمجھے جاتے تھے جنھوں نے اس فن میں خاص مہارت حاصل کی ہو۔

قرونِ وسطیٰ میں بھی عام طبیبوں اور معالجِ حیوانات میں امتیاز کیا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ دونوں پیشے بعض اوقات ایک ہی شخص اختیار کرتا تھا۔ محتسب کی طرف سے ہر معالجِ حیوانات کیلئے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنے اس پیشہ کو شروع کرنے سے پہلے اچھی طرح اس میں تربیت حاصل کرے کیونکہ اس معاملہ میں ناواقف اور غیر مستند معالجین کے عمل دخل سے کوئی حیوان ہلاک یا ضائع ہو سکتا ہے۔

دوافروشوں پر احتساب

محتسب کے لئے سب سے زیادہ مشکل کام دوافروشوں کا احتساب کرنا تھا کیونکہ دواؤں میں ملاوٹ اور نقلی اجزا کی شمولیت کا پتہ چلانا اس دور میں کوئی آسان کام نہ تھا۔ مسلمانوں کی طب میں اس قسم کی معلومات بہم پہنچانے کے بارے میں سب سے پہلے دیسقوریدوس (DIOSCORIDES) اور پلائنی (PLINY) کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اس دور کے طبی ادب میں اور بالخصوص میٹریا میڈیکا اور علم الادویہ میں بہت کچھ اضافے کئے گئے۔ تیرھویں صدی میں السقطی نے تقریباً تین ہزار دواؤں کے نام تحریر کئے ہیں۔ ان دواؤں میں اکثر و بیشتر کو محتسب پہچانتا تھا اور ان کے خواص سے واقف ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ کام نہایت مشکل تھا اور اس میں دھوکہ بھی ہو سکتا تھا۔ اسی لئے محتسب کو

اپنے اعوان میں سے کچھ کو اس کے لئے متعین کرنا پڑتا تھا کہ وہ ان دوا فروشوں کی دواؤں کو جانچیں۔ یہ اعوان دواؤں اور دوا سازوں کے تمام معاملات سے واقف ہوا کرتے تھے۔ احتساب کے ان قوانین سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلم ماہر الادویہ کس طرح دوا سازوں کی تحقیقات کرتے تھے تحقیقات کا یہ کام اطبا سے نہیں لیا جاتا ہے۔ بلکہ دوا سازوں ہی میں سے کچھ معتبر لوگوں کے ذریعہ یہ کام لیا جاتا تھا۔ جیسا کہ آج کے مہذب دور میں بھی یہی دستور ہے۔ اس دور میں دوا سازوں کی تین قسمیں تھیں۔

۱۔ شرابین :۔ یہ وہ لوگ تھے جو رقیق دوائیں مثلاً مشروبات، معاجین، خمیرہ جات اور شہد وغیرہ کی تجارت کرتے تھے۔ ان میں بیشتر لوگ غیر تعلیم یافتہ ہوتے تھے ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو حسبہ کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ ان کے لئے یہ شرائط تھیں کہ انھیں دوا سازی میں ماہر ہونے کے علاوہ ان کی خواص اور مقدار خوراک کا بھی اندازہ ہو، کسی ماہر دوا ساز سے تربیت حاصل کی ہو اور انھیں رائج و مشہور قرابادینوں پر کامل دسترس ہو مثلاً قرابادین سابور (SABUR سنہ ۸۶۹ء، علی ابن عباس المجوسی (سنہ ۹۹۴ء) کی کتاب کامل الصناعۃ الطبیہ کے مخصوص ابواب اور ابو علی حسین ابن سینا (سنہ ۱۰۳۷ء) کی کتاب القانون فی الطب کا اچھا مطالعہ ہو۔ شرابین کو اس بات کا پابند بنایا جاتا تھا کہ وہ دواؤں کے وزن اور مقدار بالکل صحیح رکھیں گے۔ اور اس بات کا خیال رکھیں گے کہ مرکبات میں جو اجزا بڑھائے جائیں وہ اس قسم کے نہ ہوں جن سے اصل دوا کی خاصیت میں تبدیلی ہو جائے ہو جائے۔ یا اس کی تاثیر میں فرق آ جائے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ دواؤں میں خالص شکر یا شہد استعمال کرنے کے بجائے بہت سے عطار گنے کے رس کو دودھ، سرکہ یا سفیدہ میں پرورده کر کے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح یہ مرکب دوائیں تو بہت خوش ذائقہ اور خوش رنگ ہو جاتی ہے لیکن یہ شربت جب دوسری دواؤں میں ملایا جاتا ہے تو اس کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے اور اس میں سے سرکہ کی بو آنے لگتی ہے۔ لہٰذا محتسب اس قسم کے نقلی مرکبات کی تیاری پر پابندی عائد کر دیتا تھا۔ اور وقتاً فوقتاً اس کی چیکنگ کرتا رہتا تھا۔

۲۔ عطارین :۔ یہ وہ لوگ تھے جو عطریات اور جڑی بوٹیوں کی تجارت کیا کرتے تھے یہ بھی اکثر ناخواندہ ہوتے تھے عطاری اور دوا سازی کے علاوہ یہ لوگ مختلف قسم کے مسالہ جات اور خوشبودار روغنیات کی بھی تجارت کرتے تھے۔ اور قیمتی خوشبویات مثلاً مشک عنبر اور زعفران وغیرہ میں ملاوٹ کرکے ناجائز نفع خوری کرتے تھے۔

ابن الحاج (۱۳۳۷ء) نے عطارین کی دو قسمیں بتلائی ہیں ایک تھوک فروش اور دوسرے خوردہ فروش، اس نے ان کو مسالہ جات کے تاجروں سے الگ شمار کیا ہے لہٰذا اس نے یہ بھی احتیاطی تدابیر کے طور پر لکھا ہے کہ اگر متعلقہ دوکاندار کسی فوری ضرورت کی بنا پر کہیں دوکان سے باہر جائے تو اپنی دوکان کسی بچہ یا ناواقف کار کے سپرد کرکے نہ جائے تاکہ کسی دوا کے غلط استعمال کا امکان نہ رہے۔

۳۔ مستند دوا ساز :۔ ان کو صیادلہ بھی کہتے ہیں، اس طبقے کے لوگوں کو مفرد اور مرکب ادویہ کے بارے میں مکمل معلومات ہوتی تھیں۔ اور انھیں بنانے و استعمال کرنے کا خاصا تجربہ ہوتا تھا۔ لیکن ان دوا سازوں میں بھی نقلی اور ملاوٹی دواؤں کا استعمال عام تھا۔ لہٰذا ان کی دوکانوں کا معائنہ ہر ہفتہ محتسب کیا کرتا تھا۔ لیکن اس قسم کی جعلسازی اور بدعنوانی کا انسداد کوئی آسان کام نہیں تھا۔ محتسب ایسے لوگوں کو دینی، اخلاقی اور قانونی بنیادوں پر کاربند رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ صحتِ انسانی پر ادویات کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہر دوا کا اپنا ایک مزاج اور خاصیت ہوتی ہے اسی کے لحاظ سے اس کا استعمال ہوتا ہے۔ ان دوا سازوں میں دغل و تریب کے بہت سے طریقے رائج تھے۔ محتسب ان طریقوں سے واقف ہوتا تھا۔ مثلاً طبا شیر میں ہڈیوں کی راکھ ملادی جاتی تھی۔ اس کے جانچنے کا طریقہ یہ تھا کہ تھوڑا سا سفوف لے کر پانی میں چھڑک دیتے تھے۔ اگر وہ پانی کے اوپر تیرنے لگے تو خالص ہے اور اگر ڈوب جائے تو نقلی ہے۔ اسی طرح لوبان (FRANKINCENSE) میں سیاہ رال اور صمغ عربی کی ملاوٹ کی جاتی تھی، اس

کے جانچنے کا طریقہ یہ تھا کہ اس کے کچھ اجزار کو آگ کے قریب لاتے اگر یہ خالص ہوتا تو دھوئیں
ای لَو کے ساتھ جلنا شروع ہوتا ورنہ نہیں ۔ رسوت میں روغن زیتون کا فضلہ اور گلسے کے
تہ کی آمیزش ہوتی تھی ۔ اس کی عمدہ قسم باہر سے دیکھنے میں سیاہی مائل ہوتی ہے اور اندر سے
سرخ یاقوتی رنگ جھلکتا ہے ۔ اگر یہ خالص ہوتا ہے تو تھوڑی سی مقدار میں آگ پر ڈالنے
سے جلنے لگتا ہے ۔ اور پانی ڈالنے سے بجھ جاتا ہے ۔ اور زعفرانی رنگ کا دھواں اٹھنے لگتا
ہے اگر یہ علامتیں نہ ہوں تو وہ نقلی ہے ۔ اسی طرح موم بتیوں میں جبیرٹ کی چربی اور سیاہ رال کی
میزش ہوتی تھی بتی کو سانچوں میں ڈھالتے وقت باقلا کا آٹا ریسہ یا پسا ہوا اثمد ملا
دیتے تھے ۔ اس کے بعد اوپر سے کچھ اصلی موم کا غلاف چڑھا دیتے تھے ۔ اسی طرح سنا
(CASSIA ANGUSHIFOLIA) کے پتیوں پر پانی چھڑک دیا جاتا تھا تاکہ تولتے
وقت اس کا وزن بڑھ جائے ۔

ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محکمۂ احتساب کا پورے مسلم معاشرے پر عموماً
اور بڑے بڑے شہروں میں خصوصاً تجارت اور اخلاق کے ہر گوشہ پر بہت گہرا اثر پڑتا تھا ۔
اس کی عملدر آمد میں خاص طور پر ایک عملی جذبہ کارفرما تھا ۔ اس میں شک نہیں کہ اس جذبہ نے
مفادِ عامہ کی خاطر خاص طور پر حفظانِ صحت ، مارکٹ ، عبادتگاہوں ، رہائشی علاقوں اور
شفاخانوں کی اصلاح میں بے حد مدد دی ہے ۔ اس محکمہ سے طبی پیشہ کو بھی بہت تقویت ملی ہے
ان پابندیوں اور روک تھام کی وجہ سے ملاوٹ و آمیزش اور ناپ تول میں جو گڑبڑ ہوا کرتی تھی
اس میں بہت کچھ کمی آگئی تھی ۔ مندرجہ بالا ضابطہ مقرر ہونے اور بد دیانت طبیبوں کے شرمناک
غیر قانونی کارناموں کو منظرِ عام پر لانے کی وجہ سے عوام ان سے ہوشیار رہنے لگے ۔ اور آئندہ
کے لئے ان کے شر سے محفوظ ہو گئے ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ قوانینِ احتساب ہی اسلام میں وہ اصول ہے جنکی
بدولت طبی پیشہ میں اصلاح ہوئی ہے ۔ اور علم الادویہ کو علاج و معالجہ سے الگ تسلیم کیا گیا ہے

اس کا جواب میں نفی میں ہے کیونکہ ان دونوں پیشوں کے الگ اور مختلف ہونے کا تصور تو نویں صدی کے آغاز ہی میں پیدا ہو چکا تھا۔ جبکہ حسبہ کے قوانین مرتب بھی نہیں ہوئے تھے اس کے علاوہ دوسری صدی ہجری میں متعدد واقعات اس قسم کے ملتے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بھی بہت سے مستند طبیبوں نے ایسے اصول و ضوابط مرتب کر لئے تھے مگر ان پر پورے طور سے عملدرآمد نہیں ہوتا تھا پھر بھی غالباً تاریخ انسانی میں پہلی بار اسلام کے اس شعبۂ احتساب نے معرض وجود میں آکر اس قسم کے قوانین اور اصول مرتب کئے ہیں جن سے فن طب اور علاج و معالجہ کے پیشہ کو بڑا فروغ ہوا ہے۔

مآخذ

۱۔ شرح دیباجۃ القاموس ۔ نصر الہورینی جلد اول قاہرہ
۲۔ خطط الشام ۔ محمد کرد علی جلد پنجم دمشق سنہ ۱۹۲۷ء
۳۔ المنجد فی العلوم والادب ۔ یسوعی سولہواں ایڈیشن بیروت سنہ ۱۹۵۶ء
۴۔ مقدمہ ابن خلدون قاہرہ مرتبہ علی الوافی
۵۔ المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار ۔ المقریزی ، جلد دوم ، قاہرہ سنہ ۱۹۵۸ء
۶۔ معالم القربۃ فی احکام الحسبہ ۔ محمد ابن الاخوہ ۔ لندن سنہ ۱۹۳۸ء
۷۔ رسالۃ فی الحسبہ ۔ عمر بن عثمان جرفیسی قاہرہ سنہ ۱۹۵۵ء
۸۔ نہایۃ الرتبۃ فی طلب الحسبہ ۔ عبدالرحمن ابن نصر الشیزری ۔ قاہرہ سنہ ۱۹۴۶ء
۹۔ کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون ۔ حاجی خلیفہ ۔ جلد اول ، استنبول سنہ ۱۹۴۱ء

۱۰- صبح الاعشیٰ - قلقشندی - جلد پنجم - قاہرہ ۱۹۱۵ء

۱۱- وفیات الاعیان - ابن خلکان - جلد اول قاہرہ ۱۹۴۸ء -

۱۲- المختصر فی اخبار البشر - ابوالفدا جلد اول قاہرہ ۱۸۶۰ء

۱۳- اخبار الحکماء - القفطی - قاہرہ ۱۹۳۶ء

۱۴- احیاء العلوم - امام غزالی جلد دوم قاہرہ

۱۵- احکام السلطانیہ - علی بن محمد الماوردی - قاہرہ ۱۹۰۹ء

۱۶- عیون الانباء فی طبقات الاطباء - ابن ابی اصیبعہ - جلد دوم - بیروت ۱۹۵۸ء

۱۷- طبقات الاطباء - ابن جلجل - قاہرہ ۱۹۵۵ء

۱۸- طبقات الامم - ابوالقاسم اندلسی - قاہرہ

۱۹- فی ادب الحسبہ - ابوعبداللہ محمد القطی

۲۰- نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب - المقری - جلد اول - قاہرہ ۱۹۴۹ء

۲۱- فتوح البلدان - بلاذری - قاہرہ ۱۹۳۲ء

۲۲- النہایۃ - ابن بسام

۲۳- کتاب المختار فی کشف الآثار - احمد الکتبی - قاہرہ

۲۴- الفہرست - ابن الندیم - قاہرہ ۱۹۳۰ء

۲۵- المدخل - ابن الحاج - جلد چہارم - قاہرہ ۱۹۲۹ء

۲۶- Edward William Lane, Arabic English Lixicon
Vol. I, New York, 1955

۲۷- The Encyclopedia of Islam, Vol. II, Leiden, 1927

۲۸- W. Behrnauer, Memoire, Journal Asiatique.

۲۹- Sami Hamarneh, the rise in professional
Pharmacy in Islam. Medical History 6(1962)

عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی

مفتی اول دار العلوم دیوبند

(از مولانا محمد ظفیر الدین صاحب دار العلوم دیوبند)

تیرھویں صدی کے اواخر سے چودھویں صدی ہجری کے ابتداء میں جن منتخب علمائے حق سے اس ملک میں علم و عمل کی روشنی پھیلی، اور جن کے انفاسِ قدسیہ سے خواص و عوام کی اصلاح ہوئی ان میں عارف باللہ، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی ایک ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے اپنے دور میں جو علمی، دینی اور ملی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ تاریخ کا نمایاں باب ہے

حضرت مفتی صاحب کی پوری زندگی درس و تدریس، تعلیم و تربیت، بیعت و ارشاد اور افتاء میں گذری۔ نام و نمود اور ریا و نمائش سے الگ رہ کر للّٰہ فی اللہ یہ ساری خدمات انجام دیں اور کوئی شبہ نہیں کہ آپ سے ملک و ملت اور بالخصوص اہلِ دین کو بڑا فائدہ پہنچا۔

مفتی صاحبؒ دار العلوم دیوبند کے ان اولین فضلاء میں ہیں جن کے زہد و تقویٰ، علم و فضل اور اخلاص و اخلاق سے غلام ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ اور جن کے فضل و کمال، علم و عمل اور جذبۂ اشاعتِ دین سے ملک اور بیرون ملک میں دار العلوم دیوبند کی شہرت کو چار چاند لگے۔ اور اہلِ علم کے قلوب میں دار العلوم کی محبت پیوست ہوئی۔ آپ کا ظاہر بہت سادہ

بے تکلف اور معمولی تھا، مگر باطن شگفتہ، تابناک اور صد درجہ اثر انگیز تھا۔

وطن اور خاندان اب ہندوستان بلکہ غیر ممالک میں بھی دیو بند کا نام اجنبی نہیں رہا۔ اسی دیو بند کے نامی گرامی عثمانی خاندان میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی ایک مشہور دانش ور ادیب اور عالمِ دین تھے کمالِ فہم اور علم و عمل کی وجہ سے ارباب علم میں متعارف اور نہایت محترم تھے۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مخلص احباب میں تھے۔ اور دارالعلوم دیو بند کے اولین معماروں میں، جن مقامی بزرگوں نے دارالعلوم قائم کیا اور آگے بڑھ کر حصہ لیا ان میں آپ کا نامِ نامی سرِفہرست نظر آتا ہے۔

مولانا فضل الرحمٰن عثمانی نے دہلی میں رہ کر تعلیم حاصل کی تھی، استاذ العلماء مولانا مملوک العلی (م ۱۲۶۷ھ) کے ممتاز شاگردوں میں آپ کا شمار ہے جو حضرت نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ) حضرت گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) اور دوسرے علماء کے بھی استاذ تھے۔ اس رشتہ سے مولانا عثمانی حضرت نانوتوی کے استاذ بھائی بھی تھے۔ فراغت کے بعد مولانا عثمانی ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر فائز ہوئے اور اسی عہدہ پر بریلی میں آپ کا قیام تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا، آپ نے اپنی آنکھوں سے سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہوتے ہوئے اور انگریزوں کو برسرِاقتدار آتے ہوئے دیکھا تھا۔

۱۵ رمحرم ۱۲۸۳ھ کو آپ کی بھرپور اعانت اور مشورے سے دارالعلوم دیو بند کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ابتداء سے تادمِ آخر اس کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے، اور آپ ہی جیسے حضرات کی برکت تھی کہ دارالعلوم کی روداد اس دور میں بھی سال بسال مفصل چھپتی تھی۔ جس میں معاونین کے ساتھ مدرسین اور طلباء کی تفصیل بھی درج ہوتی تھی۔ چنانچہ آج بھی اس کا ریکارڈ محافظ خانہ دارالعلوم میں محفوظ ہے۔

اپنی ملازمت کے سلسلہ میں آپ کا قیام بریلی، پیلی بھیت اور بجنور وغیرہ میں رہا، بلکہ آپ کے ایک صاحبزادے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند

(م ۱۳۴۹ھ) کی پیدائش بریلی کی ہی ہے ۔جہاں بسلسلہ ملازمت آپ مقیم تھے۔آپ کے متعلق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم نے لکھا ہے

"حضرت مولانا فضل الرحمٰن ... دارالعلوم دیوبند کے اولین اراکین، مجلس شوریٰ دارالعلوم کے طبقۂ اولیٰ کے اراکین اور حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کے مخصوص مجلس نشیں احباب میں تھے" (فتاویٰ دارالعلوم ص ۳۶ ج ۱)

ولادت حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی ابن مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کے بڑے صاحبزادے ہیں ۔ آپ اپنے آبائی وطن دیوبند میں ۱۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے ۔ اور یہیں علمی و دینی ماحول میں پرورش و نشو و نما ہوئی ۔بچپن میں والدین کے ساتھ کچھ دنوں بریلی میں بھی رہنا ہوا۔آپ کا تاریخی نام ظفر الدین ہے ۔یہ نام مخصوص لوگوں کے سوا کوئی جانتا نہیں تھا۔جس وقت دارالعلوم کا سنگِ بنیاد ڈالا گیا تھا اس وقت مفتی صاحب کی عمر کم و بیش آٹھ سال کی تھی اور اس وقت اس کا نام مدرسہ عربی اسلامی تجویز ہوا تھا

تعلیم دارالعلوم کی پرانی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ذی الحجہ ۱۲۸۴ھ میں ارباب مدرسہ نے فیصلہ کیا کہ درجۂ حفظ بھی قائم کیا جائے ۔چنانچہ اس خدمت کے لیے حافظ نامدار خان صاحب کا تقرر عمل میں آیا ۔

حفظِ قرآن حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس درجہ کے قائم ہوتے ہی دارالعلوم میں داخل کیے گئے ۔چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی روداد ۱۲۸۵ھ میں درجۂ حفظ کے اندر جن طلباء کو دکھایا گیا ہے ان میں مفتی عزیز الرحمٰن قدس سرہ کا نام بھی ملتا ہے ۔ اور ان طلبہ میں نام ہے جو نصف قرآن سے زیادہ حفظ کر چکے تھے ۔ ۱۲۸۶ھ کی روداد میں بھی درجۂ حفظ کے اندر آپ کا نام ملتا ہے ۔ ۱۲۸۶ء میں آپ نے یہیں دارالعلوم سے حفظِ قرآن پاک ختم کیا۔حفظِ قرآن میں آپ کے استاذ حافظ نامدار خان صاحب رہے ۔

فارسی ۱۲۸۸ھ سے لیکر ۱۲۹۰ھ تک کی روداد میں مفتی صاحب کا نام نہیں ملتا ہے ،

نے والدین کے ساتھ کہیں اور قیام ہو اور وہیں اپنے والدِ محترم سے ابتدائی فارسی کی تعلیم حاصل
کرتے رہے ہوں۔ ۱۲۹۱ھ کی روئداد میں درجہ فارسی میں آپ کا نام سکندر نامہ اور رقعاتِ عالمگیری
جماعت میں ملتا ہے۔ اس سال آپ نے ان کتابوں کا دارالعلوم میں سالانہ امتحان بھی دیا ہے
اچھے نمبرات حاصل کئے ہیں۔ اگلے سال ۱۲۹۲ھ میں انوار سہیلی اور چہار گلزار کی جماعت میں
شریک رہے۔ اور ۱۲۹۳ھ میں ابوالفضل نامی کتاب پڑھی اور اسی سال درجۂ فارسی سے
فراغت حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں ان کتابوں کے مدرس حضرت مولانا منفعت علی دیوبندی
رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یقیناً آپ نے بھی یہ کتابیں انہی سے پڑھی ہونگی۔

عربی | ۱۲۹۴ھ کی روئداد میں آپ کا نام دارالعلوم کے کسی درجہ میں نہیں ملتا ہے۔ ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے عربی کی ابتدائی کتابیں پرائیویٹ طور پر پڑھیں۔ ۱۲۹۵ھ
میں آپ کا نام درجہ عربی میں آتا ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس سال آپ نے کیا کتابیں
پڑھیں، اس لئے کہ سالانہ امتحان کی فہرست میں آپ کا نام درج نہیں ہے۔ جس سے
کتابوں کی تعیین ہو اکرتی ہے۔

۱۲۹۶ھ کی روئداد دارالعلوم میں آپ کا نام ابوداؤد شریف اور سبعہ معلقہ میں
ملتا ہے۔ آپ نے ان دونوں کتابوں کے سالانہ امتحان میں بھی شرکت کی ہے اور کامیابی
حاصل کر کے انعام بھی پایا ہے۔

فراغت | ۱۲۹۷ھ آپ کی تعلیم کا آخری سال ہے۔ اس سال آپ نے بہت ساری
کتابیں پڑھی ہیں۔ ان کے سالانہ امتحانات میں بھی شریک ہوئے ہیں، اور کامیابی
حاصل کی ہے۔ اس سال کی روئداد میں آپ کے نام کے ساتھ یہ کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔
میر زاہد، دیوان حماسہ، میر زاہد رسالہ مع رسالہ غلام یحییٰ، ابن ماجہ، شمائل ترمذی،
دیوان حماسہ، توضیح تلویح، تاریخ یمینی، نسائی شریف، ترمذی شریف،
مسلم شریف اور بخاری شریف

اس زمانے میں دارالعلوم کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ (م ۱۳۰۲ھ) تھے، اور کتب حدیث کا درس آپ ہی دیا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے بھی حدیث کی کتابیں مولانا موصوف ہی سے پڑھیں۔

مفتی صاحب جس سال بخاری شریف پڑھکر فراغت حاصل کر رہے تھے اتفاق سے اسی سال جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ میں سرپرست مدرسہ حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کا وصال ہو گیا شروع سے اب تک دارالعلوم کے سرپرست چلے آرہے تھے اور جنکی ذات سے دارالعلوم کو بڑا سہارا حاصل تھا آپ علم و عمل اور رشد و ہدایت کے آفتاب تھے۔ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت نانوتوی سے کچھ کتابیں یا حدیث کی کوئی کتاب پڑھی تھی یا نہیں اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی۔ مگر یہ طے ہے کہ آپ نے یقیناً حضرت نانوتویؒ کا اچھا خاصا زمانہ پایا ہے اور غالب گمان یہ ہے کہ آپ کی روحانی مجلس میں بھی وقتاً فوقتاً شریک ہوئے ہونگے اور فیض بھی اٹھایا ہوگا۔

اس ابتدائی دور میں دستور یہ تھا کہ ہر سال جو طلبا دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کرتے تھے انھیں اسی سال شعبان میں ایک جلسۂ عام کر کے دستارِ فضیلت دے دی جاتی تھی۔ مگر اس سال چونکہ بانیٔ مدرسہ کا وصال ہو گیا تھا اس لئے شعبان کا جلسۂ دستارِ فضیلت ملتوی کر کے شوال میں رکھا گیا اس سال کی روئداد میں یہ ساری تفصیل موجود ہے۔

دستار بندی

۱۷/ شوال ۱۲۹۷ھ کو یہ جلسۂ دستار بندی مدرسہ نو تعمیر والے مکان میں منعقد ہوا، جہاں اس وقت دارالعلوم کی عمارت نودرہ ہے۔ اس مکان میں یہ سب سے پہلے جلسۂ دستار بندی تھا۔ اس سے پہلے عموماً جامع مسجد دیوبند میں یہ جلسہ ہوا کرتا تھا۔

اسی جلسۂ دستار بندی میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کی دستار بندی امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۳۲۳ھ) اور دوسرے اکابر اساتذہ دارالعلوم کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

تدریس دارالعلوم اس کے بعد مفتی صاحب کو اسی سال دارالعلوم دیوبند میں بطور معین المدرسین درس و تدریس کی خدمت سپرد ہوئی۔ جسے دو سال تک آپ نے بلا معاوضہ انجام دیا۔

قیام مدرسہ اسلامیہ میرٹھ ۱۳۱۰ھ میں اساتذہ کرام کے مشورہ سے آپ باضابطہ مدرس ہوکر شہر میرٹھ کے مدرسہ اسلامیہ میں تشریف لے گئے، جہاں آپ نے مسلسل نو سال تک مختلف اونچی کتابوں کا درس دیا۔ میرٹھ شہر میں آپ کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور اطراف میں علمی شہرت ہوگئی۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی آپ کے اساتذہ آپ کی علمی و دینی خدمت سے برابر واقف ہوتے رہے۔ وطن کی نسبت سے برابر آنا جانا بھی ہوتا رہتا تھا۔

والد کی وفات ۱۳۲۵ھ میں آپ کے والدِ محترم مولانا فضل الرحمٰن کی وفات ہوگئی۔ اس طرح گھر کا سارا بار آپ پر آپڑا۔ اس لئے کہ آپ بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی شیخ الاسلام پاکستان اور مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب وغیرہ سب آپ سے چھوٹے تھے۔

نیابتِ اہتمام ادھر آپ کی علمی و عملی شہرت عام ہورہی تھی چنانچہ اربابِ دارالعلوم نے طے کیا کہ اب مفتی صاحب موصوف کو دارالعلوم میں بلا لیا جائے۔ نیابتِ اہتمام کے لئے ایک مربی قسم کے عالم کی ضرورت بھی تھی۔ ۲۷ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ کو آپ میرٹھ سے دیوبند تشریف لے آئے اور نیابتِ اہتمام کا عہدہ سنبھال لیا۔ کم و بیش ایک سال تک آپ نے نائب مہتمم کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔

دارالعلوم دیوبند میں اس وقت تک باضابطہ دارالافتاء کا شعبہ قائم نہیں ہوا تھا۔ اس اہم ضرورت کا احساس بہت پہلے سے تھا۔ اعلان بھی روئداد میں ہورہا تھا۔ مگر استفتوں کے جوابات اب تک عموماً حضرات اساتذۂ کرام ہی لکھا کرتے تھے۔

کارِ افتاء افتاء کا کام کافی پھیل چکا تھا، ضرورت کا احساس تیز سے تیز تر ہوتا جارہا تھا۔

چنانچہ ۷ ذی الحجہ سنہ ۱۳۱۰ھ کو مجلس شوریٰ نے ایک خط کے ذریعہ سرپرست مدرسہ حضرت گنگوہی کو اس طرف متوجہ کیا، اور تحریر کیا

"مفتی مقرر نہ ہونے کی وجہ سے مستفتیوں کو جواب دیر میں ملتا ہے جس سے ان کا حرج ہوتا ہے"

اس کے جواب میں ۹ ذی الحجہ سنہ ۱۳۱۰ھ کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کا یہ جواب موصول ہوا۔

"بندہ کے نزدیک مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کو اہتمام سے جدا کر کے افتاء مدرسہ و اسباق طلبہ سپرد کیے جاویں۔ اور اعانتِ مدرسین کی کریں۔ اور لاریب جواب فتویٰ دیر میں ملنے سے بسبب عدم فرصتی مدرسین کے مدرسہ کو بدنامی ہے۔ اور کام افتاء کا ایسا نہیں ہے کہ باوجود شغل درس کے اس کو کر سکے۔" (رجسٹر نقل کارروائی مجلس شوریٰ دارالعلوم)

سرپرست محترم کی اس تحریر کے بعد ارباب مدرسہ نے حضرت مفتی صاحب کو نیابت اہتمام سے سبکدوش کر کے افتاء کا کام سپرد کر دیا، اس طرح دارالعلوم میں باضابطہ شعبۂ دارالافتاء کھل گیا اور دارالعلوم کے سب سے پہلے مفتی آپ ہی مقرر ہوئے۔

کارِ افتاء کے ساتھ آپ کو اسباق بھی دیے گئے۔ آپ نے مدت العمر یہ دونوں خدمتیں انجام دیں۔ جب تک منصب افتاء پر رہے تن تنہا یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کام میں کوئی آپ کا معاون نہیں تھا۔

افتاء کے ساتھ تدریس

سنہ ۱۳۱۰ھ سے لے کر مسلسل رجب سنہ ۱۳۴۶ھ تک ۳۷ سال آپ نے دارالافتاء میں رہ کر یہ فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عموماً مشکوٰۃ شریف اور جلالین کا درس بھی دیتے رہے۔ یوں آپ نے مختلف سالوں میں مختلف کتابیں بھی پڑھائی ہیں۔ ابتدائی عربی کتابوں سے لے کر دورۂ حدیث تک کے اسباق آپ کے ذمہ رہے۔ آپ نے ان سب کا درس دیا تھا۔

تلامذہ سنہ ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۴۶ھ تک ہزاروں علماء آپ کے درس میں شریک ہوئے اور

مختلف اوقات میں مختلف کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں۔ قابلِ ذکر علماء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی (م سنہ) نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھی ہیں۔

"کافیہ، شرح جامی بحث فعل، ہدایۃ النحو، منیۃ المصلی، کنز الدقائق، شرح وقایہ شرح مائۃ عامل اور اصول الشاشی" (نقشِ حیات ص ج) حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب دیوبندی بھی آپ کے شاگرد تھے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ مفتی پاکستان نے لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت مفتی صاحب موصوف سے حدیث میں مشکوٰۃ شریف اور تفسیر میں جلالین شریف پڑھی، یہ بھی لکھا ہے

"فتویٰ کا ابتدائی کام بھی حضرت ممدوح ہی کی خدمت میں رہ کر کچھ سیکھا اور حصن حصین کو حرفاً حرفاً پڑھ کر اجازت حاصل کی" (مقدمہ عزیز الفتاوی ص ۴۲)

سوم سند | حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سے جلالین پڑھی ہے۔ اسی کے ساتھ مولانا نعمانی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے

"دارالعلوم کے اس وقت کے اکابر اساتذہ میں ایک امتیازی فضیلت حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کی یہ بھی تھی کہ ان کی سند سب سے عالی تھی ان کو صحاح ستہ وغیرہ کتب حدیث کی اجازت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ سے بھی حاصل تھی وہ حدیث میں براہِ راست حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ کے شاگرد تھے۔

(الفرقان جمادی الاول ۱۳۹۲ھ ص ۲۱)

اسی کے ساتھ اس کی بھی صراحت کی ہے کہ

"حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب علو سند کے اس امتیاز کی وجہ سے دورۂ حدیث کے بہت سے طلبہ ان سے حدیث کی خصوصی سند اور اجازت بھی لیتے تھے۔ اس عاجز کو بھی یہ

سعادت حاصل ہوئی ۔۔۔ حضرت نے شیوخ حدیث کے طریقے پر صحیح بخاری، صحیح مسلم جامع ترمذی، سننِ ابوداؤد، سننِ نسائی، سنن ابن ماجہ، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد اور امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کے اوائل ہم لوگوں سے سُنے، اور ان سب کتابوں کی اور ان کے ساتھ حصن حصین کی بھی اجازت مرحمت فرمائی، اسی صحبت میں حدیث مسلسل بالاولیتہ بھی سنائی۔ اور اس کی بھی اجازت دی" (ایضاً)

تدریس کتب حدیث وتفسیر

مولانا نعمانی مدظلہ نے یہ بھی لکھا ہے

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ منصب اور عہدہ کے لحاظ سے دارالعلوم دیوبند کے مفتی اکبر (گویا بعد کی اصطلاح میں صدر مفتی) تھے، تفسیر یا حدیث کا کوئی سبق بھی پڑھایا کرتے تھے۔"

یہ ۱۳۴۴ھ کا واقعہ لکھ رہے ہیں۔ مگر اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حدیث وتفسیر کی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھایا کرتے تھے۔ اسی طرح فارغ ہونے والے طلبہ آپ سے کتب حدیث کی خصوصی سند اور اجازت بھی حاصل کرتے تھے جیسا کہ اوپر تذکرہ گذرا۔

دارالعلوم دیوبند کے موجودہ سربراہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں۔

"مجھے یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ میں نے جلالین شریف، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد اور طحاوی شریف حضرتِ اقدس (مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ) سے پڑھی ہے۔" (فتاویٰ دارالعلوم مکمل و مدلل ص۴۴ ج۱)

ان چند اقتباسات سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابتدا عہد میں شرح وقایہ وغیرہ اور بعد میں مشکوٰۃ، جلالین شریف اور دورہ کے اسباق میں مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد اور طحاوی شریف پڑھایا کرتے تھے۔ اور جن طلبہ نے یہ کتابیں اس دور میں دارالعلوم

میں رہ کر پڑھی ہیں۔ انھوں نے یقینی طور پر آپ سے تلمذ کا شرف حاصل کیا ہے۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحب، مہتمم دارالعلوم نے آپ کے درس کے سلسلے میں لکھا ہے

"افتاء کے ساتھ درس کا شغل مستقل رہتا تھا۔ فقہ اور حدیث اور تفسیر کے اونچے اسباق آپ کے یہاں ہوتے تھے۔ بڑی بڑی باریک تحقیقات جو آپ کے ذہن رسا کی پیداوار ہوتی تھیں کبھی بھی اپنی طرف منسوب کر کے دعوی کے رنگ میں نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ بطور احتمال کے ارشاد فرماتے ۔۔۔۔ کہ اس مسئلہ میں ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے۔

(فتاویٰ دارالعلوم ج ۱ ص ۴۲)

آپ کے بھائیوں کی علمی خدمت

آپ کے دو چھوٹے بھائیوں نے بھی دارالعلوم میں رہ کر علم و فن کی خدمت انجام دی ہے۔ ایک حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی جو مشہور مدبر، فاضل اور ادیب تھے اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جو اپنے زمانے کے مایۂ ناز مفسر اور محدث تھے۔ اور پھر آپ کے فرزندِ ارجمند حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے بھی دارالعلوم میں رہ کر درس و تدریس اور افتاء کا فریضہ انجام دیا ہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے فوائد قرآن اور فتح الملہم، شرح مسلم کو جو درجہ حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اس کے علاوہ بھی دسیوں کتابوں کے آپ مصنف ہیں۔

ڈابھیل کا قیام

ایک دو سال کے لئے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دارالعلوم دیوبند سے جب علیحدہ ہونا پڑا تو آپ خانہ نشین ہو گئے اور خدمت افتاء بطور خود دینے لگے۔ مگر حضرت مولانا انور شاہ صاحب جب بیمار ہو گئے تو آپ ان کی جگہ بخاری پڑھانے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت تشریف لے گئے تھے اور حضرت محدث العصر مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جگہ ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ سے بخاری شریف کا درس دینا شروع کر دیا اور مسلسل ڈیڑھ ماہ درسِ بخاری دیا۔ پھر بعض ممبران شوریٰ کے اصرار پر ۳ جمادی الآخر ۱۳۴۷ھ کو دیوبند تشریف لائے۔ مصالحت کی

کوئی گفتگو بھی، یہاں آتے ہی طبیعت خراب ہوئی۔ ۱۰ رجمادی الثانی ۱۳۴۷ھ کو آپ نماز جمعہ کے لئے جامع مسجد دیوبند تشریف لے گئے۔ مگر وہاں سے واپس آکر صاحبِ فراش ہوگئے۔ ضعف بہت بڑھ گیا اور ایک ہفتہ بعد وفات ہوگئی۔

فتاویٰ دارالعلوم دارالعلوم دیوبند میں رہکر آپ نے جو فتوے تحریر فرمائے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۲۹ھ تک کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ البتہ ۱۳۲۹ھ سے ریکارڈ ملتا ہے۔ درمیان کے کچھ فتاویٰ غائب بھی ہیں۔ مگر دارالعلوم کے دارالافتاء میں جو حصہ محفوظ ہے اور جس کی ترتیب و اشاعت کا کام جاری ہے اس کے متعلق ریکارڈ کی مدد سے حکیم الاسلام حضرت مولانا طیب صاحب دامت برکاتہم نے جو یادداشت مرتب کی ہے اس میں لکھا ہے کہ آپ کی خدمت میں ۳۷۵۶۱ لفافے اور کاغذاتِ استفتاء آئے۔ جن کا آپ نے جواب لکھا اور اس کی نقل محفوظ ہے۔ اگر ہر لفافے اور کاغذِ استفتاء میں تین سوالات بھی فرض کر لیے جائیں تو جوابات کی تعداد ایک لاکھ بارہ ہزار چھ سو تراسی ہوتی ہے۔ اور اگر تمام سالوں کے ریکارڈ ہوتے تو خود اندازہ لگائیں کہ یہ تعداد کہاں تک پہنچتی۔ چنانچہ حضرت مہتمم صاحب نے لکھا ہے کہ

"حضرت مرحوم کے یہ صرف پندرہ سالہ فتاویٰ کی تعداد ہے جو بذیل ریکارڈ محفوظ ہے افسوس ہے کہ بائیس سالہ خدمت کا ذخیرہ سطح کاغذ پر نہیں ملتا۔ اگر اسی تناسب سے جو نقشہ بالا سے ظاہر ہے چالیس سال کا ایک سرسری اندازہ لگایا جائے۔ تو کم و بیش ایک لاکھ اٹھارہ ہزار فتاویٰ ہونے چاہئیں۔ جو حضرت کے قلم مبارک سے صفحہ قرطاس پر مرتسم ہوئے ہیں۔ اور ایک جلیل القدر مفتی کے فضائل و مناقب کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ انہوں نے ایک لاکھ اٹھارہ ہزار مقبول فتاویٰ سے عالم اسلامی کے ایمان و اسلام کی حفاظت کی جن میں سیکڑوں فتاویٰ محاکمے اور فیصلے کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔ (فتاویٰ دارالعلوم مدلل و مکمل ج ۱)

فتاویٰ کی اشاعت | موجودہ مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم کو اللہ تعالیٰ صحت و سلامتی کے ساتھ بہت دنوں زندہ رکھے کہ انھوں نے علم اور اہل علم کی جو قدر افزائی کی ہے وہ ان کا ہی مخصوص حصّہ ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کا یہ بچا کھچا قیمتی ذخیرہ یوں ہی برباد ہو جاتا اگر وہ اس کی ترتیب و اشاعت پر توجہ نہ دیتے۔ آپ نے بار بار یہ مسئلہ شوریٰ میں رکھا اور اسکی منظوری حاصل کی۔ مختلف علماء کو اس کام پر لگایا مگر التوار پر التوار ہوتا رہا۔ باوجود اس کے حضرتِ اقدس اس کام پر متوجہ رہے پھر جیسا کہ خود حضرت والا نے لکھا ہے

"بالآخر اس سلسلہ کی انتہا جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب زید مجدہ پر ہوئی۔ اور انھوں نے غیر معمولی جانفشانی اور تندہی سے لگ کر ترتیب فتاویٰ کا کام حسنِ اسلوب سے انجام دینا شروع کیا جو آج مرتب صورت میں ناظرین کے سامنے موجود ہے اور ہم اس کی طباعت و اشاعت کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ باقساط و حصص (متعدد جلدوں میں) یہ نورانی ذخیرہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے رہیں گے۔" (فتاویٰ جلد اول ص ۱ ج)

فتاویٰ پر حاشیہ کی ترتیب اور اس کا اہتمام | یہ سطریں آپ نے محرم ۱۳۸۲ھ میں لکھی تھیں جب فتاویٰ کی پہلی جلد زیر پریس جا رہی تھی۔ یہ بے شمار فتاویٰ رجسٹروں میں بکھرے پڑے تھے۔ جن میں قطعاً کوئی ترتیب نہیں تھی۔ بلکہ تاریخ وار مستفتی کے نام سے درج رجسٹر تھے۔ ان کی ترتیب کوئی آسان کام نہیں تھا اس وقت اور بھی جبکہ ان پر حواشی بھی لکھنا ضروری تھا۔ تاکہ ہر مسئلہ کا حوالہ مختلف کتبِ فقہ حدیث و تفسیر سے مع ابواب و صفحات درج ہوں۔ اور لوگوں کو مراجع کی طرف رجوع کرنے میں سہولت ہو۔ اسی نہج پر کام شروع کیا گیا۔ مرتب نے ترتیب کے سلسلے میں لکھا ہے۔

متفرق فتاوی تاریخ وار درج ہیں۔ ان میں کوئی ترتیب نہیں ہے مرتب نے کتاب باب اور فصل قائم کیا ہے پہلے ہر کتاب الگ کی گئی۔ مثلاً کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج، کتاب النکاح وغیرہ وغیرہ، پھر ہر کتاب میں مختلف ابواب قائم کئے گئے۔ جیسے کتاب الطہارۃ میں باب الوضو، باب الغسل، باب المیاہ، باب التیمم وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد ہر باب میں فصلیں قائم کی گئیں۔ مثلاً باب الوضو میں مندرجہ ذیل فصلیں قائم کرنی پڑیں۔ فصلِ اول فرائضِ وضو، فصلِ دوم سننِ وضو، فصلِ سوم مستحباتِ وضو، فصلِ چہارم مکروہاتِ وضو، فصلِ پنجم نواقضِ وضو۔ (فتاویٰ دارالعلوم ص ۲ ج ۱)

حوالجات کے سلسلے میں مرتب نے صراحت کی ہے کہ اکثر مسائل ایسے تھے جن کا حوالہ درج نہیں تھا۔ مرتب نے اپنی طرف سے حاشیہ پر مختلف کتابوں سے مع عبارت حوالہ درج کیا اور پھر اس حوالہ کی نشاندہی کتاب، باب، اور صفحہ کے نمبر کے ساتھ کی۔ کچھ مسائل ایسے بھی تھے جن کے حوالے درج تھے مگر یہ عبارت کہاں کی ہے اسکی نشاندہی نہیں تھی۔ مرتب نے محنت کرکے حاشیے پر اسکی نشاندہی بھی کی۔ عبارت میں ناقل سے اگر کوئی غلطی رہ گئی تھی تو اس کی تصحیح کی۔ مسائل میں اگر کہیں تکرار پایا جاتا تھا اسے سلیقے سے حذف کیا۔

فتاویٰ کی شائع شدہ آٹھ ضخیم جلدیں مختصر یہ کہ اس اہتمام کے ساتھ دارالعلوم نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کی اشاعت کا انتظام کیا اور یقیناً اس میں سب سے زیادہ دلچسپی حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے لی۔ اور انہوں نے ہی الحمد للہ دارالعلوم اس کام کی قدر افزائی کی۔ ورنہ اتنا لمبا علمی کام ہرگز جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ مرتب ہی جانتا ہے کہ ابتدا میں لوگوں نے کیا کچھ کہا اور اس میں رکاوٹے پیدا کرنے کی سعی کی۔

خدا کا شکر ہے کہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے فتاویٰ کی اب تک آٹھ ضخیم

جلدیں شائع ہو چکی ہیں ۔ جن کے مجموعی صفحات چار ہزار سے زیادہ ہیں ۔ اور مسائل کی تعداد چھ ہزار سے زیادہ ، اور اب تک صرف کتاب الطلاق تک مسائل آسکے ہیں ، نویں جلد بھی تیار ہے اور جلد ہی پریس جانے والی ہے ۔

فتاویٰ میں مہارت حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو افتاء میں جو مہارتِ تامہ حاصل تھی وہ کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ہے اس دور کے سارے اکابر آپ پر پورا اعتماد کرتے تھے ۔ اور جہاں کوئی الجھاؤ ہوتا آپ کی طرف رجوع کرتے تھے ۔ حضرت مہتمم صاحب تحریر فرماتے ہیں

" آپ کی افتائی مہارت اس حد تک پہونچی کہ بڑے سے بڑا مسئلہ اور معرکۃ الاستفتار کا جواب قلم برداشتہ اور بلا مراجعت کتب بے تکلف سفر و حضر میں تحریر فرما دیا کرتے تھے ۔ بڑے سے بڑا اہم فتاویٰ جنکو مرتب کرنے میں اگر آج کے مفتی اور ماہر علماء مشغول ہوں تو مراجعت کتب کے بعد بھی شاید دنوں اور ہفتوں کی سوچ و چار کے بعد بھی فتویٰ کا وہ سہل عنوان اختیار نہ کر سکیں گے جو حضرت ممدوح قلم برداشتہ اس طرح بے تکلف لکھ جاتے تھے ۔ جیسے روزمرہ کی معمولی باتیں ڈائری میں لکھی جاتی ہیں ۔ چالیس سال آپ نے دارالعلوم کے دارالافتاء کی خدماتِ جلیلہ انجام دیں اور اس دور میں سیکڑوں ہی ایسے اہم اور مشکل فتاویٰ بھی سپرد قلم فرمائے ۔ جو نہ صرف فتویٰ بلکہ معرکۃ الآراء مہمات میں محاکمہ کی حیثیت رکھتے تھے ۔ اور صرف چند گھنٹوں میں ... نصوص فقہیہ اکثر و بیشتر حفظ و یادداشت سے تحریر فرما دیتے تھے ۔ جن میں فرق نہیں نکلتا ... افتائی حکم نہایت جچا تلا ، اور حشو و زوائد سے پاک مدلل مختصر و جامع ہوتا تھا " (فتاویٰ دارالعلوم جـ ۱ ص)

اس میں کون ذی علم شبہ کر سکتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب موصوف میں یہ ساری خوبیاں تھیں جن لوگوں نے حضرتِ والا کے فتاویٰ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کی تائید کریں گے ، پھر اس

کے ساتھ بڑی خوبی یہ ہے کہ زبان صاف اور شگفتہ، اندازِ بیان سادہ اور سلیس، عامی سے عامی آدمی اسے سمجھ لے۔

حالات کی رعایت

عرف زمانہ کو سامنے رکھکر آپ فتویٰ دیا کرتے تھے۔ اسی طرح حالات اور تقاضائے وقت کا بھی لحاظ و پاس ہوتا تھا۔ اگر کسی مسئلہ میں دو قول ہیں تو عوام کو سامنے رکھکر سہل پہلو پر فتویٰ دیتے تھے۔ کیونکہ علماء نے اس کی صراحت کی ہے۔

وفی عدۃ الاحکام من کشف البزدوی یستحب للمفتی الاخذ بالرخص تیسیرا علی العوام مثل التوضی بماء الحمام و الصلوۃ فی الاماکن الطاھرۃ بدون المصلیٰ (عقد الجید ص۴۳)

کشف بزدوی میں ہے کہ مفتی کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ رخصتوں کو اختیار کرے تاعوام کو سہولت حاصل رہے جیسے غسل خانہ کے پانی سے وضو کرنا اور پاک جگہ پہ بلا جائے نماز، نماز ادا کرنا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) تحریر فرماتے ہیں۔

ینبغی للمفتی ان یاخذ بالایسر فی حق غیرہ خصوصاً فی حق الضعفاء لقوله علیه السلام لابی موسیٰ الاشعری و معاذ حین بعثهما الی الیمن لیسّرا ولا تعسّرا۔ عقد الجید ص۷۸

مفتی کے لئے مناسب یہ ہے غیر کے حق میں جو سہل تر ہو اسے اختیار کرے بالخصوص کمزوروں کے حق میں اس لئے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت معاذ کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تھا تو فرمایا دونوں آسانی فراہم کرنا مشقت ڈالنے کی کوشش نہ کرنا

فتاویٰ کی شگفتگی

اس طرح حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جواب کم سے کم جملوں میں واضح سے واضح تر ہوتا تھا اور دو ٹوک فیصلہ کن۔ اس میں اگر مگر یا تذبذب کو قطعاً راہ نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ علمائے امت نے لکھا ہے۔

لایجوز للمفتی تخییر المسائل	مفتی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ مسائل کو
والقاءہ فی الاشکال والحیرۃ	اشکال اور حیرت میں ڈالدے بلکہ اس کا
بل علیہ ان یبین بیاناً شافیاً	فرض ہے صاف ستھرا جواب لکھے جس
مزیلا للاشکال ..... کافیافی	سے اشکال ختم ہو جائے۔ اور مقصود کے
حصول المقصود (اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۲۲)	حاصل ہونے کے لئے کافی ہو۔

موصوف کی بڑی خوبی یہ ہے سوال پڑھکر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ سائل کس درجہ کا ہے اور پھر جواب اسی انداز کا تحریر فرماتے ہیں۔ ایک ہی طرح کے سوالات میں کسی کو بالکل مختصر جواب دیتے ہیں کہ اسکا یہ حکم ہے اور کسی کا جواب مفصل و مدلل لکھتے ہیں۔ تاکہ کوئی علمی اشکال باقی نہ رہ جائے عوام کے لئے حکم بتادینا کافی ہوتا اور وہ اسی سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ مگر علماء دلائل کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

مفتی صاحب کا دستور یہ بھی رہا ہے کہ آپ ہمیشہ مفتیٰ بہ قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔ اس باب میں نہ ابن الھمام کی رائے پر عمل کرتے ہیں۔ نہ مجدد صاحب کے قول پر نہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے قول پر، چنانچہ ایسے موقع پر صراحت فرمادیتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہ کے مقلد ہیں کسی اور کے نہیں۔ اور مفتیٰ بہ یہ قول ہے وہ ایک خاص شخص کا رجحان ہے۔

ایک شخص پوچھتا ہے کہ غیر ملک سے مال تجارت منگوانے میں ناگزیر طور پر قیمت سے زیادہ رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ جیسے بنیک کا سود تو تجارت بند کردی جائے یا باقی رکھی جائے۔ آپ جواب میں لکھتے ہیں تجارت جاری رکھی جائے اور جو زائد رقم لی جاتی ہے اسے آپ اصل قیمت میں داخل سمجھ کر ادا کریں۔

مفتی صاحب کا دل چونکہ روشن تھا اس لئے دماغ، ذہن اور حافظہ کبھی خیانت نہیں کرتا تھا۔ اور ذہن و فہم ہمیشہ درستگی ہی کی طرف جاتا تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم آپ کے جو فتاویٰ شائع کر رہا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے قبولِ عام کی دولت سے نوازا ہے۔ اس دس سال میں فتاویٰ

کے تین اڈیشن آچکے۔ آج کسی مفتی اور عالم کی الماری فتاویٰ کی ان جلدوں سے بحمداللہ خالی نظر نہیں آئے گی۔

ارشاد وبیعت

حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحب قدس سرہ جہاں ایک بڑے عالم، فقیہ اور مفتی تھے۔ وہیں ایک مرشد، مربی، مصلح اور باطنی امراض کے حکیم بھی تھے۔ جہاں تزکیۂ باطن، تصفیہ قلب اور خشیتِ الٰہی حاصل ہوتی تھی۔ آپ سے بہت سے علمائے امت نے یہ دولت پائی۔ اور بہت سے عوام کی آپ کے ذریعہ اصلاح باطن ہوئی۔

ظاہری تعلیم سے فراغت کے بعد ہی آپ باطن کو آراستہ کرنے پر متوجہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ رب العالمین نے وافر دولت سے نوازا اس دور میں علم کے ساتھ عمل کا بڑا چرچا تھا۔ دیوبند اور اس کے اطراف میں بکثرت اہل اللہ پھیلے ہوئے تھے۔ خود دارالعلوم کے متعلق مشہور تھا کہ اس کا دربان بھی صاحب نسبت ہوا کرتا تھا۔ علماء اور اساتذہ کا تو کہنا ہی کیا۔

ایک درخواست

عارف باللہ، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن عثمانی قدس سرہ مفتی اول دارالعلوم دیوبند کی سیرت وسوانح پر رفیق ندوۃ المصنفین دہلی مولانا محمد ظفیرالدین صاحب (مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) نے خدا کا نام لیکر کام شروع کر دیا ہے۔ ان کا ایک مقالہ "برہان" دہلی میں آرہا ہے۔ اس سلسلہ میں ناظرین سے درخواست ہے کہ جن حضرات کے پاس حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے خطوط یا کوئی قلمی تحریر ہو یا کچھ ضروری حالات معلوم ہوں وہ براہ کرم مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (یوپی) کے نام خطوط وغیرہ کی نقلیں یا اصل خطوط و تحریر روانہ فرمائیں۔ اور حالاتِ زندگی قلمبند کرکے بھیجیں۔ ایسے حضرات کے ندوۃ المصنفین دہلی اور اس کے منتظمین شکرگذار ہونگے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کی نو مجلد جلدیں مع حواشی دارالعلوم دیوبند سے شائع ہو چکے ہیں اور ملک و بیرون ملک اہلِ علم اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

منیجر
ندوۃ المصنفین دہلی ۶

اردو کا ارتقاء تراجم قرآن کے آئینے میں

از حافظ مولانا محمد اسرائیل صاحب فرحت قاسمی رفیق دائرۃ الرشید جامعہ عربیہ اشرفیہ نیا بھوجپور

(قسط اوّل)

دنیا کی ترقی یافتہ اور علمی زبانوں میں اردو زبان نسبتاً جدید ہوتے ہوئے بھی اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے اقوام عالم کے دلوں پر اپنا سکہ بٹھا چکی ہے۔ اردو کی پیدائش عہد مغلیہ میں ہوئی ہندی سنسکرت، عربی، فارسی، اور ہندوستان کی کئی دوسری زبانوں کے اختلاط سے جو ایک نئی زبان وجود میں آئی اس کا نام اردو رکھا گیا۔ اردو بمعنیٰ فوج کے ہے۔ فوج میں چونکہ ملک کے ہر گوشہ کے لوگ اور ہر مذہب کے ماننے والے ہوتے تھے۔ مگر ایک صوبہ والے کی زبان دوسرے صوبہ کے لوگ نہیں سمجھ پاتے تھے۔ اس صورت حال کے پیش نظر فوجیوں کے درمیان ایک ایسی زبان کی داغ بیل پڑی جسے بلا تفریق مذہب ملت سب ہی سمجھیں اور بولیں۔ اور اس ضرورت کو صرف اردو ہی پورا کر سکتی تھی۔ اردو کا مولد و منبع فوج ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر کسی طرح کی تفریق کے بغیر جو تنظیم، جو قوت اور جو وحدت فوج میں ہونی چاہئے وہ تمام تر خصوصیات اس زبان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس کے بولنے والے، ہندو مسلمان سکھ عیسائی، پارسی اور ملک کی تمام قومیں ہیں۔ اس کی رگوں میں پورے ملک کا خون دوڑ رہا ہے۔ اردو زبان میں علم و ادب کا جو سرمایہ محفوظ ہے وہ اس حقیقت کی ایک تاریخی شہادت اور دستاویز ہے۔

آج اردو جو صرف ہندو پاک ہی میں نہیں بلکہ عرب و عجم کے ہر ملک میں کم و بیش بولی اور

سمجھی جاتی ہے۔ اور موجودہ ہیئت و شکل یک وقت حاصل نہیں ہوئی بلکہ یوم تاسیس سے لیکر آج تک کئی ادوار گذر جانے اور اہلِ اردو کی علی الترتیب مساعی کا فیضان ہے۔ علماء، فضلا ادبا، شعراء کی مخلصانہ خدمات کا نتیجۂ نیک ہے جو اردو اپنے اس مقام پر نظر آرہی ہے جس مقام پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ اور علمی زبانیں فائز ہیں۔

پیشِ نظر مقالہ کے اندر اردو کا "تدریجی ارتقا" دوسرے اصنافِ ادب کی طرح سے پیش کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ مختلف ادوار میں قرآن حکیم کے جو اردو ترجمے ہوئے۔ اور ہر مترجم نے اپنے دور کے معیار کے مطابق جو اسلوب اور جو اندازِ بیان اختیار کیا اسی کے آئینہ میں اردو کی شکل و ہیئت کو پیش کرنا مقصود ہے۔

قرآن پاک کی عربی فارسی اور چند اردو تفاسیر و تراجم کی تعداد سے متعلق تفسیر خلیلی کے مقدمہ میں نواب صدیق حسن خاں صاحب نے لکھا ہے کہ تیرہ ۱۳ سو سے زیادہ تفاسیر و تراجم ایک تک منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔

قرآنِ پاک کے اردو مترجمین کی ایک طویل فہرست ہے۔ جنہوں نے ترجمہ و تفسیر کے ذریعہ ایک دینی و ملی فریضہ کو انجام دیا ہے۔ لیکن ضمنی طور پر زبان و ادب کی بھی بہت کچھ خدمت کی ہے اور اسکی تحقیق و جستجو میں عمر کا کافی حصہ صرف کیا ہے۔ یہاں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب قرآن پاک کا ترجمہ کر رہے تھے۔ جب وہ سولھویں پارے پانچویں رکوع میں پہونچے جہاں حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر ہے۔ جب ان کے دامنِ عفت پر لوگوں نے چھینٹا ڈالنا چاہا اور ان سے حضرتِ مسیح کی ولادت کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا "کُنتُ نَسیًا مَّنسِیًّا" حضرت شاہ صاحب موصوف نسیا منسیا کی اردو تلاش کرنے لگے۔ اپنے طور پر ہر چند انھوں نے تحقیق و تفتیش کی مگر تشفی نہ ہوئی۔

اس کیلئے انھیں سخت پریشانی و فکر لاحق تھی۔ کئی روز گذر جانے پر وہ ایک دن گھر سے نکلے پڑوس کے ایک مکان کے سامنے ایک گوالن کسی سے جھگڑے کے انداز میں کہہ رہی

ؤ میں اس معاملہ میں بالکل بھولی بسری ہوں۔ حضرت شاہ صاحب نے سنا تو ان کے دل کی
رھائی کلی کھل گئی۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب نے اسکا یہی ترجمہ فرمادیا۔ مزید فرمایا کہ اگر قرآن
پاک اردو میں نازل ہوا ہوتا تو "نسیا منسیا" کی جگہ پر "میں بھولی بسری ہوں" کے علاوہ دوسرا
وئی لفظ موضوع نہیں ہوتا۔ حالانکہ اکثر مترجمین نے اسکا ترجمہ اسی لفظ سے کیا ہے یعنی حضرت
ریم نے فرمایا میں "نسیا منسیا" تھی۔

اس طرح قرآنِ مجید کے مفسرین یا مترجمین نے نہ صرف دینی خدمات انجام دی ہیں بلکہ گیسوئے
اردو کے سودائی بنکر اس کی مشاطگی کی ہے۔ اس کے بنانے اور سنوارنے میں ایک اہم کردار ادا
لیا ہے۔ ذیل کی سطروں میں ہم قرآنِ مجید کے تراجم کے آئینے میں اردو کی تدریجی ترقی اور اس کی
ترویج و اشاعت کا جائزہ لیں گے۔

زیرِ نظر موضوع اپنی وسعت و ہمہ گیری کے لحاظ سے اس بات کا متقاضی ہے کہ مختلف ادوار
یں قرآنِ پاک کے جو ترجمے ہوئے یا تفسیریں لکھی گئیں اس کے امثلہ و نظائر کی روشنی میں بحث کرتے
ہوئے سنہ وار آیاتِ قرآنی کا ترجمہ پیش کیا جاتا مگر واحسرتا کہ شروع سے اب تک جتنے اردو
ترجمے ہوئے، وہ کل دستیاب نہ ہوسکے۔ جس کے سبب سے اس مقالہ کے تشنہ رہ جانے
کا قوی اندیشہ ہے۔ مزید تاسف اس امر پر ہے کہ ذیل کی سطریں لکھتے وقت اٹھارہ تراجم و
تفاسیر میرے سامنے ہیں۔ مگر ایک دو کے علاوہ کسی پر سنہ تصنیف یا سنہ طباعت نہیں —
جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ کس سنہ میں کیا گیا۔ پھر یہ بات بھی ذہن کے گوشہ میں خلش
پیدا کر رہی ہے۔ کہ کئی صدیوں کے بعد اگر اس نقطۂ نظر سے قرآن پاک کے تراجم کا جائزہ
لیا جائے تو سنہ کے نہ ہونے کے باعث ادوار کی تقسیم میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا
اس سے بھی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کسی ترجمہ میں مترجم کا نام تک حذف کر دیا گیا ہے۔ لیکن
بہرحال جو کچھ بھی دستیاب ہوا اس کے پیش نظر کوشش کی جائے گی کہ ان سطور کے مطالعہ
سے اردو کی تدریجی ترقی کا ایک خاکہ ناظرین کرام کے ذہن میں آجائے۔

اردو زبان کے وجود میں آنے کے بعد سب سے پہلے شاعروں نے اپنی جولانئ طبع کے جوہر دکھانے شروع کیے۔ پھر بہت دنوں کے بعد نثاروں نے نثر نگاری سے اردو کی ترویج و اشاعت کا کام آگے بڑھایا اور اس جدوجہد اور پیہم کد و کاوش پر تقریباً دو سو سال کا زمانہ گزر گیا۔ اور اٹھارہویں صدی کے وسط تک اردو نثر اپنے ابتدائی دور میں تھی۔ اس کے بعد تدریجاً اس لائق ہوئی کہ اس میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا جائے۔ آج سے دو سو سال قبل حضرتِ شاہ مراد اللہ انصاری (نور اللہ مرقدہ) نے سب سے پہلے قرآنِ پاک کا ترجمہ کیا۔ اردو کے مشہور اہلِ قلم مولانا سید محبوب رضوی" دیوبند نے بڑی عرق ریزی سے اس کا سراغ لگایا ہے کہ شاہ مراد اللہ صاحب، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے ہمعصر تھے۔ وہ نسلاً انصاری مشرباً قادری نقشبندی، مسلکاً حنفی اور وطناً سنبھلی تھے۔ تاریخ کی یہ ستم ظریفی ہے کہ وہ گوشۂ گمنامی میں پڑ گئے۔ شاہ مراد اللہ صاحب صرف قرآنِ مجید ہی کے جید عالم نہ تھے۔ بلکہ موجودہ ترقی پذیر اردو کا سنگِ بنیاد بھی رکھنے والے تھے۔ ان کی امتیازی حیثیت کو اردو نثر کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

شاہ مراد اللہ کے پندرہ سال بعد حضرت شاہ رفیع الدین صاحب اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآنِ مجید کا ترجمۂ اردو کیا۔ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب نے ۱۷۸۶ء اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے ۱۷۹۰ء میں ترجمہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ عام طور پر ان دونوں میں حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا ترجمہ پہلا ترجمہ مانا جاتا ہے۔ اگرچہ علمائے تاریخ کے درمیان یہ مسئلہ متنازع فیہ ہے کہ شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا ترجمہ تقدمِ زمانی رکھتا ہے یا شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا۔

بہرحال اردو کا سنگِ بنیاد پندرہویں صدی میں پڑ چکا تھا۔ اور اس ابتدائی دور کے جو نمونے ملتے ہیں وہ آج مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں جیسے "سب رس" کے مصنف ملا وجہی کی ایک نثر کا نمونہ مندرجہ ذیل ہے۔

"جالو بہشت میں کا نقرہے - سطر سطر پہ برستاہے نور - ہر ایک بول ہے ایک حور - اس سے پڑھ کر جتے حفظ پایا جالو وہ بہشت میں آیا - یہاں خدائی بولنا راج ہے - جگوئی باٹ ہماری چلیا ہر چند فہم داری ہے چلیا تو کیا ہوا باٹ ہماری ہے -"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں -

"تُو بی ایک حرام خوری ہے - نمک پر حرام اس کا کیا رہیگا - خام جسے انسان کی ہین کت اسے دل کا ذبیح انپڑلی لت جنے انصاف چھپایا - اس دل کو یہ دل کیا کام گنوایا - حاجت میں جگوئی کرے زبان پس کون آپے کیا نقصان اگر تجھے فہم دار اپنی دھکنے کو مار - یو بات دل میں رکھ مرداں کی یادگار جن نے دل کو چلایا ان نے خدا کو پایا -"

یہ بالکل ابتدائی نمونہ ہے اور اس طرح کے ادبی نمونے تاریخ ادب کے صفحات میں ملتے ہیں - لیکن اس طرح کی نثر نگاری اور دوسرے اصنافِ ادب کے قطع نظر ہمیں صرف ترجمۂ قرآن پاک کے آیئنے میں اردو کی ترویج و اشاعت کا جائزہ لینا ہے - پچھلی سطروں میں یہ گذر چکا ہے کہ شاہ مراد اللہ صاحب سب سے پہلے مترجم ہیں - انھوں نے اردو میں ترجمۂ قرآن پاک کی طرح ڈال کر ایک ایسا نمونہ پیش کیا جس نے بعد کے مترجمین کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیا - یہ ترجمہ اس وقت لکھا گیا جب اردو علمی تصنیف سے بالکل ہی دامن تھی اس زمانہ میں اردو بول چال کی زبان تو تھی - شعر و شاعری بھی ہوتی تھی - مگر نثر نگاری بالکل ابتدائی حالت میں تھی - اور جو کچھ بھی تھی وہ قافیہ کی قید و بند میں گرفتار -

مولانا شاہ مراد اللہ صاحب رح

اردو ادب کی اس مختصر تاریخ کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اٹھارھویں صدی کے وسط میں اردو ترجمہ کا آغاز ہوا -

شاہ مراد اللہ صاحب سب سے پہلے اردو مترجم ہیں - انھوں نے پورے قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا اور تفسیر بھی لکھی - مگر وہ نایاب ہو چکا ہے - صرف تیسویں پارے کا ترجمہ جامعہ عربیہ اشرفیہ نیا بھوجپور دبھان کے کتب خانہ میں ایک نسخہ ہے - اور اسی کے حوالے سے یہ ترجمہ

تین کیا جارہا ہے۔ شاہ صاحب کی یہ تفسیر ۱۱۸۱ھ میں مکمل ہوگئی تھی۔ (۱)۔ سورۂ فاتحہ
...ب کا تحت اللفظ ترجمہ شاہ صاحب نے یہ کیا ہے۔

"سب تعریف اللہ کو ہے جو سارے جہان کا بہت مہربان نہایت رحم والا مالک
انصاف کے دن کا۔ تجھی کو ہم بندگی کریں اور تجھی سے مدد چاہیں۔ چلا ہم کو راہ سیدھی۔
راہ ان کی جن پر تو نے فضل کیا اور نہ جن پر غصہ ہوا۔ اور نہ بہکنے والے"

سورۂ عصر کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

والعصر: قسم ہے عصر کے زمانے کے پیدا کرنے والے کی۔ قسم ہے زمانے کی کیا کیا باتیں کس کس طرح کی حقیقتیں کیا کیا خوبیاں زمانے میں پیدا ہوئی ہیں۔ سوگند عصر کے وقت کی نماز کی یہ بہت بڑی نماز ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا ہے جس کسی کی نماز فوت ہوئی جاتی رہی ایسا نقصان ہوا اس کا جیسے کسی کا اہل و مال غارت ہوا لٹ گیا۔

سورۂ کوثر کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ: تحقیق ہم نے دیا تیرے تئیں یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بخشا تجھ کو بہت کچھ ہر ایک طرح کی خیر خوبی کی زیادتی۔ دنیا میں آخرت میں اولاد کی بہتایت ظاہر کی اولاد باطن کی اولاد سب پیغمبروں کی امت سے تیری امت کی بہتایت سب خلق کے علم سے تیری علم کی زیادتی۔ سب کے عمل سے تیرے عمل کی بہتایت سب عمل کے ثواب سے تیرے عملوں کے ثواب کی بہتایت۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے پیچھے زمین میں آسمان میں تیری یاد کی تیرے ذکر کی مذکور کی بہتایت دونوں جہان میں تیرے دوستوں کی بہتایت

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ شاہ مراد اللہ صاحب نے نہ صرف ترجمہ و تفسیر کا حق ادا کیا بلکہ اردو زبان کو کس قدر فصاحت و سلاست کے ذریعہ سے آراستہ کیا۔ یہ نمونے دو سو سال سے زائد کے ہیں۔ جب اردو بالکل ابتدائی منزل میں تھی۔ اس

طرح اردو کی جو خدمت انھوں نے انجام دی۔ وہ تاریخ ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۲) حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ | حضرت شاہ مراد اللہ صاحب کے بعد حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ کا زمانہ آتا ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمہ کا نمونہ یہ دوسرا پارہ دوسرا رکوع :۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا	پس یاد کرو مجھکو میں یاد کروں گا تمکو اور شکر
تَكْفُرُونِ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا	کرو واسطے میرے اور مت کرو کفر۔ اے لوگو!
بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ	جو ایمان لائے ہو۔ مدد چاہو ساتھ صبر کے
وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ	اور نماز کے۔ تحقیق اللہ ساتھ صبر کرنے والوں
بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ	کے ہے اور مت کہو واسطے ان لوگوں کے کہ
بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ	مارے گئے بیچ راہ اللہ کے مردے بلکہ زندہ
وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝	ہیں اور لیکن نہیں سمجھتے تم۔ اور البتہ آزمائیں
	گے تم کو ہم ساتھ ایک چیز کے ڈر سے اور بھوک
	سے اور کمی مال کے سے اور جان کے سے اور میووں
	کے سے اور خوشخبری دے صبر کرنے والوں کو۔

سورۂ بقرہ کی آخری آیت :۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ	نہیں دیتا اللہ تکلیف کسی جی کو مگر طاقت اس کی واسطے
عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ	اسکے ہے جو کمایا اس نے اور اوپر اسکے ہے جو کمایا اس نے
نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا	اے رب ہمارے مت پکڑ ہمکو اگر بھول گئے ہم یا چوک
كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا	گئے ہم اے رب ہمارے اور مت رکھ اوپر ہمارے
مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا	بوجھ جیسا رکھا تو نے اسکو اوپر ان لوگوں کے کہ پہلے

أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝　　ہم سے تھے۔ اے رب ہمارے اور مت اٹھو! ہم سے وہ چیز کہ نہیں طاقت واسطے ہمارے ساتھ اسکے اور معاف کر ہم سے اور بخش ہمکو اور رحم کر ہمکو تو ہے دوست

ملا ہمارا مدد دے ہمکو اوپر قوم کافروں کے۔

(۳)۔ **مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ** | حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے ترجمہ کا نمونہ جو ۱۷۷۶ء اور ۱۷۹۰ء کے درمیان کیا گیا ملاحظہ کرنے کے بعد ان ہی مذکورہ دونوں آیتوں کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس طرح کیا ہے۔

دوسرا پارہ دوسرا رکوع

فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ الخ	پس یاد کرو تم مجھکو یاد کرونگا تم کو اور شکر کرو واسطے میرا اور نہ کفر کرو مجھ سے اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ مدد چاہو ساتھ صبر اور نماز کے تحقیق اللہ ہے ساتھ صبر کرنیوالوں کے اور مت کہو واسطے ان لوگوں کے جو مارے جاتے ہیں بیچ راہ اللہ کے کہ مردے ہیں بلکہ جیتے ہیں یعنی زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے اور البتہ آزمائیں گے ہم تمکو ساتھ ایک چیز کے ڈر سے اور بھوک سے اور کمی مالوں کے سے اور جانوں کے سے اور میووں کے سے اور بشارت دے صبر کرنے والوں کو۔

سورۂ بقرہ کی آخری آیت :۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا　　نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی جی کو مگر طاقت اس کی پر واسطے اس کے ہے جو کمایا اسنے

وُسْعَهَا ... الْكٰفِرِيْنَ ۝　　اور اوپر ہے جو کمایا اس نے اے رب ہمارے مت پکڑ ہم کو اگر بھول گئے ہم اور چوک گئے ہم اے رب ہمارے اور مت رکھ اوپر ہمارے بوجھ جیسا رکھا تو نے اسکو اوپر ان لوگوں کے کہ پہلے ہم سے تھے اے رب ہمارے اور مت اٹھوا ہم سے وہ چیز کہ نہیں طاقت واسطے ہمارے ساتھ اسکے اور معاف کر ہم سے اور بخش ہمکو اور رحم کر ہمکو تو ہے دوست دار ہمارا پس مدد دے ہمکو اوپر قوم کافروں کے

مذکورہ بالا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر کے ملاحظہ سے بخوبی طور پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے ترجمے کی زبان ایک عصر سے متعلق ہے تاہم کہیں کہیں الفاظ کا سیاق و سباق اور تغیر و تبدل ہے۔ چونکہ یہ دونوں مترجم ہمعصری ہی نہیں بلکہ سگے بھائی اور خانوادۂ ولی اللہی کے چشم و چراغ تھے یہ دونوں حضرات عام طور پر قرآن کے پہلے مترجم مانے جاتے ہیں۔ ان دونوں کا زمانہ اٹھارھویں صدی کے وسط سے ۱۷۹۰ء کے درمیان ہوا کے بعد تقریباً بیس برسوں کے درمیان کا کوئی ترجمہ باوجود سعی بلیغ کے نہیں مل سکا جس سے انیسویں صدی کی ابتدا سے ۱۸۱۰ء تک اردو کا جو معیار

خلیفہ عبداللہ بن المعتز عباسی شہید

۲۴۶ھ / ۸۶۰ء — ۲۹۶ھ / ۹۰۸ء

از جناب مولانا الحاج محمد ابرار حسین فاروقی گوپاموی۔ ایم۔ اے (علیگ)

خلافتِ عباسیہ کا آغاز خلافتِ عباسیہ کا سنگِ بنیاد ۱۳۲ھ / ۷۴۹ء میں السفاح عباسی خلیفہ اول کے ہاتھوں بغداد (عراق) میں رکھا گیا۔ اور ۶۵۶ھ / ۱۲۰۸ء میں اڑتیسویں اور قبل بعض سینتیسویں خلیفہ معتصم باللہ بن مستنصر باللہ کی شہادت پر یہ مستحکم ایوانِ خلافت تار تار ہو گیا۔

حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے جس سوز سے شہادت پر مرثیہ لکھا اس کا مطلع ذیل پورے مرثیہ کا نچوڑ ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

آسماں را حق بود گر خوں بہ بارد بر زمیں — بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین

بہرحال اس (۵۲۴) سال کے طویل زمانے میں دودمانِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے بڑے جلیل القدر سلطنت داں، بہادر اور فاضل ابن خلیفہ پیدا کیے جن کی حکمرانی نے دنیا کی حکومتوں کی رہنمائی کی۔ جو خلیفہ تختِ خلافت پر متمکن ہوا وہ اپنے ساتھ نئی اور مفید خصوصیات لایا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان سے لغزشیں بھی ہوئیں۔ جن کو ان کی بشریت پر محمول کیا جائے یا سیاست پر۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ عہدِ عباسی نے جو علمی، اجتماعی۔ معاشرتی۔ تمدنی۔ ثقافتی۔ سیاسی اور اقتصادی اصلاحیں کیں وہ آج تک قوموں کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔

خلفاء عباسیہ کی تاریخ اگر ایک طرف (۴۷) سالہ طویل ترین عہدِ خلافت ناصر الدین اللہ کا پیش کرتی ہے۔ جو ۵۷۵ھ / ۱۱۷۹ء تا ۶۲۲ھ / ۱۲۲۵ء حکومت کی تو دوسری طرف صرف (۲۴) گھنٹہ کا عہدِ خلافت خلیفہ ابن المعتز کا بھی پیش کرتی ہے۔ جو یقیناً قلیل ترین عہد ہے اسی قلتِ عہد نے اسکو سیاسی تاریخوں میں جگہ نہیں لینے دی۔

خلافت ابن المعتز

اس خلیفہ کا نام ابو العباس عبداللہ بن المعتز تھا۔ یہ تیرھویں[13] خلیفہ ابو عبداللہ المعتز کا بیٹا اور دسویں خلیفہ متوکل علی اللہ کا پوتا تھا۔ اگر مورخین اس کی یک شبانہ روزہ خلافت کو خلافت مان کر اسے خلفاء کی صف میں آنے کی اجازت دیں تو یہ اُنیسویں شمار میں آتا ہے۔ اور اس طرح سے خلافتِ عباسیہ کی آخری کڑی کا شمار اڑتیسواں[38] ہوگا۔ سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ سترواں خلیفہ مکتفی باللہ بن معتضد باللہ بستر مرگ پر خلافت کے آخری سانس لے رہا ہے۔ اس کا بیٹا مستکفی باللہ ابھی شیر خوار ہے۔ اس لئے دستور عباسیہ کے اعتبار سے خلیفہ کے چھوٹے بھائی ابو الفضل جعفر مقتدر باللہ بن معتضد باللہ کے نام قرعہ خلافت پڑنا چاہئے۔ لیکن وہ اتنا کم سن تھا کہ خلافت یا حکومت ہی کے معاملات سے نا آشنا تھا۔ اس لئے ارباب بست وکشاد حکومت میں انتخاب جانشین پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اختلاف آرا نے دو فریق بنا دئے۔ ایک مقتدر باللہ کا حامی دوسرا ابن المعتز کا مددگار۔ عباس بن حسن وزیر اعظم۔ اختلاف آرا کی وجہ سے انتخاب خلیفہ میں مذبذب ہو چکا تھا۔ اس لئے کہ حامیانِ ابن المعتز اسکی علمی فضیلت۔ اسکی اعلیٰ قابلیت اور ذکاوت کو شفیع بنا کر اسکو خلافت کے لئے نامزد کر رہے تھے۔ دوسرا گروہ مقتدر باللہ کی کمسنی اور ناسمجھی سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے وزیر اعظم کو اسکے انتخاب پر مجبور کر رہے تھے۔ جب انتخاب کی گتھی میں الجھاؤ زیادہ ہو گیا تو وزیر اعظم نے اپنے نائب ابن العزات ابو الحسن سے اس مسئلہ میں استصواب کیا۔ اگرچہ وہ اس استصواب کا منتظر تھا لیکن پہلے تو بمصالح رائے ظاہر کرنے سے گریز کیا تاکہ طرفداری کا گویا ملزم نہ بنے لیکن وزیر اعظم کے

اصرار پر اس نے اپنے دل کی بات ظاہر کر ہی دی لیکن پھر بھی وضاحت سے گریز کرتے ہوئے اشاروں اور کنایوں سے اپنے منشا کو اس نے اسطرح سے ظاہر کیا۔

"اللہ سے ڈریے اور یہ خدمت اس کے سپرد نہ کیجئے جو ایک کے گھر سے واقف ہو۔ دوسرے کی نعمت سے۔ تیسرے کے نام سے۔ چوتھے کی لونڈی سے۔ پانچویں کی پونجی سے اور چھٹے کے کھوٹے سے۔ جو گوں سے میل جول رکھے۔ اور لوگ اس سے جو معاملہ تھا وہ چونکہ بھی ہوئے کنایہ میں اس طرح عرض کرکے اس نے فوراً :-

"ناتجربہ کار اور کم فہم مقتدر باللہ کا نام پیش کر دیا۔"

چونکہ مقتدر باللہ کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی۔ اس لیے وزیر اعظم نے اسکی کم سنی کا عذر کیا۔ جو یقیناً بجا تھا۔ لیکن نائب ابن الفرات ابوالحسن بھی تو اس سے ناواقف نہ تھا بلکہ یہی تو وجہ تھی جس نے اسکو مقتدر کی حمایت اور ابن المعتز کی مخالفت پر (جو بطور کنایہ تھی) آمادہ کیا تھا۔ بہرحال وزیر اعظم کا جواب سنکر ابن الفرات سمجھ گیا کہ وزیر اعظم پر اس اشارہ اور کنایہ کا جادو نہ چلا تو آخر کار اس نے صاف صاف کہدیا۔[۱]

"جناب اگرچہ وہ بچہ ہے مگر ہے مقتدر باللہ ہی کا بیٹا حکومت ایسے کو نہ دیجئے جو ہماری پونجی سے واقف ہے اور ہم پر خود مختارانہ حکومت کرے بلکہ ایسے کو حکمراں بنائیے جو آپ پر ہی سارا کاروبار چھوڑ دے۔"

مکتفی باللہ کی وفات اور مقتدر کا انتخاب

ابن الفرات کا مشورہ بھلا وزیر اعظم کو کیوں نہ بھاتا۔ مکتفی باللہ کے مرتے ہی فوراً طفلانہ انتخاب عمل میں آگیا اور مقتدر باللہ کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔

اس اعلان کے ہوتے ہی مخالف جماعت اٹھ کھڑی ہوئی جس میں نہ صرف حکام شہر تھے بلکہ افسران فوج بھی تھے۔ یہ سب ابن المعتز کے حامی اور مقتدر باللہ کے انتخاب کے یکسر مخالف تھے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ وہ دوسرے انتخاب کا اعلان کر دیں۔ سب سے پہلے اس

[۱] تجارب الامم لابن مسکویہ مطبوعہ آکسفورڈ۔ جلد دوم ص ۲

جماعت کے ممتاز افراد نے ابن المعتز کی خدمت میں حاضر ہو کر خلافت کی پیشکش کر دی۔ لیکن صلح جو اور امن پسند ابن المعتز نے فوراً جواب دیا [۵]

"اگر قتل و خونریزی نہ ہو تو مجھے یہ خدمت منظور ہے"

ابن المعتز کا امن پسندانہ اور صلح جویانہ جواب ایسا نہ تھا جو اس کے حامیوں پر اثر نہ کرتا۔ چنانچہ انہوں نے اس پر پورا پورا عمل کر کے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ غرضیکہ اُدھر طفلانہ انتخاب کی امنگیں جنکے ساتھ اغراضِ حکمرانی وابستہ اور ادھر بلا جوڑ مشروط جواب کے۔ حامیان ابن المعتز کے جوش و ولولے۔ دونوں گروہوں میں تصادم ناگزیر تھا۔ چنانچہ تصادم ہوا۔ "دے بخیر گذشت" اور ابن المعتز کے حامیوں کو کامیابی ہوئی۔ مقتدر باللہ کو معزول کر دیا گیا۔ اور ابن المعتز کو خلیفہ بنا دیا گیا۔

انقلاب در انقلاب مورخین بالاتفاق اس پہلے انقلاب میں کسی خونریزی کا ذکر نہیں کرتے ہیں۔ ہاں دوسرے انقلاب میں خونی ڈرامہ کا منظر پیش کرتے ہیں جسکی ذمہ داری سے ابن المعتز قطعاً بری ہے۔

ابن طقطقی دونوں انقلابوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کو اس طرح مختصراً بیان کرتا ہے [۶]

"مقتدر باللہ کو معزول کیا گیا اور عبداللہ ابن المعتز کو خلافت سپرد کی گئی۔ جس نے ایک روز خلافت کی۔ اس کے بعد پھر مقتدر کا اقتدار ہوا اور ابن المعتز کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا بہت کم مدت خلافت کی وجہ سے عبداللہ بن المعتز کا شمار خلفاء میں نہیں کیا گیا۔"

قاضی ابن خلکان نے بھی ابن المعتز کا عہدِ خلافت یک شبانہ روز ہی لکھا ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ اس کا شمار خلفاء میں نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کے خلیفہ ہونے کی توضیح اور تفصیل اور ثبوت کے سلسلہ میں واضح طور پر لکھا ہے [۷]۔

---

[۵] تاریخ الخلفاء صفحہ (۱۵۲) مطبوعہ مصر ۱۳۰۵ھ [۶] کتاب الفخری صفحہ ۳۰۹ مطبوعہ پیرس ۱۸۹۵ء

[۷]۔ وفیات الاعیان لابن خلکان صفحہ ۱۶۱ جلد دوم۔ مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ۔

مقتدر باللہ کو رؤسا ۔ امرا، اور فوجیوں نے معزول کرکے ابن المعتز کو تخت خلافت پر بٹھادیا ۔ اور اس کو مرتضیٰ باللہ کا لقب دیکر ان سب نے اس کے ہاتھ پر بیعت بھی کرلی ۔ لیکن پھر مقتدر کا غلبہ ہوا ۔ ابن المعتز بھاگ کر ابن الجصاص جوہری کے گھر میں جا چھپا ۔ مگر مقتدر نے اس کو پکڑوا کر مونس خادم کے ہاتھ سے

۔ پنجشنبہ ماہ ربیع الاول ۲۹۶ھ / ۹۰۸ء کو قتل کرادیا

۔ اس کی تاریخ پیدائش آخر شعبان ۲۴۷ھ / ۸۶۱ء اور بقول سنان بن ثابت ۲۴۶ھ / ۸۶۰ء ہے "

چوتھی صدی ہجری کا مستند مؤرخ ابن مسکویہ ۔ (المتوفی ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) نے مقتدر باللہ اور ابن المعتز کے قضیہ کو بہت ہی تفصیل سے لکھا ہے ۔ جس نے یہ صاف صاف لکھتے ہوئے کہ اسکو خلفاء میں شمار کیا گیا ۔ اس پہلے انقلاب کی تفصیل دے کر اس کی حکومت کی بھی تشکیل کی بھی صراحت کردی ۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے [۱]

افسران فوج اور حکام شہر نے ابن المعتز کے ہاتھ پر بیعت کرکے اسکو خلیفہ بنادیا اور مرتضیٰ باللہ کا لقب بھی دیدیا ۔ پرانی وزارت برخاست ہوئی اور نئی وزارت کی حسب تفصیل ذیل تشکیل کی گئی ۔

۱۔ رئیس الوزراء = محمد بن داؤد ابن جراح

۲۔ وزیر داخلہ = علی بن عیسیٰ

۳۔ وزیر خارجہ = محمد بن عبدون

اس کے علاوہ ممالک محروسہ میں ابن المعتز کی طرف سے فرامین بھی بھیج دیئے گئے ۔ اور مقتدر باللہ کو حکم دے دیا گیا کہ وہ مع اپنی والدہ کے ابن طاہر کے گھر چلا جائے ۔ تاکہ خلیفہ (ابن المعتز) ایوان خلافت میں منتقل ہوجائے ۔ چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی ۔

---

[۱] ۔ تجارت الامم لدین مسکویہ صفحہ (۶) مطبوعہ آکسفورڈ ۔

بہرحال اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ چوبیس گھنٹے میں حکومت کا نظم و نسق مکمل ہو گیا تھا۔ ابن مسکویہ کا یہ قول کہ حکومت کی نئی تشکیل کی جا کر "بیعت کی گئی اور "خلیفہ" بنا دیا گیا۔ ابن طقطقی کے قول کی مزید تردید کرتا ہے۔ قاضی ابن خلکان نے بھی ابن مسکویہ کی تائید کی ہے۔ جسکی وضاحت اوپر کی جا چکی ہے۔

علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس المیہ پر روشنی ڈالی ہے مگر بہت ہی اجمال سے کام لیا ہے۔ چنانچہ وہ ابوالفضل جعفر مقتدر باللہ کے عہدِ خلافت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؂

"مقتدر باللہ ۲۸۲ھ ۸۹۵ء میں پیدا ہوا۔ مکتفی باللہ کی وفات کے بعد (۱۳) سال کی عمر میں تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ اس سے پہلے اس عمر کا کوئی خلیفہ تخت نشین نہیں ہوا غالباً یہی وجہ تھی کہ ابن المعتز کو تخت نشینی کا موقع مل گیا"

مورخین کے ان بیانات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ابن المعتز قتل و خون کے یقیناً خلاف تھا اگر وہ اس کا موئد ہوتا تو آج اس کی خلافت تاریخ کے صفحات پر نہ تو (۲۴) گھنٹے کی لکھی ہوتی اور نہ اسکو خلفاء کے زمرے سے خارج کیا جاتا بلکہ اگر وہ چاہتا تو رقابت کے سلسلہ ہی کو ختم کر دیتا لیکن اس نے اس کو پسند نہ کیا۔ اور بقول مورخین۔ فوجی و غیر فوجی عام معاونت کے باوجود اس نے نرمی اور امن پسندی سے کام لیا۔ اور کسی قسم کے تشدد کو روا نہ رکھا۔ حتیٰ کہ غلبہ پانے اور خلیفہ ہونے کے بعد بھی مقتدر باللہ کو آزاد رکھا۔ جس کا نتیجہ وہ ہوا جو ہوا۔

اس سفاکانہ شہادت پر ابوالحسن علی ابن ابدالی نے جو پر سوز مرثیہ لکھا ہے اس کے حسبِ ذیل دو شعر قاضی ابن خلکان نے نقل کرتے ہوئے ابدالی کے متعلق لکھا ہے۔ ؂

"تیسری صدی ہجری کا یہ وہ مشہور شاعر تھا جو اپنے ہمعصروں پر ظرافت اور ہجو گوئی میں سبقت

؂ - تاریخ الخلفاء صفحہ ۲۴۳ مطبوعہ مصر - ۱۳۰۵ھ - ؂ - وفیات الاعیان جلد اول - صفحہ ۳۴۳

لے گیا تھا۔ اسکی ہجو سے نہ امیر بچا نہ وزیر سے چھوٹا نہ بڑا حتیٰ کہ اس نے اپنے باپ اور
بھائی اور کنبہ والوں کو بھی نہ چھوڑا۔ لیکن ایسا ہجو گو شاعر ابن المعتز کی موت کو ادب کی موت
قرار دیتے ہوئے اس کی اہمیت پر اس طرح آنسو بہاتا ہے۔

شعر (مرثیہ)

لِلّٰہِ دَرُّکَ مِن میت بمضیعۃٍ ناھیک فی العلم والآداب والحسب
ما فیہ لو ولا لیت فتنقصہ وإنّما ادرکتہ حرفۃ الادب

(ترجمہ) خدا بخشے مرنے والے کو جس کی المناک موت علم و ادب کی موت ہے۔ اس میں اگر مگر کچھ نہیں تھا۔ جو اس میں کوئی نقص نکالتا۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ اس کا پیشہ علم و ادب ہی تھا۔"

محاکمہ مابین المامون و ابن المعتز

ابن المعتز کی شاہی اور سیاسی زندگی کا مختصر یہ مرقع پیش کر دیا گیا۔ ذیل میں اسکی علمی اور ادبی زندگی کو خلیفۃ المامون کی علمی زندگی سے محاکمہ یا مقابلہ کے طور پر اجمالاً پیش کیا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بنو عباس نے بڑے بڑے عالم، متبحر اور علم نواز خلفاء مثل خلیفہ ہارون الرشید اور خلیفۃ المامون ۔ پیدا کئے۔ جنہوں نے وہ علمی ماحول پیدا کیا کہ جس سے پورا ملک علم کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسلامی علوم میں یونانی فلسفہ نے گھسکر۔ گمراہی کے راستے بھی کھول دئے۔ ایک قدیم تر اور مستند تر مورخ نے لکھا ہے ۔ کہ جس وقت یونانی فلسفہ کی کتابوں کے ڈھیر حسب الطلب خلافت عباسیہ شاہ قسطنطین بن اتا ث (شاہ قسطنطنیہ) نے راہبوں سے فتوی لے کر بغداد اپنے راہبوں کے ساتھ بھیجے ہیں ۔ اسوقت راہبوں نے یہی فتوی دیا تھا کہ جس مذہب

میں یہ فلسفہ گھسا۔ اس کو گھن کی طرح سے کھا گیا۔ اس لئے:۔

"اسلام کی بڑھتی ہوئی رو کو اگر کوئی چیز روک سکتی ہے تو فلسفہ کا علم ہی اسکو روک سکتا ہے۔ اے بادشاہ اس ذخیرہ کے بھیجنے سے تجھکو ثواب ملیگا۔"

غرض کہ جو کچھ راہب نے کہا وہ سب کچھ اسلامی دنیا میں ہوا۔ معتزلہ پیدا ہوئے۔ زندیق پیدا ہوئے۔ نجومی پیدا ہوئے، غرضکہ گمراہوں کے وہ گروہ پیدا ہوئے جنہوں نے دنیائے اسلام میں ایک ہلچل مچا دی۔ اس موقع پر نجوم کی صرف ایک مثال دیتا ہوں۔ باقی المامون کے ذکر میں اعتزال کی نسبتاً تفصیلی مثال دے دونگا۔

خلیفہ ہارون الرشید کا وزیر اعظم جعفر برمکیؔ (ایرانی نومسلم) نجوم کا بے حد شیدائی تھا۔ اس نے ایک محل بنوایا۔ اس نے اس میں داخلہ کیلئے نجومیوں سے ساعت پوچھی۔ انھوں نے آدھی رات بتایا۔ رات کا وقت بتایا۔ چنانچہ وہ گویا اسی "مبارک ساعت" پر مکان یا محل کے لئے روانہ ہوا۔ اس سنسان وقت پر اور رات کی تاریکی میں ایک گانے والے کی زبان سے جو آواز بلند گا رہا تھا۔ اس نے یہ شعر سنا۔

یُدَبِّرُ بِالنُّجُومِ وَلَیْسَ یَدْرِیْ وَرَبُّ النَّجْمِ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ

(ترجمہ: انسان نجوم پر عقیدہ رکھتا ہے لیکن یہ نہیں سمجھتا ہے کہ ستاروں کا مالک (اللہ تبارک و تعالیٰ) جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے یا کریگا)

یہ گانا سنتے ہی اس نے گانے والے کو بلا کر پوچھا:۔

"اس گانے سے تیرا کیا مقصد ہے"

اس نے جواب دیا

"کوئی خاص مقصد نہیں ہے بس زبان پر یہ شعر آگیا اور میں اس کو گانے لگا"

جعفر برمکی نے اس شعر کو اپنے لئے "نفخ صور" سمجھا اور گانے والے کو ایک اشرفی دیکر رخصت کیا اور اس وقت کو بجائے شگون ٹھیک کے شگون بد سمجھا۔ طبیعت بے حد

مکدر ہوئی۔ اسی وقت وہ لوٹ گیا۔ اس کے کچھ ہی زمانہ کے بعد وہ محبوب وزیر اعظم خلیفہ کے غیظ و غضب کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو گیا۔

خلیفہ ابن المعتز ادب۔ بلاغت، نحو اور لغت کے تخت پر متمکن تھا۔ قاضی بن خلکان کا قول ہے:۔[۹]

"وہ ادیب بلیغ تھا۔ نہایت اچھا شاعر تھا۔ شعر گوئی پر اتنا قادر تھا کہ فی البدیہہ کہتا تھا۔ لفظ آسان لیکن معانی اور صنائع سے پُر ہوتے تھے۔ علماء اور ادیبوں کی صحبت سے مستفید ہوتا تھا۔"

اس کے کلام میں متانت اور سنجیدگی بھرپور ہوتی تھی۔ سہل جملے۔ استعارات، اور تشبیہات ایسے کہ جن کو سن کر یا پڑھ کر بڑے بڑے ادیب اور شعراء دنگ رہ جاتے تھے۔ مناظرِ قدرت پر جب قلم اٹھاتا تھا تو تصویر کھینچ جاتی تھی۔ تصویر کشی کا صرف ایک ہی منظر مثالاً پیش کیا جاتا ہے۔ بارش کا موسم ہے مطیرہ[۱۰] اور دیر عبدون کے سبزہ زار لہلہا رہے ہیں۔ صبح کا سہانا وقت ہے۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں چہچہا رہے ہیں۔ عیسائی اور یہودی پادری اپنی اپنی عبادت گاہوں میں پکار پکار کر نمازیں ادا کر رہے ہیں۔ اس منظر کو وہ اس خوبی سے پیش کرتا ہے کہ لفظی اور معنوی صنعتیں بھی جگمگا رہی ہیں:۔

سقی المطیرۃ ذات الظل والشجر ۔۔۔ ودیر عبدون ھطال فی المطر

فطالما نبھتنی للصبوح بھا ۔۔۔ فی غرۃ الفجر والعصفور لم یطر

اصوات رھبان دیر فی صلوتھم ۔۔۔ سود المدارع نعارین فی السحر

---

[۹]۔ وفیات الاعیان جلد اول صفحہ ۲۲۲۔ [۱۰]۔ یہ دونوں مقامات "سُر من رأے" کے (یعنی عرف عام میں سامرہ کے) قریب ہیں اور جو بغداد سے تقریباً ۱۲۰ میل ہے، نواح میں تھے۔ مطیرہ ایک پرفضا موضع تھا۔ اس کے قریب عبدون بن مخلد نے ایک گرجا بنوایا تھا۔ جہاں وہ اکثر جایا کرتا تھا۔ سو اس ایک گرجا بھی تھا۔ اسی کی نسبت سے اس مقام کو دیر عبدون کہا جاتا تھا۔

(ترجمہ سایہ دار درختوں والے مطیرہ اور دیر عبدون کے سبزہ زار مینہ کی جھڑی سے لہلہا رہے تھے جبکہ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں ہی میں تھے۔ سیہ پوش پادریوں کے نعرے ہائے سحری نے مجھ کو صبح کی شراب کے لئے جگا دیا)

بندش الفاظ کیسی چست، انداز بیان کسقدر پاکیزہ، یہ مطیرہ اور "مطر" (بارش) کی کیسی بے مثل رعایت اور ملائم میں صنعتِ مراعاۃ النظیر خالی از لطف نہیں۔ دیر ۵

دوسرا شعر جس میں لاجواب تشبیہ کارفرما ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ولاح ضوء ھلال کاد یفضحنا　　مثل القلامۃ قد قدت من الظفر

(ترجمہ: اس ہلال کے جو تراشہ ناخن کی طرح ہے۔ ظاہر ہوتے ہی ہمیں اپنے افشائے راز کا خطرہ ہو گیا۔)

ہلال کی تراشہ ناخن سے تشبیہ کیسی اچھوتی ہے۔

ابن المعتز ہلال کو ایک دوسرے شعر میں دوسری شکل میں پیش کرتا ہے جو مندرجہ بالا تشبیہ والے شعر سے زیادہ پُر لطف ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

۲ فانظر الیہ کزورق من فضۃ　　قد اثقلتہ حمولۃ من عنبر

(ترجمہ: اس (ہلال) کی طرف دیکھ جو گویا ایک چاندی کی وہ کشتی ہے جو عنبر سے گرانبار ہے۔")

اس شعر میں اس نے تو کمال ہی کر دیا ہے ہلال کو چاندی کی اس کشتی سے تشبیہہ دی ہے جس میں عنبر بھرا ہوا ہے (اور وہ کشتی اس بوجھ سے سمندر کے نیلگوں پانی میں اتنی ڈوب گئی ہے کہ اس کے چمکدار کنارے ہی صرف نظر آ رہے تھے۔)

ابن المعتز کی شعر فہمی | ابن المعتز نہ صرف شاعر اور شعر فہم تھا بلکہ شعراء فہم بھی بدرجہ اتم تھا۔ اس نے ایک موقعہ پر حسب ذیل چار قدیم تر شعراء پر

---

۱ گرجا ۔ ۲ بہت سے پادری ۔ ۳ یہودی بڑے پادری

جو تبصرہ کیا ہے وہ نہ صرف پُرلطف ہے بلکہ اس کی جبلت اور خصوصیات کی روشن تصویر ہے۔ علامہ ابن خلکان ناقل ہیں [له]

عبداللہ بن المعتز کہا کرتا تھا کہ حسب ذیل شعراء کے اقوال ان کے اعمال سے مختلف تھے (" انہم یقولون مالا یفعلون" کی عملی تفسیر)

۱۔ ابو العتاہیہ کے اشعار میں زہد مگر خود ملحد

۲۔ ابونواس کے اشعار میں لواطت مگر خود بندر سے زیادہ زانی

۳۔ ابوکلیم کاتب کے اشعار میں شجاعت مگر خود بکری سے زیادہ ڈرپوک۔

۴۔ محمد بن حازم کے اشعار میں قناعت مگر خود کتے سے زیادہ لالچی۔

خلیفہ ابن المعتز کے اساتذہ

ابن المعتز نے جن اساتذہ سے استفادہ کرکے سند فضیلت حاصل کی وہ حسب وفات دو تھے جو اپنے وقت کے امام تھے۔

۱۔ علامہ ابوالعباس ثعلب (مدرس سنہ ۲۰۰ھ / ۸۱۵ء) جن کا انتقال بغداد میں بہ عمر (۹۱) سال ۲۹۱ھ / ۹۰۳ء میں ہوا۔ اور وہیں دفن ہوئے۔

۲۔ علامہ ابوالعباس المبرد (پیدائش غالباً ۲۰۷ھ / ۸۲۲ء) اور وفات ۲۸۶ھ / ۸۹۹ء میں بہ عمر (۷۹) سال ہوئی۔ بغداد میں بمقام باب الکوفہ دفن ہوئے۔

علوم منقولی کے علاوہ ادب و بلاغت میں اس وقت ان کا کوئی مثل نہ تھا۔ اسی وجہ سے ابن المعتز بھی ادب و شاعری میں یگانہ روزگار ہوا۔ اور اس مخصوص فن میں اپنے اسلاف پر گوئے سبقت لے گیا۔ علوم منقول میں بھی وہ وقت کے ائمہ سے کم نہ تھا اسی لئے اس سے کوئی مذہبی لغزش ایسی نہیں ہوئی جس پر کوئی انگلی اٹھا سکے۔

له۔ وفیات الاعیان جلد اول صفحہ ۳۴۵

خلیفہ المامون اور خلیفہ ابن المعتز اور علمی تفوق یہ میں آغازِ محاکمہ میں کہہ چکا ہوں کہ خلافت عباسیہ نے بڑے بڑے جلیل القدر خلفاء پیدا کئے ہر خلیفہ کوئی نہ کوئی علمی یا سیاسی خصوصیت اپنے ساتھ ضرور لایا مگر تاریخیں جس قدر خلیفہ المامون کے علم اور اسکی علم نوازی پر بلا استثناء رطب اللسان ہیں۔ اس قدر کسی کو نہیں سراہتی ہیں۔ خلیفہ المامون نے علم فقہ اور علم کلام سے جسکی وجہ سے ۱۲ ؎

"وہ تمام خلفاء پر سبقت لے گیا تھا"

اس کی شہرت میں بجا طور پر چار چاند لگا دیے تھے۔ جو علماء فقہ اور کلام سو نیز محدثین کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوتا ہو اور بسا اوقات ان کے مذاکرات کی ثالثی کے علمی فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتا ہو۔ اس کا علمی تبحر کسی تبصرہ کا محتاج نہیں ہے۔

المامون کے اساتذہ امام المتکلمین ابو الہذیل العلاف کی صحبت سے وہ مستفید ہوا۔ اس نے ان کے علمی مذاکرات سے مسلسل استفادہ کیا اور ساتھ ہی ان کے ممتاز شاگرد ابو الحسن ابن ابراہیم سیار نظام کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ اور نہ صرف اس سے سندِ فضیلت حاصل کی بلکہ تختِ خلافت پر متمکن ہوتے ہی اپنے نامی گرامی استاد کو اپنا ندیم خاص بھی کر لیا تھا۔

مگر ان علمی صحبتوں اور مذاکرات نے افسوس ہے۔ بعض معتزلہ کے اثر نے اسکو اعتزال کی طرف اس قدر مائل کر دیا تھا کہ ایک وقت میں اس کا اعتزال حکومت کے لئے فتنہ ہو گیا اور ملک بھر میں وہ ہل چل مچی کہ تاریخ میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اس کا فقہی تبحر و تفقہ ناقابلِ انکار ہے لیکن بالخصوص تیسری صدی ہجری کے آغاز میں اعتزال کے چکر میں پھنس کر جو زندیقیت اور الحاد کا دیباچہ تھا اس نے پوری اسلامی دنیا کو گمراہ کرنے کی ناکامیاب کوشش کی۔

دار الخلافت بغداد میں سب سے پہلے معتزلی بشر بن غیاث مریسی نے۔ قرآن پاک

۱۲ ؎ ۱

کے مخلوق ہونے کا فتنہ اس طور پر اٹھایا کہ دربارِ خلافت میں اس قضیہ نامرضیہ کو لاکر خلیفہ المامون کو۔ گویا اپنا مرید بنایا۔ خلیفہ المامون اس کے فلسفیانہ چکر میں آکر "خلقِ قرآن" کا قائل ہوگیا۔ اور اس پر جب اس کا عقیدہ راسخ ہوگیا تو اس "عقیدہ" کو حکومت یا ریاست کا عقیدہ اس نے بنا دیا چنانچہ سب سے پہلے اس نے غالباً ۲۱۲ھ/۸۲۷ء میں سرکاری طور پر اعلان کر دیا۔ اس غیر اسلامی عقیدہ یا گمرہی کا اعلان ہوتے ہی بغداد میں طوفان برپا ہوگیا۔ اور شدت سے مخالفت شروع ہوگئی۔ حکمران اس عام وخاص مخالفت کو برداشت نہ کرسکا۔ اس پر اس نے ۲۱۸ھ/۸۳۳ء میں طے کرلیا کہ نہ صرف اس مخالفت کو تلوار سے ختم کیا جائے گا۔ بلکہ تلوار ہی کے زور سے اس غلط عقیدہ "خلقِ قرآن" کو پھیلایا جائے گا۔ چنانچہ اس جبر وتشدد پر عمل شروع ہوگیا۔ اور مخالفت کرنے والے علمائے کرام کی کثیر تعداد تلوار کے گھاٹ اتار دی گئی۔ "ہر فرعون را موسیٰ" کا وہ قانونِ الٰہی ہے جو ہر زمانے میں یکساں نافذ رہا۔ چنانچہ اس فتنہ کے موقع پر مکہ معظمہ کا ایک مجاہد عالم امام عبد العزیز بن یحییٰ مکی رحمۃ اللہ علیہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے بغداد پہنچکر اپنے مناظرے سے جو ایوانِ خلافت میں خلیفہ مامون کی صدارت میں ہوا۔ اس فتنہ کا استیصال کیا۔ اور بشر مریسی اور اس کے پیرو کو مغلوب کرکے فتحمند ہوا۔ جس پر المامون نے نہ صرف بار بار "احسنت یا عبد العزیز" (شاباش اے عبد العزیز) کہا بلکہ خلیفہ کی جانب سے وہ نقد انعام سے بھی سرفراز ہوا۔ دار الخلافت کے مسلمانوں کی خوشی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جو اس مذہبی فتح سے ہوئی

یہ تمام تفصیلات امام ممدوح علیہ الرحمۃ نے اپنی تصنیف "کتاب الجیدہ" میں دی ہے جس کا خلاصہ یا اقتباس اس جگہ دے دیا گیا ہے۔ بہرحال نہ صرف خلیفہ المامون اس گمرہی کے جال سے نکلا بلکہ خوف زدہ مسلمان بھی امن واطمان سے زندگی بسر کرنے لگے۔ اور خلیفہ نے بالاعلان اپنے فاسد عقیدہ سے رجوع کرلیا۔

خلیفہ بن المعتز جیسا کہ اوپر کے بیانات سے واضح ہوگیا ہے ادب کا لاثانی عالم تھا۔

اس کی ایک تصنیف "کتاب الادب" ہے ۔ اس کا خلاصہ میری نظر سے قاہرہ (مصر) کے ایک رسالہ "الزھرا" میں گذرا ہے اس میں سے صرف چند ہی "پند و حکم" کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں ۔ جو حسب ذیل ہیں ۔ (رسالہ الزہرا ربیع الاول ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ ۱۹۲۵ء) جلد ۲-۳

ترجمہ

چند پند و حکم

۱۔ عقل وہ سرشت ہے جو تجربوں سے پلتی ہے ۔ ۲۔ جاہلوں میں عالم اجنبی ہے ۔

۳۔ نفس انسان کا قریب تر دشمن ہے ۔ ۴۔ نیت بنیادِ عمل ہے

۵۔ مجمع میں نصیحت دشنام دہی ہے ۔ ۶۔ ناکامی پر بھی کوشش کیے جاؤ ۔

۷۔ حاسد کی سزا اس کا حسد ہے ۔ ۸۔ بلاوجہ قسمیں کھانیں جھوٹ کی علامت ہے ۔

۹۔ امن میں تنہا آدمی بے خوف رہتا ہے اور بدامنی میں جماعت پراگندہ رہتی ہے ۔

۱۰۔ کم عقل عالم وہ چرواہا ہے جس کے پاس ریوڑ زیادہ ہو ۱۱۔ خوشامد تیری عجز کو کم کرتا ہے

۱۲۔ جھوٹی بات نہ کہنے میں اتنا ہی خوش ہو جتنا سچی بات کہنے میں ۔

۱۳۔ اپنا مرقع تصاویر ہے ایک صفحہ کھلتا ہے تو دوسرا بند ہوتا ہے ۔

۱۴۔ جو مصائب سے نہیں بھاگتا مصائب اس سے بھاگتے ہیں ۔

۱۵۔ فرائض اللہ کی یاد دلاتے ہیں ۔ تاکہ بندہ اس کو فراموش نہ کرے

۱۶۔ محبت بدل سکتی ہے مگر طبیعت نہیں بدل سکتی ۔

۱۷۔ عقل بلا ادب مثل شجرِ بے برگ و بار ہے ۱۸ خواہشات کا بندہ غلام سے بدتر ہے ۔

۱۹۔ بازاروں کی زیادتی نقصان دہ ہے ۔

۲۰۔ دشمن کے لئے یہی ذلت کافی ہے کہ تو صاحب مرتبہ ہے ۔

۲۱۔ بڑے ساتھی وہ آتشیں درخت ہیں جو ایک دوسرے کو جلاتے ہیں ۔

۲۲۔ معافی اور دشنام دہی کو مخلوط نہ کر ۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کا مکتوب گرامی

ایڈیٹر برہان کے نام

مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کی شخصیت، علم وفضل، وسعتِ مطالعہ و نظر اور ادب و انشاء کے اعتبار سے نہایت بلند اور ممتاز مقام کی مالک ہے ساتھ ہی آپ کی حمیت وغیرتِ دینی اور بیباک گوئی سب کے نزدیک مسلم ہے۔ اس بنا پر ہم ذیل میں مولانا کا ایک خط شائع کرتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ جو لوگ جذباتی انداز فکر رکھتے ہیں۔ اُن میں اور جو حضرات اربابِ علم و تحقیق اور تاریخ اسلام کے مبصر ہیں اُن میں خورشید احمد صاحب فارق کے اس مضمون کے بارے میں فکر اور رائے کا کیا اختلاف ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مولانا نے اسی مکتوب میں جو بات لکھی ہے یہ بعینہ وہی ہے جس کا اظہار آپ صدق جدید مورخہ ۱۵ر فروری کے ایک نوٹ میں کر چکے ہیں۔ اب آپ مولانا کے اس خط کی روشنی میں فروری کے برہان کے نظرات دوبارہ ملاحظہ فرمائیے تو اس سے حقیقتِ حال کا اصل اندازہ ہوگا۔ (ایڈیٹر)

مولانا تحریر فرماتے ہیں :-

مورخہ ۳۰ر جنوری ۱۹۶۳ء صدق دریاباد ضلع بارہ بنکی

برادرم السلام علیکم!

فارق صاحب (دہلی یونیورسٹی) کا مقالہ سیرت نبوی پر خوب ہی نکل رہا ہے۔ ان کے مطالعہ کی وسعت اور گہرائی دونوں قابل داد ہیں اپنے رنگ کی بالکل منفرد چیز ہے لیکن ساتھ ہی دوسری طرف ایسی روایتیں بلا تکلف نقل کر جانا جو سیرت کی پاکیزگی کو صریح

لہ محکمہ ڈاک کی روایتی بدنظمی کا برا ہو کہ ۳۰ر جنوری کا لکھا خط مکتوب الیہ کو ۲۵ر فروری کو ملا ہے۔

مجروح کرنے والی ہوں۔ کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ جنوری کے برہان میں تین مردوں اور ایک عورت کا خفیہ قتل بہت زیادہ غلطیاں پیدا کرنے والا ہے۔ کم سے کم کوئی مختصر نوٹ تو آپ کی طرف سے ہونا لازمی ہے۔ ؎۱

برہان کے خدانخواستہ بند ہونے کی خبر پر آئندہ ہفتہ کے صدق میں لکھ رہا ہوں۔

والسلام

عبدالماجد

برہان

؎۱ ان تین مقتول مردوں میں ایک تو کعب ابن اشرف یہودی ہے۔ اس کے قتل کا واقعہ جس طرح فارق صاحب نے لکھا ہے بعینہٖ اسی طرح تاریخ و سیر کی تمام کتابوں کے علاوہ خود صحیح بخاری میں موجود ہے اور مولانا شبلی نے (سیرت النبی جلد اول ص ۴۰۵) اور مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری نے بھی (اصح السیر ص ۱۴۴) اسی طرح نقل کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایا جائے۔ اب باقی رہے دو مرد اور ایک عورت جس کا نام عصماء تھا تو ان کے قتل کے واقعہ کا حوالہ تین کتابوں کا فارق صاحب کے مضمون میں موجود ہے۔ جیسا کہ خود فارق صاحب نے لکھا ہے ان تینوں بدبختوں کا جرم بھی بعینہٖ وہی تھا جو کعب بن اشرف یہودی کا تھا یعنی یہ تینوں شاعر تھے اور اپنے اشعار میں برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتے رہتے۔ اور قبائل میں گھوم پھر کر اپنے اشعار کے ذریعہ لوگوں کو حضور کے خلاف بھڑکانے اور قتل کر دینے کی ترغیب و تحریص کرتے رہتے تھے۔ اس بنا پر اگر قرآن کے حکم «الفتنة أشد من القتل» کے مطابق یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما اور مرضی سے قتل کئے گئے تو اس پر کون اعتراض کر سکتا ہے؟ اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس وقت تک باقاعدہ اسلامی ریاست قائم نہیں ہوئی تھی جس کے ماتحت اس سلسلہ میں باضابطہ اور آئینی کارروائی کی جاتی اور انتقام وغیرہ کے سلسلہ میں قبائلی طور طریق پر عمل ہوتا تھا۔ فارق صاحب نے کعب بن اشرف کا واقعہ جس انداز میں لکھا ہے اس پر جس لوگوں کو پیار ہے اعتراض نہیں۔

(۱)۔ انھوں نے کعب بن اشرف کے جرم کی نشاندہی نہیں کی۔

(۲)۔ کعب بن اشرف کے سر بریدہ کو حضور کے سامنے پیش کرنے کا کیا ثبوت ہے۔

(۳)۔ حضور کعب بن اشرف کے سر بریدہ کو دیکھ کر محظوظ ۔۔۔ ہوئے ۔ یہ الفاظ نامناسب ہیں۔

ان میں سے پہلا اعتراض اس لئے غلط ہے کہ مقالہ نگار نے نہ صرف کعب بن اشرف بلکہ چاروں مقتولین کے جرم کی نشاندہی کردی ہے۔ ملاحظہ ہو برہان بابت جنوری صفحہ سطر ۱۔۲۔۳۔۴۔ دوسرے اعتراضات کا جواب یہ ہے کہ مقالہ نگار نے اس کے لئے تین کتابوں کا حوالہ درج کیا ہے چنانچہ مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری نے اصح السیر میں صفحہ ۱۲۵ (سطر ۱) میں یہی لکھا ہے رہا تیسرا اعتراض ! تو اس میں نامناسب کیا بات ہے ؟ جب ان نوجوان بہادروں نے حضور کی مرضی سے اور حضور کے ساتھ عشق و محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر یہ اقدام کیا تھا تو پھر حضور کیوں مسرور و محظوظ نہ ہوتے چنانچہ اس واقعہ کے بعد کعب بن اشرف کے ہم قبیلہ یہودیوں میں اور حضورؐ میں جو گفتگو ہوئی اس سے بھی یہ صاف ظاہر ہے۔

(۴)۔ چوتھا اعتراض یہ ہے کہ حضور نے ان بہادر دلیر نوجوانوں کو "جھوٹ بولنے" کی اجازت دی ! اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ مولانا شبلی نے بجا طور پر اس کی تردید کی ہے مگر ساتھ ہی لکھتے ہیں۔

ارباب روایت لکھتے ہیں کہ حضرت محمد بن مسلمہ نے آپ کی خدمت میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ ہم کو کچھ کہنے کی اجازت دی جائے ۔ ارباب سیر نے اس کے یہ معنی لگا لئے ہیں کہ انھوں نے جھوٹی باتیں کہنے کی اجازت مانگی چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیدی کیونکہ الحرب خدعۃ ۔ یعنی لڑائی میں دھوکہ دینا جائز ہے۔ (سیرت النبی ج ۱ ص ۲۰۷)

چنانچہ مولانا داناپوری نے بھی ارباب سیر کے تتبع میں اس موقع پر یہ الفاظ لکھے ہیں۔ حضور نے ان لوگوں کو (کعب بن اشرف کے قتل کی) اجازت دی اور یہ بھی اجازت دی کہ اگر ضرورت ہو تو "منافقت" کی گفتگو کر سکتے ہیں (اصح السیر ص ۱۲۵ سطر ۱۰)

بعض مسلمانوں کو اس سے بھی وحشت ہوئی ہے کہ فاروق صاحب کے مقولہ میں

بار بار لوٹ مار کا ذکر آیا ہے۔ ان لوگوں کو سیرت النبی جلد اول میں "غزوات پر دوبارہ نظر" از صفحہ ۳۷۵ تا صفحہ ۴۲۲ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جس میں مولانا شبلی نے بڑی تحقیق اور خوبی سے بتایا ہے کہ شروع میں جنگ کیوں اور کیسے اور کس ضرورت سے لڑی جاتی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبہ (جنگ) میں بھی کیسی عظیم اصلاحات کی ہیں۔ یہاں تک کہ جنگ بھی عبادت بن گئی۔ لیکن یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوگیا۔ بلکہ بڑی حکمت اور مصلحت شناسی سے بتدریج اور رفتہ رفتہ ہوا ہے۔

مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی کا خط

گذشتہ ۱۰ فروری ۱۹۸۳ء کا برہان پریس کو جاچکا تھا کہ ڈاکٹر فاروقی صاحب کا خط پہونچا کہ ان کے مضمون کی اشاعت روک دی جائے۔ چنانچہ گذشتہ قسط کو اس مضمون کی آخری قسط سمجھئے۔

مضمون کے سلسلہ میں دفتر برہان میں جو متعدد خطوط موصول ہوئے ان میں ایک خط مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا بھی تھا۔ اس خط کا جواب جو مفتی صاحب نے مولانا موصوف کو بھیجا ہے ہم ذیل میں اسکو قارئین برہان کی نذر کرتے ہیں۔ یہ خط بہت جامع اور حقیقت افروز ہے۔ امید ہے کہ تمام خطوط اور مراسلات جو برہان میں موصول ہوئے ہیں یہ خط ان سب کا شافی ووافی جواب ثابت ہوگا

(ایڈیٹر برہان)

مخلصم ومحترم جناب مولانا دام مجدہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پچھلے چند ہفتوں سے ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب کے مضمون "عہد نبوی کا تاریخی جائزہ" پر کافی لے دے ہو رہی ہے، جیسا کہ آپ کو معلوم

ہے کہ فارق صاحب برہان کے قدیم مقالہ نگار ہیں۔ اور ان کی متعدد اہم علمی اور دینی کتابیں بھی ندوۃ المصنفین سے شائع ہو چکی ہیں۔ فارق صاحب ہمارے ان رفقاء میں ہیں جو اپنی تالیفات پر ادارہ سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ حالانکہ ان کی جو کتاب انگریزی میں شائع ہوئی ہے پبلشرز ان کو اس کا گراں قدر معاوضہ دیتے ہیں چونکہ فارق صاحب کو ندوۃ المصنفین کی مسکنت کا بخوبی علم ہے اس لئے ادارے سے کسی حق الخدمت کا خیال ہی نہیں کرتے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ موصوف ضرورت سے زیادہ بیباک مؤرخ واقع ہوئے ہیں۔ اور اس لئے انھوں نے اس مقالہ میں اپنی بے قیدی بے باکی کا غیر معمولی مظاہرہ کیا ہے۔ رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ میں نے یا مولانا سعید احمد صاحب نے ان کے مضمون کو پہلے سے پڑھ کیوں نہیں لیا۔ یہ قطعی بات ہے کہ ہم لوگ، اگر مضمون پڑھ لیتے تو موجودہ صورت میں یہ ہرگز "برہان" میں شائع نہ ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب نے اگرچہ تمام باتیں حوالوں کے ساتھ لکھی ہیں لیکن منصب نبوت اور مقام رسالت کی شان ہی کچھ اور ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام عصمت وعظمت سے اگر تاریخ کا کوئی حوالہ ٹکرائے گا تو وہ بے تکلف رد کر دیا جائے گا کیونکہ تاریخ کی بڑی سے بڑی مستند و معتبر کتاب بھی تواتر کے اس مرتبے تک نہیں پہونچ سکتی جو مرتبہ رسالت و نبوت اور ان کی حدود ہے۔ ابن سعد اور کتاب المغازی کی تو حیثیت ہی کیا ہے آپ بخوبی واقف ہیں کہ طبقات بن سعد وغیرہ کے متعلق آمیزش کی بھی شکایتیں رہیں۔ مولانا عبدالرؤف داناپوری مرحوم نے اصح السیر میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ بہرحال منشا یہ ہے کہ ہمیں محض تاریخی حوالوں سے مرعوب نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ حالات و واقعات کے دروبست کا بصیرت احتیاط

کے ساتھ جائزہ لینا چاہئے۔ بنیادی چیز یہ ہے کہ کتب تاریخ کے تمام اندراجات کو جن میں ہزار طرح کے احتمالات ہو سکتے ہیں۔ مرکز عصمت و عظمت شخصیت سرور کائنات کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔ اور جو حوالہ اس مقام سے ٹکرائے گا اس کو پس پشت ڈال دیا جائے گا۔

فاروق صاحب صرف کی تاریخ کے اسکالر ہیں اور ان کا مطالعہ بے شبہ وسیع ہے لیکن ہم مقام رسالت کو بھی تاریخ کے رحم وکرم کے حوالے نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان حوالوں کو ایک ہزار بار چھانیں گے اور حقیقت کا پتہ لگائیں گے۔ اس مسئلہ پر بھی فاروق صاحب سے بار ہا گفتگو ہوئی ہے کہ دینی اور مذہبی حیثیت سے قطع نظر تاریخی اعتبار سے بھی احادیث رسول اللہ کا پایہ عام تاریخوں سے بدرجہا بلند ہے۔ سوال یہ ہے کہ خالص تاریخی نقطہ نظر سے بھی ہم کتاب المغازی کو سامنے رکھیں یا صحیحین اور دیگر کتب صحاح کو۔ افسوس ہے فاروق صاحب ان نکتوں پر غور نہیں کرتے۔ اور صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دوسری اہم ترین حدیث کی کتابوں کو چھوڑ کر عام تاریخوں کا سہارا لیتے ہیں۔ میں نے ایک رفیق ادارہ کے سپرد یہ کام بھی کیا ہے۔ کہ وہ فاروق صاحب کے دیئے ہوئے تاریخی حوالوں اور ان کے ترجے کو دیکھیں۔ اندازہ یہ ہے کہ ہمارے دوست نے اس راہ میں بھی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ایک بات اور عرض کر دوں وہ یہ کہ ان علمی اور تحقیقی بحثوں کے اخبار میں آنے کا کیا مطلب ہے میں تو ان لوگوں کے طریق کار سے یہی سمجھتا ہوں کہ ہمارے معاملات میں بہانے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اور جو تنکا مل جاتا ہے اس کا سہارا لیکر ہمیں بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر طرح کی ناسازگاریوں اور دشواریوں کے باوجود گذشتہ ۳۵ سال میں "برہان" اور "ندوۃ المصنفین" نے جو اعلیٰ درجے کی علمی اور مذہبی خدمت کی ہے یہ تمام ہوش و حواس کوئی انصاف پسند بھی

اس سے انکار کرسکتا ہے؟ "ندوۃ المصنفین" پر کیسے کیسے حوادث گذرے اور اب بھی گذر رہے ہیں۔ لیکن ان ارباب تقدس و تقویٰ کے قلب میں ادنیٰ سی خلش بھی پیدا نہیں ہوتی۔

ہماری کوتاہی سے ایک غیر محتاط مضمون شائع ہوگیا تو زمین و آسمان ایک کر دیا۔ "الجمعیۃ" کے پہلے مراسلے میں جو عنوان زیب قرطاس ہوا وہ یہ تھا "برہان دہلی کی حضرت عائشہؓ کی شان میں گستاخی"۔

معلوم نہیں آپ کی کیا رائے ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ اس طرح کی تحریر کی اشاعت کا مقصد عام مسلمانوں میں اشتعال پھیلانے کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ موقع ملے تو فارق صاحب کے مقالے کا جواب تحقیقی اور مثبت انداز میں تحریر فرمائیں۔ یہ کام آپ ہی جیسے حضرات کرسکتے ہیں۔

فقط والسلام

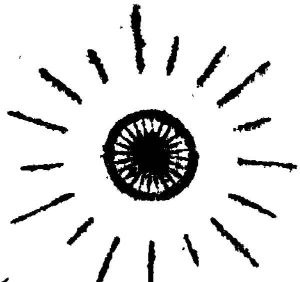
عتیق الرحمٰن عثمانی

اظہارِ حقیقت

از خورشید احمد فارق - دلی یونیورسٹی دہلی

سب سے پہلے میں اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ عہدِ نبوی کا تاریخی جائزہ لکھ کر میں نہ تو مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنا چاہتا ہوں نہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کا کوئی داعیہ میرے دل میں ہے۔ دل آزاری یا اہانت تو میں غیر مسلموں کی بھی روا نہیں سمجھتا۔ چہ جائیکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت۔ جائزہ لکھنے سے میرا مقصد عہدِ نبوی کی اپنے علم اور مطالعہ کی حد تک ایک متوازن اور صحیح تصویر پیش کرنا تھا۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ ایک تاریخ نگار کا اولین فرض غیر جانبداری ہے۔ مذہب بھی حکم دیتا ہے کہ جب بات کہو تو انصاف اور غیر جانبداری پر مبنی ہو۔ "واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربیٰ"۔ میں نے بھی اپنے ذاتی رجحان اور معاشرہ کے دباؤ سے حتی الامکان غیر متاثر ہو کر جائزہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ میرے مآخذ تمام تر عربی ہیں، بنیادی اور قدیم ترین، دوسری صدی ہجری میں قلمبند ہوئے۔ صحابہ تک ان کی روایت مرفوع ہے۔ انھیں مرتب کرنے والے اپنے زمانے کے ممتاز محدث، فقیہ، عالم اور قاضی تھے میں نے حدیث کی کتابوں مثلاً صحاح ستہ سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن یہ بہت محدود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کتابوں میں فقہی احکام سے متعلق احادیث بیان کی گئی ہیں۔ تاریخی واقعات و حوادث سے متعلق بہت کم ہیں اور اگر ادھوری کوئی تاریخی حدیث ان میں ملی ہے اور وہ بنیادی مراجع میں بھی موجود ہے تو میں نے فٹ نوٹس میں مراجع کا ہی حوالہ دیا ہے اور حدیث کی کتاب کا دینا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ حدیث کی کتابیں بنیادی مراجع سے بعد میں قلمبند ہوئی ہیں۔ اور حوادث کے لئے اس اہمیت کی حامل نہیں جو ان سے متقدم مراجع کو حاصل

ہے۔ یہ بنیادی مراجع گذشتہ سو سال میں یوروپ اور مصر و لبنان میں طبع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی طباعت سے عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ کی تاریخ کے بہت سے گوشے روشن ہو گئے ہیں اور اس دور کی تاریخ کا تحقیقی اور فی الجملہ قابلِ اعتماد مطالعہ کرنے کے لئے نئی راہیں کھل گئی ہیں۔ یہ مراجع ہندوستان کے عربی مدارس کے نصاب میں داخل نہیں ہیں اس لئے ان میں پیش کردہ معلومات سے مدارس کے طلبہ واقف نہیں ہوتے اور چونکہ عربی مدارس کے کتب خانوں میں بھی یہ مراجع بالعموم نہیں پائے جاتے وہاں کے اساتذہ کو ان کے مطالعہ کا کم ہی موقعہ ملتا ہے اس لئے جائزہ پڑھکر بہت سے حضرات حیران ہوئے اور بہت سے مشتعل اور سمجھے کہ جائزہ کی تفصیلات میں نے اختراع کی ہیں۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ میں مغازی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ہجرت کے پہلے سال غیر مسلموں سے لڑائی کی اجازت دی گئی۔ اور دوسرے سال لڑائی فرض کر دی گئی۔ (کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم، قاتلوا المشرکین حتیٰ لا تکون فتنہ، قاتلوا المشرکین حیث وجدتموھم وغیرہ) مدینہ کی دس سالہ زندگی میں رسول اللہؐ نے خود دو درجن سے زیادہ معرکوں کی قیادت کی۔ اور قریب چار درجن مہمیں اپنے سپہ سالاروں کی ماتحتی میں بھیجیں۔ جائزہ میں ان معرکوں یا مہموں کا ذکر کرنا ناگزیر تھا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتصادی توانائی۔ سیاسی طاقت اور اشاعتِ اسلام کا گہرا تعلق تھا۔ جائزہ میں قاری کو ایسی تصریحات بھی ملیں گی جو براہ راست مراجع سے ماخوذ نہیں ہیں۔ ان سے مترشح یا متبادر ہی ہوتی ہیں یا عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ کے میرے بیس سالہ تقابلی مطالعہ سے مجھے قرین قیاس نظر آئیں۔ ان تصریحات میں ہو سکتا ہے مجھ سے اجتہادی غلطی ہوئی ہو۔ الجمعیۃ میں متعدد خط چھپے ہیں جن میں جائزہ سے لیکر ایسے اقتباس پیش کئے گئے ہیں جن سے خط لکھنے والے حضرات خاص طور پر آزردہ ہوئے ہیں۔ ان کا شاید یہ خیال ہے کہ وہ اقتباس میں نے گھڑے ہیں۔ ان حضرات نے غیظ و غضب میں ہر اقتباس سے متعلق مراجع کے وہ حوالے نہیں دیکھے جو فٹ نوٹس میں درج ہیں۔ میں نے ان کا عربی متن تطویل بلاطائل سے بچنے کے لئے نہیں دیا تھا۔ ان حضرات سے درخواست ہے کہ حوالوں کی مدد سے مراجع کا مطالعہ کر کے تشفی کر سکتے ہیں۔ تقابلی مطالعہ سے جو چند تصریحات میری ہیں انمیں اگر کوئی اجتہادی غلطی ہوئی ہے تو قابلِ



ہمارا فرض

• کوئی شخص اپنا حق پہلے ہی چھوڑ دے، لیکن فرض کو چھوڑ کر وہ بھاری خطا کا مرتکب ہوگا •

مہاتما گاندھی

آج کے بچے کل کے معمار ہیں۔ ملک کے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم ان کی پرورش کس طرح کرتے ہیں۔

آیئے آج ہم اپنے بچوں کے تئیں اپنا فرض نبھانے کا عہد کریں۔ یہ ہمارا قومی فرض بھی ہے۔



محکمہ فیملی پلاننگ

۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت ۔
تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند مغل
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم ۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم صدیق اکبرؓ ۔ تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم ۔ انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ۔ تاریخ گجرات ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ۔ مصائب سرور کونینؐ ۔

۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول ۔ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ۔ اسلامی کتب خانے برصغیر میں ۔
تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ۔ معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔

۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم ۔ تاریخ ردہ ۔ سرکشی ضلع بجنور ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم ۔ حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ۔ عرب و ہند عہد رسالت میں ۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر ۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ۔ رموز عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم ۔ تفسیر مظہری اردو جلد ششم ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ۔ تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم ۔ تاریخ الفخری ۔ حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

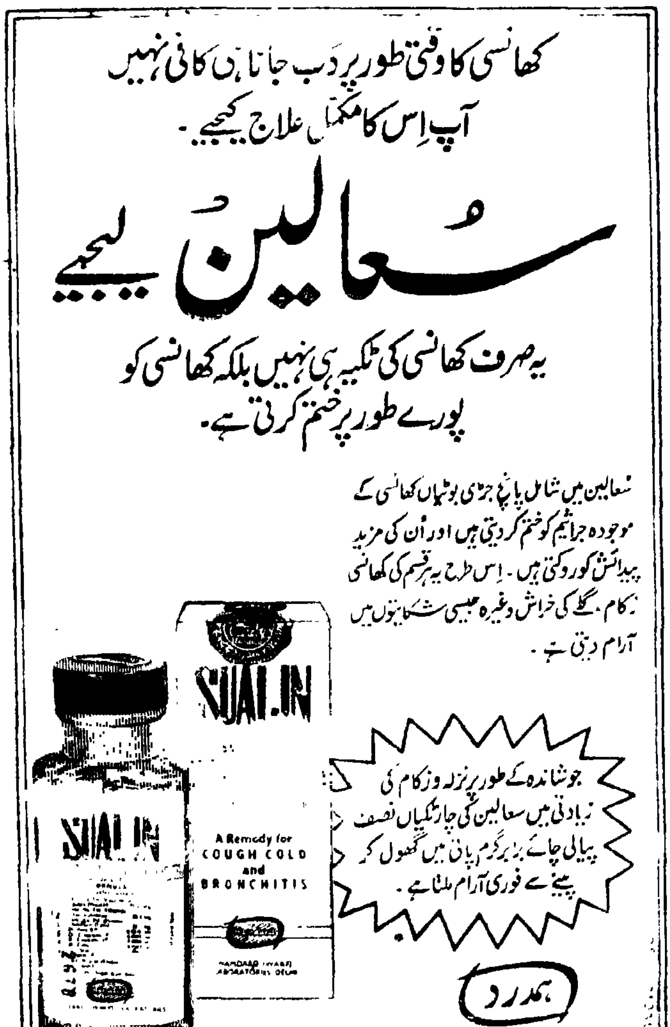
۱۹۷۰ء حیات عبدالحی ۔ تفسیر مظہری اردو جلد نہم ۔ مآثر و معارف ۔ احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم ۔ بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

Regd. No D. (D) 231 Phone 262815 MARCH 197

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ



حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب
سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول 'نبی عربی صلعم'۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم 'خلافتِ راشدہ'۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ سلطنتِ۔ تاریخ ملت حصہ سوم 'خلافتِ بنی امیہ'

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت حصہ چہارم 'خلافتِ ہسپانیہ'۔ تاریخ ملت حصہ پنجم 'خلافتِ عباسیہ اول'

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے) (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم 'خلافتِ عباسیہ دوم' بصائر۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم 'تاریخ مصر و مغربِ اقصیٰ'۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم 'خلافتِ عثمانیہ'۔ جارج برنارڈ شا۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
ازسرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

جلد ۷۳ | ماہ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۴ء | شمارہ ۴

نظرات

شروع شروع میں جب مجلس مشاورت قائم ہوتی ہے تو بعض حضرات کو یہ خیال تھا اور راقم الحروف بھی ان میں شامل تھا، کہ مقاصد ایک سہی لیکن جب ہر پارٹی اور جماعت کا فکر اور طریق کار ایک دوسرے سے مختلف ہے تو اُن میں اشتراک عمل کیوں کر ہو سکتا ہے، لیکن چوں کہ مجلس مشاورت نے عملی اور پارلیمنٹری سیاست سے اپنے آپ کو بالکل الگ رکھا اور ساتھ ہی اپنے اعضاء ارکان کو یہ آزادی دی کہ پارلیمنٹری سیاست میں وہ جو نظریہ چاہیں رکھ سکتے ہیں اور اپنی تمام تر توجہ کو مسلمانوں میں تعمیری کام کا جذبہ پیدا کرنے اور مسلمانوں اور برادرانِ وطن میں جو بُعد ہے اُس کو دور کرنے پر مرکوز رکھا اور ملک میں دورہ کر کے اس مقصد کی زیادہ سے زیادہ وضاحت کی اس بنا پر اب ایک ایسی فضا قایم ہو گئی ہے کہ مسلمان سیاسی نظریات کے اختلاف کے باوجود اپنے معاملات و مسائل پر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر تعمیری نقطۂ نظر سے غور کرنے اور سوچنے لگے ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں مجلس مشاورت کی مجلس منتظمہ کا جو جلسہ دو روز تک دہلی میں ہوا۔ اور اس سے پہلے بڑودہ میں ہوا تھا اُس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ بڑودہ کا جلسہ ہم نے نہیں دیکھا۔ لیکن دہلی کے جلسہ میں یا امید افزا منظر صاف نظر آیا کہ ایک جمعیۃ علمائے ہند کو چھوڑ کر (دعوت نامہ جس کے نام بھی گیا تھا) مسلمانوں کی سب جماعتوں کے معزز نمائندوں نے اس میں شرکت کی اور خود اعتمادی اور اشتراک عمل کے جذبہ کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل پر تعمیری انداز فکر سے تبادلۂ خیالات کیا اور بحث و گفتگو میں حصہ لیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مجلس مشاورت کا یہ بہت

بڑا کارنامہ اور اُس کی یہ نمایاں کامیابی ہے، اور اسی سے اُس واہمہ کی تردید ہو جاتی ہے جس کا ذکر شروع میں کیا گیا مجلس کی تعمیر و تشکیل کے دو پہلو ایسے ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ (۱) ایک یہ کہ مجلس کے اعضاء و ارکان میں وہ حضرات شامل ہیں جو ملک کی نامور شخصیتیں ہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار ہیں اور ان کو مسلم سوسائٹی کا اعتماد حاصل ہے، اور (۲) دوسرا پہلو یہ ہے کہ تعلیم جدید کے مسلمان نوجوانوں کا ایک فعال و متحرک طبقہ مجلس کے ساتھ اپنی جوانی کے جوش و خروش اور عزم و آہنگ کے ساتھ شریک ہے یہ نوجوان مجلس میں اسی لئے شریک ہیں کہ انھیں مجلس کی آزادیٔ فکر و رائے اور مسلمانوں کے مختلف طبقات میں اشتراکِ عمل کا جذبہ پیدا کرنے پر یقین ہے۔

مجلس مشاورت کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ وہ اپنی آواز ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچائے اور تعمیری مقاصد کے لئے ان میں اتحاد و اتفاق کا جذبہ پیدا کرے، ہماری رائے میں مجلس کا یہ پہلا مرحلہ ناکام نہیں رہا۔ اب وقت آگیا ہے کہ مجلس اپنے طے شدہ تعمیری پروگرام کو عملی شکل دینے کی طرف متوجہ ہو۔ جہاں تک اس پروگرام کا تعلق ہے اس کے تین اجزا نہایت اہم ہیں۔ (۱) تعلیم میں مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنا۔ (۲) مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشی حالت کو بہتر بنانا۔ (۳) اور ان کی اخلاقی اور سماجی اصلاح کرنا۔ دہلی کے حالیہ اجلاس میں ان موضوعات پر ٹھوس اور فکر انگیز مقالات پڑھے گئے، اور تقریریں بھی ہوئیں لیکن اب مسلمان دیکھیں گے کہ مجلس عمل کے میدان میں کیا کرتی ہے۔

پچھلے دنوں لکھنؤ میں اچانک مگر بہت شدید شیعہ سنی جو فساد ہوا اُس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ آج مسلمانوں کو اپنے ملّی وجود کے بقاء و تحفظ کے جو مسائل درپیش ہیں ان کو ان مسائل کی شدت کا قطعاً کوئی احساس نہیں ہے۔ کیوں کہ متنبی کا بہت مشہور مصرع ہے

هذا لشئ انك تذهب الاحقاد، یعنی مصیبتوں کے وقت آپس کی دشمنی اور کینہ جاتے رہتے ہیں، پس اگر شیعہ سنیوں کے آپس کے کینہ اور عداوتیں نہیں گئیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کے لئے کوئی مصیبت مصیبت ہی نہیں ہے، اور مولانا حالی کے بقول یہ ایک ایسا مرض ہے جس کا علاج بقراط و جالینوس کے پاس بھی نہیں تھا۔ اور جو قوم ایک ایسے لا علاج مرض کا شکار ہو اُس کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرنا چنداں مشکل نہیں۔

تاریخ کو جھٹلانا ممکن نہیں ہے ہمیں معلوم ہے کہ عصور ماضیہ میں شیعہ اور سنیوں کے باہمی اختلافات نے کیا کچھ حشر سامانی نہیں کی ہے۔ لیکن آج دنیا کا نقشہ بدل گیا ہے، اور سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی اور عہد گذشتہ کے تجربات نے لوگوں کو زندگی کے مسائل کے متعلق معروضی نقطۂ نظر سے سوچنے اور غور کرنے کا سلیقہ سکھایا ہے اور قومیں جو تنازع للبقا کے میدان میں باہم دست و گریباں تھیں اب وہ اپنے صدیوں کے دامانِ صد چاک پر "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے اصول کے سوزن سے بخیہ کاری کر رہی ہیں، چنانچہ مسلمان اور عیسائی جن کے سینے حروب صلیبیہ نے چھلنی کر دئے تھے اب ایک دوسرے سے قریب آرہے ہیں۔ کل کون کہہ سکتا تھا کہ شاہ فیصل اور انور سادات امریکہ سے دوستی کا مصافحہ کریں گے ملک الحرمین الشریفین روس کی طرف خیر سگالی کا ہاتھ بڑھائیں گے۔ عرب اور اسرائیل مصالحت کی میز پر ایک ساتھ بیٹھ کر گفتگو کریں گے، امریکہ روس اور چین آپس میں مل جُل کر بیٹھیں گے، اور بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان تینوں ماضی قریب کی سخت ترین تلخ یادوں کو بھلا کر پھر ایک دوسرے سے گلے ملیں گے، یہاں تک شیعہ سنی تعلقات کا تعلق ہے، ہندوستان میں یہ جتنے خراب ہیں، دنیا میں کہیں اتنے خراب نہیں، ایران ایک شیعہ ریاست ہے مگر وہاں پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون سنی ہے اور کون شیعہ! شاہ فیصل نے ابھی پچھلے دنوں شاہ ایران کی میزبانی بڑی گرم جوشی اور اخلاص

وحمیت سے کی ہے اور اب حجازِ مقدس میں ایرانی حجاج وزائرین کی تعداد برابر بڑھتی جارہی ہے غرض کہ دنیا کا رُخ یہ ہے اور زمانہ کی یہ فضلہ ہے صد حیف! اگر ہندوستان میں ان بین الاقوامی حالات کا اب بھی کوئی اثر نظر نہ آئے۔

لیکن جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے لکھنؤ کا یہ فساد ایک خاص قسم کا تھا۔ یہ مذہبی سے زیادہ سیاسی تھا اور اس میں وہ لوگ شریک تھے جن کا فریقین میں سے کسی سے تعلق نہیں تھا۔ پھر جانی اور مالی نقصانات میں بھی کوئی توازن نہیں ہے، اس بنا پر حکومت نے بہت اچھا کیا کہ فوراً ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی ہے، اس کمیٹی کی رپورٹ کا انتظار کرنا چاہیئے، پھر ہم دیکھیں گے کہ حکومت مجرموں کو ان کے کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے کیا اور کیسا اقدام کرتی ہے۔

ایک درخواست

عارف باللہ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہ مفتی اوّل دارالعلوم دیوبند کی سیرت وسوانح پر رفیق ندوۃ المصنفین دہلی مولانا محمد ظفیر الدین صاحب (مرتب فتاوٰی دارالعلوم دیوبند) نے خدا کا نام لیکر کام شروع کر دیا ہے۔ ان کا ایک مقالہ برہان دہلی میں آرہا ہے۔ اس سلسلہ میں ناظرین سے درخواست ہے کہ جن حضرات کے پاس حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے خطوط یا کوئی قلمی تحریر ہو یا کچھ ضروری حالات معلوم ہوں۔ وہ براہِ کرم مرتب فتاوٰی دارالعلوم دیوبند (یوپی) کے نام خطوط وغیرہ کی نقلیں یا اصل خطوط و تحریر روانہ فرمائیں اور حالاتِ زندگی قلم بند کر کے بھیجیں۔ ایسے حضرات کے ندوۃ المصنفین دہلی اور اس کے منتظمین شکر گزار ہونگے۔ (منیجر)

عارفِ باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ

مفتی اوّل دار العلوم دیوبند

(از مولانا محمد ظفیر الدین صاحب دار العلوم دیوبند)

(۲)

آپ کے مرشد حضرت شاہ رفیع الدین دیوبندیؒ حضرت مولانا شاہ فرید الدین عثمانیؒ کے فرزند ارجمند تھے۔ مولانا فرید الدین اپنے دور کے ایک بڑے عالمِ دین اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ نے چاہا کہ شاہ رفیع الدین آپ کے فرزند تعلیم حاصل کریں مگر ظاہری علوم کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوئی۔ مگر چونکہ مادر زاد ولی تھے اس لئے آپ کے والد محترم فرمایا کرتے تھے۔ رفیع الدین گو علم حاصل نہیں کر سکا مگر اس کا شمار جماعت علماء میں ہوگا۔ اوران میں ہی رہے گا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ شیخ رفیع الدین دیوبندیؒ نے دہلی جاکر اسوقت کے مشہور محدث اور شیخ حضرت مولانا شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی (م ۱۲۹۵ھ) کی خدمت میں رہ کر محنت کی۔ اور بیعت ہوکر قلب و نظر کی اصلاح کی۔ اور بالآخر وہاں سے خلعتِ خلافت سے نوازے گئے۔ حضرت شاہ عبد الغنی مجددی فرمایا کرتے تھے کہ

"دو صاحبوں سے مجھے جسقدر محبت ہے کسی سے نہیں۔ تلامذہ میں حضرت شاہ فخر العالم مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ سے اور مریدین میں حضرت شاہ رفیع الدین دیوبندیؒ سے"

عارف باللہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے لکھا ہے ۔

"حضرت قطب العالم ، راس العلماء ، وارث الانبیاء مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے ۔ واقعات آپ (شاہ رفیع الدین دیوبندی) کے اور معاملات آپ کے نہایت صحیح اور مطابق نفس الامر ہیں ۔ اور اکثر آپ کے احوال دریافت فرمایا کرتے تھے "

دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دور میں آپ اس کے مہتمم ثانی رہے ۔ اور دارالعلوم کی خدمت انجام دی ۔ اور سنہ ۱۳۰۶ھ میں ہجرت فرما کر حرمین شریفین تشریف لے گئے ۔ پہلے کچھ دنوں مکہ مکرمہ میں قیام رہا ۔ پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے ۔ اور وہیں اقامت پذیر ہو گئے ۔ اور بالآخر وہیں سپردِ خاک ہوئے ۔

بیعت اور خلافت

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سنہ ۱۳۰۰ھ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور باطن کا تزکیہ آپ کے ذریعہ حاصل کیا ۔ ابتدا میں بیعت ہونے کے بعد مزاج میں یکسوئی اور مخلوق سے بعد اس حد تک بڑھا کہ بیوی بچوں کی طرف بھی التفات باقی نہ رہا ۔ خلوت گزینی محبوب مشغلہ بن گیا ۔ اس سے متاثر ہو کر آپ کے والد محترم مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے شیخ رفیع الدینؒ آپ کے شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ جس راہ پر آپ نے عزیز الرحمٰن سلمہ کو ڈالا ہے اس کے اچھے اور مبارک ہونے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں ۔ اور اس سے اس کو علیحدہ بھی نہیں کرنا چاہتا ۔ مگر یہ ضرور خواہش ہے کہ یہ سب بیوی بچوں کی طرف متوجہ رہ کر کرے ۔ یہ سن کر شیخ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مولوی صاحب آپ کو اللہ نے اور بھی اولاد دی ہے ۔ اور انشاء اللہ آئندہ بھی ہو گی ۔ ان کو آپ جس طرح چاہیں اور جہاں چاہیں لگائیں ۔ اس ایک کو اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ دیں باقی معاملات درست ہی رہیں گے ۔ اس کے بعد آپ کے والد صاحب نے خاموشی اختیار فرمالی ۔ اور آپ اپنے شیخ کی زیرِ تربیت راہِ سلوک طے کرتے رہے ۔ اور بالآخر حضرت

شاہ رفیع الدین صاحب نے آپ کو خلعت خلافت سے نوازا

خلافت حضرت حاجی امداد اللہ رح

۱۳۰۵ھ میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں تقریباً دو سال قیام فرمایا۔ تو اسی زمانے میں آپ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (م ۱۳۱۷ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ فرمایا۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے بھی اپنی طرف سے خلافت سے نوازا۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ حضرت شاہ رفیع الدین کا تذکرہ قلم بند فرمایا تھا جو پاکستان میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو آپ کے پیر بھائی حاجی محمد ابراہیم صاحب کراچوی کے صاحبزادہ سے ہاتھ آیا ہے اور جسے آپ نے عزیز الفتاویٰ کے دوسرے ایڈیشن میں چھاپ دیا ہے۔ اسمیں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے۔

"چنانچہ آخر ۱۳۰۶ھ میں (حضرت شاہ رفیع الدین دیو بندی) بغرض ہجرت حرمین شریفین کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ احقر پہلے سے حاضر حرم محترم مکہ مکرمہ اور حاضر خدمت فیض اثر، حجۃ اللہ البالغہ، صدیق زماں، خلاصہ دوراں، واقف علم حقیقت و کاشف رموز طریقت، غواص بحار معانی، دریائے لآلی عرفانی مقرب حضرت ربانی، مقبول بارگاہ یزدانی حضرت شاہ حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تھا۔ کہ حضرت مولانا و مرشدنا (شاہ رفیع الدین) مکہ معظمہ میں پہونچے"

حضرت گنج مراد آبادی سے استفاضہ

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس دور کے ایک بڑے اللہ والے برگزیدہ عالم حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی (م ۱۳۱۳ھ) سے بھی باطنی فیض پایا تھا۔ جب آپ ان کی خدمت میں ۱۳۰۹ھ میں حاضر ہوئے اور کتب حدیث اور حصن حصین کی سند اجازت حاصل کی تھی، اس لئے کہ حضرت گنج مراد آبادی قدس سرہ کو حدیث اور حصن حصین کی اجازت و سند براہ راست شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) اور شاہ محمد اسحٰق صاحب مہاجر مکی (م ۱۲۶۲ھ) سے حاصل تھی۔[1]

[1] عزیز الفتاویٰ مطبوعہ پاکستان

علمار کا رجوع

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حدیث کی سند واجازت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) سے بھی حاصل تھی[1] حضرت گنگوہی آپ کا بڑا لحاظ فرماتے تھے۔ حکیم عبدالوہاب صاحب کا بیان ہے

"حضرت مفتی صاحب جب قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ ان کے لئے جگہ چھوڑ دیتے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ان میں ایک خاص چیز نظر آتی ہے۔ جو اور آنکھیں نہیں دیکھتی ہیں" (مہاجر دیوبند ۷ دسمبر ۱۹۲۸ء)

اس طرح حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں بڑی جامعیت آگئی تھی۔ اور یقیناً آپ اس دور میں راہِ سلوک کے بہت بڑے ممتاز فرد تھے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو چھپا رکھا تھا۔ اور نام و نمود سے گھبراتے بلکہ متنفر تھے۔ مگر بایں ہمہ اہل اللہ میں معروف و مشہور تھے۔ اور علمار آپ کی طرف راہِ سلوک کے سلسلہ میں رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا منظور نعمانی مدظلہ اپنے زمانۂ طالب العلمی (۱۳۴۴ھ) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس زمانے میں دارالعلوم دیوبند کے جو طلبہ اپنی اصلاح کے لئے کسی صاحبِ ارشاد شیخ سے تعلق قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ یا تو دیوبند میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن مجددی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق قائم کر لیتے تھے۔ یا پھر حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھانہ بھون جایا کرتے تھے۔ (الفرقان ربیع الآخر ۱۳۹۳ھ ص ۳۷" اسی طرح حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں

"حضرت ممدوح یعنی مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ) نہ صرف عالم اور مفتی ہی تھے بلکہ عارف باللہ اور صاحبِ باطن اکابر میں سے تھے۔ بیعت و ارشاد کا سلسلہ مستقلاً قائم تھا اور ہزارہا بندگانِ خدا اطراف ہندوستان میں آپ کی باطنی تلقین و تربیت سے فیضیاب ہو کر مراد کو پہونچے۔ اور یہ سلسلہ دور دور تک پھیلا۔ آپ حضرت اقدس مولانا

---

[1] دیکھئے اخبار مہاجر دیوبند مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۲۸ء ص ۵۔

شاہ رفیع الدین دیوبندی قدس سرہ مہتمم ثانی دار العلوم دیوبند کے ارشد خلفاء میں تھے۔ اور سلسلہ نقشبندیہ کے نہایت ہی صاحب حال اور ممتاز مشائخ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔" (فتاویٰ دار العلوم ج ۱ صفحہ ۳)

اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کے بہت بڑے عارف باللہ اور ولی کامل تھے۔ اور آپ سے خواص وعوام کو روحانی اور باطنی فائدے حاصل ہوتے تھے۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی (م ـــــ ھ) نے بھی مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدا رسیدہ ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ صاحب نزھۃ الخواطر نے لکھا ہے۔

وکان کثیر الافاضۃ قوی النسبۃ	بکثرت لوگوں کو فیض پہنچاتے تھے۔ آپ
یداوم علی حلقۃ الذکر والتوجہ	قوی النسبۃ تھے۔ حلقۂ ذکر اور توجہ
وتذکر لہ کشوف وکرامات	کا معمول تھا۔ آپ کے بہت سے کشف و
(ج ۸ صفحہ ۳۲۱)	کرامات کے واقعات بیان کئے جاتے

ہیں۔

آپ کے مریدین| زمانہ قیام میرٹھ میں شہر میرٹھ اور ضلع میرٹھ کے بہت لوگ آپ سے وابستہ ہوئے اور باطنی تعلیم حاصل کی، آپ کے خلفاء میں حضرت مولانا قاری محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت مشہور و مقبول ہوئے اور ان سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ بہت پھیلا،

حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مشہور استاذ حدیث بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، مگر مولانا کو اجازت آپ کے مجاز حضرت مولانا قاری محمد اسحٰق صاحبؒ سے حاصل تھی، اس لئے کہ حضرت مفتی صاحب کی وفات ہو چکی تھی، مولانا مرحوم سے بھی یہ سلسلہ بہت کافی پھیلا، حضرت مہتمم صاحب دار العلوم مدظلہ نے لکھا ہے۔

"قاری صاحب ممدوح کے مجاز خلفا میں سے اول نمبر کی شخصیت فاضل یگانہ حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنیؒ تھے، . . تقسیم ملک کے بعد مولانا ممدوح پاکستان تشریف لے گئے . . . اس کے بعد آپ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی اور مستقلاً وہیں دیارِ حبیب میں مقیم ہیں (چند سال ہوتے وفات ہوگئی ۔ ظفیر) آج مدینہ منورہ میں بحمد اللہ آپ کا ایک حلقہ ہے، اطراف سے آنے والے حجاج آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں یہ وہی سلسلۂ نقشبندیہ کا فیض ہے جو حضرت مفتی اعظم ہند (مفتی عزیز الرحمن صاحب) کے سلسلہ سے پہنچا، اس لئے مفتی اعظم کا سلسلۂ فیض ہندوستان اور پاکستان سے گذر کر آج حجاز میں بھی اپنا کام کر رہا ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم ص۳۹ ج۱)

خود مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے کو کبھی ظاہر نہیں فرماتے تھے، یکسو ہوکر افتاء اور درس و تدریس میں مشغول رہتے، اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ تصرف باطنی کی قوت عطا کر رکھی تھی، مگر ایسا معلوم ہوتا کہ آپ کو اس سے کوئی مناسبت نہیں ہے، اگر دوسرے اپنی قوت باطنی کا اظہار کرتے، تو اسے بھی اس سے روکتے، اور اس طرزِ عمل پر ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے،

تصرف باطنی پر تنبیہ | مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک پیر بھائی مولانا محمد ابراہیم کراچوی جو خود بھی مجاز تھے، مفتی صاحبؒ کے پاس دیوبند آیا کرتے تھے ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک نانبائی والے کی دوکان پر تشریف لے گئے اس نے بد معاملگی کی، اور ناموزوں کلمات کہے، اس پر مولانا کراچویؒ کو جلال آگیا، صاحبِ تصرف تھے ہی، دکان پر تیز نگاہ ڈالی تو اس کا سارا سامان اُلٹ پلیٹ ہوگیا، دکان دار یہ دیکھ کر سہم گیا، یہ خبر کسی طرح مفتی صاحب تک پہنچ گئی، یہ بات آپ پر شاق گذری، چنانچہ آپ نے تنبیہ فرمائی اور مولانا کراچویؒ نے جاکر دوکان دار سے معافی چاہی۔

والد محترم کے لئے توجہ باطنی | حضرت مفتی صاحبؒ بہت متواضع تھے اور کبھی اپنے کو روحانی طور پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے، آپ کے یہاں خفا بہت زیادہ تھا، مگر جب کوئی عجیب

پیش آ گئی تھی، تو کچھ کرنا ہی پڑتا تھا، آپ کے پدر بزرگوار حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی کا جب آخری وقت ہوا، تو ایک عجیب سی بے چینی کی کیفیت طاری ہوئی، اسی بے چینی میں گھر والوں سے دریافت کیا مولوی عزیز الرحمٰن کہاں ہے، مفتی صاحب فوراً کھانے سے اُٹھ کر تشریف لائے، والد محترم نے فرمایا عزیز الرحمٰن! تو نے میرے لئے انگلی تک نہیں اُٹھائی، منشا غالباً یہ ہوگا کہ دعا تک نہیں کی،

یہ سُن کر حضرت مفتی صاحب شرمندہ ہوئے اور والد کی چارپائی سے لگ کر بیٹھ گئے، سر پر رومال ڈال لیا اور گردن جھکالی، جس طرح مراقب ہوتے ہیں، چند منٹ بعد پاس بیٹھنے والوں نے دیکھا کہ والد محترم کی بے چینی میں افاقہ شروع ہوا، اور چہرہ کھل پڑا، پھر تھوڑی دیر بعد آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھائیں اور ہنستے ہوئے اپنے صاحبزادوں مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مطلوب الرحمٰن کو خطاب کر کے فرمانے لگے، شبیر! ذرا دیکھو تو یہ اوپر کیا ہے، اور مطلوب دیکھو تو سہی یہ کیا ہے؟ اسی حال میں کلمہ طیبہ پڑھا اور چند منٹ بعد روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، حضرت مفتی صاحبؒ اسی طرح مراقب بیٹھے رہے،

تصرف باطنی | اسی طرح ایک دفعہ دیوبند میں ایک قبر سے قرآن پڑھنے کی آواز سنائی دینے لگی، جوں ہی یہ خبر مشہور ہوئی، روزانہ وہاں بھیڑ جمع ہونے لگی، اور میلہ سا لگنے لگا، اس کی اطلاع حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ہوئی، آپ نے محسوس کیا کہ یہ ایک مستقل فتنہ بن جائے گا، جس وقت یہ آواز آتی تھی ایک دن اُسی وقت حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بنفس نفیس تشریف لے گئے، چنانچہ تلاوت کی آواز سُنائی دی، آپ نے یہ سُن کر فرمایا:

"کیوں لوگوں کو فتنے میں مبتلا کر رکھا ہے"

اس جملہ کے ساتھ ہی وہ آواز بند ہو گئی، اور پھر کبھی سُنائی نہیں دی،

تواضع اور انکساری | ورنہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ تو اس قدر منکسر المزاج اور متواضع تھے کہ کبھی کوئی یہ بھی سمجھ نہیں پاتا کہ یہ کوئی بڑے عالم یا بڑے بزرگ ہیں، آج کل کے پیروں کی طرح نہ کوئی پروپگنڈا

تھا، نہ بناؤ سنگھار اور نہ رکھ رکھاؤ، روزانہ بازار کا سودا خود جاکر لاتے، اور صرف اپنا ہی سودا نہیں لاتے، بلکہ اپنے محلے کے پاس پڑوس کا بھی، حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ نے لکھا ہے

"علم و عمل کے ساتھ تواضع اور کسرِ نفسی، اپنے کو چھپانا اور مٹانا آپ کا خاص رنگ تھا، بعد نماز عصر محلہ کے آس پاس کے گھروں کے دروازوں پر جاکر پوچھتے کہ بازار سے کسی کو کچھ سودا منگانا ہو تو بتلادے، گھروں سے آواز آتی، مفتی جی مجھے چار پیسے کی مرچیں لادو، کہیں سے آواز آتی تیل چاہئے، کسی گھر سے کہا جاتا نمک درکار ہے، حضرت ممدوح سب کے پیسے لے لیتے اور بازار جاکر ایک ایک فرمائشی سودا خریدتے ... اور یہ سب سامان رومال کے الگ الگ کونوں میں باندھ کر خود ہی لاتے، یہ کبھی گوارہ نہیں فرماتے کہ اس بوجھ کو کوئی اور اٹھائے، خود ہی یہ سامان اپنے کندھوں پر لادتے ... پھر خود ہی گھر جاکر یہ اشیاء فرمائش کنندوں کو سپرد فرماتے" (فتاوی صفحہ ۱۴ ج ۱)

دیوبند کے اطراف اُس زمانہ میں عموماً چھتیں مٹی کی ہوتی تھیں، برسات میں کبھی کبھی یہ چھتیں ٹپکنے لگتیں، اس موقع پر بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ محلہ کی بیواؤں کے مکانات کی چھت کی مرمت کرتے اور اس پر مٹی ڈلواتے،

غمِ آخرت اور علم سے ذوق ایک دن سوتے وقت قرآن پاک کی ایک آیت کے سلسلہ میں ایک علمی اشکال پیش آیا، جب حل نہ ہوا تو اٹھے اور سیدھے گنگوہ کے لئے پیدل روانہ ہوگئے کہ وہاں پہنچ کر حضرت مولانا گنگوہی سے دریافت کریں گے، اور پھر لوٹ آئیں گے، چنانچہ تہجد کے وقت گنگوہ پہنچ گئے اتفاق سے اس وقت حضرت گنگوہیؒ تہجد کے لئے وضو فرمارہے تھے،

"آپ نے سلام کیا فرمایا کون؟ عرض کیا، عزیز الرحمٰن، فرمایا تم اس وقت کیسے، عرض کیا ایک علمی اشکال لے کر حاضر ہوا ہوں اور وہ یہ ہے کہ قرآن تو نفع آخرت کو صرف اپنی ذاتی سعی میں منحصر بتا رہا ہے، جس سے غیر کی سعی کے نافع ہونے کی نفی نکل رہی

ہے اور حدیث میں ہے کہ غیر کی سعی مفید اور موثر ہوتی ہے اس تعارض کا حل سمجھ میں نہیں آتا، حضرت گنگوہیؒ نے وضو کرتے ہوئے برجستہ فرمایا کہ آیت قرآنی میں سعی ایمانی مراد ہے جو آخرت میں غیر کے کارآمد نہیں ہو سکتی کہ ایمان تو کسی کا ہو اور نجات کسی کی ہو جائے، اور حدیث میں سعی عملی مراد ہے، جو ایک کی دوسرے کے کام آسکتی ہے، اس لئے کوئی تعارض نہیں"

مفتی صاحب یہ واقعہ بیان کر کے فرماتے تھے کہ اس جواب سے ایک دم مری آنکھ سی کھل گئی، اور اس سے آئندہ کے لئے علم کا ایک بڑا دروازہ مرے لئے کھل گیا۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کشف و کرامت کے واقعات بھی بہت ہیں، مگر ان سب کے باوجود آپ کی یہ خوبی تھی کہ کبھی اپنے کو سرے سے کوئی حیثیت نہیں دی، علم و عمل میں مشغول رہے، لوگوں سے اس طرح ملتے کہ معلوم ہوتا آپ ایک معمولی مولوی ہیں، جس طرح عام طور پر ہوتے ہیں،

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق دارالعلوم کے علماء میں یہ بات مشہور ہے کہ آپ نے کسی کے متعلق کبھی کسی بدظنی کا اظہار نہیں فرمایا، اگر کوئی کہتا کہ فلاں ایسا ہے تو آپ خود توجیہ کرتے کہ منشا یہ ہوگا یعنی اس کا مقصد خیرخواہی تھا نہ کہ بدخواہی ۔ اسی طرح نہ کسی کو کبھی بُرا بھلا کہا۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ نے تحریر فرمایا ہے اس طرح بیس سال تک حضرت ممدوح (مفتی عزیز الرحمٰن قدس سرہٗ) سے متعارف ہوتے اور پھر خدمت میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی، اس طویل مدت میں میں نے کبھی ایک دفعہ بھی یہ نہیں دیکھا کہ حضرت ممدوح کو کسی پر غصہ آرہا ہے، اس کے متعلق ڈانٹ اور تنبیہ کے معمولی الفاظ بھی کہہ رہے ہیں، حلم و کرم اور حیا و مروت کا مجسمہ تھے، بڑے بڑے زبان دراز دشمنوں سے بھی سابقہ پڑے مگر اس مرد خدا کی زبان پر ادب و تعظیم کے سوا کوئی دوسرا لفظ چلتا ہی نہیں تھا۔ (عزیز الفتاویٰ مکمل ج ۱ ص ۴۳)

تصنیف و تالیف | آپ نے افتاء، درس، تدریس، اور ارشاد و بیعت کے ساتھ تصنیف و تالیف کی بھی خدمت انجام دی اس شعبہ میں اہم کام تو فقہ و فتاویٰ سے متعلق تھا

جس کا پہلے بھی تذکرہ آچکا ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر دوسرے علمی کام بھی آپ نے کیے جیسے حاشیہ میزان البلاغۃ منحۃ الجلیل ببیان ما فی معالم التنزیل"

حاشیہ میزان البلاغۃ حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) کی ایک تصنیف بزبان عربی فنِ بلاغت میں ہے، جو مختصر ہونے کے باوجود بہت جامع اور عمدہ ہے، اسکا نام "میزان البلاغۃ" ہے یہ کتاب گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی تھی ۱۳۱۱ھ سے پہلے طبع نہیں ہوئی، میرٹھ کے مشہور عالم دین مولانا بشیر الدین صاحبؒ کو اُس زمانہ میں اسکی طباعت کا خیال آیا، آپ نے اسکے تعارف میں لکھا ہے کہ

وکانت الی الآن مستورۃً فی الاغشیۃ ومحجوبۃ فی الاغطیۃ فقصدت بطبعہ لیعم فیضہ ولکن اردت قبل طبعہا ان اعلق علیہا الحواشی والتعلیقات وازید فیہا من نفسی بعض التحقیقات فلم اقدر علیہ لکثرۃ اشغالی فالتمست من فاضل الدھر وکامل العصر فرید الزمان مولانا المولوی عزیز الرحمٰن فزینہ بالحواشی المفیدۃ فی ایام معدودۃ

(میزان البلاغۃ ص۱)

وہ اب تک پردۂ گمنامی میں تھی میں نے اس کے چھاپ دینے کا ارادہ کرلیا تاکہ اس کا فیض عام ہوجائے، لیکن یہ بھی ارادہ کرلیا تھا کہ طباعت سے پہلے اس پر تعلیقات اور حواشی کا اضافہ کردوں اور اپنی طرف سے بعض تحقیقات ملحق کردوں لیکن کثرتِ مشاغل کی وجہ سے ایسا نہ کرسکا، لہذا میں نے کامل العصر اور فاضل زمانہ اور یکتائے روزگار مولانا مولوی عزیز الرحمٰن سے درخواست کی کہ وہ اس کتاب کو مفید حواشی سے مزین فرمادیں چنانچہ چند دنوں کی محنت سے انھوں نے یہ خدمت بحسن و خوبی انجام دے دی۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گو یہ حاشیہ چند دنوں میں لکھا ہے لیکن دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر قیمتی، جاندار اور عام ہے، اور مفتی صاحبؒ

کو اس فن سے کیسی عمدہ مناسبت تھی، اس کتاب کے حواشی پڑھتے تو صحیح اندازہ ہوگا۔

آپ یہ جانتے ہیں کہ "میزان البلاغۃ" کے مصنف عربی ادب کے ادیب تھے اور یہ کتاب متن متین کے طور پر آپ نے لکھی ہے اس لئے اس کی زبان شگفتہ، معیاری اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی سمونے کی سعی کی گئی، حضرت مفتی صاحب نے بھی عربی ہی میں اس کا حاشیہ تحریر فرمایا ہے اور ماشاء اللہ اس کی زبان بھی سلیس اور شگفتہ ہے، بہرحال ۱۳۱۱ھ میں آپ نے یہ حاشیہ لکھا ہے، اس کتاب کے ٹائیٹل پر کتاب کے نام کے نیچے بھی صراحت ہے

"بتحشیۃ العالم الزماں مولانا مولوی عزیز الرحمن الدیوبندی سلمہ المنان"

تین چار صفحات تک ہر حاشیہ کے ختم پر یہ لکھا ہوا نظر آتا ہے "مولانا مولوی عزیز الرحمن سلمہ الرحمن" اور کسی کسی حاشیہ کے ختم پر صرف "عزیز" لکھا ہوا ہے، اور کہیں صرف "ع" اور کہیں کچھ بھی نہیں۔

اس میں بین السطور بھی ہے اور یقیناً یہ بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہی قلم فیض رقم سے ہوگا، آخری حاشیہ ختم کرکے محشی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے

"ختم الکلام بحسن الاختتام اللّٰھم اجعلنا من الذین اذا احسنوا استبشروا واذا اساؤا استغفروا واختم لنا بالایمان والسلامۃ والاسلام وحقق لنا الحسنیٰ وزیادۃ واکرمنا بالمغفرۃ واخر دعوانا الخ"

یہ کتاب قاضی محمد عبد الہادی مہتمم مطبع مجتبائی شہر میرٹھ کے اہتمام میں مطبع مذکور سے چھپی ہے،

منحۃ الجلیل | مفتی صاحب رح کی دوسری تصنیف "منحۃ الجلیل ببیان مافی التنزیل للبغوی":

اور یہ ایک قرآن پاک کے حاشیہ پر ہے، جسے مطبع لامع النور آگرہ نے ۱۳۱۶ھ میں چھاپا: یہ تفسیر خاکسار کے سامنے نہیں ہے مگر سنا ہے کہ آپ نے بغوی (سنہ ۵۱۶ھ) کی مشہور و مقبول تفسیر معالم التنزیل کا اردو میں عطر کشید کر لیا ہے اور اسے قرآن پاک کے حاشیہ پر چھاپنے والو

نے چھاپ دیا ہے، یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے، افسوس یہ ہے کہ یہ حاشیہ پھر دوبارہ غالباً نہیں چھپا، ورنہ اس کے نسخے عام طور پر پائے جاتے، دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں بھی یہ قرآن پاک نہیں ہے معلوم ہوا ہے آپ کے صاحبزادے مفکر ملت حضرت مولانا مفتی محمد عتیق الرحمن صاحب مدظلہ کے پاس موجود ہے،

مختصر تذکرہ شاہ عبدالغنی مجددی وشاہ رفیع الدین دیوبندی | ابھی حال میں عزیز الفتاوی کا جدید اڈیشن جو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ نے پاکستان سے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا ہے اس میں حضرت مفتی عزیزالرحمن رحمۃ اللہ علیہ کے دو مختصر رسالے لگے ہوئے ہیں ایک میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددیؒ (م ۱۲۹۶ھ) کے حالات ہیں اور دوسرے میں آپ کے مرشد مولانا شاہ رفیع الدین دیوبندیؒ (م ۱۳۰۸ھ) کے حالاتِ زندگی ہیں، ان دونوں رسالوں کی ضخامت کوئی آٹھ صفحات ہیں ان دونوں رسالوں کے سلسلہ میں مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ مفتی پاکستان نے لکھا ہے

> "کراچی میں حضرت ممدوح (مولانا مفتی عزیز الرحمن) قدس سرہ کے ایک خلیفہ مجاز حضرت مولانا محمد ابراہیم (م ۱۳۴۵ھ) کے صاحبزادے مولوی عبداللہ صاحب مدرس دینیات سندھ مدرسہ کراچی سے حضرت ممدوح کے بہت سے قلمی مکاتیب کا ایک ذخیرہ ہاتھ آیا، جن میں فقہی تحقیقات اور فتاویٰ کے علاوہ آپ کی سیرت وسوانح کا بھی ایک بہت بڑا حصہ ہے، حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے قلم سے لکھے ہوئے کچھ حالات وواقعات اپنے شیخ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ مہتمم اول دارالعلوم دیوبند کے اور اسی میں کچھ حالات ان کے شیخ اور تمام علمائے دیوبند کے استاذ حضرت شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنی قدس سرہ کے اسی ذخیرے میں ملے، جو فی نفسہ نہایت مفید مضامین پر مشتمل ہیں اور اس لحاظ سے بھی ہمارے موضوع سے متعلق ہیں کہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی ایک مفید تالیف ہے" (عزیز الفتاویٰ مکمل ص ۲۳ج۱)

استفتائے جمعہ | حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مطبوعہ رسالہ "استفتاء جمعہ" کے نام سے ہے، جس کے متعلق ٹائیٹل پر نام کے نیچے درج ہے کہ

"جس کو جناب احمد موسیٰ جی . . . جنوبی افریقہ نے حضرت الحاج الحافظ الشیخ محمد عزیز الرحمن صاحب مفتی دار العلوم دیوبند سے تالیف کرا کے . . . شائع کیا"

اس میں نمازِ جمعہ سے متعلق دس سوالات کے مدلل جوابات ہیں، گاؤں اور شہر کی تعریف اور ان میں نمازِ جمعہ کے شرائط کی تفصیل پوچھی گئی ہے، حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے اس جواب پر علمائے دار العلوم دیوبند، علماء دہلی، علماء مرادآباد اور علماء کلکتہ کے دستخط ثبت ہیں۔

یہ رسالہ آٹھ صفحات میں پھیلا ہوا ہے، رسالہ ہر طرح قابلِ استفادہ اور لائق مطالعہ ہے اور اپنے عنوان پر مکمل و مدلل ہے، یہ غالباً ۱۳۳۶ھ میں شائع ہوا ہے۔

وفات | یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہ رجب ۱۳۴۶ھ سے دار العلوم دیوبند سے بعض باتوں کی وجہ سے علیحدہ ہو کر دیوبند ہی میں خانہ نشین ہو گئے تھے، اور افتاء کا کام بطور خود انجام دیا کرتے تھے، حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ڈابھیل میں درس بخاری دے رہے تھے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علالت کی وجہ سے وہاں اسباق بند تھے، لہذا لوگوں کا اصرار ہوا کہ حضرت مفتی صاحب رح ڈابھیل تشریف لا کر درس بخاری دیں، تاکہ طلبہ کا زیادہ نقصان نہ ہونے پائے، چنانچہ جب اصرار بڑھا تو آپ ڈابھیل تشریف لے گئے اور وہاں ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ سے "درس بخاری" شروع فرما دیا ابھی کل ڈیڑھ ماہ قیام کو گذرا تھا کہ ایک دو ممبران مجلسِ شوریٰ دار العلوم دیوبند کے ارجنٹ تار اور خطوط پہنچے کہ آپ چند دنوں کے لئے دیوبند آ جائیں، کچھ مشورے کرنے ہیں، مجبور ہو کر وہاں سے ۳ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ کو دیوبند آئے، یہاں گفتگو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی، ضعف و نقاہت پھر اس قدر لمبا سفر، یہاں پہنچ کر طبیعت مضمحل ہو گئی، ۱۰ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ تک پھر بھی

چلتے پھرتے رہے، جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد بھی تشریف لے گئے، ۱۰ رجمادی الثانی کو جمعہ کی نماز سے واپسی کے بعد ضعف بہت زیادہ بڑھ گیا، اور دو ایک دن میں صاحبِ فراش ہو گئے، علاج معالجہ جاری رہا، ۱۶ رجمادی الثانی ۱۳۴۷ھ تک ہوش و حواس قائم رہے اور آپ بولتے رہے، اس بیماری کے زمانہ میں آپ کا معمول تھا کہ متعدد قاریوں اور حفاظ سے قرآن پاک پڑھوا کر سنتے تھے ہاتھ میں برابر تسبیح رہتی تھی، ذکر زبان پر جاری رہتا، اسی دن تشنج کا سخت دورہ پڑا، لوگ مایوس سے ہو گئے مگر پھر حالت تھوڑی سی سنبھلی، ۱۷ رکو تیسرا دورہ پڑا، آواز بند ہو گئی، مگر سانس سے برابر ذکر خفی کی آوازیں آرہی تھیں اس تیسرے دورہ کے بعد امید کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا، دن بھر ملنے اور دیکھنے والے آتے رہے، بعد نماز مغرب پاس میں رہنے والوں نے سنا کہ آپ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ فرما رہے ہیں، حالاں کہ کوئی بظاہر وہاں نہیں تھا، جب اہل اللہ کو خبر ہوئی تو انھوں نے سمجھ لیا اب رخصت کا وقت قریب آگیا، ۱۷ رجمادی الثانی ۱۳۴۷ھ کا دن گذرا، رات کا اکثر حصہ اسی حالت میں گذرا، آخر پونے دو بجے رات میں روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور آپ واصل الی الحق ہو گئے، إنا للہ وإنا الیہ راجعون۔

صبح دس بجے تکفین کے بعد آپ کا جنازہ دار العلوم کے احاطہ مولسری میں لایا گیا، محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے، لوگوں نے آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی، فرمایا میری طبیعت ناساز ہے، لہٰذا حضرت مولانا اصغر حسین جو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد بھی ہیں، ان سے کہا جائے کہ نمازِ جنازہ پڑھائیں چنانچہ انھوں نے نماز جنازہ پڑھائی ـــــ ـــــ جس میں تمام اساتذہ، منتظمین، کارکنان، طلبا اور شہر کے تمام عوام و خواص نے شرکت کی، نمازِ جنازہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (م ــــ ھ) نے پڑھائی، اور گیارہ بجے دن میں قبرستان قاسمی میں ایک مجمع عظیم نے آپ کو سپرد خاک کیا طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ آپ کی تربت پر پتھر نصب ہے جہاں آپ آسودہ خواب ہیں، اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، اس

تربت والے پتھر پر یہ عبارت کندہ ہے،

"قدوۃ السالکین مفتی اسلام حضرت مولانا مفتی شاہ عزیز الرحمن عثمانی نقشبندی مجددی، دیوبندی تاریخ وفات ۱۷ر جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ"

آپ کی تربت حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے مزار سے پورب میں دو گز کے فاصلہ پر ہے،

مرض الوفات میں آپ پر فالج کا بھی اثر رہا، تیسرے دورے کے بعد، زبان بند ہوگئی، مگر دماغ کام کرتا رہا اس آخری دن بھی آپ اس بیماری میں سُنتے تھے مگر بول نہیں سکتے تھے، آپ کی یہ بیماری کچھ زیادہ لمبی نہیں تھی، ۱۱ر سے لے کر ۱۷ تک سات دنوں میں کام تمام ہوگیا۔

حلیہ | حضرت مفتی صاحب قدس سرہ درمیانہ قد کے تھے، چہرہ کھلا ہوا اور رنگ صاف ستھرا تھا لباس سادہ مگر پاکیزہ پہنتے تھے، نفاست پسند تھے، سر پر بال تھے یعنی کاکل رکھتے تھے، ٹوپی گول استعمال فرماتے جیسا کہ عام طور پر مشائخ استعمال کرتے ہیں ٹوپی پر عموماً عمامہ باندھتے تھے

نیک نفسی | طبیعت مرنجاں مرنج تھی، بقول حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کسی کے متعلق سوء ظن نہیں رکھتے ہیں، بلکہ بہتر محمل تلاش کرتے تھے، مفتی صاحب نے لکھا ہے

"مجھے کبھی یاد نہیں کہ ان کی مجلس میں کسی بُرے سے بُرے آدمی کی بُرائی کا ذکر ہوتا ہو، اور کسی کی غیبت کا تو تصور کیا ہو سکتا تھا، ان کے مواجہ میں اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں کوئی غلط بات بھی کہتا تو غایت حیا اور مروّت سے یہ کبھی نہ فرماتے کہ تم یہ بات غلط کہہ رہے ہو، بلکہ اس کی بات کا صحیح محمل تلاش کرکے یوں فرماتے تھے گویا آپ کا مطلب یہ ہے اس طرح اس کی غلطی کی اصلاح بھی فرما دیتے اور تغلیط و تردید کے الفاظ سے بچ جاتے تھے۔ (عزیز الفتاوی ص۱۲ و ص۱۳)

آپ کا قیام چھوٹی مسجد میں رہتا تھا جہاں پہلے آپ کے مرشد حضرت شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ دیوبندی کا قیام رہتا تھا، اس مسجد کی نئی تعمیر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ

علیہ نے اپنے زمانہ میں کرائی اور پہلے سے زیادہ وسیع ہوگئی، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ کمرہ اس مسجد میں اب بھی موجود ہے، یہ مسجد چھتہ والی مسجد سے سوگز کے فاصلہ پر پورب سمت میں واقع ہے، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اپنے خسر کے حوالہ سے لکھا ہے۔

"میں نے کبھی بھی حضرت ممدوح کو پیر پھیلا کر لیٹے ہوئے یا سوئے ہوئے نہیں دیکھا، ہمیشہ سکڑ کر اور گھٹنے پیٹ میں دے کر لیٹتے اور سوتے تھے، پہلے تو میں اتفاق پر محمول کرتا رہا، مگر جب مسلسل یہی طرز عمل دیکھا تو میں سمجھا کہ یہ اتفاقی بات نہیں بلکہ ارادی فعل ہے، ایک دن میں نے عرض کیا حضرت! آپ پیر پھیلا کر کبھی نہیں سوتے، فرمایا دنیا پیر پھیلا کر سونے کی جگہ نہیں ہے، اس کا مقام قبر ہے، جہاں آدمی پیر پھیلا کر سوئے گا۔" (فتاویٰ دار العلوم مکمل ص۴۳)

حضرت والا کبھی اپنی ذات کو اہمیت نہیں دیتے تھے، بلکہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ ہو جاتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے، حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ نے لکھا ہے کہ میں جب ۱۳۴۵ھ میں حج سے واپس آیا تو جہاں مدرسہ کے تمام طلبہ استقبال کے لئے آئے، حضرت اقدس مفتی صاحب قبلہ بھی اسٹیشن تشریف لائے، اور بڑی شفقت کا برتاؤ فرمایا،

حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے یہ بھی لکھا ہے

"حضرت ممدوح کی وفات کی شب میں حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی اور دوسرے بزرگوں کی معیت میں میں بھی حضرت ممدوح کے پاس حاضر ہوا، وقت اخیر تھا مگر حواس بالکل قائم تھے، مجھے دیکھ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور شفقت سے ہاتھ سر پر رکھ کر پیار کیا اور کچھ دعائیہ کلمات بھی فرمائے جو میں سن اور سمجھ نہ سکا" (فتاویٰ ص۴۵)

اولاد| حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کی روحانی اور علمی اولاد ہزاروں کی تعداد میں ملک و بیرون ملک میں پھیلی ہوئی تھی، مگر اسی کے ساتھ جسمانی اولاد بھی اللہ تعالیٰ نے عطا کر رکھی تھی، پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے ہوئے، دو لڑکیاں شادی سے پہلے گذر گئیں بقیہ اولاد کی آپ نے اپنی زندگی

میں شادی کردی تھی، چنانچہ تین لڑکیوں سے اولاد ہے اور وہ پھیل رہی ہے، مگر اس وقت صرف ایک لڑکی زندہ تھی،

لڑکے دو ہیں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مدظلہٗ صدر مجلس مشاورت کل ہند، اور قاری جلیل الرحمٰن صاحب مدظلہ مدرس درجہ تجوید دارالعلوم دیوبند، بحمداللہ یہ دونوں بعافیت ہیں اور صاحب اولاد ہیں، اور خوش و خرم ہیں، حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا مستقل قیام دہلی میں رہتا ہے آپ ندوۃ المصنفین دہلی کے بانی اور ناظم بھی ہیں اور قاری صاحب کا قیام دیوبند میں ہے قاری صاحب مدظلہ کے بڑے صاحبزادے مولانا فضیل الرحمٰن ھلال عثمانی اس وقت مالیر کوٹلہ کے مفتی ہیں، اس طرح یہ تیسری پشت بھی فتا کے فرائض انجام دے رہی ہے

ایک درخواست | حضرت مفتی عزیزالرحمٰن صاحب قدس سرہ نے معالم التنزیل کا جو خلاصہ "منحۃ الجلیل" کے نام سے کیا تھا اور جو پہلے شائع بھی ہو چکا ہے، وہ اس وقت نایاب ہے کیا اچھا ہوتا کہ خود حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اپنے نامی گرامی ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی یا مکتبہ برہان سے معیاری کتابت و طباعت کے ساتھ شائع فرما دیتے، تاکہ علماء اور طلبہ کے ساتھ عوام بھی اس سے استفادہ کرتے، اور اس طرح مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ محنت سبھوں کے لئے عام ہو جاتی، یا پھر دارالعلوم دیوبند اسے شائع کرنے کی کوئی صورت پیدا کرتا۔

مجھے یاد ہے کہ فتاویٰ کی اشاعت کے وقت اکثر ذمہ دار علماء کہا کرتے تھے کہ دارالعلوم روپے ضائع کر رہا ہے۔ بہت سارے فتاویٰ شائع شدہ ہیں ان کے مقابلے میں سے کون پوچھے گا، مگر دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ اس کی آٹھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں کتاب النکاح تک کے مسائل آگئے ہیں، اور اب کتاب الطلاق کی کتابت جاری ہے اور انشاء اللہ یہ پوری ہو کر رہے گی، آپ کو سُن کر حیرت ہوگی کہ اس کے تین اڈیشن آچکے ہیں اور آج جو قدر و منزلت اس فتاویٰ کی ہے کسی دوسرے فتاویٰ کی نہیں، اگر منحۃ الجلیل ببیان ما فی التنزیل"، کسی قرآن کے حاشیہ پر بڑے اہتمام سے چھاپ دیا گیا تو وہ بھی اسی طرح عوام میں قبول عام حاصل کرے گا، جس طرح فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مدلل و مکمل۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے فتاویٰ کے نمونے بھی آئندہ پیش کئے جائیں گے، اس وقت ناظرین کو صحیح طور پر معلوم ہو سکے گا کہ انھیں اس دور میں کیا امتیاز حاصل تھا، حضرت مفتی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے قاری جلیل الرحمٰن صاحب فرماتے تھے کہ دارالعلوم سے علیحدگی کے بعد بھی بعض فتاویٰ کے سلسلہ [illegible]

اس وقت اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے آئندہ اگر ہو سکا تو انشاء اللہ کچھ اور چیزیں پیش کی جائیں گی۔

اُردو کا ارتقاء تراجم قرآن کے آئینے میں

از حافظ مولانا محمد اسرائیل صاحب فرحت قاسمی (رفیق دائرۃ الرشید جامعہ عربیہ اشرفیہ بنیا بھوجپور ضلع بھوجپور بہار)

(۲)

حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی کی ابتداء سے تقریباً پون صدی تک ہندوستان میں سیاسی ابتری، ہنگامہ خیزی اور افراتفری کا دور رہا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سلطنتِ مغلیہ پر زوال کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ کمپنی پورے ملک میں اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنا چاہتی تھی۔ اِدھر مرابٹھے الگ سر اٹھا رہے تھے اودھ کی نوابی بھی سنگین حالات سے دوچار تھی۔ نواب حیدرآباد اور ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں بھی ایک عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ یہ کل طاقتیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو رہی تھیں پورا ملک انھیں ناگفتہ بہ حالات میں کراہ رہا تھا مسلمان ان ہی سیاسی چکیوں میں پس رہا تھا۔ ملک کا ذی علم اور اہلِ قلم طبقہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ علمی خدمات اور تصنیف و تالیف کے لئے جو خوش گوار اور پُر سکون ماحول ہونا چاہیئے وہ تقریباً مفقود تھا۔ ذہنی اور روحانی اطمینان معدوم ہو چکا تھا اس کے قبل اہلِ علم اور صاحبِ فکر و نظر کے جو مختلف مکاتب تھے اپنے طور پر کچھ علمی خدمات انجام دیتے رہے مگر انیسویں صدی کا ماحول ان کے لئے بھی سازگار نہ تھا ہاں یہ ضرور تھا کہ ہوشمند اور فکر و بصیرت والے لوگ بجائے کوئی ٹھوس اور علمی کارنامہ انجام دینے کے ذہنی سکون کے لئے گیسوئے اردو کے پیچ و خم کو سنوارنے میں مصروفِ کار تھے اس دور میں اُردو کے مشہور شاعر تو بہت ہوئے اِن میں بہت

سے صاحبِ دیوان بھی ہوئے مگر علمی میدان میں شاید ہی کوئی ایسا فرد اٹھا ہو جو تصنیف و تالیف کے ذریعہ ٹھوس، اور اساسی خدمات انجام دے کر ممتاز حیثیت کا مالک بنا ہو۔

سیاسی بحران، اور حالات کی ہولناکیوں کے باعث انیسویں صدی کے ستر برس تک بڑے پیمانے پر ہندوستان میں کوئی علمی اور دینی ادارہ بھی وجود میں نہیں آیا تھا ویسے چھوٹے چھوٹے مکاتب و مدارس ضرور تھے جن میں تعلیم و تدریس کا کام جاری تھا۔ مگر بالکل محدود پیمانے پر مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ان کی معاونت و امداد اوران کے باقی رہنے کے دوسرے ذرائع بھی کالعدم ہو چکے تھے۔ جن سے ان اداروں میں ایک مردنی چھائی ہوئی تھی۔ عام طور پر اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کا فقدان تھا جو کسی بڑے اور اہم کام کے لئے لزوم کی حیثیت رکھتا ہے:۔

ملک کا یہی وہ تاریک اور بھیانک دور تھا جس سے علم کا کارواں گذر رہا تھا، ایسے دل شکن حالات میں ظاہر ہے قرآن کا ترجمہ و تفسیر جیسا اہم اور ٹھوس کام کتنا مشکل ہے اندازہ قیاس اور آثار و قرائن بھی اس پر شاہد عدل ہیں اور اردو کے مشہور اہلِ قلم نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس قیامت خیز دور میں ترجمہ و تفسیر کی کوئی ٹھوس خدمت نہیں ہوئی۔

آخر کار اس ہنگامہ خیزی اور افراتفری کا نتیجہ ۱۸۵۷ء میں غدر کی شکل میں ظاہر ہو گیا مغل سلطنت کے بچے کھچے آثار اور برائے نام اقتدار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اب ہندوستان کے مسندِ حکومت پر قابض ہو گئی مسلمانوں کے ہاتھوں سے سلطنت گئی تھی اس لئے انھیں اس کا زیادہ ملال تھا اس حزن و یاس اور اندوہ و غم میں تقریباً پندرہ (۱۵) سال کا زمانہ گذر گیا۔ بالآخر ۱۸۶۰ء-۱۸۷۰ء [1] سے ہی ہندوستان کے اندر کئی علمی ادارے وجود میں آنے شروع ہو گئے تھے دارالعلوم دیوبند ۱۸۶۷ء کے ۹ سال بعد ۱۸۷۶ء میں قیام عمل میں آیا مدرسۃ العلوم علی گڑھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، ندوۃ المصنفین دہلی اور اس طرح کے یکے بعد دیگرے چھوٹے بڑے پیمانے کے کئی دوسرے علمی ادارے قائم ہوئے ۱۸۵۷ء کے تقریباً ایک نسل کے بعد علوم و فنون کا کارواں تازہ دم ہو کر علم و ادب

[1] سن توجہ طلب ہے۔ برہان

کی راہ پر پھر رواں دواں ہوگیا۔

علی گڑھ سے جو شخصیتیں بساطِ علم و ادب پر جلوہ گر ہوئیں ان میں خصوصیت کے ساتھ سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکار اللہ صاحب، علامہ الطاف حسین حالی، اور علامہ شبلی نعمانی تھے۔ اور مرکز العلوم دیوبند سے رشد و ہدایت کے آفتاب و ماہتاب بن کر جو چمکے ان میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ مولانا محمد یعقوب گنگوہیؒ، مولانا رشید احمد صاحب، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ، خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:۔

(۷) حضرت مولانا ابو محمد ابراہیم صاحبؒ اسی دوران ۱۸۸۴ء آرہ (ضلع بھوجپور) بہار کے رہنے والے مولانا ابو محمد ابراہیم صاحبؒ نے قرآنِ پاک کے صرف پہلے پارے کی تفسیر لکھی جو تفسیر خلیلی کے نام سے موسوم ہوئی وہ تفسیر ہمارے پیشِ نظر ہے، اس سے چند اقتباسات نقل کئے جا رہے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کا لفظی ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:۔

"ساری خوبیاں خدا ہی کے لئے ہیں جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔ بڑا ہی مہربان نہایت ہی رحم والا، انصاف کے دن کا مالک تجھی کو ہم پوجتے ہیں اور تجھی سے ہم لوگ مدد چاہتے ہیں تو ہم کو سیدھی راہ چلا ان لوگوں کی راہ جن کو تو نے نوازا اُن کی راہ نہیں جن پر تو غصہ ہوا اور بھٹکنے والوں کی راہ:۔

سورۂ بقرہ کا چھٹا رکوع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں یہ آیت مذکور ہے۔ اس کا ترجمہ مولانا ابو محمد ابراہیم صاحبؒ نے یوں فرمایا ہے

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝	اور (یاد کرو) جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم تم نے بچھڑا پوجنے کے سبب سے اپنا آپ بگاڑا اب اپنے پیدا کرنے والے کی طرف پھر رجوع کرو اور اپنا مارا جانا اختیار کرو تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک یہی بات اچھی ہے رجب کے

تم لوگوں نے موسیٰ کے حکم کی تعمیل کی) تو خدا بھی تم پر
پھر مہربان ہوگیا اور وہ بڑا ہی معاف کرنے والا
مہربان ہے۔

مذکورہ تراجم کے یہ وہ نمونے ہیں جو ۱۸۸۰ء کے پہلے کئے گئے اور اس وقت تک اردو کی ترقی کی رفتار بہت سُست تھی چوں کہ اس وقت تک کوئی علمی اِدارہ قائم نہیں ہوا تھا اور نہ کوئی اہم اور علمی ادبی شخصیت ایسی پیدا ہوئی تھی جس کا اُردو پر احسانِ عظیم ہو اور جس نے اُردو میں استعمال ہونے والے الفاظ کو جو کیچڑ میں پڑے ہوئے تھے انھیں صاف ستھرا کر کے دُکانِ ادب کی زینت بخشی ہو اس کام کے لئے ایک ایسی شخصیت وجود میں آئی جس نے ایک طرف مسلمانانِ ہند کو رفعت و بلندی سے ہم کنار کیا تو دوسری طرف علوم و فنون اور زبان و ادب پر اتنا بڑا احسان کیا کہ جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا میری مراد اس سے سرسید احمد خاں کی ذاتِ گرامی ہے:-

⑤ سرسید احمد خاں | زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا ؎ کہ بڑھ کے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

سرسید احمد خاں کے دل میں مسلمانوں کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ زندگی بھر مسلمانوں کی سربلندی کی خاطر مشقتیں جھیلتے رہے، طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرتے رہے زبان و ادب اور علم و فن کی ترقی اور قوم کی عزت و عظمت کے لئے وہ سب کچھ برداشت کرتے رہے جو ایک ہمدرد قوم اور غم گسار کو کرنا چاہیئے "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" ان کے کارناموں میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جہاں انہوں نے دوسری طرح کے کارہائے نمایاں انجام دیئے قرآن پاک کی تفسیر لکھ کر علم و ادب کا ایک ایسا گراں قدر سرمایہ چھوڑ گئے جو ہمیشہ جلی حرفوں میں لکھا جاتا رہیگا اردو زبان جس مقام پر سیکڑوں سال میں بھی نہیں پہونچی تھی سرسید نے چند سالوں میں وہاں پہونچا دیا ایسے ایسے بلیغ تشبیہات و استعارات اور روزمرہ کے محاورات ایجاد کیے اور سلاست و صفائی برجستگی و چُستی الفاظ کی بندش اور خوشنما ترکیبوں سے اردو کا دامن اسطرح مالامال کیا کہ ۱۸۹۰ء سے قبل کی اُردو اور ۱۸۹۰ء کے بعد کی اُردو میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا غیر مانوس الفاظ ژولیدہ تراکیب

جنکے استعمال سے اُردو میں دریا کی روانی شہد کی شیرینی اور سلاست و شگفتگی نہ تھی، سر سیّد احمد خاں نے ان اسقام پر انگلی رکھکر ایک ایک سقم کو دُور کیا اور ایک ایک لفظ کو چُن چُن کر ایسی مناسب جگہ پر اس کو فٹ کیا گویا وہ لفظ اسی جگہ کے لئے وضع کیا گیا ہو اس طرح اسکے قبائح کو محاسن سے اغلاط کو صحت سے ژولیدگی کو برجستگی سے اور رکاکت کو سلاست سے بدل دیا۔ اور اُردو کی راہ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت انہوں نے اختیار کی اُردو ادب کی تاریخ میں وہ کارنامے انجام دیئے گئے کہ تاریخ ادب کے صفحات پر تا حشر زرّیں حرفوں میں لکھا جاتا رہے گا۔ وہ اُسلوبِ جدید کے بہت بڑے موجد تھے۔

سطورِ بالا میں سر سیّد احمد کی خدماتِ جلیلہ کا اختصاراً ذکر آ گیا ہے۔ انہوں نے علمی ادبی اور ملّی خدمات کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھی جو "تفسیر القرآن" کے نام سے موسوم ہے مذکورہ بالا سطور میں آیاتِ قرآنیہ کے پانچ اقتباسات کا اُردو ترجمہ پیش کیا جا چکا مندرجہ ذیل آیت کا ترجمہ سر سیّد احمد خاں اِس طرح کرتے ہیں:—

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی ...... الخ — اور (یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم تم نے اپنی جانوں پر بچھڑا بناکر ظلم کیا پھر معافی چاہو اپنے پیدا کرنے والے پس مار ڈالو اپنے آپکو یہ اچھا ہے تمہارے لئے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک پھر (خدا نے) تمکو معاف کیا ہاں وہ بڑا معاف کرنے والا بڑا مہربان ہے ؞

دوسرے پارے کے دوسرے رکوع کا ترجمہ شاہ مراد اللہؒ شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمہم اللہ کے تراجم سے جو اسے پیش کیا جا چکا ہے۔ اب ملاحظہ ہو سر سیّد احمد خاں نے اس کا ترجمہ کس طرح کیا ہے؟

فَاذْكُرُونِىٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِىْ ۔ الخ پھر مجھکو یاد کرو میں تم کو یاد کرونگا اور میرا شکر کرو اور ناشکری مت کرو۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو مدد چاہو صبر کرکے

اور نماز پڑھنے سے بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے
ساتھ ہے اور مت کہو ان لوگوں کو جو مارے جاویں
اللہ کی راہ میں مردے - بلکہ وہ زندہ ہیں ولیکن تم نہیں
جانتے اور ہم تمہارا امتحان کریں گے - ایک چیز سے
ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں
کے نقصان سے بشارت (خوشخبری) دے
صبر کرنے والوں کو

سورۃ بقرۃ کی آخری آیت کا ترجمہ یہ ہے -

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا الخ تکلیف نہیں دیتا اللہ کسی کو مگر بقدر اس کی طاقت
کے اس کے لئے ہے جو اس نے کمایا اور اس پر ہے
جو اس نے کمایا اے پروردگار ہمارے ہم کو مت
پکڑ اگر ہم نے بھول کی یا چوک کی ہے اے پروردگار ہمارے
اور مت رکھ ہم پر بھاری بوجھ جس طرح کہ تو نے رکھا اس کو
ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے تھے اے پروردگار ہمارے اور
اور مت رکھ ہم پر وہ چیز جس کی برداشت کی طاقت
ہم کو نہیں اور معاف کر ہم سے اور بخش ہم کو اور مہربانی کر
ہم پر تو ہی مولا ہے پھر مدد کر ہماری کافروں کی قوم پر

(۶) **ڈپٹی نذیر احمد** | سرسید احمد خاں کے رفقاء کار میں مولانا ذکاء اللہ، مولانا الطاف حسین حالی
اور ڈپٹی نذیر احمد تھے جنہیں اردو کے عناصر اربعہ کہا جاتا ہے - ڈپٹی نذیر احمد، سرسید
احمد خاں کے ہمعصر تھے - اور دونوں ایک دوسرے کے رفیق کار تھے - عام طور پر ہمعصروں
کے درمیان جو چشمک اور رقابت ہوتی ہے یہاں اس کا تصور تک نہ تھا - بخلاف اس کے

سر سید احمد کو اگر شہنشاہ مان لیا جائے تو یہ لوگ ان کے وزرا ر تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد بہت سی اصلاحی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں "توبۃ النصوح" کا بہت اونچا مقام ہے۔ انھوں نے ہر صنفِ ادب پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ناول افسانہ علمی مقالات سیر و سوانح اور علمی، ادبی اصلاحی مضامین پر مشتمل ان کی تخلیقات ہیں۔ منجملہ ان کے وہ قرآن پاک کے مترجم بھی تھے۔ "قرآن مجید مترجم" کے نام سے قرآنِ پاک کا مکمل ترجمہ انھوں نے کیا ہے ان کے ترجمے میں شگفتگی، سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت کا ایک دریا موجزن نظر آتا ہے۔ مذکورہ نمونوں میں جن آیاتِ قرآنیہ کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ انہی آیات کے تراجم یہاں دیے جاتے ہیں

پہلا پارہ چھٹا رکوع

وَاِذْ قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِہٖ یٰقَوْمِ الخ

اور وہ وقت بھی یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو! تم نے بچھڑے کی پرستش) کے اختیار کرنے سے اپنے اوپر (بڑا ہی) ظلم کیا تو (اب) اپنے خالق کی جناب میں توبہ کرو اور (وہ یہ ہے کہ اپنے لوگوں کے ہاتھوں سے) اپنے تئیں ہلاک کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے اس کے نزدیک تمھارے حق میں یہی بہتر ہے پھر (جب تمھاری طرف سے تعمیل حکم کی آمادگی ظاہر ہوئی تو) خدا نے تمھاری توبہ قبول کر لی بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

دوسرے پارے کے دوسرے رکوع کے ترجمے اوپر گذر چکے ہیں:۔ ڈپٹی صاحب کا ترجمہ یہ ہے۔

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ الخ

تو تم ہماری یاد میں لگے رہو کہ ہمارے یہاں بھی تمھارا ذکر (خیر) ہوتا ہے اور ہمارا شکر کرتے رہو اور ہماری

ناشکری نہ کرو مسلمانو! (تم کو کسی طرح کی مشکل پیش
آجائے تو اس کے مقابلے کے لئے) صبر اور نماز سے مدد
لو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔ اور جو
لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کو مرا ہوا نہ کہنا
(وہ مرے نہیں) بلکہ زندہ ہیں۔ مگر (ان کی زندگی کی
حقیقت) تم نہیں سمجھتے اور البتہ ہم تم کو تھوڑے سے
خوف سے اور بھوک سے اور مال اور جان اور پیداوار
(ارضی) کی کمی سے آزمائیں گے اور اے پیغمبر! صبر کرنے
کرنے والوں کو (خوشنودئ خدا کی اور کشائش کی)
خوش خبری سنا دو۔

سورۂ بقرہ کی آخری آیت
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا الخ

اللہ کسی شخص پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اسی قدر جس (کے
اٹھانے کی) طاقت اس کو ہو جس نے اچھے کام کئے تو
(ان کا نفع بھی) اسی کے لئے ہے۔ اور جس نے برے کام
کئے (ان کا وبال بھی) اسی پر اے ہمارے پروردگار۔
اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہم کو (اس کے وبال
میں) نہ پکڑ اور اے ہمارے پروردگار جو لوگ ہم سے
پہلے ہو گزرے ہیں جس طرح تو نے ان پر (ان کے
گناہوں کے پاداش میں احکام سخت کا) بار ڈالا
تھا۔ ویسا بار ہم پر نہ ڈال اور اے ہمارے پروردگار
اتنا بوجھ جس (کے اٹھانے) کی طاقت ہم کو نہیں۔

ہم سے نہ اُٹھوا اور ہمارے قصوروں سے درگذر
کر اور ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم پر رحم فرما
تو ہمارا (حامی و) مددگار ہے تو ان لوگوں کے مقابلے
میں جو کافر ہیں ہماری مدد کر :-

ڈپٹی صاحب موصوف کا رنگ ترجمہ بہ نسبت دوسرے تراجم کے صاف اور واضح ہے۔ تحت اللفظ با محاورہ ترجمہ کے درمیان اضافی توسین سے مطلب بالکل واضح ہوجاتا ہے آپ نے یہ ترجمہ انیسویں صدی کے بالکل اخیر میں کیا تھا۔ زبان و بیان کی دل کش طرزِ نگارش اور مفاہیم و مطالب سے اتنی مقبولیت ہوئی کہ تیرہ (۱۳) برس کے اندر اس کے دس (۱۰) ایڈیشن شائع ہوگئے مجموعی طور پر اس کی مقدار لاکھوں سے زیادہ ہوگئی :-

(۵) مولانا احمد رضا بریلوی | مولانا احمد رضا صاحب بریلوی، سرسید احمد خاں اور ڈپٹی نذیر احمد کے ہم عصر تھے وہ ایک زبردست صلاحیت کے مالک تھے ان کی عبقریت کا لوہا پورے ملک نے مانا۔ مولانا موصوف نعت گو شاعر بھی تھے اگرچہ تذکرہ نگاروں نے انھیں کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ مولانا نے اپنی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا کہ مسلمانوں میں جہاں بہت سے فرقے تھے۔ ان میں ایک اور فرقے کا اضافہ ہوگیا۔ جس سے دین میں بہت سی نئی چیزیں داخل ہوگئیں اور اس طرح ملک گیر پیمانے پر دو (۲) جماعتیں وجود میں آگئیں، اہل دیوبند اور اہلِ بدعت ان دونوں کے درمیان عرصۂ دراز تک رسہ کشی چلتی رہی باہمی تنازعے اور تلخیوں نے اتنا طول کھینچا کہ دونوں کے درمیان علمی میدان میں افسوس ناک حد تک اختلاف کی گرم بازاری رہی مگر تقسیمِ ہند جو کہ مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑا المیہ ثابت ہوئی قدرتاً اس میں وہ شدت نہ رہی اور آج دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے قریب تر ہوتی جارہی ہیں فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں صاحب نے انیسویں (۱۹) صدی کے آخیر میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا اور مولانا سید محمد نعیم الدین نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ اس کی تفسیر

کی اس طرح اس تفسیر کا نام ہے :-

کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن مع خزائن العرفان فی تفسیر القرآن

ترجمہ تحت اللفظ ہے مگر اس کی زبان بہت صاف اور شستہ ہے

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ یٰقَوْمِ اِنَّکُمْ الخ	اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع لاؤ تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

دوسرے پارہ کے دوسرے رکوع کا ترجمہ

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ الخ	تو میری یاد کرو میں تمہارا چرچا کروں گا اور میرا حق مانو اور میری ناشکری نہ کرو۔ اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ بے شک اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔ اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں۔ انھیں مردہ نہ کہو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں۔ ہاں تمھیں خبر نہیں اور ضرور ہم تمھیں آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور پھلوں کی کمی سے اور خوش خبری سنا ان صبر کرنے والوں کو

تیسرے پارہ (سورۂ بقرہ کی آخری آیت)

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا الخ	اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر۔ اس کا فائدہ ہے جو اچھا کمایا اور اس کا نقصان ہے جو بُرائی کمائی اے رب ہمارے ہمیں نہ پکڑ اگر

ہم بھولیں یا چوکیں۔ اے رب ہمارے اور ہم پر
بھاری بوجھ نہ رکھ جیسا تو نے ہم سے اگلوں پر رکھا
تھا۔ اے رب ہمارے ہم پر بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں
سہار نہ ہو۔ اور ہمیں معاف فرما دے اور بخش دے
اور ہم پر مہر کر تو ہمارا مولا ہے تو کافروں پر ہمیں مدد دے۔

⑧ مولانا عبدالحق حقانی دہلوی | اُردو کی مشہور تصنیف جو "بیسویں صدی" کے آغاز میں انجام پذیر ہوئی وہ ہے "تفسیر حقانی" یہ مولانا عبدالحق دہلوی کی تفسیر ہے۔ حضرت موصوف نے تفسیر کے شروع میں ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جس کی طوالت صفحہ ۱۵۲ تک محیط ہے۔ اس مقدمہ میں انھوں نے اپنی دانست کے مطابق فرقۂ باطلہ پر لے دے کیا ہے۔ مسلم و غیر مسلم کے آرا پر ایک ایسی تنقید کی ہے جس سے اُن کے تبحرِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا مطالعہ کتنا وسیع تھا۔ انھوں نے بیسیوں مذاہب و مسالک پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور ان کے رد میں ناقابلِ تردید دلائل دیتے چلے گئے ہیں۔ آپ نے اپنا قلم تفسیر ہی تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ تواریخ و عقائد اور قصص و روایات، احادیث و فقہ کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اور اس طرح پر مقدمہ گوناگوں افادی پہلوؤں کا حامل ہو گیا ہے۔ ترجمہ کا اندازِ بیان یہ ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ الخ

اور یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے
میری قوم بلاشک تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا
پس توبہ کرو اپنے پروردگار سے پس قتل کرو اپنے آپکو
یہ تمہارے لئے تمہارے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے
پھر تم کو خدا نے معاف کیا بے شک وہ بڑا معاف
کرنے والا مہربان ہے

فَاذْكُرُونِيْ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ الخ

پس مجھے یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔ اور میرا شکریہ ادا کرو ناشکری نہ کرو۔ اے ایمان والو مدد لو صبر اور نماز سے بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور مت کہوان کو کہ جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں مردے۔ بلکہ وہ زندہ ہیں۔ لیکن تم نہیں دیکھتے اور بے شک ہم تمھارا امتحان کریں گے۔ کسی طرح خوف سے اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے اور خوش خبری دے صبر کرنے والوں کو۔

سورۃ البقرۃ کی آخری آیت :-

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا الخ

اللہ کسی کو طاقت سے باہر حکم نہیں دیتا ہے جس نے نیکی کمائی تو اپنے لئے اور برائی کی تو اپنے اوپر اے ہمارے رب نہ پکڑ ہم کو۔ اگر ہم سے بھول یا چوک ہو جائے۔ اے رب اور مت رکھ ہم پر بوجھ بھاری جیسا کہ تو نے ہم سے اگلے لوگوں پر رکھ دیا تھا۔ اے رب اور نہ اٹھوائیو ہم سے جس کی ہم میں طاقت نہیں اور در گذر کر ہم سے اور بخش ہم کو اور مہربانی کر ہم پر تو ہی ہمارا مولا ہے اور فتح دے ہم کو کافروں کی قوم پر۔

(باقی آئندہ)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تقسیم کے بعد

(۱۷)

سعید احمد اکبر آبادی

جنوری ۱۹۶۸ء کے شروع میں اپنا ٹرم پورا کرنے سے پہلے ہی نواب صاحب علی گڑھ سے رخصت ہو گئے، تو ڈاکٹر عبد العلیم وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کے سینیر پروفیسر تھے۔ اور وہ بھی عربی کے، علی گڑھ سے ان کا تعلق بہت دیرینہ تھا۔ اس بنا پر علی گڑھ کی روایات وخصوصیات اور اس کے تہذیبی کیرکٹر سے جو واقفیت ڈاکٹر صاحب کو ہو سکتی تھی باہر کے کسی شخص کو نہیں ہو سکتی تھی۔ غالباً یہی مصلحت تھی جس کے پیش نظر موصوف کا انتخاب اس عہدۂ جلیلہ کے لئے ہوا۔

ڈاکٹر عبد العلیم

لیکن افسوس ہے کہ یہ تجربہ ناکام رہا۔ یونیورسٹی کو اس سے فائدہ کے بجائے نقصان پہونچا۔ ڈاکٹر عبد العلیم نے جب اپنے عہدہ کا چارج لیا تو چونکہ گھر کے آدمی تھے اس بنا پر یونیورسٹی میں ہر جگہ اس پر عظیم مسرت کا اظہار کیا گیا۔ ہر فیکلٹی

اور اکثر ڈیپارٹمنٹس اور ہر ادارے نے الگ الگ ان کو شاندار استقبالیے دیئے۔ یہ سلسلہ دو ڈھائی مہینہ تک چلتا رہا۔ تقرر کے چند روز بعد ہی عید تھی۔ اس موقعے پر بھی اساتذہ و ملازمین کی جتنی بڑی تعداد عید کی مبارکباد دینے کی غرض سے علیم صاحب کے پاس آئی۔ شاید ہی کسی اور کے پاس آئی ہو۔ اور علیم صاحب نے بھی ان میں سے ایک ایک شخص کی خاطر تواضع کرنے میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی۔ اس بنا پر اسٹاف اور عملۂ انتظامیہ نے ہمیشہ ان کے ساتھ توقیر و احترام کا معاملہ کیا۔ اور ان کے بڑے پن کا لحاظ رکھا۔ لیکن افسوس ہے کہ طلبار میں ان کو وہ ہر دلعزیزی اور وقار حاصل نہیں ہو سکا جو عہدہ کے اعتبار سے ان کو حاصل ہونا چاہیئے تھا کیوں؟ اس میں کچھ دخل تو ان کے ذاتی امور اور معاملات کا ہے جن کو میں زیر بحث لانا پسند نہیں کرتا۔ اور کچھ اس بات کا ہے کہ وہ اچھے ایڈمنسٹریٹر نہیں تھے۔ ایک کامیاب ایڈمنسٹریشن کے لئے اعلیٰ قابلیت اور بے لوث و بے غرض زندگی کے علاوہ مستحکم قوتِ فیصلہ اور مضبوط قوتِ ارادی شرطِ اولین کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک ایڈمنسٹریٹر کا یہ فرض ہے کہ جب اس کے سامنے کوئی معاملہ آئے تو ٹھنڈے اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ کسی ذہنی تحفظ (Mental Reservation) کے بغیر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرے۔ اور پھر کسی نتیجہ پر پہونچکر اس کا فیصلہ کرے۔ لیکن جب وہ ایک فیصلہ کرلے تو اب سختی سے اس پر قائم رہے۔ یہ نہ ہو کہ کسی دباؤ یا خوف یا لالچ میں آکر اسے تبدیل کر دے۔

جہاں تک علیم صاحب کا تعلق ہے اس معاملہ میں وہ "اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی" کا مصداق ہیں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ نہایت ذہین طباع اور معاملہ فہم آدمی ہیں، موضوعِ زیر بحث کو فوراً سمجھ لیتے اور اس کی تہہ تک پہونچ جاتے ہیں۔ بولتے کم ہیں۔ لیکن جب بولتے ہیں تو ٹو دی پائنٹ بولتے ہیں۔ ان کی تقریر مختصر ہوتی ہے اور حشو و زوائد سے پاک ساتھ ہی وہ شریف خصلت، بامروت اور رحمدل انسان

ہیں۔ ایذا رسانی سے دور اور مرنج و مرنجان طبیعت کے مالک ہیں۔ لیکن یہ شریفانہ خصلت پرائیویٹ زندگی میں خواہ کیسی ہی قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہو ایڈمنسٹریشن میں اس سے پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور نظم و نسق میں خلل پڑتا ہے۔ کیونکہ ایڈمنسٹریشن کا دارو مدار عدل و انصاف پر ہے نہ کہ رحم اور کسی کی اندھا دھند مدد کرنے پر۔ اور ایک مجرم کے ساتھ رحم کرنا ایک ادارے ایک سوسائٹی اور ایک معاشرہ پر ظلم کرنا ہے۔ اپنی اس افتادِ طبع کے باعث علیم صاحب ایک فیصلہ پر مضبوطی سے قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ اور اسی افتادِ طبع کا یہ اثر تھا کہ ان کے فیصلہ ہمیشہ بے لاگ نہیں ہوتے تھے چنانچہ ان کے عہد میں کتنے فیصلے ہیں جن کا حال یہ تھا کہ آج اور، اور کل کچھ اور۔ امتحانات کی تاریخیں مقرر ہو گئی ہیں ان کا اعلان ہو چکا ہے۔ اور سب تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں۔ لیکن طلبا کے ایک وفد نے ان سے ملاقات کر کے تاریخوں کی تبدیلی کا مطالبہ کیا اور فوراً امتحانات کے ملتوی ہونے کا اعلان ہو گیا۔ آج ڈسپلن کمیٹی نے کسی طالب علم کے اخراج یا اُسے کوئی اور سزا دینے کا فیصلہ کیا ہے لیکن تھوڑے دنوں کے بعد ہی اس پر نظرِ ثانی ہوئی اور فیصلہ تبدیل ہو گیا۔ علیم صاحب کا عہد اس طرح کی مثالوں سے پُر ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایڈمنسٹریشن کا وقار باقی نہیں رہا۔ اور طلبا کے دماغ میں یہ خیال جم گیا کہ جا و بے جا، درست و نادرست جو مطالبہ بھی ہم چاہیں گے۔ وائس چانسلر سے منوالیں گے۔

چنانچہ آئے دن کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہوتا رہتا تھا۔ اور اس سلسلہ میں بعض اوقات علیم صاحب کے ساتھ اس قسم کا ناروا سلوک ہوتا تھا کہ دیکھنے والوں کو ان پر رحم آتا تھا اور ذاتی طور پر مجھے اب تک اس کا ملال ہے۔ اس بنا پر ان میں اور طلبا میں ہمیشہ کشیدگی رہی طلبا یونین کے جلسوں میں کھُلم کھُلا جس طرح ان پر تنقید کرتے تھے، میں نے طلبا کو کسی وائس چانسلر پر اس طرح کی تنقید کرتے نہیں سُنا۔ اس تنقید کے بعض اجزاء درست ہوتے تھے اور بعض نادرست بھی۔ لیکن لب و لہجہ غضب آلود اور توہین آمیز ہوتا تھا

اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ طلبار کا اعتماد حاصل نہیں کرسکے ۔

یہ سب کچھ تو تھا ہی کہ اتنے میں ۱۹۷۲ء کا رسوائے عالم ایکٹ آگیا ۔ اس نے جلتے پر تیل کا کام کیا یہ ایکٹ اس وقت بچے بچے کی زبان پر ہے اور اس پر جو تنقیدیں ہوئی ہیں وہ بھی سب کو معلوم ہیں ۔ (میرے نزدیک اس ایکٹ پر سب سے زیادہ جامع اور ٹھوس تنقید پروفیسر تیواری کی ہے) ۔ اس بنار پر اس ایکٹ کو بیان کرنے یا اس پر تنقید کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اس سلسلہ میں مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے وہ آخر میں کروں گا ۔ یہاں کہنا یہ ہے کہ علیم صاحب کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ ۱۹۶۵ء میں ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کو معطل کردینے سے جس فتنہ کا آغاز ہوا تھا علیم صاحب کے عہد میں ۱۹۷۲ء کے ایکٹ کی شکل میں اس کی تکمیل ہوگئی ۔ اس ایکٹ کی حشر سامانی کا یہ عالم ہوا کہ یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی ۔ ٹھیک اس وقت جب کہ امتحانات قریب تھے یونیورسٹی اچانک بند کردی گئی ۔ طلبار کو بارہ گھنٹے کے اندر اندر ہوسٹل سے نکل جانے کا فرمان صادر ہوگیا ۔ طلبار کی یونین معطل کی گئی ۔ اس کے عہدہ دار گرفتار ہوئے اس دار و گیر سے بعض پرانے اور نیک نام پروفیسر بھی نہ بچ سکے ۔ وہ بھی معطل کئے گئے اس اتھل پتھل کا نہایت افسوسناک اور لائق ہزار افسوس انجام یہ ہوا کہ تعلیم اور امتحان دونوں تل پٹ ہوگئے ۔ جس سے قوم کے نوجوانوں کی مستقبل کی زندگی متاثر ہونا لازمی امر ہے ۔ کیونکہ جب امتحانات اپنے متعینہ زمانہ سے سات آٹھ مہینے لیٹ ہوگئے، تو اندازہ کیجئے کہ آخری (فائنل) امتحان دینے والوں میں کتنے نوجوان ہوں گے جنھوں نے بیرونی ممالک میں یا ہندوستان میں ہی پروفیشنل تعلیم یا کسی اور ٹریننگ کے لئے یہاں یا کہیں اور داخلہ کا پروگرام بنا رکھا ہوگا ۔ یا وہ کسی مقابلہ کے امتحان میں شرکت کے امیدوار ہوں گے ۔ یا ان کو ملازمت کی توقع ہوگی ۔ اس صورتِ حال نے ان سب طلبار کی امیدوں، آرزوؤں اور امنگوں پر پانی پھیر دیا اور ان

غریبوں کا اور ان کے والدین کا دم گھٹ کے رہ گیا۔

پھر جب امتحانات شروع ہوئے تو کس طرح ؟ چونکہ نتائج جلد شائع کرنے تھے اس لئے وائس چانسلر صاحب کا حکم ہوا کہ بیرونی ممتحنین جنھوں نے امتحانات کے پرچے بنائے بھی تھے ان کے پاس کاپیاں نہ بھیجی جائیں۔ اور یونیورسٹی کے اساتذہ ہی گروپ کی شکل میں جلد از جلد کاپیوں کو جانچ کر ان امیدواروں کی قسمت کا فیصلہ کردیں۔ باخبر اصحاب جانتے ہیں کہ سمسٹر سسٹم کے ماتحت اول تو خارجی امتحان (External Assesment) اور داخلی امتحان (Internal Ass.) میں بہت زیادہ فرق کے باعث یونیورسٹی کا داخلی امتحان پہلے سے ہی بدنام تھا چنانچہ اس کا ثبوت موجود ہے کہ بعض مواقع پر ہمارے گریجویٹ یا پوسٹ گریجویٹ نوجوان کسی انٹرویو میں گئے ہیں اور وہاں جب انہوں نے اپنی مارک شیٹ (Mark Sheet) دکھائی تو محض اس بنیاد پر ان کا انتخاب نہیں ہوسکا کہ ان کے داخلی امتحان اور خارجی امتحان کے نمبروں میں بہت فرق تھا اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب خارجی امتحان کو بالکل ہی حذف کردیا جائے اور داخلی امتحان بھی اس طرح ہو کہ کاپیوں کو جلد از جلد گروپ کی شکل میں جانچ کر (متعلقہ شعبہ کے صدر کی نگرانی میں سہی) نتائج مرتب کرنے کی تاکید ہو تو اس امتحان پر کہاں تک اعتبار و اعتماد کیا جاسکتا ہے ؟

امتحان کی اس طرح جو ابتری ہوئی وہی تعلیم کی بھی ہوئی۔ یعنی ایک سمسٹر میں دو سمسٹر کی تعلیم کا آرڈر ہوا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مثلاً ایک شخص روزانہ سات گھنٹے دفتر میں کام کرتا ہے لیکن چونکہ یہ دفتر سے ایک مدت تک غیر حاضر رہا ہے اس لئے اب جب یہ واپس آیا ہے تو تلافی مافات کی صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ وہ روزانہ چودہ گھنٹے کام کرے گا تو فرمایئے کیا اس کو وہ شخص دفتر یا کام کسی کے ساتھ انصاف کہا جاسکتا ہے ؟ ہرگز نہیں پھر اس طرح تعلیم میں جو نقص پیدا ہوگا اس پر پردہ ڈالنے کی غرض سے خارجی امتحان

کا دستور امسال بھی اُڑا دیا گیا۔ اور داخلی امتحان کو اور بھی نرم کر دیا گیا ہے تعلیم اور امتحان دونوں میں یہ بدنظمی اس لئے پیدا ہوئی کہ یونیورسٹی پانچ ساڑھے پانچ مہینہ کے لئے بغیر کسی سبب کے اچانک بند کر دی گئی اور طلباء سے ہوسٹل خالی کرائے گئے اور یونیورسٹی پر پولس کا پہرہ بیٹھ گیا

یہ جو کچھ اندھیر مچا اور آفت آئی علیم صاحب کے عہد میں .... اور اُنکے حکم سے آئی۔ مجھکو اس کا یقین ہے کہ علیم صاحب جس مرنج مرنجان اور رحم دل طبیعت کے آدمی ہیں اس کی وجہ سے یہ سب چیزیں انکی اپنی پسند کی نہیں تھیں اور وہ ان پر خوش اور مطمئن ہرگز نہیں تھے لیکن اب انکی ایک اور کمزوری سامنے آئی اور وہ یہ کہ وہ عملاً حکومت کے آلۂ کار ہو کر رہ گئے علیم صاحب نے اپنے آپ کو مکمل طور پر وزارتِ تعلیم کے حوالے کر دیا۔ وہاں سے جو احکام آتے تھے علیم صاحب کے دستخط سے یونیورسٹی میں جاری ہوتے تھے لیکن قانون میں ذمہ داری سبب فعل پر نہیں بلکہ مباشر بالفعل پر آتی ہے۔ اس لئے تاریخ کا فرشتہ یہ سب کچھ لکھے گا علیم صاحب کے نامۂ اعمال میں ہی [1]

---

[1] لیکن سیاست کی شاطرانہ چالوں کی بوقلمونی ملاحظہ فرمائیے یوپی کے الیکشن میں مسلمانوں کا ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے عین اس موقع پر اخبارات میں اطلاع آئی کہ علیم صاحب نے استعفاء دے دیا ہے اور گورنمنٹ نے اسے منظور کر لیا ہے۔ حالانکہ جب وائس چانسلری کی مدت کے ختم ہونے میں صرف دو دن باقی رہ گئے تو اب استعفار کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ لیکن درحقیقت گورنمنٹ مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ یونیورسٹی میں جو کچھ ہوا علیم صاحب کی دھاندلی سے ہوا۔ گورنمنٹ کا اس میں دخل نہیں ہے اور مسلمان ان سے ناراض نہیں تو اب استعفا لیکر ان کو الگ کر دیا گیا ہے۔ اور اس طرح گویا مسلمانوں کے مطالبات کی ایک قسط منظور کر لی گئی ہے۔ چنانچہ اس خیال کو مستحکم کرنے کی غرض سے ادھر علیم صاحب علیگڑھ سے رخصت ہوئے، اور ادھر نظر بند طلباء رہا ہوئے۔ اور معطل اساتذہ بحال کر دیئے گئے۔ لیکن ایک شخص دریافت کر سکتا ہے کہ اگر علیم صاحب گورنمنٹ کے نزدیک مجرم اور مسلمانوں کی بے چینی اور یونیورسٹی کی تخریب کے ذمہ دار تھے تو ان کو اس انعام کے دیے کا کیا مطلب ہے۔ کہ وہ یونیورسٹی سے الگ ہوئے اور انہیں ایک عظیم سرکاری ادارے کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔

تمام ماہرین تعلیم کی متفقہ رائے کے مطابق ایک یونیورسٹی کے لئے سب سے مقدم اور ضروری بات یہ ہے کہ وہ اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار (Autonomous) ہو لیکن بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک اس یونیورسٹی کے معاملہ میں اس اصول کو جس طرح پامال کیا گیا ہے پورے ملک میں کسی یونیورسٹی کے معاملہ میں اس طرح پامال نہیں کیا گیا۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کا ادارہ ہے اور مسلمان بحیثیت ایک فرقہ (Community) کے اب تک حکومت کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں؟

علیم صاحب نے اپنے دور کے آخری دنوں میں پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کو پرو وائس چانسلر مقرر کر دیا تھا۔ نظامی صاحب بین الاقوامی شہرت کے اسکالر، اردو اور انگریزی کے بلند پایہ مصنف اور محقق ہیں۔ ان کا اصل مضمون ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ ہے۔ لیکن اسلامی تصوف پر ان کی تصنیفات کیف و کم کے اعتبار سے اس مرتبہ کی ہیں کہ آج ان کو تصوفِ اسلام کی تاریخ پر ایک سند (Authority) تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے اسکالر عام طور پر انتظامی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ لیکن نظامی صاحب اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ انہوں نے پہلے ایس۔ ایس ہال کے پرووسٹ (Provost) اور طلبا کے معاملات کے ڈین مقرر ہو کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ انتظامی امور و معاملات میں بھی نہایت چست، مستعد، محنتی اور ہوش و گوش کے انسان ہیں۔ فیصلہ بہت جلد کرتے ہیں۔ اور آج کے کام کو کل پر اٹھا کر نہیں رکھتے ہیں۔ اس بنا پر اس میں شبہ نہیں کہ علیم صاحب عمر رسیدہ اور اپنے کچھ عوارض کے باعث زیادہ محنت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو نظامی صاحب سے زیادہ بہتر اور معتمد اور معین و مددگار نہیں مل سکتا تھا[1]

---

[1] یہ الگ بات ہے کہ نظامی صاحب سے دیرینہ اور عزیزانہ تعلق کی بنا پر میری ہمیشہ یہ رائے رہی اور اب بھی ہے کہ ان کو ایڈمنسٹریشن کی دردِ سر اور گراں بار ذمہ داریوں سے الگ رہنا چاہیے۔ آج

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بدقسمتی سے ۱۹۶۲ء ایکٹ کے سلسلے میں یونیورسٹی میں جتنے ہنگامے ہوئے، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے وہ سب نظامی صاحب کی پرووائس چانسلر شپ کے زمانے میں ہوئے اور یونیورسٹی کے کم وبیش سبھی کاموں کا بوجھ انھوں نے اپنے سر لے رکھا تھا۔ اس لئے ان حالات سے یونیورسٹی کے اندر اور یونیورسٹی کے باہر مسلمانوں میں جو دل گرفتگی اور بیزاری پیدا ہوئی اسکا ذمہ دار عام طور پر نظامی صاحب کو قرار دیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کے اندر بھی ایک بڑا طبقہ اس خیال کا پیدا ہوگیا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے نظامی صاحب کی دھاندلی اور ضد سے ہو رہا ہے۔ ورنہ علیم صاحب اس سے متفق نہیں ہیں اور ان کی ہمدردیاں مظلوم طلباء اور اساتذہ کے ساتھ ہیں۔ میں نے خود بڑی حیرت سے سنا اور دیکھا کہ کل جو لوگ علیم صاحب کے سب سے بڑے نقاد تھے آج وہ ان کے انتہائی مداح تھے۔ یہ تعجب اور بھی زیادہ ہوا جب میں نے یونیورسٹی میں تبلیغی جماعت کے ایک ممتاز رکن کو علیم صاحب کی شان میں ایک پرزور مدحیہ قصیدہ پڑھتے اور اس کے بالمقابل نظامی صاحب کی مذمت کرتے سنا۔

لیکن درحقیقت اس طرح کی خیال آرائیاں واقعات کے سرسری مطالعہ اور یونیورسٹی کے آئین وضوابط سے بے خبری کا نتیجہ ہیں۔ یونیورسٹی کے آئین کی رو سے پالیسی تمام تر وائس چانسلر کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں اس کا فیصلہ ہی حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے۔ پرووائس چانسلر صرف اس پالیسی کو عمل میں لانے اور اس کے مطابق کام کرنے کا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔

آجکل کے عام معاملات کے پیشِ نظر یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ ہرگز ایسی اہم اور وقیع چیز نہیں ہے کہ نظامی جیسا شخص اپنا مطالعہ، تحقیق، تصنیف وتالیف، صحت وتندرستی، دل کا چین اور دماغ کا سکون یہ سب کچھ قربان کرکے اس متاعِ کم مایہ کی قیمت ادا کرے وائس چانسلر شپ کے لئے دوسرے لوگ بھی ہو سکتے ہیں لیکن علم وتحقیق کی دنیا میں جو کام نظامی کر سکتے ہیں وہ دوسرا نہیں کر سکتا۔

ذمہ دار ہوتا ہے ۔ وائس چانسلر اپنی صوابدید کے مطابق جس شخص کو چاہے اپنی مدد کے لیئے پرو وائس چانسلر مقرر کر سکتا ہے ۔ اور اگر پالیسی میں اختلاف پیدا ہو جائے تو جب چاہے اسے الگ کر سکتا ہے ۔ اس بنا پر یہ سمجھنا قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کہ یہ جو کچھ ہوا علیم صاحب کی پالیسی کے خلاف اور ان کی مرضی کے بغیر نظامی صاحب کی ناروا در اندازی اور آزادرائے سے ہوا ۔ ورنہ اگر حقیقت یہی ہوتی تو علیم صاحب کے علی گڑھ سے رخصت ہونے پر نظر بند طلبار رہا اور معطل اساتذہ بحال نہ ہوتے ۔ کیونکہ نظامی صاحب اس وقت تو صرف پرو وائس چانسلر ہی تھے ۔ اور اب تو وہ قائم مقام وائس چانسلر ہیں ۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ کسی امر میں وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر کی رائے میں اختلاف ہو ۔ اور پھر وائس چانسلر دلائل کی قوت سے وائس چانسلر کو اپنا ہم خیال بنا لے ۔ بہرحال پالیسی ، آخری فیصلہ اور حکم کا اجرا یہ سب وائس چانسلر کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔ اور اس بنا پر اچھے برے کی ذمہ داری اسی کے سر عائد ہوتی ہے ۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا طلبار اور ان کے مسائل و معاملات سے متعلق تھا ۔ اب انتظامیہ کو دیکھیے تو علیم صاحب کی ضرورت سے زیادہ شرافتِ نفس ، انسانی ہمدردی اور رحمدلی نے اس میں بھی اپنا رنگ دکھایا ۔ مجھے ایک دو نہیں اس قسم کے متعدد واقعات معلوم ہیں کہ ایک شخص نے شدید جرم یا جرائم کا ارتکاب کیا ہے تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے لیکن اس کے باوجود اس کے خلاف تادیبی کارروائی نہیں کی گئی ۔ اور اگر سزا کے طور پر اس کو اس جگہ سے ہٹا دیا گیا تو اُسے پھر کسی دوسری جگہ پر لگا دیا گیا ۔ اس پر جسٹرار یا ڈپٹی رجسٹرار کسی نے کہا ۔ حضرت ! یہ تو مجرم تھا ۔ تو علیم صاحب نے اپنے خاص انداز میں فرمایا : ہاں بیشک ۔ یہ تو مجرم تھا ۔ لیکن یہ بتائیے کہ اس کی بیوی اور بچوں نے کیا جرم کیا ؟ جو وہ بھوکے مر رہے ہیں ۔ کل یہ سب روتے ہوئے میرے پاس آئے تھے اب بتائیے میں کیا کروں ؟ علیم صاحب اس انسانی ہمدردی میں اتنے

فیاض یا خود سرواقع ہوئے ہے کہ پراکٹر کی رپورٹ یونیورسٹی کے قانون کے مطابق جس کی عدم موجودگی یا جس کے امیدوار کے خلاف ہونے کی صورت میں کسی شخص کا تقرر نہیں ہوتا علیم صاحب اسکی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دفتروں میں ناپسندیدہ افراد گھس گئے پچھلے دنوں مختلف شعبوں سے ٹائپ رائٹر کے چوری ہونے کی وارداتیں کثرت سے ہوئیں۔ مولانا آزاد لائبریری میں ڈاکہ پڑا۔ یونیورسٹی اکاؤنٹ میں سے کسی شخص نے دھوکہ دیکر ایک بہت بڑی رقم اڑالی۔ میرے نزدیک یہ سب کچھ علیم صاحب کی اسی ہمدردی اور رحدلی کا شاخسانہ ہے۔ علیم صاحب کا معاملہ جب غیروں کے ساتھ یہ تھا تو اپنوں کے ساتھ کیا کچھ نہ ہوتا۔ چنانچہ جب انکے صاحبزادے کا تقرر سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرر کی پوسٹ پر ہوا تو اُس پر کافی ہنگامہ ہوا۔ یونیورسٹی کے حلقہ میں چہ می گوئیاں ہوئیں پمفلٹ شائع ہوئے۔ بعض لوگ اسے پارلیمنٹ میں اٹھانے کی سوچ رہے تھے پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔ آں حضرت صلعم نے ایسے ہی موقعوں کے لئے فرمایا ہے اِتقوا مَوَاضِعَ التُّھَمُ یعنی تہمت کی جگہوں سے بچو۔ علیم صاحب نے اسکی پرواہ نہ کی۔

غرض کہ اس میں شک نہیں علیم صاحب بڑے شریف النفس۔ بامروّت۔ باوضع۔ ہمدرد و غمگسار۔ سنجیدہ و متین اور دوست نواز انسان ہیں اور انکی دوست نوازی سے میں علی گڑھ میں ہی نہیں بلکہ کلکتہ کے قیام کے زمانہ سے فائدہ اُٹھاتا رہا ہوں جس کے لئے میں انکا شکرگذار ہوں۔ لیکن وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کو کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔

علی گڑھ یونیورسٹی قبل از تقسیم و بعد از تقسیم کا جائزہ ختم ہوا۔ اب آخر میں گورنمنٹ اور یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء اور عام مسلمانوں سے اس سلسلے میں کچھ معروضات کرنی ہیں

گورنمنٹ کی توجہ کے قابل یونیورسٹی کی تاریخ جو بیان کی گئی اس سے یہ صاف ظاہر ہے جس کی تردید نہیں ہوسکتی کہ

(۱) سرسید کی زیرِ قیادت اینگلو محمڈن کالج مسلمانوں نے اپنے سرمایہ سے قائم کیا تھا۔

(۲) اس کالج کے قیام کا اولین مقصد مسلمانوں کے لئے جو تعلیم میں بہت پسماندہ تھے، جدید تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا تھا۔ اگرچہ اس کا دروازہ غیر مسلموں کے لئے بھی کھلا ہوا تھا۔

(۳)۔ یہی کالج آگے چل کر یونیورسٹی بنا۔ اس کی جدوجہد اور سرمایہ کی فراہمی بھی مسلمانوں نے ہی کی۔

(۴)۔ یہ یونیورسٹی مسلمانوں کی صرف ایک تعلیمی درسگاہ نہیں تھی۔ بلکہ کالج کے اساسی مقصد کے ماتحت مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور اسلامی روایات و ثقافت کا بھی ایک عظیم الشان ادارہ تھی۔

(۵) اس بنا پر نہ صرف برصغیر ہند و پاک کے مسلمان بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس یونیورسٹی کے ساتھ غیر معمولی محبت اور قلبی لگاؤ ہے۔ ان کی یہ تمنّا اور آرزو ہے کہ وہ ہمیشہ اسلامی ثقافت و تہذیب کے ایک عظیم نمائندے ادارہ کی حیثیت میں قائم رہے۔

(۶)۔ ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی اور ملک میں جمہوریت کے قیام کے بعد یہ ضروری تھا کہ یونیورسٹی کا اصل کیرکٹر قائم رکھتے ہوئے یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء میں کچھ ایسی تبدیلیاں کی جائیں جن کے باعث یونیورسٹی کے اصل کردار اور جمہوریت کے تقاضوں میں مطابقت پیدا کی جا سکے اس میں شک نہیں کہ یہ وقت کی اہم ضرورت تھی۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اگر سرسید حیات ہوتے تو وہ خود اس معاملہ میں پیشقدمی کرتے۔

(۷)۔ ۱۹۵۱ء ایکٹ اسی سمت میں ایک اقدام تھا جس پر حکومت مطمئن اور مسلمان رضامند تھے۔ اور جس کو مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور دیگر مسلمان ممبران پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ سے باہر تمام مسلمان اداروں اور جمعیتوں کی منظوری و پذیرائی حاصل تھی۔

(۸) ۱۹۶۵ء میں ایک ہنگامہ پیدا ہوا اور اس ایکٹ کو معطل کر کے گورنمنٹ نے

اپنی نامزد کردہ ایگزیکیٹو کونسل یونیورسٹی پر مسلط کردی - اور یہ اعلان ہوا کہ اب یونیورسٹی کے لئے الگ ایک ایکٹ بنے گا -

(۹) - اس سے مسلمانوں میں تشویش پیدا ہوئی اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ ایکٹ جلد بنے - گورنمنٹ نے غیر رسمی طور پر کیبنٹ کے ایک ممتاز وزیر کی سربراہی میں ایک کمیٹی مقرر کردی جس نے ممتاز مسلمان رہنماؤں اور تعلیم کے ماہروں کے باہم مشورہ اور اتفاق سے ایکٹ کا مسودہ تیار کرلیا -

(۱۰) مسلمانوں کو یقین تھا کہ اس مسودہ کے مطابق پارلیمنٹ میں بل پیش ہوگا - اور منظور ہوجائے گا - لیکن ان کی حیرت اور مایوسی کی کوئی حد نہیں رہی - جب پارلیمنٹ میں جھٹ پٹ ۱۹۶۵ء ایکٹ پیش ہوا اور منظور بھی ہوگیا اور یہ اس مسودہ سے مختلف تھا جس پر پہلے سب کا اتفاق ہوچکا تھا - مسلمانوں نے محسوس کیا کہ یہ ایکٹ جمہوریت کے تقاضوں اور مطالبات کے بھی خلاف تھا - اور اس میں یونیورسٹی کے اسلامی اور آج کل کی بول چال میں اقلیتی کردار کے تحفظ کی کوئی ضمانت بھی نہیں تھی -

(۱۱) . اس پر ملک میں ایجی ٹیشن ہوا - مسلمانوں کے مختلف سیاسی اور غیر سیاسی پلیٹ فارموں سے اس کے خلاف سخت احتجاج کی آوازیں بلند ہونے لگیں - اور یہ مسئلہ حکومت کے خلاف مسلمانوں کی شکایتوں میں سرفہرست آگیا -

(۱۲) - حکومت نے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی غرض سے اس ایکٹ میں کچھ ترمیم و تنسیخ کردی - لیکن ایجی ٹیشن اب بھی بند نہیں ہوا مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے تحفظ کی گارنٹی ہونی چاہیئے -

ان تنقیحات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا تعلق ہے حکومت کا ذہن اب تک صاف نہیں ہے - اس لئے کبھی کچھ کرتی ہے اور کبھی کچھ - اعلان کچھ ہوتا ہے - اور عمل کچھ - اور ایک بل بنتا ہے اور پھر اس میں ترمیات

شروع ہوجاتی ہیں۔ اور یہی بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کے متعلق اُس کا یہ رویہ اس لئے ہے کہ اس کے تحت الشعور میں اب تک مسلمانوں کے لئے وہ وسعتِ قلب نہیں پیدا ہو سکی ہے جو اس ملک کی اکثریت یا اور اقلیتوں کے لئے ہے۔

اس ملک میں اکثریت کے تہذیبی اور ثقافتی ادارے بھی ہیں۔ اور اقلیتوں کے بھی۔ وسوا بھارتی اور بنارس ہندو یونیورسٹی، علی گڑھ کی طرح یہ دونوں بھی مرکزی گورنمنٹ کی یونیورسٹیاں ہیں۔ ان کے تہذیبی اور ثقافتی ادارے ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یہی نا کہ علوم جدیدہ کے ساتھ یہاں ہندوؤں کے پرانے علوم و فنون، مذہب، فلسفہ اور زبان و روایاتِ قدیمہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے۔ اور صرف تعلیم ہی نہیں ان روایات کے مطابق تربیت بھی ہوتی ہے۔ اور وہاں ہوسٹل میں رہنے والے طلبا کے لئے جو قواعد و ضوابط ہیں ان میں ان سب چیزوں کی رعایت رکھی گئی ہے۔ فرق صرف اسی قدر ہے کہ وسوا بھارتی ڈاکٹر ٹیگور کے فلسفہ و خیال کی ترجمان ہے جو کہ موحد تھے اور ہندو یونیورسٹی ہندوؤں کے دیرینہ مذہب و ثقافت کی نمائندہ ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اول الذکر یونیورسٹی کا نظام اور ایڈمنسٹریشن تمام تر ڈاکٹر ٹیگور کے ہم خیال بنگالیوں اور مؤخر الذکر یونیورسٹی کا ایڈمنسٹریشن ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، ہونا یہی چاہیے تھا جب یہ تہذیبی اور کلچرل ادارے ہیں تو ضروری ہے کہ جو لوگ اس تہذیب اور کلچر کے نمائندے اور علمبردار ہیں۔ ان اداروں کا ایڈمنسٹریشن بھی انہیں کے ہاتھ میں ہو۔ یعنی ادارہ کے ہر شعبہ میں اکثریت انہیں کی ہو۔ انگریزوں کے زمانہ میں ہندو بنارس یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی دونوں فرقہ وارانہ (Communal) یونیورسٹیاں تھیں۔ چنانچہ اول الذکر کے کورٹ اور ایگزیکٹو کونسل کا ممبر غیر ہندو اور مؤخر الذکر کی ان مجلسوں کا ممبر کوئی غیر مسلم نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن آج ملک آزاد ہے۔ ہماری قومی حکومت قائم ہے۔ اور اس کا دستور جمہوری ہے اس بنا پر اب یہ ادارے قدیم حیثیت کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتے

تھے۔ اس بنا پر ہندو بنارس یونیورسٹی کے قدیم ایکٹ میں بھی ترمیم ہوئی۔ اور یہاں ۱۹۵۱ء کا ایکٹ معرض وجود میں آیا۔ لیکن بہرحال ان یونیورسٹیوں کا تہذیبی کیرکٹر قائم رکھنا تھا اس بنا پر جمہوریت کے تقاضوں کے ساتھ کیرکٹر کے تحفظ اور بقا کے مسئلہ کو اس طرح ہم آہنگ کیا گیا کہ لیگزیکیٹو کونسل اور کورٹ کی ممبری کا دروازہ تو ہر ایک کے لئے واکر دیا گیا۔ لیکن ان میں اکثریت انہیں لوگوں کی رکھی گئی جو تہذیب متعلقہ کے نمائندے اور علمبردار تھے۔ اس معنیٰ کے اعتبار سے جو مسلمانوں کے علاوہ دوسری اقلیتوں کے ادارے ہیں ان کا حال بھی یہی ہے۔ یعنی جو عیسائی ادارے ہیں ان کا ایڈمنسٹریشن عیسائیوں کے ہاتھ میں اور جو سکھ ادارے ہیں ان کا ایڈمنسٹریشن سکھوں کے ہاتھ میں ہے۔ پس جب یہ چیز سب جگہ ہو رہی ہے۔ تو مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں کیوں نہیں ہو سکتی؟ گورنمنٹ نے ۱۹۷۲ء کے ایکٹ میں چند ترمیمات منظور کر کے اس منزل کی طرف ایک قدم بڑھایا ہے۔ لیکن جب تک خود ایکٹ میں ترمیم نہ ہو ان تحفظات کی آئینی حیثیت قائم نہیں ہوتی۔ مسلمان اقلیتی کردار کے تحفظ کا جو مطالبہ کرتے ہیں اسکا یہی مطلب ہے اور اس کے تسلیم کر لینے میں گورنمنٹ کو پس و پیش نہیں ہونا چاہئے۔

علاوہ ازیں معاملہ کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ بنارس ہندو یونیورسٹی کا ذکر نہیں۔ آج ہندوستان میں یونیورسٹیوں کی تعداد سو سے اوپر ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ ان یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبار اور مسلمان اساتذہ کا فی صد کیا تناسب ہے؟ اس کے برخلاف علی گڑھ میں غیر مسلم اساتذہ اور طلبار کا کیا تناسب ہے؟ اگر پہلی صورت میں تناسب نہ ہونے کے برابر ہے تو گورنمنٹ کو سوچنا چاہئے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اسکی ایک وجہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی بھی ہے لیکن اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ اس کے ایک دو نہیں کثرت سے ثبوت موجود ہیں۔ ایک مشہور یونیورسٹی کے ایک ہندو پروفیسر جو صدر شعبہ بھی تھے اور میرے بہت بے تکلف دوست۔ انہوں نے خود مجھ سے کہا کہ

ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شعبہ میں لکچرر کی پوسٹ کے لئے ایک مسلمان امیدوار لڑکی کا انتخاب سلیکشن کمیٹی سے لڑ جھگڑ کر محض اس لڑکی کی اعلیٰ قابلیت اور لیاقت کی بنیاد پر کرا لیا تو ان کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اور ان پر لعن طعن کی بوچھار ہوگئی مگر یہ بھی ضد کے پورے تھے۔ اپنی بات پر اڑے رہے اور آخر یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل نے بھی سلیکشن کمیٹی کے اس فیصلہ کو منظور کر لیا۔ اور یہ لڑکی اب بھی نیک نامی اور قابلیت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہی ہے۔ بس ان حالات میں اگر مسلمانوں کو تعلیم میں آگے بڑھنا اور اپنی پسماندگی دور کرنا ہے تو کیا خود ملک اور قوم کے مفاد کا یہ تقاضہ نہیں ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کو اس کی اپنی تاریخی حیثیت کے ساتھ باقی رکھا جائے۔ اور اس کو دستوری اعتبار سے دوسری یونیورسٹیوں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ایسا نہ بنا دیا جائے کہ مسلمان طلباء اور مسلمان اساتذہ کو یہاں بھی جگہ پانے میں دقت اور دشواری محسوس ہو۔ سر سید کی تقریریں اور تحریریں پڑھیے آپ کو محسوس ہوگا کہ ان کے زمانہ میں بھی مسلمان طلباء کے لئے یہی دشواریاں تھیں جن کی وجہ سے انہوں نے کالج قائم کیا تھا۔ یہ وہ حقائق اور واقعات ہیں جن پر حکومت کو ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہیئے۔

طلباء اور اساتذہ سے گذارش

یونیورسٹی کے لئے اقلیتی کردار کا مطالبہ کرنے میں یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ نے بھی مجموعی طور پر گرم جوشی سے حصہ لیا ہے۔ لیکن ان کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ان کا یہ مطالبہ اسی وقت باوزن اور وقیع ہو سکتا ہے جب کہ وہ علماً اور عملاً یونیورسٹی کی تہذیبی روایات کے حامل ہوں اور اس کی صورت یہی ہے کہ سیاست کے ہنگاموں سے الگ تھلگ رہ کر ایک طرف وہ کردار۔ اخلاق و عادات اور طور طریق زندگی کے اعتبار سے پکے اور سچے مسلمان ہوں۔ اور دوسری طرف تعلیم، تحریر و تقریر اور اسپورٹس وغیرہ میں ایسے کامل ہوں کہ ان کے ذریعہ ان کے خاندانوں کو فائدہ پہونچے۔ یونیورسٹی کا نام روشن ہو اور ملک و قوم ان کی خدمات سے مستفید ہو ا

اس وقت جبکہ ملک ایک نہایت بھیانک اور شدید بحران کے دور سے گذر رہا ہے اور نوجوان طلبار میں سخت اختلال وانتشار ذہنی وقلبی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اسلام کا مطالبہ ہے کہ علی گڑھ کے طلبار علوم وفنون اور اعلیٰ اخلاق سے آراستہ وپیراستہ ہوکر ملک کو اس بحران سے نکالنے میں اپنا رول ادا کریں۔ یہ کام نعرہ بازی سے نہیں ہوسکتا اقبال کے ان اشعار کو اپنا رہنما بنانے سے ہوسکتا ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
ترا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
خونِ دل وجگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جلترنگ
یہ زورِ دست وضربت کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

اس سلسلہ میں اساتذہ کے فرائض اور بھی اہم ہیں۔ یہ قوم کی تعمیر اور اس کو قعر انحطاط سے نکال کر مصطبۂ عزت ووجاہت پر پہونچانے کا وقت ہے۔ اس لئے وقت کا اور خصوصًا اسلام کا ان سے مطالبہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی راحت وآسائش اور شخصی رفاہیت وترقی اور غیر علمی وتعلیمی دلچسپیوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے اوقات طلبہ کی تعلیم وتربیت اور اپنے ذاتی مطالعہ اور ریسرچ کے لئے وقف کردیں۔ یہی ان کی سب سے بڑی عبادت ہے۔ میرا تعلق ہندوستان کی اور بیرونی ممالک کی متعدد یونیورسٹیوں سے رہا ہے اور میں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اپنے اپنے وسائل کے اندر جس ٹھاٹ باٹ اور خوش عیشی کی زندگی علی گڑھ کے اساتذہ گذارتے ہیں۔ کسی اور یونیورسٹی کے اساتذہ اس طرح نہیں گذارتے اور جتنا کم تعلق یہاں کے اساتذہ کو طلبار سے ہوتا ہے۔ اتنا کسی یونیورسٹی کے اساتذہ کا نہیں ہوتا۔ مولانا آزاد لائبریری

کے لائبریرین سے دریافت کیجئے کہ سال بھر میں کتنے اساتذہ نے اپنے نام کتنی کتابیں اشو کرائی ہیں ۔ تو آپ کو اس کا جواب حوصلہ افزا نہیں ملے گا ۔ اگر آپ اسی کی تحقیق کریں کہ سال بھر میں اساتذہ کے ریسرچ اور علمی مقالات وکتب کا اوسط کیا ہے تو آپ کو امید آفرین اعداد وشمار نہیں ملیں گے ۔ کلکتہ یونیورسٹی جیسی یونیورسٹیوں میں یہ قاعدہ ہے کہ اگر پانچ برس کے اندر اندر کسی پروفیسر نے کوئی ریسرچ ورک نہیں کیا ہے تو اس سے جواب طلب کیا جاتا ہے اور اگر جواب اطمینان بخش نہیں ہوتا تو اس کی ترقی روک لی جاتی ہے ۔ بدرالدین طیب جی نے یہ قاعدہ یہاں بھی جاری کرنا چاہا تھا ۔ لیکن یار لوگوں نے کھنڈت ڈال دی ۔ اور انکی ایک نہ چلنے دی ۔ کیونکہ بعض اچھے اچھے سینیر پروفیسر اس لپیٹ میں آجاتے ۔ کتنا افسوس اور دکھ ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ مختلف علوم وفنون ۔ مڈیسن ، انجینیرنگ ، سائنس اور ٹکنالوجی میں انعامات پانے والوں کی فہرستیں یا ان کے کارناموں کا تذکرہ آئے دن اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے ۔ اور ان میں ایک نام بھی علی گڑھ کا نہیں ہوتا ۔

مسلمانوں سے گذارش

آخر میں مسلمانوں سے یہ گذارش ہے کہ آپ کا یونیورسٹی کے لئے اقلیتی کردار کا مطالبہ برحق ، اس کو منوانے کے لئے آپ کا جوش وخروش لائق تحسین و ستائش ! لیکن آپ کو یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ آج یونیورسٹی کا سالانہ بجٹ کم و بیش ایک کروڑ روپیہ ہے ۔ اس سے علاوہ کروڑوں روپیہ کی عمارتیں اور پروجیکٹ اب تک بن کر تیار ہو چکے ہیں ۔ یہ سب روپیہ گورنمنٹ کے خزانہ ہی سے تو آیا ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ آپ کا بھی تو کچھ فرض ہے یا نہیں ؟ اقلیتی کردار کی حفاظت کا عملی طریقہ یہ ہے کہ لائق اور فرسٹ کلاس مسلمان طلبار زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخلہ لیں ۔ اسی طرح یونیورسٹی میں کوئی جگہ خالی ہو تو اس کے لئے بہتر سے بہتر مسلمان امیدوار موجود ہوں ۔ جہاں تک طلبار کا تعلق ہے وہ اسی وقت میسر آسکتے ہیں جب کہ ان کی ہائی اسکول یا ہائر سیکنڈری اسکول

کی تعلیم اعلیٰ درجہ کی ہو۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱)۔ ملک میں اور خصوصاً شمالی ہند میں مسلمانوں کے جو ہائی اسکول یا انٹر کالج ہیں ان کو بلڈنگ۔ لائبریری لیبوریٹری۔ کھیل کے میدانوں۔ اساتذہ کی لیاقت وقابلیت اور ہوسٹل وغیرہ کے اعتبار سے بہترین سکول اور کالج بنایا جائے

(۲)۔ جو طلبا رذہین اور پڑھنے کے شوقین ہیں مگر غریب گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں ان کی تعلیم اور صحت بخش غذا اور دوسری ضرورتوں کا انتظام کیا جائے۔

(۳) جو طلبا رذہین اور ہونہار ہیں مگر بدقسمتی سے ایسے ماحول میں رہتے ہیں جہاں وہ یکسوئی کے ساتھ اپنا کام نہیں کر سکتے۔ مثلاً ایک چھوٹا سا گھر ہے اور اس میں ماں باپ کے علاوہ آٹھ نو بہن بھائی رہتے ہیں ان کو اس ماحول سے نکال کر ہوسٹلوں میں رکھا جائے۔

(۴) جو مسلمان بچے۔ مثلاً کرخنداروں اور معمولی کاریگروں اور چھوٹے درجہ کے دوکانداروں کی اولاد، جو عام طور پر تعلیم سے الگ رہتے ہیں۔ ان میں جو ذہین بچے ہیں ان کے والدین کو سمجھا بجھا کر انہیں تعلیم پر مائل کرنا اور انکے لیے اس سلسلہ میں سہولتیں اور ترغیبات بہم پہنچانا۔

اگر یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو یونیورسٹی کے عظمت کے ساتھ محفوظ رکھنا ہے تو یہ سب کام ایک ٹھوس اور پائیدار تنظیم کے ساتھ مسلمانوں کو لازمی طور پر کرنے ہیں۔ ورنہ اگر گورنمنٹ نے یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو تسلیم بھی کر لیا تو جب فرسٹ کلاس مسلمان طلبا رکثیر تعداد میں آئیں گے ہی نہیں تو یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ایک کلاس میں جتنی سیٹیں (Seats) ہیں ان کو خالی رکھا جائے یا جس کلاس میں داخلہ کے لئے فرسٹ کلاس ہونے کی شرط ہے اس کو سیکنڈ کلاس مسلمان لڑکوں سے پر کر دیا جائے۔ اسی طرح یونیورسٹی کا اسٹینڈرڈ گریگا اور اس کی عظمت پر حرف آئے گا۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے۔

(ختم شد)

جنگِ آزادی کے دو جلیل القدر مجاہد

جناب خان غازی کابلی

ہندوستان کی جنگ آزادی کے دو جلیل القدر مگر گمنام مجاہد ـــــ مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی ـــــ اور حافظ محمد عثمان علیگڈھی ـــــ خدا کو پیارے ہو گئے یعنی "دار الفساد" (دنیائے فانی) سے "عدم آباد" کوچ کر گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا الیہِ راجعون ـــــ یہ دونوں جلیل القدر مجاہد۔ "غازی" کے صرف شناسا ہی نہیں تھے۔ بلکہ کاروانِ آزادی کے مخلص اور فداکار ساتھی بھی تھے۔ اس لئے دونوں مجاہدین کی جدائی کی خبر سن کر اور بیرٹھکر "غازی" کو بے حد صدمہ ہوا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے اور کیا کہا جائے کہ ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں

بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی صوبہ سرحد میں ریاست "سوات" کے باشندے تھے۔ اور اس نسبت سے "سواتی" کہلاتے تھے ـــــ اس خطۂ ارضی (سوات) کا نام آریوں کے ایک قدیم قبیلے اور دریائے (سوات) کی نسبت سے ہی "سوات" پڑا ہے "ہلرِ اعظم" کے "نازی" آریوں نے بھی "سوات" کی نسبت سے ہی اپنا نام "سواستکا" رکھا تھا ـــــ "سوات" کا ہندوستان کی آزادی کی تحریکوں سے بھی بہت ہی گہرا

تعلق رہا ہے۔ اور سید احمد شہید بریلوی اور ان کے مجاہدوں کا بھی یہ خطہ عرصہ دراز تک گہوارہ رہ چکا ہے۔ جس کے مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی ایک نہایت ہی اہم اور آخری کڑی تھے ——— جس زمانے میں ہندوستان کے پرجوش نوجوان جذبۂ حریت سے سرشار ہوکر کثرت کے ساتھ افغانستان (کابل) جایا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی افغانستان بھی گئے تھے لیکن پھر اس خیال سے واپس لوٹے تھے کہ ——— "ہندوستان کی آزادی کی جنگ ہندوستان کے میدانوں میں ہی لڑنی چاہئے" چنانچہ جب ہندوستان آئے تو متعدد مرتبہ گرفتار ہوئے۔ قید و بند کی مشقتیں اور مصیبتیں بخندہ پیشانی برداشت کیں ——— مولانا حکیم کا کوئی بھی کام صلہ و معاوضہ پانے اور دنیاوی مفاد کے حصول کے لئے نہ تھا بلکہ ان کا ہر کام "عاشقانہ" ہی ہوا کرتا تھا چنانچہ ان کا کمالِ "علم و فضل" بھی اور "دار و رسن" سے کھیلنا بھی ۔ دونوں ہی "عشق" پر مبنی تھے۔ اسی لئے ہمیشہ تنگ دست اور پریشان حال رہتے تھے۔ بقول میر ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

اس عشق و فن کی بدولت کئی مرتبہ اجڑے برباد ہوئے اور پھر آباد ہوئے۔ مگر نہ اپنی تباہیوں اور بربادیوں کا کبھی شکوہ کیا ——— نہ ہی آبادیوں اور عزت افزائیوں پر کبھی مغرور ہوئے۔ ہمیشہ حسرت کے اس شعر کو جھوم جھوم کر پڑھتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ؎

سیہ کار تھے باصفا ہوگئے ہم ترے عشق میں کیا سے کیا ہوگئے ہم

غازی نے دورانِ قیام دہلی ایک دن ان سے کہا کہ آپ افغانوں کے "حسرت موہانی" ہیں۔ اس لحاظ سے اگر آپ کو "حسرت افغانی" کہکر پکارا جائے تو اس نام کو کیا آپ پسند فرمائیں گے؟ ہنس کر فرمانے لگے "مادرِ ہند" نے ایک ہی "حسرت" پیدا کیا ہے اور وہ مولانا "حسرت موہانی" ہیں۔ کوئی دوسرا "طرفہ تماشہ" حسرت نہ پیدا ہوا ہے اور نہ ہی

آئنہ کوئی ہوگا ؎

یک طرفہ تماشہ ہے "حسرت" کی طبیعت بھی
ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی

غالباً یہ بات ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء ماہ اگست کی ہے کہ ایک دن علی الصبح مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی اپنے ایک شہزادے کے ہمراہ کوچہ رحمان تشریف لائے اور گلی میں کھڑے ہو کر صدا لگائی ــ خان غازی کابلی ہیں یا نہیں ؟ ــــ " غازی نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی کھڑے ہیں۔ فوراً ان کی صدا کے جواب میں عرض کیا ــــ " مولانا ! " میں گھر میں موجود ہوں اور ابھی حاضر ہوتا ہوں ــــ انھوں نے افغانی لہجے اور زبان میں بلند آواز سے چلانا شروع کیا۔

"کافرہ! اِندرا کوز شہ

یعنی اے کافر جلدی نیچے اتر آؤ۔

یاد رہے کہ افغانی زبان (پشتو) میں کافر کا لفظ "بہادر" اور "محبوب شخصیت" کے لیے استعمال ہوا کرتا ہے۔ اردو کے ایک شاعر نے بھی کہا ہے کہ ؎

اُف یری کافر جوانی جوشش پہ آئی ہوئی
ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی

اسی طرح حضرت امیر خسرو افغانی ثم دہلوی نے بھی "کافر" کا لفظ اپنی ایک فارسی غزل میں یوں باندھا ہے۔

کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

گویا محبت کی زبان ہی بالکل نرالی ہوتی ہے اور اس کی گالی میں بھی پیار چھپا ہوا ہوتا ہے۔ بلبلِ ہندوستان نواب فصیح الملک حضرت داغ نے کیا ہی خوب فرمایا ہے ؎

اے داغ برا مان نہ تو اسکے کہے کا معشوق کی گالی سے تو عزت نہیں جاتی

مختصر یہ کہ چونکہ مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی نے شوق ومحبت کی شراب سے سرمست ہو کر غازی کو کافر کہکر بلایا تھا۔ اس لئے غازی نے اس گالی نما لفظ میں قندونبات کا سا مزہ اور لطف محسوس کیا۔

مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی بے حد ہی "باغ وبہار" شخصیت تھے چونکہ جب "غازی" ان کے ہمراہ جامع مسجد اردو بازار کی جانب رواں دواں ہوئے، تو انہوں نے راستے میں بھی اپنی گفتگو کی "بسم اللہ" لفظ کافر سے کی۔ انہوں نے دریافت کیا "اے کافر! آپ نے اتنا نام کیونکر پیدا کیا ہے۔ میں جب بھی "امبور" میں آپ کا نام اخبارات میں پڑھتا ہوں تو رشک کرتا ہوں"۔

غازی نے عرض کیا ــــــ "برسوں تک "بدھو" بن کر گاندھی کی "آندھی" میں مشتِ خاک کی طرح اڑانے کے بعد جب میر جعفر زٹلی کا یہ شعر نظر سے گذرا" ؎

جعفر جو کوئے یار میں یوں بھیڑ بھاڑ ہے
تو بھی گھسڑ پھسڑ کہ گھسیر م گھسار ہے

تو نام پیدا کرنے کا جذبہ دل میں موجزن ہوا۔ شہرت و ناموری کے کوچے کی بھیڑ بھاڑ میں گھسیرم گھسار ہو کر نام پیدا کیا اور احرار، خدائی خدمت گار اور ہندوستان کی آزادی کے ہر مورچے پر اپنی شہرت کے پرچم خود ہی آگے بڑھ کر لہرائے کیونکہ کوئی کسی کو لفظ نہیں دیا کرتا یہ کام خود ہی کرنا پڑتا ہے۔

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا

اس طرح کی دلچسپ باتیں کرتے کرتے جب ہم اردو بازار پہنچے تو خدا جانے ان کے دل میں کیا خیال چٹکیاں لینے لگا کہ کھڑے ہو گئے۔ اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یوں گویا ہوئے۔

"میں کسی عظیم الشان جلسہ کے اسٹیج پر آپ کی تقریر سننا چاہتا ہوں"۔

اس پر غازی نے عرض کیا ـــــ اچھا تو پھر مجھے اجازت دیجئے اور آپ تیاری شروع کر دیجئے کیوں کہ آج ۵ بجے شام کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں میری صدارت میں جلسہ ہونے والا ہے افغان سفیر جنرل محمد عمر خان بھی اس میں جلوہ گر ہوں گے اور میں ٹھیک چار بجے بعد دو پہر آکر آپ کو اردو بازار سے اپنے ہمراہ لے چلوں گا اور آپ وہاں میری تقریر اسٹیج پر بیٹھ کر سماعت فرمائیں گے ۔ چنانچہ جب میں ٹھیک چار بجے درگاہ عزیزیہ اسعد یا تار پہنچا تو مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی مع اپنے شہزادے کے تدارد تھے ۔ درگاہ والوں سے دریافت کیا ، جواب ملا کہ وہ تو نئی دہلی خان غازی کابلی کی تقریر سننے گئے ہیں ۔ اس جواب کے بعد جب کانسٹی ٹیوشن کلب پہنچا تو مولانا حکیم اپنے شہزادے کے ساتھ کرسیوں پر براجمان نظر آئے ۔ دریافت کیا کہ آپ نے میرا انتظار کیوں نہیں کیا ؟ معصومانہ مسکراہٹ کے ساتھ فرمانے لگے

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب

مولانا حفیظ الرحمان القمری نے اپنے مختصر مضمون میں لکھا ہے کہ مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی کو مولانا آزاد سے بڑی گہری عقیدت تھی لیکن غازی سے جو ان کی گفتگو ہوئی تھی اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مولانا حکیم صاحب کو مولانا آزاد سے عقیدت نہیں بلکہ عشق تھا اور یہ بات اس لئے صحیح ہے کہ جب وہ کسی سے مولانا آزاد کی برائی سن لیتے تھے تو بقول غالب ع کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا ، کے تحت ان کا دماغی توازن بگڑ جاتا تھا ۔

ایک دن یونہی مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی نے غازی سے دریافت کیا ۔ آپ مشاہیر میں سے کن کن سے متاثر ہیں ؟ غازی نے عرض کیا ۔

(۱) خان عبدالغفار کی خدمت و ہمت (۲) ۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت ۔ (۳) ۔ مولانا ظفر علی ظفر اور حسرت موہانی کے بے باکی حق گوئی اور جرأت (۴) ۔ مولانا

سید حسین احمد مدنی کے تقوے ۔ اور ابوالکلام آزاد کے علم و فضل اور انداز نگارش نے متاثر کیا ہے ۔ اس پر مولانا حکیم سواتی نے فرمایا کہ مجھے مولانا آزاد سے یک گونہ عشق ہے ۔ اسلئے ان کے ذکر کے ساتھ کسی اور کے ذکر کے سننے کی مجھ میں تاب نہیں ہے ۔ غازی نے عرض کیا کہ آپ کا یہ عشق تو اس قسم کا ہے جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے ؏ ۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا ۔ اس پر مولانا حکیم صاحب اتنے بگڑے کہ مرنے مارنے کو تیار ہو گئے اور میرے لئے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا ۔ اور آخر میں " شاندار پسپائی " کا اعلان کر کے ان کی خدمت میں مولانا اختر شیرانی کا شعر پیش کیا کہ ۔

اس لئے تجھکو میں ناراض کیا کرتا ہوں
کہ مجھے تیرے منانے میں مزہ آتا ہے ۔

اس پر مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی کا چہرہ مسکرا کر پھول کی طرح کھل اٹھا ۔

مولانا حفیظ الرحمٰن العمری نے اپنے مضمون میں یہ انکشاف کیا ہے کہ مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی نے مولانا غلام رسول مہر کی تالیف سید احمد شہید پر ۳۶ صفحات پر مشتمل تبصرہ سپرد قلم کیا تھا جس میں مہر صاحب کی غلط معلومات اور غلط فہمیوں کا ازالہ کر کے تصحیح کی گئی تھی اور مہر صاحب اس کی پہلی ہی قسط دیکھکر تڑپ اٹھے تھے ۔ اس سلسلے میں انہوں نے العمری صاحب کو ایک خط بھی لکھا تھا ۔

اسی طرح مولانا غلام رسول مہر کی تالیف سید احمد شہید کے سلسلہ میں غازی سے دوران قیام دہلی میں مولانا حکیم فضل الرحمٰن نے فرمایا تھا کہ

" مہر صاحب کی تمام کتاب سید عبدالجبار صاحب آف ستھانہ اور ایسے لوگوں کی معلومات سے پُر اور عبارت ہے جن کا سید احمد شہید کی تحریک اور " مجاہدین " سے قطعاً تعلق بھی ثابت نہیں ہوتا ہے ۔ سید عبدالجبار صاحب شاہ آف ستھانہ ۔۔۔۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی جماعت " احمدیہ " سے تعلق رکھتے تھے ۔ اور جب سوات اور ستھانہ کے لوگوں پر ان کی

احمدیت کا راز ظاہر ہوا تو وہ بھاگ کر پہلے قادیان اور لاہور گئے پھر حیدرآباد دکن میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ خدا جانے آج کل کہاں ہیں مر گئے ہیں یا کہ زندہ۔

بھلا ایسی کتاب جو احمدیوں اور سرکاری معلومات پر مشتمل ہو وہ کیونکر معتبر اور سید احمد شہید کی کتاب ہو سکتی ہے۔

اگر "مولانا العمری" کے پاس مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی کا ۳۶ صفحات پر مشتمل تبصرہ موجود اور محفوظ ہے تو اسے "برہان" میں اشاعت کے لیے کیوں نہیں بھیجتے تاکہ اسکی اشاعت سے دنیا مولانا غلام رسول مہر کی غلطیوں سے واقف ہو۔ اور مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی کی روح کو تسکین حاصل ہو۔

اب مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی جیسے ایک دوسرے مجاہد حافظ محمد عثمان علیگڑھی کے حالات ملاحظہ ہوں۔ حافظ محمد عثمان صاحب بھی مولانا سواتی کی طرح ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے مجاہد جلیل اور غازی کے حبیب و خلیل تھے۔ خلافت کے زمانے میں جبکہ غازی مدرسہ یوسفیہ منیڈھو ضلع علی گڑھ میں تھے۔ تو مولانا حافظ محمد عثمان سے دوستانہ تعلقات استوار ہوئے تھے۔ اس زمانے میں مدرسہ یوسفیہ میں مولانا حبیب احمد صاحب کیرانوی، مولانا قاری شمس الدین شمس ہاپوڑی درس دیا کرتے تھے۔ مولانا محمد عرفان ہزاروی بھی اسی مدرسے سے وابستہ تھے۔

حافظ محمد عثمان نہایت ہی حریت پرست دیندار اور جفاکش انسان تھے۔ ان کی زندگی حسرت کی طرح بالکل سادہ اور نام ونمود سے بالکل پاک وصاف تھی۔ ہمیشہ پھٹے پرانے پیوند لگے کپڑے ان کے زیب تن ہوا کرتے تھے۔ اور درزی کے کام سے رزق حلال پیدا کر کے بسر اوقات کرتے تھے۔ تقسیم وطن کے بعد بھی غازی نے انہیں اسی حالت میں ہی دیکھا جس حالت میں انہیں خلافت کے زمانے میں دیکھا تھا۔ ان کی زندگی کے کئی دلچسپ اور مجاہدانہ واقعات ہیں لیکن یہاں بجز بیکراں میں سے برہان کے صفحات کی تنگ دامانی

کی وجہ سے صرف ایک ہی واقعہ کو پیش کیا جاتا ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ پر بے شمار ترک مجاہدوں اور شہیدوں کے معصوم بچے انگریزوں کے ہاتھ لگے۔ جنہیں انگریزوں نے مختلف مشنوں میں تقسیم کردیا تھا۔ ان یتیم بچوں میں سے ایک احمد نامی علی گڑھ کے مشن بنرادیوی کے حصہ میں آیا تھا۔ اور اس کا عیسائی نام "الویل بسن" رکھا گیا تھا۔ مولانا محمد عثمان کو اس کا علم ہوا تو بے تاب ہو کر غازی کے پاس میڈیسو آئے اور فرمانے لگے جس طرح بھی ممکن ہو سکے اس ترک بچے کو عیسائیوں کے چنگل سے چھڑانا ہے اور یہ خدمت آپ (غازی) کے سپرد ہے ــــ چنانچہ غازی نے کئی ماہ کی کوششوں کے بعد پتہ لگایا کہ یہ ترک بچہ گورنمنٹ ہوسٹل پریس میں ملازم ہے۔ اور اسے بالکل یہ معلوم نہیں کہ وہ کون ہے کون نہیں ہے۔ اس پر غازی نے گورنمنٹ ہوسٹل پریس میں کسی نہ کسی طرح سے رسائی حاصل کر کے اس ترک بچے سے دوستی پیدا کی۔ اور ایک دن جمعہ کے روز اسے مولانا حافظ محمد عثمان کی خدمت میں پیش کیا۔ اور اسی روز ہی جامع مسجد علی گڑھ میں نماز جمعہ کے بعد اسے کلمۂ توحید پڑھا کر مشرف بہ اسلام کیا گیا۔ اور اس کا پرانا نام احمد رکھا اس ترک بچہ کے دوبارہ اسلام میں آنے پر جس قدر مولانا حافظ محمد عثمان کو مسرت ہوئی تھی اس کے بیان کے لئے تلاشِ بسیار کے باوجود الفاظ نہیں ملتے۔ مختصر یہ کہ اس خوشی میں جامع مسجد علی گڑھ میں نماز جمعہ کے بعد جو جلسہ ہوا تھا اس میں مولانا حافظ عثمان نے نہایت دھواں دھار اور پرجوش و ولولہ انگیز تقریر فرمائی تھی۔ اس زمانے میں علی گڑھ کے کوتوالی کے انچارج سید منظور علی احمدی ہوا کرتے تھے۔ غازی چونکہ جہاں گشت انقلابی تھے۔ اس لئے اس واقعہ کے بعد فوراً علیگڑھ سے ایک رات کو غائب ہو گئے۔ اور پھر دوبارہ تقسیم وطن کے بعد جب علی گڑھ میں مولانا حافظ محمد عثمان سے ملاقات ہوئی تو بہت افسوس کے ساتھ فرمانے لگے ــــ "غازی" آپ بہت بڑے آدمی تھے۔ لیکن ہندوستان نے آپ کو چھوٹا کردیا بڑے لوگوں کی خدمات کا میدان

بہت وسیع ہوا کرتا ہے اور مجھے حیرت ہے کہ آپ نے اپنی خدمات کو بختونستان تک ہی کیوں محدود کر دیا ہے ـــــ حافظ مرحوم کی اس قسم کی باتیں سن کر غازی اس خیال سے خاموش ہو گئے کہ "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو"۔ مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی اور حافظ محمد عثمان صاحب علیگڑھی دونوں چونکہ عاشقانِ پاک طینت میں سے تھے۔ اس لئے اس دعائیہ مصرعہ پر مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

التقریظ والانتقاد

المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیہ

للحافظ ابن حجر العسقلانی [1]

(سعید احمد اکبر آبادی)

الشیخ الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اُن محققین علماء میں سے ہیں جو اگرچہ اپنے وطن میں "غریب شہر" ہیں لیکن عرب ممالک میں اُن کے علم وفضل اور شہرت و عظمت کا طوطی بولتا ہے، اور اس شہرت وعظمت کی بنیاد حدیث کی وہ نادر اور اہم کتابیں ہیں جن کے مخطوطات کو آپ نے تحقیق وترتیب کے موجودہ علمی اصول کے مطابق اڈٹ کرکے شائع کیا ہے۔ ان میں مسند الحمیدی۔ کتاب الزہد والرقاق لعبداللہ بن المبارک اور سنن سعید بن منصور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ابھی حال میں حدیث کی ایک اور

---

[1] کتاب تین ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے اور اسے حکومت کویت کی وزارت اوقاف وشئون اسلامیہ نے نہایت اہتمام سے ادارۃ التراث الاسلامی کی طرف سے شائع کیا ہے۔ کاغذ۔ طباعت۔ ٹائپ۔ گٹ اپ۔ اور جلد سب اس قدر اعلیٰ اور خوب صورت کہ سبحان اللہ! دیکھتے ہی آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں۔

نہایت اہم کتاب مصنف عبدالرزاق گیارہ ضخیم مجلدات میں نہایت اہتمام سے مولانا کی ہی تحقیق و تصحیح سے بیروت سے شائع ہوئی ہے ہم نے جوہانسبرگ میں ان مطبوعہ مجلدات کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ مطالعہ کا موقع نہیں ملا۔ یہ زیرِ تبصرہ کتاب بھی جو تین ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے مولانا کی ہی تحقیق و تصحیح سے کویت سے شائع ہوئی ہے

<u>کتاب کا تعارف</u> | احادیث کی جمع و تدوین کا دور ختم ہوجانے کے بعد اکابر محدثین مختلف حیثیتوں سے احادیث کے مجموعے مرتب کرتے رہے جن میں سے بعض آج متداول ہیں اور ارباب علم و نظر اُن سے واقف ہیں۔ اسی زنجیرِ طلائی کی ایک کڑی یہ کتاب ہے، اس میں حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ نے اُن احادیث کو ابواب فقہیہ کے مطابق مرتب کیا ہے جو صحاح ستہ میں اور مسند احمد میں نہیں ہیں اور آٹھ مسانید میں سے کسی میں موجود ہیں۔ ان مسانید کے نام یہ ہیں (۱) مسند طیالسی (۲) مسند حمیدی (۳) مسند ابن ابی عمر (۴) مسند مسدد (۵) مسند ابن منیع (۶) مسند ابن ابی شیبۃ (۷) مسند عبد بن حمید (۸) مسند ابن ابی اسامۃ

بعد میں حافظ ابن حجر نے مسند ابی یعلی اور مسند اسحاق بن راہویہ کا ان پر اور اضافہ کر دیا۔ اس طرح یہ کتاب درحقیقت دس مسانید کا نچوڑ ہے۔

یہ مجموعہ تین وجوہ سے نہایت اہم اور قیمتی تھا۔

(۱) اس کو حافظ ابن حجر ایسے حافظ حدیث اور محقق و نقاد نے مرتب کیا تھا۔

(۲) اس مجموعہ کی احادیث اُن مسانید سے ماخوذ تھیں جو اگرچہ مرتب کے زمانہ میں موجود اور اُن کے پیش نظر تھیں لیکن اب اُن میں سے اکثر و بیشتر نایاب ہیں اور اُن سے استفادہ براہِ راست ممکن نہیں ہے۔

(۳) یہ احادیث صحاح ستہ اور مسند احمد کی احادیث و روایات کے علاوہ ہیں اور اس بنا پر متعلقہ احکام و تفصیلات پر نئی اور مزید روشنی پڑتی ہے۔

[illegible] اس اہمیت کی بنا پر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی [illegible]

مجموعہائے احادیث کی کھوج رہتی ہے اس مخطوطہ کی تلاش و جستجو تھی، سعیدیہ لائبریری حیدرآباد میں ایک مخطوطہ تھا مگر وہ ناقص تھا۔ مدینہ منورہ کی لائبریری میں اُس کا سراغ لگا اور وہاں سے وہ مفقود تھا۔ آخرکار مَنْ جَدَّ وَجَدَ کے مطابق ترکی سے مولانا کو دو مخطوطوں کی فوٹو کاپیاں ملیں، ان میں ایک مجردہ تھی اور ایک مسندہ - یعنی ایک بغیر اسناد کے تھا اور دوسرا اسانید کے ساتھ - مگر یہ دوسرا اغلاط اور تصحیفات سے پر تھا۔ اس کے علاوہ اول تو اس کا خط باریک اور گنجلک تھا اور پھر فوٹو صاف نہیں آیا تھا - اس بنا پر اُس سے کما حقہٗ استفادہ سخت دشوار کام تھا۔ البتہ نسخۂ مجردہ نسبتہً زیادہ صاف اور واضح تھا۔

تحقیق وتعلیق | اس بنا پر مولانا نے مجردہ کو بنیاد بنایا اور اُس کی تحقیق و ترتیب اور تعلیق و تحشیہ میں مصروف ہو گئے - اس سلسلہ میں آپ نے جو اہم کام انجام دیئے وہ حسب ذیل ہیں -

(۱) متن کی تصحیح اس طرح کی ہے کہ

(الف) جو لفظ نسخۂ مجردہ میں غلط تھا۔ مگر نسخۂ مسندہ میں صحیح تھا اس کو متن میں جگہ دی ہے اور حاشیہ میں اصل نسخہ کی نشان دہی کر دی ہے۔

(ب) جہاں دونوں نسخوں میں کوئی لفظ غلط یا بے معنیٰ تھا متن میں اس کی جگہ جو لفظ صحیح اور با معنیٰ ہو سکتا تھا وہ رکھا ہے اور اصلین میں جو غلط لفظ تھا اسے حاشیہ میں لکھ دیا ہے - اس صحیح لفظ کا انتخاب کبھی تو خود کیا ہے اور کبھی اُن کتابوں کی مدد سے کیا ہے جو اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ مثلاً الحافظ الشہاب البوصیری کی مختصر اتحاف السادہ ..... یا الہیثمی کی کتاب مجمع الزوائد اور ان کے ساتھ آپ کتاب کی احادیث کا مقابلہ و موازنہ کرتے گئے ہیں۔

(ج) کبھی یہ بھی کیا ہے کہ اصل نسخہ میں جو لفظ تھا اُس کو متن میں جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ لیکن حاشیہ میں لکھ دیا ہے کہ خود آپ کی رائے میں اس لفظ کی جگہ یہ لفظ زیادہ قرینِ صواب تھا۔

(۲) احادیث کے درجات متعین کئے ہیں، یہ نہایت اہم کام ہے اس کی قدر اہل فن ہی

جان سکتے ہیں۔

(۳) راویوں پر کلام کیا ہے۔

(۴) جو الفاظ مغلق اور غیر مشہور تھے ان کی لغوی تحقیق کی ہے۔

(۵) اختلاف نسخ کا بالالتزام ذکر کیا ہے۔

یہ تعلیقات اس قدر کثرت سے ہیں کہ کوئی صفحہ ان سے خالی نہیں اور اپنی کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے تاریخی، ادبی اور فن حدیث و علم اسانید و رجال سے متعلق معلومات کا بیش بہا گنجینہ ہیں جس کے باعث کتاب کی افادیت دہ چند ہو گئی ہے اور جو مولانا کے غزارتِ علم اور وسعت و دقتِ نظر کی شاہدِ عدل ہیں۔ تعلیقات کے علاوہ شروع کتاب میں ایک مقدمہ بھی ہے جس میں حافظ ابن حجر کا مختصر مگر جامع ترجمہ ہے۔ اس کے بعد کتاب کا تعارف اور اس کے مخطوطات کا تذکرہ ہے پھر مخطوطہ کے دونوں نسخوں کے بعض صفحات کے عکس ہیں۔ ان میں نسخہ مسندہ کا جو عکس ہے وہ اس قدر باریک اور گنجلک ہے کہ اس کو پڑھ لینا بجائے خود ایک بہت بڑا کمال ہے، علاوہ ازیں ہر جلد کے آخر میں مضامین کتاب کی اجمالی اور مفصل اور تحقیق و تعلیق میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کی فہرستیں بھی شامل ہیں۔ غرض کہ اہلِ علم اور اربابِ ذوق کے لئے یہ تحفہ مفید اور نعمتِ غیر مترقبہ ہے کتاب کی افادیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں کثرت سے ایسی احادیث بھی نظر آئیں جن کی روشنی میں بعض فقہی مسائل پر ازسرِ نو گفتگو یا اُن پر نظر ثانی کی جا سکتی ہے، لیکن اس پر مستقل مقالہ کی ضرورت ہے۔

ادبیات

غزل

جناب خاور جبل پوری صاحب

کہنے میں آکے اپنے دلِ مبتلا کے ہم
خود جل بجھے چراغِ تمنا جلا کے ہم

قائل کبھی ہوئے نہ مخالف ہوا کے ہم
طوفاں میں بھی جلتے رہے جھلملا کے ہم

دیتا ہے ذوقِ حسن ہمیں دعوتِ نظر
کب تک رہیں گے دامنِ تقویٰ بچا کے ہم

ہرگز نہ راس آئی رہ و رسمِ عاشقی
دو ہی قدم چلے کہ گرے ڈگمگا کے ہم

اوروں کا کیا سوال کہ خود اپنی ذات سے
بیگانہ ہو گئے تمہیں اپنا بنا کے ہم

ہر وقت تھی نظر میں نئی راہ کی تلاش
ہر بار لوٹ آئے ہیں منزل تک جا کے ہم

اپنے ہی رنگ و روپ کو دیکھا پسِ حجاب
حیرت زدہ ہیں حسن کا پردہ اٹھا کے ہم

یہ فیضِ نظر ہے خاور آدابِ عاشقی
سینہ پہ زخم کھاتے رہے مسکرا کے ہم

تبصرے

حیاتِ سلیمان از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی تقطیع متوسط ضخامت ۸۴۷ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ :- دار المصنفین اعظم گڈھ

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ عہدِ حاضر میں اپنے علم وفضل اور جامعیت کے اعتبار سے عالمِ اسلام کی ایک نہایت ممتاز اور بلند پایہ شخصیت تھے، اسلامی علوم وفنون تحقیق وتنقید، شعر وادب، تعلیم وسیاست، تقریر وخطابت ان میں سے کوئی میدان ایسا نہیں ہے جو آپ کے اشہبِ فکر وقلم کی جولان گاہ نہ رہا ہو۔ ایک تصوف رہ گیا تھا تو سب کاموں سے فارغ ہو کر اُس میں بھی وہ کمال پیدا کیا کہ اس راہ کے مردانِ کار میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ ۔ حضرت سید صاحب کے حالات میں کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن مکمل ومبسوط اور محققانہ ومستند سوانح حیات کا حق دار المصنفین کی مسندِ علم پر آپ کے جانشین سے بہتر اور کون ادا کر سکتا۔ چنانچہ خوشی کی بات ہے کہ جس طرح سید صاحب نے "حیاتِ شبلی" لکھ کر اپنے استاد کا حق ادا کیا تھا ٹھیک اسی انداز میں شاہ صاحب نے یہ صحیفۂ زرّیں مرتب کر کے اپنے استاد ومربی کا حق ادا کر دیا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ سید صاحب کو حیاتِ شبلی کے لئے مواد ادھر ادھر سے جمع کرنا اور دوسروں کی امداد کا سہارا لینا پڑا۔ لیکن شاہ صاحب کو اس کی ضرورت پیش نہیں آئی کیوں کہ سید صاحب اپنی مصروفیتوں اور سرگرمیوں کی روئداد معارف میں قلمبند کرتے اور مکاتیب میں بھی اپنے احوال وکوائف لکھتے رہتے تھے اور

ان میں سے اکثر و بیشتر محفوظ بلکہ شائع ہو چکے تھے ۔ اس بنا پر شاہ صاحب نے اپنے استاد علام کی زندگی کی داستان زیادہ تر خود استاد کی زبان سے سنائی ہے ۔ اس حیثیت سے اس کتاب کو صاحبِ سوانح کی خود نوشت سوانح حیات بھی کہا جا سکتا ہے ۔ لیکن شاہ صاحب نے اس پوری داستان کو محنتِ شاقہ اور عرق ریزی کے بعد اس چابکدستی اور ہنرمندی سے مرتب کیا اور اس میں جگہ جگہ اپنی معلومات ومشاہدات کا رنگ اس خوبی سے بھرا ہے کہ پوری کتاب مجموعۂ لالۂ وگل ہو گئی ہے ۔ پوری کتاب سنین کے اعتبار سے نو ابواب پر تقسیم ہے ۔ اور ان میں سید صاحب کے خاندانی اور ذاتی حالات ، اوصاف وکمالات اور اخلاق و شمائل کے علاوہ آپ کی تصنیفات وتالیفات مقالات ومضامین اور تقریریں اور خطبات ، اسفار ، تعلیمی اور سیاسی خدمات شعر وشاعری ، مختلف عہدے اور مناصب ، ان سب پر استیعاب واستقصا سے کلام کیا ہے ۔ سید صاحب کا تعلق چونکہ اپنے وقت کی تمام اسلامی ، تعلیمی ، سیاسی اور ادبی تحریکوں اور ان کے مراکز سے تھا ۔ اس بنا پر یہ کتاب صرف ایک شخصی سوانح حیات نہیں بلکہ اس دور کی کم و بیش نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے مسلمانوں کی تہذیبی اور تمدنی تاریخ بھی ہے ۔ آخر میں سید صاحب کی وفات پر جو مرثیے لکھے گئے وہ اور بعض خاص خاص تشذرات کے اقتباسات بھی دے دیئے گئے ہیں ۔ انداز نگارش ایسا بے ساختہ وبرجستہ اور شگفتہ ہے کہ کتاب کو شروع کرنے کے بعد اسے ختم کئے بغیر ہاتھ سے رکھدینے کو جی نہیں چاہتا ۔ البتہ کتاب میں بعض معمولی فرو گذاشتیں رہ گئی ہیں ۔ مثلاً ص ۸ پر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو دیوبندی لکھا ہے ۔ حالانکہ وہ چاندپوری تھے ۔ چاندپور بجنور کے قریب ایک قصبہ ہے اور مولانا اسی نسبت سے مشہور تھے ۔ ص ۱۲ پر حاشیہ میں مفتی عبد اللطیف صاحب کے انتقال کا سن بھی غلط درج ہو گیا ہے ۔ صحیح تاریخ غالباً ۱۳۵۷ھ یا ۱۳۵۸ھ ہے

علاوہ ازیں ص ۷۵ پر لکھتے ہیں: سید صاحب مئی ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے مستعفی ہو کر الہلال کے عملۂ ادارت میں شامل ہو گئے۔ لیکن آگے چل کر ص ۶۲ پر تحریر ہے چنانچہ سید صاحب ۱۹۱۴ء کے شروع میں کلکتہ سے پونا چلے گئے

جیسا کہ سید صاحب کے خط مورخہ ۲ر جنوری ۱۹۱۴ء بنام سید عبدالحکیم صاحب دسنوی سے معلوم ہوتا ہے۔ سید صاحب ۲ر جنوری کو پونا پہنچے تھے تو پھر مئی میں کلکتہ آنے کا کیا مطلب ہے۔ ضروری ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک تاریخ غلط ہے۔ پھر ص ۵-۴ پر جامعہ میں توسیعی لکچر کی صدارت کے زیر عنوان شاہ صاحب نے صرف ڈاکٹر بہجت وہبی کا تذکرہ کیا ہے۔ حالانکہ انہیں لکچروں کے سلسلہ میں محترمہ خالدہ ادیب خانم کے بھی متعدد لکچر "جدید ٹرکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" پر ہوئے تھے اور ان میں سے ایک لکچر کی صدارت ڈاکٹر اقبال نے کی تھی۔ اور دوسرے کی صدارت سید صاحب نے فرمائی تھی۔ اور اس سلسلہ میں بحیثیت صدر لیکچر پر بڑا فاضلانہ تبصرہ کیا تھا۔ راقم الحروف ان دونوں لیکچروں میں موجود تھا۔ امید ہے کہ کتاب کے آئندہ ایڈیشنوں میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت از ڈاکٹر محمد عمر ریڈر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ تقطیع خورد ضخامت ۷۴۹ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد 20/- پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۶۔

فاضل مصنف نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ "ہندوستان کی اٹھارھویں صدی کی معاشرت" کی تیاری کے سلسلے میں میر تقی میر کے کلام اور انکی تصانیف کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ لیکن بعد میں ان کو اس موضوع سے اس قدر دلچسپی ہوئی کہ خود میر کا عہد ان کا مرکز توجہ بن گیا۔ چنانچہ یہ کتاب بھی جو نثار احمد صاحب فاروقی جنھوں نے

اس کتاب پر فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے ۔ ان کے بقول پہلے میر کے معاشرہ پر ایک طویل مقالہ کی شکل میں تھی ۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اس کا اصل موضوع عہدِ میر کی سماجی تاریخ ہے لیکن میر کا عہد دو دوروں پر مشتمل ہے ایک انکا قیام دہلی تک اور دوسرا قیام لکھنؤ کا ۔ اس بنا پر کتاب دو حصوں پر منقسم ہے ۔ پھر اگرچہ اصل موضوع سماجی حالات ہیں لیکن چونکہ یہ حالات سیاسی اور اقتصادی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ اس بنا پر فاضل مصنف نے حصہ اول میں نادر شاہ اور ابدالی کے حملوں کے علاوہ انگریزوں جاٹوں اور مرہٹوں کی طوائف الملوکی کے تذکرے کے ساتھ اس زمانے کے اقتصادی اور سماجی حالات اور اسی طرح حصۂ دوم میں نوابانِ اودھ کے حالات کے ساتھ اس دوسرے دور کے سماجی اور اقتصادی حالات قلمبند کئے ہیں ۔ اول الذکر دو قسم کے حالات کا بیان اگرچہ نسبتاً مختصر ہے کیونکہ یہ تو صرف پس منظر کے طور پر ہے ۔ لیکن جتنا کچھ بھی ہے دورِ متعلقہ کی سیاسی اور اقتصادی تصویر کشی کے لئے کافی ہے ۔ البتہ سماجی حالات دونوں ادوار کے (اور وہی اصل موضوع کتاب ہیں) اس طرح شرح و بسط اور تفصیل سے لکھے ہیں کہ آپ کو انگریزی ۔ فارسی یا اردو کسی زبان کی کتاب میں بھی اس طرح یکجائی طور پر نہیں ملیں گی اور ان کے جمع و ترتیب میں مصنّف نے جو محنتِ شاقہ اور غیر معمولی کاوش کی ہے اس کا اندازہ کتاب دیکھے بغیر نہیں ہو سکتا ۔ کوئی مخطوطہ ہو یا مطبوعہ ، انگریزی میں ہو یا فارسی اور اردو میں کتاب تاریخ کی ہو یا مذہب و تصوف کی ۔ شاعروں کے دواوین ہوں یا مجلات و رسائل ۔ غرض کہ کوئی ذریعۂ معلومات ایسا نہیں ہے جو موصوف کی نظر سے بچ گیا ہو ۔ چنانچہ صرف اہم مآخذ کی فہرست جو کتاب کے آخر میں درج ہے اٹھارہ صفحات پر ہے ۔ اس بنا پر اس میں شک نہیں کہ کتاب تاریخی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے اپنے رنگ میں منفرد اور لاجواب ہے ۔ اور حالات خواہ سیاسی ہوں یا اقتصادی اور یا سماجی ۔ پھر دونوں

کے ہوں یا دورِ ثانی کے ۔ غرض کہ پوری کتاب از اول تا آخر سرتاسر ایک داستانِ خوں چکاں اور صدر جہ مرقع عبرت انگیز "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم" کا مصداق ہے ۔ اس لئے عوام اور خواص دونوں کا اس کا مطالعہ کرنا چاہئے ۔ کتاب میں کچھ فروگذاشتیں بھی نظر پڑیں ۔ جن کی نشاندہی ضروری ہے ۔ (۱) بعض جگہ سنِ ہجری اور سنِ عیسوی میں مطابقت نہیں ہے ۔ مثلاً صفحہ ۹۸ پر ۱۱۷۳ھ کو ۱۸۹۵ء کے مطابق لکھا ہے حالانکہ یہ ۱۷۵۹ء کے مطابق ہے ۔ (۲) تاریخ کہیں ہجری لکھی ہے اور کہیں عیسوی ۔ اس میں یکسانیت ہونی چاہئے ۔ مثلاً ص ۸۸ پر تمام واقعات کی تاریخ سن ہجری سے لکھتے چلے آ رہے ہیں ۔ مگر ص ۸۹ پر شاہ عالم کی وفات کا سن عیسوی لکھا ہے ۔ اور اس کے بعد ہی بہادر شاہ ظفر کا سنِ جلوس ہجری لکھدیا ہے ۔ اس سے قاری کے ذہن میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس پایہ کی علمی کتاب میں ایسا نہیں ہونا چاہئے ۔ (۳) ۔ ص ۸۹ پر ہی شاہ عبدالعزیز دہلوی کا ایک حوالہ ہے اور ص ۹۰ پر ان کی طرف "تاریخِ عزیزی" کے نام سے ایک کتاب منسوب کی ہے حالانکہ یہ کتاب عبدالعزیز پسر صہبائی کی ہے ۔ چنانچہ مآخذ کی فہرست میں ص ۱۸۷ پر ان کو پسر صہبائی لکھا بھی ہے ۔ لیکن مصنف نے دونوں عبدالعزیز کو غلط ملط کر دیا ہے "غلام حلیم" حضرت شاہ عبدالعزیز ابن شاہ ولی اللہ کا تاریخی نام تھا ۔ نہ کہ پسر صہبائی کا جو اول الذکر سے بہت متاخر ہیں ۔ (۴) ۔ صفحہ ۱۵۳ پر شاہ ولی اللہ دہلوی کی ایک عبارت نقل کرتے کرتے درمیان میں ایک سطر لکھدی ہے ۔ اور اس کے لئے حوالہ تاریخ محمد شاہی کا لکھا ہے ۔ اس کے بعد شاہ صاحب کی عبارت پھر شروع کی ہے ۔ اور اس کے لئے حوالہ الفرقان کا دیا ہے ۔ عبارتوں کا یہ تداخل آدابِ تحریر کے خلاف ہے (۵) اسی صفحہ پر تاریخ محمد شاہی کو قلمی لکھا ہے ۔ اور اس کا حوالہ دیا ہے ۔ لیکن مآخذ کی فہرست میں اس کتاب کے مطبوعہ ایڈیشن کا ذکر ہے ۔ (۶) ۔ ص ۲۹ پر ہے کہ نادر شاہ کے حملہ کے دس سال بعد احمد شاہ ابدالی نے مسلسل نو حملے کئے لیکن ص ۳۰ پر ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے نادر شاہ

کے علاوہ آٹھ سال ۔۔۔۔۔ اور صحیح یہی ہے ۔ ایک علمی اور محققانہ کتاب میں دو برس کا فرق کھلتا ہے
بہرحال اتنی ضخیم کتاب میں یہ فروگذاشتیں چنداں اہم نہیں ہیں ۔ ان کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا کہ آئندہ اڈیشن میں ان کا لحاظ رکھا جائے ۔

تذکرۂ سعید از جناب افضل اقبال صاحب ایم ۔ اے ، تقطیع کلاں ۔ ضخامت ۱۱۰ صفحات ، کتابت و طباعت بہتر قیمت درج نہیں ۔ پتہ ، سعیدیہ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ ، حیدرآباد ۔ حیدرآباد دکن میں سعیدیہ لائبریری کے نام سے ایک کتاب خانہ ہے جو اگرچہ بہت بڑا نہیں ہے لیکن اپنے مشتملات کے لحاظ سے نہایت اہم اور قابلِ قدر ہے اس میں عربی اور فارسی کے نہایت اہم اور قدیم مخطوطات ، مختلف علوم و فنون پر محفوظ ہیں ۔ اور متعدد مخطوطات خود مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں ۔ اس کتاب خانہ کے جامع اور بانی شیخ الاسلام مفتی محمد سعید خاں صاحب مرحوم المتوفی ۶ ر فروری ۱۸۹۶ء تھے ۔ مرحوم بلند پایہ عالم و فاضل اور صاحب تصانیف کثیرہ بزرگ تھے ۔ اور آپ حیدرآباد ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اور مفتی بھی رہ چکے تھے ۔ آپ کا خاندان نہایت وسیع اور مردم خیز تھا ۔ مرد تو مرد اس خاندان کی خواتین بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں ۔ اور ملک و قوم کی خدمت کے مختلف شعبوں میں کام کر رہی ہیں ۔ اس کتاب میں مختلف اصحابِ قلم کے مضامین ہیں ۔ جن میں جناب مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ، ان کے خاندان اور اس خاندان کے قابلِ ذکر افراد و اشخاص سے تعارف کرایا گیا ہے ۔ اور ساتھ ہی کتب خانہ سعیدیہ کی تاریخ ۔ اس کی خصوصیات اور اس کے بعض اہم مخطوطات کا دلچسپ اور مفید تذکرہ کیا گیا ہے ۔ موضوع کی مناسبت سے اس مجموعہ میں جناب ڈاکٹر محمد یوسف الدین صاحب کی ایک ریڈیائی تقریر کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا ہے ۔ جو عثمانیہ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ و تمدن کے عنوان سے ہوئی تھی خوشی کی بات ہے کہ اب سعیدیہ لائبریری کے ساتھ ایک ریسرچ انسٹیٹیوٹ بھی قائم ہو گیا ہے اور یہ کتاب اسکی پہلی اشاعت ہے ۔ امید ہے اربابِ علم و ذوق اس کی قدر کریں گے ۔ ○○○

۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔
تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم
۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی
۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید لپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم ۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات ۔
۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم ، صدیق اکبر ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم ، انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد
۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم ، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ، تاریخ گجرات ، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم
۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، مصائب سورۃ یوسف ۔
۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اُردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔
۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اوّل ، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ، اسلامی کتب خانے ، عرب دنیا ۔
تاریخ ہند پر نئی روشنی
۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اُردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ، معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔
۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اُردو جلد سوم ، تاریخ روہیلکھنڈ ضلع بجنور ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اوّل
۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اُردو جلد چہارم ، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ، عرب و ہند عہد رسالت میں ۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔
۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اوّل ۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر ۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات
۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اُردو جلد پنجم ۔ مرد عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔
۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم ، تفسیر مظہری اُردو جلد ششم ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ
۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ، تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔
۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اُردو جلد ہشتم ، تاریخ الفخری ، حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر
۱۹۷۰ء حیات عبدالحی ، تفسیر مظہری اُردو جلد نہم ، مآثر و معارف ، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت ۔
۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اُردو جلد دہم ، بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان
۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی ادب کی تاریخ ، قدیم ہندوستان

Regd. No. D. (D) 231 Phone 262815 APRIL 1974

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

ندوۃ المصنفین دہلی

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب
سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اوّل۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اوّل۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ سلطیہ۔ تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اوّل۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اوّل"

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر۔

۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ"۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا۔

۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اوّل (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

بُرہان

جلد ۷۳ | ماہ ربیع الآخر ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۴ء | شمارہ ۵

نظرات

اب جب کہ علی گڑھ کا مضمون ختم ہو گیا ہے، مجھکو وعدہ اور پروگرام کے مطابق جنوبی افریقیا اور ماریشس کے سفرنامے کی طرف توجہ کرنی چاہیئے تھی جس کے لئے ہند اور بیرون ہند سے شدید تقاضے آبھی رہے ہیں، لیکن پچھلے دنوں برہان میں پروفیسر خورشید احمد فارق کا جو مضمون شائع ہوا۔ اور اُس پر دو قسط برہان میں جو خطوط موصول ہوئے یا اخبار الجمعیۃ میں شائع ہوئے اُن سے یہ محسوس کر کے بڑا دکھ اور افسوس ہوا کہ ایک پروفیسر صاحب موصوف کا ہی ذکر نہیں جو اپنے بقول "غیر جانب دار مورخ" ہو کر ہلاک جادو کے سامری ہو گئے۔ بلکہ ہم میں جو طبقہ دیندار کہلاتا ہے اُس کا ذہن بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات و سرایا کے معاملہ میں صاف نہیں اور اس سلسلہ میں اُس کا مطالعہ سرسری اور سطحی ہے۔ اس بنا پر جب ہمارے قدیم اکابر مورخین سیرت کا کوئی بیان یا روایت اس کے مزعومات کے خلاف سامنے آتی ہے تو وہ اُن سے ہی بدگمان ہو جاتا اور اُن کی ثقاہت پر کلام کرنے لگتا ہے، ان وجوہ سے میں اپنا دینی اور مذہبی فریضہ سمجھتا ہوں کہ اپنے مطالعہ اور غور و فکر کی روشنی میں غزوات و سرایا کی جو حقیقت میں نے سمجھی ہے اس کو بیان کر دوں اور اس کو دوسرے کاموں پر مقدم رکھوں، چنانچہ یہ مقالہ خدا نے چاہا تو آئندہ ماہ سے "عہد نبوی کے غزوات و سرایا اور اُن کے مآخذ پر ایک نظر" کے زیر عنوان شائع ہونا شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد اسی سلسلہ کا ایک دوسرا مقالہ "الغرانیق العلیٰ کی روایت" پر ہوگا۔ والامر بید اللّٰہ وبہ التوفیق۔

افسوس ہے پچھلے دنوں عالم اسلام کے دو بلند پایہ اور نامور شخصیتیں ہم سے جدا ہوگئیں، اور یہ دونوں مصری تھیں، ایک ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور دوسرے شیخ ابوزہرہ۔ اول الذکر بچپن میں ہی نابینا ہوگئے تھے لیکن اس کے باوجود علم و فضل اور ادب و انشا میں وہ کمال پیدا کیا کہ نہ صرف مصر کے بلکہ مشرق کی ایک نامور شخصیت بن گئے، انھوں نے جامعہ ازہر قاہرہ یونیورسٹی اور پھر فرانس میں تعلیم حاصل کی تھی، اس بنا پر وہ کلاسکل اور جدید دونوں ادبیات کے مبصر اور صاحب فن نقاد تھے، ایک زمانہ میں پروفیسر مارگولیوتھ کی ہمنوائی میں انھوں نے "الشعر الجاہلی" کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اس پر مصر میں ان کے خلاف اس قدر شدید ہنگامے ہوئے کہ لوگوں نے ان کا سوشل بائیکاٹ کر دیا اور گورنمنٹ نے بھی کتاب کی اشاعت ممنوع قرار دے دی، اس کے بعد ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے قابل اعتراض حصہ کو خارج کر کے اسی کتاب کو "الادب الجاہلی" کے نام سے شائع کیا، اس کے علاوہ اور متعدد کتب، مثلاً حدیث الاربعا تین جلدوں میں، علی ہامش السیرۃ، الشیخان، الفتنۃ الکبریٰ، مرآۃ الاسلام، الایام، وغیرہا مرحوم کی یادگار ہیں لیکن ان کا اصل میدان ادبی تنقید تھا۔ علاوہ ازیں وہ ایک خاص طرز تحریر کے بانی اور موجد تھے جس میں نسیم سحر کی لطافت، دریا کی روانی شعلہ کی لپک اور سیل رواں کی طاقت سب گھل مل گئے ہیں۔ عرب کی نئی نسل کے ذہن اور فکر پر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے قلم کے بہت گہرے اثرات ہیں اور اس حیثیت سے وہ بے شبہ عہد جدید کے ادبی معماروں میں ایک ممتاز مرتبہ و مقام کے مالک ہیں۔

شیخ محمد ابوزہرہ عصر حاضر کے نہایت فاضل اور بلند پایہ عالم و محقق اور مصنف تھے فقہ، اس کے اصول اور تاریخ پر ان کی نظر بہت گہری اور وسیع تھی۔ چنانچہ ائمہ اربعہ، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل ان میں سے ہر ایک

کے فقہ پر الگ الگ انھوں نے کتابیں لکھیں اور پھر امام اعظم کے تلامذہ قاضی ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر ان میں سے بھی ہر ایک کے فقہ پر الگ الگ ایک کتاب تصنیف کی۔ علاوہ ازیں فقہ جعفری اور المذاہب الاسلامیہ پر بھی ان کی تصنیفات ہیں جو بڑی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہیں۔ راقم الحروف کو پانچ چھ مرتبہ سفر قاہرہ اور وہاں کے قیام کا اتفاق ہوا ہے، اور افسوس ہے کہ اپنی خواہش اور تمنا کے باوجود ڈاکٹر طہٰ حسین مرحوم سے ملاقات کا کبھی موقعہ نہیں ملا۔ کیوں کہ ان دنوں میں یا وہ قاہرہ سے باہر تھے یا تھے وہیں۔ مگر علیل تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے شیخ ابوزہرہ سے تقریباً ہر سفر میں ملاقات اور ان کی مجلس میں بیٹھنے اور مجمع البحوث الاسلامیہ کے جلسوں میں ان کی تقریریں اور سوال و جواب سننے کا موقع ملا ہے، اور جیسا کہ میں نے برہان میں لکھا بھی ہے۔ میرے لئے یہ بات لائق افتخار و مسرت ہے کہ ایک مرتبہ مجمع کے جلسہ میں کسی موضوع پر میں نے عربی میں تقریر کی تو شیخ مرحوم نے جلسہ گاہ سے نکلتے ہوئے اس تقریر اور اُس کی زبان کی تعریف کی، اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کے ساتھ شیخ کو حافظہ نہایت قوی اور تقریر و خطابت کا عجیب و غریب ملکہ عطا فرمایا تھا، مجمع البحوث الاسلامیہ کی میٹنگ کے لئے اُن کا مقالہ ڈیڑھ سو دو سو صفحات سے کم کا نہیں ہوتا تھا لیکن وہ کبھی مقالہ پڑھتے نہیں تھے بلکہ زبانی تقریر کرتے تھے۔ یہ تقریر ڈیڑھ دو گھنٹہ سے کم کی نہیں ہوتی تھی، لیکن پیرانہ سالی کے باوجود اس درجہ مربوط اور مسلسل ہوتی تھی کہ مقالہ سے منطبق کر لیجئے، اور شروع سے آخر تک اس جوش اور قوت سے بولتے تھے کہ ہر برق و شرر کی چشمک باہم کا سماں بندھ جاتا تھا۔

مصر میں عظیم اکثریت شافعی المذہب حضرات کی ہے لیکن شیخ ابوزہرہ معاشی اور سیاسی مسائل میں عموماً حنفی مسلک کو ترجیح دیتے تھے اور اس کے اثبات کے لئے دلائل و براہین کا انبار لگا دیتے تھے، یوں بھی نہایت خود دار مگر بے حد متواضع اور خلیق تھے،

اپنی جو رائے ہوتی تھی اسے برملا ظاہر کرتے تھے۔ اگرچہ وہ حکومت مصر کی پالسی کے خلاف ہو۔ رحمهما الله رحمة واسعة۔

خدا کا شکر ہے برصغیر ہند و پاک کے آسمان پر دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ دو ہفتہ کے نتیجہ میں نفرت وعناد اور کشمکش و دل گرفتگی کے جو سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے وہ اب چھٹ رہے ہیں اور صلح وصفائی کی صبح صادق پائدار امن اور دوستی و خیرسگالی کے آفتاب تاباں کے طلوع کی پیش گوئی کر رہی ہے، اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو چکی ہے پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرلیا۔ ۹۳ ہزار اسیرانِ جنگ اور سیاسی نظربند جو ہندوستان میں تھے وہ ایک ایک کرکے اپنے وطن واپس پہنچ چکے ہیں اسی طرح پاکستان اور بنگلہ دیش میں لاکھوں انسانوں کا تبادلہ ہوچکا ہے اور فضا نارمل ہوگئی ہے اس خوش آیند اور امید افزا صورت حال کے لئے بے شبہ کوئی ایک نہیں بلکہ تینوں ملک ہی یکساں طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید ہے اب وہ دن بھی جلد آئے گا جب کہ تینوں ملکوں میں سفارتی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات بحال ہوں گے اور تینوں ایک ہی جسم کے مختلف اعضا کی طرح مل جل کر رہیں گے۔

گذارش

خریداری برہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلہ میں خط وکتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔

(منیجر) ادارہ کے قواعد ضوابط مفت طلب فرمایئے۔

اُردو کا ارتقاء تراجم قرآن کے آئینے میں

از حافظ مولانا محمد اسرائیل صاحب فرحت قاسمی
(رفیق دائرۃ الرشید جامعہ عربیہ اشرفیہ نیا بھوجپور ضلع بھوجپور (بہار))

(۳)

⑨ حضرت مولانا سید علی حسن بہاری | بیسویں[۲۰] صدی کے شروع میں ترجمہ و تفسیر کی عام شاہراہ سے ہٹ کر مولانا سید علی حسن بہاریؒ نے مطالب القرآن لکھا۔ انھوں نے لفظی ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا۔ اور نہ عام تفسیروں کی طرح بالتفصیل دلائل و براہین سے مطلب واضح کیا۔ بلکہ ترجمہ اور تفسیر کے درمیان انداز یہ اختیار کیا کہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ قوسین میں مطلب کا اضافہ کرتے چلے گئے، تاکہ ترجمہ کا ابہام اور اختصار اس میں نہ رہے اور نہ تفسیر کی بہت زیادہ طوالت اختیار کرلے۔ اِن دونوں کے درمیان ایک دوسرا ہی اسلوب انھوں نے اختیار کیا جس کا نام "مطالب القرآن" رکھا۔ افسوس کہ صرف تیسواں[۳۰] پارہ دستیاب ہوا نمونہ درج ذیل ہے۔

سُورۂ کوثر کا مطلب یہ ہے۔

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ۝ (اے پیغمبر) ہم نے تم کو نہر کوثر عطا کیا ہے۔ یا کثرت سے خیر و برکت
فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ دی ہے جیسے نبوّت عظمیٰ قرآن مجید دینِ اسلام آپ کی رفعتِ ذکر آپ
إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝ کے علوم، خلقِ عظیم، مقامِ محمود، مقامِ قرب، علماء اور اولیاء جو آپ کے
نام کو جگمگایا کریں گے۔ کثرتِ امت وغیرہ۔ پس اس امتحان کے جلے۔

ہماری ہی نماز پڑھو اور ہمارے ہی نام کی قربانی کرو۔ اے پیغمبر جو تمہارا برائی چاہے اس کا نام لیوا نہ رہے گا۔

سورۂ عصر ملاحظہ ہو۔

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

اللہ تعالیٰ قسمیہ فرماتا ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے۔ مگر ہاں جو مومن ہیں۔ اور جو نیکوکار ہیں اور جو (دین) کو حق اور صبر کی طرف لوگوں کو رغبت دلاتے ہیں وہ گھاٹے میں نہیں۔

سورۂ فلق ملاحظہ ہو۔

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ مِن شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ وَمِن شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ۝ وَمِن شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ۝ وَمِن شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝

(جملہ شر سے بچنے کے لئے اللہ کی جناب میں یوں دعا مانگو اور) کہو کہ خدایا میں تیری پناہ میں آتا ہوں مخلوقات کے جملہ شر سے (یعنی مجھکو جملہ شر سے محفوظ رکھو اور جملہ ان سب شر سے بھی) اندھیری رات کے شر سے (جیسے موذی اور درندہ جانور چور ڈاکو جن خبائث حجابات روحانیا) گنڈوں پر پھونکیں مارنے والوں کے شر سے جیسے جادوگر ساحر ڈائن عورت کے نازو کرشمہ) حسد کرنے والوں کے حسد سے (خواہ وہ حاسد انسان ہو یا اس کے اندر نفس امارہ)

⑩ حضرت مولانا محمد فتح صاحب | بیسویں صدی عیسوی کے شروع ہوتے ہی اُردو کا مقام بہت بلند ہو گیا۔ اخبار و جرائد بکثرت نکلنے لگے ادب وصحافت کا معیار بہت ارفع و اعلیٰ ہو گیا ایک سے بڑھکر ایک اہلِ قلم پیدا ہونے لگے۔ دوسرے اصنافِ ادب کے ساتھ ہی ساتھ قرآن کا ترجمہ بھی کثرت سے ہونے لگا بیسویں صدی کے اُردو مترجمین کے جو ترجمے دستیاب ہو سکے ان میں خاص شہرت کے مالک ہیں مولانا محمد فتح صاحب کا مندرجہ ذیل انھیں آیتوں کا ترجمہ رقم کیا جا رہا ہے:۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ (الآیۃ) اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ بھائیو! تم نے بچھڑے کو (معبود) ٹھہرانے میں (بڑا) ظلم کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو اپنے تئیں ہلاک کر ڈالو! تمھارے خالق کے نزدیک تمھارے حق میں یہی بہتر ہے۔ پھر اس نے تمھارا قصور معاف کر دیا وہ بے شک معاف کرنے والا اور صاحب رحم ہے۔

دُوسرے پارہ کا دوسرا رکوع:۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝ اَلآیۃ سو تم مجھے یاد کرو میں تمھیں یاد کیا کروں گا۔ اور میرا احسان مانتے رہنا۔ اور ناشکری نہ کرنا۔ اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔ بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کی نسبت یہ نہ کہنا کہ وہ مرے ہوئے ہیں۔ (وہ مردہ نہیں) بلکہ وہ زندہ ہیں۔ لیکن تم نہیں جانتے اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مالوں، جانوں اور میووں، کے نقصان سے تمھاری آزمائش کریں گے۔ تو صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو۔

سورۂ بقرہ کی آیت مُلاحظہ

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ (الآیۃ) خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اچھے کام کرے گا تو اس کو ان کا فائدہ ملے گا بُرے کام کرے گا تو اُسے اس کا نقصان پہنچے گا۔ اے پروردگار اگر ہم سے بھول یا چوک ہو گئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کیجیو۔ اے پروردگار! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیو جیسا کہ ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے پروردگار! جتنا بوجھ اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا ہمارے سر پر نہ رکھیو۔ اور (اے پروردگار) ہمارے گناہوں سے

درگذر کر اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا مالک ہے اور ہم کو کافروں پر غالب فرما:۔

(۱۱) مولانا سید عبدالدائم جلالی تقریباً ۱۹۲۰ء میں ایک غیر معروف شخصیت مولانا سید عبدالدائم جلالی نے قرآن پاک کے ترجمے اور تفسیر کی خدمت انجام دی۔ یہ تفسیر رسالہ مولوی دہلی" میں حسبتہ حسبتہ شائع ہوتی رہی اور جب وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو "تفسیر بیان السبحان" کے نام سے مستقل کتابی شکل میں شائع کی گئی جو "حمیدیہ پریس مولوی دہلی" میں طبع ہوئی فاضل مترجم کو اتنی شہرت نہیں ملی جتنی بیسویں صدی کے دوسرے مترجمین کو حاصل ہوئی رسالہ مولوی کے قارئین ضرور ان سے واقف ہیں۔ مگر محدود پیمانے[1] پر ترجمہ میں سلاست و روانی بھی ہے۔ زبان کی حسن و صفائی بھی اور ادائے مطلب کا دلنشیں انداز ہے:۔

پہلا پارہ پانچویں رکوع

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ (الآیۃ) اور (یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو! تم نے بے شک گوسالہ کو (معبود) بنا لینے سے اپنے اوپر ظلم کیا سو توبہ کرو تم اپنے خالق کی جانب اور اپنی جانوں کو قتل کر ڈالو تمھارے حق میں یہی بہتر ہے تمھارے خالق کے نزدیک پھر اللہ متوجہ ہوا تم پر یقیناً وہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے:۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (الآیۃ) اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا اس کے کمائے ہوئے کا نفع بھی اسی کے لئے ہے اور اس کے کماتے ہوئے کا ضرر بھی اسی کے واسطے ہے (تم کہو) اے ہمارے رب اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو اس کا مواخذہ ہم سے نہ کر اے ہمارے پروردگار ہم سے پہلے لوگوں پر جیسا بار گراں تو نے ڈالا تھا ہم پر ویسا بھاری بوجھ نہ ڈالنا۔ اے ہمارے پروردگار ہم سے ایسا بوجھ نہ اٹھوا جس کے اٹھانے کی ہم میں

[1] فاضل مضمون نگار نے غالباً تفسیر مظہری اردو از مولانا سید عبدالدائم جلالی ملاحظہ نہیں فرمائی جو ادارہ ہذا سے ضخیم ۱۱ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے تکمیل کا سلسلہ جاری ہے۔ (برہان)

طاقت نہ ہو۔ اور ہم سے درگذر کر اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر تو ہمارا حامی ہے۔ کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر:۔

⑪ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ موجودہ دور میں اُردو ایک انتہائی بلیغ زبان بن چکی ہے دنیا میں آج جتنے علوم وفنون رائج ہیں وہ تمام تر اُردو میں منتقل ہو گئے اس کی ترقی میں علماء دیوبند کا بہت بڑا حصہ رہا ہے اُنھوں نے اُردو میں اتنا کام کیا ہے اور اس کثرت سے کتابیں تصنیف کی ہیں جن کا شمار احاطۂ تحریر سے بالاتر ہے۔

ضمنی طور پر پچھلے صفحات میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کا ذکر آچکا ہے سرزمین دیوبند سے اُٹھنے والی شخصیتوں میں مولانا کی ممتاز حیثیت ہے آپ کی شخصیت ملک گیر شہرت کی حامل تھی مدرسہ دارالعلوم دیوبند میں سب سے اونچے عہدہ پر آپ فائز تھے یعنی شیخ الحدیث تھے آپ کی مشہور تفسیر جو "حمائل شریف مترجم" کے نام سے معروف ہے۔ اور جس کے آخری حصہ کے چھ پاروں کی تفسیر آپ کے وصال کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پورا کیا۔ یہ تفسیر گوناگوں خوبیوں کی حامل ہے۔ اور دورِ حاضر کی تقریباً تمام تفاسیر پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔ اُردو میں تفسیر ہر مکتبۂ فکر اور ہر خاص وعام کے نزدیک سند قبولیت کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ اور اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں مسلمانوں کے لاکھوں گھروں میں یہ تفسیر موجود ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے دور میں اُردو معراجِ ترقی کو چھو رہی تھی ترجمہ میں آپ نے عالمانہ اندازِ بیان اختیار کیا محاورات اور روزمرہ کی چاشنی سے زبان میں ایک لطافت پیدا ہو گئی تھی جو اپنے اندر بڑی دل کشی رکھتی تھی۔

عصرِ حاضر کا یہ عظیم الشان کارنامہ علماء وفضلاء ہم عصر کے مسلسل تقاضوں پر شروع ہوا۔ یہ ترجمہ ۱۹۰۹ء میں آپ نے شروع کیا تھا اور تین سال کی شبانہ روز محنت کے بعد سورۂ توبہ تک پہنچے اس کے بعد آپ اس منزل کے رہ نورد ہوئے جو اکثر انبیاء، ائمہ، صلحاء، علماء، مجاہدین وپیشوائے دین کو پیش آچکی ہے۔ یعنی حالات اور مذہبی ضروریات کے پیشِ نظر آپ نے ۱۹۱۶ء

میں عزم بیت اللہ فرمایا اس وقت خود حجاز کا چپہ چپہ ظلم و جور کی قہرمان طاقتوں سے الامان الامان پکار رہا تھا۔ ترکوں کی تکفیر کے فتاوے تیار ہو رہے تھے۔ اور اس وقت متحدہ ہندوستان کے سات کروڑ کی ملت اسلامیہ کا مرکز عقیدت و محبت الحاد و طاغوتیت کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اس شعلہ فشاں ماحول میں اس مرد مجاہد نے "شریف حسین" مکہ کی بدگمانیوں کا شکار ہو کر نظر بندی اور قید و بند کو ترجیح دی دراصل قدرت اُن سے سکون و خلوت کی زندگی عطا کر کے دوسرا ہی کام لینا چاہتی تھی بحر روم کا یہ چھوٹا جزیرہ مالٹا آپ کا عارضی مسکن بنا حضرت شیخ الہند اپنے رفقاء کے ساتھ ۱۹۱۵ء میں مالٹا پہنچے اور ترجمہ کا کام شروع کر دیا۔ رفقاء کار میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قابلِ ذکر ہیں ترجمہ کا کام ایک سال میں پورا ہوگیا۔ یعنی ۱۹۱۶ء میں پایۂ اختتام کو پہنچ گیا پھر آپ نے حواشی شروع کی سورۂ نساء تک پہنچے تھے کہ ہندوستان بھیج دیئے گئے۔ یہاں آنے کے بعد ہم ۲ پاروں کا حاشیہ بھی پورا کر دیا اور اس کے بعد سفر آخرت فرمایا آپ کے وصال کے بعد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے اس کو پورا کیا۔ یہ مسودہ ۱۹۲۳ء میں طباعت کے لئے مدینہ پریس بجنور میں پہلی بار دیا گیا۔

ترجمہ کا نمونہ درج ذیل ہے :۔

وَاِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ الاٰیہ	اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اے قوم! تم نے نقصان کیا اپنا یہ بچھڑا بنا کر سو اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک پھر متوجہ ہوا تم پر بے شک وہی ہے معاف کرنے والا نہایت مہربان۔
فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ الاٰیہ	سو تم یاد رکھو مجھ کو میں یاد رکھوں گا تم کو اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو۔ اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور نہ کہو اُن کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں "کہ مردے ہیں" بلکہ وہ تو زندہ ہیں لیکن تم کو خبر نہیں اور البتہ ہم آزمائیں گے۔

تم کو تھوڑے سے ڈر سے اور بھوک سے اور نقصان سے مالوں کے اور
جانوں کے اور میووں کے اور خوش خبری دے صبر کرنے والوں کو۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا الآية

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے اس کو ملتا
ہے جو اس نے کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کمایا۔ اے رب ہمارے!
نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا چوکیں، اے رب ہمارے! اور نہ رکھ ہم پر
بوجھ بھاری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر! اے رب ہمارے!
اور نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس کی ہم کو طاقت نہیں اور درگذر کر
ہم سے اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم پر تو ہی ہمارا رب ہے مدد کر ہماری
کافروں پر

⑫ مولانا سید محمد شاہ | بیسویں صدی کے غیر معروف مترجم مولانا سید محمد شاہ ہیں یہ ترجمہ بیسویں صدی کے ربع اوّل کے بعد کا ہے مترجم کے ہم عصروں میں مولانا سید سلیمان صاحبؒ ندوی، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ، مولانا عبد الحلیم صاحبؒ صدیقی، مولانا شبلی نعمانی وغیرہم تھے جنھوں نے اس ترجمہ پر اپنی مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ ترجمہ کی زبان نہایت سلیس اور صاف ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ الخ

اور (وہ بھی یاد کرو) جب کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم
بے شک تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے آپ پر بڑا ظلم کیا پس اپنے خالق
کی طرف رجوع کرو اور اپنی جانوں کو مارو کہ تمہارے لئے تمہارے پروردگار
کے نزدیک یہی بات بہتر ہے چنانچہ اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی بے شک
وہ درگذر کرنے والا مہربان ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ الخ

پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا میرے شکر گذار رہو، اور کفران
نعمت نہ کرو اے ایمان والو! (سب باتوں میں) صبر و صلوٰۃ (کے ذریعے)
سے مدد لیا کرو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے اور ان

لوگوں کو جو راہ خدا میں مارے جائیں۔ مردہ نہ کہو (حقیقتاً) وہ زندہ ہیں لیکن تم (ان کی زندگی کو) نہیں سمجھتے اور یہ ضروری ہے کہ ہم خوف و ہراس، بھوک کی تکلیف مال و جان کے نقصان اور پھلوں کی کمی سے تمہارا کچھ تھوڑا بہت امتحان لیں (اے پیغمبر) صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دیجئے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا الخ — اللہ کسی انسان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ہر شخص وہی کچھ پائے گا جو اس نے کمایا۔ اور جواب دہ بھی اسی کے لئے ہے جو اس نے کمایا (ایمان والے تو یہی کہتے ہیں) خدایا! اگر ہم سے بھول یا چوک ہو جائے تو اس پر ہمیں سزا نہ دے۔ خدایا ہم پر ویسا بار نہ ڈال جیسا کہ تو نے ان لوگوں پر ڈالا تھا۔ جو ہم سے پہلے تھے۔ خدایا ہم سے ایسا بوجھ نہ اٹھوا جس کی ہمیں طاقت نہیں۔ ہم سے درگذر فرما۔ ہمارے گناہ بخش دے اور ہم پر رحم کر خدایا تو ہی ہمارا آقا ہے۔ تو ہی ہمیں نافرمانوں کے مقابلے میں فتح عطا فرما۔

⑬ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری — بیسویں صدی کے اوائل میں سرزمین ہند میں ایک سے بڑھ کر ایک جید علماء، وفضلاء، ادیب و شاعر پیدا ہوئے اور ادب وصحافت اور علوم وفنون کا میر کارواں بن کر جادۂ دین و شریعت پر اہل قافلہ کو چلاتے رہے مرکز العلوم دیوبند سے پیدا ہونے والی شخصیتوں میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری بھی ہیں۔ آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے ممتاز شاگرد اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ساتھیوں میں تھے آپ نے اہل حدیث کا مسلک اختیار کیا۔ کتاب وسنت سے والہانہ وابستگی تھی، ملت اسلامیہ کا یہ وہ طبقہ ہے جو قرآن وسنت کے علاوہ دین میں کسی اور چیز کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اس کا زاویۂ نگاہ بس یہیں تک محدود ہے۔ اور اس کا عقیدہ ہے کہ

اصل دیں آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیثِ مصطفےٰ بر جاں مسلّم داشتن

ماضیٔ قریب میں اہلِ سنّت والجماعت اور اہلِ حدیث کے درمیان بہت دنوں تک باہمی آویزش چلتی رہی۔ حالانکہ فی الحقیقت لفظی تنازع کے سوا اس کی اصلیت اور کچھ نہ تھی۔ اور اسی لفظی نزاع نے سینکڑوں مناظروں اور مباحثوں کی محفلیں گرم کرائیں اور شاید اس گرمیٔ محفل سے کچھ فائدہ تو ہوا نہیں البتہ ملّت کے دلوں میں ایک شگاف ضرور پیدا ہوگیا۔

بہرحال مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری اپنی گہری بصیرت اور علمی خدمت کی بنا پر کل ہند اہلِ حدیث کانفرنس کے صدر بنائے گئے۔ اور تادم واپسیں صدارت کے عہدے پر متمکن رہے۔ انھوں نے بہت سی کتابوں کی تصنیف کے ساتھ ہی ساتھ قرآنِ پاک کا ترجمہ بھی کیا اور حواشی بھی لکھے آپ کی یہ تصنیفِ لطیف "تفسیر ثنائی" کے نام سے موسوم ہے اور طبقۂ اہلِ حدیث میں بڑی عقیدت واہمیت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے ذیل کا نمونۂ ترجمہ ہم مختلف جگہوں سے منتخبہ پیش کر رہے ہیں ترجمہ کی زبان نہایت شستہ اور سلیس ہے۔ اور مطلب کے لئے بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں آپ کا انتقال ہوگیا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ الخ	خدا کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر حکم نہیں دیتا جو کچھ کوئی نیکی کرے وہ اسی کو ملے گی اور جو برائی کرے اس کا وبال بھی اس پر ہوگا۔ اے ہمارے مولا! نہ پکڑ ہم کو اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے۔ اے ہمارے مولا! نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری جیسا کہ رکھا تو نے ہم سے پہلوں پر اے ہمارے مولا! ہم کو ایسے حکم نہ دیجیو جن کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہم سے درگذر کر اور ہم کو بخش اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا والی ہے۔ پس تو کافروں کی قوم پر ہم کو فتح یاب کر۔

سورۂ یٰسین پارہ ۲۳ رکوع ۲

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُمْ
مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ
يَنْسِلُونَ ٥ قَالُوا يَا وَيْلَنَا
مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا
هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ
وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ٥
إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً
فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ
فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا
وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ
إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي
شُغُلٍ فَاكِهُونَ ٥ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ
فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِئُونَ
لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُمْ مَا
يَدَّعُونَ ٥ سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ
رَبٍّ رَحِيمٍ ٥ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ
أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ٥

اور صور پھونکا جائے گا تو یہ لوگ قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کی طرف
چل کر کھڑے ہوں گے (وہ اٹھتے ہوتے) کہیں گے ہائے ہم کو ہماری
خواب گاہ سے کس نے اٹھایا؟ یہ تو وہی ہے جس کا خدا تعالیٰ نے
(اپنی مہربانی سے) وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا۔ (حقیقت
میں وہ گھڑی) ایک ہی آواز (سے پیدا) ہوگی جس کو سنتے ہی سب
لوگ ہمارے حضور حاضر ہو جائیں گے پھر اس روز کسی جان پر ظلم
نہ ہوگا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اسی کا تم کو بدلا ملے گا جنت والے اس
روز (پسندیدہ) مزے میں جی بہلا رہے ہوں گے (کیوں کہ) ان
کی بیویاں تختوں پر تکیہ لگائے (بہت ہی آرام میں) ہوں گی۔
ان کے لئے اُن (بہشتوں) میں ہر قسم کے پھل ہوں گے اور جو کچھ
وہ چاہیں گے اُن کو ملے گا (بڑی نعمت یہ ہوگی کہ) پروردگار
مہربان کی طرف سے اس کو سلام کہا جائے گا اور (کہا جائے گا)
او بدکارو! آج الگ ہو جاؤ۔

(۱۵) مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی | بیسویں صدی کے اوائل میں رشد و ہدایت کے افق پر آفتاب بدر بغل اور ماہتاب برکف ملتِ اسلامیہ کی جو عظیم اور جامع شخصیت طلوع ہوئی اسے دنیا مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کہتی ہے حضرت مولانا امت مسلمہ کی پوری تاریخ میں بعض خصوصیات میں اپنی نظیر آپ تھے عصر حاضر کے ایک فرد واحد اور یکتائے روزگار تھے۔ ایک طرف آپ

کی شخصیت علم وفضل اور حقائق ومعارف کی جامع تھی۔ تو دوسری طرف رشد وہدایت کا آفتاب بن کر لاکھوں بندگانِ خدا کے تاریک قلوب کو انھوں نے انوارِ الٰہی کی تجلیات سے روشن اور تابناک بنایا اور جہاں تک علم وادب کی خدمات کا تعلق ہے کوئی ایسا موضوع نہ ہوگا جس پر آپ کی متعدد تصانیف نہ ہوں چھوٹی بڑی کل تصنیفات کی تعداد تقریباً تیرہ سو ہے۔ یہ سعادت ملتِ اسلامیہ کی پوری تاریخ میں کیا بلکہ تاریخِ عالم میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوتی ہوگی۔ جو علمی کارنامے حضرت تھانویؒ کے ہاتھوں انجام پائے۔ ان میں فقہ، حدیث، تفسیر، عقائد واخلاق، فلسفہ، تصوف، تاریخ وسیر، ادب، معانی وغیرہ ہیں۔ اور قرآنِ پاک کی تفسیر تو ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تفسیر "بیان القرآن" کے نام سے موسوم ہے جو کئی جلدوں میں ہے۔ مگر اس کا خلاصہ ایک جلد میں ہے جو میرے پیشِ نظر ہے۔ ترجمہ کی زبان کس قدر بلیغ ہے۔ ذیل کا ترجمہ اس کا شاہد ہے۔ حضرت مولاناؒ کا ۱۹۴۳ء میں انتقال ہوگیا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ الخ)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ الخ	اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اپنی قوم سے کہ اے میری قوم بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اپنے اس گئو سالہ (پرستی) کی تجویز سے سو تم اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو۔ پھر بعض آدمی بعض آدمی کو قتل کرو یہ (عمل درآمد) تمھارے لئے بہتر ہوگا۔ تمھارے خالق کے نزدیک پھر حق تعالیٰ تمھارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے بے شک وہ تو ایسے ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔
فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ الخ	مجھ کو یاد کرو میں تم کو (عنایت) سے یاد رکھوں گا اور میری (نعمت کی) شکرگذاری کرو اور میری ناسپاسی مت کرو اے ایمان والو! صبر اور نماز سے سہارا حاصل کرو۔ بلاشبہ حق تعالیٰ صبر کرنے والوں

کے ساتھ رہتے ہیں۔ (اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ بدرجۂ اولیٰ) اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں ان کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ معمولی مردوں کی طرح مردے ہیں بلکہ وہ تو (ایک ممتاز) حیات کے ساتھ زندہ ہیں لیکن تم (اُن) حواس سے (اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے اور (دیکھو) ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف اور فاقہ سے اور مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے اور آپ ایسے صابرین کو بشارت سُنا دیجئے

(ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی [illegible])

سُوْرَۂ بَقَرَہ کی آخری آیت

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا الخ

اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا۔ مگر اسی کا جو اس کی طاقت (اور اختیار) میں ہو اس کو ثواب بھی اسی کا ملے گا جو ارادہ سے کرے اے ہمارے رب ہم پر دار و گیر نہ فرمایئے اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے اے ہمارے رب! ہم پر کوئی ایسا بار (دنیا یا آخرت کا) نہ ڈالئے جس کی ہم کو سہار نہ ہو اور درگذر کیجئے ہم سے اور بخش دیجئے ہم کو اور رحم کیجئے ہم پر آپ ہمارے کارساز ہیں۔ (اور کارساز طرفدار ہوتا ہے) سو آپ ہم کو کافروں پر غالب کیجئے۔

(۱۶) مولانا احمد سعید صاحب دہلوی | سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ جو مرکز کے متوطن تھے، عصر حاضر کے مفسرین میں آپ کی اچھی خاصی شہرت ہے۔ زبان پر اتنی قدرت حاصل تھی کہ جس مطلب کو تقریر یا تحریر میں ادا کرتے فصاحت و بلاغت اور ایجاز کا دریا بہا دیتے ملت نے اسی معجز بیانی کی وجہ سے ان کا لقب "سحبان الہند" دیا تھا اور جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کی

چٹکیوں میں لوہا موم ہو جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت سحبان الہندؒ کی زبان سے جو مطلب ادا ہوتا وہ مثل موم کے پگھل کر ادا ہوتا عمر بھر زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے اونچے درجہ کے علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ تاریخ و سیر پر پورا عبور حاصل تھا۔ علمی بصیرت اور گہری فکر کے حامل تھے۔ قدرت نے انھیں بڑی خصوصیات اور عنایات سے نوازا تھا زبان بالکل ٹکسالی تھی روزمرہ اور بامحاورہ اردو پر کامل دستگاہ حاصل تھی۔ ترجمہ میں "خیر الکلام ما قل ودل" کا نمونہ ملتا ہے۔ مختصر الفاظ میں زیادہ معانی کو بیان کر دینا آپ کا مخصوص حصہ تھا۔

آپ کی "تفسیر کشف الرحمٰن" کے نام سے معنون ہے یہ تفسیر بڑی جامع مانی جاتی ہے۔ حضرت والاؒ نے سولہ[۱۶] تفاسیر کی مدد سے کشف الرحمٰن لکھی تھی۔ جس کی تفصیل صفحہ اول پر ہے۔ مولانا نے ۱۹۶۲ء میں واصل بحق ہو گئے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ الخ	اور وہ بات یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! تم نے اس بچھڑے کو معبود بنا کر اپنا بڑا نقصان کیا سو اب تم اپنے خالق کے سامنے توبہ کرو اور ایک دوسرے کو قتل کر دو یہی طریقہ تمھارے خالق کے نزدیک تمھارے لئے بہتر ہے پھر خدا نے تم پر توجہ فرمائی بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا ہے نہایت مہربان ہے
فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ الخ	سو ان نعمتوں پر مجھکو یاد کرو میں تم کو یاد رکھوں گا اور میرے احسانات کا شکریہ ادا کرتے رہو اور میری نافرمانی نہ کیا کرو۔ اے ایمان والو! صبر اور نماز سے قوت حاصل کرو بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کئے جائیں اُن کو یوں نہ کہو کہ وہ مُردے ہیں۔ بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں لیکن تم ان کی زندگی کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اور البتہ ہم تمھیں قدرے خوف اور بھوک اور مال و جان سے نقصان اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے۔ اور آپ ان صبر کرنے

والوں کو بشارت دے دیجئے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اللہ تعالیٰ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی بساط کے موافق اس
الخ کی کمائی کا نفع بھی اسی کے لئے ہے اور اس کے کئے کا وبال بھی اسی پر ہے۔

اے ہمارے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہم سے ان پر مواخذہ نہ کر۔ اے ہمارے پروردگار! ہم پر کسی ایسے سخت حکم کا بار نہ ڈال۔ جیسے ہم سے پہلوں پر تو نے ڈالا تھا۔ اے ہمارے پروردگار ہم سے وہ بارِ گراں نہ اٹھوا۔ جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ اور ہم سے درگذر فرما اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہمارا آقا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کے مقابلے میں جو کافر ہیں ہماری مدد فرما۔

(۱۷) امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ | بیسویں صدی میں اُفقِ صحافت پر جلوہ گر ہونے والی علمی، سیاسی شخصیتوں میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ وہ ایک جامع خصوصیات اور عظیم المرتبت شخصیت کے مالک تھے۔ یدِ قدرت نے انھیں فضل وکمال، فہم وادراک سے بھرپور طور پر نوازا تھا۔ حق سبحانہ وعزّ اسمہٗ نے جن محاسن واوصاف سے نوازا تھا۔ ملت نے کماحقہٗ استفادہ نہ کیا ان کا رسوخِ علم، تدبّر وتفقہ، علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی، ٹھوس افکار و انظار دُنیا کے لئے "سنگِ میل" کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی گرامی قدر مخلصانہ شخصیت کے ابواب ارباب بصیرت کے لئے درسِ عبرت ہیں۔ کاشکہ دنیا قدر ومنزلت کرتے ہوئے ان سے وہ علمی، ادبی، تاریخی کام لیتی جس کے لئے قدرت نے ان کی تخلیق فرمائی تھی تو آج علمی دُنیا بہت ہی زیادہ فیضیاب اور علمی شہ پاروں سے مالا مال نظر آتی۔ موصوف اپنی ہمہ گیر شخصیت کے اعتبار سے بیسویں صدی میں ایک ضرب المثل اور ممتاز حیثیت کے مالک تھے اپنے اور بیگانوں میں یکساں طور پر اپنے دورِس ذہن اور دلوں کو موہ لینے والے کلمات عالیہ در حکیمانہ استدلال کی بُنیاد پر امام کا درجہ رکھتے تھے جوانی کے باغ وبہار سے نکل کر زندگی کے آخری ایام تک ملک و

ملت کے فلاح و بہبود کی خاطر صبر آزما احوال سے گذرتے ہوئے اور ملک و قوم کے تمام مطاعن کی پروا کئے بغیر حق نمائی میں پیش رو رہے۔ جب مولانا آزادؒ نے ملک و قوم کی ناصحی فرمائی اور خاطر خواہ توجہ نہیں پائی تو اپنی تحریر میں ایک جگہ اس تاثر کا یوں اظہار بھی فرما دیا کہ

"میں اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا"

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم　　میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

فی الحقیقت آزادیٔ وطن کے سیاسی ہجوم میں آئے نہیں لائے گئے اور اس کی کش مکش نے انھیں وہ موقعہ نہیں بخشا جس سے موصوف اپنے ذوقِ سلیم کے اعتبار سے دینی، علمی، ادبی، تاریخی، خدماتِ جلیلہ انجام دیتے جس کی آج شدت کے ساتھ کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ ان تمام کے باوجود آپ نے اپنی جامع تصنیفات میں جو کچھ بھی قلمبند فرمایا ہے وہ صحافت و انشا میں بلاشبہ موجودہ و آئندہ نسلوں کے لئے شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔

مولانا کی جتنی عظیم شخصیت تھی اس کے شایانِ شان ان کا تعارف نہیں کرایا جا سکتا وہ اکبر و شیر شاہ کا دماغ و مزاج امام ابن تیمیہ کا تبحر و تفکر امام ابو حنیفہ کا تفقہ حضرت عمرؓ کا تدبر، غزالی اور رازی کا تفلسف اور اشوک و اورنگ زیب کا جاہ و جلال لے کر دنیا میں آتے تھے۔ ان کی ذات میں قدرت نے بیک وقت بہت سے کمالات جمع کر دیئے تھے ان کی شخصیت عہد آفریں تھی وہ نصف صدی تک ہندوستان کی سیاست پر چھائے رہے اور ماضیٔ قریب کی تلخ سیاست کا کون سا ایسا پیچ و خم ہوگا جسے انھوں نے اپنے ناخنِ تدبر سے نہ سلجھایا ہو۔ ان کی آواز میں شعلے کی لپک بادل کی گرج اور برق و رعد کی کڑک تھی جس نے قصرِ برطانیہ میں ایک زلزلہ ڈال دیا تھا۔ ان کی زبان و قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ سے ایوانِ حکومت کے در و بام میں لرزہ اور شگاف پڑ جاتا تھا۔

آزادی کے بعد وہ مرکزی وزیرِ تعلیم بنائے گئے اور دس برس تک وزارتِ تعلیم کی کرسی پر جلوہ افروز رہنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں چند روزہ علالت میں مبتلا رہ کر انھوں نے داعیٔ اجل

کو لبیک کہا۔ اور پورے سرکاری اعزاز و احترام کے ساتھ دلّی میں جو ملّت کے ہزاروں آفتاب و ماہتاب کا آخری مسکن ہے سپردِ خاک کر دیئے گئے۔ ان کے انتقال کے بعد سابق صدر جمہوریۂ ہند آں جہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے صحیح کہا تھا کہ مولانا کی ذات ملک کی نصف صدی کی تاریخ تھی اور آج ان کی مُردہ لاش کو سرزمین دِلّی میں دفن نہیں کیا جا رہا ہے۔ بلکہ پورے پچاس سال کی تہذیب و تاریخ ان کے ساتھ مدفون ہو رہی ہے۔

بساطِ فکر و فن اور میدانِ علم و ادب میں جہاں سے دوسرے لوگ سفر شروع کرتے ہیں مولانا اس کم عمری میں اس منزل پر پہنچ کر پیڑں کے کانٹے چن رہے تھے ۱۴ برس کی عمر میں وہ سپہر علم و ادب پر ایک تارہ بن کر چمکے اور دیکھتے دیکھتے چند ہی سالوں کی قلیل مدت میں ایک روشن آفتاب بن کر سرزمین ہند پر ضو فشانی کرنے لگے ان کے قلم کی جولانی نے خانقاہوں سے لے کر بڑی بڑی علمی درسگاہوں تک اور ایوانِ حکومت سے لے کر بڑے بڑے سیاسی اداروں تک کو چونکا دیا ملک کی علمی ادبی اور سیاسی شخصیتوں کی نگاہیں ان کی طرف مرکوز ہونے لگیں اور پہلے ہی دن پورے ملک نے ان کا لوہا مان لیا۔

مولانا نے ادب و صحافت سے اپنی زندگی کا سفر شروع کیا تھا ۱۹۱۲ء میں سب سے پہلے کلکتہ سے انھوں نے ہفتہ وار الہلال نکالا وہ ایک شعلۂ جوالا تھا۔ جس نے لاکھوں تیرہ و سرد دلوں کو روشنی اور گرمی پہنچائی۔ اس وقت ملک کی عظیم شخصیت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ ہم لوگ اب تک خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے تھے الہلال نے ہمیں بیدار کر دیا۔ مگر حکومت برطانیہ کی نظرِ بد سے وہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ اور دو سال کے بعد بند ہو گیا۔ پھر البلاغ کے نام سے مولانا نے دوسرا جریدہ نکالا اس کی زندگی بھی بہت مختصر ثابت ہوئی اور پھر جلا وطنی اور نظر بندی کے ناخوشگوار حادثات پیش آنے لگے۔ مولانا کی عمر کا ساتواں حصہ جیل کی چہار دیواریوں میں گذرا ہے:۔

مولانا آزادؒ نے اُردو زبان کو ایک ایسا اسلوب ایک ایسا لب و لہجہ ایک ایسا اندازِ بیان

اور ایک ایسی طرزِ نگارش عطا کی کہ اُردو میں انتہائی بلاغت، جلالت و جبروت، عظمت و تاثر اور سلاست و دلنشینی پیدا ہوگئی، اس وقت ادب و صحافت کا کارواں جن راہوں سے گذر رہا تھا مولانا کے اسلوبِ نگارش کو دیکھ کر سہما ٹھہرا اور آگے بڑھنے سے اپنے قدم کو روک لیا۔ اور الہلال والبلاغ کی طرزِ نگارش اور روش پر نگاہیں مرکوز کردیں اس وقت کا شاید ہی کوئی ادیب کوئی صحافی اور کوئی ایسا نثار ہوگا جس نے الہلال کی طرزِ تحریر سے متاثر ہوکر اسے اپنانے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس طرح "مولانا ابوالکلام آزاد" نے اُردو ادب کی جو خدمت انجام دی تاریخ ادب کے صفحات پر زرّیں حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

مولانا آزادؒ صرف ایک اونچے درجے کے ادیب اور سیاست داں ہی نہ تھے بلکہ اپنے دور کے بہت بڑے ایک جیّد عالم اور عبقری ذہن رکھنے والے ایک مفکرِ اسلام بھی تھے، اسلامی علوم پر انھیں گہری بصیرت تھی دیگر علوم و فنون کے گہرے مطالعے کے ساتھ ساتھ خود اُن کے قول کے مطابق عربی، فارسی اور اُردو میں جتنی قدیم و جدید تفاسیر ہیں وہ تمام قرآن کی نظر سے گذر چکے تھے۔

مولانا کے دل میں ترجمہ و تفسیر کا ایک داعیہ پیدا ہوا اور ۱۹۱۶ء میں البلاغ کے صفحات پر ترجمان القرآن اور تفسیر البیان کا اعلان کردیا گیا ترجمہ اور تفسیر کا کام انھوں نے ۱۹۱۹ء میں شروع کردیا تھا حالات اگر سازگار ہوتے تو جس تیزی سے کام ہو رہا تھا دو۲ سال کی مدت اس کی تکمیل کے لئے کافی تھی مگر جلاوطنی، نظر بندی اور قید و بند کی صعوبتوں نے اس کا موقع نہیں دیا اور یہ کام دو۲ سال کے بجائے ۱۵ سال کی مدت یعنی ۱۹۳۰ء میں پورا ہوا۔ چوں کہ سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں بڑی مشکل سے جمع ہوتی ہیں مولانا نے ان دونوں کو ایک زندگی میں سمونے کی کوشش کی اور بحمداللہ وہ بہت حد تک کامیاب رہے اگرچہ دو۲ سال کا کام پندرہ سال میں پورا ہوا۔

قرآنِ کریم کی جن آیتوں کے تراجم اوپر پیش کئے جا چکے ہیں انھیں تین آیتوں کا ترجمہ مولانا

کے قلم سے پیش کیا جارہا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِہٖ الخ ۱

اور (پھر وہ وقت) جب موسیٰ (کتاب الٰہی کا عطیہ لے کر پہاڑ سے اُترا تھا اور تمھیں ایک بچھڑے کی پوجا میں سرگرم دیکھ کر) پکار اُٹھا تھا۔ اے میری قوم! (افسوس تمھاری حق فراموشی پر) تم نے بچھڑے کی پوجا کر کے خود اپنے ہاتھوں اپنے کو تباہ کر دیا ہے پس چاہیئے کہ اپنے خالق کے حضور میں توبہ کرو اور گئوسالہ پرستی کے بدلے اپنی جانوں کو قتل کرو اسی میں خدا کے نزدیک تمھارے لئے بہتری ہے۔ چنانچہ تمھاری توبہ قبول کرلی گئی اور اللہ بڑا ہی رحمت والا اور رحمت سے درگذر کرنے والا ہے۔

دوسرا پارہ دوسرا رکوع ملاحظہ ہو۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ الخ

پس (اب) میری یاد میں لگے رہو میں بھی تمھاری طرف سے غافل نہ ہوں گا (یعنی قانونِ الٰہی یہ ہے کہ اگر تم اللہ سے غافل نہ ہوگے تو اللہ کی مدد و نصرت بھی تمھاری طرف سے غافل نہ ہوگی) اور دیکھو! میری نعمتوں کی قدر کرو ایسا نہ کرو کہ کفرانِ نعمت میں مبتلا ہوجاؤ مسلمانو! صبر اور نماز (کی معنوی قوتوں) سے سہارا پکڑو یقین کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوجاتے ہیں تو یہ مت کہو کہ مردے ہیں۔ نہیں وہ تو زندہ ہیں لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے اور یاد رکھو! یہ ضرور ہونا ہے کہ ہم تمھارا امتحان لیں۔ خطرات کا خوف، بھوک کی تکلیف، مال و جان کا نقصان، پیداوار کی تباہی۔ یہ وہ آزمائشیں ہیں جو تمھیں پیش آئیں گی پھر جو لوگ صبر کرنے والے ہیں انھیں

(فتح وکامرانی کی) بشارت دے دو۔

سورۃ البقرہ کی آخری آیت

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا الخ

اللہ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا ہر جان کے لئے وہی ہے جیسی کچھ اس کی کمائی ہے جو کچھ اسے پانا ہے وہ بھی اس کی کمائی سے ہے اور جس کے لئے اسے جواب دہ ہونا ہے۔ وہ بھی اس کی کمائی ہے (پس ایمان والوں کی صدائے حال یہ ہوتی ہے کہ) خدایا! اگر ہم سے سعی وعمل میں بھول چوک ہو جائے تو اس کے لئے نہ پکڑیو اور ہمیں بخش دیجیو! خدایا ہم پر بندھنوں اور گرفتاریوں کا بوجھ نہ ڈالیو جیسا کہ ان لوگوں پر ڈالا تھا جو ہم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ خدایا! ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوائیو جس کے اٹھانے کی ہم (ناتوانوں) میں سکت نہ ہو۔ خدایا! ہم سے درگذر کر! خدا! ہم پر رحم کر! خدایا تو ہی ہمارا مالک وآقا ہے پس ان (ظالموں) کے مقابلے میں جن کا گروہ کفر کا گروہ ہے ہماری مدد فرما!

صد افسوس کہ دورِ حاضر کے چند قابلِ ذکر مترجم شخصیتوں کے تراجم نہیں مل سکے ورنہ ان کے نمونے بھی پیش کئے جاتے۔

شیخ الرئیس بو علی سینا

اور

مرضِ عشق

از حکیم محمد عطاء الرحمٰن سیوانی ندوی۔ بی یو۔ ایم۔ ایس (علیگ)
لٹریری ریسرچ یونٹ۔ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہر زمانہ کے شعراء نے اپنے اپنے دور میں عشق کو بیکیف و پُر مسرت اور حزن و ملال کے ایک سلسلۂ لامتناہی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جس کی تفصیل اردو و فارسی کی کسی بھی تاریخ و ادب کی کتاب میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ رومانیت پسند شعراء تو یہاں تک کہہ گئے ہیں۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ ایک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

لیکن عموماً لوگ مرحلۂ عشق کے صحیح راہ رو نہیں ہوتے بلکہ محض خیالی طور پر اپنے آپ کو "یکے از عشاق نامراد" ظاہر کرتے ہیں جیسا کہ عراقی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے۔

عاشق کہ شد کہ یار بہ حالش نظر نکرد اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

غرض عشق دو ہی ٹھیرے ایک وہ جسے "اہل نظر" "حقیقی" اور "صادق" کہتے ہیں اور دوسرا وہ جو عام طور پر "لوگوں کو ہو جاتا ہے" اور عموماً اسی دوسری قسم کو عشق کا مصداق سمجھا جاتا ہے لیکن جیسا کہ عراقی نے کہا ہے اس نام نہاد عشق کا بھی علاج ہے ہر چند کہ یہ بات رومانیت پسند طبائع کے لئے مضحک ہو مگر یہ فرض بھی وہی انجام دیتا ہے جو زکام سے لے کر

کینسر (Cancer) تک کا علاج کرتا ہے، کیوں کہ طبیب نفسیات (Sychology) کا ماہر ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ عشق کے واردات "قلب پر وارد نہیں ہوتے" بلکہ دماغ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے اعصاب میں چند پر اسرار اور ناقابلِ تشریح و توضیح ہیجانات پیدا کر دیتے ہیں۔ بقولِ شاعر

بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اسلامی یونانی طب میں اس مرض کا بحیثیت طبی مرض کے قدیم ترین حوالہ طبری کی "فردوس الحکمۃ" میں ملتا ہے۔ شاید ابو الحسن علی بن ابن الطبری سے پہلے اسلامی دور کے اطبار یونانی نے بھی اس سے تعرض کیا ہوگا مگر بدقسمتی سے ان کی تصانیف ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔ طبری نے لکھا ہے۔

وبلغنا ان بعض ابناء الملوک الروم عشق امرأۃً من نساء ابیہ فجعل یذوب بدنہ من حبّہا حتی سقط ولم یکن لابیہ غیرہ فجمع الاطباء لعلاجہ وعالجوہ فلم یقعوا علیہ الی ان اتاہ شیخ من العلماء فجسّ عرقہ فبینما العرق فی یدہ اذ مرّت بہ امرأۃ فاضطربت العروق وتتابعت فلما رأی الطبیب ذلک أمسک ساعۃ ثم جسّ العرق ثانیۃ وأمرت یُمشی کل انثیٰ فی دارھم، فلما مرّوا تلک المرأۃ التی کان یعشقہا اضطرب

ہمیں یہ حکایت پہنچی ہے کہ روم کے کسی شاہزادے کو اپنے باپ کی عورتوں میں سے کسی کے ساتھ عشق ہو گیا تھا۔ اس کی محبت میں اس کا بدن گھلا جا رہا تھا، یہاں تک کہ وہ بالکل لاغر و نحیف ہو گیا۔ اس کے باپ کا اس کے سوا اور کوئی بیٹا نہیں تھا، لہٰذا اس نے اطبار ملک کو اس کے علاج کے لئے مامور کیا اور انھوں نے اس کا علاج بھی کیا مگر کامیاب نہیں ہو سکے آخر ایک پیر سال خوردہ عالم (طبیب) اس کے دربار میں آیا اس نے شاہزادے کی نبض دیکھی جب وہ نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا تو ایک عورت وہاں سے گذری جس سے اس کی رگ

العرق ايضا وتتابع فلم يلبث
ان هلته العشق لها، فأتى الملك
فأخبره ان لا علاج له الا في شيء
لا يقدر عليه، فقال ان كان ذلك
مما يوجد ببذل ما املكه فهو
موجود، فقال لو اتى ذلك على بعض
اهلك قال نعم فاخذ الامان
لابنه ولنفسه ثم اعلمه ان شفاءه
في تزويجه تلك المرأة فسر الملك
بذلك وجمع بينهما وبرئ ابنه[1]

نبض پھڑکنے لگی، جب طبیب نے دیکھا تو کچھ دیر کے لئے رک گیا، پھر دوبارہ نبض دیکھی اور حکم دیا کہ محل کی جملہ خواتین کے نام بار بار لئے جائیں جب مریض شاہزادے نے اس عورت کا نام سنا جس سے اسے عشق تھا تو پھر اس کی نبض بار بار پھڑکنے لگی، اب طبیب کو اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ وہ اس عورت کے عشق میں مبتلا ہے۔ لہذا وہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے بتایا کہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے صرف ایک علاج جس پر بادشاہ قادر نہیں ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اس امر خطیر کے بدلے میں اس کی مملکت کا ایک حصہ بھی صرف ہو جائے تو وہ تیار ہے، طبیب نے کہا کہ اگر معاملہ آپ کے کسی اہل خانہ کا ہو؟ بادشاہ نے فرمایا اس کے لئے میں تیار ہوں۔ پس طبیب نے پہلے تو شاہزادے کے لئے اور پھر اپنے لئے بادشاہ سے امان حاصل کی۔ اور پھر عرض کیا کہ اس کی شفایابی اس عورت کے تزویج پر موقوف ہے، بادشاہ خوش ہو گیا اور دونوں کا وصال کرا دیا۔ اس طرح شاہزادہ تندرست ہو گیا۔

---

[1] ملاحظہ ہو، فردوس الحکمۃ فی الطب۔ تصحیح ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صفحہ ۴۳۲ س ۹-۲۰
مطبوعہ برلن ۱۹۲۸ء

ممکن ہے طبری کے شاگرد رازی اور اس کے جانشینوں ابوالحسن احمد بن محمد الطبری اور علی بن العباس المجوسی وغیرہ نے بھی اس کو بیان کیا ہو، مگر سب سے زیادہ وضاحت شیخ الرئیس بوعلی سینا نے القانون فی الطب میں کی ہے، "وکل الصید فی جوف الفرا" کے مصداق ہم اسی سے تعرض کر رہے ہیں جیسے اس نے جلد ثالث فن اول مقالۂ چہارم فصل فی العشق میں لکھا ہے —— پہلے اس "مرض لاعلاج" کی علامتیں تحریر کی ہیں۔

وعلامته غور العین ویبسها وعدم الدمع الا عند البکاء وحرکته متصلة للجفن ضحاکة کانه ینظر الی شئ لذیذ او یسمع خبراً ساراً او یمزح ویکون نفسه کثیر الانقطاع والاسترداد فیکون کثیر الصداع ویتغیر حاله الی فرح وضحك او الی غم وبکاء عند سماع الغزل ولاسیما عند ذکر الهجر والنوی وتکون جمیع اعضائه ذبلة خلا العین فانها تکون مع غور مقلتها کبیرة الجفن سمینته لسهره وتزفره المتصعد الی رأسه ولا یکون لشمائله نظام ویکون نبضه (ای نبض العاشق) نبضاً مختلفاً بلا نظام البتة کنبض اصحاب الهموم ویتغیر نبضه وحاله

اس کی علامت آنکھوں کا دھنس جانا اور ان کا خشک ہونا، آنسوؤں کا نہ بہنا سوائے بکاء وزاری کے وقت، پلکوں کی متصل حرکت گویا وہ ہنس رہے ہیں، اور گویا مریض کسی لذت بخش شے کی طرف دیکھ رہا ہے یا کسی مسرور کن خبر کو سن رہا ہے یا مزاح کر رہا ہے اس کا سانس بار بار منقطع ہوتا ہے اور پھر واپس آتا ہے ۔اسے بہت زیادہ دردِ سر لاحق رہتا ہے ۔غزلیات سنتے وقت اس کا حال متغیر ہو جاتا ہے، کبھی فرحت اور ہنسی کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور کبھی غم اور گریہ وزاری کی خصوصاً ہجر اور فراق کی یاد سے۔ اس کے سارے اعضا لاغر ہوتے ہیں سوائے آنکھوں کے جن کے دھنسنے کے باوجود ان کے کوئے بڑے ہوتے ہیں، جس کی وجہ اس کی کثرت بیداری ہوتی ہے ۔اس کی آہیں سر تک جا پہنچی

عند ذكر المعشوق خاصة وعند لقائه بغتة[1]

ہیں، اس کے عادات میں کوئی نظم قائم نہیں رہتا اس کی نبض مختلف اور غیر منتظم ہوتی ہے جس طرح غمگین لوگوں کی ہوتی ہے۔ اس کی نبض اور اس کا حال خاص طور سے معشوق کے ذکر اور اس سے یکایک ملاقات کے وقت متغیر ہو جاتا ہے۔

زاں بعد اس نے اس "عاشق ناشاد" کے معشوق کی دریافت کے لئے ان علامات بالخصوص نبض سے کام لینے کا طریقہ بتایا ہے۔

ويمكن من ذلك ان يستدل على المعشوق انه من هو اذا لم يعترف به فان معرفة معشوقه احد سبيل علاجه والحيلة في ذلك ان يذكر اسماء كثيرة تعاد مرارا ويكون اليد على نبضه فاذا اختلف بذلك اختلافا عظيما وصار شبه المنقطع ثم عاود وجربت ذلك مرارا، علمت انه اسم المعشوق ثم يذكر كذلك السكك والمساكن والحرف والصناعات والنسب والبلدان

ان علامتوں سے اس بات کا امکان ہے کہ اس کے معشوق پر استدلال کیا جا سکے کہ وہ کون ہے۔ جب کہ عاشق خود اس کا نام نہ بتلائے۔ کیوں کہ معشوق کو معلوم کرنا اس کے علاج کا ایک طریقہ ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ مختلف نام باربار دہرائے جائیں اور طبیب کا ہاتھ مریض کی نبض پر برابر رہے، پس جب نبض کی حالت میں بہت زیادہ اختلاف رونما ہو اور منقطع سی معلوم ہونے لگے اور پھر لوٹ آئے۔ میں نے اس امر کا بارہا تجربہ کیا ہے۔ تو تم جان لوگے کہ اس کے معشوق کا یہی نام ہے (جس کے اوپر مریض کی نبض مختلف ہوگی) پھر

---

[1] ملاحظہ ہو، القانون فی الطب از شیخ بو علی سینا صفحہ ۶۰-۱۱ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ

وتضيف كلامنها الى اسم المعشوق ويحفظ النبض حتى اذكان يتغير عند ذكر شئ واحد مرارا، جمعت من ذلك خواص معشوقه من الاسم والحيلة والحرفة وعرفته[1]

اسی طرح گلی کوچوں، مقامات، مختلف پیشوں، نسبتوں اور شہروں کے نام لئے جائیں (جب صحیح تفصیلات مل جائیں) تو ان میں سے ہر ایک کو معشوق کے نام کے ساتھ ملایا جائے اور اس کی نبض (ذہن میں) محفوظ رکھی جائے یہاں تک کہ ایک ہی شے کے ذکر کرنے سے وہ بار بار متغیر ہو۔ اس طرح تم اس کے معشوق کے حالات کا مثلاً اس کا نام، حلیہ، پیشہ جمع کر لو اور شناخت کرو۔

یہ صرف شیخ کا قیاس ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ذاتی تجربہ بھی ہے، چناں چہ وہ اس "حیلہ" کے بعد لکھتا ہے

فانا قد جربنا هذا واستخرجنا به ما كان في الوقوف عليه منفعة ثم ان لم تجد علاجا الا تدبير الجمع بينهما على تحليل الدين والشريعة فعلت[2]

کیوں کہ ہم نے اس طریقہ کو بارہا آزمایا ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ معلومات حاصل کی ہیں جن کی واقفیت منفعت بخش ثابت ہوئی، پھر اگر تم اور کوئی علاج نہ پاسکو سوائے ان کے ازدواج کے جس طور پر کہ وہ ازدواج مذہب اور شریعت میں جائز ہو تو اس کے مطابق عمل کرو (یعنی ان دونوں کی شادی کرا دو)

زاں بعد لکھتا ہے

وقد رأينا من عاودته السلامة والقوة وعاد الى لحمه وكان قد

ہم نے ان مریضوں کو بھی دیکھا جن کی اس طریقہ سے سلامتی اور قوت لوٹ آئی اور ان کا

---

[1] ملاحظہ ہو۔ القانون فی الطب صفحہ ۶۶ [2] ایضاً صفحہ ۶۷

بلغ الذبول وجاوزه وقاسى الامراض
الاصعبة المزمنة والحميات الطويلة
بسبب ضعف القوة لشدة العشق
لما حصل بوصل من معشوقه بعد
مطل معاودة فى اقصر مدة
(ایضا صفحہ ۶۱)

گوشت بھی دوبارہ بدن پر آگیا، حالانکہ وہ لاغری
کی حد تک پہنچ کر اس سے تجاوز کر گیا تھا اور مریض
نے بڑے سخت اور مزمن امراض جیسے تھے اور
عرصہ دراز تک بخار میں بھی مبتلا رہا تھا جس
کی وجہ عشق کی شدت کے باعث مریض کے اندر
ضعفِ قوت تھی، یہ سلامتی مریضِ عشق کو اس
وقت حاصل ہوئی جب کہ مدت دراز کے بعد
اسے اپنے معشوق کا وصال حاصل ہوا۔ اور
یہ سلامتی و تندرستی اتنی قلیل مدت میں اس کو
حاصل ہوئی کہ جس سے ہمیں خود بھی تعجب ہوا۔

لیکن بدقسمتی سے شیخ کی عادت مستمرہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے واقعات وتجربات کی زمانی و مکانی طور پر نشان دہی نہیں کرتا، وہ یہ تو کہتا ہے کہ ہم نے "اس کا تجربہ کیا" لیکن یہ نہیں بتاتا کہ کب کیا، کہاں کیا، اور کس کے اوپر کیا؟

خوش قسمتی سے یہ تفصیل نظامی عروضی سمرقندی کے چہار مقالہ کے مقالہ چہارم حکایت پنجم میں موجود ہے۔ وہ شیخ کے جرجان سے فرار اور ریگزار دہستان سے نجات کے بعد جرجان پہنچنے کے ضمن میں لکھتا ہے۔

"وابو علی بطوس رفت و بہ نشابور رسید۔ خلقے را دید کہ ابو علی را می طلبیدند متفکر بگوشہ فرود آمد و روزے چند آنجا بود و از آنجا روے بگرگان نہاد کہ قابوس پادشاہ گرگان بود مردے بزرگ و فاضل دوست و حکیم طبع بود، ابو علی دانست کہ او را آنجا آفتے نرسد چوں بگرگان رسید بکاروان سرائے فرود آمد مگر در ہمسایگی او یکے بیمار شد معالجت کرد، بہ شد، بیمارے دیگر را نیز معالجت کرد بہ شد، بامداد قارورہ آوردن گرفتند وابو علی ہمی نگریست دخلش پدید آمد

درد بروز می افزود، روزگارے چنیں می گذاشت مگر یکے از اقربائے قابوس وشمگیر را کہ پادشاہ گرگان بود عارضہ پدید آمد و اطبا بہ معالجت او برخواستند و جہد کردند و جہد بے تمام نمودند علت بہ شفا نہ پیوست و قابوس را عظیم در آں دل بستگی بود، تا یکے از خدم قابوس را گفت کہ در فلاں خیم جوانے آمدہ است عظیم طبیب و بہ غایت مبارک دست و چند کس بر دست او شفا یافت۔ قابوس فرمود کہ او را طلب کنید و بہ سر بیمار برید تا معالجت کند کہ دست او دست مبارک تر بود۔ پس ابو علی را طلب کردند و بہ سر بیمار بردند جوانے دید بہ غایت خوبروئے و متناسب اعضا خطا اثر کردہ و زار افتادہ، پس بہ نشست و نبض او بگرفت و تفسرہ بخواست و بدید، پس گفت مرا مردے می باید کہ غرفات و محلات گرگان را ہمہ شناسد، بیاوردند و گفتند "اینک"۔ ابو علی دست بر نبض بیمار نہاد و گفت بر گوئی و محلتہائے گرگان را نام بردہ۔ آں کس آغاز کرد و نام محلتہا گفتن گرفت تا رسید بہ محلتے کہ نبض بیمار و آں حالت حرکتے غریب کرد۔ پس ابو علی گفت ازیں محلت کوہا بردہ، آں کس بر داد تا رسید بنام کوئے کہ آں حرکت غریب معاودت کرد۔ پس ابو علی گفت کسے می باید کہ دریں کوئے ہمہ سرائے ہائے را بداند، بیاوردند و سرائے ہا را بر دادن گرفت تا رسید بداں سرائے کہ ایں حرکت باز آمد، ابو علی گفت اکنوں کسے می باید کہ نام ہائے اہل سرائے تمام داند و بر دہد، بیاوردند، بر دادن گرفت تا آمد بنامے کہ ہماں حرکت حادث شد، آں کہ ابو علی گفت "تمام شد" پس روئے بہ معتمدان قابوس کرد و گفت، ایں جوان در فلاں محلت و در فلاں کوئے و در فلاں سرائے بر دختر فلاں فلاں نام عاشق است و داروئے او وصال آں دختر است و معالجت او دیدار او باشد۔ پس بیمار گوش داشتہ بود و ہر چہ خواجہ ابو علی می گفت می شنید، از شرم سر در جامہ خواب کشید۔ چوں استطلاع کردند ہم چناں کہ خواجہ ابو علی گفتہ بود۔ پس ایں حال را پیش قابوس رفع کردند، قابوس را عظیم آمد و گفت "او را بہ من آرید" خواجہ ابو علی را پیش قابوس بردند و قابوس صورت ابو علی داشت کہ سلطان یمین الدولہ فرستادہ بود،

چوں پیش قابوس آمد گفت "انت ابو علی؟ گفت "نعم یا ملک معظم" قابوس از تخت فرود آمد و چند گام ابو علی را استقبال کرد و در کنارش گرفت و با او بر یکے نہالی پیش تخت نشست و بزرگی ہا پیوست و نیکو پرسید و گفت۔ "اجل افضل و فیلسوف اکمل کیفیت ایں معالجہ البتہ باز گوید" ابو علی گفت "چوں نبض و تفسرہ بدیدم مرا الیقین گشت کہ علت عشق است و از کتمان سرحال بدیں جا رسیدہ است۔ اگر از وے سوال کنم راست نگوید۔ پس دست بر نبض او نہادم نام محلات بگفتند چوں بہ محلت معشوق رسید عشق او را بجنبانید، حرکت بدل شد، دانستم کہ دراں محلت است، بگفتم تا نام کوچہا گفتند چوں نام کوچہ معشوق خویش شنید، ہماں معنی حادث شد، نام کوچہ نیز بدانستم، بفرمودم تا سرائے ہا را نام برند چوں نام سرائے معشوق رسید ہماں حالت ظاہر شد سرائے نیز بداشتم، بگفتم تا نام ہمہ اہل سرائے برند چوں نام معشوق خود بشنید بغایت متغیر شد، معشوق را نیز بدانستم، پس بدو گفتم و او منکر نتوانست شدن مقر آمد" قابوس ازیں معالجت شگفتی بسیار نمود و متعجب بماند، و الحق جائے تعجب بود، پس گفت "یا اجل افضل اکمل، عاشق و معشوق ہر دو خواہر زادگان من اند و خالہ زادگان یکدیگر، اختیارے بکن تا عقد ایشاں بکنم" پس خواجہ ابو علی اختیارے پسندیدہ بکرد و آں عقد بکردند، و عاشق و معشوق را بہم پیوستند، و آں جوان پادشاہ زادہ خوب صورت از چناں رنجے کہ بمرگ نزدیک بود برست[1]۔

غرض شیخ کا جرجان پہنچنا مسلم ہے، چناں چہ آقائے سعید نفیسی نے لکھا ہے۔

"در گرگان ابن سینا حتماً با خاندان قابوس روابطے بہم زدہ است، چناں کہ در سالتے در عرض گرگان برائے نذریں گیس دختر قابوس نوشتہ است کہ ابو الریحان البیرونی انتال یاد کردہ است[2]"

بلکہ خود شیخ اپنی سوانح عمری میں اس بات کا معترف ہے اور لکھتا ہے۔

---

[1] قزوینی: تعلیقات چہار مقالہ (مرتبہ ڈاکٹر معین) صفحہ ۱۲۱-۲۲-۱۲۳

[2] سعید نفیسی: پور سینا صفحہ ۷۶ (نیز قزوینی تعلیقات چہار مقالہ صفحہ ۴۳۵-۴۳۶ ملاحظہ ہو)

"ثم دعت الضرورة الی الانتقال الی نسا ومنها الی جرجان وکان قصدی الأمیر قابوس فاتفق ... موته ـ ثم مضیت الی دهستان ومرضت بها مرضا صعبا وعدت الی جرجان"[1]

پھر ضرورت میرے نسا کی طرف جانے کی مقتضی ہوئی اور وہاں سے جرجان جانے کے لئے۔ میرا ارادہ امیر قابوس سے ملاقات کا تھا مگر (اس اثنا میں) اس کی موت واقع ہوگئی پھر میں دہستان چلا گیا جہاں ایک سخت مرض میں مبتلا ہوگیا اور پھر جرجان واپس آیا۔

مگر چہار مقالہ کے فاضل ایڈیٹر محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے اس پوری حکایت کو قابلِ التفات نہیں سمجھا بلکہ اسے "بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے" کے مصداق مصنف (نظامی عروضی) کی اختراع قرار دیا ہے اور اس کی صحت پر اپنے شک کا بدیں طور اظہار کیا ہے۔

"صدق و صحت این حکایت بعینها به تحقیق نه پیوسته"[2]

اور اس شک کی تائید میں تین دلیلیں دی ہیں جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ فضلائے ایران میں سے آقائے سعید نفیسی کا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے چنانچہ انھوں نے لکھا ہے۔

"داستانے کہ دربارۂ ابن سینا و محمود غزنوی رواج بسیار دارد یکسرہ ساختگی و نادرست است"[3]

محققینِ یورپ میں سے زخاؤ *Sachau* بھی جس نے البیرونی کی "الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ" کو ایڈٹ کیا ہے۔ اس حکایت کی صحت کا منکر ہے۔ اس کے دلائل انکار اور ان پر تبصرہ بھی آگے آرہا ہے۔

---

[1] عیون الانباء جلد ۲ صفحہ ۴

[2] قزوینی : تعلیقات چہار مقالہ صفحہ ۲۲۶ س ۲۳ ملاحظہ ہو

[3] سعید نفیسی : پور سینا صفحہ ۱۵۲

لیکن یورپی فضلاء ہوں یا ایرانی ادباء دونوں کے دلائل یکسر ضعیف ہیں اور ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ اس عہد کی تاریخ ایران سے سطحی واقفیت کا نتیجہ ہیں۔

اس عاجز کے خیال میں یہ شکوک و شبہات قطعاً بے بنیاد ہیں، چنانچہ بعد کے مؤرخین نے جنھیں اس حکایت کی تنقید کے لئے عہد حاضر کے محققین سے کہیں زیادہ مواقع حاصل تھے اسے اس طور پر نقل کیا ہے گویا انھیں اس کی صحت میں کوئی شک نہیں ہے اور وہ اسے ایک واقعہ نفس الامری سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر قاضی احمد غفاری نے "تاریخ جہاں آرا" میں اور خواندمیر نے "حبیب السیر" میں شیخ بوعلی سینا کے سلسلہ میں اس واقعہ کو بغیر کسی تنقید کے نقل کیا ہے۔ بلکہ صاحب حبیب السیر تو اس کی حتمی طور پر صحت کے قائل ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں۔

"بہ صحت پیوستہ کہ دراں آوان کہ کوکب دولت سلطان محمود غزنوی بدرجۂ استقلال رسید بعضے از اہلِ شر و فساد بہ عرض رسانیدند کہ شیخ ابو علی بد مذہب است، سلطان محمود از غایت عصبیت قصدِ شیخ فرمودہ، ابوالفضل حسن بن میکال را نزد خوارزم شاہ ارسال داشت و پیغام داد کہ چناں معلوم شد کہ دراں دیار جمعے از فاضل عدیم المثل توطن دارند باید کہ ایشاں را بہ پایہ سریر اعلیٰ فرستی، ابوریحان و ابوالخیر ملازمت سلطان اختیار کردند و ابوعلی و ابوسہل بہ تعجیل از خوارزم بیروں آمدہ راہ فرار پیش گرفتند و در بیابانے کہ میانِ خوارزم و ابیورد است سرگردانی بسیار کشیدہ، ابوسہل دراں صحرا از دور تشنگی و گرما فوت شد و ابو علی بدحال و بیمار با ابیورد رسید و از آں جا با استو و از استو بہ جرجان رفت" [1]

عہد حاضر میں محققین یورپ کے اندر الیٹ Elliot [2] نے اور ہندوستان میں پروفیسر

---

[1] خواندمیر: حبیب السیر جلد ۲ صفحہ ۴۴۲ (تہران ۱۳۳۳ شمسی)

[2] ملاحظہ ہو Elliot and Dawson. History of India (1969) 3

محمد حبیب[۱] نے بھی اسی طرح اس واقعہ کو صحیح تسلیم کیا ہے۔

اب رہا ناقدین کا شک تو اس کی تفصیل یہ ہے۔

قزوینی نے اس حکایت کی صحت سے مزید انکار ابوریحان البیرونی کے غزنی جانے کے سلسلے میں کیا ہے اور حسب ذیل دلائل اپنے انکار کے سلسلہ میں دئے ہیں۔

(الف) اما ایں کہ نظامی عروضی ابونصر بن عراق را برادر زادۂ خوارزم شاہ دانستہ است، از ملاحظۂ نسب ہر دو معلوم می شود کہ باطل است۔ چہ خوارزم شاہ ابوالعباس مامون بن مامون بن محمد است و صاحب ترجمہ منصور بن علی بن عراق و شاید نسبتے دیگر بین ایشاں بودہ است، واللہ اعلم[۲]"

(ب) "آنچہ دریں حکایت متعلق بہ ملاقات ابوعلی با امیر قابوس است باید مجعول و بے اصل باشد[۳]"

(ج) مصنف را دریں فقرہ دو سہو واضح دست دادہ است، یکے آں کہ وزارت ابوعلی سینا را در رے فرض کردہ و حالاں کہ در ہمدان بودہ است۔ دیگرے آں کہ ابوعلی را وزیر علاء الدولہ دانستہ و حالانکہ ہیچ وقت وزارت علاء الدولہ را ننمود[۴]"

مگر یہ دلائل کچھ زیادہ وقیع نہیں ہیں کیوں کہ

(الف) قزوینی کی پہلی دلیل پر تبصرہ کرنے سے قبل اس تلخ حقیقت کی جانب بھی متوجہ کرنا ضروری ہے کہ باوجود ان کی سنجیدگی و متانت کے اس حکایت پر تعلیقات قلمبند کرتے وقت وطنی عصبیت سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے جس کے نتیجہ

۱۔ ملاحظہ ہو Mahmud of Gazna By Late Professor M Habib

۲۔ قزوینی، تعلیقات چہار مقالہ صفحہ ۲۲۲ (مرتبہ ڈاکٹر معین)

۳۔ قزوینی: تعلیقات چہار مقالہ صفحہ ۲۲۳ (مرتبہ ڈاکٹر معین)

۴۔ " " " صفحہ ۲۲۴ (" ")

میں ان کا ذہن صاف نہیں رہ سکا یہ اسی امر کا نتیجہ تھا کہ وہ آلِ عراق کے استیصال کو محمود غزنوی کے نامۂ اعمال میں درج کرتے ہیں[1] حالاں کہ دوسری جگہ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ یہ مامونیوں کی حملہ آوری کا نتیجہ تھا[2]۔

خوارزم کے مغربی حصہ کا نام جرجانیہ تھا اس کے مشرقی حصہ میں جس کا صدر مقام شہر کاث تھا خوارزم کا قدیم شاہی خاندان رہا کرتا تھا، اسی مقام کو البیرونی نے "آلِ عراق" کے نام سے اپنی تحریروں میں ذکر کیا ہے اور ابونصر بن عراق (یا ابونصر منصور بن علی بن عراق) آخری خوارزم شاہی فرمانروا ابوعبداللہ خوارزم شاہ واقعتاً اس کا بھتیجا تھا۔

فاضل قزوینی کو "خوارزم شاہ" کے لقب سے شدید طور پر التباس ہوا ہے، کیونکہ خوارزم کے مغربی حصہ پر مامونی خاندان حکومت کرتا تھا اور مشرقی حصہ (کاث) پر خوارزم کے قدیم شاہی خاندان حکمراں تھے جن کا لقب "خوارزم شاہ" تھا، عربوں کی فتح یابی کے بعد اس خاندان سے حکومت نکل چکی تھی اور صرف ان کا خاندانی لقب برقرار رہ گیا تھا، مگر مامون بن محمد نے ۳۸۵ھ میں اس لقب کو بھی چھین کر خود اختیار کر لیا تھا، بایں وجہ نظامی عروضی سمرقندی نے ابونصر بن عراق کو اپنے مقالہ میں "برادرزادۂ خوارزم شاہ" تحریر کیا تھا۔ لیکن یہ امر انتہائی باعث حیرت ہے کہ قزوینی جیسا فاضل بھی اس تعلیقات کو مرتب کرتے وقت ایک شدید تسامح میں مبتلا ہو گیا اور ان تاریخی حقائق کو نظر انداز کر کے استبعاد کا شکار ہو گیا۔

---

[1] ملاحظہ ہو قزوینی، تعلیقات چہار مقالہ صفحہ ۲۴۲ (در آخریں ایشاں ابوعبداللہ محمد بن احمد بن محمود بن عراق بودہ است کہ ابوریحان از وبہ "شہید" تعبیر می نماید و گویا ایشاں نیز مانند بسیارے از ملوک دیہوتات قدیمۂ دیگر از سطوت شمشیر سلطان قہار محمود غزنوی منقرض و متلاشی گردیدند)

[2] ایضاً صفحہ ۲۱۱-۲۱۲ (مامون بن محمد خوارزم شاہ ابتداء والی جرجانیہ (گرگانج) بود و در ۳۸۵ھ ابوعبداللہ خوارزم شاہ صاحب کاث را گرفتہ بکشت و ممالک او بہ تصرف وے در آمد)

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

(ب) ہرچند کہ شیخ بوعلی سینا قابوس سے ملاقات نہیں کر سکا مگر اتنا مسلم ہے کہ وہ جرجان ضرور پہنچا جیسا کہ وہ خود اپنی خود نوشت سوانح حیات میں کہتا ہے جس کی تفصیل سابق میں مذکور ہوئی اور یہاں (جرجان میں) اس کے قابوس کے پس ماندگان سے گہرے روابط و مراسم بھی قائم ہوئے یہاں تک کہ اس خاندان کی ایک موقر خاتون زرین گیس کے نام اس نے علم الہیت میں ایک رسالہ لکھ کر معنون کیا اور یہ اتنا اہم رسالہ تھا کہ البیرونی بھی حریفانہ چشمک کے باوجود قانون مسعودی میں اس کا حوالہ دینے پر مجبور ہوا۔ جس کی تفصیل اوپر مذکور ہو چکی ہے، لہذا اس بات میں کوئی استبعاد نہ ہونا چاہیئے کہ اس نے قابوس متوفی کے خواہرزادے کا علاج کیا جو مرض عشق میں مبتلا تھا۔ اس لئے قزوینی کو نظامی عروضی کے اس تسامح کے باوجود لکھنا پڑا۔

"ہرچند صدق و صحت ایں حکایت بہ تحقیق نہ پیوستہ ولے شیخ ابوعلی سینا در کتاب قانون در فصل عشق اشارتے بدیں نوع علاج فرمودہ گوید"[1]

قانون کی عبارت سابق میں مذکور ہو چکی ہے اگر دونوں عبارتوں کو ملایا جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ قانون میں اپنا تجربہ نقل کرتے وقت شیخ کے ذہن میں یہی جرجان والا واقعہ تھا۔ قانون میں شیخ کہتا ہے کہ مریض عشق کا اس بات کے سوائے اور کوئی علاج نہیں ہے کہ اس کی اپنی معشوقہ کے ساتھ تزویج کر دی جائے، بشرطیکہ یہ پیوند زناشوئی مذہب و شریعت کے منافی نہ ہو۔ نظامی عروضی بھی یہی لکھتا ہے کہ شیخ مخاطب نے شیخ کو یہی جواب دیا،

"عاشق و معشوق ہر دو خواہرزادگان من اند و خالہ زادگان یکدیگر اختیار بکن تا عقد ایشاں بکنیم"[2]

---

[1] قزوینی: صفحہ ۱۲۲ مرتبہ ڈاکٹر معین۔

[2] ملاحظہ ہو قزوینی صفحہ ۱۲۳ مرتبہ ڈاکٹر معین

شیخ قانون میں یہ بھی کہتا ہے کہ اس علاج سے عاشق کی صحت بھی واپس آتے میں نے دیکھی ہے۔ حالانکہ وہ مختلف امراض صعب میں گرفتار ہو کر موت کے نزدیک پہنچ گیا تھا اور یہی نظامی عروضی سمرقندی نے لکھا ہے۔

"آں جوان پادشاہ زادہ خوب صورت از چناں رنجے کہ بہ مرگ نزدیک بود برست[1]"

سوال یہ ہے کہ شیخ پھر صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ یہ علاج میں نے جرجان میں کیا تھا اور مریض قابوس کا بھانجہ تھا۔ اس کے لئے ہمیں شیخ کی عادت کا مطالعہ کرنا پڑے گا، اس کی یہ عادت ہے کہ وہ کسی واقعہ کی تفصیل کھل کر نہیں بیان کرتا۔

اس کا استاد اس کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر جرجانیہ چلا گیا لیکن شیخ یہ نہیں بتاتا کہ وہ کیوں گیا؟ وہ خود بخارا سے جرجانیہ بھاگا، یہاں بھی نہیں بتاتا کہ کیوں بھاگا؟ آخر میں وہ جرجانیہ سے فرار ہونے پر مجبور ہوا لیکن یہاں بھی نہیں بتاتا کہ اس کو ایسا کیوں کرنا پڑا؟ اسی طرح وہ امراء وملوک کا علاج کرتا ہے مگر یہ نہیں بتاتا کہ اس مریض کا نام کیا تھا؟ اس نے رے میں مجدالدولہ دیلمی کے مالیخولیا کا علاج کیا تھا اور اس کے لئے تقویت قلب کا ایک نسخہ تجویز کیا تھا جسے وہ "الادویۃ القلبیہ" میں بیان کرتا ہے مگر وہ مجدالدولہ کے نام کی صراحت نہیں کرتا صرف اتنا کہتا ہے "میں نے بعض امراء کا (جو بادشاہوں کے قائم مقام تھے) سخت قسم کے مالیخولیا کا جو مانیا (جنون) کی طرف مائل تھا علاج کیا" ظاہر ہے اس کا اشارہ مجدالدولہ کی طرف ہے، چنانچہ اس کا شاگرد ابوعبید جوزجانی اس کے سوانح حیات میں لکھتا ہے

(ثم انتقل) الی الری واتصل بخدمۃ السیدۃ (مجدالدولہ کی ماں) پھر وہ شہر رے میں گیا اور

---

[1] ملاحظہ ہو قزوینی: صفحہ ۱۲۳

[2] ملاحظہ ہو۔ ترجمۂ الادویۃ القلبیہ۔ مترجمہ حضرت الاستاذ شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب فلسفی مرحوم سابق پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ صفحہ ۱۱۶، مطبوعہ ایران سوسائٹی کلکتہ۔

السیدۃ وابنھا مجد الدولہ وعرفہ بسبب کتب وصلت معہ تتضمن تعریف قدرہ وکان مجد الدولہ اذ ذاک غلبۃ السوداء واشتغل بمداواتہ[1]

اور مجد الدولہ کی خدمت میں پہنچا جہاں اس کے پاس جو تعارفی خطوط تھے ان سے لوگوں نے اسے پہچانا اور اس وقت مجد الدولہ پر سودا دیت کا شدید غلبہ تھا، لہٰذا اس کے علاج میں مشغول ہوا۔

اسی طرح شیخ کی جو بھی مصلحت رہی ہو وہ قانون میں یہ نہیں بتاتا کہ جس کے عشق کا اس نے علاج کیا تھا وہ کون تھا اور کہاں رہتا تھا۔ لیکن تاریخی قرائن سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ وہ قابوس بن وشمگیر کے خاندان ہی کا کوئی فرد تھا۔

رہی خود قابوس سے شیخ کی ملاقات تو یقیناً یہاں نظامی عروضی سے تسامح ہوا ہے اور اس نے بیٹے منوچہر فلک المعالی کے بجائے اس کے متوفی باپ کا نام لکھ دیا ہے۔ لیکن اس قسم کے تسامحات بڑے بڑے مستند مورخین سے ہوئے ہیں جس کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔ مگر ان تسامحات کی وجہ سے ان مورخوں کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آیا۔ لہٰذا اس معمولی تسامح کی وجہ سے پوری حکایت ہی کو بے اصل قرار دینا بڑی زیادتی ہوگی، بالخصوص جب کہ اس تسامح کو چھوڑ کر چہار مقالہ کی زیر بحث حکایت کی بقیہ تفصیلات شیخ کی خود نوشت سوانح عمری کے بعینہ مطابق ہیں۔

صورت حال یہ ہے کہ سلطان محمود کی جوع ارضی کو عرصۂ دراز تک فخر الدولہ دیلمی اور قابوس بن وشمگیر روکے رہے۔ مگر [illegible]ھ میں ان دونوں کے انتقال کے بعد اس کے حوصلے بڑھ گئے کیوں کہ ان کے جانشین اپنے باپوں کی طرح قابل نہ تھے نتیجہ یہ ہوا کہ قابوس کے بیٹے منوچہر فلک المعالی نے جلد ہی محمود کی بالادستی کو تسلیم کر لیا، فخر الدولہ کے بیٹے اور رے میں کچھ عرصہ بعد تلخی بڑھ گئی جس سے طاقت کم ہونے لگی پھر بھی جب تک مجد الدولہ کی ماں سیدہ زندہ رہی محمود کو رے پر حملہ کی جرأت نہیں ہوئی اس کے مرنے کے بعد اس نے [illegible]ھ میں رے کو فتح کر لیا۔ (باقی آئندہ)

---

[1] عیون الانباء۔ ابن ابی اصیبعہ جلد ثانی صفحہ ۵ طبع مصر

گیت کی زبان

از ڈاکٹر عنوان چشتی۔ لکچرار اردو ادبیات۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

یوں تو ہر قسم کی اعلیٰ شاعری کی زبان شعری تجربہ کے بطن سے نمودار ہوتی ہے لیکن غنائی شاعری کی زبان خاص طور پر شعری تجربہ کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ اس لئے گیتوں کی زبان میں دو قسم کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو تمام غنائی شاعری میں قدرِ مشترکہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسری وہ جو محض گیتوں کی اپنی انفرادی خصوصیات ہیں۔ پہلی خصوصیات کو گیت کی روایتی اور دوسری کو انفرادی کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ گیتوں کی زبان کی روایتی اور انفرادی خصوصیات کو ایک دوسرے سے الگ الگ کرنا مشکل ہے پھر بھی کسی نہ کسی حد تک ان کی شناخت کی جا سکتی ہے۔

غنائی شاعری میں خارجیت پر داخلیت کو۔ روایت پر انفرادیت کو۔ تخیل پر جذبہ کو۔ کائنات پر ذات کو۔ "کل اظہاریت" پر خود اظہاریت کو اور مصنوعی آہنگ پر فطری ترنم کو فوقیت حاصل ہے۔ اسی رجحان کا اثر غنائی شاعری کی تمام ہیئتوں اور ان کی زبان پر بھی ہوتا ہے۔ چونکہ گیت غنائی شاعری کی ایک مخصوص ہیئت ہے اس لئے گیتوں میں ایسی زبان ہوتی ہے جو خارجی واقعات سے زیادہ داخلی کوائف کی ترجمان ہوتی ہے جو تخیل کی گلکاریوں سے زیادہ جذبہ کی صداقت کی مظہر ہوتی ہے جو بالواسطہ ترسیل خیال سے زیادہ براہِ راست جذبہ کی شدت کی عکاس ہوتی ہے اس میں جگ بیتی

سے زیادہ آپ بیتی بیان کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ مسائل زندگی سے زیادہ زندگی کے دردو داغ اور کرب و کیف کی ترجمانی کی اہلیت ہوتی ہے۔ غرض اس میں ترسیلی اور تخلیقی زبان کی جملہ خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس لئے مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ گیتوں کی زبان غنائی شاعری کے عناصر کے تابع ہوتی ہے۔ غنائی شاعری کی انھیں خصوصیات کو میں نے روایتی خصوصیات کہا ہے۔ گیتوں کی زبان کی انفرادی خصوصیات کو اجاگر کرنے کے لئے غنائی شاعری کے عناصر کے علاوہ بعض دوسرے اہم اور ناگزیر عوامل و عناصر پر توجہ کرنی ہوگی۔ جن میں لوک گیتوں کی روایت اور نسوانی اظہار کی خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔ انھیں سے گیتوں کی زبان میں وہ خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جنھیں میں نے گیتوں کی زبان کے انفرادی خصوصیات کہا ہے۔

اردو گیتوں کی تخلیق کے بہت سے محرکات ہیں۔ ان میں بنگالی غنائی شاعری خصوصاً ٹیگور کی شاعری۔ رومانی تحریک۔ ہندی اصناف و اسالیب کی طرف مراجعت کا رجحان کسی حد تک خارجی محرکات ہیں اور جذبہ کا براہِ راست اور بے تکلف اظہار کی خواہش داخلی محرک ہے۔ لیکن سب سے زیادہ طاقتور اور بنیادی محرک لوک گیتوں کی روایت ہے جن سے متاثر ہو کر ہر زبان میں ادبی گیتوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ لوک گیت محرک بھی ہے اور نمونہ بھی۔ لیکن اردو شاعری کو لوک گیتوں سے تحریک تو ملی مگر وہ انھیں اپنے لئے نمونہ نہ بنا سکے۔ (یہ بحث مناسب موقع پر اگلی سطور میں آئے گی)۔ دنیا میں سب سے پہلا غنائی اظہار لوک گیت کی صورت میں ہوا ہوگا۔ ہندوستان میں بھی لوک گیتوں کی روایت بہت پرانی ہے یہ انسانی ذہن کی پہلی شعری اپج اور جذبہ کا اولین لسانیاتی اظہار ہے۔ لوک گیتوں کی روایت سے بنگال کی "لریکل شاعری"، ہندی "پرگیت مکتک" اور "ساہتک گیت" سے لے کر جدید ترین فلمی گیتوں تک ہر قسم کی غنائی شاعری متاثر ہے۔ اب تو لوک گیتوں کا اثر اتنا بڑھ رہا ہے کہ بعض فلمی گیتوں کی دھنیں لوک گیتوں کی دھنوں پر بن رہی ہیں۔

لوک گیت بول چال کی زبان میں ہوتے ہیں۔ اس زبان کا دامن بہت وسیع ہے۔

اس میں بازار۔ دفتر۔ جلسے، جلوسوں گلیوں۔ کاروبار اور راز و نیاز کی زبان کی تمام شکلیں شامل ہیں۔ اس کی زیادہ ٹھیٹھ صورت دیہات میں بولی جاتی ہے۔ لوک گیتوں میں بول چال کی زبان کی یہی دیہی ٹھیٹھ صورت ہوتی ہے۔ اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ دیہاتیوں کی زبان پر جو لفظ جس طرح چڑھ جاتے ہیں اسی طرح بولے جاتے ہیں۔ انھیں اس سے سروکار نہیں ہوتا کہ لفظ فصیح ہے یا غیر فصیح۔ اس کا تلفظ درست ہے یا نادرست۔ وہ جس لفظ کو اپنے مفید مطلب پاتے ہیں اسی طرح بولتے ہیں۔ زبان کا یہی ٹھیٹ روپ لوک گیتوں میں نظر آتا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دیہی بول چال کی زبان پر مقامی آب و رنگ کا گہرا اثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے ایک ہی خطہ کے مختلف جگہوں کے لوک گیتوں کی زبان میں بول چال اور لب و لہجہ کے نازک امتیازات ہوتے ہیں۔ یہ امتیازات لوک گیتوں کی زبان کے دائرہ کو وسیع کرتے ہیں۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ لوک گیتوں کی زبان پر اس علاقہ کے مخصوص پیشوں کا اثر بھی ہوتا ہے چوں کہ ایک پیشہ کے لوگوں کی زبان دوسرے پیشہ کے لوگوں کی زبان سے کسی قدر مختلف ہوتی ہے اس لئے گڈریوں۔ آہیروں۔ گڈریوں اور دھوبیوں کے لوک گیتوں کی زبان میں لب و لہجہ کے امتیازات کے علاوہ ذخیرہ الفاظ۔ الفاظ کے تلفظ اور ان کی وضعوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ساجن۔ سجنا۔ سجنوا وغیرہ الفاظ کی تشکیل ایسے ہی اسباب و محرکات کے تحت ہوتی ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ لوک گیتوں کی زبان میں صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس زبان کے الفاظ کی بہت سی ابتدائی اور قدیم شکلیں موجود ہیں یا ادنیٰ تغیرات کے بعد ابھی تک باقی ہیں۔ یہ خصوصیت ان علاقوں کے لوک گیتوں میں زیادہ نظر آتی ہے جہاں نئی روشنی نہیں پہنچی یا کم پہنچی ہے۔ یہ سب خصوصیات مل کر زبان کو سادہ۔ فطری۔ بے تکلف اور اکہرا بنا دیتی ہیں۔ بول چال کے عمل میں ہر لفظ ترسیل کی ضرورت کی زد پر آ کر ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے یا کم از کم اپنی خاردار سطح کو سڈول بنا لیتا ہے۔ دیہی لب ولہجہ کی خراد پر چڑھ کر اپنی نئی ہیئت تراش لیتا ہے۔ اس عمل سے

الفاظ میں اشتراک باہمی اور ایک دوسرے میں تحلیل ہونے کی صلاحیت بڑھجاتی ہے جس کی وجہ سے لوک گیتوں کی زبان میں گھلاوٹ ۔ دل سوزی ۔ مٹھاس ۔ سڈول پن اور ایک خاص قسم کی فطری معصومی پیدا ہوجاتی ہے

نسوانی اظہار کی خصوصیت میں لہجے کا لوچ اور جذبہ کا بے ساختہ اظہار شامل ہے ۔ براہِ راست اور بے ساختہ اظہار میں رنگارنگی سے زیادہ یک رنگی ۔ تصنع سے زیادہ سادگی ہوتی ہے ۔ صنفِ نازک بات کو گھما پھرا کر کہنے سے زیادہ براہ راست کہنے میں یقین رکھتی ہے ۔ زبان کی آرائش ۔ الفاظ کی صحت اور بیان کے تکلف سے زیادہ اپنی بات کو مخاطب کے دل میں اتارنے کی کوشش کرتی ہے ۔ وہ اپنی کہانی کو الفاظ کی بندشوں میں نہیں جکڑتی بلکہ اس کے دل پر جو کچھ گزری ہے اس کو اپنی زبان میں ہوبہو ادا کردیتی ہے ۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اس سے لفظوں کے توتا مینا نہیں بناتی بلکہ اس کی جزئیات بیان کردیتی ہے ۔ اس کو تخیل کے پروں پر اڑنے سے زیادہ جذبات کی لہروں پر بہنا پسند ہے ۔ اس لئے تخیلی زبان سے زیادہ جذباتی زبان میں گفتگو کرتی ہے ۔ اس کے مزاج کا صبر و تحمل کا جوہر غیض و غضب پر حاوی رہتا ہے اس لئے وہ الم انگیز لمحوں میں چیخوں پر سسکیوں کو ترجیح دیتی ہے ۔ اس کے مزاج کی یہی خصوصیات اس کی زبان میں نظر آتی ہیں ۔ وہ پُرشور تکلم سے زیادہ لطافت ۔ نزاکت ۔ سادگی سرگوشیوں میں بات کرنا پسند کرتی ہے ۔ سرگوشیوں کے لہجے میں الفاظ کے طمطراق سے زیادہ لطافت ۔ نزاکت سادگی اور معصومی کی ضرورت ہوتی ہے گیتوں کی زبان میں نسوانی اظہار کی بے ساختگی کی یہی خصوصیات ہونی چاہئیں ۔

نسوانی اظہار کی دوسری خصوصیت لہجہ کا لوچ ہے ۔ اس میں کرختگی پر خوش آہنگی کو ۔ تلخی پر شیرینی کو ۔ سختی پر نرمی کو اور کھردرے پن پر سڈول پن کو فضیلت ہوتی ہے ۔ نسوانی اظہار میں لوچ ہی نہیں سریلاپن بھی ہوتا ہے ۔ گیتوں میں یہی سریلاپن موسیقیت کے عنصر

کے نام سے موسوم ہے۔ موسیقیت کے دو قسم کے عناصر ہوتے ہیں۔ داخلی اور خارجی عناصر۔ داخلی عناصر میں جذبہ کا آہنگ۔ لحن کی موسیقی۔ لہجہ کا لوچ اور ایک ایسی لَے شامل ہے جو اگرچہ باقاعدہ اوزان و بحور کی تابع نہیں ہوتی لیکن ان سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ خارجی عنصر میں موسیقی کے راگ راگنیوں کی دھنیں۔ دُوُت ۔ وِلمبت اور مدھیہ لے۔ مُیلت آوازوں کی نغمگی اور بحر و قوافی کا آہنگ شامل ہے۔ لوک گیتوں کو خارجی عناصر سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا اُن کا انحصار داخلی عناصر پر ہوتا ہے۔ داخلی عناصر نسوانی اظہار کی وہ خصوصیت ہے جس کو لہجہ کا لوچ اور گلے کے سروں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ گیتوں نے موسیقیت کی خارجی اور داخلی دونوں قسم کے عناصر سے فیض اُٹھایا ہے۔ اس لئے گیتوں کی زبان میں حروف کی نغمگی ۔ جملوں اور مصرعوں کی موسیقیت داخلی آہنگ کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ گیتوں کی زبان میں آواز کی اشاریت اور لہجہ کے زیر و بم بنیادی خیال کی ترسیل اور جذبہ کی تجسیم کرتے ہیں اس لئے گیتوں کی زبان میں نرمی ۔ گھلاوٹ ۔ رسیلا پن ۔ رعنائی ۔ تازگی اور شادابی ہوتی ہے اور ان سے ترنم کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور گیتوں کی زبان رس رنگ اور نغمہ کا آبشار ہو جاتی ہے۔

لوک گیتوں کے موضوعات زندگی کی طرح وسیع ہیں۔ مگر یہ موضوعات عورت کے نقطۂ نظر یا کم از کم نسوانی تناظر (PERSPECTIVE) میں پیش کئے جاتے ہیں۔ بہ الفاظ دگر گیتوں کے موضوعات پر بھی نسوانیت کی مہر ہوتی ہے۔ اس لئے مہد سے لحد تک ہر موضوع گیتوں کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ بچے کی پیدائش کے گیت ۔ شادی بیاہ کے گیت ۔ جنیو کے گیت ۔ ختنہ کے گیت ۔ چکی کے گیت ۔ چرخے کے گیت ۔ ساونی کے گیت (ساون کے مہینے میں جھولے کے گیت) بھکاریوں کے گیت ۔ برہا کے گیت ۔ لوریاں ۔ جھکرے (پوربی اضلاع میں مردوں کے گیت) وبرگا تھا اور عزائی گیت وغیرہ سینکڑوں قسم کے گیت ہوتے ہیں۔ گیتوں کے موضوعات کے تکثر اور تنوع نے ان کی زبان کے دائرہ

کو کافی وسیع کر دیا ہے - یہ دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں ہر جذبہ اور ہر رنگ کے لئے موزوں ترین لفظ موجود ہے چوں کہ گیتوں کے موضوعات صنف نازک کی زندگی کے گرد گھومتے ہیں اس لئے ان میں صنف نازک کے جذبات اور اس کی مخصوص زبان کی بیشتر خصوصیات ہوتی ہیں -

جب ہم اس پس منظر میں اُردو گیتوں کی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے کثیر حصہ میں گیتوں کی زبان کی بیشتر خصوصیات کا فقدان نظر آتا ہے - اس کی دو وجوہ ہیں - ایک فارسیت کا رجحان اور دوسرا اُردو سے غیر ٹکسالی عناصر کو پاک کرنے کا رجحان - یہ دونوں رجحان ایک دوسرے کا لازمی نتیجہ ہیں - فارسیت کے رجحان نے ہندی الفاظ اسالیب اور روایات پر فارسی الفاظ اسالیب اور اصناف کو ترجیح دی اردو سے غیر ٹکسالی عناصر کو پاک کرنے کے رجحان نے شاعری سے ہندستانیت کے بعض مفید عناصر کو نکال دیا - انھیں دونوں رجحانوں کی زد میں لوک گیتوں کا عظیم سرمایہ بھی آگیا - اور اُردو شاعروں نے اس کی طرف سے آنکھ بند کرلی - اس میں شک نہیں کہ لوک گیتوں کا بیشتر سرمایہ منظر عام پر نہیں آیا لیکن جتنا آچکا ہے اس سے استفادہ نہیں کیا گیا - اُردو شاعر لوک گیتوں کے کارآزمودہ رچے بسے اور موسیقیت میں ڈوبے ہوئے لفظوں سے محروم رہے جن سے گیتوں کی عظیم روایت وابستہ ہے - اُردو شاعر بول چال کی زبان پر شاعری کی روایتی زبان کو ترجیح دے کر ترسیلی خصوصیات سے دست بردار ہو گئے - زبان کی ترسیلی خصوصیات تخلیقی خصوصیات میں تحلیل ہو کر گیتوں میں وہ حسن پیدا کرتی ہیں جس کو سحر حلال کہا جا سکتا ہے - جن شاعروں نے شعری زبان سے انحراف کر کے زبان کی سادگی کی طرف توجہ کی ہے وہ بھی فصیح - صحیح - سادہ شیریں نیز نرم الفاظ کے روایتی انتخاب کا شکار ہو گئے ہیں - ایسے الفاظ شعری زبان کے نسبتاً ہلکے اور نرم عناصر پر مشتمل ہیں - ان میں بول چال کی زبان کی خصوصیات بہت کم ہیں - بول چال کی زبان کے ساتھ ایک ستم یہ بھی ہوا کہ اس کو سوقیوں کی زبان قرار دے کر اس سے اچھوت کی طرح برتاؤ کیا گیا اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اردو گیتوں میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو بول چال کی زبان میں گیت لکھنے سے پیدا ہوتی تھی

آنچل جو ڈھلکتا ہے آنچل کو ڈھلکنے دو
بے شورِ سلاسل جب گلشن میں بہار آئے
برسوں کا شناسا جب ملتے ہوئے کترائے
ہر شیشۂ دل چھن سے جب توڑ دیا جائے
تب دل سے دھواں بن کر آہوں کو نکلنے دو (زبیر رضوی)

رات دن سلسلۂ عمرِ رواں کی کڑیاں
کل جہاں روح جھلس جاتی تھی
اپنے سائے سے بھی آنچ آتی تھی
آج اس دشت پہ ساون کی لگی ہیں جھڑیاں
ہر طرف سلسلۂ عمرِ رواں کی ... کڑیاں (احمد ندیم قاسمی)

ان دونوں ٹکڑوں میں شورِ سلاسل۔ شناسا۔ شیشۂ دل۔ سلسلۂ عمرِ رواں۔ روح اور دشت وغیرہ الفاظ گیت کی زبان کے عناصر نہیں ہیں۔ اس لئے ان میں زبان کی حد تک گیت پن سے زیادہ نظمیت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

اُردو شاعری اپنے ابتدائی دور میں ہندی اور فارسی روایات کا گہوارہ تھی۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ بعض اثرات اور رجحانات کے تحت ہندی سے دور اور فارسی سے قریب ہوتی گئی۔ اس دورِ قبول میں اُردو شاعری کو فارسیت کے بعض مثبت عناصر حاصل ہوگئے مگر ہندوستانیت کے بعض زندہ عناصر سے محروم ہو گئی۔ یہ زندہ عناصر دو قسم کے ہیں۔ ہندی الفاظ، اصناف اور ہندی شاعری کی بعض روایات مثلاً عورت کی طرف سے اظہارِ عشق اور بارہ ماسہ کی روایات وغیرہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ اردو شاعری میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں مگر اتنی کم کہ انھیں اردو شاعری کی واضح خصوصیات یا نمایاں رجحان قرار نہیں دیا جاسکتا اگرچہ

اردو اور ہندی دونوں کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ مگر دونوں میں کھڑی بولی کی بنیادی خصوصیات کے تناسب میں فرق ہے۔ یہ خصوصیت اردو میں زیادہ اور ہندی میں کم ہیں۔ کھڑی بولی کی بنیادی خصوصیات میں نوکیلے۔ منفرد صوت۔ بلند بانگ الفاظ اور نکھار نیز کھڑا لب و لہجہ شامل ہے۔ اردو نے ان خصوصیات میں فارسی شعری زبان کی نغمگی اور دلکشی کا اضافہ کیا مگر اردو میں کھڑی بولی کی بنیادی خصوصیات اور مردانہ پن بڑی حد تک باقی رہا۔ ہندی نے کھڑی بولی کی بنیادی خصوصیات میں سنسکرت کی نغمگی اور دیسی بولیوں مثلاً اودھی۔ برج۔ قنوجی۔ بندیلی وغیرہ کے غنائی عناصر اور الفاظ کو سمو لیا اور اس کے لب و لہجہ کے تیکھے پن اور تیزی (SHARPNESS) کو بڑی حد تک کند کر لیا۔ جس سے اس میں نسوانی اظہار کی خصوصیت پیدا ہو گئی۔ اردو نے ہندی الفاظ اور اسالیب سے کنارہ کشی کر کے نہ صرف ہندی بلکہ اس کے توسل سے ملنے والے دوسری بولیوں کے ایسے ذخیرہ الفاظ اور دیگر مثبت عناصر سے ہاتھ دھو لیا جو کامیاب گیتوں کی تخلیقوں کی ضمانت بن سکتے تھے۔ مجھے اپنی اس رائے کے اظہار میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ اردو سے زیادہ ہندی میں اور ہندی سے زیادہ اودھی میں گیتوں کی زبان بننے کی صلاحیت ہے — ہندی شاعری کی دوسری روایت یعنی عورت کی طرف سے اظہارِ عشق اور بارہ ماسہ ذخیرہ سے اجتناب کی وجہ سے اردو میں گیتوں کی روایت کے فروغ کو نقصان پہنچا۔ گیت نسوانیت کا شعری اظہار ہے جس میں عورتوں کے جذبات بالخصوص عشقیہ جذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ اس ہیئت کو عورت کی طرف سے اظہار محبت کی روایت سے جو فروغ مل سکتا تھا وہ اس کے فقدان سے نہیں مل سکا۔ یہی حال بارہ ماسہ کا ہے۔ بارہ ماسہ میں عورت موسموں کی کیفیات کے لحاظ سے اپنے پریمی یا شوہر کو یاد کرتی ہے۔ یہ انداز بھی گیتوں کے مزاج کے عین مطابق ہے مگر اردو شاعروں نے بارہ ماسوں کی تخلیق سے اجتناب کر کے دہرا نقصان اٹھایا۔ ایک یہ کہ بارہ ماسہ جیسی دلکش طرزِ اظہار سے

ہاتھ دھویا دوسرے یہ کہ اس کے معنوی اثرات سے گیتوں کی روایت کو جو ترقی مل سکتی تھی وہ بھی نہیں ملی۔ اور موسم وہجور کے باہمی ربط کے بیان سے جو جمالیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس سے بھی اُردو شاعری بالخصوص گیتوں کو محروم کردیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ مجموعی طور پر گیتوں کی زبان اپنے معیار کو نہیں چھو سکی اور اس میں وہ تخلیقی شان اور رچاؤ پیدا نہیں ہوا جو گیتوں کی زبان کا جوہر ہے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ اردو گیتوں کی زبان قطعاً مصنوعی اور غیر تخلیقی ہے یا اس میں گیت کی زبان کے زندہ عناصر نایید ہیں۔ یہ عناصر کمیاب سہی مگر نایاب نہیں۔ گیتوں کی زبان کی خصوصیات کے نقطۂ نظر سے اُردو گیتوں میں زبان کے تین رجحان خاص طور پر نظر آتے ہیں (۱) اُردو کی ٹکسالی زبان کا رجحان۔ (۲) اردو ہندی ملی جلی زبان کا رجحان۔ (۳) لوک گیتوں۔ اَودھی ہندی اور بول چال کی زبان کا استعمال۔ ان تینوں رجحانوں میں پہلے دو رجحان حاوی ہیں۔ تیسرا کسی قدر کمزور اور جدید ہے۔ دراصل یہ تینوں رجحان تاریخی تسلسل کے اعتبار سے ایک دوسرے کا لازمی اور فطری نتیجہ ہیں۔ اُردو زبان میں فارسی اصناف واسالیب کی تکمیل سنہ ۱۸۵۷ء تک مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے ردعمل نے مغربی تہذیب وتعلیم کے اثرات مل کر اردو میں ہندی اصناف واسالیب کا رجحان پیدا کیا۔ چوں کہ اردو زبان میں فارسیت کا غلبہ ہو چکا تھا اور اُردو سے غیر ٹکسالی عناصر کو پاک کرنے کی مہم بھی کامیاب ہو چکی تھی اس لئے اپنے ابتدائی دور میں گیت بھی اُردو کی ٹکسالی زبان میں لکھے گئے۔ اس رجحان کی بھی دو شکلیں نظر آتی ہیں۔ ایک فارسی الفاظ وتراکیب کا رجحان اور دوسرا سپاٹ سادہ اور سلیس اُردو الفاظ کا استعمال۔ یہ رجحان عظمت اللہ خاں۔ حفیظ جالندھری سے شروع ہو کر تا حال نظر آتا ہے۔

جاگ سوزِ عشق جاگ
آ مغنیِ شباب۔ جاگ خوابِ ناز سے

دل شکستہ ہے رباب - عرصۂ دراز سے
مر گئے قدیم راگ
جاگ - سوزِ عشق جاگ - (حفیظ جالندھری)

اس گیت میں فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت ہے اور روایتی شاعرانہ زبان کی مہر لگی ہوئی ہے - "مغنی شباب" "خوابِ ناز" "دل شکستہ رباب" "عرصۂ دراز" اور "سوزِ عشق" جیسی ترکیبیں اپنی جگہ پر بہت پر آہنگ ہیں مگر یہ زبان اور آہنگ گیتوں کی بنیادی زبان کا آہنگ نہیں - لیکن یہ زبان موضوع - موادِ اور بحر سے پوری طرح ہم آہنگ ہے - اسی لئے اس میں تخلیقی فن کی جھلک اور غنائیت کا حسن دونوں عنصر موجود ہیں - اور یہ گیت :

یاد کی لہروں پر تم آؤ
سوچ میں آنکھ ہے سوچ میں ہے من
من کی موج بنے جب الجھن
اس دم ان آنکھوں میں چھپ کر
تم آنسو بن کر شرماؤ
یاد کی لہروں پر تم آؤ
یاد کی لہروں پر تم آؤ
جب یہ دل حیران ۰۰۰۰ پڑا ہو
گم سم اور سنسان پڑا ہو
ادھروں پہ بنسی کو دھر کر
ایک مچلتی تان اڑاؤ
یاد کی لہروں پر تم آؤ (ڈاکٹر مسعود حسین خاں)

اس گیت میں سوچ ۔ من ۔ الجھن ۔ حیران ۔ شرماؤ ۔ آنکھ وغیرہ الفاظ سادہ اور لوچدار انداز رکھتے ہیں جن میں ہندی کے دو لفظ "ادھروں" (ہونٹوں) اور "دھر" اجنبی معلوم ہوتے ہیں ۔ دراصل اس گیت کی زبان بنیادی طور پر اردو کی ٹکسالی زبان کا کسی قدر سادہ اور صاف روپ ہے ۔ اور گیت کی زبان سے بہت قریب ہے ۔

اردو ہندی کی ملی جلی زبان کا رجحان بھی کافی نمایاں ہے ۔ یہ عظمت اللہ خان ۔ اختر شیرانی ۔ تاثیر ۔ میراجی ۔ مقبول حسین احمد پوری ۔ وقار انبالوی ۔ نیائے شرما ۔ اندرجیت شرما ۔ قیوم نظر ۔ جمیل الدین عالی وغیرہ سے ہوتا ہوا حال کے نئے شاعروں کے گیتوں تک مسلسل نظر آتا ہے ۔ اس رجحان کے بھی دو رنگ نمایاں ہیں ۔ ایک میں اردو الفاظ کی فراوانی اور دوسرے میں ہندی الفاظ کی بہتات ہے ۔ یہ گیت بعنوان "آج کی رات"

پریتم رہ جا آج کی رات
آج کی رات جیارا دھڑکے آج کی رات انکھیاں بھی پھڑکیں
جوڑ رہی ہوں ہات ۔ پریتم رہ جا آج کی رات ۔
بجلی کڑکے بادل برسے ۔ آج کی رات نکل نہیں گھر سے
آج بھری برسات ۔ پریتم رہ جا آج کی رات
آج کی رات جیا گھبرائے ۔ آج کی رات گئی کب آئے
سن جا من کی بات ۔ پریتم سن جا من کی بات

(وقار انبالوی)

اور اب یہ گیت پڑھئے :

سر کا گیان کہاں سے پاؤں ۔ کھو گئے میرے راگ
جس مورت کا بنا پجاری اسی سے من کو لاگ

سرکا گیان کہاں سے پاؤں ۔ کھو گئے میرے راگ
پوجا سے سرگیان کے بدلے اپنے آپ کو پاؤں
اپنے آپ کو پاؤں تو سنگیت کا مان گھٹاؤں
یہ کیسا بیراگ
سرکا گیان کہاں سے پاؤں کھو گئے میرے راگ

رات کا جنگل ۔ ریت کا مندر بن باتی کا دیپ
بن لہروں کا ساگر جیون بن موتی کا سیپ
بن جوتی کی آگ
سرکا گیان کہاں سے پاؤں کھو گئے میرے راگ

(شہاب جعفری)

پہلے گیت میں پریتم ۔ جیارا ۔ انکھیاں ۔ جیا اور من اور دوسرے گیت میں ۔ سر ۔ گیان ۔ مورت پجاری ۔ پوجا سنگیت ۔ بیراگ ۔ مندر ۔ دیپ ساگر جیون وغیرہ الفاظ ہندی کے ہیں ۔ پہلے میں ہندی الفاظ کم اور اردو الفاظ زیادہ ہیں جب کہ دوسرے میں اس کے برعکس ہندی الفاظ کا پلہ بھاری ہے دونوں قسم کے الفاظ دونوں گیتوں میں شیر و شکر ہیں ۔ یہ زبان گیتوں کی زبان سے قریب ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔

تیسرا رجحان ہندی اودھی اور لوک گیتوں کی زبان کو اپنانے کا رجحان ہے ۔ اس طرح کے گیت کمیاب ہیں مگر نایاب نہیں ۔ اس رجحان کو ۱۹۴۷ء کے بعد فروغ ملا جمیل الدین عالی ۔ شکیل بدایونی ۔ قتیل شفائی ۔ شہاب جعفری ۔ ندا فاضلی اور دوسرے بہت سے فلمی اور غیر فلمی شاعروں کے یہاں ایسی زبان نظر آتی ہے ۔ یہ گیت

دیپ جلے بن باتی راما
میں تو نیند کی ماتی راما

دیپ جلے بن باتی راما
کو میرو من کا بسیا راما - کو میرو جائی رام
سدھ بسرائی بو جھو نہ پاتی میں دکھ پاتی رام
بیت گنوائی رام
لکھ لکھ پھاڑوں پاتی راما
دیپ جلے بن باتی		(شہاب جعفری)

یہ اس رجحان کی ابتدائی شکل ہے۔ اس میں تمام الفاظ ہندی زبان کے ہیں یا ہندی تلفظ میں نظم ہوتے ہیں۔ اس کی زبان پر کسی حد تک دیہات کی ٹھیٹھ زبان کا اثر بھی ہے۔ اس گیت کی زبان میں گیت کی زبان کی کئی خصوصیات مجتمع ہوگئی ہیں جن سے اس میں گیت کی فضا کی خنک تابی اور آہنگ کی نرمی پیدا ہوگئی ہے۔ اور یہ گیت

موہے بھول گئے سانوریا بھول گئے سانوریا
اون کہہ گئے اجہو نہ آئے لینی نہ موری کھبریا
موہے بھول گئے سانوریا
دِل کو دئے کیوں دُکھ برہا کے - توڑ دیا کیوں محل بنا کے
آس دلا کے او بے دردی پھیرلی کا ہے نجریا
موہے بھول گئے سانوریا
نین کہیں رو رو کے سجنا - دیکھ چکے ہم پیار کا سپنا
پریت ہے جھوٹی پر تم جھوٹا - جھوٹی ہے ساری نگریا
موہے بھول گئے سانوریا
(شکیل بدایونی)

اس گیت میں نظر سے نجریا - خبر سے کھبریا اور نگر سے نگریا کی طرف مراجعت نے بول چال

اور ٹھیٹ زبان کی خصوصیات پیدا کی ہیں۔ علاوہ دوسرے الفاظ بھی ہندی اور بول چال کی زبان کے ہیں۔ اس طرح اس گیت میں لوک گیتوں کی زبان سے مشابہت پیدا ہو گئی ہے یہی مشابہت اس میں گیت کی زبان کی خصوصیات پیدا کرتی ہے۔

جدید تر گیتوں میں گیت کی زبان کے بیشتر عناصر نظر آنے لگے ہیں جس سے ایک طرف اُردو شاعری کو نیا ذخیرہ الفاظ مل رہا ہے اور دوسری طرف گیت زبان کے نقطۂ نظر سے اپنے معیار کی طرف بڑھ رہا ہے جس سے امید کی جاتی ہے کہ گیت بہت جلد اُردو شاعری کی مقبول اور ممتاز ہیئت سمجھی جانے لگی گی۔

خلافتِ راشدہ کے دور کی اہمیت اور اس کی مشترک روح

از جناب مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی ندوۃ العلماء لکھنؤ

" زیرِ نظر مضمون اس مقالہ کا ایک حصہ ہے جو جناب سید اطہر حسین صاحب آئی۔ اے۔ ایس کی انگریزی کتاب GLORIOUS CALIPHATE کے لئے بطور مقدمہ کے لکھا گیا تھا۔ یہ کتاب خلفائے راشدین کی سیرت اور کارناموں پر مشتمل ہے اور غالباً اس موضوع پر انگریزی میں پہلی کتاب ہے جو ایک مسلمان فاضل کے قلم سے نکلی ہے۔ عام افادہ اور دلچسپی کے خیال سے اس کو برہان میں بھی شائع کیا جا رہا ہے یہ کتاب عنقریب مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہونے والی ہے۔"

جن لوگوں نے قرآن کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے، اور سیرت و حدیث سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں، وہ اس بات سے ضرور واقف ہوں گے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، آپ کی بعثت کے مقاصد، اور آپ کے اصلاحی و تربیتی کام، اور جس طرح کا انقلاب آپ دنیا میں برپا کرنا اور جو نیا معاشرہ آپ وجود میں لانا چاہتے تھے، اس کا دائرہ نہ تو آپ کی زندگی تک محدود تھا، اور نہ جزیرۃ العرب کے حدود تک، قرآن مجید نے ایک طرف آپ کی نبوت و بعثت کے عالمگیر ہونے، اور پوری نوعِ انسانی کو اس کا مخاطب ہونے کا اعلان الفاظ میں کیا ہے:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ اے محمدؐ! کہو کہ، اے انسانو! میں تم سب

إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ[1]
کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں، جو زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔

دوسری طرف آپ کی دعوت اور آپ کے کارِ نبوت کی تکمیل، اور اس کے عروج و ارتقاء کی آخری منزل اور نقطہ پر پہنچنے کی پیشین گوئی اس انداز سے فرمائی جس سے یہ نتیجہ قدرتی طور پر نکلتا ہے کہ آپ کی دعوت اور جد وجہد ایک چراغ کی وقتی اور عارضی بھڑک، اور کسی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بجلی کی چمک کے مرادف نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا چراغ ہے جو بالآخر ساری دنیا کو روشن کرے گا، اور اپنی درخشانی و تابانی کے نقطۂ عروج پر پہنچ کر رہے گا، اور آپ کا لایا ہوا دین مستقبل قریب میں تمام ادیان پر غالب آجائے گا، فرمایا گیا:۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۔ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ[2]۔
یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا۔ خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو، وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

ان واضح اعلانات و حقائق کے بالمقابل جن سے نبوتِ محمدی کے زمانی اور مکانی رقبے کے لامحدود ہونے کا ثبوت ملتا ہے، یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ محمد رسول اللہ

[1] سورۃ الاعراف: ۱۵۸

[2] سورۃ الصف: ۸ — ۹

صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سابقین اور افراد نوع انسانی کی طرح ایک محدود و معین جسمانی زندگی لے کر آتے تھے اور موت و حیات کے طبعی اور عالمگیر قانون سے آپ بھی اسی طرح مستثنیٰ نہ تھے جیسے کہ دنیا کے باقی انسان، قرآن مجید میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے کہ:-

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم[1]

محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں، یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔

دوسری جگہ فرمایا

انك ميت وانهم ميتون[2]

اے نبی تمھیں بھی مرنا ہے، اور ان لوگوں کو بھی مرنا ہے

یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ ایسی تسلیم شدہ حقیقت ہیں جن میں سے کسی کا بھی کوئی ایسا شخص انکار نہیں کر سکتا جو قرآن پر ایمان رکھتا ہے، اور اپنے کو مسلمان کہتا ہے، آپ کا کام آپ کی زندگی پر ختم نہیں ہوتا آپ کی زندگی کے بعد بھی اس کا جاری رہنا ضروری ہے علمی طور پر بھی یہ ایک حقیقت ہے اور جو شخص تاریخ سے کچھ بھی راہ و رسم رکھتا ہے، وہ جانتا ہے، کہ آپ کا دنیا سے تشریف لے جانے کے وقت تک اسلام جزیرۃ العرب کے ایک مخصوص رقبہ تک محدود تھا خود پورے عرب میں بھی نہیں پھیلا تھا، پڑوسی ملک میں نہ اس کی روشنی مشرقی سلطنت ایران کے وسیع حلقۂ اثر میں پہنچی تھی، نہ مغربی شہنشاہی بازنطینی سلطنت کے وسیع مقبوضات میں، نہ اسلام کو اپنی غیر معمولی اصلاحی و تربیتی، اخلاقی و اجتماعی، معاشرتی و تمدنی، قانونی و سیاسی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا تھا، اور نہ

---

[1] سورۃ آل عمران : ۱۴۴

[2] سورۃ الزمر : ۳۰

اس کی بنیاد پر ایک پوری زندگی کی تشکیل، اور ایک مکمل معاشرہ کے قیام اور اس کے ذریعہ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا کوئی وسیع تجربہ لیا گیا تھا، نہ دنیا کو اس کا موقع ملا تھا کہ مختلف قوموں، تہذیبوں، قوانین، مزاجوں اور طبائع، نسل و رنگ، انتظامی واقتصادی اختلافات کی موجودگی میں اسلامی اصول و تعلیمات کی صداقت، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت کی ہوئی جماعت کی قابلیت کا کوئی تجربہ کر سکے۔ عرب کے ایک محدود علاقہ کو چھوڑ کر جس میں گنتی کے چند شہر اور مرکزی مقامات تھے، خدا کی ساری زمین مطلق العنان بادشاہوں کے ظلم و سفاکی، بے مقصد جنگوں کی غارتگری اور خون آشامی، (جن میں سے ایران و بازنطینی سلطنت کی ٹکر ماضی قریب کا تازہ واقعہ تھا) طبقہ حکام کی دولت ستانی اور تعدی، امراء اور رؤساء کی نفس پرستی اور عیش کوشی، عمال کی بدانتظامی اور بے عنوانی، کارپردازان سلطنت کی نااہلی، اور فرض ناشناسی، علم و دین کے ٹھیکیداروں (احبار و رہبان) کی ابلہ فریبی اور نفس پرستی سے تاراج اور پامال ہو رہی تھی، اور کہیں بھی انسان کو اپنی فطری صلاحیتوں کو نشوونما دینے، اور ترقی کی آخری منزل تک پہنچانے، اور علم و عقل کو آزادانہ طریقہ پر اپنا کام کرنے کا موقعہ نہیں مل رہا تھا، ابھی دنیا نے شرک و بت پرستی، خرافات واوہام سے نجات، اور اپنے جیسے انسانوں کی ابدی غلامی سے آزادی، اور خدائے واحد کی پرستش اور غلامی، اور دین و دنیا کی سعادت و ترقی کی بشارت ہی سنی تھی، اور ایک محدود اور مختصر رقبہ میں دینِ توحید، اور انسانیت کے شرف و احترام کا تجربہ ہی کیا تھا، کہ آپ کی زندگی کی وہ مدت پوری ہو گئی جو خدا نے مقرر فرمائی تھی، اور آپ کو طلبی کا پیغام آگیا، اب اس مقصد کی تکمیل کا جس کے لئے آپ کو مبعوث کیا گیا تھا، اور اس نعمت میں دنیا کے زیادہ سے زیادہ انسانوں کو شریک کرنے کے لئے جس کو لے کر آپ دنیا میں آئے تھے اس کے سوا کیا شکل تھی کہ یہ کام آپ کے ان لائق جانشینوں کے سپرد کیا جائے، جن کو آپ نے اپنی ۲۳ برس کی نبوت کی زندگی میں تیار کیا تھا، اور جو

ایک طرف آپ کے سب سے زیادہ معتمد علیہ، سفر و حضر اور جلوت و خلوت میں آپ سے سب سے زیادہ قریب، آپ کے مزاج و مذاق سے سب سے زیادہ آشنا اور اسلام کے مقاصد کے سمجھنے میں سب سے زیادہ ذہین و زیرک اور دوسری طرف مسلمانوں کی نگاہوں میں سب سے زیادہ معتبر و محترم، اور آپ کی جانشینی کے اہل و حقدار تھے، اور جن کے ساتھ آپ کا زندگی بھر کا طرزِ عمل اس بات کی تصدیق کرتا تھا، کہ وہ آپ کی نظر میں اس نازک ذمہ داری کو قبول کرنے کے پوری طرح اہل ہیں، پھر واقعات، ان کے کارنامے، ان کے زمانے کی وسیع فتوحات، اشاعتِ اسلام کی محیر العقول وسعت، ان کا زہد و اتقا، ان کی بےنفسی اور بے لوثی، ان کا ایثار و قربانی، جاہ و اقتدار اور عیش و تنعم کے بہترین وسائل و مواقع سے بالکل فائدہ نہ اٹھانا، دریا میں اترنا اور پھر دامن تر نہ ہونا، اسلام کی تعلیمات کو پورے عزم و خلوص کے ساتھ نافذ کرنا صاف بتلاتا ہے کہ وہ اس جانشینی کے ہر طرح سے اہل، اور اس نازک اور پیچیدہ ذمہ داری کے لئے جس کی مثال بےنفس داعیوں، پیشوایانِ مذاہب، اور بانیانِ سلطنت، اور کار پردازانِ حکومت دونوں کی تاریخ میں یکساں طریقہ پر نایاب ہے، ہر طرح سے موزوں تھے۔

نبوت کی اسی جانشینی کا نام "خلافت" اور تقدیر الٰہی کے مطابق جو لوگ اسلام کے ابتدائی عہد میں اس منصب رفیع پر فائز ہوتے، ان کا نام اسلام کی تاریخ اور مسلمانوں کے عرف اور اصطلاح میں خلفائے راشدین ہے، یہ خلافت در حقیقت نبوت کے تنظیمی و انتظامی، اور اصلاحی و دعوتی فرائض کی تکمیل کا ہے، اور اس طرح ہم اس کو تاریخی طور پر سیرتِ نبوی ہی کا ایک باب، اور آپ ہی کی نبوت اور تربیت کا ایک معجزہ اور اس کا کارنامہ سمجھتے ہیں، اور اس کارنامہ کی اشاعت و تبلیغ، اس کو صحیح رنگ میں پیش کرنا، اور اس کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنا ہمارے نزدیک سیرت ہی کی ایک خدمت، اور نبوت محمدیؐ کے اعجاز کو نمایاں کرنے کی ایک کوشش ہے،

کہ درختوں اور پھولوں کی خوشنمائی و شادابی، اور حسنِ ترتیب، باغبان کی محنت اور شاگردوں اور ساختہ و پرداختہ انسانوں کی کارگزاری، اپنے مقصد سے عشق اور وفاداری، اور صحیح راستہ پران کی استقامت واستواری استاد اور مربی ہی کی تعلیم و تربیت اور اس کی مردم گری اور کیمیا سازی کی دلیل ہے، یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کو علم و عمل کے میدان میں جو کچھ حاصل ہوا، اور وہ جاہلیت کی پست سطح سے علم و عرفان کی جن بلندیوں تک پہنچے، وہ سب نبوت محمدیؐ ہی کا فیضان، اور آپ کی تعلیم و تربیت کا کرشمہ تھا، اسی حقیقت کو قرآنِ مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ[1]	وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود انھیں میں سے اُٹھایا، جو انھیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اگرچہ ان چاروں خلفاء کو مختلف حالات مسائل، مشکلات اور تجربوں کا سامنا کرنا پڑا، انسانی زندگی تغیر پذیر ہے، اسلامی معاشرہ بھی نئے نئے عوامل سے متاثر ہو رہا تھا، حجاز اور دار الخلافہ، مدینہ یا کوفہ بدلتے ہوئے حالات، اور اثر قبول کرنے والی طبیعتوں سے غیر متاثر نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے ان خلفاء کے فیصلوں، مسائل کے حل اور طرزِ عمل میں اختلاف و تنوع کا ظاہر ہونا قدرتی عمل ہے ان میں اجتہادی اختلافات بھی رونما ہوتے، ابتدائی دو خلفاء (ابوبکرؓ و عمرؓ) کے ساتھ جس طاعت و انقیاد اور جس احترام و اعتماد کا معاملہ تھا، اور ان کے زمانے میں اسلام جس طرح دنیا میں پیش قدمی کر رہا تھا، اور ہر معاملہ میں کامیابی اور اقبال مندی ان کا ساتھ دے رہی تھی

---

[1] سورۃ الجمعہ ۲

اس طرح پچھلے دو خلفاء (حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ) کے دور میں پیش نہیں آیا، خصوصیت کے ساتھ ان اسباب اور تبدیلیوں کی بنا پر جن کی طرف اس کتاب میں اشارہ کیا گیا ہے حضرت علیؓ کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کا قدم آگے نہیں بڑھا، اور مادی و سیاسی حیثیت سے بظاہر اسلامی قلمرو میں کوئی وسعت اور ترقی نہیں ہوئی، لیکن حالات کے اس اختلاف کے باوجود دیانت داری کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کرنے والا محسوس کرے گا کہ ان چاروں خلفاء میں ایک ہی روح کام کر رہی تھی، ان چاروں پر ایک ہی نقطۂ نظر غالب اور حاوی تھا اور وہ اسلامی احکام کی پیروی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زیادہ سے زیادہ اتباع اور آپ کے دلی منشار کے پورا کرنے کی مخلصانہ کوشش، اپنے بارے میں انتہائی زہد و ایثار سے کام لینا، اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی خیر خواہی میں اپنے فہم و اجتہاد اور اپنے امکان و استطاعت کے بقدر کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھنا، خلافت کی جو عظیم و نازک ذمہ داری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یا ان کے پیش رو خلیفہ یا مسلمانوں نے ان کے سپرد کی تھی اس پر سختی اور مضبوطی سے قائم رہنا، اور اس کے راستہ میں جان دینے سے بھی دریغ نہ کرنا، یہ وہ مشترک روح ہے جو ان چاروں خلفاء کے قالبوں میں نظر آتی ہے" اور جس کے بارے میں ان کے درمیان کوئی اصولی تضاد یا اختلاف پایا نہیں جاتا، یہی وہ روح ہے جو خلیفۂ اول حضرت ابو بکرؓ کے اس بے لوچ رویہ میں جلوہ گر نظر آتی ہے، جو انھوں نے زکوٰۃ روکنے والوں، اور ارتداد اختیار کرنے والوں کے مقابلہ اور جیش اسامہ کے روانہ کرنے میں اختیار کیا، یہی روح حضرت عمرؓ کے زہد، اسلامی تعلیمات اور احکام کے نفاذ میں شدت، اس بارے میں کسی کی پرواہ نہ کرنے، اور امراء و عمال کے عزل و نصب میں کارفرما نظر آتی ہے، یہی روح خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کے منصب خلافت سے دست بردار نہ ہونے، اور اپنی جان کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کا خون بہانے سے انکار کر دینے میں صاف جھلکتی ہے، جس کو خاص طور پر اس کتاب میں بہت خوبی سے نمایاں کیا گیا ہے، یہی

روح خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کے بے لچک فیصلوں، خلافت کے نبوی مزاج و منہاج، اور اس کے اصول و معیار سے انحراف کرنے والوں کے مقابلہ میں صف آرا ہونے، عمالِ سلطنت کے انتخاب، ملوکیت اور عجمی سلطنتوں کی تقلید سے مکمل احتراز، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے پیش رو خلفاء کی فقیرانہ اور زاہدانہ زندگی پر مضبوطی سے قائم رہنے، غلط مطالبوں اور مغالطوں کے سامنے قطعاً سپر انداز نہ ہونے اور اسی راہ میں جان دے دینے کے کارنامے میں صاف طور پر نظر آتی ہے، اس طرح یہ چاروں خلفاء ایک ہی صداقت کے ترجمان، ایک ہی روح کا مظہر، اور ایک ہی منزل کے مسافر نظر آتے ہیں، اور غور سے دیکھنے والے انصاف پسند کو ان میں خواہ کتنا تنوع نظر آئے (جو زندگی اور آزادی کی علامت ہے) کوئی تقابل اور تضاد نظر نہیں آئے گا۔

ان حقیقتوں کو سامنے رکھئے تو خلافت راشدہ اور خلفائے راشدین پر کتاب لکھنا ان کو صحیح رنگ میں پیش کرنا، اور ان کے ساتھ انصاف کرنا بڑا نازک اور دشوار کام ہے یہ کام وہی انجام دے سکتا ہے جو افراط و تفریط غلو و مبالغہ اور تعصب سے پاک ہو جو اس کثرت میں وحدت کی تلاش، اور واقعات و روایات کے انبار میں حقیقت کا سرا پانے میں کامیاب ہو سکے اور ان کے کارنامے کی حقیقی عظمت کو خود دیکھ سکے اور دوسروں کو دکھا سکے، یہ مشکل کام وہ انجام نہیں دے سکتا جو صرف مادی کامیابی، فتوحات کی کثرت اور اسلامی سلطنت کی وسعت کو عظمت و کامیابی کا واحد معیار قرار دے اور نہ وہ شخص انجام دے سکتا ہے جو محض زہد و عبادت، اور علم و حکمت کو خلافت و وراثت نبویؐ کی اساس قرار دے۔

اس کے لئے وہ معتدل، اور جامع نقطۂ نظر، اور طریق فکر ضروری ہے، جو وسیع النظر اور محقق اہلِ سنت کا شعار، اور طرۂ امتیاز ہے، اس کام کے لئے قلب کی وسعت کے علاوہ نظر و مطالعہ کی وسعت بھی درکار ہے تاکہ خلافتِ راشدہ کے عہد کے نظامِ سلطنت

بقیہ دیکھو صفحہ ۳۶۱ پر

ایک محبّ باصفا کی رحلت

(از عتیق الرحمٰن عثمانی)

افسوس ہے ۱۸ / اپریل کی سہ پہر کو مخلص محترم جناب حافظ مقبول احمد صاحب پٹنہ والوں کی وفات ہوگئی ۔ مرحوم مدت مدید سے پیشاب کی نالی کے غدودوں کی اذیت ناک تکلیف میں مبتلا تھے اور معذور ہوگئے تھے ۔ ہر طرح کے معالجات ہوئے مگر مرض کی شدت میں کمی نہیں ہوئی ۔ یہاں تک کہ وقت موعود آپہونچا ۔ عمر ۸۰ سال کے قریب ہوئی ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ حافظ صاحب مرحوم حقیقی معنی میں فرشتہ خصلت انسان تھے ۔ ان کی غیر معمولی خصوصیات کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا ، انتہائی نیک دل ، خدا ترس ، صاحب خیر ، راسخ العقیدہ ، چھپ چھپ کر ضرورت مندوں اور بے سہاروں کی مدد کرنے والے ۔ مجسم شرافت ، مروت کے پیکر ۔ مرحوم سے چالیس سال سے گہرے مخلصانہ روابط تھے ۔ حق تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے ۔ اب ہندوستان میں ان کی واحد یادگار ان کے بھتیجے میاں اخلاص احمد صاحب ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کو مرحوم کے نقوشِ قدم پہ چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے ۔ زمانے کی رفتار بھی کتنی تیز ہے ۔ کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے جب ۱۹۳۳ء میں حافظ محمد اسمعیل صاحب جیون بخش مرحوم اور حافظ محمد ادریس صاحب جملانے مرحوم (بیڈیا اسٹریٹ پلان ہاؤس کلکتہ) کی تجویز و تحریک پر کلکتہ جانا ہوا تھا ۔ قیام کلکتہ کا زمانہ مختلف حیثیتوں سے یادگار زمانہ ہے ۔ اسی وقت کی ایک ایک بات حافظے میں ابھر رہی ہے ۔ یکسر اجنبی ماحول میں کلکتہ پہونچا تو حافظ محمد ادریس صاحب نے میرے قیام کے انتظام کو لوٹولہ ۸۰ میں حافظ مقبول احمد صاحب ہی کے یہاں کیا تھا ۔ اس سے پہلے حافظ صاحب اور ان کے والد محترم حافظ محمد اسمعیل صاحب پٹنہ والوں کا نام تو سنا تھا لیکن ان سے کوئی خاص تعارف نہیں تھا ۔ حافظ صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی تو معلوم ہوتا تھا برسوں کے شناسا ہیں ۔ وہ ۱۹۳۳ء تھا اور اب ۱۹۷۴ء ہے ۔ چالیس سال سے زیادہ کی اس طویل مدت میں کیسے کیسے انقلابات آئے ۔ لیل و نہار کی کیسی کیسی گردشیں دیکھیں لیکن مرحوم سے تعلق کی جو وسعت پہلے روز قائم ہوگئی تھی اس میں سرمو فرق نہیں آیا ۔ نہ صرف یہ کہ فرق نہیں آیا بلکہ اس کی وسعتیں بڑھتی ہی گئیں ۔ حافظ صاحب حلقۂ دیوبند کے رکن رکین تھے ۔ اور اس نسبت سے تمام اکابر دیوبند سے غیر معمولی روحانی ربط رکھتے تھے ۔ لیکن مجھے یہ ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ خلوص و شفقت کا جو نہایت عمیق تعلق مرحوم کو میرے ساتھ تھا وہ عجیب ہی تھا اور شاید اس خصوصیت میں کوئی میرا سہیم و شریک نہیں ہے ۔ ۱۹۳۳ء میں مرحوم کی فرم کے کاروباری حالات نہایت ہی خستہ تھے ۔ اور یہ خستگی مسلسل بڑھتی رہی تھی ۔ مگر اس مشکل اور نازک وقت میں میرے آرام و آسائش کا جس طرح خیال رکھا اس کا نقشہ آج بھی آنکھوں میں گھوم رہا ہے ۔ کچھ دنوں کے بعد جب میرے قیام کا بندوبست مرحوم حاجی اسرار احمد صاحب کی بلڈنگ میں ہوگیا اور پھر چند ماہ کے بعد متعلقین بھی کلکتہ پہونچ گئے تو مرحوم نے انتہائی نیک شفقت آمیز انداز میں فرمایا کہ مفتی صاحب آپ جہاں کہیں بھی قیام کریں مجھے بخوشی منظور ہے ۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ کولوٹولہ ۸۰ کے جس کمرے میں آپ کا قیام رہا ہے وہ آپ ہی کا ہوگیا ہے اور مردانہ نشست ہر حالت میں یہیں رہے گی ۔ چنانچہ کلکتہ کے کم و بیش پانچ سال کے تاریخی قیام میں مردانہ نشست وہی رہی ۔ اور کلکتہ چھوڑنے کے بعد بھی سالانہ قیام وہیں رہا ۔ سالہائے گذشتہ کی طرح کلکتہ کا پروگرام بنتا تو اپریل کی ان تاریخوں میں کلکتہ ہوتا ۔ اور اس طرح خلوص و شفقت کے اس پیکر کی تجہیز و تکفین میں شرکت کی سعادت حاصل ہوجاتی ۔ مگر ادارے کے حالات کی مجبوری سے بمبئی کا سفر پیش آگیا اور کلکتہ کا سالانہ سفر اپریل میں نہ ہو سکا ۔ جس کا صدمہ ہمیشہ رہے گا ۔

حافظ صاحب محترم آج دنیا میں نہیں ہیں ۔ ہم بھی نہیں رہیں گے لیکن ان کی شفقتیں سینۂ قلب پر ثبت ہوچکی ہیں ۔ اب ایسے کلکتہ میں جانا ہوگا جہاں نہ شیخ فیوض الدین صاحب مرحوم ہیں نہ حافظ مقبول احمد صاحب مرحوم ۔

شئونِ علمیہ

(انتخابِ مطالعہ)

مولوی محمد عبد اللہ صاحب طارق دہلوی

اس دنیا میں جہاں بڑے بڑے فضلاء و نبلاء بستے ہیں وہیں کچھ مبتدی طلباء بھی رہتے ہیں۔ اور جہاں بامِ علم وفن کی بلند منزلوں پر بڑے بڑے وسیع النظر علماء جلوہ افروز ہیں وہیں مدارجِ علم کی کسی نچلی سیڑھی پر کچھ نیچے بھی پیر لٹکائے دریائے علم کی موجوں کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہے ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ ایک کہنہ مشق اور ماہر پیراک کی دسترس سطح سمندر کے جن موتیوں تک ہو، ساحلِ سمندر پر ٹخنوں ٹخنوں پانی میں کھیلنے والا بچہ بھی وہاں تک رسائی پا سکے لیکن ہاں وہ بچہ اپنے جیسے بہت سے بچوں کو کچھ رنگ برنگے گھونگے اور سیپیاں دکھا کر ضرور کچھ نہ کچھ دل چسپی کا سامان پیدا کر سکتا ہے۔ بس ایک صاحبِ ظرف بڑا پیراک اس کے موجودہ کھیل تماشے پر نظر نہیں کرتا بلکہ اس طرح اس کے سمندر سے قریب ہونے اور تھوڑی تھوڑی دور پانی میں جانے کے شوق پر ہمت افزائی کرتا ہے ؎

تیری نظر کے سامنے چاند بھی ہے چکور بھی
عشق کا انتخاب دیکھ کوششِ رائیگاں نہ دیکھ (ادیب سہارنپوری)

اس تمہید کے بعد ناظرین کرام کی خدمت میں گذارش ہے کہ مذکورہ بالا عنوان کے تحت دورانِ مطالعہ سامنے آنے والی ان خاص خاص باتوں کے پیش کرنے کا ارادہ ہے جو کسی حیثیت

سے اہم، مفید اور دلچسپ ہیں ان کا تعلق خواہ کسی بھی موضوع سے ہو سردست اس کی ایک قسط پیشِ خدمت ہے اگر یہ سلسلہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تو آئندہ بھی اس کو ہر ماہ یا کبھی ایک دو ماہ کے فاصلے سے پیش کیا جاتا رہے گا۔ واللہ ولی التوفیق۔

میں ناظرین کی خدمت میں یہ بھی عرض کردوں کہ اس انتخاب و اقتباس کی حیثیت کسی علمی و تحقیقی مضمون کی نہ ہوگی بلکہ برہان برادری کے چند اکابر و احباب کی ایک نیم علمی نیم تفریحی مجلس کی ہوگی اس لئے ممکن ہے کہیں اندازِ تحریر میں کوئی بات ایسی بھی آجائے جس میں کچھ بے تکلفی محسوس ہو جس کے لئے میں پیشگی معذرت خواہ ہوں ؎

تو اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے
امید تو نہیں ہے مگر ہاں خدا کرے (آزاد انصاری)

(۱) ایک تفسیر جس میں ایک حرف بھی کسی سے نقل نہیں:-

ہمارے اس دورِ جدید کے بعض روشن خیال فضلاء کو قدیم علماء تفسیر سے ایک یہ شکایت ہے (اور ضروری نہیں کہ یہ شکایت ہر طرح اور ہر پہلو سے بے جا ہی ہو) کہ یہ حضرات بیشتر ایک دوسرے سے نقل کرتے چلے گئے اور کسی نے کوئی جدت پیدا نہ کی ــــ میرے سامنے اس وقت علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی کتاب "بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ" رکھی ہوئی ہے اس میں انھوں نے ابو امامہ محمد بن علی الدکالی المصری ابن النقاش المتوفی ۷۶۳ھ کے حالات میں ان کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے

وتفسیر اطول جداً التزمات لا ینقل فیہ حرفا عن احد (ص۸۲)	اور ایک بہت ہی طویل تفسیر بھی لکھی ہے جس میں یہ التزام کیا ہے کہ کسی سے ایک حرف بھی نقل نہیں کریں گے۔

اس میں خاص بات یہ ہے کہ ایسے مشکل اور عجیب التزام کے ساتھ کسی ایک آدھ آیت یا سورت کی تفسیر لکھنا ہی کیا کچھ کم عجیب اور حیرت انگیز کارنامہ ہے چہ جائیکہ پورے قرآن مجید کی تفسیر

لکھ دی جائے اور مزید برآں یہ کہ یہ تفسیر کوئی مختصر سی نہیں بلکہ بقول سیوطیؒ "مطول" طویل ہے اور صرف طویل نہیں بلکہ جِدًّا بھی یعنی بہت طویل ہے ـــــ اور آپ یہ نہ خیال فرمائیے کہ ہمارے دور کے جدت پسندوں کی طرح وقت کے علماء شرع سے الگ انھوں نے اپنی کوئی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنالی ہوگی بلکہ اپنے دور کے اونچے اہلِ علم کا اعتماد بھی ان کو حاصل تھا حافظ ابن کثیر جیسا امام تفسیر ان کے متعلق تعریفی الفاظ بیان کرتا ہے اور مختلف فنون میں ان کی دستگاہ کا معترف ہے قال ابن کثیر کان فقیہا نحویا شاعراً واعطا له ید طولی فی فنون - اور جب یہ دمشق پہنچے تو علامہ سبکی نے ان کا بہت اعزاز و اکرام کیا۔ علامہ حافظ زکی الدین المنذری جن کی کتاب الترغیب والترہیب کے انتخاب و ترجمہ (جلد دوم) میں آجکل یہ راقم سطور مصروف ہے وہ ان محمد بن علی الدکالی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر چکے ہیں

کاش آج یہ نادر تفسیر دیکھی جا سکتی۔

(۲) زمخشری کی اعتزال سے توبہ :-

علامہ زمخشری کا معتزلی ہونا اس قدر مشہور ہے کہ یہ وصف کسی اور میں شاید اتنا زیادہ ممتاز نہ ہوا اور خود زمخشری نے بھی ہمیشہ اپنے معتزلی ہونے کا اظہار بڑے فخر کے ساتھ کیا، اور میں نے جہاں تک دیکھا سنا ہے سب لوگ زمخشری کو معتزلی اور پکا معتزلی ہی سمجھتے ہیں لیکن مدارک التنزیل کی شرح الاکلیل میں ایک جگہ یہ عجیب و غریب انکشاف ملا جو کم از کم میرے لئے تو انکشاف ہی تھا کہ زمخشری نے اپنے اخیر وقت میں اعتزال سے توبہ کر لی تھی اور توبہ کرنے کے بعد النصائح الصغار اور النصائح الکبار لکھیں۔ یہاں الاکلیل کی بعینہٖ عربی عبارت نقل کئے دیتا ہوں تاکہ ناظرین خود ان کے الفاظ میں یہ مضمون سمجھ لیں۔ انھوں نے یہ بات باقاعدہ حوالہ و سند کے ساتھ لکھی ہے غالباً اس لئے کہ یہ بات غیر معروف ہے اس لئے ممکن ہے کسی کو تسلیم کرنے میں تامل ہو۔ وہ عبارت یہ ہے:-

"افاد العلامة الفهامة الآفندی دادہ جونکی فی حاشیته
علی شرح السعدی فی التصریف قال العلامة اکمل الدین
فی شرح الکشاف انه قد تاب من مذھب الاعتزال
وصنف النصائح الصغار والنصائح الکبار بعد توبته من
الاعتزال ۔ انتھی ۔"

(الاکلیل علی مدارک التنزیل ج ۴ صفحہ تفسیر سورۃ الاعراف)

ابھی غالباً اکتوبر یا نومبر ۱۹۶۳ء کی بات ہے ندوۃ المصنفین میں جناب مجیب الرحمان صاحب استاد لسانیات راج شاہی یونیورسٹی ڈھاکہ سے ملاقات ہوئی بات چیت کے دوران انھوں نے ذکر کیا کہ میں نے علامہ زمخشری پر ایک مقالہ لکھا ہے انھوں نے وہ مقالہ دکھایا بھی جو کسی ماہانہ رسالے میں شائع ہوا ہے مجھے یہ بات یاد آئی اور میں نے پوچھا کہ زمخشری کی اعتزال سے توبہ کے متعلق بھی آپ نے کچھ لکھا ہے ؟ بولے کہ نہیں، مجھے تو کہیں ملا نہیں آپ کی نظر سے کہیں گذرا ہے ؟ میں نے کہا کہ ہاں ہے اور فلاں کتاب میں ہے آپ جلد و صفحہ کا حوالہ چاہیں تو کل تکلیف فرمائیے میں گھر سے نقل کراؤں گا چنانچہ دوسرے دن یہ عبارت انھوں نے حاصل کی اور اپنے مقالے میں شامل کرلی ۔ انھوں نے بیان کیا کہ وہ اپنے مقالات کا ایک مجموعہ شائع کرنے ہیں اس میں شاید وہ اسے بھی شائع کریں ۔

(۴) منصور حلاج کو پھانسی دی گئی تھی ؟ ۔

مشہور ہے کہ منصور حلاج کو پھانسی دی گئی تھی لیکن یہ صحیح نہیں ہے اس کو سزا دینے کے لئے پہلے کوڑے مارے گئے پھر گردن اڑا دی گئی ۔

(ماہنامہ معارف ج ۵۲ نمبر ۳ ستمبر ۱۹۴۳ء بحوالہ تاریخ خطیب ج ۸ صفحہ ۱۳۵)

تبصرے

اردو الفاظ شماری از جناب حسن الدین احمد صاحب ایم۔ اے تقطیع کلاں۔ ضخامت ۷۷۵ صفحات، کتابت طباعت اور کاغذ اعلیٰ۔ مجلد قیمت اور پتہ درج نہیں۔

یہ اُردو کی وہ خوش نصیب کتاب ہے جس کا اجرا وزیر اعظم نے اپنے مکان پر ایک شان دار تقریب میں کیا تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب کا موضوع "الفاظ شماری" ہے، یہ کام انگریزی، ترکی اور دوسری زبانوں میں ہوا ہے اور خود اردو میں بھی ہندوستان اور بیرون ہند میں بعض لوگوں نے کیا ہے، الفاظ شماری کا طریقہ یہ ہے کہ ایک زبان کا جو ذخیرۂ الفاظ ہوتا ہے اُس میں سے کثیر الاستعمال الفاظ ایک معتد بہ مقدار میں منتخب کر لئے جاتے ہیں اور پھر چند علوم و فنون کو متعین کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان متعین علوم و فنون کی کتابوں میں مذکورۂ بالا منتخب الفاظ میں سے کون سا لفظ کتنی مرتبہ آیا ہے، ظاہر ہے یہ کام بڑی محنت اور عرق ریزی کا ہے اور اس کے دو فائدے ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ زبان کے کثیر الاستعمال الفاظ کی ایک فہرست مرتب ہو جاتی ہے اور اس کے ذریعہ نو آموزوں کے لئے اس زبان کا سیکھنا آسان ہو جاتا ہے اور (۲) دوسرے یہ کہ اس فہرست سے یہ اندازہ لگانا آسان ہوتا ہے کہ زبان کی تعمیر و تشکیل میں کن خارجی عوامل و موثرات کا دخل زیادہ ہے لائق مرتب جو مرکزی حکومت میں ایک اعلیٰ افسر ہیں ان کا یہ ذوق بہت زیادہ قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہے کہ اپنے منصب کی سرکاری مصروفیتوں کے باوجود انھیں دو مقاصد

کے پیش نظر گیارہ برس کی محنت شاقہ کے بعد انھوں نے اُردو زبان کے ایسے ہی الفاظ کی تین طویل فہرستیں مرتب کی ہیں پہلی فہرست جو اُردو زبان کے ۵۶ ہزار الفاظ میں سے دس ہزار نو سو ستائیس الفاظ پر مشتمل ہے اُس میں الفاظ کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے اور اندراج کی صورت یہ ہے کہ ہر صفحہ پر سلسلہ کے نمبر اور لفظ کے سامنے گیارہ خانے ہیں، ان میں سے دس خانے اور علوم و فنون کے لئے مخصوص ہیں جن سے اس لفظ کا انتخاب کیا گیا ہے اور ہر خانہ میں ہندسوں کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ اس فن میں یہ لفظ (مرتب کے مقرر کردہ دائرہ کے اندر) کتنی مرتبہ آیا ہے، آخر میں ایک خانہ مجموعی میزان کا ہے۔ دوسری فہرست میں الفاظ ترتیب نزولی کے اعتبار سے جمع کئے گئے ہیں یعنی جو لفظ مثلاً "ہونا" زبان میں سب سے زیادہ کثیر الاستعمال ہے وہ سر فہرست ہے اور اس کے آگے ہندسوں سے بتایا گیا ہے کہ اُردو لٹریچر میں یہ لفظ کتنی مرتبہ مستعمل ہوا ہے۔ علی ہذا القیاس دوسرے الفاظ ہیں، تیسری فہرست ان الفاظ پر مشتمل ہے جو ایک ہی طرح سے لکھے جاتے ہیں مگر اُن کے معانی مختلف ہیں خواہ ہم تلفظ ہوں یا نہ ہوں مثلاً بیر۔ بیر۔ بیر۔ بیر۔ اگرچہ یہ پورا کام ٹیکنیکل قسم کا ہے اور ان فہرستوں کو حرفِ آخر بھی نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس سے مرتب کی غیر معمولی محنت اور ذوق و شوق کا اندازہ ہوتا ہے، علاوہ ازیں شروع میں چالیس صفحات کا ایک فاضلانہ اور پُر از معلومات مقدمہ ہے جس میں مآخذ کے حوالوں کے ساتھ زبان کی تاریخی سرگذشت، الفاظ کی تاریخی حیثیت اور الفاظ شماری کی حقیقت، اُس کے فوائد اور اُس کے اصول پر بحث و گفتگو کے بعد اپنے الفاظ شماری کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے غرض کہ کتاب اردو لٹریچر میں اپنی نوعیت میں منفرد ہے۔ امید ہے اہلِ ذوق اس کی قدر کریں گے۔

الترغیب والترہیب کا ملخص اردو ترجمہ جلد اول | از جناب مولوی عبداللہ الدہلوی ۔
تقطیع متوسط، ضخامت ۴۳۲ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد تیرہ روپیہ ۔ پتہ : ندوۃ المصنفین ۔ اردو بازار ۔ جامع مسجد دہلی ۶ ۔

ترغیب وترہیب یعنی اعمال کے اجر و ثواب اور اُن کے عقاب وعذاب پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں حافظ زکی الدین عبدالعظیم المنذری کی کتاب سب سے زیادہ مشہور اور بعض وجوہ سے زیادہ وقیع اور مقبول بھی ہے یہ کتاب اسی کا ملخص ترجمہ ہے اور یہ کتاب کی جلد اول ہے جو بنیت ۔ کتاب العلم، کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ پر مشتمل ہے لیکن ترجمہ کے ساتھ ہر روایت کی تشریح اور اُس پر کچھ کلام بھی ہے ۔ پھر یہ ترجمہ مسلسل نہیں ہے ۔ بلکہ احادیث صحیحہ کا انتخاب اور مکررات کو حذف کر کے اس کو مرتب کیا گیا ہے اس بنا پر یہ اردو اڈیشن اُن اسقام سے محفوظ ہے جو ترغیب وترہیب پر کتابوں کے خد وخال ہیں ۔ ترجمہ کے علاوہ نوجوان مترجم نے ڈھائی سو صفحات کا ایک فاضلانہ مقدمہ بھی لکھا ہے جو ان کے ذوقِ تحقیق وکاوش اور وسعت مطالعہ و ناقدانہ بصیرت کا آئینہ دار ہے، اس میں حافظ منذری کے حالات وسوانح ۔ علمی اور عملی کمالات، ان کی کتاب اُس کے شروح اور تلخیصات اور تراجم وحواشی کا تعارف، اور فضائل و رذائل اعمال سے متعلق روایات کے باب میں محدثین کا رویہ، ان سب پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے بعد دین میں سنت کا مقام، اُس پر بعض لوگوں کی طرف سے اعتراضات کے جوابات اور ممتاز محدثین کے تراجم وغیرہ پر دیدہ ورانہ بحث کی گئی ہے ۔ دورانِ بحث میں لائق مترجم نے اُن بعض غلطیوں کی بجا طور پر تصحیح کردی ہے جو قصداً یا بلا قصد کے زمانۂ حال کے اکابر علماء و مصنفین سے صادر ہو گئی تھیں اسماء کے بارہ میں جہاں کہیں اختلاف تھا اُس کی تحقیق کر کے ایک شق کو معین کیا ہے، منذری نے خود اپنی کتاب کے جو مآخذ بیان کئے تھے، موصوف نے پوری کتاب کا تتبع کر کے ان مآخذ پر پچاس اور کتابوں کا اضافہ کیا ہے، علمی اور تحقیقی اضافا

سے بے شبہ یہ کوشش اور دریافت بڑی وقیع چیز ہے ان وجوہ کے باعث یہ صرف ایک کتاب کا مقدمہ نہیں، بلکہ ایک مستقل علمی رسالہ ہے اور اس کے پیشِ نظر اگر انہیں ذوق کے مطابق کام کرنے کا موقع ملا تو نوجوان مرتب کے علمی مستقبل کے متعلق بہت خوش آیند توقعات قایم کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح عوام اور خواص دونوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوگا۔

<u>ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں</u> | از ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، تقطیع متوسط، ضخامت ۳۵۲ صفحات، کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت مجلد -/۴/ پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵

یہ وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے مصنف کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مقالہ بہمہ وجوہ اس کا مستحق تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس مقالہ کا موضوع ہندوستان کے اُن مفسرین کے حالات کا استقصا تھا جنھوں نے تفسیریں عربی میں لکھی تھیں، اس بنا پر وہ تفسیریں خارج از موضوع ہو گئیں جو فارسی اُردو یا کسی اور زبان میں لکھی گئی ہیں، لیکن اس کی تلافی اس طرح کی گئی ہے کہ اس کتاب میں مکمل تفسیروں کے ساتھ ان کتابوں یا رسالوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو قرآن مجید کی کسی ایک سورت کی تفسیر یا متعلقات قرآن میں سے کسی ایک مبحث یا چند مباحث پر اصلاً یا طبعاً مقدمہ لکھی گئی ہیں پھر ایک باب اُن حضرات کے تذکرہ اور تراجم پر ہے جن کی نسبت یہ معلوم ہے کہ انھوں نے تفسیر لکھی تھی لیکن مصنف کو ان کی تفسیر کا سراغ کسی کتب خانہ میں نہیں مل سکا۔ اس آخری باب کے علاوہ شروع کے چار ابواب میں مکمل تفسیریں اجزائے قرآن کی تفسیریں، تفسیروں کی شرحیں اور ان کے حواشی اور متعلقات قرآن مجید کو الگ الگ ایک باب کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ ہر تصنیف کے ساتھ پہلے مصنف کا تعارف اور ترجمہ لکھا ہے اور اس کے بعد تصنیف کی خصوصیات اور اُس سے متعلق دوسرے مباحث

پر گفتگو کی گئی ہے اور نیز یہ کہ یہ تصنیف کس کتب خانہ میں اور کہاں کہاں ہے اس سلسلہ میں مصنف کے پیش رو ڈاکٹر زبیر احمد سے یا کسی اور سے اگر کوئی غلطی ہوئی ہے تو اس کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے یہ سارا مواد بڑی محنت وکاوش اور تحقیق سے جمع کیا گیا ہے۔ آخر کتاب میں پانچوں ابواب کے مشتملات کی مفصل فہرستیں اور ساتھ ہی ایک فہرست مآخذ کی شامل ہیں، زبان، شگفتہ، سلیس ورواں اور منضبط ہے، اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب اُردو لٹریچر میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے لیکن مصنف نے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے نام کے آگے ۱۳۲۷ھ لکھا ہے، معلوم نہیں یہ کون سا سن ہے؟ کیوں کہ یہ نہ سن ولادت ہے اور نہ سن وفات، اسی طرح حضرت مجدد الف ثانی کے کسی بیان کے لئے آبِ کوثر کا حوالہ دینا مقالہ کی علمی شان سے فروتر ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۵۸)

طریقِ حکمرانی، ان کی اصلاحات واجتہادات اور ان کی انتظامی واصلاحی کارناموں کا بھی صحیح طور پر جائزہ لیا جا سکے اور اس کو نمایاں کیا جا سکے۔ پھر اس سب کو مؤثر اور دل نشین طریقہ پر پیش کرنے کے لئے ایک اچھا، رواں، اور شگفتہ قلم، دل آویز طرزِ تحریر، اور عصری اسلوب بھی درکار ہے، خصوصیت کے ساتھ جب یہ کام انگریزی زبان میں انجام دیا جائے تو اس کی مشکلات، اور ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی ہیں اس لئے کہ اس زبان میں اس موضوع کی کتاب کا پڑھنے والا بعض بنیادی اور ابتدائی اصطلاحات سے ناواقف ہوتا ہے وہ اس ماحول اور پس منظر سے بھی ناآشنا ہے جس میں یہ بالکل نئے طرز کا معاشرہ اور نئی شکل کی مملکت قائم ہوئی، جو نہ کوئی مطلق العنان سلطنت یا بادشاہی تھی، اور نہ پورے طور پر جدید معنی میں جمہوری اور عوامی حکومت۔ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰

سنہ ۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔
تاریخ صقلیہ۔ تاریخ ملت جلد نہم

سنہ ۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

سنہ ۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب)، جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

سنہ ۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبرؓ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب روس اور اس انقلاب کے بعد

سنہ ۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

سنہ ۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء معاصر مورخین

سنہ ۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹-۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

سنہ ۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے، عرب و ہند
تاریخ ہند پر نئی روشنی

سنہ ۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں۔ معارف الآثار۔
نیل سے فرات تک۔

سنہ ۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم۔ تاریخ سرکشی ضلع بجنور۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی اول

سنہ ۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم۔ حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط۔ عرب و ہند عہد رسالت میں۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

سنہ ۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات
لادینی دور کا تاریخی پس منظر۔ ایشیا میں آخری نو آبادیات

سنہ ۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم۔ سوز عشق۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

سنہ ۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

سنہ ۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم۔ تین تذکرے۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

سنہ ۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم۔ تاریخ الفخری۔ حیات ذاکر حسین۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

سنہ ۱۹۷۰ء حیات عبدالحی۔ تفسیر مظہری اردو جلد نہم۔ مآثر و معارف۔ احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

سنہ ۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم۔ بیماری اور اس کا روحانی علاج۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

سنہ ۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر۔ انتخاب الترغیب والترہیب۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

Regd. No. D. (D) 231 Phone 262815 MAY 197

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوة المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ -
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق و فلسفۂ اخلاق - فہمِ قرآن - تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" - صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اوّل - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال - تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ" -

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اوّل - اسلام کا نظامِ حکومت - سلسلہ تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی اُمیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اوّل - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت - مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ" - تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اوّل"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے) (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر -

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ" تدوینِ قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد -
اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا -

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اوّل (جس کو ازسرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے) - کتابتِ حدیث -

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت - قرآن اور تعمیرِ سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

برہان

جلد ۷۲ | ماہ جمادی الاول ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۴ء | شمارہ ۶

نظرات

افسوس ہے گذشتہ ماہ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اکسٹھ برس کی عمر میں ہم سے جُدا ہو گئے مرحوم ایک نہایت بلند مرتبہ اور ماہرِ فن ڈاکٹر کی حیثیت سے ریاست میں ہر جگہ معروف اور مشہور تھے، لیکن عملی سیاسیات کے میدان میں گامزن ہوئے ابھی انھیں دس بارہ برس ہی ہوئے تھے، اس کے باوجود وہ اس شان اور کروفر کے ساتھ اپنی ریاست کے آسمانِ سیاست پر نمودار ہوئے کہ پرانے چراغ جھلملا کے رہ گئے، ان کی سیاست اگرچہ اتر پردیش تک محدود رہی، لیکن ان کی غیر معمولی شخصیت کا وقار اور وزن پورے ملک کے مسلمانوں میں ہر جگہ محسوس کیا جاتا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مرحوم جذبہ اور عمل دونوں کے انسان تھے نہایت جری، بے باک اور صاف گو تھے، ان کی سیاست شتر گربگی یا منافقت کے عیب سے پاک و صاف تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیاست کو جلبِ منفعت کا ذریعہ بنانے کے بجائے انھوں نے چند در چند مالی نقصانات برداشت کئے اور اپنی کمائی کے لاکھوں روپئے اپنے کازپر بے دریغ خرچ کر ڈالے۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے بھی وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ عقیدہ اور عمل میں پکے اور سچے مسلمان۔ ہمدرد و متواضع خوش اخلاق و خوش طبع تھے اس بنا پر مخالفین بھی ان کا ادب و احترام کرتے تھے، عارضۂ صد میں مبتلا تھے، روس اور یورپ میں اعلیٰ سے اعلیٰ علاج کرایا مگر مرض نہ گیا، ایک مرتبہ بڑی حسرت سے بولے: میں نے ڈاکٹر کی حیثیت میں تین لاکھ مریضوں کے ہاتھ دیکھے ہیں، لیکن آج خود اپنا ہاتھ دیکھتا ہوں تو حسرت ہوتی ہے۔ آخر یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا اور د

خدا کو پیارے ہو گئے۔ اللّٰھمّ اغفرلہ وارحمہ۔

افسوس ہے پچھلے دنوں مراکش کے مشہور مجاہد آزادی شیخ علال الفاسی کا بھی ۶۴ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا مرحوم امیر شکیب ارسلان کے بعد عالمِ عرب کی دوسری اہم شخصیت تھے جن میں قدرت نے علم و فضل اور صلاح و تقویٰ کے ساتھ غیر معمولی سیاسی جد و جہد کا کمال بھی ودیعت کر دیا تھا۔ فاس کے باشندہ ہونے کی حیثیت سے جب وہ جامعۃ القرویین سے تعلیم پاکر فارغ ہوئے اور انھوں نے اپنے ملک کو فرانسیسی استعمار کا صیدِ زبوں پایا تو انھوں نے حزب الاستقلال کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور اپنی زندگی استخلاص وطن کے لئے وقف کر دی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے پورے ملک کا دورہ کر کے عوام میں بے داری پیدا کی اور پھر افریقہ مشرق وسطی اور یورپ اور امریکہ کا دورہ کر کے خارجی اثرات کے ذریعہ ملک کے لئے آزادی کی راہ ہموار کی۔ اس جرم کی پاداش میں وہ ایک عرصہ کے لئے جلاوطن بھی کئے گئے لیکن اُن کی جدّ و جہد آزادی کی رفتار میں کوئی فرق نہ ہوا آخر ۱۹۵۶ء میں ملک آزاد ہوا اور وہ اپنے وطن واپس آ گئے۔ شیخ علال عالم اسلام کے اتحاد کے بھی زبردست مبلغ اور داعی تھے اور اسی مقصد کے لئے دنیا بھر کی اسلامی کانفرنسوں میں بڑے اہتمام سے شریک ہوتے رہتے تھے، ہمیں بھی مرحوم سے دو مرتبہ ملاقات اور گفتگو کا شرف حاصل ہوا ہے، ایک مرتبہ خاص اُن کے وطن رباط (مراکو) میں جب ۱۹۶۴ء میں راقم الحروف حکومت ہند کے وفد خیرسگالی کے ممبر کی حیثیت سے وہاں گیا تھا اور ان کی پارٹی حزب الاستقلال نے نہایت شان دار ڈنر دیا تھا اور دوسری مرتبہ ایران میں جب کہ وہ شیخ طوسی کے جشن ہزار سالہ میں شرکت کے لئے آئے تھے، نہایت سنجیدہ و متین کم سخن اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۹۸ء میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ راجیہ سبھا میں مسٹر رام نواس مردہا وزیر امور داخلہ نے ایک خاتون کے سوال کے جواب میں بتایا کہ سال گذشتہ یعنی ۱۹۹۷ء میں دو سو بیالیس فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں اور ریاستی حیثیت سے ان کی تفصیل یہ ہے: آندھرا پردیش: ۱۲۔ آسام: ۱۰۔ بہار: ۳۱۔ گجرات: ۱۷۔ جموں و کشمیر: ۴۔ کیرالا: ۷۔ مدھیہ پردیش: ۲۵۔ مہاراشٹر: ۲۲۔ منی پور: ۱۔ کرناٹک: ۹۔ اڑیسہ: ۱۔ راجستھان: ۱۶۔ تامل ناڈو: ۱۳۔ اترپردیش: ۴۷۔ مغربی بنگال: ۲۔ اور دہلی ۶۔ ان اعداد و شمار کے بعد وزیر موصوف نے ان اقدامات کا تذکرہ کیا ہے جو فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لئے گورنمنٹ کر رہی ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے قومی یک جہتی کونسل کو زیادہ موثر اور فعال بنانے کا بھی ذکر کیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام بھی ضروری ہے اور ہونا چاہیئے، لیکن جرائم کے انسداد کی پہلی شرط یہ ہے کہ مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے، تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور پھر کسی کو اُس جرم کے ارتکاب کا حوصلہ نہ ہو، اسی بناء پر وزیر موصوف کو اپنے بیان میں یہ بھی بتانا چاہیئے تھا کہ (۱) ان ۲۴۲ فسادات میں کس فرقہ کے جانی اور مالی نقصانات کتنے ہوئے اور ان نقصانات کا فرقہ وارانہ تناسب کیا ہے؟ (۲) کتنے مجرم گرفتار ہوئے، اور ان کا تناسب فرقہ وارانہ کیا ہے؟ (۳) پھران گرفتار شدگان میں کتنے لوگوں کو سزا ہوئی اور کیا ہوئی اور (۴) جو لوگ بے گناہ قتل ہو گئے یا لٹ لٹا کر تباہ و برباد ہو گئے گورنمنٹ نے اُس کی تلافی کس طرح کی، تعجب ہے کہ اگر مسٹر مردہا نے اپنے بیان میں ان سوالات میں سے کسی ایک پر بھی روشنی نہیں ڈالی تو راجیہ سبھا کے کسی ممبر کو بھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ ان سوالات کو اُٹھاتا اور ان کا جواب طلب کرتا۔

افسوس ہے کہ ۱۰ ر جون کو ہندوستان اور پاکستان میں جو گفتگو ہونے والی تھی اسے پاکستان نے ہندوستان کے ایٹمی دھماکہ کی آڑ لے کر ملتوی کر دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی شروع

سے پالیسی یہ رہی ہے کہ دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کو معمول کے مطابق لانے اور انھیں بحال کرنے میں جلدی نہ کی جائے، اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک تعلقات نارمل نہیں ہوتے، پاکستان کسی نہ کسی عنوان سے بڑے ملکوں اور خصوصاً عرب ممالک اور چین سے مختلف قسم کے مفادات حاصل کرسکتا ہے، اور ظاہر ہے اس وقت ایٹمی دھماکہ سے بڑھ کر اور کیا بہانہ اور حیلہ ہوسکتا تھا۔ اس سلسلہ میں ہم مسٹر بھٹو سے صرف اتنا ہی عرض کرسکتے ہیں کہ یہ جو کچھ آپ کررہے ہیں وہ عہدِ حاضر کی سیاست سے خواہ کتنا ہی قرین ہو، لیکن یہ اسلام کی سیاست ہرگز نہیں ہے۔ اسلام کی سیاست تو یہ ہے کہ " فاذا عزمت فتوکل علی اللہ "

جیسا کہ مسٹر بھٹو نے اور بعض دوسرے پاکستان کے لیڈروں نے کہا بھی ہے، پاکستان خود ایٹم بنانے کی فکر میں ہے اور اُس کے پاس سائنٹسٹ حضرات کی کمی نہیں ہے، لیکن روپیہ کی کمی ہے، اس لئے عرب ممالک اور بعض اور ملکوں سے روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے مسٹر بھٹو نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اب اُس سے وہ فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ دوسرے ملکوں سے ہندوستان کے خلاف حفاظت کی جو گارنٹی طلب کر رہے ہیں اور جس کے حصول کے بعد ہی وہ شملہ معاہدہ کے ماتحت ہندوستان سے گفت و شنید کا سلسلہ شروع کر سکتے ہیں اُس کا یہی مطلب ہے۔ لیکن سوچنے کا یہ طریقہ وہ ہے جس سے مسائل سلجھتے نہیں۔ بلکہ اور اُلجھتے چلے جاتے ہیں اس کے برخلاف سوچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اگر ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات دوستانہ ہو گئے ——— اور یہ کہیں بعید بات نہیں تاریخ میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں ——— تو

ہندوستان کی اٹمی طاقت پاکستان کے خلاف استعمال ہونے کے بجائے ۔ ضرورت کے وقت خود پاکستان کے مفاد اور اُس کی منفعت کے لئے استعمال ہو سکتی ہے ۔ آج افریقہ اور ایشیا کے ممالک کے لئے سب سے اہم مسئلہ علاقائی سالمیت (REGIONAL SECURITY) کا ہے، یہ مقصد اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ ان علاقوں کی مملکتیں اپنے اختلافات کو ختم کر کے ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوں اپنے پر اور اپنے ہمسایہ ممالک پر اعتماد کریں، بڑی طاقتوں کی طرف التجا اور التماس کی آنکھوں سے دیکھنا اور ان کی بساطِ سیاست کا مہرہ بننا ترک کر دیں ، اور آپس میں تجارتی ۔ صنعتی و حرفتی، سائنٹفک اور ٹکنالوجیکل اشتراک و تعاون کی رفتار کو تیز تر کر دیں، ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کے لئے سالمیت اور بقاء حیات کا یہی وہ راز ہے جس کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش پاکستان اور ہندوستان دونوں کو کرنی چاہئے ۔

اصلاح جلد نمبر

برہان دہلی

جنوری ۱۹۷۴ء سے شروع ہونے والی جلد نمبر ۷۲ ہے ۔ غلطی سے مارچ اپریل اور مئی ۷۴ء کے شمارہ ۳ ۔ ۴ ۔ ۵ میں جلد نمبر ۷۳ طبع ہوگئی ہے ۔ قارئین کرام ان تینوں شماروں کی جلد نمبر ۷۳ کو ۷۲ بنالیں ۔

معذرت خواہ
مینیجر برہان دہلی

عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا اور اُن کے مآخذ پر ایک نظر

سعید احمد اکبر آبادی

(۱)

اگرچہ مقالہ کا موضوع بحث غزوات و سرایا ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری پیغمبرانہ زندگی شروع سے آخر تک اس طرح مربوط و مسلسل ہے کہ اس کے کسی جزو کو دوسرے اجزاء سے الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا اور اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، اس کی نوعیت، مکہ کی زندگی اور پھر ہجرت کا تذکرہ مختصراً کر دیا جائے۔

یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ مغربی مصنفین[۱] جنھوں نے اسلام اور سیرتِ

---

[۱] ان میں وہ مستشرقین شامل نہیں ہیں جنھوں نے اسلام یا حضور کی سیرت پر کتابیں لکھی ہی نہیں اسلام کے خلاف سخت معاندانہ پروپیگنڈہ کرنے کی غرض سے اور اس لئے واقعات کو توڑ موڑ کر اور اصل حقائق کو مسخ کرکے انھوں نے اپنی خباثتِ نفسی اور دناءتِ طبع کا سخت المناک مظاہرہ کیا ہے، ان لوگوں کی پروفیسر گب، پروفیسر آربری اور ہمارے زمانے کے فاضل مستشرق پروفیسر منٹگمری نے بھی سخت مذمت کی ہے۔

مقدسہ پر علمی اور تحقیقی انداز پر کتابیں لکھی ہیں۔ اور لب و لہجہ سنجیدہ اور متین رکھا ہے چونکہ ان کا ذہن نبوت اور رسالت کے تصور سے خالی ہے۔ اس بنا پر انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا جائزہ ایک عظیم انسان، ایک عظیم مفکر اور ایک عظیم رفارمر اور مقنن کی حیثیت سے لیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غزوات و سرایا کا رشتہ بھی حضور کی اس حیثیت کے ساتھ جوڑ کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے۔ کہ آپ نہایت بلند حوصلہ اور صاحب عزم انسان تھے۔ فاتح اور سیاست کے ماہر تھے۔ جنگ کے طریقوں سے خوب واقف تھے یہ سب چیزیں اپنی جگہ کیسی ہی درست ہوں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ حیثیت کو نظر انداز کر جانے کے باعث یہ حضرات ان غزوات و سرایا کے ان پہلوؤں اور سیرتِ نبوی کے ان گوشوں سے قصداً یا بلا قصد کے اغماض کر جاتے ہیں۔ جن سے ان غزوات کی اصل حیثیت و نوعیت متعین ہوتی ہے۔ اور جو ایک پیغمبر اور فاتح و کشور کشا کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتے ہیں۔ غور کیجئے کہ بدر کا معرکۂ کارزار بپا ہے۔ ایک طرف عرب کے بہترین جنگ آزماؤں کی فوج گران نوسو کی تعداد میں سازو سامان سے آراستہ اور مکمل طور پر ہتھیار بند ہے اور دوسری طرف صرف تین سو تیرہ انسانوں کا ایک دستہ ہے۔ جس کے پاس نہ پورے ہتھیار ہیں اور نہ ضروری سازو سامان۔ جنگ اپنے شباب پر ہے دونوں طرف سے تلواریں چل رہی ہیں اور نیزے لپک رہے ہیں۔ لاشیں تڑپ تڑپ کر گر رہی ہیں۔ زخمی بدن سے خون کے فوارے ابل رہے ہیں۔ لیکن اسی عالم کرب و اضطراب میں اسی بے سرو سامان فوج کا قائدِ اعظم بارگاہِ خداوندی میں خشوع و خضوع کا پیکرِ مجسم بنا سربسجود ہے اور اپنے مالک و آقا سے کہہ رہا ہے: اے خدا! اگر آج یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر قیامت تک تیری بندگی کرنیوالا کوئی نہ ہوگا۔ اسی عالم میں وہ آسمان کی طرف دیکھتا اور ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے: اے خدا! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اُسے آج پورا کر۔ کوئی بتائے کہ

امید وبیم کے اس نازک ترین موقع پر یہ کیرکٹر بجز ایک پیغمبر برحق کے اور کس کا ہوسکتا ہے۔ علاوہ ازیں اسی غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت حذیفۂ اور حضرت ابوحسیل دو صحابی کہیں سے آرہے تھے کہ راستہ میں قریش نے روکا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کو جا رہے ہو۔ انھوں نے انکار کیا اور عدم شرکت کا وعدہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر پورا واقعہ سنایا اور جنگ میں شرکت کی اجازت طلب کی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم ہر حالت میں وعدہ پورا کریں گے اور ہمیں صرف خدا کی مدد درکار ہےلہ۔ سوچنا چاہئے کہ سخت بے سروسامانی اور قلت تعداد کے باوجود اعلیٰ اخلاق کی یہ پاسداری اور خدا کی مدد پر یہ بھروسہ اور یقین کیا دنیا کے کسی بڑے سے بڑے فاتح میں بھی پائے جاتے ہیں؟ ہرگز نہیں ہ

بہرحال غزوات وسرایا کے یہی اسرار ورموز باطنی اور روحانی ہیں جو مغربی مصنفین اور ان کے متبعین سے ان کے علم وتحقیق کے باوجود مخفی رہ جاتے ہیں۔ اور اسی بنا پر اس کوتاہ نظری پر غزوات وسرایا سے متعلق تحقیق وتفتیش کی جو عمارت قائم ہوتی ہے وہ غزوات کی صحیح عکاسی کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ غزوات پر گفتگو کرنے سے پہلے صاحبِ غزوات (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت و رسالت اور غزوات کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے تک کے حالات کا مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

نبوت کسبی اور اختیاری منصب نہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعاتِ زندگی اور سیرت کے لئے قرآن مجید سے بڑھ کر مستند اور اعلیٰ واشرف مآخذ اور کیا ہوسکتا ہے! نبوت سے پہلے کے آپ کے واقعات

لہ۔ صحیح مسلم بحوالہ سیرت النبی جلد اول ص ۲۹۷۔

حالات جو قرآن مجید میں مذکور ہیں ان سے چند مگر نہایت اہم یہ باتیں ۔

(۱) ۔ آپ یتیم پیدا ہوئے تھے[1]

(۲) ۔ آپ کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد یہ حالت بہتر ہو گئی تھی ۔[2]

(۳) ۔ آپ امی تھے ۔ نہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ دین اور ایمان کیا چیز ہے ۔

(۴) ۔ آپ تلاشِ حق میں سرگرداں اور حیران و پریشاں تھے تو اللہ نے آپ کو سیدھا راستہ دکھایا یعنی پیغمبری عطا فرما دی[3]

اِن آیات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ رسالت و نبوت کا کوئی تصور تھا نہ یہ آپ کا معاذاللہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ اور پروگرام تھا۔ نہ آپ اس منصب کے لئے تیاریاں کر رہے تھے ۔ بلکہ یہ منصب اچانک اور آپ کی کسی توقع ، امید یا انتظار کے بغیر آپ کو سپرد کیا گیا ۔ چنانچہ صحیح بخاری کے شروع میں ہی باب بدء الوحی کے زیرِ عنوان جو طویل روایت مذکور ہے اس کا مضمون بھی یہی ہے کہ غارِ حرا میں آپ کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا تھا آپ خود اس کی کوئی توجیہ نہیں کر سکے تھے ۔ اور ایک غیر معمولی صورتِ حال کے پیش آجانے کے باعث آپ پر لرزہ طاری ہو گیا تھا ۔ لیکن حضرت خدیجہؓ کی فراست اور اعلیٰ اقدارِ حیات پر جزم ولیقین نے اس کی ایک جھلک دیکھ لی اور ورقہ ابن نوفل سے گفتگو کے بعد اس کی تصدیق ہو گئی ۔

نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک ایک

---

[1] ۔ سورۃ والضحیٰ ۔ [2] ایضاً [3] ۔ ایضاً

قول اور عمل کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے مسئول اور جواب دہ تھے۔ اور اب آپ کا جو قدم اٹھتا تھا اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اور اس کی نگرانی میں اٹھتا تھا۔ اپنی رسالت کا اعلان فرمایا تو شروع میں (کم و بیش ایک برس کے اندر) بادن حضرات مسلمان ہوئے لیکن ان میں سے اکثر کی عمر اس وقت بیس برس سے کم تھی اور ان کے خاندان کے بڑے بوڑھے سب کفر و شرک پر قائم تھے۔ نوجوانوں کے علاوہ کچھ غریب غربار تھے۔ اور کچھ غلام تھے۔ توحید کی دعوت نے مکّہ کے لوگوں میں آگ تو لگا ہی دی تھی۔ یہ مسلمانوں کی سب سے پہلی جماعت ان کے غیظ و غضب کا نشانہ بن گئی۔ جو غریب غربار یا نادری غلام تھے ان کا کوئی سہارا یا مددگار نہیں تھا۔ اس لئے ظلم و ستم اور جبر و تعدی کا منہ سب سے زیادہ انہیں کو دیکھنا پڑتا تھا۔ اس بنا پر دعوت اسلام شروع میں عام اور برملا نہیں بلکہ پوشیدہ تھی اسلام قبول کرنے والوں میں ارقم بن الارقم بارہویں نمبر پر تھے۔ ان کا مکان صفا کے دامن میں تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ سب حضرات انھیں کے گھر میں جمع ہوتے اور باہم مشورہ اور مذاکرہ کرتے تھے۔ یہ دعوتِ اسلام کا بالکل ابتدائی دور ہے۔ اس کی مدت تین برس ہے۔

دعوتِ اسلام کا دوسرا دور اس حالت پر کم و بیش تین برس گذرے تھے کہ اب دعوت کے عام اور علانیہ کر دینے کا فرمانِ الٰہی صادر ہوا۔ ارشاد ہوا۔

فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین وانذر عشیرتک الاقربین

آپ کو اب جو جو احکام ملتے رہیں انھیں کھل کر بیان کیجئے اور مشرکین کی پرواہ نہ کیجئے اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو خدا کا خوف دلائیے

اس حکم کی تعمیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ عام اور برملا

کر دی اور اس کا آغاز اس طرح کیا کہ مکہ کی آبادی کے باہر سب اہلِ قریش کو ایک جگہ جمع کیا ۔ اور ان کے سامنے پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ توحید اور بت پرستی کی مذمت بیان فرمادی ۔ اسی طرح رشتہ داروں کو جمع فرمایا اور ان کو ایمان و عملِ صالح کی دعوت دی ۔ اس دعوتِ عام دبر ملا کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے دلوں میں اندر ہی اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور دشمنی کی جو آگ سلگ رہی تھی ۔ اب وہ کوہِ آتش فشاں بن کر یک بیک پھٹ پڑی ۔ اسلام کی تاریخ کا پہلا دن تھا جب کہ دینِ قیم کے مقابلہ پر باطل نے اپنی جمعیت کی صف آرائی کا اعلان کر دیا ۔ اور ہمیں کہنا چاہیئے کہ اب سے دس برس کے بعد جن غزوات کا سلسلہ شروع ہوا ان کا طبلِ جنگ درحقیقت اسی وقت بج گیا تھا

ایک اہم نکتہ اس موقعہ پر خاص طور سے یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اگر عام حالات ہوتے تو اسباب ظاہری کے پیشِ نظر قریش کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں سے عہدہ برآ ہونا چنداں مشکل نہیں تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ اس زمانے میں قبائلی زندگی کے جن آداب وضوابط میں جکڑے ہوئے تھے ان کی وجہ سے قریش کے لئے من مانی کرنا آسان نہیں تھا ۔ ابوطالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم اور حضرت خدیجہؓ آپ کی زوجۂ محترمہ تھیں اور یہ دونوں قریش کی برادری کے نہایت اہم اور معزز رکن تھے ۔ اس لئے جب تک حضور کو ان دونوں کی حمایت اور حفاظت حاصل تھی یہ لوگ حضور کو قتل نہیں کر سکتے تھے ۔ اس بنا پر اب قریش نے باہم مشورہ کے لیے متعدد اجتماعات منعقد کئے اور ہر مرتبہ کوشش کی کہ ابوطالب حضور کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں مگر ایسا نہ ہوا تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ستانے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کئے ۔ آپ کو ساحر اور کاہن مشہور کیا ۔ اپنے

اور دوسرے قبیلوں کے لوگوں کو آپ کے پاس جانے سے روکا آپ کے غریب ترین ساتھیوں کو سخت ترین جسمانی اذیتیں پہنچائیں ۔ چچا ابوطالب نے جب یہ دیکھا تو اپنی قوم کو حضور کی حمایت کی دعوت دی بنی عبدالمطلب ، بنی ہاشم ، اور بنی عبد مناف ان سب نے ابولہب کو مستثنیٰ کرکے اس دعوت کو قبول کیا ۔

ہجرت حبشہ اِن قبائل کی حمایت کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی تحفظ تو سر دست ہوگیا لیکن اور اذیتوں میں کمی نہیں ہوئی اور ادھر صحابۂ کرام کے لئے روز بروز زندگی دشوار ہوتی جارہی تھی ۔ اس لئے آپ نے اِن حضرات کو حبشہ کی ہجرت کا مشورہ دیا یہ ہجرت دو مرتبہ ہوئی ہے ۔ اولاً بارہ مرد اور چار عورتیں نبوت کے پانچویں برس ماہ رجب میں حبشہ گئے ۔ انھوں نے وہاں دو مہینے قیام کیا تھا کہ انھیں معلوم ہوا کہ اسلام مکہ میں پھیلنے لگا ہے ۔ یہ سن کر مہاجرین واپس آگئے ۔ لیکن مکہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی اور قریش اسلام کی عداوت اور دشمنی میں پہلے سے بھی زیادہ سخت ہوگئے ہیں ۔ اس لئے تھوڑے دنوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دوبارہ حبشہ جانے کا مشورہ دیا ۔ چنانچہ پہلے حضرت جعفر ابن ابی طالب اور پھر دوسرے مسلمان یکے بعد دیگرے روانہ ہوئے ۔ بعض حضرات اپنے متعلقین کے ساتھ تھے ۔ اور بعض تنہا ۔ اب جو مسلمان وہاں پناہ گزین تھے ، عام اور مشہور روایت کے مطابق ان کی تعداد تراسی یا چوراسی بیان کی جاتی ہے ۔

قریش نے مہاجرین کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا ۔ دو آدمیوں کا وفد بھیج کر کوشش کی کہ شاہِ حبشہ مہاجرین کو اپنے ملک سے نکال دے ۔ لیکن اس مشن میں ان کو ناکامیابی ہوئی اور شاہ نے مہاجرین کے نمائندہ حضرات سے گفتگو کے بعد ان مسلمانوں کو مکہ واپس کرنے سے انکار کردیا

شعب ابی طالب اس مایوسی اور ناکامی نے قریش کی جلتی پر تیل کا کام کیا اُدھر حضرت عمرؓ مسلمان ہو چکے تھے۔ جس کے باعث مسلمانوں کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اور وہ علانیہ عبادت کرنے لگے تھے۔ اس صورتِ حال پر قریش قابو سے باہر ہو گئے۔ اور اب ان لوگوں نے ایک تحریری معاہدہ کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثاروں کا سوشل بائیکاٹ کرنے کا اعلان کر دیا عہدنامہ جو خانہ کعبہ پر آویزاں کیا گیا تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ بنو ہاشم اور بنو المطلب کی لڑکیوں کے ساتھ نہ کوئی عقد کرے گا اور نہ ان کو اپنی لڑکی دیگا۔ ان سے نہ کوئی چیز خریدی جائے گی۔ اور نہ کوئی چیز ان کے ہاتھ فروخت ہو گی۔ جناب ابوطالب کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ مذکورہ بالا دونوں خاندانوں کے لوگوں کو مع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لے کر شعب ابی طالب میں چلے گئے جو مکّہ کے پہاڑوں میں ایک درّہ اور بنو ہاشم کا موروثی مِلک تھا۔ یہ واقعہ نبوت کے ساتویں برس ماہ محرم کا ہے۔

اس موقعہ پر دو باتیں خاص طور پر یاد رکھنے کی ہیں جو عام سیرت نگاروں سے نظر انداز ہو گئی ہیں۔ (۱)۔ ایک یہ کہ قریش نے بنو ہاشم اور بنو المطلب کے مقاطعہ کا جو عہدنامہ لکھا تھا عام مورخین سیرت اور اربابِ روایت کے مطابق اس کے الفاظ وہی ہیں جو ہم نے اوپر لکھے ہیں۔ البتہ مولانا شبلی نے (سیرت النبی ج ۱ ص ۲۴۵) ان الفاظ پر "جب تک وہ (بنو ہاشم) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کے لئے حوالہ نہ کریں گے"، کا اضافہ کیا ہے، لیکن اس اضافہ کی نسبت مولانا حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ یہ الفاظ صرف مواہب لدنیہ میں مذکور ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بعینہٖ یہی الفاظ حافظ ابن عبدالبر کی کتاب "الدرر فی اختصار المغازی والسیر" میں بھی موجود ہیں۔

۱؎ ص ۵۷، ۶۰ - مولانا شبلی نے "صرف مواہب لدنیہ" اس لئے لکھا ہے

(باقی صفحہ ۳۷۵ پر)

علمار کا اتفاق ہے کہ سیرت مقدسہ میں سب سے زیادہ مستند اور معتمد علیہ وہ کتابیں ہیں جو محدثین نے لکھی ہیں اور حافظ ابن عبدالبر جس پایہ کے محدث ہیں ارباب نظر پر پوشیدہ نہیں۔ پھر مواہب لدنیہ کے مصنف علامہ قسطلانی کے بلند پایہ محدث ہونے میں بھی کلام نہیں۔ وہ صحیح بخاری کے مشہور شارح ہیں۔ ہم نے کتب سیرت کا استقصا نہیں کیا۔ ورنہ ممکن ہے کہ یہ الفاظ اور بعض کتابوں میں بھی موجود ہوں بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ اب اسلام کی ترقی اور اشاعت اور اپنی تمام کوششوں کی ناکامی و نامرادی نے قریش کو اس درجہ بوکھلا دیا تھا کہ وہ حضور کی جان کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اور اس کے علاوہ ان کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس کی تائید بعض اور روایات سے بھی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں بنو ہاشم اور بنی المطلب ان سب کا عام مقاطعہ اور جناب ابو طالب کا اس پر یہ اہتمام کہ سب کو لے کر شعب ابی طالب میں چلے گئے۔ یہ بھی اس بات کی صاف دلیل ہے کہ معاملہ انتہائی نازک اور سنگین تھا۔ یعنی یہ لوگ حضور کے قتل کے درپے تھے۔ اور اب اس سے کم کسی چیز پر وہ راضی نہیں ہو سکتے تھے۔

(۲)۔ دوسری اہم چیز جو اس واقعہ میں لحاظ کے قابل ہے یہ ہے کہ شعب ابی طالب میں جن لوگوں نے پناہ لی وہ دو ایک آدمیوں کو مستثنیٰ کر کے بنو ہاشم اور بنو المطلب کے سب لوگ تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ اور وہ بھی تھے جنھوں نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ پہلا طبقہ تو اپنے دین کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۴) کہ حافظ ابن عبدالبر کی کتاب اُن کے زمانہ میں طبع نہیں ہوئی تھی اور اُس کا مخطوطہ اُن کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ یہ کتاب ڈاکٹر شوقی ضیف کی تصحیح و تعلیق سے ابھی ۱۹۶۶ء میں قاہرہ میں طبع ہوئی ہے۔

لئے یہ سب آفات و شدائد برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا تھا۔ لیکن دوسرے طبقے کے لئے باعث اور محرک کیا تھا جس کی وجہ سے وہ سب سختیاں انگیز کررہے تھے؟ عام خیال یہ ہے کہ اس کا سبب قبائلی حمیّت تھا۔ ہمیں اس سے انکار نہیں لیکن ذرا گہرائی میں جائیے تو معلوم ہوگا کہ اس کا ایک بڑا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی جاذبیت اور کشش اور اس کے ساتھ ہی حضور کے کردار اور عمل اور آپ کی بے لوث و بے غرض زندگی کا اثر بھی تھا۔ اگرچہ اب تک ان لوگوں نے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کیا تھا لیکن ان کے دل بے شبہ متاثر تھے۔ ابوطالب نے موت کے وقت جن احساسات کا اظہار کیا تھا۔ ہمارے نزدیک کم وبیش اس وقت یہی احساسات ان سب لوگوں کے تھے۔

شعب ابی طالب میں ان سب لوگوں کا قیام جن میں بچے بھی تھے اور عورتیں بھی تین برس کے قریب رہا۔ اس مدت میں وہ کونسی تکلیف تھی جو انھوں نے نہیں اٹھائی۔ اور وہ کونسی سختی اور اذیت تھی جو انھوں نے برداشت نہیں کی۔ لیکن کیا مجال کہ ان کے پائے صبرواستقلال میں کوئی لرزش پیدا ہوئی ہو۔ مظلومیت کا کمال یہ ہے کہ خود ظالم کو رحم آجائے۔ آخر دشمنوں میں چند لوگوں نے عہدنامہ منسوخ کردینے کی تحریک کی۔ اور بڑی ردوکد اور بحث وگفتگو کے بعد ایک شخص مطعم بن عدی نے سبقت کی اور عہدنامہ کو چاک کردیا۔ پھر ایک روایت کے مطابق یہی مطعم چند اور سرداران قریش کے ساتھ ہتھیار بند ہوکر شعب ابی طالب پہونچے اور محصورین کو وہاں سے نکال لائے۔

عام الحزن

اب بنوہاشم اور بنو المطلب کو ان آلام و تکالیف سے تو نجات مل گئی جس میں اب تک مقاطعہ کے باعث وہ مبتلا رہے تھے۔ لیکن اسی برس یعنی سنہ ۱۰ نبوی میں ایک طرف ابوطالب اور دوسری جانب حضرت خدیجہ

کا چند مہینوں کے فصل سے آگے پیچھے انتقال ہوگیا۔ نظر بہ اسباب ظاہری یہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موجودہ صبر آزما حالات میں بہت بڑا سہارا تھے۔ اور یوں بھی ابوطالب نے جس محبت و شفقت کے ساتھ بچپن میں آپ کی پرورش کی اور عہد شباب میں آپ کے ساتھ ہر قسم کی خیراندیشی اور خیر سگالی کا معاملہ کیا اور نبوت کے بعد دشمنوں کے مقابلہ میں ہر وقت وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دل وجان سے سینہ سپر رہے ان سب وجوہ کی بنار پر وہ کہنے کو چچا تھے لیکن درحقیقت باپ سے کم نہیں تھے۔ رہیں حضرت خدیجہؓ! تو انہوں نے حضور کے ساتھ جس غیر معمولی محبت، ہمدردی و غم گساری اور امداد و اعانت کا معاملہ کیا تھا اس کی اہمیت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید میں حضور کو مخاطب کر کے ووجدک عائلاً فاغنیٰ فرماکر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے اس پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ اس بنار پر ان دونوں کی بیک وقت جدائی کا جو غم اور رنج و ملال ہوسکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ حضور نے اس سال کو عام الحزن یعنی غم کا سال فرمایا۔

لیکن جو دنیا کا غم کھانے اور ان کا دکھ درد دور کرنے کیلئے
آیا تھا اُسے اپنے فرائضِ منصبی کے ادا کرنے میں اپنے ذاتی
رنج وغم کی کیا پرواہ ہوسکتی تھی۔ آپ نے اپنا کام جاری رکھا اور اس کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تیز ہوگئی۔

طائف کا سفر قریش کی ایذارسانی اور تبلیغ واشاعتِ اسلام کی راہ میں رکاوٹوں اور دشواریوں میں روز بروز شدت پیدا ہوتی جاتی تھی۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے باہر دوسرے قبیلوں کو دعوتِ اسلام دینے کا خیال فرمایا۔ مکہ مکرمہ سے پچاس[1] میل کے فاصلہ پر

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

طائف تھا۔ یہ نہایت سرسبز و شاداب مقام تھا۔ آب و ہوا بہت عمدہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموؤں کا خاندان عبد یالیل یہیں آباد تھا۔ اس لئے حضور نے اپنے خادم خاص حضرت زید بن حارثہ کے ساتھ اس مقام کا رُخ کیا لیکن یہاں کے رؤسا اور امرا آپ کے ساتھ نہایت گستاخی اور بدتمیزی سے پیش آئے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ آبادی کے چند چھوکروں اور لڑکوں کو آپ کے خلاف ورغلا دیا۔ یہ لوگ دورویہ صف بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اور جب حضور ان کے درمیان میں سے گزرے تو انھوں نے اتنی سخت سنگباری کی کہ آپ کے دونوں پاؤں سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے۔ اس عالم میں آپ ایک باغ میں پہنچکر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ لیکن یہاں ربیعہ کے دو لڑکے عتبہ اور شیبہ پہلے سے موجود تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی دشمنی اور اسلام

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) ڈاکٹر حمید اللہ نے "عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ" میں صفحہ ۱۰ پر یہی فاصلہ لکھا ہے لیکن ڈاکٹر جواد علی نے تاریخ العرب قبل الاسلام - ج ۴ - ص ۲۰۹ پر ۷۵ میل لکھے ہیں۔ ممکن ہے اِن دونوں میلوں میں وہی فرق ہو جو آج کل میل اور کیلومیٹر میں ہوتا ہے۔ بہرحال طائف مکہ سے جنوب مشرق میں سطح مرتفع پر قائم ہے۔ اور اس زمانہ میں اور اب بھی یہ مکہ کا شملہ ہے یعنی اہل مکہ گرمیوں کا موسم یہیں گزارتے ہیں۔ قرآن مجید میں "القریتین" کا جو لفظ آیا ہے بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مکہ کے ساتھ دوسرا قریہ طائف ہی مراد ہے اسلام کے ظہور کے وقت اس جگہ کے باشندوں کی غالب اکثریت قبیلۂ ثقیف کی طرف منسوب تھی۔ اس قبیلہ کے زعماء نے حضور کے ساتھ یہ سخت ظالمانہ اور بیرحمی کا برتاؤ کیا تھا۔ بنوامیہ کا مشہور سفاک اور ظالم حجاج اسی قبیلہ کا ایک فرد تھا۔

کے خلاف شدید نفرت کا علم تھا۔ انھوں نے آپ کی شان میں نہایت گستاخانہ الفاظ کہے تو آپ یہاں سے بھی اٹھکر واپس ہو گئے۔

جوار عرب میں باقاعدہ حکومت کا رواج تو تھا نہیں، قبائلی نظام قائم تھا اس بنا پر اگر کسی شخص کو جان و مال کی حفاظت (Protection) درکار ہوتی تھی تو اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو کسی قبیلہ کے سربراہ اور سردار کی پناہ میں دے دیتا تھا۔ اور عربی میں اس کو ہی جوار کہتے تھے۔ جب تک ابوطالب زندہ رہے حضور ان کی پناہ میں رہے۔ ابوطالب کے انتقال کے بعد خاندان کا بزرگ اور آپ کا چچا ابولہب تھا۔ لیکن یہ پہلے سے ہی آپ کا جانی دشمن تھا۔ چنانچہ ابوطالب اور بنو ہاشم کے ساتھ شعب ابی طالب میں بھی نہیں گیا تھا اور اب حضور کی حفاظت سے دست بردار ہو گیا تھا۔ اس بنا پر مکہ میں رہنے کے لئے حضور کو جوار کی ضرورت تھی۔ ابن اسحاق کا بیان ہے جسے حافظ ابن عبدالبر (الدرر ص ۶۵) نے نقل کیا ہے۔ کہ "ان برسوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو مختلف قبیلوں کے سامنے پیش فرماتے اور ان سے جوار کی درخواست کرتے تھے لیکن ان میں کوئی اس پر رضامند نہیں ہوا۔ اور ہر ایک نے یہی جواب دیا کہ وکیف یصلحنا من افسد قومہ یعنی جس شخص نے اپنی ہی قوم میں فساد پیدا کر دیا وہ ہماری اصلاح کیونکر کریگا۔ آخر حضور طائف سے واپسی میں جب حرا تشریف لائے اور یہاں عرب کے ایک سردار مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف سے بھی درخواست کی تو مطعم فوراً اس کے لئے تیار ہو گئے۔ بیٹوں کو بلا کر حکم دیا کہ ہتھیار بند ہو کر حرم میں جاؤ اور اب وہ خود اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ آیا اور حرم کے پاس کھڑے ہو کر باواز بلند کہا کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس واقعہ کو

نقل کرنے کے بعد اپنے قیاس سے لکھا ہے "مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس پناہ دہی کے معاوضہ میں یہ اقرار کرنا پڑا کہ شہر میں تبلیغی تقریریں نہیں کی جائیں گی۔ (عہد نبوی کا میدانِ جنگ ص ۱۲) ڈاکٹر صاحب نے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا اور نہ اس طرح کی کوئی شرط کسی کتاب میں ہماری نظر سے گذری ہے۔ اس لئے اگر یہ فقط ڈاکٹر صاحب کا قیاس ہے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ درست نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ مطعم بن عدی کی پناہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ میں تبلیغی سرگرمی کا سراغ نہیں ملتا لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ آپ نے جوار کی شرط کے ماتحت اپنے اوپر مکہ میں تبلیغ نہ کرنے کی پابندی عائد کرلی تھی بلکہ اس کے وجوہ حسب ذیل تھے۔

(۱)۔ آپ اہل مکہ کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اور ان کو ختم اللہ علی قلوبھم ---- کا مصداق سمجھتے تھے۔

(۲)۔ مطعم بن عدی آپ کا محسن تھا جس نے اس درجہ سخت صبر آزما حالات میں پناہ دی تھی۔ اس بنا پر آپ کے حسنِ اخلاق اور احسان شناسی کا تقاضہ تھا کہ آپ مکہ میں تبلیغی سرگرمی کو جاری رکھکر مطعم کو کسی شدید ابتلا میں گرفتار نہ ہونے دیں[1]۔

قبائل کا دورہ

ان وجوہ کی بنا پر اب آپ کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا کہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لیے نئے

---

[1] مطعم نے حضور کو صرف پناہ نہیں دی بلکہ جیسا کہ روایات میں ہے اس کا بھی اہتمام کیا کہ مطعم خود اور اسکی اولاد حرم میں مسلح رہتی تھی اور آپ ان لوگوں کی حفاظت میں حرم میں نماز پڑھتے تھے یہی وجہ تھی کہ اگرچہ مطعم مسلمان نہیں ہوا تھا لیکن جب اس کا انتقال ہوا تو حضرت حسان بن ثابت نے اسکا مرثیہ لکھا زرقانی علی المواھب ج ۱۔ ص ۵۱۶۔

گوشے اور نئی جگہیں تلاش کریں چنانچہ آپ نے یہی کیا۔ حج کے زمانے میں سارے عرب کے قبائل آتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقام منا میں ان قبائل سے ملاقات کرتے ان کو اسلام کی حقیقت سمجھاتے اور اسے قبول کر لینے کی دعوت دیتے تھے۔ اور آپ نے ان لوگوں سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ حضور کو اپنے ملک میں لے چلیں تاکہ آپ وہاں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا کام اطمینان سے کرسکیں۔ آپ نے ان کو یہ مژدہ بھی سنایا کہ اگر انھوں نے اسلام کو قبول کر لیا تو وہ جلد ہی پورے عرب کے سردار بلکہ قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے مالک ہوجائیں گے۔ آپ نے اس سلسلہ میں جن قبائل سے گفتگو کی مورخین نے انکی تعداد پندرہ یا سولہ لکھی ہے۔ اس کے علاوہ عکاظ، المجنہ اور ذوالمجاز عرب کے مشہور میلے جو سالانہ لگتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِن میلوں ٹھیلوں میں بھی تشریف لے جاتے اور لوگوں کو اپنی دعوت سے روشناس کرتے تھے لیکن قریش کے سردار اور خصوصًا ابولہب ان مواقعوں پر بھی آپ کا تعاقب کرتے اور قبائل کو کبھی ڈرا دھمکا کر، کبھی حضور کا مذاق اڑا کر، غرض جس طرح بن پڑتا حضور کی دعوت کو قبول کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ اور کسی پر اثر نہیں ہوا۔ اور انھوں نے دعوتِ اسلام رد کردی۔ (باقی)

کچھ المامون کی اوّلیات کے بارے میں

(از شبیر احمد خاں غوری ایم - اے - ایل - ایل - بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش)

(۱)

برہان کی سابقہ اشاعت (مارچ ۱۹۷۸ء) میں جناب مولانا الحاج محمد ابرار حسین صاحب فاروقی گوپامئوی ایم - اے علیگ کا ایک تحقیقی مقالہ بعنوان

"خلیفہ عبد اللہ بن المعتز عباسی شہید"

شائع ہوا ہے - مولانا اسلامی تاریخ (اسلامک ہسٹری) بالخصوص مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کے ایک جانے اور مانے ہوئے ماہر ہیں اور یہ تحقیق اُنھیں کے قلم سے کما حقہٗ ادا ہو سکتی تھی -

ابن المعتز کی امن پسندی، سنجیدہ مزاجی اور حلم و عفو کے علاوہ مولانا نے اُس کے علمی مقام کو بھی متعین کیا ہے - ابن المعتز کی سخن وری اور سخن سنجی تاریخ ادبِ عربی کا ایک مسلم واقعہ ہے - مولانا نے اس کی مزید توضیح کے لئے اُس کا خلیفہ مامون الرشید سے بھی موازنہ کیا ہے اور اور اس موازنہ میں بعض "محدثات" کا شرف اوّلیت مامون الرشید کو بخشا ہے - مولانا نے پہلے تو یہ لکھا ہے کہ جب مامون الرشید نے قیصر روم سے قدیم فلسفہ و حکمت کی کتابیں منگائیں تو اُس نے اپنے درباری علماء سے مشورہ کیا - پادریوں نے کہا کہ آپ یہ کتابیں ضرور بھیج دیں کیونکہ انھیں پڑھ کر مسلمان جیسی فعال قوم ناکارہ محض ہو کر رہ جائے گی - اس قصّہ کو نقل کرنے کے بعد مولانا فرماتے ہیں -

"غرض کہ جو کچھ راہبوں نے کہا وہ سب کچھ اسلامی دنیا میں ہوا۔ معتزلہ پیدا ہوئے۔ زندیق پیدا ہوئے۔ نجومی پیدا ہوئے غرض کہ گمراہیوں کے وہ گروہ پیدا ہوتے جنھوں نے دنیائے اسلام میں ایک ہلچل مچادی"

(الف) بظاہر مولانا کے افادات کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ مامون کی تفلسف پسندی کے نتیجے میں :-

(۱) فرقہ معتزلہ پیدا ہوا۔

(۲) زنادقہ پیدا ہوئے۔

(۳) نجومی پیدا ہوئے۔

(۴) دوسرے انقلابی ملاحدہ پیدا ہوئے

غالباً ان افادات سے تو اسلام کی فکری تاریخ کے ایک نوآموز مبتدی کو بھی اتفاق کرنے میں تامل ہوگا۔

(ب) لیکن اگر ان افادات کو کسی اور محمل پر محمول کرنا درست ہو تو زیادہ سے زیادہ یہ معنیٰ مستنبط کئے جاسکتے ہیں کہ الحاد و بے راہ روی کی تحریک میں خلیفہ مامون الرشید کی تفلسف پسندی اور فلسفہ نوازی کی وجہ سے ایک نیا زور پیدا ہو گیا۔

مگر اس سلسلے میں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دینی و فکری بے راہ روی کی تحریک میں جو اسراع اور زور پیدا ہوا، خلیفہ مامون الرشید اُس کی "علت" تھا یا خود اُس کا "معلول" تھا اور اسلامی سماج میں عرصہ سے جس فکری بے راہ روی کا سیلاب بہتا چلا آرہا تھا اُس کے اندر اُس کی حیثیت ایک بے دست و پا تنکے سے زیادہ نہ تھی جس نے خود کو منہ زور موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہو۔

مامون الرشید کے عقیدت مندوں نے پہلی شق کو اختیار کیا ہے کیوں کہ انھیں اُس کے قریبی حلقوں میں

"الناس علیٰ دین ملوکھم"

کی کارفرمائی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ لیکن اسلامی سماج کے اندر جو زیر سطحی فکری دھارے بہہ رہے تھے، اُن کے مطالعہ سے دوسری شق کی تائید ہوتی ہے۔

مگر ان دونوں نظریوں پر محاکمہ سے پہلے مولانا کے افادات سے جو ظاہری معنی مستنبط ہوتے ہیں، اُن پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا۔ یہ بات اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ ان افادات کو دوسرے محمل پر محمول کر کے جو معانی مستنبط ہو سکتے ہیں، اُن کی دونوں شقوں کی تفصیل اسی تمہید کا تتمہ ہے جو (الف) کا مقتضا ہے۔

اسلام میں فکری بے راہ روی کا آغاز

اعتزال ہو یا نجوم، الحاد ہو یا زندقہ، اسلامی سماج کے لئے یہ سب چیزیں بہت کچھ یونانی فلسفہ کی دین ہیں۔ مامون الرشید ۱۷۰ھ میں پیدا ہوا تھا اور فلسفہ اس سے کہیں پہلے اسلامی فکر میں داخل ہونا شروع ہو گیا تھا، نیز اُس نے موخر الذکر کو بڑی شدت سے متاثر کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔

مامون سے پہلے فلسفہ

عام طور سے اسلامی فکر میں یونانی فلسفہ و حکمت کا داخلہ یا اس علم کی کتابوں کے ترجمہ کا آغاز مامون الرشید کے عہدِ حکومت میں بتایا جاتا ہے۔ زیادہ محتاط محققین اسے عباسی خلافت کے آغاز (بالخصوص دوسرے عباسی خلیفہ) (ابو جعفر منصور) کے زمانہ سے شروع کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ کے ساتھ اسلامی سماج کا انہماک عباسیوں سے کہیں پہلے (بالخصوص اموی دور ہی) سے شروع ہو گیا تھا۔

اسلام اور حکمت پسندی کی تعلیم | حصول علم و حکمت کی تڑپ شروع ہی سے اسلام کے مزاج میں مضمر رہی ہے۔ اُس کے "نظام اقدار" میں حکمت کو "خیر اعلیٰ" (خیراً کثیراً) قرار

دیا گیا ہے جیسا کہ قرآن کریم کہتا ہے۔

ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیرا۔

[اور جس کو حکمت ملی اُسے خیر کثیر ملی]

چنانچہ قرآن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف کسی باجبروت شاہنشاہ کی حیثیت سے نہیں کراتا، بلکہ "معلم کتاب وحکمت" کی حیثیت سے کراتا ہے اور اس "معلم کتاب وحکمت" کی بعثت کو اُمت مسلمہ پر خدائے کریم کا احسان عظیم بتاتا ہے:۔

"لقد منّ اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین

اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ اُن میں اُنھیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا ہے جو اُنھیں خدائے تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور حکمت سکھاتے اور پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے

اسی کا نتیجہ تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا جہان کی نعمتوں میں سے خصوصیت کے ساتھ صرف حکمت ہی کے حصول کی ترغیب دی اور اسے مرد مومن کی متاع گم گشتہ قرار دیا جسے جہاں بھی وہ ملے اُسے اس کے لے لینے کا مستحق بتایا کہ

"کلمة الحکمة ضالة المؤمن اینما وجدھا فھو احق بھا"

اسلام کی ان بنیادی تعلیمات نے اسلامی سماج میں علم وحکمت کی ایک نہ بجھنے والی پیاس پیدا کردی اور اس بے پایاں تشنگی کا نتیجہ تھا کہ بسا اوقات وہ "آب زلال" اور "مارگدہ" کے امتیاز کی بھی زحمت نہ فرماتے وہ تو صرف "حکمت" کے جویا تھے خواہ نام ہی کی کیوں نہ ہو۔

کچھ اسی قسم کا سابقہ مسلمان فاتحین کو اُن مفتوحہ اقوام کے ساتھ پیش آیا جو اُس گئے گذرے زمانہ میں بھی عہد قدیم کی "حکمت یونانیاں" کے امین سمجھے جاتے تھے۔ لہٰذا جب اُنھیں عیسائی پادریوں سے تبادلہ خیالات کا موقعہ ملا جن کے یہاں اپنی مذہبی تعلیم کے علاوہ یونانی علم وحکمت

کے کچھ مبادی کی تعلیم کا بھی رواج تھا تو موخرالذکر کی دل کشی سے مسحور و متاثر ہوکر نام نہاد علم و عرفان کے اُس سرچشمہ کی جستجو میں لگ گئے جس کا نام یونانی فلسفہ و حکمت ہے۔ چنانچہ ابن خلدون نے لکھا ہے:۔

"ثم جاء الله بالاسلام . . . وابتدأ امرهم بالسذاجة . . . حتى . . . تشوقوا الى الاطلاع على هذه العلوم الحكمية بما سمعوا من الاساقفة والاقسة المعاهدين بعض ذكر فيها وبما تسمو اليه افكار الانسان

پھر اللہ تعالیٰ نے اسلام کو مبعوث فرمایا . . . اسلامی ثقافت کا آغاز بڑی سادگی سے ہوا . . مگر . . . پھر اہلِ اسلام کو علومِ حکمیہ پر واقفیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا کیوں کہ انھوں نے اہلِ ذمہ ساقفہ اور قسیسوں سے اس کا کچھ ذکر سنا تھا جس کی وجہ سے انسانی فکر اس کی طرف راغب ہوگئی۔

خلافت راشدہ کے دور میں تفلسف پسندی

اس قسم کے "اِعجاب" واشتیاق کا قدیم ترین واقعہ جس کا ذکر تاریخ میں محفوظ ہے خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں پیش آیا۔ یہ معاملہ فاتح مصر حضرت عمرو بن عاص کے ساتھ ہوا کیوں کہ جو مقامی علما[1] حضرت عمرو بن عاص کو اس فتح کی مبارک باد دینے آئے اُن میں ابن القفطی نے "یحییٰ النحوی" کو بھی بتایا ہے جس کی حکمت و دانش کی باتوں سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے

"دخل على عمرو وقد عرف موضعه من العلم واعتقاده وما جرى له مع النصارى فاكرمه عمرو ورأى له موضعًا وسمع كلامه فى ابطال التثليث فاعجبه وسمع كلامه ايضًا فى انقضاء الدهر ففتن به وشاهد من حججه المنطقيه وسمع من الفاظه الفلسفيه

وہ فلسفی حضرت عمرو بن عاص کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عمرو بن عاص علم و فضل میں اُس کا مقام جانتے تھے، اُس کے عقائد سے بھی واقف تھے اور عیسائیوں کے ساتھ اُس کا جو معاملہ گزرا تھا، اُس کی بھی اُنھیں اطلاع تھی لہٰذا اُنھوں نے اُس کی بہت زیادہ عزت و تکریم کی اور اُسے

التی لم تکن للعرب بہا أنسہ من حالہ وکان عمرو عاقلاً حسن الاستماع صحیح الفکر فلازمہ وکان لا یکاد یفارقہ "

تقرب سے نوازا اُس نے عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث کا جو رد کیا تھا وہ تقریر سُنی جو اُنھیں بہت اچھی لگی۔ دہر و زمانہ کے انقضاء و انقطاع کے بارے میں اُس کا کلام سنا۔ لہذا وہ اس کے مفتون و شیدا ہو گئے اس کی منطقی دلیلیں اور فلسفیانہ گفتگو کو دیکھا جن سے عرب مانوس نہیں تھے۔ اس سے وہ بہت زیادہ مرعوب ہوئے عمرو بن عاص یوں بھی بڑے عقلمند و دانا تھے دوسروں کی بات کو اچھی طرح سننے والے اور اچھی اور صحیح بات سوچنے والے ہیں اُنھوں نے اُسے اپنے ساتھ رکھ لیا اور اُسے کسی طرح اپنے سے جدا نہ کرتے۔

اگرچہ ابن القفطی نے کسی مجہول الحال فلسفی سے حضرت عمرو بن عاص کی ملاقات کی اہمیت بڑھانے کے لئے اس کا نام "یحیٰی النحوی" بتایا ہے (کیونکہ حقیقی یحیٰی النحوی تو فتح مصر سے کوئی چالیس سال پہلے ہی انتقال کر چکا تھا) مگر اس حکایت سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ یونانی علم و حکمت کے ساتھ مسلمان اکابر کا اعتنا اور اُن کا اُس کے ساتھ "اعجاب" صدر اسلام ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

اموی خلافت کا زمانہ اور یونانی فلسفہ کے ساتھ اعتنا

غرض جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا ہے یونانی فلسفہ و حکمت کے ساتھ مسلمانوں کو ابتدائے اسلام ہی سے اعتناء ہونے لگا تھا مگر اس کی باقاعدہ ابتدار اموی خاندان کے خلیفہ عبدالملک بن مروان (۶۵ - ۸۶ھ) کے عہد حکومت میں ہوئی جب کہ یزید بن معاویہ کے بیٹے خالد نے جو یونانی علم و حکمت کے ساتھ

اپنے رغبت وانہماک کی بنا پر "حکیم آل مروان" کہلاتا تھا، یونانی اور قبطی زبانوں سے کیمیا کے علاوہ نجوم اور طب کی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کرائیں چنانچہ ابن الندیم جس کی تاریخ علوم بالخصوص اسلام میں علوم عقلیہ (یا فلسفہ وحکمت) کے آغاز وارتقا پر بڑی گہری نظر تھی، لکھتا ہے :-

کان خالد بن یزید بن معاویہ یسمی حکیم آل مروان .. خطر بباله الصنعة فامر باحضار جماعة من فلاسفة الیونانیین .... وامرهم بنقل الکتب فی الصنعة من اللسان الیونانی والقبطی الی العربی۔ وهذا اول نقل کان فی الاسلام من لغة الی لغة "

خالد بن یزید بن معاویہ "حکیم آل مروان" کے نام سے مشہور تھا .... اُس کے دل میں کیمیاگری اور ہوس کا خیال آیا۔ لہٰذا اُس نے یونانی فلاسفہ کی ایک جماعت کو حاضر کرنے کا حکم دیا ...... اور اُنھیں حکم دیا کہ یونانی اور قبطی زبانوں سے کیمیا کی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کریں ۔ اور یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کا کام ہوا ۔

اس سے کچھ پہلے ایک رومی طبیب اہرن القس نے بعہدِ مروان سریانی زبان میں یونانی طب کی ایک "کناش" لکھی تھی اور خالد بن یزید کے کچھ ہی بعد ایک دوسرے یہودی طبیب ماسرجویہ نے اس طبی کناش کا کچھ ابواب کے اضافہ کے ساتھ عربی میں ترجمہ کیا۔ پہلی صدی ہجری کے سرے پر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس ترجمہ کو سرکاری کتب خانہ سے نکال کر محض نفع رسانی خلق کے لئے شائع کرایا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز ہی کے زمانہ میں ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ یہ اسکندریہ کے مدرسہ فلسفہ کا جس نے مسیحی تعصب وتنگ نظری کے باوجود کسی نہ کسی طرح اس شہر میں اپنے وجود کو باقی رکھا، اسکندریہ سے انطاکیہ میں منتقل تھا۔ اسلامی سماج کی تشقیت ذہنی پہلے

کا کوئی فوری اثر تو مترتب نہ ہوسکا، لیکن بعد میں یہی منتقلی اس باب میں دور رس نتائج کی حامل ثابت ہوئی، کیوں کہ کوئی ڈیڑھ صدی بعد یہ مدرسہ پہلے انطاکیہ سے حران میں اور اُس کے کوئی نصف صدی بعد حران سے آخر کار سرکاری مخالفت کے باوجود بغداد میں داخل ہوا۔ مگر اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے ۔

عبدالملک بن مروان کے عہدِ حکومت کے ایک اور واقعہ نے اس تحریک کے لئے مزید راہ ہموار کردی ۔ اس سے پہلے مغربی صوبوں کا دیوانِ کتابت رومی زبان میں اور مشرقی صوبوں کا فارسی زبان میں رکھا جاتا تھا ۔ مگر بعض وجوہ سے اس کی زبان عربی کرائی گئی ۔ اس سے فلسفہ وحکمت کے دقیق مسائل کی کماحقہ ادائیگی کے لئے عربی زبان کی صلاحیت متحقق ہوگئی ۔

اس سلسلے میں اہم خدمات مجوسی کتاب نے انجام دیں ۔ یہ لوگ ہمیشہ سے تثقیفِ ذہنی کے لئے حقیقی یا مزعومہ یونانی فلسفہ سے استفادہ کرتے رہے تھے ۔ جب تک دیوانِ کتابت کی زبان پہلوی رہی، وہ ان نام نہاد یونانی فلسفہ کے تراجم پہلوی زبان میں پڑھتے رہے مگر عربی ہوگئی تو ان لوگوں نے انھیں عربی میں ترجمہ کرڈالا چنانچہ ابن الندیم لکھتا ہے :۔

وقد كانت الفرس نقلت في القديم شيئاً من كتب المنطق والطب الى اللغة الفارسية فنقل ذلك الى العربي عبدالله بن المقفع وغيره	قدیم زمانہ میں ایرانیوں نے منطق اور طب کی کچھ کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا ۔ لہٰذا ان فارسی تراجم کا عبداللہ بن المقفع وغیرہ نے عربی میں ترجمہ کیا ۔

اس طرح جو حقیقی یا مزعومہ یونانی فلسفہ کی کتابیں ترجمہ ہوئیں اُنھوں نے دوسری صدی کی اسلامی (بالخصوص کلامی) فکر پر دور رس اثرات ڈالے جیسا کہ شہاب الدین سہروردی مقتول سے ملا صدرا نے "الاسفار الاربعہ" میں نقل کیا ہے :۔

"وقع بايديهم ما نقله جماعة في عهد بني أمية من كتب اساميها يشبه	ان کو کچھ ایسی کتابیں ملیں جن کا بنی اُمیہ کے عہد حکومت میں ایک جماعت نے ایسی کتابوں سے

اسامی الفلاسفة ۔ فظن القوم ان کل اسم یونانی هو اسم فیلسوف فوجد وا فیها کلمات استحسنوها وذهبوا الیها وفرعوها رغبة فی الفلسفة ۔	ترجمہ کیا تھا جن کے نام فلاسفہ کے نام کے مشابہ تھے ۔لہٰذا ان لوگوں نے یہ گمان کیا کہ ہر یونانی نام کسی فلسفی کا نام ہوتا ہے ۔ان کتابوں میں انھیں کچھ ایسے کلمات (ابحاث) ملے جنھیں انھوں نے مستحسن سمجھا ، انھیں اپنا مذہب و موقف بنا لیا اور فلسفہ سے فرطِ رغبت و میلان کی بنا پر اُن ابحاث کی مزید تفریع کی ۔

بدقسمتی سے تاریخ نے اس علمی و فکری سرگرمی کی پوری تفصیل محفوظ نہیں رکھی البتہ ابن الندیم نے اموی عہد کے بعض ادبا رکتاب کی تصانیف کا ضرور ذکر کیا ہے ۔ مگر ان کے عنوانوں سے ان کے موضوع کا پتہ نہیں چل سکتا ۔لیکن ایک کتاب کے متعلق اُس نے تصریح کی ہے کہ یہ ارسطو کے ان خطوط کا مجموعہ تھی جو اُس نے سکندر کو لکھے تھے اس کتاب کا مترجم خلیفہ ہشام بن عبدالملک (۱۰۵ - ۱۲۵ھ) کا کاتب سالم بن العلا رتھا جو مشہور اُموی کاتب عبدالحمید کا خسر یا داماد (ختن) تھا ۔ ابن الندیم کے الفاظ حسب ذیل ہیں :-

" سالم و یکنیٰ ابا العلاء کاتب هشام بن عبد الملك وکان احد الفصحاء وقد نقل من رسائل ارسطاطالیس الی الاسکندر "	سالم جس کی کنیت ابوالعلا رتھی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا کاتب تھا ۔ اپنے زمانہ کے مشہور فصحا رمیں سے تھا ۔ ارسطو نے سکندر کو جو خطوط لکھے تھے اُن کا اُس نے عربی میں ترجمہ کیا ۔

اسی زمانہ میں مزعومہ یونانی الاصل نجوم کا رواج بڑھتا جارہا تھا اور شاید اس فن کی بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں ۔ ان میں ایک کتاب افسانوی دانا تے علوم ہرمس (HERMES) کی طرف منسوب ہے اس کتاب کا ایک نسخہ بقول نلینو آج بھی ملانو کے کتب خانہ میں محفوظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ ۱۲۵ھ میں ہوا تھا ۔

خالص یونانی منطق اور رسمی فلسفہ کی مستند بالخصوص ارسطاطالیسی تصانیف کے ضمن میں کسی کتاب کے ترجمہ کا اموی عہد میں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ لیکن قاضی صاعد اندلسی نے ارسطاطالیسی منطق کے ترجمہ کی ابتداء کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ عباسی عہد سے پہلے ارسطاطالیسی منطق میں سے "قاطیغوریاس" (CATEGORIES) یا شاید فرفوریوس کی "ایساغوجی" کا ترجمہ ہوچکا تھا۔ مزید تفصیل آگے آرہی ہے اس مختصر سے جائزے سے واضح ہوگیا ہوگا کہ یونانی فلسفہ و حکمت کے ساتھ مسلمانوں کا اعتناء عباسیوں سے کہیں پہلے شروع ہوچکا تھا اور امویوں کے عہد میں تو اُس کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ بھی ہوچکا تھا۔

عباسی خلافت کا آغاز اور یونانی فلسفہ کے ساتھ مسلمانوں کا انہماک

۱۳۲ھ میں ایک سیاسی انقلاب رونما ہوا جس کے نتیجہ میں امویوں کا زوال ہوا اور عباسی خاندان برسرِاقتدار آیا۔ بظاہر یہ دو خاندانوں کی کشمکش تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ "عرب کے سوزِ دروں" اور "عجم کے حسنِ طبیعت" کا معرکہ تھا جس میں موخرالذکر کی فتح ہوئی۔ عباسی ایرانیوں کی مدد سے برسرِ اقتدار آتے تھے، لہذا اُنھوں نے اُن کے باب میں نرم تر رویہ اپنایا اور کاروبارِ سلطنت کی تنظیمِ جدید اُنھیں کے مشورے سے کی۔ پہلی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ احیائیت پسند REVIVALISTS عناصر نے اپنے قومی مذہب کے احیاء کے لئے فلسفہ کا سہارا لیا۔ اس طرح زندقہ کی تحریک کو ہوا ملی۔ دوسری پالیسی کے نتیجہ میں اُنھوں نے علم و حکمت بالخصوص فلسفیانہ علوم کے ماہرین کو اپنے تقربِ خصوصی سے نوازا۔

اس "فلسفہ نوازی" یا "حکمت پروری" کا آغاز دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے کیا جیسا کہ قاضی صاعد نے لکھا ہے:-

فکان اول من عنی منھم بالعلوم الخلیفۃ الثانی ابوجعفر المنصور...	خلفاء عباسیہ میں سے پہلا خلیفہ جس نے علوم حکمیہ کے ساتھ اعتناء کیا وہ دوسرا خلیفہ

فکان رحمہ اللہ تعالیٰ مع براعتہ فی الفقہ وتقدمہ فی علم الفلسفۃ ... کلفاً بھا وباھلھا۔	ابو جعفر منصور تھا۔ اللہ اُس پر رحمت نازل فرمائے جہاں اُسے فقہ میں دستگاہ عالی اور فلسفہ میں تقدم و پیشوائی حاصل تھی ..... وہیں وہ ان علوم کا شائق اور اُن کے ماہرین کا قدردان تھا۔

لہٰذا اُس کے عہدِ خلافت میں مختلف علوم حکمیہ کی ترقی ہوئی۔ مگر اس کی تفصیل سے پیشتر اسلامی فکر میں "فلسفہ و حکمت" کا جو مصداق رہا ہے اُس کے دائرۂ عمل کو متعین کر لینا مستحسن ہوگا۔

آج سائنس بالخصوص (Exact Sciences) اور فلسفہ یا (Speculative Sciences) میں بنیادی طور پر تفریق کی جاتی ہے مگر یونانی۔ اسلامی فلسفہ میں جملہ علوم عقلیہ فلسفہ و حکمت ہی کے تحت آتے تھے۔ "حکمت" کی دو قسمیں تھیں :- حکمت نظری اور حکمت عملی۔ اول الذکر کی تین قسمیں تھیں :- الٰہیات (یا مابعد الطبیعیات)، ریاضیات اور طبیعیات۔ ثانی الذکر یا حکمتِ عملی کی بھی تین قسمیں تھیں :- علم الاخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدن۔ پھر ان اقسام کی ذیلی اقسام تھیں، کچھ اصول اور کچھ فروع، چنانچہ نجوم اور طب طبیعیات کے فروع تھے۔ منطق بھی حکمت نظری کی ذیلی اقسام میں محسوب ہوتا تھا۔

بہر حال منصور کے عہدِ خلافت میں ان مختلف علوم میں سے اکثر کی ترقی ہوئی جس کا مختصر گوشوارہ حسب ذیل ہے :-

ریاضی و طبیعیات | منصور نے سب سے پہلے (اپنے پرپوتے مامون الرشید سے کوئی ساٹھ ستر سال پیشتر) قیصر روم کو لکھا کہ ریاضی و ہیئت کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرا کر بھیج دے چنانچہ ابن خلدون نے لکھا ہے :-

"فبعث ابو جعفر المنصور الی ملک الروم	پس خلیفہ ابو جعفر منصور نے بادشاہ روم کو پیغام

ان یبعث الیه بکتب التعالیم مترجمة فبعث الیه بکتاب اوقلیدس و بعض کتب الطبیعیات فقراءها المسلمون واطلعوا علی ما فیها"

بھیجا کر اُس کے ملک میں جو ریاضی (MATHEMATICS) کی کتابیں ہیں، اُنھیں ترجمہ کرا کر اُسے بھیج دے۔ پس قیصر نے اُسے اُقلیدس کی کتاب الاصول اور کچھ طبعیات کی کتابیں بھیجیں جنھیں مسلمانوں نے پڑھا اور اُن کے مضامین پر مطلع ہوئے۔

ان کتابوں کو پڑھ کر باقی کتابوں کے بارے میں مسلمان فضلاء کا شوقِ بے پایاں اور بڑھ گیا چنانچہ ابن خلدون اس کے بعد لکھتا ہے :-

وازدادوا حرصًا علی الظفر بما بقی منها

اس سے اُن کا شوق (حرص) اُن کتابوں کے حاصل کرنے کے لئے اور بڑھ گیا جو اُن میں سے وہاں ملک روم میں باقی رہ گئی تھیں۔

منطق منصور ہی کے زمانہ میں ارسطاطالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں قاطیغوریاس (CATEGORIES) باری ارمنیاس (PARI HERMENETICAE) اور انالوطیقائے اولیٰ (ANALYTICAE PRIOR) نیز فورفوریوس کی "ایساغوجی" کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے صرف پہلی کتاب ہی کا ترجمہ ہوا تھا۔ یہ ترجمہ ابن المقفع نے کیا۔ قاضی صاعد نے لکھا ہے :-

" فاما المنطق فاول من اشتهر به فی هذه الدولة عبد الله بن المقفع الخطیب الفارسی کاتب ابی جعفر المنصور فانه ترجم کتب ارسطاطالیس المنطقیة الثلاثة فی صورة المنطق وهی کتاب قاطاغوریاس وکتاب باری ارمینیاس وکتاب انولوطیقا . . . . وترجم ذلک المدخل

رہا منطق تو اس (عباسی) خاندان کے زمانہ میں پہلا شخص جو اس کے ساتھ اعتناء کے لئے مشہور ہوا عبداللہ بن المقفع تھا جو ایرانی خطیب اور خلیفہ، ابوجعفر منصور کا کاتب تھا۔ اُس نے ارسطاطالیسی منطق کی (پہلی) تین کتابوں کو جو منطق کی صورت پر ہیں ترجمہ کیا۔ وہ کتابیں قاطیغوریاس باری ارمینیاس اور انالوطیقائے اولیٰ تھیں . . .

الی کتاب المنطق المعروف بالایساغوجی — نیز اُس نے منطقی کتابوں کے اُس تعارف کا بھی عربی میں ترجمہ کیا جو "ایساغوجی" کے نام سے مشہور ہے۔

ہیئت منصور کے دربار میں فلکیات و ہیئت کے بڑے بڑے ماہرین موجود تھے جیسے فزاری، یعقوب بن طارق، ماشاء اللہ وغیرہ۔ نجوم و ہیئت کے ساتھ منصور کے اعتناء کے قصے ہندوستان تک پہنچ گئے اور وہاں کے ماہرین علم ہیئت کا ایک وفد ۱۵۶ھ (یا بقول البیرونی ۱۵۲ھ) میں "سدھانت" کا ایک نسخہ لے کر دربارِ خلافت میں پہنچا جس کا خلیفہ کے حکم سے الفزاری (نیز یعقوب بن طارق) نے عربی میں آزاد ترجمہ کیا جو مامون الرشید کے زمانہ تک "السند ہند الکبیر" کے نام سے مسلمان ہیئت دانوں کا معمول بہ رہا۔

طب ۱۴۸ھ میں منصور کے علاج کے لئے جندی سابور کے مدرسہ طبیہ کا سربراہ جورجیس بلایا گیا۔ علاج معالجہ کے علاوہ جورجیس نے منصور کے حکم سے طب کی بہت سی کتابوں کا عربی میں ترجمہ بھی کیا۔ ابن ابی اُصیبعہ اُس کے بارے میں لکھتا ہے :-

"جورجیس .... خدم بصناعة الطب المنصور .... وقد نقل للمنصور کتبا کثیرة من کتب الیونانیین الی العربی" — جورجیس .... اس طبیب نے علمِ طب کے ذریعہ خلیفہ ابوجعفر منصور کی خدمت کی اور منصور کے واسطے بہت سی یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔

غرض فلسفہ و حکمت کی اکثر شاخوں کا منصور ہی کے زمانہ سے مسلمانوں میں رواج بڑھنے لگا بالخصوص منطق کا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے اپنے متبعین میں منطق و حکمت کے ساتھ غیر معمولی اعتناء دیکھا تو آپ نے فرمایا

"ان الناس لا یزال بھم المنطق حتی یتکلموا فی اللّٰہ فاذا سمعتم ذلک قولوا لا الٰہ الا الواحد الذی لیس کمثلہ شیٔ" — لوگ منطق میں مشغول رہنے لگے ہیں یہاں تک کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے اندر بھی قیل و قال کرتے ہیں۔ پس جب ایسی گفتگو سنو تو کہہ دیا کرو نہیں کوئی

معبود سوائے اُس اکیلے خدا کے جس کے مانند کوئی

چیز نہیں۔

منصور نے ۱۵۸ھ میں وفات پائی اور اُس کا جانشین اُس کا بیٹا مہدی ہوا۔ اُس کے زمانہ میں زندقہ نے خطرناک شکل اختیار کرلی اور اس کی اصلاح کے لئے مہدی نے متکلمین سے اس کے رد میں کتابیں لکھوائیں۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

زندقہ کے استیصال کے علاوہ مہدی نے فلسفہ وحکمت کی ترقی میں بھی تعمیری کردار انجام دیا۔ اُس نے اپنے دیوانِ کتابت کے کاتب ابونوح نصرانی سے ارسطاطالیسی منطق کی پانچویں کتاب "طوبیقا" (TOPICAE) یا جدل کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ ابونوح نے ارسطاطالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں کا (جن کا ابن المقفع نے پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا) از سرِنو سریانی سے عربی میں ترجمہ کیا۔

مہدی کے زمانہ میں بھی منجمین دربار کی زینت بنے رہے جن کا پیشوا اور سربراہ تھوفیل الرہاوی تھا۔

مہدی کے بعد پہلے ہادی اور سال بھر بعد ہارون خلیفہ ہوئے۔ ہارون کو بقول ابن الاثیر جدل وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اُس کا وزیر یحییٰ بن خالد برمکی علوم حکمیہ کا والہ وشیدا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ ہارون کے عہدِ خلافت کا نصف اول برمکی خاندان کی علم دوستی وعلماء نوازی کا درخشاں دور ہے۔ خود دورِ عصرِ یونانی علم وحکمت کے احیاء و ترقی پر مائل تھی چنانچہ ہارون نے "خزانۃ الحکمۃ" کے نام سے ایک لائبریری کی بنیاد ڈالی جو قدیم ایرانی لائبریریوں کے انداز پر قایم کی گئی اور اس کی سربراہی اُس نے ایک ایرانی فضل بن نوبخت کو تفویض کی۔ بعد میں اس کا سربراہ سلما کو مقرر کیا جس کا عہدہ "صاحب بیت الحکمۃ" بعد میں اُس کے نام کا جزو بن گیا۔ عہدِ ہارونی کی علمی سرگرمیوں یا برمکی خاندان کی تربیت علم وفضل کا مختصر گوشوارہ حسب ذیل ہے۔

<u>ریاضی وہندسہ</u> اُصولِ اقلیدس کا پہلا ترجمہ منصور کے زمانہ میں ہوا تھا۔ مگر ہارون کے عہد میں

یحیٰی بن خالد برمکی کے ایما سے حجاج بن یوسف بن مطر نے ازسرِ نو اس کتاب کا ترجمہ کیا۔ اگلی صدی میں حجاج نے دوبارہ اس کا ترجمہ ہارون کے بیٹے مامون کے لئے کیا۔ لہٰذا پہلا ترجمہ نقلِ ہارونی اور دوسرا نقلِ مامونی کہلایا۔

علم الہیئت | یحیٰی بن خالد بن برمک ہی کے اعتنا و ایما سے یونانی علم الہیئت کی مشہور کتاب "المجسطی" کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ المجسطی کے ترجمے تو اس زمانہ میں بہت سے ہوئے مگر یحیٰی کو پسند نہیں آتے۔ لہٰذا اُس نے ابوحسان اور سلما صاحب بیت الحکمہ سے اس کا ترجمہ کرایا۔ اُقلیدس کے مترجم حجاج بن یوسف نے بھی المجسطی کا ترجمہ کیا۔ ابن الندیم نے لکھا ہے

"الکلام علی کتاب المجسطی ...... اول من عنی بتفسیرہ واخراجہ الی العربی یحیی بن خالد بن برمك ففسرہ لہ جماعۃ فلم یتقنوہ ولم یرض ذلك - فندب لتفسیرہ اباحسان وسلم صاحب بیت الحکمۃ فاتقناہ واجتہدا فی تصحیحہ ... وقد قیل ان الحجاج بن مطر نقلہ ایضاً"

کتاب المجسطی پر کلام ..... پہلا شخص جس نے اُس کی شرح وتفسیر اور اُس کے عربی میں ترجمہ کرانے کی طرف توجہ کی وہ یحیٰی بن خالد برمکی تھا۔ ایک جماعت نے اُس کی فرمائش پر اُس کی تفسیر کی مگر اُنھوں نے اچھی طرح شرح وتفسیر نہیں کی اور اس سے یحیٰی بن خالد مطمئن نہیں ہوا، لہٰذا اُس نے اس کی شرح وتفسیر کے لئے ابوحسان اور سلما صاحب بیت الحکمۃ کو مامور کیا انھوں نے باحسن وجوہ اس کام کو انجام دیا اور اس کی تصحیح میں کوشش فراواں کی۔ . . . یہ بھی کہا گیا ہے کہ حجاج بن مطر نے بھی اس کا ترجمہ کیا تھا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ عہدِ اسلام کی پہلی رصدگاہ مامون الرشید نے ۲۱۵ھ کے قریب بغداد میں قائم کرائی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے کوئی چالیس سال پہلے یحیٰی بن خالد برمکی کے ایما سے شہر جندی سابور میں احمد بن محمد النہاوندی کی سربراہی میں پہلی مسلم رصدگاہ قائم ہوئی تھی

کی دریافتوں کو "الزیج المشتمل" میں قلمبند کیا گیا۔ ابن یونس "الزیج الکبیر" میں لکھتا ہے:۔

"ولا اعلم بین رصد بطلیموس وبین رصد اصحاب الممتحن رصداً الا رصد احمد بن محمد النہاوندی الحاسب بجندی سابور فی ایام یحییٰ بن خالد بن برمک فانہ رصد واثبتہا فی زیج المسماۃ المشتمل۔"

میں بطلیموس کی رصد اور اصحاب ممتحن کی رصد (رصد مامونی) کے درمیان اور کسی رصد کو نہیں جانتا سوائے احمد بن محمد نہاوندی حاسب کی رصد کے جو یحییٰ بن خالد برمکی کے زمانہ میں شہر جندی سابور میں قائم تھی۔ نہاوندی نے وہاں فلکیاتی مشاہدات کئے تھے اور اُنھیں "زیج مشتمل" میں قلمبند کیا تھا۔

طب: ہارون کے دربار میں اطبائے حاذقین کی ایک کثیر تعداد تھی جن میں دو طبیب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں: جبرئیل بن بختیشوع جس کی حذاقتِ طبی سے متاثر ہوکر ہارون نے اُسے دربار کا رئیس الاطباء مقرر کیا تھا اور دوسرا یوحنا بن ماسویہ جو طب کے علاوہ منطق اور دیگر علوم متداولہ کا بہت بڑا فاضل تھا۔ جبرئیل نے فنِ طب میں متعدد کتابیں لکھی تھیں مگر یوحنا بن ماسویہ ایک کثیر التصانیف مصنف تھا۔ ابن ابی اُصیبعہ نے فنِ طب میں اُس کی کوئی پنتالیس کتابیں گنائی ہیں جن میں سے "کتاب الکمال والتمام" کا حوالہ رازی بار بار اپنی کتاب الحاوی میں دیتا ہے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ قدیم زمانہ میں ریاضی و ہیئت اور طب و نجوم فلسفہ ہی کا جزو محسوب ہوتے تھے اس لئے عہدِ ہارونی میں ان علوم (ریاضی و ہیئت اور طب وغیرہ) کے ساتھ اعتنا فلسفہ و حکمت کی ترقی ہی کے مترادف تھا۔ مگر خالص منطق و فلسفہ میں بھی ہارون کے عہد خلافت میں کوئی غیر اہم ترقی نہیں ہوئی۔

منطق: ارسطاطالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں اور "ایساغوجی" کا ترجمہ پہلی مرتبہ عبداللہ بن المقفع نے (بعہد منصور) اور دوسری مرتبہ ابونوح کاتب نصرانی نے (بعہد مہدی) کیا ہارون کے عہد

ساتیسری مرتبہان کا ترجمہ ہوا۔یہ ترجمہ سلما صاحب بیت الحکمۃ نے غالباً براہ راست یونانی سے کیا تھا۔

طب اور فلسفہ میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔عہد ہارون کے دونوں مشہور طبیب بھی منطق میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔یوحنا بن ماسویہ کی علمی مجلس میں دیگر علوم کے علاوہ منطق کے ابحاث کا بھی چرچا رہتا تھا۔جبرئیل کی مصنفات میں ابن ابی اصیبعہ نے طب کے علاوہ منطق کی ایک کتاب کا بھی بعنوان "کتاب فی المنطق" ذکر کیا ہے۔جالینوس نے منطق میں "کتاب البرہان" لکھی تھی۔جبرئیل ہی کے ایما سے مترجم ایوب نے قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں اُسے تلاش کیا اور اُس کے متعدد مقالوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔

فلسفہ مسلمانوں میں فلسفہ سے مراد ارسطو کا فلسفہ ہوتا تھا اور اُس کی بیشتر فلسفیانہ تصانیف چار شعبوں میں تقسیم کی جاتی تھیں:۔منطق، طبیعیات، الہیات اور اخلاقیات۔منطق میں اس کی آٹھ کتابیں تھیں جن میں سے صرف پہلی تین کتابوں کا ترجمہ ہوا (تفصیل اوپر مذکور ہوئی) بقیہ پانچ کتابیں پانچ سو سال سے ممنوع التعلیم تھیں اور ہارون کے بعد سوسوا سو سال تک بھی ممنوع التعلیم (یا بقول فارابی "الجزء الذی لا یقرأ") بنی رہیں۔مامون اور اُس کے جانشینوں کے زمانہ میں بھی اُن کے ساتھ تعرض نہیں کیا گیا۔اُس کے کوئی سو سال بعد فارابی نے اس رسم قدیم کے خلاف بغاوت کی۔

طبیعیات میں بقول ابن الندیم ارسطو کی سات کتابیں متداول تھیں اور شاید ان کا عہد ہارونی میں ترجمہ بھی ہوا تھا۔اور کتابوں کے متعلق تو تیقن کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا، مگر ارسطاطالیسی طبیعیات کی "کتاب السماع الطبیعی" کا ہارون کے عہد میں (برامکہ کی زیر سرپرستی) سلام الابرش نے ترجمہ کیا تھا چنانچہ ابن القفطی اُسے قدیم مترجمین کے گروہ میں شمار کرتا ہے اور اُس کے اس ترجمہ کے بارے میں لکھتا ہے:۔

سلام الابرش من النقلۃ القدماء | سلام الابرش قدیم ترجموں میں سے تھا۔وہ برامکہ

فی ایام البرامکه ویوجد بنقل السماع الطبیعی ۔

کے عہد میں تھا۔ اُس کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں میں سے "سماع طبیعی" (PHYSICE) پائی جاتی ہے

اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اُس نے یا اور کسی مترجم نے اور بھی کتابوں کا ترجمہ کیا ہو اور اتنا تو یقینی ہے کہ ارسطاطالیسی فلسفہ و حکمت کے اُس زمانہ میں اور بھی مترجم تھے جو حنین اور بعد کے مترجمین سے امتیاز کے لئے "النقلۃ القدماء" کہے جاتے تھے

الٰہیات میں ارسطو کی "مابعد الطبیعیات" (METAPHYAICS) کا بھی ترجمہ ہو چکا تھا اور شائقینِ فلسفہ کے علاوہ متکلمین کے حلقوں میں بھی اس کے ساتھ اعتنا کیا جاتا تھا کیوں کہ یہ کتاب ارسطاطالیسی عبقریت کا شاہکار سمجھی جاتی تھی اور اتنی مشکل اور مغلق تھی کہ شیخ بوعلی سینا بھی اپنی غیر معمولی ذہانت کے باوجود چالیس مرتبہ پڑھنے کے بعد بھی اسے نہ سمجھ سکا تھا۔

بہرحال ہارون کے عہد (برامکہ کے زمانہ) میں یہ کتاب اپنے اغلاق و غموض کے لئے ضرب المثل تھی۔ چنانچہ مرتضیٰ زبیدی نے مشہور معتزلی متکلم "نظام" کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وزیر جعفر بن یحییٰ برمکی ارسطو کی تعریف کر رہا تھا کہ نظام نے کہا: رہنے دیجئے، میں تو اُس کی تردید بھی لکھ چکا ہوں۔ جعفر نے کہا: تردید تو تم کیا لکھو گے، تم تو اسے پڑھ بھی نہیں سکتے۔ نظام نے کہا: کہو اول سے آخر تک پڑھ کر سنا دوں اور کہو تو آخر سے اول تک۔ بہرحال نظام نے اُسے فرفر سنا دیا۔ اور یہی نہیں بلکہ اس وثوق و اعتماد کے ساتھ وہ اس کا رد بھی کرتا جاتا تھا کہ جعفر حیرت میں رہ گیا۔ مرتضیٰ زبیدی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"وذکر جعفر بن یحیی البرمکی ارسطاطالیس فقال النظام قد نقضت علیه کتابه۔ فقال جعفر کیف وانت لا تحسن ان تقرأه۔ فقال ایما احب الیك ان اقرأه من اوله الی آخره ام من آخره الی

جعفر بن یحییٰ برمکی (ایک محفل میں) ارسطو کا ذکر کر رہا تھا۔ اس پر نظام نے کہا میں تو اُس کی کتاب (کتاب الحروف یا مابعد الطبیعیات) کا رد لکھ چکا ہوں۔ اس پر جعفر نے کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے تم تو ڈھنگ سے اُسے پڑھ بھی نہیں سکتے۔

اوله فان حج يذكر شيئاً فشيئاً وينقص عليه - فتعجب منه جعفر" (كتاب منية الامل صفحہ)	نظام نے جواب دیا آپ کیا چاہتے ہیں اُسے شروع سے آخر تک پڑھ کر سناؤں یا آخر سے ابتدا تک پھر وہ تھوڑا تھوڑا کر کے اُس کتاب کے محتویات کو سنانے لگا اور ساتھ ساتھ اس کی تردید بھی کرتا جاتا تھا۔ اس سے جعفر کو حد درجہ تعجب ہوا۔

ممکن ہے ایک معتزلی تذکرہ نگار نے اپنے فرقہ کے ایک عالم کی تعریف میں مبالغہ واطراء سے کام لیا ہو لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ برامکہ کے زمانہ میں یہ کتاب ترجمہ ہو چکی تھی اور اعلیٰ علمی حلقوں میں متداول تھی۔

برامکہ ہی کے زمانہ میں وہ پراسرار شخصیت تھی جو عالمی کیمیا کی تاریخ میں "جابر بن حیان" کے نام سے موسوم ہے۔ اگرچہ اُس کی پراسرار شخصیت کی بنا پر قدیم زمانہ میں کچھ لوگوں کو اُس کے بارے میں شک تھا، مگر ابن الندیم نے اس شک کو یہ کہہ کر رفع کر دیا ہے۔

وانا اقول .... والرجل له حقيقة وامره اظهر واشهر وتصنيفاته اعظم واكثر (الفهرست صفحہ)	میں کہتا ہوں .... اس شخص جابر بن حیان کی حقیقت ہے (وہ تاریخی شخصیت ہے افسانوی نہیں ہے) اس کا معاملہ ظاہر اور مشہور ہے اور اُس کی تصانیف بڑی عظیم المرتبت اور کثیر التعداد ہیں۔

وہ اُس کے زمانہ کے بارہ میں دو قول نقل کرتا ہے: ایک قول یہ کہ وہ سیدنا حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے عقیدت مندوں میں سے تھا اور دوسرا قول یہ کہ وہ برامکہ کے متوسلین میں سے تھا۔ بہر صورت وہ مامون الرشید سے نصف یا ربع صدی پیشتر تھا۔

جابر بن حیان کیمیا کے علاوہ فلسفہ و حکمت میں بھی کمال رکھتا تھا بلکہ گروہ فلاسفہ تو اُسے اپنے ہی گروہ میں محسوب کرتا تھا۔ ابن الندیم لکھتا ہے۔

زعم قوم من الفلاسفة انه كان منهم	فلاسفہ کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ جابر بن

ولہ فی المنطق والفلسفۃ مصنفات" حیان انھیں میں سے (ایک فلسفی) تھا اور منطق
(الفہرست صفحہ) وفلسفہ میں اُس نے متعدد کتابیں تصنیف
کی تھیں۔

ابن الندیم نے اُس کی مصنفات کی فہرست دیکھی تھی اور وہ اُس کے حوالہ سے نقل کرتا ہے۔
"قال جابر فی کتاب فہرستہ ..... جابر نے اپنی فہرست مصنفات میں لکھا ہے کہ
الفت ثلثمائۃ کتاب فی الفلسفۃ" میں نے فلسفہ میں کوئی تین سو کتابیں لکھی ہیں۔

اور فلسفہ میں اس جابر ابن حیان کو یہ مہارت تامہ حاصل تھی کہ اس میں تبحر حاصل کرنے کے بعد اُس نے اس کی تنقید وتنقیص میں بھی سینکڑوں کتابیں لکھیں جیساکہ ابن الندیم اُس سے نقل کرتا ہے۔
"ثم الفت بعد ذلک خمسمائۃ کتاب اس کے بعد میں نے فلسفہ کے رد میں کوئی پانچ سو
نقضاً علی الفلاسفۃ" کتابیں لکھیں۔

یہ مختصر جائزہ برامکہ کے زوال پرختم ہوجاتا ہے۔ اُن کی بربادی سے علمی سرپرستی کی یہ مجلس کچھ عرصہ کے لئے درہم برہم ہوگئی اور فلسفہ وحکمت کے شائقین بیس سال کے لئے خانہ نشین ہوگئے تاآنکہ مامون نے آکر اس تحریک کی تجدید کی۔

ہارون نے ۱۹۳ھ میں وفات پائی اور وصیت نامہ کے مطابق امین اُس کا جانشین ہوا۔ مگر بعد میں دراندازوں کے کہنے میں آکر دوسرے بھائی مامون سے لڑ بیٹھا۔ یہ لڑائی صرف دو بھائیوں کی خانہ جنگی نہ تھی بلکہ "عرب کے سوز دروں" اور "عجم کے حسن طبیعت" کا آخری معرکہ تھا جس میں مقدم الذکر کو بری طرح شکست ہوئی۔

اس طرح اسلامی ثقافت کی تاریخ کا ایک باب ختم ہوا اور دوسرے باب کا افتتاح ہوا۔ مگر اس مختصر جائزے سے (جو اسلامی فکر میں یونانی فلسفہ وحکمت کے آغاز وارتقا کے ایک خاکے سے زیادہ نہیں ہے) اتنا تو واضح ہوگیا ہوگا کہ مامون الرشید کے برسر اقتدار آنے اور فلسفہ وحکمت کی ترقی میں سرکاری وسائل وذرائع کو استعمال کرنے بلکہ خود اُس کی پیدائش سے پہلے ہی، یونانی فلسفہ اسلامی سماج میں کہاں تک دخیل ہوچکا تھا۔ (باقی آئندہ)

شیخ الرئیس بوعلی سینا
اور
مرضِ عشق

از حکیم محمد عطاء الرحمن سیوانی ندوی۔ بی۔ یو۔ ٹی۔ ایس (علیگ)
لٹریری ریسرچ یونٹ ۔۔ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

بہرحال منوچہر فلک المعالی سلطان محمود سے دبتا تھا اور چہار مقالہ میں جہاں قابوس سے شیخ کی ملاقات کا ذکر ہے وہاں قابوس بھی سلطان محمود کے مقابلہ میں ایک نرم انداز اختیار کرتا ہوا دکھایا گیا ہے جو یقیناً اس کے بیٹے نے اختیار کیا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ لکھتے وقت نظامی عروضی کے پیش نظر منوچہر فلک المعالی تھا مگر کسی وجہ سے اس سے سہو ہو گیا اور اس نے منوچہر کے بجائے اس کے باپ قابوس کا نام لکھ دیا۔

(ج) قزوینی نے شیخ کے دو تسامح گنائے ہیں۔ ایک یہ کہ اس نے اسے رے میں وزارت کے عہدہ پر فائز بتایا ہے۔ دوسرے یہ کہ شہنشاہ علاء الدولہ کا وزیر قرار دیا ہے۔

شیخ کی زندگی ایک طویل وغیر مختتم شورشوں کی داستان ہے اور بجائے خود ایک دلچسپ تاریخ بننے کی مستحق ہے وہ جرجان سے رے گیا، رے سے قزوین گیا، ہمدان گیا اور آخر

میں اصفہان گیا - جرجان سے کیوں بھاگا؟ کیوں کہ اسے خوف تھا کہ محمود غزنوی جو اس کی انقلابی سرگرمیوں پر متنبہ ہو چکا تھا اسے وہاں سے اسی طرح گرفتار کرائے گا جس طرح اس نے خوارزم سے پکڑوانے کی کوشش کی تھی، لہذا وہ رے پہنچا جو اس زمانہ میں قرامطہ کا ایک بہت بڑا گڑھ تھا، مگر وہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد جب اپنی دال گلتی نظر نہ آئی نیز محمود کے حملہ کی متواتر خبریں آنا شروع ہوئیں تو وہاں سے بھاگ کر قزوین و ہمدان پہنچا اور بہت جلد اپنی قابلیت کی بنا پر وزارت کے لائق سمجھا گیا - بایں ہمہ اس نے اپنی انقلابی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں جس کے نتیجہ میں قزوین میں بار بار شدید بلوے اور شورشیں ہوتی رہیں اور انھیں منظم کراتا رہا تا آنکہ مجبور ہو کر وہ اصفہان پہنچا جہاں ایک کٹر شیعی علاء الدولہ کاکویہ برسر اقتدار تھا - ادھر رے کو فتح کرنے کے بعد محمود نے اصفہان پر حملہ کیا مگر یہ شیخ کے حسن تدبیر ہی کا نتیجہ تھا کہ علاء الدولہ نے بار بار شکست کھانے کے باوجود بھی ہتھیار نہیں ڈالے - محمود نے ۴۲۱ھ میں وفات پائی اور اس کا بیٹا مسعود اس کا جانشین ہوا - اس نے بھی باپ کی طرح اصفہان پر فوج کشی جاری رکھی اور ایک حملہ میں تو علاء الدولہ کو اتنی عظیم شکست فاش ہوئی کہ اس کی بہن بھی گرفتار ہو کر دشمنوں کے ہاتھ میں چلی گئی - علاء الدولہ کے لئے مرنے کا مقام تھا مگر شیخ نے اس کی ہمت بندھائی اور مسعود کو پیغام بھیجا کہ یہ لڑکی اعلیٰ خاندان کی ہے، آپ اس سے شادی کرلیں، اصفہان جہیز میں دے دیا جائے گا - مسعود فریب کھا گیا اور اس سے شادی کرلی مگر شیخ نے ایفائے وعدہ نہ کیا - اور اصفہان مسعود کے قبضہ میں نہیں دیا، مسعود نے جھلا کر لڑکی کو طلاق دے دی اور کہلا بھیجا کہ میں اسے لشکر کے غنڈوں کو آبروریزی کے لئے دے دوں گا، یہ واقعی علاء الدولہ کے لئے مرجانے کا مقام تھا، مگر شیخ کی حکمت عملی پھر کام آئی اور اس نے کہلا بھیجا کہ لڑکی کی عزت و ناموس کی ذمہ داری باپ بھائی پر اس وقت تک ہے جب تک وہ کنواری ان کے گھر ہے - شادی کے بعد اس کی عزت و آبرو کی ذمہ داری اس کے شوہر اور سسرال والوں پر عائد ہوتی ہے - اب اگر اس لڑکی کے ساتھ کوئی ناشائستہ حرکت ہوتی ہے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ علاء الدولہ کی بہن کے ساتھ ایسا ایسا ہوا بلکہ ساری دنیا یہی

کہ گئی کہ شہنشاہ روئے زمین سلطان مسعود کی بیوی کے ساتھ لشکر کے غنڈوں نے بُرا کام کیا۔ مسعود کو ڈپلومیٹک شکست (Diplomatic Defeat) ہوئی اور اُس نے لڑکی کو پورے عزت واحترام کے ساتھ اس کے میکے واپس کر دیا۔

قزوینی نے تو اس حکایت کے اس جز کو بے اصل بتایا تھا جو البیرونی کے غزنی جانے کے متعلق ہے، لیکن آقائے سعید نفیسی نے باقی حکایت کی صحت بالخصوص شیخ و محمود غزنوی کے تعلقات کے بارے میں جو کچھ مشہور ہے اس سے انکار کیا ہے، فرماتے ہیں۔

"داستانے کہ دربارۂ ابن سینا و محمود غزنوی رواج بسیار دارد بکلی ساختگی ونادرست، چناں می نماید کہ ایں داستان را نخست نظامی عروضی سمرقندی در چہار مقالہ جعل یا از ماخذ نامعتبر نقل کردہ باشد"[1]

اس تغلیط کی تائید میں آقائے موصوف نے تین دلیلیں دی ہیں

(الف) "نخست آں کہ ابو نصر عراق وابوالریحان بیرونی وابوالخیر خمار تا پایان پادشاہی خوارزم شاہیاں در خوارزم ماندہ اند"[2]

(ب) "دلیل دیگر ایں است کہ ابن سینا خود صریحاً در سرگذشت خویش می گوید — بیروں رفتن وے از خوارزم در ہماں زمانے رخ دادہ است کہ قابوس درگذشتہ۔ دلیل دیگر ایں است کہ قطعاً ابن سینا سراسر در زندگی خود قابوس را ندیدہ وبا او در برنہ شدہ است"[3]

(ج) "خواجہ حسین بن علی میکال کہ نظامی می نویسد دریں واقعہ رسول محمود در دربار خوارزم بودہ است درست معلوم نیست، کیست دریں خاندان ابو عبداللہ حسین

---

[1] ملاحظہ ہو سعید نفیسی، پور سینا ص ۱۵۲

[2] " " " " ص ۱۵۲

[3] " " " " ص ۱۵۲

بن ابوالقاسم علی معطوعی یگانہ کسی است کہ حسین بن علی بودہ است و تا حوالی ۴۰۵ھ
زندہ بودہ است۔ گمان نمی رود این حسین بن علی کہ تا حدود ۴۰۵ھ زندہ بود ۴۲ سال
پیش ازاں بداں درجہ از احترام و اہمیت رسیدہ بودہ باشد کہ محمود اورا بدربار خوارزم
شاہ بہ رسالت فرستادہ باشد"[1]

آقائے نفیسی کی پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ البیرونی وغیرہ ۴۰۸ھ میں جرجانیہ کے اندر ضرور پائے جاتے ہیں جہاں سے محمود غزنوی انھیں اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اس سے پہلے جرجانیہ سے باہر نہ نکلے ہوں یا ۴۰۳ھ میں غزنی نہ گئے ہوں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ۴۰۳ھ کے قریب عزیز مصر کا سفیر مشرقی ممالک میں فاطمی خلفاء کا پروپیگنڈا کرنے کے لئے آیا تھا جب سلطان محمود کو یہ معلوم ہوا تو اس نے ہر قسم کی احتیاطی تدابیر کرنا شروع کیں، چوں کہ شیخ بھی ایک خطرناک انقلابی تھا اور جرجانیہ خوارزم اس زمانہ میں قرامطہ کا گڑھ تھا مگر محمود شیخ کو کوئی اہمیت دے کر قومی ہیرو نہیں بنانا چاہتا تھا (ورنہ وہ اسے خاموشی سے گرفتار کرالیتا) اس لئے اس نے گو والی خوارزم سے ایک طرح کی ثقافتی تبادلہ (Cultural Exchange) کی خواہش کی مگر شیخ کے دل میں چور تھا لہذا وہ یہ خبر سنتے ہی جرجانیہ سے فرار ہوگیا، باقی فضلاء خوارزم محمود کے فرمان کے بموجب قاصد کے ہمراہ غزنی چلے آئے، ظاہر ہے سلطان کو تو ابن سینا کی تلاش تھی جس کی انقلابی سرگرمیوں پر کڑی نگرانی رکھنے کے لئے وہ غزنی میں نظر بند رکھنا چاہتا تھا، مگر وہ سونے کی چڑیا تو اڑ گئی لہذا ان بے ضرر فضلاء کے غزنی میں رکھنے پر اسے کوئی اصرار نہیں ہوا۔ اور چوں کہ یہ لوگ اپنے وطن مالوف واپس جانا چاہتے تھے لہذا جلد ہی خوارزم لوٹ گئے جہاں وہ لوگ ۴۰۸ھ تک جبکہ سلطان محمود نے خوارزم کو فتح کیا مقیم رہے۔

دوسری دلیل کا جواب سابق میں مذکور ہو چکا ہے، شیخ کی قابوس سے یقیناً ملاقات نہیں ہوئی اور غالباً یہاں نظامی عروضی سے تسامح ہوا ہے کہ اس نے بیٹے کے بجائے باپ کا

[1] ملاحظہ ہو۔ سعید نفیسی، پور سینا صہ ۱۵۲

نام تحریر کردیا ہے۔

تیسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ سلطان محمود شیخ کو کوئی بڑی اہمیت دینا نہیں چاہتا تھا جو اس کے گرفتار کرانے کے لئے کسی منجھے ہوئے گرگ باراں دیدہ سفیر کو بھیجتا، وہ صرف فضلاء خوارزم کے ضمن میں اس کو غزنی بلانا چاہتا تھا اور ان فضلاء کی طلبی کا فریضہ جو ایک قسم کی ثقافتی مہم (CULTURAL MISSION) تھی ایک نوعمر امیر خواہ وہ خواجہ حسین بن علی میکال ہو یا کوئی اور غیر معروف میکال بہ سہولت انجام دے سکتا تھا اس کے لئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں تھی۔

محققین یورپ میں سے زخاؤ (SACHAU) نے اس حکایت کے بارے میں لکھا ہے۔

(الف) "کن حالات میں اس نے اپنے وطن کو خیرباد کہا؟ یہ سوال اب تک ایسے قصے کہانیوں میں الجھا ہوا ہے کہ مجھے خوف ہے کہ مشرق کے لئے ذیل کی سطور تاریخ کے ایک عمدہ اور باوقار چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔

(ب) یہ بیان واقعات کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔

(ج) یہ یقینی ہے کہ ابن سینا اور ابو سہل ۴۰۷ھ سے پہلے ہی خوارزم سے فرار ہو چکے تھے اور شاید ۴۰۳ھ سے بھی پہلے جب کہ ان کا مربی شاہزادہ علی بن مامون انتقال کر چکا تھا، اس لئے کہ ابن سینا جرجان پہنچنے کے فوراً بعد شمس المعالی (م ۴۰۳ھ) کے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ شیخ بو علی سینا کو علاء الدولہ کے یہاں وزیر جیسا ہی منصب حاصل تھا اور اس لئے اگر نظامی عروضی نے یہ لکھا کہ "بہ وزارت شہنشاہ علاء الدولہ افتاد" تو اس میں کوئی تسامح نہیں ہے۔

یہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شیخ علاء الدولہ کا وہ باضابطہ وزیر تھا اور اس اعتراض میں خود

ناضل قزوینی سے عجلت پسندی کا اظہار ہوا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ ان کے قلت مطالعہ کا نتیجہ ہے، ہاں یہ ضرور عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ اگر وہ اس عہد کی دیگر تواریخ کو ملاحظہ فرماتے تو ایسا سقیم اعتراض نہ کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ کا علاء الدولہ کے یہاں وزیر خوش تدبیر ہونا اس زمانہ میں ایک مسلم تاریخی واقعہ تھا، اور مورخین اسے دیگر تاریخی حقائق کی طرح نقل کرتے تھے۔ ان مورخین روزگار میں سے ایک صدرالدین ابی الحسن بن ابی الفوارس ہے۔ اس کی کتاب "اخبار الدولۃ السلجوقیہ" شیخ کے بعد اگلی صدی میں لکھی گئی تھی۔ اصالۃً تو یہ سلاجقہ کی تاریخ ہے لیکن اس کے ابتدا میں سلجوقیوں کے پیش رؤوں بالخصوص مسعود غزنوی کے عہد حکومت اور اس کی حروب و فتوحات کی تفصیل بھی ہے۔ مورخ نے مسعود کے سپہ سالار کے حملۂ اصفہان کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

"وکان الشیخ الحکیم ابو علی ابن سینا رحمہ اللہ وزیر الملک علاء الدولہ"

مورخ مذکور کی پوری متعلقہ عبارت حسب ذیل ہے۔

"ثم سار ابو سھل الحمدونی (عمید خراسان) مع تاش فراش الی اصفہان مع جیوش غلا الارض وتشحن الطول منہا والعرض، فانھزم منہا الملک علاء الدولہ ابو جعفر واغاروا علی خزائنہ ودارہ وکان الشیخ الحکیم ابو علی بن سینا رحمہ اللہ وزیر الملک علاء الدولہ فاغار عسکر تاش فراش علی بیت کتب ابی علی ونقلوا اکثر تصانیفہ وکتبہ الی خزانۃ کتب غزنۃ وکانت فیہا مجموعۃ الی ان احرقھا جنود ملک الجبال الحسین بن الحسین"

رہا رے میں اسے وزیر بتانا تو اس تسامح کے لئے بھی نظامی عروضی زیادہ موردِ الزام نہیں ہے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس نے یہ حکایت شیخ کی طبی حذاقت ثابت کرنے کے

لئے لکھی ہے نہ کہ اس کی زندگی کے جزئیات کی تفصیل کے لئے۔

اور البیرونی اور ابوالخیر نے پہلی مرتبہ ۴۰۸ھ کے بعد غزنہ جانے سے پہلے خوارزم کو خیرباد کہا جیسا کہ سطور ذیل سے مترشح ہوتا ہے، حالاں کہ

(د) مذکورۂ بالا بیان میں ان کے زمانۂ روانگی اور وجوہات جلاوطنی کے متعلق بالکل مختلف واقعات بلا سوچے سمجھے الجھا دئے گئے ہیں۔"

مگر یہ ۱۸۷۹ء کی بات ہے جب کہ الآثار الباقیہ ایڈٹ ہوئی تھی لیکن اس کے بعد اسلامیات کے بعض اہم ماخذ جیسے "تتمۂ صوان الحکمۃ" وغیرہ شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں اور ضرورت ہے کہ زخاؤ SACHAU کے اس قول پر نظر ثانی کی جائے۔ اور انھیں ماخذ کی روشنی میں زخاؤ کے دلائل پر تبصرہ کیا جا رہا ہے

(الف) غالباً زخاؤ (SACHAU) کا اشارہ ملاحدۂ باطنیہ کی انقلابی سرگرمیوں، ان کے خلاف امراء اسلام کی تادیبی کارروائیوں اور بالخصوص محمود غزنوی کے ابن سینا جیسے ملک الحکماء (PRINCE OF THE PHILOSOPHERS) کی آزار رسانی کی طرف ہے۔ یہ مشرق کے لئے بدنما داغ ہو یا نہ ہو مگر اس فرقہ کا استیصال اور ابن سینا کی انقلابی سرگرمیوں کا سدباب وقت کی اہم ترین ضرورت تھا اور اگر محمود اس کی طرف توجہ نہ دیتا تو یقیناً فرائض جہاں بانی کی انجام دہی میں کوتاہی کا مرتکب قرار پاتا، آخر اس کی "بدنمائی" ادارۂ احتساب مذہبی (INSTITUTE OF INQUISITION) سے تو زیادہ نہیں ہے، لیکن یہ مجنونانہ تعصب مذہبی بھی مغربی ثقافت کی "درخشانی" کو کم نہ کر سکا۔

(ب) زخاؤ SACHAU نے ان واقعات کی تفصیل نہیں دی جن کی کسوٹی پر اس کے خیال میں یہ بیان پورا نہیں اترتا ورنہ اس پر تبصرہ کیا جاتا

(ج) غالباً زخاؤ (SACHAU) کو وہ مصادر نہیں مل سکے تھے جو اب شائع ہو کر عام دسترس میں آ گئے ہیں بالخصوص شیخ کی خود نوشت سوانح عمری، اسی لئے اس

کی عبارت میں یہ خلط مبحث ہے اور یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

(د) شیخ کے بخارا سے جرجانیہ پہنچنے اور جرجانیہ سے جلا وطن ہونے کے متعلق تفصیل بڑی وضاحت کے ساتھ اوپر مذکور ہو چکی ہے، اس کا اعادہ تطویل لاطائل کا مصداق ہوگا۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا ہوگا کہ ہر چند نظامی عروضی کی عبارت میں (خواہ خود مصنف سے تسامح ہوا ہو یا ناقلین و ناسخین اس کے ذمہ دار ہوں) کچھ ضرور تغیر ہوا ہے۔ مگر نفس واقعہ[1] واقعہ نفس الامری کا مصداق ہے

اور اس طرح چہار مقالہ کی یہ حکایت شیخ کی سوانح عمری کی باز تشکیل میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

---

[1] یعنی شیخ کا جرجان پہنچنا اور قابوس کے بھانجے کے مرض عشق کا علاج کرنا۔ سیوانی ندوی

دہلی
چودھویں صدی کے شعروادب میں

از جناب شعیب اعظمی صاحب

دہلی ہزار بار اُجڑی ہزار بار بسی۔ ناز و نعمت کے بھرپور دن بھی دیکھے اور رنڈاپے کی گھڑیاں بھی گنیں، ہزار چرکے کھاتے اور اپنی گود میں صدہا داستانیں لئے سسکتی بھی رہی مگر کہلائی سدا سہاگن، دِلّی پانڈووں کی۔ دِلّی مسلمانوں کی۔ دِلّی سلطانوں کی صوفیا کی یا مشائخ کی یا فرنگی کی کس کی دِلّی کبھی مہربان ہوئی تو دودھوں نہلایا اور پوتوں پھلایا اور بے رحم بنی تو ایسی کہ ڈائن بن کر سات پشت تک کو ہضم کر گئی۔ تیمور کی تلواروں کی چمک سے دلی کا دِل دہلا۔ نادر شاہ کی خوں آشام تلوار نے اسی سرزمین پر اپنی پیاس بجھائی۔ داراشکوہ کی عظمت کا تاج انھیں گلیوں میں روندا گیا، سرمد کی سرمستی اسی جامع مسجد کے دروازہ پر جاں بحق ہوئی۔ اٹھارہ سو ستاون کی انقلابی مہم کا سر یہیں کچلا گیا اور اُنیس سو سینتالیس کی بھیانک خون کی ہولی یہیں کھیلی گئی اور لاکھوں بے خانماں قافلوں کے بوجھ سے اسی کی کمر جھک گئی مگر ادیبوں اور شاعروں نے اس کی عظمت کے گُن ہمیشہ گائے گئے گذرے دور میں بھی میر نے اس شہر کو عالم میں انتخاب کہا جہاں منتخب روزگار رہتے تھے اسی گلی کوچے کی ہر شکل ان کو تصویر نظر آئی لیکن بگڑی سنبھالنے کی بھی فکر لگی رہی۔ ذوق نے ان گلیوں کو دکن

کے دربار پر ترجیح دی لیکن غالب رہنے کے باوجود "کیا کھائیں گے" کے غم میں گھلتے رہے اور حالی نے تو مرحوم لکھ کر مہر آخر لگا دی مگر ان سب کے باوجود کوئی اسے چھوڑ نہ سکا کوئی اس سے فرار حاصل نہ کر سکا اور سب اسے سینے سے لگائے رہے۔

اسی دہلی کے لیل و نہار ہم چودھویں صدی کے آثار میں تلاش کریں گے۔ اس صدی کی ابتدا میں خلجیوں کا چل چلاؤ تھا۔ معزالدین کیقباد کی رنگین زندگی وقت کے دھندلکوں میں کھو رہی تھی اور ہندوستان کا تاج و تخت تغلق فرمانروا غیاث الدین تغلق کا استقبال کر رہے تھے۔ تغلق نے نہ صرف بغاوتیں فرو کیں بلکہ مشرق میں بہار بنگال تک تاخت و تاز کی بلکہ دکن کی سنگلاخ سرزمین کو بھی ہموار کیا اور محمد بن تغلق نے دیوگیر کو ملک کا دار السلطنت ثانی قرار دیا۔ اس خاندان نے تقریباً پون صدی تک ہندوستان کے دو تہائی حصہ کو زیر نگیں رکھا اس کے بادشاہوں میں محمد بن تغلق اور فیروز تغلق خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو مورخین کو علائی عہد کی تعریف میں رطب اللسان پاتے ہیں اور تغلق عہد کی مذمت میں صفحے کے صفحے سیاہ پاتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ محققین بھی اس فیصلہ میں جانبدار نہیں رہ جاتے اور علائی عہد کے علما، شعرا اور مورخین کے گُن گانے کے ساتھ ساتھ عہد تغلق کو ایک زوال آمادہ دور کا نام دیتے ہیں مگر حقیقت کیا ہے اس کا تجزیہ ہم اُس عہد کے دیگر شعراء، مورخین اور مصنفین کی تحریر سے کر سکتے ہیں۔

اس عہد کے حالات معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس تین بڑے ذرائع ہیں۔ بیرونی سیاحوں کے سفرنامے، وہ کتابیں جو بیرونی علماء نے یہاں کے حالات معلوم کر کے لکھیں اور تیسرا وہ گروہ جو خود یہاں کے علماء، شعراء، مورخین اور مشائخ کے ملفوظات پر مشتمل تھا جن کے الفاظ میں وقت کی دھڑکتی ہوئی نبض تھی۔ غالباً ان تینوں ذرائع کے مطالعہ کے بعد اس فیصلہ میں دیر نہ لگے گی کہ تغلق عہد کسی طرح بھی ادبی، تہذیبی، معاشرتی اور اقتصادی طور پر کم حیثیت نہ تھا۔

محمد بن تغلق کی دہانت، علمیت، علم دوستی اور سخاوت کسی تفصیل کی محتاج نہیں ہے۔ برامکہ، معن زادہ اور حاتم نے جو برسوں میں دیا سلطان نے وہ چشم زدن میں دے ڈالا، برنی نے اُسے فرعون، سکندر اعظم، سلیمان اور نمرود جیسا عالی ہمت بتایا ہے اور حوصلہ میں جمشید اور خسرو کی مانند قرار دیا ہے چنانچہ یہی وجہ تھی کہ خراسان، عراق، بخارا، سمرقند اور خوارزم، سیستان، ہرات، مصر اور دمشق سے علماء، فضلا اور ضرورت مندوں کا ایک جم غفیر دہلی میں آگیا تھا فرشتہ لکھتا ہے:-

"آوازہ سخاوتش چناں گشت کہ مردم از قندھار سیستان وخراسان وعراق و مصر وبغداد بدرگاہ سلطان محمد آمدہ منتظر انعام واکرام بودند نوازشہا یافتہ ونواختہ شدند۔"

ممکن ہے ابن بطوطہ کے ہندوستان آنے میں یہ کشش بھی شامل رہی ہو اس کے علاوہ قلقشندی، خلال، شیخ مبارک، شہاب الدین، اور ابوصنعاء کے تذکرے بھی محمد بن تغلق کی فیاضی اور عالی ہمتی اور ہندوستان کی خوشحالی کے ذکر سے خالی نہیں ہیں، شہاب الدین عباس دہلی والوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ ذہین اور عقلمند ہیں، فارسی اور ہندی بولتے ہیں، دونوں زبانوں میں شعر بھی کہتے ہیں، مختلف علوم وفنون، طب اور ریاضی میں ماہر ہیں مسالک الابصار میں درج ہے کہ یہاں کے باشندوں کا پہناوا سفید ہے علماء اولیا اور درویش زیادہ تر ادنی کپڑے پہنتے ہیں۔ بادشاہ اور امراء تاتاری لباس میں ہوتے ہیں۔ پانچ پانچ گز کے عمامے باندھتے ہیں حبشی زمردی سیاح اس عہد میں دوبار ہندوستان آئے۔ ان کے لکھنے کے مطابق بالوں کی لٹ ہوتی ہے۔ اور گندھی ہوئی چوٹیاں بھی مروج ہیں سپاہی تسلے باندھتے ہیں۔ قضاۃ اور علماء لشکریوں کی مانند جُبّیت لباس پہنتے ہیں۔ عورتیں موباف باندھتی ہیں۔ خلال لکھتے ہیں کہ دہلی میں مکان پتھر کے ہوتے ہیں۔ اور دو منزلہ ہیں۔ اکیس ۲۱ شہروں کو دہلی کہتے ہیں۔ ایک ہزار مدرسے ہیں۔ ایک شوافع کا ہے باقی احناف کے ہیں۔ تقریباً ستر شفاخانے ہیں۔ بازار عام

خانقاہیں زیادہ ہیں۔ اور جامع مسجد کی اونچائی سو ہاتھ کی تھی۔

اس ضمن میں ابن بطوطہ کا بیان زیادہ اہم ہے۔ جو سرکاری مہمان تھا۔ قاضی بھی رہ چکا تھا۔ اور ہندوستان کے مختلف خطوں کی سیر بھی کر چکا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ تمام شہر میں ہندو آبادی کی کثرت ہے جو آزادی سے اپنی عبادت کرتے اور تہوار مناتے ہیں دسہرہ، دیوالی، ہولی اور بسنت کے موقعہ پر بہت خوشی منائی جاتی ہے۔ سلطان ان کی مذہبی زندگی میں دخیل نہیں اور غیر مسلم فوج اور شہری زندگی میں برابر کے شریک تھے۔ سلطان نے نہ کوئی بت توڑا اور نہ ہی کوئی مندر مسمار کیا۔ تہذیبی حلقوں میں غلام اور لونڈیوں کی کثرت ہے۔ جو قیمتاً ملتی ہیں سینکڑوں اشعار انہیں حفظ ہیں اور حدیثیں بھی بکثرت یاد ہیں۔ وہ گانے بجانے میں طاق ہیں۔ وہ یہاں کی عورتوں کے حسن اور اخلاق کا اتنا مداح تھا کہ دنیا کے دوسرے ممالک کی عورتوں پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ ہر موقع کی تصویر پیش کرتا ہے۔ غمی، خوشی اور شادی کی رسومات بیان کرتا ہے۔ دلہن کے دروازے پر سہیلیاں کھڑی ہوجاتی ہیں اور دولہا کی پارٹی سے مقابلہ ہوتا ہے۔ دلہن پر سے سہیلیاں پیسے نچھاور کرتی ہیں۔ اور اللہ اکبر کے نعرے لگاتی ہیں۔

کھانے میں دودھ اور گھی کی فراوانی تھی۔ کھانے کی دوکانیں بکثرت تھیں۔ شامی کباب، سیخ کباب، پلاؤ، قورمہ مختلف قسم کے سالن، مٹھائیاں، پتلی چپاتیاں، بھنا گوشت، گھی کی پوریاں، خشک میٹھی روٹی، قلیہ۔ پیاز ادرک کا قیمہ، حالفل۔ بادام اور پستہ بھرا ہوا سموسہ غرض سب کچھ وافر ہوتا تھا، مہمان کی ضیافت شربت، مٹھائی، پھول اور پان سے ہوتی تھی بعض اوقات ابن بطوطہ کی ضیافتوں میں ہزار پان پیش کئے گئے۔ اس عہد کے مشہور شاعر مطہر کڑہ نے ان پانوں کا ذکر کر کے ابن بطوطہ کے بیان کو سند دے دی ہے:۔

برگ داران شده در دادن تنبول رواں   برگ واں ہائے زرد سیم گرفتہ بکنار

بڑھا چند گلِ برگ چو گلِ تازہ و تر — دو ختۂ آں گلِ صد برگ بہ یک سوزنِ خار

شیخ مبارک رقمطراز ہیں کہ محمد بن تغلق کے دربار میں ۱۲ سو طبیب تھے دو ہزار قوال ور ایک ہزار شاعر تھے اور تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ادیبوں اور شاعروں کی دیکھ بھال ے لئے چار نائب وزرار مقرر تھے علماء اور قضاۃ کی دیکھ بھال صدر جہاں کے ہاتھ میں تھی اور بادشاہ ان علما سے دلچسپ گفتگو کرتا تھا اُن کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھتا تھا۔

یہ وہ دہلی تھی جسے انحطاط کا نام دیا جاتا ہے امیر خسرو اگرچہ اس عہد کے شاعر نہیں ہیں مگر تغلق نامہ لکھ کر وہ اس عہد سے بھی متعلق ہو گئے ہیں۔ اسی دہلی کے بارے میں وہ قرانِ السعدین میں لکھتے ہیں کہ یہ جنت عدن ہے اور اس کی عظمت کے سامنے ختن بھی ہیچ ہے اور مقدس اتنا کہ مکہ بھی اس کا طواف کرنے پر آمادہ ہو جائے:-

شعرت دہلی کنف دین و داد — جنت عدن است کہ آباد باد
ہست چو ذاتِ ارم اندر صفات — حرسہا اللہ عن الحادثات
فلک زدہ دوازہ او فتح باب — سیزدہ دروازہ صد فتح باب
نام بلندش رہ بالا گرفت — تا بہ ختن شدرہ یغما گرفت
گر بشنود قصۂ ایں بوستاں — مکہ شود طائف ہندوستاں

امیر خسرو نے جس دہلی کی شان میں یہ اشعار کہے اسی کی مدح میں عہد کے مشہور شاعر عصامی نے اپنے شاہنامہ فتوح السلاطین میں یہ شاندار اور یادگار اشعار بھی کہے ہیں۔

غرض شہر دہلی کہ در ملک ہند — یکے تختگہ بود خاطر پسند
تماشا گہ جملہ اہل نظر — دیارش چمن در چمن سر بسر
بہ نیروئے دیں مامن مومناں — شدہ گرچہ بد جائے اہرمناں
برشک از سوادش سوادِ ارم — مضافات او مصر و بغداد ہم

چناں تختگاہے کہ در روزگار ... بماند از شہان جہاں یادگار
ملائک ہمہ کو چہ ایش مدام ... زپر ہائے خود رفتہ ہر صبح و شام
در و مسجدی ہمچو بیت الحرم ... برآوردۂ خسروانِ عجم
منارہ درآں مسجد باصفا ... بفردوس چوں سدرۃ المنتہیٰ
ہماں حوضِ شمسی ز پاکی آب ... ببرد آب از چشمۂ آفتاب

اور اُس کے موسم کی خوشگواری لوگوں کا دِل موہ لیا کرتی تھی۔

بہر چار فصلش ہوا معتدل ... شدا زرو نقشِ باغ رضواں خجل
باطراف او باغہائے سمن ... چو پُر چیں بکردہ سواد چمن
نسیمے شد آں باغ ہر صبحدم ... برد بہر رونق صبا در ارم
کسی کو درآں شہر گردد مقیم ... نماند در و حرص باغِ نعیم

دہلی کی خوبصورتی اور حُسن میں علمار فضلار اور دانشوروں کی موجودگی نے چار چاند لگا دئیے تھے۔ عصامی ہی کے مندرجہ ذیل اشعار سے اس کی تصدیق ہوجائے گی۔

درآں شہر عالم لبسے خاستہ ... ہمہ در ہمہ علم آراستہ
اگر مشکلے در بخارا فتاد ... وگر فتنۂ در سمرقند زاد
گرو ہے کہ مفتی آں کشورند ... زاصحاب ایں شہر فتویٰ برند
درآں شہر ہر جنس صنعت گراں ... ہمہ کامل از صنعتِ بیکراں

غور فرمائیے کہ یکتائے روزگار دہلی کیا درجہ رکھتے تھے۔ بخارا اور سمرقند کے علمار کے مقابلے میں ہمارے علمار کیا مرتبہ رکھتے تھے۔

چودھویں صدی کے اگلے نصف میں فیروز تغلق کی فلاحی کوششوں نے محمد بن تغلق کی سخت گیری کو ختم کر کے عام خوشحالی اور فارغ البالی عطا کی تھی صوفیا کے خاندان، خانقاہوں اور زیارت گاہوں کو نوازا گیا تھا۔ مزارات و مقابر

کی حرمت کی گئی۔ آبپاشی کی آسانی نے دور دراز گاؤں کو بھی خوشحالی بخشی۔ دہلی میں مدرسہ شاہی کی بنیاد پڑی۔ برنی اس مدرسہ اور مسجد کی تعریف کرتا ہے کہ یہ عجیب وغریب عمارت حوض علائی پر بنائی گئی ہے۔ اس کی خوبصورتی اور بلندی کے ساتھ کمروں اور برآمدوں کی مسلسل قطاریں ہیں۔ موزوں ستونوں نے دنیا کی دوسری عمارتوں کو ہیچ کر دیا ہے۔ جو مسافر یا شہری اس شہر میں آتا ہے۔ سمجھتا ہے گویا بہشت میں آگیا ہے۔ یا فردوس بریں کی سیر کر رہا ہے۔ اس کا سارا حزن وملال ختم ہو جاتا ہے۔ اور اپنے شہر کو بھول جاتا ہے لوگ یہیں بس جانے کے خیال سے مکان تعمیر کر کے قیام پذیر ہو جاتے ہیں مسافر اور سیاح قسمیں کھاتے ہیں۔ کہ ہم نے ایسی عمارت کبھی نہیں دیکھی اور یہ قیصر وکسریٰ کے ایوان سے بلند تر ہے۔ صوفیا چاشت، اشراق، تہجد اور اوراد میں مصروف رہتے ہیں۔ یہاں فن کے بہترین استاد مقرر ہیں اور تفسیر، حدیث اور فقہ پڑھائی جاتی ہے۔ حفاظ ہر روز ختم قرآن کرتے ہیں اور مصلیوں کی تکبیر سے آسمان گونجتا ہے۔

نباشد ایں چنیں زیبا بنائے　　　وگر باشد چنیں زیبا بنائے

برنی کے اس بیان کی تصدیق اسی عہد کے مشہور شاعر مولانا مطہر کڑہ کے الفاظ سے لفظ بہ لفظ ہو جاتی ہے۔ پڑھئے اور شعر کا لطف اٹھائیے۔

اندر آئی زدر مدرسۂ شاہجہاں　　　آسمانی نگری تازہ جہانی انوار
بینی آنجا کہ درعمر ندیدست کسی　　　آنچناں جائی نہ در گوش شنیدہ اخبار
نہ چناں جائی بہ ہمداں نہ خورشنج سدید　　　نہ چناں نقش ہر بوم ونہ بچین وبلغار
عالمان عربی لفظ عراقی دانش　　　ہمہ درجبہ شامی وعصری دستار
ہر یکی نادرۂ دہر درالوائے ہنر　　　در بلاغت بہ حجاز وبہ یمن مجد ووقار
ہر یکی واسطۂ عقل در اطراف ودیار　　　در نقاہت بخارا وسمرقند نشاں

مدرسہ کی یہ فضا درس و تدریس کے علاوہ خورد و نوش کا سامان بھی مہیا کرتی تھی۔ مطہر مدرسہ میں ایک تماشائی کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ کھانے کا وقت ہوا تو اساتذہ اور طلبا نے ان کو بھی شریکِ دسترخوان کیا۔ یہ نعمتیں سرکاری خرچ پر مدرسہ کی نذر ہوتی تھیں۔ مدرسہ کی ضیافت ملاحظہ ہو جس پر امرا کو بھی رشک ہو

آسماں رنگ بیاراستہ نانِ مائدہ ای	کاسہ و صحن درو ہمچو کواکب بقطار
ہمہ دُراج و کبوتر بچہ و کبک و کلنگ	ماہی و مرغ مسمن بہ کوہ و قطار
ناردان و شکر و لوز و لوزینہ در وی	زعفران، صندلی دخشک ہمہ چیز از ابزار

لیکن یہی دہلی کبھی کبھی اپنی تلون مزاجی کا مظاہرہ بھی کیا کرتی تھی۔ محمد بن تغلق عجیب و غریب بادشاہ تھا۔ نئی اسکیمیں اس کے ذہن کی اُپج تھیں۔ اس کے عہد میں ایک بہت بڑا قحط پڑا۔ لوگ اسی کے شکار تھے کہ اسی درمیان تانبے کے سکوں کا اجرا اور دار السلطنت دہلی کو دولت آباد منتقل کرنا پڑا تھا۔ لوگوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ دہلی دہلی نہ رہی ایک شہر خموشاں اور شمشان بھومی بن گئی۔ لوگ بادلِ ناخواستہ رخصت ہوئے۔ اور زبردستی بھیجے گئے۔ عصامی کے متفرق اشعار سے اندازہ ہوگا کہ دہلی والوں پر کیا بیتی۔ بوڑھے، بچے اور عورتیں کس بے بسی کا شکار تھیں۔ ملاحظہ ہو:۔

ہمہ خلق گریاں پئے خانہ خویش	رہا کردہ مالوف اوطانِ خویش
بسے گوشہ گیران پرہیز گار	بسی کنج نشینان شستہ گذار
عواتان بہ تکلیف و تعذیب شان	بروں کردند از خانہا موکشان
گروہے کہ گشتند در خانہ پیر	زغوغائے عالم شدہ گوشہ گیر

کیا طفل، کیا پیر، کیا عورت سب ہی پریشان تھے۔ مگر شیر خواروں کو دیکھئے

چہ پیر و چہ کودک چہ مرد و چہ زن	رہا کرد ہر یک دیار و دمن
بسی طفل بے شیر گشتہ ہلاک	بسی سر پئے آب خفتہ بخاک

اور پھر وہ خواتین جو اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نہ نکلی تھیں، جنھوں نے کبھی آفتاب، کبھی آفتاب کی تمازت کا تصور بھی نہ کیا تھا اور جن کے چہرے نے کبھی گرد کا منہ بھی نہ دیکھا تھا اُن کا کیا حشر ہوا ملاحظہ ہو:۔

زنانے کہ بودند اندر حجاب　　ندیدہ بودندی رخِ آفتاب
ندیدہ درِ خانۂ خود گہے　　ندانند از صنعۂ تا دری
دراں راہ دیدم کہ ہر دلبری　　بہر غول گامی نہادہ سری
ہمہ نازکانے کہ ہرگز بخواب　　نخوردہ غم از گرمیٔ آفتاب
یکی پا برہنہ رہے می نوشت　　ہمہ دشت از ایشاں صنم خانہ گشت
بروئی کہ جز داغ صندل نبود　　شد از کوشش زرد گرد کبود
بحشمے کہ جز در گلستاں نرفت　　بہاموں برفت و بیاباں برفت
بسی آبلہ پا نداراں پانشست　　بسی خارِ گردوں دراں پاشکست
ازاں قافلہ با عذابی شدید　　سوئے دولت آباد می رسید

اگر دہلی میں ایک طرف سیاسی فرمانروائی تھی۔ تو دوسری طرف عوام کے دلوں پر صوفیا کی روحانی حکومت تھی۔ اس وقت کی مرکزی شخصیت سلطان الاولیا حضرت شیخ نظام الدین کی ذات بابرکات تھی جن کی گرد وپیش کے اژدہام نے غیاث الدین تغلق کو اس طرح ہراساں کر دیا جیسے برامکہ کی مقبولیت نے ملوں کو محبوب الٰہی کے فیض سے ملک کے بیشتر علاقوں میں صوفیا پہنچ کر اپنا حلقہ بنا چکے تھے۔ چشتیہ گروہ کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے انھوں نے شاہانِ وقت کو کبھی اپنے پاس پھٹکنے کا موقعہ نہ دیا۔ اور نہ ہی ان کی جانب کبھی رخ کیا اور دوسری جانب سہروردیہ سلسلہ تھا جن کو دربار میں رسائی حاصل تھی۔ اور جس ملک کے متعدد علمار صدر جہاں اور شیخ الاسلام کے منصب پر فائز بھی رہے مگر عوام

ہیں دونوں سلسلے روحانیت کی تبلیغ کرتے رہے۔ چراغ دہلی، برہان الدین غریب، فخرالدین زراد، رکن الدین ملتانی، جہانیاں جہاں گشت، یحییٰ منیری، مسعود بک، بندہ نواز جیسے صوفیا نے جسم و روح کی صفائی کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی خدمت کی۔ فوائد الفواد، خیر المجالس اور سیر الاولیاء جیسے ملفوظات اور مشاہیر صوفیا کی تاریخیں لکھی گئیں۔ یحییٰ منیری نے درجنوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ ان کے مکتوبات نے عوام کی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے۔ یحییٰ منیری اور مسعود بک نے وحدۃ الوجود کے عقیدے کی اشاعت علی الاعلان کی۔ اور منصور کی مانند مسعود بک نے انا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ تک لگایا چنانچہ علمائے دہلی نے انکے خلاف فتویٰ دے کر قتل کروادیا۔ نور العیون اور مرآۃ العارفین ان کے عقیدے کے مظہر ہیں۔ چنانچہ چند متفرق اشعار اس کے شاہد ہیں۔

رفت ز مسعود بک جملہ صفات بشر — او کہ ہمہ ذات بود باز ہمہ ذات شد

باز ایں دلِ دیوانہ ام بانگ انالحق میزند — سر باز چوں منصور دم از سرِ مطلق میزند

دیدی کہ از ہر قطرہ خوں نقش انالحق گر خورد — تا تو ندانی کیں نفس عاشق بناحق میزند

صوفیا سماع کے عاشق تھے اور علماء نے حضرت نظام الدین اولیاء اور چراغ دہلوی کو بھی مطعون کیا تھا۔ مگر سماع کا مفہوم جتنا اچھا اور پُر تاثیر مسعود بک نے سمجھایا اتنا بڑے سے بڑے صوفی وقت کو بھی معلوم نہ تھا۔ ملاحظہ ہو سماع کا سوز و گداز :-

آں طائفہ کز اہل سماعند کیانند — آنانکہ بجز دوست نہ بینند ندانند

در رقص در آیند چو از غایت مستی — از گردن دل رشتہ جاں نیز گسلانند

دستک چو زنند از سر مستی بتو لعبد — ہم از ازل و ہم ز ابد دست فشانند

با آنکہ بظاہر ہمہ درویش و فقیر اند — در ملک قناعت ہمہ شاہ دو جہانند

دایم لب ماعند ہمہ وقت بر قند در عین عیانند وز اغیار نہانند

ان لوگوں میں سب سے زیادہ پُراثر شخصیت چراغ دہلی کی تھی۔ جن کے ملفوظات حمید قلندر نے جمع کئے تھے۔ پروفیسر حبیب کہتے ہیں کہ خیر المجالس پڑھتے وقت آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ وہ شاہانِ وقت کے مخالف تھے۔ ان کے الفاظ میں پیری مریدی بچوں کا کھیل بن کر رہ گئی تھی نہ وہ خانقاہیں تھیں اور نہ وہ لنگر خانے کیونکہ خانقاہوں اور اولیاء کی وہ عظمت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان کی یہ ناآسودگی اس لئے بھی تھی کہ محمد بن تغلق کی نگاہ میں وہ باغی تھے اور اس کی زندگی میں فیروز تغلق کو تختِ دہلی پر لانے کی سازش میں حصہ لیا تھا۔ بہر حال چراغ دہلی کا فلسفہ ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ ان کے متفرق اشعار ان کے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مگر ان کی ایک غزل جو واحد کلام ہے ان کی شخصیت اور مسلک کی بہترین نمائندہ ہے۔ غزل کی سلاست، تاثیر اور مواد کی داد آپ ضرور دیں گے۔

بیکارم و باکارم چوں مد بحباب اندر خاموشم و گویانم چوں خط بہ کتاب اندر
ای زاہد ظاہر بیں از قرب چہ می پرسی او در من و من در وی چوں بو بہ گلاب اندر
از فلسفہ و منطق جز عشق نفہمیدم چنداں کہ نظر کردم شبہا بہ کتاب اندر
گہ شادم و گہ غمگیں از حالتِ خود غافل می خندم و می گریم چوں طفل بخواب اندر
می خندم و می گریم چوں گل تہ شبنم می سوزم و می سازم چوں خون کباب اندر
در سینہ نصیرالدین جز عشق نمی گنجد ایں طرفہ تماشا بیں دریا بہ حباب اندر

فیروز شاہ کے دور میں تصوف کی شاعری کا ذوق عام ہو گیا تھا۔ امراء اور رؤسا شاعری کرنا اور علم و ادب کی سرپرستی کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ عین الملک اور تاتارخاں نے اپنی زیرِ نگرانی بہت سی مذہبی اور ادبی کتابوں کی تدوین کی۔ خود فیروز شاہ جس ذوق کا آدمی تھا۔ اس کی مثال ذیل کی ایک مختصر غزل سے مل جائے گی کہ وہ کس پایہ کا شاعر تھا

اور تصوف کا کتنا گہرا اثر اسکی زندگی پر تھا۔ بروضتہ السلاطین میں اس کی پانچ غزلیں شایع ہوئی ہیں۔ آخری غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں

ما مریدان پیر میکدہ ایم | فارغ از نام دامین از ننگیم
زاہدان دشمنند رندان را | زاں بہ ایشاں عیشہ در جنگیم
در غم عشق و روی سوئے بتان | گاہ در روم و گاہ در زنگیم
طالب شاہدان خوش خوہیم | منکر زاہدان دل تنگیم
ہمچو فیروز خاک راہ تو ایم | گرچہ بدنام تاج آور نگیم

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر دور کے دانشور اپنے عہد سے تقریباً ناآسودہ رہے ہیں۔ اور خاص طور سے مذہبی شخصیتیں تو قدروں اور روایتوں کا ماتم کرنے میں سب سے آگے ہیں۔ اگر چراغ دہلی کے ملفوظات میں ہم ان کو تغلق دور کی بدحالی پر ماتم کناں پاتے ہیں تو یہ حیرت کی بات نہیں ہے۔ جو آیا وہ پچھلوں کو رویا۔ ماضی کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہا۔ چنانچہ تغلق دور کی ابتدا سے قبل ہم ان صوفی شعراء کے کلام میں یہ چیز آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ جس عہد کی تعریف میں شعراء اور مورخین رطب اللسان تھے۔ اسی عہد کی اخلاقی اقدار کا کیا حال تھا۔ بوعلی قلندر پانی پتی اپنی مثنوی کے ایک حصے میں اخلاق، سخاوت، خلوص، محبت، برکت کے فقدان کا ذکر کرتے ہیں۔ اور بے حیائی پر حیرت زدہ ہیں:-

برکت از کشت و زراعت گشت کم | قامت جود و سخاوت گشت کم
خلق نیکو شد ز عالم ناپدید | طبع مردم سگ صفت گشتہ پلید
مہر کم شد از دل فرزند و زن | فتنہ برپا گشت در دیر کہن
چوں حیا برخاست عالم گشتہ تنگ | دختران با مادراں دارند جنگ

اس عہد کے معاشرہ کا یہ ایک عام تجزیہ ہے ادران اشعار سے اندازہ

لگایا جاسکتا ہے۔ کہ فرد اور جماعت کا شیرازہ انحطاط پذیر تھا۔ اور عام لوگ کس قماش کے رہے ہوں گے۔ امیر خسرو نے اہلِ دہلی پر چند اشعار لکھے ہیں جن میں ان کی طنازی، عشوے اور حسن نے خسرو کو اس طرح متاثر کیا تھا جیسے غالب کو بنارس میں برہمن زادوں نے اور شبلی کو بمبئی میں زرتشت زادوں نے حیران کر دیا تھا۔

ای دہلی وای بتان سادہ — پگ بستہ ودیشہ کج نہادہ
خون خوردن شان آشکاراست — گرچہ پنہاں خورند بادہ
فرماں نہ برند زاں کہ ہستند — از غایت ناز خود مرادہ
نزدیک دل چناں کہ جاں را — برداشتہ گوشۂ نہادہ
جائے کہ برہ کنند گل گشت — در کوچہ و در گل پیادہ
آسیب صبا رسید بردوش — دستار چہ برزمیں فتادہ
شان در رہِ عاشقاں بدنبال — خونناب ز دیدگاں کشادہ
ایشاں ہمہ یاد حسن در سر — وینہا ہمہ دل بباد دادہ
خورشید پرست شد مسلماں — زیں کج حکیمانِ شوخ وسادہ
کردند مرا خراب وسرمست — ہندو بچگانِ تاک زادہ
سربستہ شان مجوئی مرغول — خسرو چو سگیست در قلادہ

یہ حال تو ہندو بچوں کا تھا مگر عوام کی عام تمدنی زندگی کم حیثیت ہو کر رہ گئی تھی۔ اخلاقی بے راہ روی دہلی والوں کی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ اسی عہد کے مشہور شاعر عصامی کے کے چند اشعار اس انحطاط پذیر معاشرہ کا بہترین عکس ہیں :۔

زہر کوچۂ اہلِ بدعت نجاست — ہم از شومت شان سعادت بکاست
لباسی دگر خلق برداختند — ز دستار تا کفش نو ساختند

بظاہر سراسر تواضع نمائی | بباطن بیابی خصومت گرائی
بآزار دلہا نہادہ دلی | شب و روز در خرج ناحاصلی
گہ لاف ہر یک چو روئیں تنی | گہ کار حملہ چو بیوہ زنی
ہمہ مردم آزار و شیطاں نواز | ہمہ آشنا سوز و بیگانہ ساز
مصلا و سبحہ بر انداختہ | صراحی و ساغر عوض ساختہ

کم علمی اور شیخی کس قدر عام تھی یہ بھی دیکھ لیجئے :۔

کسی را کہ امروز جنبد زباں | ہمہ ہست بس ذو فنون زماں
بصد لابہ یک حرف حاصل کنند | بہر جمعے آں حرف لافے زنند
برانند از عربدہ باد را | بشاگردی آرند اُستاد را
نماندہ دریں عالم عیب جوئی | مگر کم تمیزان بسیار جوئی
حکیم در نظامی و خسرو شوند | دگر کس نصیحت کند نشنوند
بنزدیک خود ہر یکی بوعلیست | ہمیں خود پرستیدن از غافلی ست

عصامی نے تغلق سے دکھ پایا تھا اس لئے دہلی کی تباہی کے بیان میں جائز و ناجائز بھی کہہ گیا ہوگا بلکہ جہاں تک دہلی کے عوام اور خواص کا تعلق ہے اُن کی عکاسی میں کسی مبالغہ کا دخل نہیں ہے اُسی عہد کے ایک اور شاعر نے لوگوں کی بدمذاقی اور بغض و حسد کی تصویر اس طرح کھینچی ہے :۔

جماعتی ہمہ بدخواہ اہلِ فضل و ہنر | جماعتی ہمہ بدخواہ مردمِ دانا
جماعتی کہ ندانند سنگ را ز گہر | جماعتی کہ ندانند اطلس از دیبا
جماعتی کہ بباز ارِ عقل شاں کیسانست | بہائی مہرہ سنگین را یوئی لالا
زخبثِ باطنِ ایشاں شود چو بادِ سموم | اگر بخاطرِ شاں بگذرد نسیم صبا
بوقت مدح چو غنچہ دہاں خود بستہ | بوقت ہجو چو بلبل بصد زباں گویا

زطعنہ شاں نشود در فضائلم نقصاں   پلید از دہنِ سگ کجا شود دریا

یہ چودھویں صدی کی دہلی تھی جس کے مختلف رنگ شعر و ادب کے آئینہ میں نظر آئے۔ یہ عہد قابلِ نفریں اور زوال آمادہ تھا اس کا فیصلہ قارئین پر ہے دلی میں آپ رہتے ہیں یا ہم رہتے ہیں دلی کس کی آپ کی یا میری؟

تبصرے

مسلمان اور سیکولر ہندوستان از ڈاکٹر مشیر الحق ریڈر شعبۂ ویسٹ ایشیا اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ تقطیع متوسط، ضخامت ۱۸۰ صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ، قیمت مجلد: ۶/۵، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی - ۲۵۔

آج کل صرف مسلمانوں کے لئے نہیں۔ بلکہ پورے ملک اور قوم کے لئے ایک اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ مسلمان بہ حیثیت ایک فرقے کے سیکولر ہندوستان کے فریم میں فٹ بیٹھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں بیٹھ سکتے تو اس ملک میں امن کا مستقبل کیا ہوگا؟ اور اگر بیٹھ سکتے ہیں تو کس حد تک؟ اور وہ حد کیا ہے؟ چنانچہ آزادی کے بعد سے اب تک مسلم اور غیر مسلم اہل قلم اور مفکرین اس پر اظہار خیال کرتے رہے اور انگریزی اور اردو میں لکھتے رہے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی موضوع پر ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ لائق مصنف نے اسے جس محنت و کاوش، سنجیدہ نگاری اور اعتدال فکر و ذہن سے مرتب کیا ہے۔ اس کی وجہ سے اب تک جو کچھ اس مسئلے پر لکھا گیا ہے اس سب پر سبقت لے گئی ہے۔ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں مذہب سیکولرزم اور سیکولر ریاست۔ ان میں سے ہر ایک کی تعریف کرکے ان کے باہمی تعلق، مسلمانوں کے مختلف طبقات کا سیکولرزم اور سیکولر ریاست کے متعلق ردعمل اور اس کے وجوہ و اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں

مسلمانوں کی دینی تعلیم کے نظام کا اعداد و شمار اور حقائق و واقعات کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں عربی مدارس کا نصاب تعلیم، طریق درس، طلبار کی تربیت اس کے اچھے بُرے نتائج، بعض مشہور مدارس میں طلبار کی تعداد، علمار کے دینی اور سماجی اور سیاسی کارنامے وغیرہ۔ ان سب پر کلام کیا گیا ہے۔ باب سوم جس کا عنوان دینی رہنمائی ہے اس میں بڑی تفصیل اور وضاحت سے اس پر بحث ہے کہ مسلمان شروع سے آج تک ہمیشہ ہر معاملہ میں دین اسلام سے رہنمائی حاصل کرتے رہے ہیں۔ اور چونکہ دین کے عالم علمار ہوتے ہیں۔ اسی لئے مسلمان ان کے زیر اثر و قیادت رہے ہیں۔ اسی سے فتویٰ کا رواج ہوا۔ استفتا کیسے کیا جاتا ہے۔ فتویٰ کس طرح دیا جاتا ہے کتب فقہ کی جامعیت مسائل و معاملات کا کیا عالم ہے۔ مفتیوں میں اختلاف کی کیا وجہ ہے۔ ہندوستان میں اس کا کیا طریقہ رہا ہے۔ باب چہارم قانون اور شریعت پر گفتگو کیلئے مخصوص ہے۔ اس ذیل میں تقسیم سے قبل جو وقف ایکٹ اور شریعت ایکٹ بنا اور اب برسوں سے مسلم پرسنل لا پر موافق اور مخالف جو کچھ کہا اور لکھا گیا ان سب کا ایک مربوط تذکرہ ہے۔ باب پنجم میں جو مبہم سیکولرزم کے زیر عنوان ہے ان دشواریوں اور پیچیدگیوں پر تبصرہ کیا گیا ہے جو سیکولرزم کا واضح تصوّر نہ ہونے اور حقیقی سیکولرزم کے عملی فقدان کے باعث پیدا ہو رہی ہیں۔ ان پانچوں ابواب پر سیر حاصل گفتگو کے بعد ایک باب میں ان سب کا خلاصہ اور ان سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ان کو قلمبند کیا گیا ہے۔ آخر میں تین ضمیمے ہیں جو مسلم پرسنل لا سے متعلق مختلف سرکاری قوانین کی دستاویزات پر مشتمل ہیں۔ ان کے بعد کتابیات اور شروع میں ایک مختصر دیباچہ! یہ ہے کتاب کی کل کائنات۔

لیکن اس کتاب سے نہ اصل مسئلہ کا حل پیدا ہوتا ہے اور نہ اس سے کوئی قطعی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے واضعین دستور، پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کی تحریروں اور تقریروں اور جیسا کہ مصنّف نے خود لکھا

ہے کہ دستور کے مطابق حلف وفاداری میں خدا کا نام لینا پڑتا ہے۔ ان سب سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کے سیکولر ہونے کے معنی "لادینی" کے ہرگز نہیں ہیں بلکہ غیر مذہبی ہونے کے ہیں۔ اور یہ لفظ انگریزی لفظ Theocracy کی ضد ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے من حیث القوم سیکولرزم بایں معنی کو نہ صرف قبول کیا ہے، بلکہ اسے خوش آمدید کہا ہے اور اب مسلم پرسنل لا وغیرہ کے سلسلے میں حکومت سے جو شکایات یا بالفاظ صحیح تر حکومت سے جو مطالبات ہیں ان کا منشا ہرگز یہ نہیں کہ وہ سیکولرزم کو ہضم نہیں کر سکے ہیں۔ بلکہ ان مطالبات اور شکایات کی بنیاد یہ ہے کہ دستور میں بیان کردہ سیکولرزم پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ اور خود حکومت بھی اس کو تسلیم کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ مسز اندرا گاندھی نے اور کانگریس نے بار بار اعلان کیا ہے کہ مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہیں ہوگی۔ مصنّف لکھتے ہیں سیکولرزم اور سیکولر ریاست پر مسلم سماج ابھی تک ایک دبدھے کی حالت میں ہے (ص ۴۵)۔ ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ مسلمانوں کو جو تشویش ہے اور جس میں ان کے ساتھ بہت سے اپنا ئے وطن بھی شریک ہیں وہ یہ ہے کہ کہیں ہندوستان کا یہ سیکولرزم کمیونزم کے زیر اثر آکر "لادینیت" کے ہم معنی نہ ہو جائے پھر یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ سیکولرزم ایک طریق حیات ہے۔ وہ طریقہ حیات نہیں ایک نقطۂ نظر (Attitude Of Mind) ہے جس کا ظہور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ دنیاوی معاملات میں اشتراک و تعاون کی شکل میں ہوتا ہے۔ مصنّف نے کچھ مجملاً اشارے کیے ہیں لیکن ان کو دینی تعلیم اور دینی رہنمائی کے سلسلے میں اس سوال پر بھی غور کرنا چاہیئے تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تحریک آزادی کے دلو جگر

علی گڑھ مسلم لیگ کا حامی اور تقسیم کا پرجوش داعی تھا۔ اور اس کے برعکس دیوبند کانگریس کا ساتھی اور تقسیم کا سخت مخالف تھا۔ علاوہ ازیں انھیں حضرت شیخ الہند کی تحریک اور اس معاملہ میں ہندوؤں کے ساتھ ان کے تعاون کا بھی ذکر کرنا چاہیئے تھا۔ اس سے معلوم ہوتا کہ دینی تعلیم اور انگریزی تعلیم ان دونوں میں سیکولرزم یعنی مذکورہ بالا کا ذہن پیدا کرنے میں کتنا بڑا فرق ہے۔ لائق مصنف کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے یہ کتاب غیر جانبدار ہوکر لکھی ہے لیکن یہ کتاب کا ہنر نہیں بلکہ عیب ہے کیونکہ اس کی وجہ سے کتاب واقعات کی کھتونی ہوکر رہ گئی ہے اور واقعات بھی باہمدگر مختلف اور متضاد ہیں۔ اس لئے قاری کا ذہن کسی نتیجہ تک پہنچنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ بعض جگہ تعبیر کی غلطی بھی ہے مثلاً ص ۹۵ پر استحسان کو مفاد عامہ کا ہم معنی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اس کے لئے اصولِ فقہ میں ایک اور مستقل اصل ہے۔ اور اس کا نام ہے " المصالح المرسلہ " امام مالک کے ہاں اس کی بڑی اہمیت ہے رہا استحسان تو یہ قیاس خفی کا نام ہے مفادِ عامہ وغیرہ سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ ان کوتاہیوں سے قطع نظر واقعات کے تجزیاتی بیان۔ حسن ترتیب اور معلومات کے اعتبار سے کتاب قابلِ قدر اور لائق مطالعہ ہے زبان

شگفتہ اور سلیس و رواں ہے لیکن مسلمانوں کے لئے بد کہنے (ص ۱۴۲) کا لفظ ناموزوں اور نامناسب ہے

ضروری گذارش

کاغذ کی ہوشربا گرانی کے باعث برہان کی اشاعت فروری س۷۴ء میں ہی بند ہوجاتی مگر ادارہ کے ممبران اور خریداران برہان کے اصرار پر اشاعت جاری رکھی گئی تھی۔ برہان میں جو کاغذ لگایا جاتا ہے کہ گذشتہ ماہ تک ۵۵ روپے فی رم کے حساب سے مل رہا تھا۔ مگر اب ماہ جون میں وہی کاغذ ۶۶ روپے فی رم آیا ہے ــــ ٹائیٹل کا کاغذ جو ۶۰ روپے تک آجاتا تھا اب ۱۵۰ روپے رم آیا ہے۔ طباعت جو ۹/ فی پلیٹ دی جارہی تھی اب ۱۴/ فی پلیٹ تک پہونچ گئی ہے۔ ان حالات میں قارئین برہان اور ادارہ کے ممبران سے حسب ذیل امور میں تعاون درکار ہے۔

(۱)۔ برہان کا چندہ اور ممبری کی فیس بروقت ادا فرمائیں۔

(۲)۔ یاددہانی کے خطوط ارسال ہوتے ہیں۔ قارئین ان خطوط پر کم توجہ فرماتے ہیں۔ اگر رسالہ برہان جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ تو فوراً ادائیگی فرمائیں ورنہ سلسلہ منقطع کرنے کی بروقت ہدایت دیں۔

(۳)۔ سالانہ بدل اشتراک میں اضافہ زیر غور ہے جو اب ۱۵ روپے سالانہ ہے کم ہے مگر آپکو اسکے لئے تیار رہنا چاہیے۔

(۴)۔ خریداران برہان اور ادارہ کے ممبران نئے خریدار اور نئے ممبروں کی توسیع کے لئے کوشش فرمائیں۔

(۵)۔ دفتر کو خطوط روانہ کرتے وقت یا منی آرڈر ارسال کرتے وقت اپنا خریداری نمبر تحریر کرنا نہ بھولیں تاکہ جواب یا تعمیل میں تاخیر نہ ہو۔

(۶)۔ ادارہ کی فہرست طلب فرمائیے تاکہ آپ خود ادارہ کی مطبوعات سے متعارف ہوں اور دوسروں کو متعارف کرائیں۔

نیازمند

دی مغل لائن لمیٹڈ — حکومتِ ہند کا تجارتی ادارہ

پروگرام حج ۱۹۷۴ء

بمبئی سے بحری جہازوں کی روانگی : ہم انتہائی مسرت کے ساتھ ذیل میں ۱۹۷۴ء کے لئے جہازوں کی روانگی کا عارضی پروگرام پیش کرتے ہیں ۔

بمبئی سے روانگی (قبل رمضان) جدہ سے روانگی

بمبئی سے روانگی	تاریخ	جدہ سے روانگی	تاریخ
۱۔ ایس۔ ایس محمدی	۵ ستمبر ۱۹۷۴ء	۱۔ ایس۔ ایس۔ محمدی	۳۰ دسمبر ۱۹۷۴ء
۲۔ ایم۔ وی۔ اکبر	۸ ستمبر ۱۹۷۴ء	۲۔ ایس۔ ایس مظفری	۱ جنوری ۱۹۷۵ء

(بعد رمضان)

بمبئی سے روانگی	تاریخ	جدہ سے روانگی	تاریخ
۳۔ ایم۔ وی۔ اکبر	۲۱ اکتوبر ۱۹۷۴ء	۳۔ ایم۔ وی۔ اکبر	۴ جنوری ۱۹۷۵ء
۴۔ ایس۔ ایس محمدی	۲۵ اکتوبر ۱۹۷۴ء	۴۔ ایس۔ ایس۔ محمدی	۱۸ جنوری ۱۹۷۵ء
۵۔ ایس۔ ایس مظفری	۳۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء	۵۔ ایس۔ ایس۔ مظفری	۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء
۶۔ ایم۔ وی۔ اکبر	۶ نومبر ۱۹۷۴ء	۶۔ ایم۔ وی۔ اکبر	۲۳ جنوری ۱۹۷۵ء
۷۔ ایس۔ ایس۔ محمدی	۱۴ نومبر ۱۹۷۴ء	۷۔ ایس۔ ایس۔ محمدی	۶ فروری ۱۹۷۵ء
۸۔ ایس۔ ایس مظفری	۱۹ نومبر ۱۹۷۴ء	۸۔ ایس۔ ایس مظفری	۸ فروری ۱۹۷۵ء
۹۔ ایم۔ وی۔ اکبر	۲۳ نومبر ۱۹۷۴ء	۹۔ ایم۔ وی۔ اکبر	۱۱ فروری ۱۹۷۵ء
۱۰۔ ایس۔ ایس۔ محمدی	۳ دسمبر ۱۹۷۴ء	۱۰۔ ایس۔ ایس۔ محمدی	۲۵ فروری ۱۹۷۵ء
۱۱۔ ایس۔ ایس مظفری	۸ دسمبر ۱۹۷۴ء	۱۱۔ ایس۔ ایس۔ مظفری	۲۷ فروری ۱۹۷۵ء
۱۲۔ ایم۔ وی۔ اکبر	۱۰ دسمبر ۱۹۷۴ء	۱۲۔ ایم۔ وی۔ اکبر	۲ مارچ ۱۹۷۵ء

کرایہ جہاز: بمبئی۔ جدہ۔ بمبئی کے سفر کا کرایہ مندرجہ ذیل ہے۔ صرف واپسی ٹکٹ جاری کئے جائیں گے

فرسٹ کلاس	کرایہ مع خوراکی	محاصل خدمات حج وکرایہ مکان	فارن ٹریول ٹیکس	پلگرم پاس وغیرہ کی فیس	مجموعی رقم
بالغ	۳۵۰۰ روپے	۱۸۰ روپے	۵۲۵ روپے	۲۰ روپے	۴۲۲۵ روپے

اسپیشل ڈیک کلاس (صرف ایم۔ وی۔ اکبر میں) ۔ یہ انتظام مزید سہولتوں مثلاً آرام دہ بستر اور ۶ تا ۱۲ برتھ کے علیحدہ علیحدہ کیبن کے ساتھ کیا گیا ہے ۔

اسپیشل ڈیک کلاس	کرایہ مع خوراکی	محاصل خدمات حج وکرایہ مکان	فارن ٹریول ٹیکس	پلگرم پاس وغیرہ کی فیس	مجموعی رقم
بالغ	۱۴۰۰ روپے	۱۸۰ روپے	مستثنیٰ	۲۰ روپے	۱۶۰۰ روپے

ٹکٹ کلاس بالغ	۱۳۵۰ روپیے	۱۸۰ روپیے	مستثنیٰ	۲۰ روپے	۱۵۵۰ روپیے

بچے جن کی عمر ایک اور سولہ سال کے درمیان ہوگی ان کو حج پر جانے کی قطعی اجازت نہیں دی جائے گی البتہ والدین اپنے ساتھ صرف ۱۲ ماہ تک کی عمر کے بچے لے جا سکتے ہیں۔ ان کے لئے ۲۰ روپیے پلگرم پاس کے ادا کرنے ہوں گے۔ ایسے بچوں کی عمر جہاز پر سوار ہونے کی تاریخ تک بارہ ماہ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

پابندیاں

حکومت ہند نے عازمین حج کے مفاد عامہ اور ان کی بھلائی کے پیش نظر بعض پابندیاں عائد کی ہیں۔ لہٰذا عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان عائد کردہ پابندیوں کو اچھی طرح سمجھ کر درخواست دیں۔ درج ذیل عازمین کی درخواست قبول نہیں کی جائیں گی۔

(الف)۔ وہ افراد جو گذشتہ پانچ سال یعنی سنہ ۱۹۷۰ء تا سنہ ۱۹۷۴ء (جنوری) کے درمیان ہندوستان کے کسی بھی حصے سے فریضۂ حج ادا کر چکے ہیں۔ ایسے افراد حج بدل پر بھی نہ جا سکیں گے۔

(ب)۔ بچے جن کی عمر ایک اور سولہ سال کے درمیان ہوگی۔

(ج)۔ وہ عازمینِ حج جن کے پاس غیر ملکی زرِ مبادلہ ۱۱۰۰ (ایک ہزار ایک سو) سعودی ریال سے کم ہوگا جو تقریباً ہندوستانی ۲۶۰۰ روپیوں کے برابر ہوگا۔

(ح)، وہ خواتین جنہیں جہاز پر سوار ہوتے وقت پانچ ماہ یا اس سے زیادہ کا حمل ہوگا۔

(ھ)۔ درج ذیل بیماریوں اور معذوریوں میں مبتلا افراد :-

(۱)۔ دماغی امراض (۲)۔ تپ دق یا سل (۳)۔ قلبی امراض (۴)۔ شدید دمہ (۵)۔ متعدی جذام (۶)۔ دیگر شدید متعدی بیماریاں یا جسمانی کمزوریاں۔

شدید بیماری یا خاتون کے حمل پر شبہ کی حالت میں بمبئی میں ان کا طبی معائنہ کیا جائے گا لہٰذا عازمین حج غلط بیانی سے درخواست نہ دیں

درخواست بھیجنے کا طریقہ

حج [illegible] کے تمام عازمین کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ مغل لائن سے بلا قیمت تقسیم کئے جانے والے نئے درخواست فارم، ہدایت کا پرچہ حاصل کریں۔ پرانے فارم پر دی گئی درخواست قبول نہیں کی جائے گی۔

عازمین حج جن کی درخواستیں گذشتہ پانچ سال میں مسترد ہو چکی ہیں ان کو اعلان کے مطابق فوقیت دی جائے گی۔ بشرطیکہ وہ گذشتہ نامنظور درخواستیں نئی درخواست کے ساتھ منسلک کریں۔

(۱)۔ ریاست جموں و کشمیر (۲)۔ منی پور (۳)۔ جزائر اندمان نکوبار (۴)۔ لکشادیپ سے آنے والی درخواستیں کا انتخاب ریاستی حج کمیٹی ایڈمنسٹریٹر کرتے ہیں لہٰذا ان مقامات کے عازمینِ حج صرف مقامی حکام کو درخواستیں دیں گے۔

درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ

حج [illegible] کیلئے مقررہ فارم پر تمام درخواستیں ہدایات کے مطابق ہر اعتبار سے مکمل اور رجسٹرڈ پوسٹ کے ذریعے اس طرح روانہ کی جائیں کہ وہ کمپنی کے ہیڈ آفس پر ۲۶ جولائی [illegible] یا اس سے قبل

پہنچ جائیں ۔ دستی طور پر کوئی درخواست دفتر کے کاؤنٹر پر قبول نہیں کی جائے گی ۔ ۲۶ جولائی ۱۹۶۸ء کے بعد پہنچنے والی کوئی درخواست قبول نہیں کی جائے گی ۔ اور اسے بھیجنے والے کو لوٹا دیا جائے گا ۔

درخواست فارم | نئے جاری کردہ درخواست فارم اور ہدایات کا پرچہ برائے حج ۱۹۶۸ء صرف عازمین حج کو ان کی گذارش پر مغل لائن مفت مہیا کرتی ہے ۔ عازمین حج کے لئے لازمی ہے کہ وہ حج ۱۹۶۸ء کے لئے چھپے ہوئے نئے فارم کا استعمال کریں اور پہلے کے فارم قطعاً استعمال نہ کریں ۔ یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہئے کہ فارم مہیا کرنے ، درخواستیں اور کرایہ کی رقم وصول کرنے یا اس طرح کا کوئی کام انجام دینے کے لئے مغل لائن نے اپنی کوئی شاخ ، نمائندہ یا ایجنٹ مقرر نہیں کیا ہے ۔

مذکورہ بالا معلومات حج ۱۹۶۸ء کے لئے مغل لائن کے جاری کردہ اعلان کا اختصار ہے ۔ مکمل تفصیلات اور درخواست فارم کے لئے لکھئے ۔

مغل لائن لمیٹڈ

تار کا پتہ: "مغل" بمبئی — Mogal Bombay

۱۶ ربنک اسٹریٹ ، فورٹ بمبئی ۲۳-۴۰۰

ٹیلی فون ۲۵۶۸۳۵

ٹیلیکس ۲۰۴۹-۰۱۱

سنہ ۱۹۵۴ء حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ اسلام والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔
تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

سنہ ۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

سنہ ۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید مع اضافہ و ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

سنہ ۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبر، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

سنہ ۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

سنہ ۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، بصائر و عبر

سنہ ۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ ـ ۳۰۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

سنہ ۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے، برٹینیا
تاریخ ہند پر نئی روشنی

سنہ ۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں، معارف الآثار۔
نیل سے فرات تک۔

سنہ ۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم۔ تاریخ روہیلکھنڈ ضلع بجنور۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی اول

سنہ ۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

سنہ ۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

سنہ ۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم۔ مرد عشق۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

سنہ ۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

سنہ ۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

سنہ ۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

سنہ ۱۹۷۰ء حیات عبدالحی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

سنہ ۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

سنہ ۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر۔ انتخاب الترغیب والترہیب۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

Regd. No. D. (D) 231 Phone 262815 JUNE

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ اسلام کا اقتصادی نظام ۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام ۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت ۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام ۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق ۔ فہم قرآن ۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" ۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اوّل ۔ وحی الٰہی ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول ۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال ۔ تاریخ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ" ۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اوّل ۔ اسلام کا نظامِ حکومت ۔ سرایہ ۔ تاریخ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم ۔ لغات القرآن جلد دوم ۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم ۔ قرآن اور تصوف ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اوّل ۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو ۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت ۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم ۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم ۔ تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ" ۔ تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اوّل"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر ۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغربِ اقصیٰ" تدوینِ قرآن ۔ اسلام کا نظامِ مساجد ۔
اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا ۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم ۔ عرب اور اسلام ۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافت عثمانیہ" جارج برنارڈ شا ۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر ۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اوّل (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ کتابتِ حدیث ۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت ۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت ۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ ۔

برہان

جلد ۷۳ | ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۷۴ء | شمارہ ۱

نظرات

اس مہینہ برہان کو ۵۶ صفحات پر مشتمل دیکھ کر آپ کو حیرت نہ ہونی چاہئے، کاغذ کی غیر معمولی گرانی اور اُس پر بھی اُس کی نایابی کے باعث اب حالات اس درجہ سخت اور صبر آزما ہو گئے ہیں کہ تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو اختیار کرنا ناگزیر تھا۔ اور وہ یہ ہیں (۱) برہان کی اشاعت بند کر دی جائے۔ (۲) ضخامت حسب معمول رکھی جائے مگر زر چندہ کی رقم میں اضافہ کر دیا جائے۔ (۳) چندہ یہی رکھا جائے مگر ضخامت کم کر دی جائے۔ قارئین برہان کے مفاد کے پیش نظر سر دست تیسری صورت اختیار کی گئی ہے لیکن حالات کا دباؤ اس قدر شدید ہے کہ اگر ان میں تبدیلی نہ ہوتی تو نہیں کہا جا سکتا کہ کل کیا ہو گا!

افسوس ہے کم و بیش تین برس سے ہندوستان اور پاکستان میں آمد و رفت اور رسل و رسائل کا جو دروازہ بند ہے وہ کسی طرح کھلنے میں نہیں آتا۔ اور مستقبل قریب میں اس کے کھلنے کی جو توقع پچھلے دنوں پیدا ہو گئی تھی اب وہ امید موہوم ہوتی جا رہی ہے۔ لاکھوں انسان ہیں جو ادھر اور اُدھر دونوں طرف اپنے اعزا، اقربا اور دوستوں کے دیکھنے اور غم و شادی میں ان کے شریک ہوتے کو ترس گئے ہیں۔ ملاقات تو بڑی چیز ہے خیریت و عافیت معلوم کرنے تک میں دشواریاں اور زحمتیں ہیں۔ ایک ملک میں جو علمی اور ادبی لٹریچر پیدا ہو رہا ہے دوسرے ملک والے اس سے بالکل بے خبر ہیں۔ غرض کہ سیاست ہماری زندگی پر اب اس طرح مسلط ہو گئی ہے کہ علم و فن۔ شعر و ادب، ثقافتی یگانگت اور انسانیت عامہ کے تقاضے اور مطالبات، سب سیاست کے بھاری پتھر کے نیچے دب کر رہ گئے ہیں۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

ابھی گذشتہ مہینہ عزیزی ڈاکٹر محمد اسلم یہاں آئے تو میرے لئے پاکستان میں مطبوعہ کتابوں کا ایک بنڈل لیتے آئے تھے جن کو وہاں کے احباب نے ان کی معرفت ارسال کیا تھا۔ اس دورِ بے خبری و بے تعلقی میں اس بنڈل کی آمد ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ اس لئے ان میں سے چند اہم کتابوں کا تذکرہ کرکے قارئین برہان کو بھی اس میں شریک کر لینا مناسب معلوم ہوا۔

(۱) سلوک الملوک از فضل اللہ بن روزبہان اصفہانی : اسلامی نظم و نسقِ حکومت پر یہ بہترین کتاب ہے جو نویں صدی ہجری میں تالیف ہوئی، ڈاکٹر محمد اسلم صدر شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور نے قیام انگلینڈ کے زمانہ میں پروفیسر آربیری کے مشورہ سے اس کا مع تعلیقات کے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اب یونیسکو کی مدد سے یہ ترجمہ ندوۃ المصنفین، لاہور کی طرف سے بڑے اہتمام سے شایع ہوا ہے، ضخامت ۴۴۵ صفحات۔ ٹائپ، طباعت، کاغذ اور گٹ اپ سب اعلیٰ قیمت -/۵۵

(۲) سید علی ہمدانی از ڈاکٹر سید اشرف ظفر۔ سید علی ہمدانی جو عام طور پر شاہ ہمدان کے لقب سے معروف ہیں آٹھویں صدی ہجری میں وادیٔ کشمیر کے بہت مشہور اور بلند پایہ صوفی اور بزرگ تھے۔ یہ کتاب ان کے حالات و سوانح پر پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔ مطبوعہ ندوۃ المصنفین، لاہور، ضخامت ۳۲۸ صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ، قیمت 10/50

(۳) صحیفہ اقبال نمبر حصہ اول و دوم مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی و جناب کلب علی خاں فائق، علامہ اقبال کی شخصیت، نجی زندگی، فن اور اُن کے پیغام پر نہایت معلومات افزا اور بصیرت افروز مقالات کا مجموعہ! ضخامت ۵۵۰ صفحات۔ ٹائپ اور طباعت اعلیٰ سالانہ چندہ -/۱۵

(۴) قانونی لغت از مولوی تنزیل الرحمن صاحب ایڈوکیٹ، قانون کے انگریزی لفظوں اور اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ اور اس اعتبار سے اہم کتاب تقطیع کلاں

ضخامت ۴۳۶ صفحات، کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت -/18

(۵) کاشف الاسرار یعنی سورۂ فاتحہ کی تفسیر از مولانا عبدالسلام نیازی مرحوم کتاب ابھی پریس سے نہیں آئی ہے، جلدی میں اس کو اسی ناتمام حالت میں بھیج دیا ہے۔

(۶) تاریخ تصوف، از مولانا عبدالصمد صارم الازہری ضخامت ۴۰۰ صفحات کتابت وطباعت معمولی۔ قیمت -/15

(۷) شعر العرب جلد اول از مولانا عبدالصمد صارم الازہری، ابن قتیبہ کی مشہور کتاب "الشعر والشعراء" کا اردو ترجمہ ضخامت ۴۰۰ صفحات، کتابت وطباعت بہتر۔

(۸) مقام غالب از مولانا عبدالصمد صارم ۔ غالب کے کلام کا ایک تنقیدی مطالعہ: ضخامت ۲۷۰ صفحات ۔

سطور بالا میں کتابوں کا صرف تذکرہ اور اُن کا تعارف کرایا گیا ہے، ان پر تبصرہ پھر کبھی حسبِ موقع وگنجائش ہوگا۔

ندوۃ المصنفین دہلی کی ایک جدید کتاب

تہذیب کی تشکیلِ جدید

اخلاق وعادات حسنِ ذوق وعمل قوموں کے اصول وقوانین اُن کی زندگی کے نصب العین وغیرہ یہ چیزیں ہیں جو تہذیب کے دائرے میں آتی ہیں۔ مغربی تہذیب دو گروہوں میں بٹی ہوتی ہے ایک گروہ تو وہ ہے جو مشرق کو مغرب میں دراندازی کا موقعہ دینا نہیں چاہتا دوسرا گروہ جو تکوین وتشکیل کے ہر مرحلہ میں مشرق ہی کو اثر انداز مانتا ہے اس افراط وتفریط کی وجہ قومی عصبیت صلیبی جنگیں مطالعہ وتحقیق کی کمی وغیرہ ہے ۔

مصنف نے اس کتاب میں تشکیلِ جدید کے بنیادی خدوخال بیان کرنے کے ساتھ یہ کوشش کی ہے کہ زندگی میں مغربی تہذیب کے اثرات کا کسی قدر تفصیلی ذکر ہو جائے تاکہ دونوں کے تقابلی مطالعہ میں سہولت ہو مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک محققانہ کتاب کتاب کے مطالعہ سے تہذیب کی تشکیلِ جدید کے تمام عنوانات روشن ہو کر سامنے آجاتے ہیں ۔

عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا اور اُن کے مآخذ پر ایک نظر

از سید احمد اکبر آبادی

(۲)

اب حج کے موسم میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل سے گفت و شنید اور ان کو دعوتِ اسلام کا پروگرام بنایا تو اُن میں جو لوگ دعوتِ اسلام کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتے تھے ان سے بیعت لینے کے لئے ایک محفوظ جگہ کی ضرورت تھی، اس کے لئے آپ نے عقبہ کا انتخاب فرمایا، عقبہ کے معنی گھاٹی ہیں جو دو پہاڑوں کے بیچ میں ہوتی ہے، ڈاکٹر محمد حمید اللہ جنھوں نے بڑی محنت اور شوق و ذوق سے حجازِ مقدس کے اہم تاریخی مقامات کو خود جا کر دیکھا اور واقعات کی روشنی میں ان کا جغرافیائی جائزہ لے کر اُن کے حدود کا تعین و تشخص کیا ہے اس عقبہ کے متعلق لکھتے ہیں :-

"منیٰ کے قریب راستے کے دونوں طرف پہاڑوں کی ایک مسلسل دیوار ہے، مکہ سے جائیں تو حدودِ منا شروع ہوتے کو بمشکل ایک فرلانگ رہتا ہے کہ بائیں ہاتھ پر اس پہاڑی دیوار میں ایک چھوٹا سا خم آتا ہے جو کمان بلکہ نصف دائرہ کی شکل کا ہے اور اتنا بڑا کہ لاہور کی جامع مسجد یا حیدرآباد کی مکہ مسجد مع اپنے صحنوں کے اس کے اندر سما سکیں، یہ مقام عقبہ کہلاتا ہے، اس کے اندر ایک بہت بڑا کنواں ہے اور اندر آج کل زراعت بھی ہوتی ہے، اور جس مقام

پرشہور بیعت ہائے عقبہ ہوئی تھیں، وہاں ایک کافی بڑی مسجد بھی ہے، جس پر
گو چھت نہیں ہے، لیکن قبلہ رُخ اور مناکی سمت کی بیرونی دیوار پر دو قدیم
کوفی کتبے ہیں۔ جسے آج کل مسجد العشرہ کہتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ یہی مسجدِ بیعتِ
عقبہ ہے[1]۔

عقبہ میں تین بیعتیں | یہی وہ مقام ہے جہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین برس مسلسل تین بیعتیں لی ہیں پہلی بیعت ماہ رجب ۱۱ ھ نبوی میں یثرب (مدینہ) کے قبیلہ خزرج کے چھ افراد سے لی۔ موسم حج کے موقعے پر یہ لوگ بھی آئے ہوتے تھے۔ عقبہ کے قریب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے ملاقات ہوئی تو آپ نے حسب معمول ان کو اسلام کی دعوت دی اور قرآنِ مجید کی چند آیات پڑھیں یثرب میں ان لوگوں کا رہن سہن یہود کے ساتھ تھا اور چوں کہ یہ اہلِ کتاب تھے اس لئے ان کو معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آخر الزماں آنے والا ہے، اس بات کا چرچا اور تذکرہ وہ آپس میں کرتے رہتے تھے اور کبھی کبھی اوس اور خزرج کے لوگوں سے بھی کہتے تھے کہ جب وہ پیغمبر آئے گا تو ہم اس کی اطاعت قبول کر کے تم لوگوں پر حکومت کریں گے۔ قرآنِ مجید کی اس آیت میں یہود کی ان باتوں کی طرف ہی اشارہ کیا گیا ہے:۔

وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ	پہلے تو یہ لوگ (یہود) پیغمبر کے ذریعہ کافروں پر فتح پانے کی باتیں کرتے تھے، لیکن جب وہ وقت آگیا جسے یہ جانتے تھے تو یہ پیغمبر کا انکار کر بیٹھے۔

اس بنا پر اب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حق ترجمان سے ان لوگوں نے اسلام کا پیغام اور قرآنِ مجید کی آیات سنیں تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے ان کے دل

[1] عہد نبوی کے میدانِ جنگ ص ۱۲

کے دروازہ پر دستک دی ہو۔ وہ بہت متاثر ہوئے، آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بولے: ہم کو جلدی کرنی چاہئے، کہیں یہود ہم پر سبقت نہ لے جائیں۔ اور فوراً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کر لی۔

دوسرے برس یعنی ۱۱ھ نبوی میں موسم حج کے موقع پر بارہ اشخاص آئے، ان میں پانچ تو وہی گزشتہ سال کے تھے، ان کے علاوہ سات نئے تھے، یہ بھی مسلمان ہو گئے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی بیعت لی جس کو العقبۃ الثانیہ کہا جاتا ہے، تیسرا برس یعنی ۱۲ھ ن۔ ہوا تو اس مرتبہ لوگ کثرت سے آئے، ان میں وہ انصار بھی تھے جو مسلمان ہو چکے تھے اور ان کے علاوہ کافر بھی بڑی تعداد میں تھے، ان میں سے ۷۲ آدمیوں نے جن میں دو عورتیں بھی تھیں شب کے کسی حصہ میں پوشیدہ طور پر عقبہ پہنچ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ اس کو العقبۃ الثالثہ کہتے ہیں[1]۔

مدینہ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت | اب اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے مکہ کا دروازہ بند تھا تو خدا نے اس کے لئے مدینہ کا دروازہ کھول دیا۔ پہلی بیعت کے بعد ہی وہ چھ انصار مدینہ واپس لوٹے تو جاتے ہی انھوں نے اسلام کی تبلیغ واشاعت شروع کر دی یہاں تک کہ ارباب سیر کا بیان ہے کہ مدینہ میں انصار کا ایک گھر بھی ایسا نہیں تھا جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ نہ ہو، پہلی بیعت جن حضرات نے کی تھی وہ سب قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے، دوسری بیعت سے اس دائرہ میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور اس مرتبہ جن لوگوں نے بیعت کی ان میں دو شخص ابوالہیثم بن التیہان اور عویم بن ساعدۃ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے، جب یہ لوگ مدینہ واپس ہونے لگے تو آں حضرت صلی اللہ

---

[1] ان تینوں عقبات کا مفصل تذکرہ ابن ہشام، ابن سعد، طبری، ابن عبدالبر، ابن حزم، ابن سید الناس ابن کثیر، اور النویری سب نے کیا ہے اور متعلقہ اشخاص وافراد اور ان کے قبیلوں کے نام لکھے ہیں۔

علیہ وسلم نے حضرت ابن مکتوم اور حضرت مصعب بن عمیر کو جو المقری القاری (معلم اور قاری) کے لقب سے مشہور ہیں ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ انصار میں جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے ان کو قرآن مجید پڑھاتے، اسلام کے احکام و مسائل کی تعلیم دیتے اور نماز میں امامت کرتے تھے، اس وقت تک نماز جمعہ کی فرضیت کا حکم نہیں ہوا تھا اس کے باوجود حضرت مصعب بن عمیر انصار کو جن کی تعداد اس وقت چالیس تھی مدینہ کے قرب میں بقیع الخضمات نام کی ایک جگہ تھی وہاں جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے، دار قطنی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کی ہے کہ یہ مصعب بن عمیر کا اجتہاد نہیں تھا۔ بلکہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ایما کیا تھا۔

حضرت مصعب صرف معلم اور امام نہیں تھے، بلکہ ان کا فرض اسلام کی تبلیغ و اشاعت بھی تھا، اس فرض کو انھوں نے اس خوبی سے انجام دیا کہ انصار کثرت سے ان کے ہاتھوں پر مسلمان ہوئے یہاں تک کہ اب انصار کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جس میں اکے دکے لوگوں کو چھوڑ کر مسلمان نہ ہوں[1]۔

عقبۂ ثالثہ کے موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ اشخاص کو جن میں نو قبیلۂ خزرج کے تھے اور تین قبیلۂ اوس کے نقبا بھی مقرر فرمایا تھا۔ یہ نقیب کی جمع ہے، نقیب اُس شخص کو کہتے تھے جو اپنے قبیلہ میں سب سے زیادہ ممتاز اور معتمد علیہ ہوتا تھا۔ قبیلہ کے حالات اور ان کے اسرار سے واقف ہوتا تھا اور ضرورت کے وقت ان کی نمائندگی بھی کرتا تھا۔

بیعت کن چیزوں پر لی گئی | عقبہ کی ان تینوں بیعتوں کا ذکر تمام کتب سیرت میں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ بیعت کن چیزوں پر لی گئی تھی اور اس معاملہ میں تینوں بیعتوں کا حال یکساں ہے یا اُن میں فرق ہے اور اگر فرق ہے اور یقیناً ہے تو کیوں ہے حقیقت یہ ہے عقبہ

---

[1] ابن عبدالبر ص ۷۳

اولیٰ کے موقع پر جو بیعت لی گئی اُس کی نسبت حافظ ابن عبدالبر صرف اس قدر لکھتے ہیں

فاسلموا به وبایعوا — یہ لوگ اسلام لے آئے اور انھوں نے بیعت کی[1]

عقبۂ ثانیہ کے موقع پر جو بیعت ہوئی اُس کی نسبت تحریر فرماتے ہیں۔

فبایع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ ھولاء عند العقبة علی بیعة النساء، ولم یکن أمر بالقتال بعد[2] — آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کے پاس ان لوگوں سے ایسی بیعت لی جیسی عورتوں سے لی جاتی ہے اور اب تک جنگ کا حکم نہیں ہوا تھا۔

یعنی یہ بیعت صرف اسلام قبول کرنے پر تھی اور اُس کے بنیادی اجزا یہ تھے کہ بیعت کرنے والا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرے گا۔ سرقہ اور زنا نہیں کرے گا، اولاد کو قتل نہیں کرے گا، کسی پر تہمت نہیں لگائے گا اور احکام خداوندی کی نافرمانی نہیں کرے گا۔

لیکن اب عقبۂ ثالثہ کا موقع آیا تو بیعت کا مضمون بدل جاتا ہے، ابن ہشام کی روایت کے مطابق بیعت کرنے والے نے اپنا ہاتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دیا تو آپ نے فرمایا :۔

"میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم میری حفاظت اسی طرح کرو گے جس طرح تم اپنی عورتوں اور بچوں کی کرتے ہو" اس کے جواب میں ان میں سے ہر شخص نے کہا : "قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے، ہم آپ کی حفاظت اپنی عورتوں اور بچوں کی طرح کریں گے، یا رسول اللہ! آپ ہماری بیعت قبول فرمائیے۔ ہم لوگ جنگوں کی گود میں پلے اور بڑھے ہیں اور

---

[1] ابن عبدالبر ص ۷۱
[2] ابن عبدالبر ص ۷۲
[3] ابن ہشام ج ۲ ص ۸۴

جنگ آزمائی ہم کو باپ دادا سے ورثہ میں ملی ہے[1]۔

حافظ ابن عبد البر نے اسی مضمون پر اتنا اور اضافہ کیا ہے :-

وان یرحل الیهم هو واصحابه — اور نیز اس پر بیعت لی کہ حضور اور آپ کے ساتھی مدینہ چلے جائیں گے۔

اور پھر آگے چل کر کہتے ہیں :-

وکانت البیعة لیلة العقبة الثالثة علی حرب الاسود والاحمر، واخذ لنفسه واشترط علیهم لربه، وجعل لهم علی الوفاء بذالك الجنة۔ (ص ۷۹)

عقبۂ ثالثہ کی شب میں آپ نے جو بیعت لی تھی، آپ نے خود اپنی حفاظت کا بھی ان سے وعدہ لیا اور اگر انھوں نے یہ وعدہ پورا کیا تو آپ نے اس پر ان کو جنت کی بشارت دی۔

عقبۂ ثالثہ کی اہمیت | مورخین وارباب سیر عقبۂ ثالثہ کی بیعت پر سرسری طور پر گذر گئے ہیں، لیکن درحقیقت یہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ جو شخص بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نفسیاتی مطالعہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ کس واقعہ کا آپ کے ذہن میں کیا تاثر اور کیا ردعمل پیدا ہوا وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اب جب کہ ایک طرف کفار قریش کی شیطنت، فتنہ پردازی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سخت معاندانہ سرگرمیوں میں روزبروز اضافہ ہوتا جارہا تھا اور دوسری جانب مدینہ میں اسلام کے قدم جم رہے اور اس کو پھولنے پھلنے کا موقع مل رہا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبۂ ثالثہ کے وقت ہی کفار قریش سے جنگ کرنے اور ابھی سے اس کی تیاریاں شروع کر دینے کا قطعی فیصلہ کر لیا تھا، یہ صحیح ہے جیسا کہ ابوبکر جصاص نے کتاب احکام القرآن میں نقل کیا ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ قتال ہجرت سے پہلے ممنوع

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۴۸

یکن جس طرح ہجرت کا حکم بعد میں نازل ہوا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
ن کا فیصلہ پہلے سے کر رکھا تھا، چنانچہ خود عقبۂ ثالثہ کی بیعت میں اس کا ذکر ہے
ے اسی طرح آیاتِ قتال (۱) وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا
تَعْتَدُوا الآیۃ اور (۲) أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ
نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ[۲] اگرچہ ہجرت کے بعد نازل ہوئیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ
ضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کا منصوبہ ہجرت سے پہلے ہی بنالیا تھا۔ البتہ
منصوبہ نے عملی شکل اُس وقت اختیار کی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو
نہ اجازت مل گیا۔

کیوں ناگزیر تھی | یہ منصوبہ جنگ کیا تھا؟ اس کا مفصل تذکرہ تو بعد میں اپنے موقع ومحل
ئے گا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے جنگ کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ یہی
وال ہے جس کا صحیح جواب دریافت نہ ہونے کے باعث آں حضرت صلی اللہ علیہ
کے غزوات وسرایا سے متعلق غیر مسلموں میں غلط فہمی پیدا ہوئی اور انھوں نے اسلام
خون کیا اور زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ عام مسلمان تو درکنار بعض علما بھی غلط
سے محفوظ نہ رہے،

لموں کی غلط فہمی | غیر مسلموں کی غلط فہمی کیا تھی؟ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ اسلامی مورخین
بت مغازی کے سلسلہ کا جو واقعہ جس طرح سنتے ہیں روایت کر دیتے ہیں اور از راہ
یاط روایت کو اپنی رائے کی آمیزش سے محفوظ رکھنے کی غرض واقعہ کا سبب بیان نہیں
ے اس طرح احتیاط فی الروایۃ کا حق تو ادا ہو گیا، لیکن اس سے عام ناظرین پر

اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ مگر خبردار حد سے تجاوز نہ کرنا۔
جو لوگ مظلوم ہونے کی بنا پر جنگ کرتے ہیں ان کو جنگ کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے اور
بے اللہ ان لوگوں کی نصرت پر بہر وجوہ قدرت رکھنے والا ہے۔

یا اشہر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرتے اور اُن کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں، صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں، اُسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔ (سیرت النبی ج ا ص ۵۸)

بعض علماء کی غلط فہمی | مولانا شبلی نے غیر مسلموں کی جس غلط فہمی کا ذکر کیا، بعینہٖ یہ تو نہیں لیکن بعض علماء نے اسی کے قریب قریب اظہار خیال کیا ہے، مثلاً مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب داناپوری رقمطراز ہیں:-

"جب حق واضح ہوگیا اور باطل ظاہر ہوگیا تو چونکہ تبلیغ اور حمایت احکام الٰہی بجمیع لوازمہ مامور بہ ہے اس لئے سارے کافروں سے کافۃً وہ ابتدا کریں یا نہ کریں مقاتلہ بھی مامور بہ ہوا۔ بشرطیکہ نیت محض تبلیغ احکام ہو، حق وباطل کے ظاہر ہو جانے کے بعد حق کے لئے مجبور کرنا اور باطل کو جبراً ترک کرانا اکراہ فی الدین نہ رہا"

اسی سلسلۂ کلام میں آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"آپ (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نے شاہان عالم اور اقوام دنیا کو دعوت توحید دی اور بتا دیا کہ عدم قبول کی حالت میں ہم بامر اللہ جہاد بالسیف پر مامور ہیں۔ جیسا کہ ان خطوں کی عبارتوں سے واضح ہے۔ (اصح السیر ص ۴۱۱)

جنگ کا فیصلہ کرنے کی حقیقی وجہ | اس بناء پر ضروری ہے کہ اس سوال کے جواب پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے قبل ہی جنگ کرنے کا جو فیصلہ کیا اور جس کی تیاری آپ نے عقبۂ ثالثہ سے شروع بھی کردی اُس کی حقیقی وجہ کیا تھی؟

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی منصب | اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو منصب عطا فرمایا تھا وہ رسالت ہے، یعنی ایک دین قیم جو انسان کی دینی اور دنیوی، ظاہری اور باطنی زندگی کے فوز و فلاح کا ضامن اور کفیل تھا آپ اُس کے داعی

اور مبلغ بنا کر بھیجے گئے تھے، لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں نہایت اہم اور یاد رکھنے کی ہیں
(۱) ایک یہ کہ جہاں تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت اور اُس کے متعلقہ اُمور کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے اُس کو قرآن مجید میں بار بار بڑی شدت اور قوت سے بیان فرمایا اور حضور کو اس طرف متوجہ کیا ہے: مثلاً۔ قُمْ فَانْذِر: آپ کھڑے ہو جئے اور عذابِ الٰہی سے ڈرا دیجئے، بلغ ما انزل الیک: جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے اُس کی تبلیغ کیجئے، فاصدع بما تؤمر: جن چیزوں کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے واشگاف بیان کیجئے،

(۲) دوسری یہ کہ تبلیغ و تذکیر اور دعوت و ارشاد کے حکم کے ساتھ تکرار و تاکید کے پیرایہ بیان میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ ہدایت و ضلالت کی کنجی اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اور اس کا دار و مدار ہر انسان کی اپنی فطری استعداد و صلاحیت پر ہے اس لئے آپ کا جو کام ہے وہ کرتے رہئے اور اس مخمصہ میں ہرگز نہ پڑیئے کہ کون آپ کی دعوت کو قبول کرتا ہے اور کون نہیں کرتا ان سب کا معاملہ خدا کے سپرد ہے:۔ چنانچہ فرمایا گیا:۔

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ۝ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝ (الغاشیہ)

پس اے محمدؐ آپ ان کو سمجھا دیجئے، اور آپ تو صرف سمجھانے والے ہی ہیں اور ان لوگوں پر کوئی داروغہ تو نہیں ہیں، مگر ہاں! ان میں جو لوگ روگردانی اور کفر کریں گے، اللہ ان کو بڑا عذاب دے گا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:۔

فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ (آل عمران)

پھر یہ لوگ اگر مسلمان ہو گئے تو ہدایت یاب ہو گئے، اور اگر انھوں نے روگردانی کی (تو آپ

کو اس سے کیا) آپ کا فرض تو صرف ابلاغ ہے

ایک آیت میں آپ کو یاد دلایا گیا :۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ۝ البقرہ

ہم نے تو بے شبہ آپ کو حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، اور اصحاب دوزخ کی نسبت آپ سے باز پرس نہ ہوگی۔

ایک آیت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرے مبلغین و داعیان حق کے لئے ایک عام اصول اور کلیہ کے طور پر بیان کیا گیا۔

لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

جب تم ہدایت پر ہو تو جو لوگ گمراہ ہیں وہ تمہارا کیا بگاڑ لیں گے۔

ہدایت اور ضلالت بے شک اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، لیکن جو لوگ بار بار کی تذکیر اور انذار و تبشیر کے باوجود پیغام حق کو قبول نہیں کرتے تھے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت عالم ہونے کے باعث اُس کا سخت صدمہ اور ملال ہوتا تو ایک امر طبعی تھا ہی، ملاحظہ فرمایئے اللہ تعالیٰ کس شفقت آمیز تہدید کے پیرایہ میں اس صدمہ کو حضور کے دل سے دور کرنا چاہتا ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا

(الکہف)

اگر یہ لوگ ان باتوں پر ایمان نہ لائے تو شاید آپ افسوس کے مارے اپنا جی ہلکان کر دیں گے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا :۔

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ (النمل)

آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور آپ نہ بہروں کو ہی اپنی پکار نہیں سنا سکتے جب یہ رو گرداں ہو کر اور پیٹھ پھیر کر چلتے ہیں

ایک اور مقام پر فرمایا گیا :-

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (القصص)

جس کو آپ چاہیں، ہدایت نہیں دے سکتے، لیکن ہاں! اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے،

اچھا! اگر لوگ آپ کی دعوت قبول نہ کریں اور آپ کے پیغام پر کان نہ دھریں تو اس حالت میں حضور کو کیا کرنا چاہیئے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا جواب بھی پردۂ راز میں نہیں رکھا۔ صاف ارشاد ہوا :-

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔ (التوبہ)

اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو آپ کہئے: "مجھ کو اللہ کافی ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں نے اُس پر بھروسہ کیا ہے اور وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے۔

اور یہ آیت تو پہلے بھی آ چکی ہے :-

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ

اگر یہ روگردانی کریں تو بہرحال آپ کا فرض تو صرف ابلاغ ہی ہے۔

یہ جو کچھ آپ نے پڑھا اُس سے بلا شائبۂ ریب و شک یہ صاف ظاہر ہے کہ بحیثیت رسول اللہ ہونے کے آپ کا فرضِ منصبی صرف ابلاغ۔ دعوت اور تذکیر تھا اور آپ یہ دیکھنے کے ہرگز مکلف نہیں تھے کہ کون آپ کا پیغام قبول کرتا ہے اور کون قبول نہیں کرتا۔ کون ایمان لاتا ہے اور کون کفر پر قائم رہتا ہے پس جب کسی شخص کے مسلمان ہونے نہ ہونے کی ذمہ داری اور مسئولیت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد ہی نہیں ہوتی تو ظاہر ہے اسلام کے قبول نہ کرنے پر جنگ کرنا یا کسی کو اُس کے قبول کرنے پر مجبور کرنا اسلام میں کیونکر جائز ہو سکتا ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم

جن کی پوری حیاتِ طیبہ قرآن کی عملی تفسیر ہے آپ سے اس کا صدور کیوں کر ممکن ہے۔

دین میں جبر نہیں | جو لوگ اسلام میں جبر کی بات کرتے ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہوں یا مسلمان، وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اسلام کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ جبر کے ساتھ جمع ہو ہی نہیں سکتا، کیوں کہ اسلام میں ایمان کی پہلی شرط ہے تصدیق بالجنان، یعنی دل سے سچ جاننا۔ اور ظاہر ہے جبر سے یہ تصدیق حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ - قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ) — دین میں زبردستی کا کیا سوال؟ حق تو باطل سے صاف صاف متمیز ہو چکا ہے۔

علامہ سید رشید رضا تفسیر المنار میں اسی موقع پر لکھتے ہیں:-

قاعدة كبرىٰ من قواعد دين الاسلام وركن عظيم من اركان سياسته، فهو لا يجوز اكراه احد على الدخول فيه (بحوالہ تفسیر ماجدی ج ا ص ۱۰۰۴) — یہ آیت دین اسلام کے ایک اہم ضابطہ اور اسلامی سیاست کے ایک عظیم رکن کی نشاندہی کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے پر کسی کو مجبور کرنا جائز نہیں ہے۔

علامہ ابن جوزی نے اس آیت کے اسبابِ نزول تین لکھے ہیں، لیکن سب سے زیادہ قوی اور قابلِ ترجیح جو سبب ہے وہ یہ ہے کہ جب بنو نضیر کو مدینہ سے جلا وطن کیا گیا تو ان لوگوں میں انصار کے چند بیٹے بھی تھے، انصار نے کہا: ہم اپنے بیٹوں کو یہود کے ساتھ نہیں جانے دیں گے اور ان کو اسلام پر مجبور کریں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوتی (زاد المسیر فی علم التفسیر ج ا ص ۳۰۵)[ا]

بہر حال یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارِ مکہ کے

[ا] جن چند حضرات نے آیت کے ان دو لفظوں کے متعلق خواہ مخواہ ناسخ و منسوخ کی بحث اٹھائی ہے اس موقع پر ان کی نسبت اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

اف جنگ کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ ہرگز اس لئے نہیں تھا کہ یہ لوگ دعوتِ اسلام کو دل کیوں نہیں کرتے اور دینِ قیم کے حلقہ بگوش کیوں نہیں بنتے، بلکہ یہ فیصلہ اس پر مبنی تھا کہ بحیثیت پیغمبر کے آپ کا جو فرضِ منصبی ہے، یعنی ابلاغ، دعوت، تذکیر اور انذار و تبشیر لوگ اسے انجام نہیں دینے دیتے، اُس میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں، حضور کی تذلیل و توہین، استہزاء و تمسخر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے، جو لوگ مسلمان ہو گئے ہیں ان کا جینا مشکل کر دیا ہے، دینِ حق کے ساتھ دشمنی کی انتہا ہے کہ اس دین کے داعی کے قتل کر دینے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں، مطعم بن عدی کی پناہ میں آنے کے بعد حضور نے مکہ سے باہر فریضۂ رسالت کو انجام دینا شروع کیا ہے تو ان ظالموں نے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ آپ جہاں جاتے ہیں یہ بھی پہنچ جاتے ہیں، اور جن لوگوں سے آپ خطاب فرماتے ہیں ان کو طرح طرح سے ورغلاتے، ڈراتے اور دھمکاتے ہیں، حضور کے خلاف اُن کو بھڑکانے اور مشتعل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عصبیتِ جاہلیہ کیا بُری شے ہے کہ انسان دن کو شبِ تاریک کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے، ورنہ وہ لوگ جو غزواتِ نبوی پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں اگر اُن میں ذرا بھی انصاف پسندی اور حق شناسی کی رمق ہو تو انھیں اور ان کے ساتھ ساری دنیا کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عظیم احسان کا شکرگذار ہونا چاہئے کہ آپ نے سخت ترین لڑائیاں لڑ کر انسان کے لئے ضمیر کی آزادی، عقیدہ کی آزادی، عمل کی آزادی، اور اظہار و بیان کی آزادی کی راہیں کشادہ کیں اور صدیوں کی جہالت اور تعصب نے انسانی فکر و ذہن کو جمود و بے حسی، غلط بینی و غلط اندیشی کی جن زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا انھیں پاش پاش کیا، جب تک ایسا نہ ہوتا نہ انسانی تہذیب و تمدن میں ترقی ہو سکتی تھی، نہ علوم و فنون میں ارتقاء ہو سکتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان اپنی انسانیت کی متاعِ گم شدہ کو واپس نہیں پا سکتا تھا آج یورپ کو اپنے عہدِ تعقل (THE AGE OF REASON) پر فخر ہے، جس کا آغاز سولھویں صدی سے ہوتا ہے،

لیکن اس عہد کا اصل سرچشمہ کہاں ہے، سب سے پہلے کس نے انسانی عقل وشعور کو جھنجوڑا۔ اسے انفس وآفاق میں غور کرنے کی دعوت دی، وہ کون ہے جس نے انسان کو احساس کمتری سے اس عہد تعقل سے بھی صدیوں پہلے نجات دی اور اُس کے حقیقی شرف ومجد کا اعلان کیا، مجلس اقوام متحدہ کی "دستاویز حقوق انسانی" عہد جدید کے انسان کا مقدس صحیفۂ اخلاق ہے لیکن اعلیٰ مکارم واخلاق جنھوں نے وحشیوں کو دنیا کی شائستہ ترین قوم بنا دیا ان کا صور سب سے پہلے کس نے پھونکا! سوچنا چاہیے کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم عصبیت جاہلیہ کے خلاف جنگ کر کے اسے ختم نہ کر دیتے تو انسانی تہذیب وتمدن اور کائنات عالم میں غور وفکر کا کاروان ترقی کی کس منزل میں ہوتا؟

ایک شبہ اور اس کا ازالہ آپ اوپر پڑھ آئے ہیں کہ عقبۂ ثالثہ کی بیعت کے سلسلہ میں حافظ ابن عبدالبر نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ:

وکانت البیعة علی حرب الاسود والاحمر	اور یہ بیعت کالے اور گورے سب سے جنگ کرنے پر لی گئی تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ کفار قریش سے جنگ کرنے کے تو اسباب ووجوہ موجود تھے لیکن دنیا کے سب لوگوں نے کیا قصور کیا تھا جس کی وجہ سے حضور نے اُن سب کے خلاف جنگ کرنے کی بیعت لی!

جواب یہ ہے کہ جملۂ زیر بحث عربی زبان کا ایک محاورہ ہے اور اردو میں اس کا صحیح ترجمہ ہوگا۔ عرب وعجم سے لڑائی مول لینے پر، نہ کہ "جنگ لڑنے پر" قاعدہ ہے کہ کوئی شخص کسی کی محبت اور عشق میں دیوانہ ہو جاتا ہے اور اپنے محبوب کی مرضی کے سوا کسی اور کی پرواہی نہیں کرتا، یا ایک شخص کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دینے کے لئے کمربستہ ہوتا ہے اور اپنی دُھن میں کسی کی نہیں سُنتا، کسی کی رائے اور مشورہ قبول نہیں کرتا تو کہتے ہیں: "اس شخص نے ساری دنیا سے لڑائی مول لے لی ہے" پس اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس وقت یہ ارشاد فرما کر بیعت کرنے والوں کو یہ جتانا چاہا کہ وہ اسلام کو قبول کر کے جس راہ پر گامزن ہو رہے ہیں اُن کو سمجھنا چاہیئے کہ یہ راہ آسان نہیں ہے، اس میں کانٹے بچھے ہوتے ہیں، قدم قدم پر ان کی سخت مخالفت ہوگی، ان کو ہر مرحلہ پر دشمنوں سے سابقہ ہوگا، ان کو تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلنی ہوں گی اور جان و مال کی قربانی پیش کرنی ہوگی۔ اگر وہ اس راہ پر عزم و استقلال اور ثابت قدمی سے جمے رہے تو اللہ تعالیٰ ان کو اس کا انعام دے گا، اور زمین و آسمان کے خزانے ان کے لئے اپنے دروازے کھول دیں گے۔ حضور کو یقین تھا کہ چوں کہ اسلام کو دُنیا کے ہر گوشے میں پہنچنا ہے اس بنا پر آج مکہ میں جو صورتِ حال پیش آئی کل پورے عرب و عجم میں اس کو یہی صورتِ حال پیش آئے گی اور اُس سے بھی اسی طرح نپٹنا ہوگا جس طرح اب مکہ کے لوگوں سے نپٹنا ہے، اسی بنا پر حضور کے اس ارشاد کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ خواہ مخواہ ساری دنیا سے جنگ کرنی ہے، بلکہ مقصد آئندہ کے خطرات اور دشواریوں کی طرف متوجہ کر کے ان لوگوں کو اعلیٰ الگ کرنے اور حسب تقاضائے وقت و مصلحت ان سے عہدہ برآ ہونے پر آمادہ و مستعد کرنا تھا۔

<u>ہجرت کی تیاری</u> | اب جب کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا آپ کے لئے مکہ سے ہجرت کر جانا ضروری تھا۔ چنانچہ آپ نے ہجرت کا عزم صمیم کر لیا لیکن رحمتِ عالم کو اپنے سے زیادہ فکر دوسروں کی رہتی تھی۔ اس لئے آپ نے عقبۂ ثالثہ کی بیعت کے بعد ہی جس کا علم کفار کو نہیں تھا۔ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دے دیا[1]۔
(باقی)

---

[1] ہجرت کے حکم کے بارہ میں حسب معمول علما کا اختلاف ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ اگرچہ ہجرت اسلام کے لئے شرط نہیں تھی، لیکن اس وقت فرض کر دی گئی تھی اور اُس کی وجہ جیسا کہ لوگوں کا عام خیال ہے یہ نہیں تھی کہ مسلمانوں کو گوشۂ عافیت درکار تھا۔ بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ ہجرت کفار مکہ کے ساتھ جنگ کے منصوبہ کا ایک جز اور "کلمۃ اللہ" کو کفار کے قبضہ سے نکال لینے کا پیش خیمہ تھی، چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے والذین آمنوا ولم یہاجروا ما لکم من ولایتہم من شیء حتی یہاجروا وہ لوگ جو ایمان لائے لیکن ہجرت نہیں کی ان کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ مگر ہاں اُس وقت جب وہ ہجرت کریں۔

عربوں کے عہد میں سندھ میں علم و ادب

از ڈاکٹر محمد اسلم صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

عرب و ہند کے تعلقات قدیم زمانے سے چلے آتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل عربوں کے تجارتی جہاز جنوبی ہند کی بندرگاہوں میں لنگرانداز ہوتے ہوئے جزائر شرق الہند (موجودہ انڈونیشیا) تک جایا کرتے تھے[1]۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ معدلت میں بحرین کے گورنر عثمانؓ بن ابی العاصی الثقفی کے دل میں ہندوستان پر حملہ کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اُس نے اپنے بھائی الحکم کو چند جہاز دے کر ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ الحکم نے بمبئی کے نواح میں تھانہ پر حملہ کیا اور بہت سامانِ غنیمت لے کر بحفاظت بحرین پہنچ گیا[2]۔ جب حضرت عمرؓ کو اس مہم کی اطلاع ملی تو انھوں نے عثمانؓ بن ابی العاصی کو لکھا، "ثقیف کے بھائی تو نے کیڑے کو لکڑی پر چڑھا دیا۔ قسم ہے اگر وہ لوگ ضائع ہو جاتے تو میں تیری قوم سے اتنے ہی آدمی لے لیتا[3]" ہمارے علماء اور مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کو چونکہ بحری جنگوں کا کوئی تجربہ نہ تھا اس لئے حضرت عمرؓ نے عثمانؓ بن ابی العاصی کو متنبہ کیا کہ وہ آئندہ اس قسم کی غلطی کا ارتکاب نہ کرے۔

---

[1] محمد اسلم، نظریہ پاکستان اور نصابی کتب، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء، ص ۹۰
[2] علامہ بلاذری، فتوح البلدان، مطبوعہ مکتبۃ النہضۃ المصریہ، ج ۳، ص ۵۳۰
[3] ایضاً۔

ہندوستان پر الحکم کا پہلا حملہ چونکہ بڑا کامیاب رہا تھا اس لئے اس نے موقعہ پاکر بھڑوچ پر حملہ کیا اور اس کے بھائی مغیرہ نے دیبل کی کھاڑی میں تباہی مچا دی[1]۔ یہ دونوں مہمیں بڑی کامیاب رہیں اور دونوں بھائی بہت سامانِ غنیمت لے کر واپس لوٹے۔

علامہ بلاذری رقمطراز ہیں کہ حضرت عثمانؓ سندھ میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے اور موصوف وہاں کے حالات سے بخوبی واقف تھے[2]۔ حضرت عثمانؓ نے جب عبداللہ بن عامر کو عراق کا گورنر مقرر کیا تو اُسے سندھ کے سرحدی علاقوں کے حالات معلوم کرنے کا حکم دیا۔ عبداللہ بن عامر نے حکیم بن جبلہ العبدی کو مکران کے ساحلی علاقوں کا جائزہ لینے پر مامور کیا۔ کچھ عرصہ بعد جب حکیم بن جبلہ اپنا مشن مکمل کرکے عبداللہ بن عامر کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُس نے اُسے حکم دیا کہ وہ مدینہ منورہ جاکر خود ہی اپنی سروے رپورٹ امیرالمومنین کی خدمت میں پیش کرے۔ حکیم بن جبلہ نے مکران کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت عثمانؓ کو بتایا۔

ماؤھا وشل وتمرھا دقل ولصّھا بطل، ان الجیش فیھا ضاعوا وان کثروا جاعوا[3]۔	وہاں پانی کم ہے اور پھل نکمے ہیں۔ چور دلیر ہیں۔ اگر لشکر کم ہو تو وہاں ضائع ہو جائے اور اگر زیادہ ہو تو بھوکوں مر جائے۔

حکیم بن جبلہ کی گفتگو سن کر حضرت عثمانؓ نے استفسار فرمایا کہ وہ خبر دے رہا ہے۔ یا سجع کہہ رہا ہے؟ حکیم نے کہا کہ وہ خبر دے رہا ہے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے اس علاقے پر لشکر کشی کا ارادہ ترک کر دیا[4]۔

حضرت عثمانؓ کے جانشین حضرت علیؓ بھی سندھ کے حالات سے بخوبی واقف

---

[1] سید سلیمان ندوی، عربوں کی جہاز رانی، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۳۵ء، ص ۵۹

[2] علامہ بلاذری، فتوح البلدان، مطبوعہ مکتبۃ النہضۃ المصریہ، ج ۳، ص ۵۳۰

[3] ایضاً۔

[4] عبدالحیٔ، نزہۃ الخواطر، مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۴۲ء، ج ۱، ص ۷

تھے اور انھوں نے ایک عرب سردار کو باقاعدہ سندھ کے ساحلی علاقوں کی نگرانی پر مامور کیا تھا[1]۔ حضرت علیؓ کو باہمی خانہ جنگی نے سندھ پر لشکرکشی کی اجازت نہ دی لیکن جب ان کی شہادت کے بعد حضرت معاویہؓ کو قدرے سکون نصیب ہوا تو انھوں نے سندھ کی طرف توجہ مبذول کی۔ امیر معاویہ کے نامور جرنیل المہلب نے متعدد بار سندھ کے سرحدی شہروں پر حملے کئے لیکن ہمارے مؤرخوں نے ان حملوں کو سرحدی جھڑپوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مروانیوں کے عہد میں سندھ کے فرماں روا راجہ داہر نے مکران کے گورنر سعید بن اسلم کو قتل کر کے عربوں کی مخالفت مول لی[2]۔ اس واقعہ کے چند سال بعد جب سندھی بحری قزاقوں نے عربوں کے چند جہاز لوٹ لئے تو انھیں مجبوراً سندھ پر حملہ کرنا پڑا۔

حجاج بن یوسف نے، جو ولید بن عبدالملک کے عہد میں مشرقی صوبوں کا گورنر جنرل تھا۔ اپنے داماد اور بھتیجے محمد بن قاسم کو فوج دے کر سندھ روانہ کیا اور اس نوجوان فاتح نے سندھیوں کے دلوں پر اپنی تلوار کی دھاک بٹھا دی۔ محمد بن قاسم کا مقصد محض کشورکشائی نہ تھا اس لئے وہ جہاں کہیں بھی گیا اس نے تبلیغ اسلام کو اولین اہمیت دی۔ یہ اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ سب سے پہلے سندھیوں میں سے جینہ قوم نے اسلام قبول کیا[3]۔

علامہ بلاذری لکھتے ہیں کہ محمد بن قاسم نے دیبل کی فتح کے بعد وہاں کی زمین کی پیمائش کروائی اور اس کے قطعات فاتحین میں تقسیم کر دیئے۔ علاوہ ازیں اس نے دیبل میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی اور اس شہر میں چار ہزار مسلمان آباد کئے[4]۔ اسی طرح محمد بن قاسم نے داہر کے دارالحکومت ارور کی فتح کے بعد وہاں بھی ایک عالی شان مسجد تعمیر کروائی[5]۔

---

[1] سید سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات، مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۰ء، ص ۱۴
[2] علامہ بلاذری، فتوح البلدان، مطبوعہ مکتبۃ النہضۃ المصریہ، ج ۳، ص ۵۳۰
[3] محمد معصوم بھکری، تاریخ سندھ، مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۸ء، ص ۲۳
[4] علامہ بلاذری، فتوح البلدان، مطبوعہ مکتبۃ النہضۃ المصریہ، ج ۳، ص ۵۳۵
[5] میر محمد معصوم بھکری، تاریخ سندھ، مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۸ء، ص ۲۶

میر محمد معصوم بھکری کی روایت ہے کہ محمد بن قاسم نے مال غنیمت کے خمس سے ہر شہر اور قصبے میں مساجد تعمیر کروائیں[1]۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم نے ان مساجد کو آباد رکھنے کے لئے پورے سندھ میں مسلمان آباد کئے تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو مفتوحہ علاقوں میں تبلیغ اسلام کا بڑا خیال رہتا تھا چنانچہ انھوں نے سندھی رؤسا کے نام خط تحریر کئے اور انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ ان کی اس دعوت پر جو سندھی رؤسا مشرف باسلام ہوئے ان میں راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ بھی شامل تھا[2]۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو سندھی نومسلموں کی دینی تربیت کا اتنا خیال رہتا تھا کہ انھوں نے سندھ کے اہم شہروں کی مساجد میں جیّد علماء کو خطیب بنا کر بھیجا۔ جب مشہور سیّاح ابن بطوطہ اپنی سیاحت کے دوران سیہون آیا تو وہاں کے خطیب نے اُسے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ایک فرمان دکھایا جس میں اُس کے جدّ اعلیٰ الشیبانی کو جامع مسجد سیہون کا خطیب مقرر کرنے کا ذکر تھا[3]۔

محمد بن قاسم نے سندھ کے طول و عرض میں جو مساجد تعمیر کروائی تھیں۔ اس کی واپسی کے بعد وہاں علوم اسلامیہ کا درس شروع ہوگیا اور مساجد سے ایسے ایسے باکمال عالم پڑھ کر نکلے جنھوں نے دنیائے اسلام سے اپنی علمیت کا لوہا منوایا۔ محمد بن قاسم کا جانشین یزید بن ابی کبشہ بڑا علم دوست شخص اور ثقہ محدّث تھا اُسے صحابۂ کرامؓ کی صحبت میسر آئی تھی اور اُس نے ابوالدرداءؓ اور شرجبیل بن یوسف سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ یزید بن ابی کبشہ کے شاگردوں میں ابولبشر، الحکم بن عتیبہ، علی بن الاقمر، معاویہ بن قرہ المزنی اور ابراہیم السکسکی جیسے نامور راوی شامل ہیں۔ امام بخاریؒ نے الصحیح میں، امام الشیبانیؒ نے کتاب الآثار میں

---

[1] میر محمد معصوم بھکری، تاریخ سندھ، مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۸ء، ص ۲۶
[2] بلاذری فتوح البلدان (اردو ترجمہ)، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۲ء ص ۶۲۶
[3] ابن بطوطہ رحلۃ، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۹۵ء، ج ۲، ص ۵

اور امام حاکم نیشاپوری نے المستدرک میں یزید بن ابی کبشہ کی روایتیں نقل کی ہیں[1]۔ ہمارے خیال میں یہ اس کی ثقاہت کی بڑی دلیل ہے۔

اسرائیل بن موسیٰ البصریؒ کا شمار بھی قدما محدثین میں ہوتا ہے۔ موصوف کو تبع تابعی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ انھوں نے امام حسن بصری، ابی حازم الاشجعی، محمد ابن سیرینؒ اور وہب بن منبہ بن سعید القطان سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ موصوف سندھ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اسرائیل بڑے ثقہ محدث تسلیم کئے جاتے تھے، امام بخاری نے ان کی روایت کردہ احادیث کو الصحیح میں نقل کیا ہے[2]۔

عمرو بن مسلم باہلی فاتح ماوراء النہر قتیبہ بن مسلم کے بھائی تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے انھیں سندھ کا والی مقرر کیا تھا۔ عمرو نے اپنے عہد میں ہندوستان پر کئی کامیاب حملے کئے۔ عمرو کی زندگی اگرچہ سپاہیانہ تھی مگر وہ علوم کی ترویج و اشاعت میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ انھوں نے یعلیٰ بن عبید سے اور خود اُن سے ابو الطاہر نے حدیثیں روایت کی ہیں[3]۔

موسیٰ بن یعقوب الثقفیؒ کا شمار ابتدائی دور کے علماء میں ہوتا ہے۔ موصوف محمد بن قاسم کے ہم قبیلہ تھے اور اسی کے ساتھ سندھ آئے تھے۔ محمد بن قاسم نے الور کی فتح کے بعد انھیں وہاں کا خطیب مقرر کیا تھا۔ یہ عہدہ ان کی اولاد میں کئی صدیوں تک نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہا[4]۔

مفضلؒ بن المہلب کو تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے اور سندھ کی سرزمین کو ان کا مدفن ہونے کی سعادت حاصل ہے۔ ان کے بھائی یزید بن المہلب نے یزید بن عبد الملک کے عہد میں بغاوت کردی اور وہ یزید کے بھائی مسلمہ بن عبد الملک کا مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا[5]۔

---

[1] محمد اسحٰق، انڈیاز کونٹری بیوشن ٹو دی سٹڈی آف حدیث لٹریچر، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۵۵ء، ص ۴۲
[2] عبد الحیٔ، نزہۃ الخواطر، مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۴۷ء، ج ۱، ص ۲۳
[3] محمد اسحٰق، انڈیاز کونٹری بیوشن ٹو دی سٹڈی آف حدیث لٹریچر، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۵۵ء، ص ۲۶
[4] علی بن حامد کوفی، چچ نامہ، مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۳۹ء، ص ۹
[5] بلاذری، فتوح البلدان (اردو ترجمہ)، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۲ء، ج ۲، ص ۲۲۶

اس کے رشتہ داروں نے جن میں مفضل بھی شامل تھے، قندابیل میں پناہ لی[1] لیکن مقامی گورنر نے خلیفہ کے عامل ہلال بن التیمی کے ساتھ مل کر اُن کا مقابلہ کیا۔ مہلب کے بہت سے رشتہ دار اور بھائی دادِ شجاعت دیتے ہوئے میدانِ کارزار میں کام آئے۔ ان مقتولین میں مفضل بھی تھے۔

مفضل نے مشہور صحابی نعمان بن بشیرؓ سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں اور اُن سے روایت کرنے والوں میں ان کے فرزند حاجب، ثابت البنانی اور جریر بن حزم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ہمارے محدثین نے مفضل کو ثقہ تسلیم کیا ہے۔ اُن کی روایت کردہ حدیثیں سنن ابی داؤد اور سنن نسائی میں موجود ہیں۔[2]

عربوں کے ابتدائی ایامِ حکومت میں جو اہلِ علم و کمال سندھ میں آکر آباد ہو گئے تھے ان میں شیخ ابو حفص ربیع البصری بھی تھے۔ جن کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ آپ امام حسن بصری کے شاگرد تھے اور بڑے ثقہ محدث تسلیم کئے جاتے تھے۔[3] ان کے شاگردوں میں امام سفیان ثوریؒ، ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن المبارکؒ، ابوالحسن آدم بن عبدالرحمٰن الخراسانیؒ، ابو سلیمان داؤد بن المحبرؒ، ہشام بن عبدالملک الباہلیؒ، ابو سعید عبدالرحمٰن بن مہدی العنبریؒ، ابوالحسن عاصم بن علی الواسطیؒ، ابوالولید الطیالسیؒ، اور ابو سفیان وکیع بن الجراح الکوفیؒ (جو امام اہلِ سنت محمد بن ادریس الشافعیؒ کے شیوخ میں سے تھے) خاص طور پر مشہور ہیں۔[4]

ابو حفص ربیع نے سندھ میں احادیثِ نبوی کا درس شروع کیا اور انھوں نے علم کی جو شمع روشن کی اس کی ضَو سے پورا سندھ منور ہو گیا۔

---

[1] ابن اثیر، الکامل فی التاریخ (اردو ترجمہ)، مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۷۶ء، ج ۱۲، ص ۴۰۵
[2] محمد اسحٰق، انڈیاز کونٹری بیوشن ٹو دی اسٹڈی آف حدیث لٹریچر، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۵۵ء، ص ۲۶
[3] رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۹۴ء، ص ۳
[4] ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، ماہنامہ المعارف لاہور، بابت جنوری ۱۹۷۳ء، ص ۱۰

عربوں کے دور حکومت میں سندھ کی خاک سے جو اہلِ علم پیدا ہوئے ان میں ابومعشر نجیح بن عبدالرحمن السندی کا نام سرفہرست ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ خود یمن میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کے والدین سندھی تھے) ابومعشر کتاب مغازی کے مصنف اور نامور محدث ہیں اور امام اہلِ سنت احمد بن حنبلؒ نے انہیں مغازی پر سند تسلیم کیا ہے[۱]۔ ان کے اساتذہ میں محمد بن کعب القرظی، موسیٰ بن بشار، نافع مولیٰ ابن عمرؓ، ابن المنکدر اور محمد بن قیس کے نام لئے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک صحابی امامہ بن سہلؓ کو دیکھا تھا[۲]۔ ابومعشر نے مدینہ منورہ اور بغداد میں درس حدیث دیا اور عرب و عراق کے نامور علماء نے ان سے حدیث کی سند لی[۳]۔ عباسی خلیفہ کے دربار میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی اور جب ان کا انتقال ہوا تو خلیفہ نے خود ان کی نماز جنازہ پڑھائی[۴]

اسی طرح سندھ کے علماء میں الحافظ الامام ابوبکر محمد بن رجاء کا بڑا اونچا مقام ہے۔ موصوف نے اسحٰق بن راہویہ، احمد بن حنبل، علی ابن المدینی، ابن نمیر، اور ابابکر ابن ابی شیبہ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ ان کے تلامذہ میں ابوعوانہ، ابوحامد ابن الشرقی، محمد بن صالح بن ہانی، ابن الاخرم اور ابوالنضر محمد بن محمد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ابوبکر محمد نے احادیث کا ایک مجموعہ الصحیح کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے امام مسلم بن حجاج نیشاپوری کی الصحیح کا خلاصہ بھی تیار کیا۔ ابوبکر محمد ۲۸۶ھ میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے[۵]۔

الحافظ خلف بن سالم السندیؒ آل مہلب کے آزاد کردہ غلام اور اپنے عہد کے ایک

---

[۱] ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، مطبوعہ حیدرآباد، ج ۱، ص ۲۱۳
[۲] خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، مطبوعہ بغداد ۱۹۳۱ء، ج ۱۳ ص ۴۲۷
[۳] سمعانی، کتاب الانساب، مطبوعہ لیدن ۱۹۱۲ء ص ۳۱۳ ب
[۴] ایضاً۔
[۵] ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۵۶ء، ج ۲ ص ۶۸۶

نامور محدث تھے۔ انھوں نے بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں ان کا شمار ثقہ راویوں میں ہوتا تھا۔ ابوبکر بن عیاش اور یعقوب شعبہ جیسے اہل علم نے انھیں ثقہ اور یحییٰ بن معین جیسے فاضل نے انھیں صدوق کہا ہے۔ الحافظ خلف ۲۳۱ھ میں فوت ہوئے۔[1] ان سے بہت سے لوگوں نے حدیث کی سماعت کی ہے۔

اسی طرح سندھ میں ابوالعطاء سندھی جیسا قادر الکلام شاعر پیدا ہوا جس کے قصائد نے عربی ادب کی مشہور کتاب الحماسہ میں عربی شعراء کے قصائد کے ساتھ جگہ پائی۔[2]

سندھ میں عربوں کے دورِ حکومت میں ابو علی سندھیؒ نام کے ایک صوفی ہوتے ہیں جن سے مشہور صوفی حضرت بایزید بسطامیؒ (م ۲۶۱ھ) نے تصوف کی تعلیم پائی تھی۔ ابو علی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ عربی نہیں جانتے تھے۔[3] حضرت بایزیدؒ کے سوانح نگاروں کا کہنا ہے کہ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے:

أنا تعلمت من أبي علي علم الفناء والتوحيد	میں ابو علی سے علمِ فنا اور توحید کی تعلیم حاصل
وهو تعلم مني الحمد وقل هو الله احد	کی اور انھوں نے مجھ سے الحمد اور قل ہو اللہ کی

قاضی اطہر مبارک پوری نے اپنی تصنیف "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" میں چونتیس ایسے عالموں، زاہدوں اور محدثوں کے نام گنوائے ہیں جو سندھی نسبت سے مشہور تھے۔[4] یہاں ان کا ذکر کرنا طوالت سے خالی نہیں ہوگا۔

عربوں کے عہدِ حکومت میں دیبل کا شمار دنیائے اسلام کے عظیم علمی مراکز میں ہوتا تھا۔ مشہور جغرافیہ دان یاقوت الحموی نے تو "وقد نسب إليها قوم من الرواة" لکھ کر اپنی دانست میں اپنا فرض پورا کر دیا ہے[5] لیکن طبقات قسم

---

[1] ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۵۵ء، ج ۲، ص ۶۵
[2] ابی تمام حبیب، دیوان الحماسہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء، ص ۴۲
[3] پرشر، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء، ج ۱، ص ۹۳۲
[4] قاضی اطہر مبارکپوری، رجال السند والہند، مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۵ء، ص ۲۸
[5] یاقوت الحموی، معجم البلدان، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۵ء، ج ۲، ص ۴۹۵

کی کتابوں کی ورق گردانی سے یہ معلوم ہوا کہ اس زمانے میں دیبل میں بڑے نامی گرامی علماء، حفاظ، قراء، محدثین اور مفسرین مقیم تھے اور ایک عالم اُن کے فیضانِ علم سے سیراب ہو رہا تھا۔ ایسے ہی علماء میں ہمیں احمد بن محمد بن ہارون المقری الدیبلی کا نام نظر آتا ہے جو اپنے عہد کے نامور محدث اور قاری تھے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے علوم مروجہ کی تعلیم جعفر بن محمد الفریابی اور ابراہیم بن شریک الکوفی سے پائی اور قرأت کا فن جعنون بن الشہم سے بروایت حفص سیکھا۔ ان سے کچھ حدیثیں بھی مروی ہیں لیکن ان میں سب سے اہم وہ حدیثیں ہیں جن کی روایت انھوں نے چند واسطوں سے حضرت ثوبانؓ مولیٰ رسول اللہؐ سے کی ہیں۔ احمد بن محمد کا انتقال رجب ۳۴۳ھ میں ہوا۔[1]

علی بن موسیٰ کا شمار چوتھی صدی کے نامور محدثین میں ہوتا ہے۔ یہ بزرگ دیبل میں حدیث کا باقاعدہ درس دیا کرتے تھے۔[2] کچھ عرصہ کے لئے آپ بغداد بھی تشریف لے گئے جہاں بہت سے علماء نے ان سے حدیث کی سماعت کی۔

خلف بن محمد الموازینی کا شمار بھی دیبل کے مشاہیر میں ہوتا ہے۔ یہ بزرگ علی بن موسیٰ دیبلیؒ کے تلمیذ الرشید تھے لیکن انھوں نے بغداد کی سکونت اختیار کر لی تھی جہاں وہ حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں سے ابوالحسن نے بڑا نام پایا ہے۔[3]

ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ دیبلی تیسری صدی کے اولیائے کبار میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ صاحب کشف و کرامت تھے اور فنِ قرأت میں امام تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کے اساتذہ میں جعفر بن محمد سغیطہ، عبدالرزاق بن حسن اور سکن بن بکرویہ جیسے قراء کے نام لئے جاتے ہیں۔[4] آپ نے شام میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں وہ عربوں کو قرأت اور تجوید

---

[1] اطہر مبارکپوری، رجال السند والہند، مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۸ء، ص ۶۳

[2] ایضاً، ص ۱۶۲۔

[3] خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، مطبوعہ بغداد ۱۹۳۱ء، ج ۸، ص ۳۳۲ [4] ایضاً

[5] ابن جوزی، صفۃ الصفوۃ، مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۵۵ھ، ج ۴، ص ۵۲ - ۵۳

کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

ابو العباس احمد بن نصر بن الحسین القاضی الدیبلیؒ کا شمار دیبل کے نامور زہاد اور اہلِ علم میں ہوتا ہے۔ موصوف کو فقہ شافعی پر کامل دسترس تھی۔ ابو العباس دیبل سے بغداد چلے گئے تھے جہاں قاضی القضاۃ ابو الفضائل القاسم بن یحییٰ نے انھیں قاضی کے عہدہ پر فائز کیا۔[1]

ابو العباس بڑے نیک اور متقی انسان تھے اور دین کے معاملات میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ یاقوت الحموی نے ان کے لئے دعائیہ کلمات استعمال کئے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان کا بڑا احترام تھا۔[2] ابو العباس آخر عمر میں موصل چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

ابو القاسم شعیب بن محمد بن احمد بن سعید بن بزیع بن سوار دیبلیؒ برصغیر پاک و ہند کے قدماء محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے سوانح حیات کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گزرے۔ ان کے متعلق صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ وہ دیبل سے ترک سکونت کر کے مصر چلے گئے تھے، جہاں وہ حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔[3] ڈاکٹر محمد اسحٰق کی روایت کے مطابق مشہور محدث ابو سعید بن یونس اُن کے شاگرد تھے۔[4]

علی بن احمد بن محمد دیبلیؒ کا شمار تیسری صدی کے مشاہیر فقہا اور محدثین میں ہوتا ہے۔ موصوف شافعی المذہب تھے اور انھوں نے فن قضاء پر ایک کتاب "ادب القضاء" کے نام سے لکھی تھی، جس میں قضاء کے بعض اہم مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ان

---

[1] اطہر مبارک پوری، رجال السند والہند، مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۸ء، ص ۶۵

[2] یاقوت الحموی، معجم البلدان، مطبوعہ بیروت ۱۹۵۵ء، ج ۱، ص ۲۵۸

[3] اطہر مبارک پوری، رجال السند والہند، مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۸ء، ص ۱۵۷

[4] محمد اسحٰق، انڈیاز کونٹری بیوشن ٹو دی سٹڈی آف حدیث لٹریچر مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۵۵ء، ص ۳۶

کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ابوالعباس الاصمؒ اور ابو عبداللہ بن احمد بن موسیٰ دیبلیؒ جیسے نامور ماہرین حدیث سے روایت کی ہے۔ قاضی اطہر مبارک پوری کے خیال میں علی بن احمد مقری شام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ دیبلی کے نواسے تھے[1]

ابو جعفر محمد بن ابراہیم بن عبداللہ دیبلیؒ اپنے عہد میں حدیث کے زبردست عالم مانے جاتے تھے۔ انھوں نے ابی عبیداللہ بن عبدالرحمٰن المخزومی، ابن المبارک اور ابی عبداللہ الحسین بن الحسن المروزی سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ آپ دیبل کی سکونت ترک کر کے مکہ مکرمہ میں جا بسے تھے جہاں آپ حدیث کا درس دیا کرتے تھے[2]۔ ان کے فرزند رشید ابراہیم بن محمد دیبلیؒ نے بھی علم حدیث میں بڑا نام پایا ہے۔ موصوف نے اپنے والد کے علاوہ موسیٰ بن ہارون سے بھی حدیثیں روایت کی ہیں۔ ابراہیم بھی اپنے والد کے ساتھ مکہ مکرمہ میں مقیم ہو گئے تھے[3]

ابوالعباس محمد بن محمد بن عبداللہ الوراقؒ دیبل کے رہنے والے تھے اور ان کا شمار زہاد کے زہاد اور عباد میں ہوتا تھا۔ موصوف نے حدیث کی تعلیم جعفر بن محمد بن الحسن، عبدان بن احمد بن موسیٰ العسکری اور محمد بن عثمان بن ابی سوید البصری سے پائی تھی۔ علم حدیث میں ان کی عظمت کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ موصوف امام حاکم نیشاپوریؒ صاحب المستدرک کے استاد تھے[4]

ابو محمد دیبلیؒ کا شمار تیسری صدی کے مشاہیر صوفیاء اور جنید بغدادیؒ کے ساتھیوں میں ہوتا ہے۔ آپ دیبل سے نقل مکانی کر کے بغداد میں جا بسے تھے۔ ان کے متعلق یہ روایت اکثر تذکروں میں ملتی ہے!

---

[1] اطہر مبارک پوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۶ء، ص ۱۶۱
[2] سمعانی، کتاب الانساب، مطبوعہ لیڈن ۱۹۱۲ء، ص ۲۳۶ ب
[3] یاقوت الحموی، کتاب الانساب، مطبوعہ بیروت ۱۹۵۵ء، ج ۲، ص ۴۹۵
[4] سمعانی، کتاب الانساب، مطبوعہ لیڈن ۱۹۱۲ء، ص ۲۳۶ ب

وکان جنید یکرمہ[1] جنید ان کا احترام کیا کرتے تھے۔

ابو العباس احمد بن عبد اللہ بن سعید دیبلی کا شمار چوتھی صدی کے نامور زہاد اور محدثین ہوتا ہے۔ انھوں نے حصولِ علم کے لئے بڑا طویل سفر کیا اور اس راہ میں بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ انھوں نے بصرہ میں ابا خلیفہ قاضی اور معدان جعفر بن محمد الفریانی سے، مکہ مکرمہ میں مفضل بن محمد الجنیدی اور محمد بن ابراہیم دیبلی سے، مصر میں علی بن عبد الرحمٰن اور محمد بن زبان سے، دمشق میں ابا الحسن احمد بن عمیر سے، بیروت میں ابا عبد الرحمٰن سے، حران میں ابا عروبہ الحسین بن ابی معشر سے اور تستر میں احمد بن زہیر سے حدیث کی سماعت کی۔ علم حدیث میں ان کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ امام حاکم نیشاپوریؒ صاحب المستدرک ان کے شاگرد تھے۔

آخری عمر میں ابو العباس نے نیشاپور میں الحسن بن یعقوب الحدادی کی خانقاہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ ہمیشہ صوفیانہ لباس زیب تن کرتے اور نماز کے لئے مسجد میں جانے کے علاوہ خانقاہ سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ سمعانی کی روایت کے مطابق انھوں نے رجب ۳۴۳ھ میں نیشاپور میں وفات پائی۔[2]

ابو القاسم الحسین بن محمد بن اسد دیبلی کے ایک بلند پایہ محدث تھے۔ ان کے متعلق صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ وہ ۳۲۰ھ کے لگ بھگ دمشق میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔[3]

ابو بکر محمد بن حسین بن محمد دیبلیؒ چوتھی صدی کے ایک نامور قاری اور محدث تھے۔ انھوں نے قرأت کا فن امام قرأت ہارون اخفش کے دو شاگردوں ابن لبی حمزہ اور ابن ابی داؤد

---

[1] اطہر مبارکپوری، رجال السند والہند، مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۸ء، ص ۲۸۶

[2] سمعانی، کتاب الانساب، مطبوعہ لیدن ۱۹۱۲ء، ص ۲۳۶ ب

[3] اطہر مبارک پوری، رجال السند والہند، مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۸ء، ص ۱۰۵

سے سیکھا تھا۔ان کے تلامذہ میں امام حافظ ابوالحسن علی ابن عمر دارقطنی اور عبدالباقی ابن حسن جیسے بزرگوں کے نام آتے ہیں۔ انھوں نے شام میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی[1]

ابوموسیٰ دیبلی کا شمار تیسری صدی کے صوفیاء میں ہوتا ہے۔ موصوف حضرت بایزید بسطامی کے بھانجے تھے۔اوران کی صحبت سے مستفیض بھی ہوئے تھے۔ابوموسیٰ سے اپنے ماموں کے بہت سے اقوال منقول ہیں[2]

ابومحمد حسن بن حامد دیبلی چوتھی صدی کے ایک بلند پایہ ادیب، شاعر اور محدث تھے اوران کا شمار بغداد کے بڑے مالدار تاجروں میں ہوتا تھا۔انھوں نے بغداد میں ایک سرائے بنوائی تھی جوان کے نام کی مناسبت سے "سرائے خان بن حامد" کہلاتی تھی۔

ابومحمد نے حدیث کی سماعت علی بن محمد بن سعید موصلی سے کی تھی۔ اوران کے شاگردوں میں محمد بن علی صوریؒ نے علم حدیث میں بڑا نام پایا ہے۔عربی شاعری میں بھی ابومحمد کا بڑا اونچا پایہ تھا۔اورمشہور شاعر المتنبیؔ کے ان کے ساتھ بڑے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ بغداد میں قیام کے دوران انہی کے ہاں مہمان ٹھہرا کرتے تھے۔ المتنبیؔ کہا کرتے تھے کہ اگر وہ کسی تاجر کی تعریف کرتا تو ابومحمد کا ذکر اپنے اشعار میں ضرور کرتا

ابومحمد نے کچھ عرصہ مصر میں بھی درس حدیث دیا اور وہیں ۴۰۷ھ میں انھوں نے رحلت فرمائی[3]

دیبل کی یہ علمی بساط زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ سنہ ۲۸۰ھ میں اس دارالحدیث

---

[1] اطہر مبارک پوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مطبوعہ دہلی سنہ ۱۹۶۷ء، ص ۱۶۲

[2] ایضاً، ص ۱۶۳

[3] اطہر مبارک پوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مطبوعہ دہلی سنہ ۱۹۶۷ء ص ۱۶۱۔

واسنن میں ایک زبردست زلزلہ آیا ۔ اور چند لمحوں میں یہ جیتا جاگتا شہر ملبہ کا ڈھیر بن گیا ۔ علامہ بلاذری کی روایت کے مطابق اس سانحہ میں ڈیڑھ لاکھ انسان لقمۂ اجل بنے[۱] ۔ اس حادثہ میں جو لوگ زندہ بچ گئے انھوں نے دل برداشتہ ہو کر عرب ممالک کی راہ لی یہی وجہ ہے کہ ہمیں تیسری صدی اور چوتھی صدی میں دیبلی نسبت رکھنے والے متعدد عالم اور محدث مصر، شام، عراق اور حجاز میں درس و تدریس میں مشغول نظر آتے ہیں ۔

دیبل کے بعد سندھ میں علم و ادب اور صنعت و تجارت کا دوسرا مرکز منصورہ تھا ۔ مشہور جغرافیہ دان یاقوت الحموی نے منصورہ کا تعارف " مدینۃ کبیرۃ کثیرۃ الخیرات ذات جامع کبیر، کے الفاظ میں کروایا ہے[۲] ۔ مورخ شہیر مقدسی نے اس "جامع کبیر" کا محل وقوع " وسط الاسواط " بتایا ہے ۔ انھوں نے یہاں کے باشندوں کو اصحاب علم و مروت بتاتے ہوئے ان کی ذکاوت اور اسلام دوستی کی بڑی تعریف کی ہے[۳] مقدسی کے زمانے میں منصورہ کپڑے اور جوتے کی صنعت کا بڑا مرکز تھا اور یہاں کے بنے ہوئے کپڑے اور جوتے و ساور کو بھیجے جاتے تھے[۴] ۔ جب مسعودی یہاں آیا تو اس نے تمام علاقے کو ہرا بھرا پایا[۵] ۔ اصطخری نے بھی اپنی مشہور تصنیف المسالک والممالک میں آم اور لیموں کے درختوں کی نشاندہی کی ہے[۶] ۔ ابن الفقیہ الہمدانی نے بھی سندھ میں "عجائب کثیرۃ" کی موجودگی کا ذکر کیا ہے[۷] ۔

---

۱ ۔ طبری، تاریخ طبری (اردو ترجمہ) مطبوعہ حیدرآباد سنہ ۱۹۴۰ء، ج ۳، ص ۶۱۵

۲ ۔ یاقوت الحموی، معجم البلدان، مطبوعہ مصر سنہ ۱۹۰۶ء، ج ۸، ص ۱۷۷ ۔ ۱۷۸

۳ ۔ المقدسی احسن التقاسیم، مطبوعہ لیدن سنہ ۱۸۷۷ء، ص ۴۷۹

۴ ۔ ایضاً، ص ۴۷۹

۵ ۔ مسعودی مروج الذہب، مطبوعہ قاہرہ سنہ ۱۸۶۶ء، ج ۱، ص ۸۱

۶ ۔ ابن حوقل، کتاب صورۃ الارض، مطبوعہ لیدن سنہ ۱۹۳۹ء، ج ۲، ص ۳۲۰ ۔ ۳۲۱

۷ ۔ اصطخری، المسالک والممالک، مطبوعہ قاہرہ سنہ ۱۹۶۱ء ۔ ص ۱۰۳

کا ذکر کیا ہے[1] ۔

دیبل کی طرح منصورہ میں بھی اہل علم و فضل کی ایک جماعت موجود تھی ۔ منصورہ کے علمار میں ابوجعفر عبداللہ بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن عیسیٰ بن ابی جعفر المنصور المعروف بہ ابن بویہ بڑے اونچے پلئے کے عالم تھے ۔ سمعانی نے انہیں بڑا ثقہ محدث بتایا ہے ۔ ان سے محدثین کی ایک بڑی جماعت نے حدیث کی روائت کی ہے ۔ انھوں نے ۳۵۰ھ میں وفات پائی ۔[2]

ابو محمد عبداللہ بن جعفر بن حرّہ بھی منصورہ کے ایک نامور محدث اور قرآن مجید کے مستند قاری تھے ۔ انھوں نے حدیث کی سماعت حسن بن مکرمؒ اور ان کے ساتھیوں سے کی تھی ۔ ان کی علمی شان کا اندازہ صرف اتنی سی بات سے ہو سکتا ہے کہ امام حاکم نیشاپوریؒ صاحب المستدرک ان کے شاگرد تھے[3] ۔

ابو العباس احمد بن محمد بن صالح التیمی امام داؤد ظاہری کے پیرو اور منصورہ کے قاضی تھے ۔ ان کا شمار ظاہری مذہب کے فضلار میں ہوتا ہے ۔ انھوں نے اپنے مذہب کی تائید میں بڑی بلند پایہ کتابیں لکھی تھیں جن میں سے کتاب المصباح کبیر ، کتاب الہادی اور کتاب النیّر خاص طور پر قابل ذکر ہیں[4] ۔ سمعانی کی روائت ہے کہ آپ منصورہ سے عراق چلے گئے تھے ۔ ابو العباس کو بھی امام حاکم نیشاپوری کا استاذ ہونے کا شرف حاصل ہے[5] ۔

---

[1] ۔ ابن الفقیہ الہمدانی ، کتاب البلدان ، مطبوعہ لیدن ۱۸۸۵ء ، ص ۲۵۱

[2] ۔ سمعانی ، کتاب الانساب ، مطبوعہ لیدن ۱۹۱۲ء ، ص ۵۴۳ ب

[3] ۔ ایضاً ۔

[4] ۔ ابن ندیم ، الفہرست مطبوعہ المطبعۃ الرحمانیہ مصر ، ص ۳۰۶ ۔

[5] ۔ سمعانی ، کتاب الانساب ، مطبوعہ لیدن ۱۹۱۲ء ، ۵۴۳ ب

قاضی ابو محمد داؤد دیلیؒ کا شمار بھی منصورہ کے فضلاء میں ہوتا ہے موصوف ظاہری مذہب کے امام تسلیم کئے جاتے تھے۔ مشہور جغرافیہ داں اور سیاح المقدسی نے ان سے منصورہ میں ملاقات کی تھی اور اس نے ان کی چند تصانیف دیکھی تھیں۔ جو اس کی رائے میں بڑی بلند پایہ تھیں[1]۔

ابوبکر احمد بن محمد منصوری بکرآبادی بھی منصورہ کے ایک بلند پایہ محدث تھے۔ انھوں نے حدیث کی سماعت امام ابوبکر اسمٰعیلی اور حافظ بن عدی سے کی تھی موصوف منصورہ سے ترکِ سکونت کر کے جرجان کے ایک نواحی قصبے بکرآباد میں جا بسے تھے[2]۔ ابوبکر کا انتقال ۲۹ جمادی الاول ۴۲۲ھ کو بکرآباد میں ہوا[3]۔

دیبل اور منصورہ کے بعد سندھ میں تیسرا بڑا علمی مرکز بوقان تھا۔ اور یہ خالص مسلمانوں کی بستی تھی[4]۔ یہاں ری دور میں یہاں کئی نامور علماء پیدا ہوئے جنھوں نے سندھ کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی علم کے چراغ روشن کئے۔

بوقان کے علماء میں ابوسعید بن اسعد بن محمد بوقانیؒ بڑے اونچے پایہ کے عالم تھے۔ اور ان کا شمار چھٹی صدی کے مشاہیر شوافع میں ہوتا تھا۔ موصوف کو امام غزالی کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ابوسعید ذی قعدہ ۵۵۶ھ میں مشہد علی رضا میں غزوں کے ہاتھوں شہید ہوئے[5]۔

محمد ابن احمد بن منصور بوقانیؒ چوتھی صدی کے ایک نامور محدث تھے۔ انھوں نے حدیث کی سماعت مشہور محدث امام ابوحاتم بن محمد بن حبان البستی (م ۳۵۴ھ)

۱۔ مقدسی احسن التقاسیم، مطبوعہ بیروت مکتبہ خیاط، ص ۴۸۱

۲۔ اطہر مبارکپوری، رجال السند والہند مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۸ء، ص ۵۸

۳۔ ایضاً

۴۔ یاقوت الحموی، معجم البلدان، مطبوعہ مصر ۱۹۰۶ء ج ۲، ص ۲۰۷

۵۔ تاج الدین سبکی طبقات الشافعیہ الکبریٰ مطبوعہ مطبع حسینیہ مصر ج ۴ ص ۶۶

سے کی تھی۔ اس سے زیادہ ان کے حالات نہیں مل سکے۔[1]

ابوالمکارم فضل اللہ بن محمد بوقانی کا شمار پانچویں صدی کے نامور محدثین میں ہوتا ہے۔ ان کے متعلق صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ موصوف امام البغوی صاحب المصابیح کے آخری شاگرد تھے۔[2]

محمد بن احمد بن محمد بن خلیل بن احمد بوقانی ۴۶۷ھ میں بوقان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے حدیث کی تعلیم امام ابوبکر بن خلف شیرازی سے پائی۔ ان کے شاگردوں میں سے عبدالرحیم بن سمعانی نے علم حدیث میں بڑا نام پیدا کیا۔ محمد بن احمد محرم ۵۴۹ھ میں بوقان میں فوت ہوئے۔[3]

عربوں کے دورِ حکومت میں قصدار (موجودہ خضدار) کے انگور شیرینی اور لطافت میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کے بارے میں کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔[4]

بِلادٌ قصدارُ اردُ اعنابِہا   الیٰ فتیٰ دیناً اَجنبتْ ودینِ

سندھ کے دوسرے اہم شہروں کی طرح قصدار بھی علم وادب کا ایک بڑا مرکز تھا اور اس شہر کی خاکِ پاک سے بھی کئی نامور علماء اٹھے۔ جو دنیائے علم وادب کے آسمان پر مہرومہ بن کے چمکے۔ علمائے قصدار میں ابو محمد جعفر بن الخطاب القصداری بڑے اونچے پایہ کے عالم تھے۔ موصوف بڑے اعلیٰ پایہ کے محدث اور فقیہہ مانے جاتے تھے۔ اور وہ اپنے ہمعصروں میں زہد وورع کے لئے ضرب المثل تھے۔ انھوں نے حدیث کی سماعت ابوالفضل عبدالصمد بن محمد بن نصیر العاصمی سے کی اور ان کے تلامذہ

۱۔ اطہر مبارک پوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۷ء، ص ۱۶۴

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ بلاذری، فتوح البلدان (اردو ترجمہ)، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۲ء، ص ۱۷ م

میں سے ابو الفتوح عبد الغافر بن الحسین بن علی الکاشغری نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔ ابو محمد قصدار سکونت ترک کر کے بلخ میں جا بسے تھے۔[1]

ابو داؤد سلیمان بن اسمٰعیل کا شمار پانچویں صدی کے نصف اول کے مشاہیر محدثین میں ہوتا ہے۔ موصوف قصدار سے نقل مکانی کر کے مکہ مکرمہ میں جا بسے تھے جہاں وہ حدیث درس دیا کرتے تھے۔ ان کے اساتذہ میں ابو القاسم علی بن محمد بن عبد اللہ بن یحییٰ طاہر حسینی، ابو الفتح رجاء بن عبد الواحد اصبہانی اور حافظ ابو الحسین یحییٰ بن ابی الحسن رواسی جیسے فضلاء کے نام گنوائے جاتے ہیں۔ ابو داؤد نے ۴۶۰ھ کے لگ بھگ مکہ مکرمہ میں انتقال کیا۔[2]

چوتھی صدی کے وسط میں قصدار، مکران اور کرمان پر خوارج کا قبضہ ہو گیا اور انھوں نے یہاں ایک آزاد حکومت قائم کر لی جس کا دولت عباسیہ کے ساتھ کسی بھی قسم کا رابطہ نہ تھا۔[3] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصدار اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں پر خوارج کا تسلط قائم ہوتے ہی وہاں سے سنی علماء ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

راجہ داہر کا پایہ تخت الور سندھ کے دوسرے شہروں کی طرح بھی علمی مرکز نہ بن سکا تاہم وہاں ایک علمی خاندان محمد بن قاسم کے زمانے سے ہی آباد ہو گیا تھا۔ جس نے مسلمانوں کی علمی روایات کو صدیوں تک برقرار رکھا۔ علی بن حامد کوفی کی ملاقات الور میں اسمٰعیل بن علی بن محمد بن موسیٰ بن طائی بن یعقوب الثقفی سے ہوئی تھی جو اپنے زمانے کے ایک نامور فقیہ اور الور کے قاضی اور خطیب تھے۔ موصوف کو قضاء اور خطابت ورثہ میں ملی تھی۔ چچ نامہ کے ایک اندراج سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ کو محمد بن قاسم نے دار الحکومت الور کا قاضی اور خطیب مقرر کیا تھا۔[4] علی بن حامد کوفی کو تاریخ سندھ کے عربی اوراق اسمٰعیل سے

---

[1] سمعانی، کتاب الانساب، مطبوعہ لیدن ۱۹۱۲ء، ص ۵۵ ب

[2] اطہر مبارک پوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۷ء، ص ۲۹۹-۳۰۰

[3] ایضاً، ص ۲۶۷

[4] علی بن حامد کوفی، چچ نامہ، مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۳۹ء، ص ۹

یہی [illegible] جس کا فارسی ترجمہ علی بن حامد نے چچ نامہ کے عنوان سے کیا ہے۔[1]

ملتان کا شمار بھی اس زمانے میں سندھ کے شہروں میں ہوتا تھا۔ جب مشہور سیاح اور جغرافیہ دان ابن حوقل یہاں آیا تو اُس نے اہالیانِ ملتان میں قرآن اور علوم قرآن کی طرف رغبت پائی۔ اس زمانے میں ملتان میں ساتوں قرأتوں سے قرآن پڑھنے والے قاری موجود تھے۔ ابن حوقل کی ملاقات ایسے لوگوں سے بھی ہوئی جو فقہ اور ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس نے ملتان میں علماً کی موجودگی کا اعتراف کیا ہے لیکن ان کے نام نہیں بتائے۔[2] مقدسی نے بھی اہلِ ملتان کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

لیس عندھم زنا ولا شرب خمر ومن ظفر وابہ یفعل ذلک قتلوہ اوحدّوہ ولا یکذبون فی بیع ولا یبخسون فی کیل ولا یخسرون فی وزن یحبون الغرباء۔[3]

ان کے ہاں زنا نہیں ہے اور نہ ہی شراب پی جاتی ہے۔ جس کو ایسا کرنے پر پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اسے قتل کر دیتے ہیں یا اس پر حد جاری کرتے ہیں۔ وہ خرید فروخت میں جھوٹ نہیں بولتے۔ وہ نہ کم ماپتے ہیں اور نہ ہی کم تولتے ہیں۔ وہ مسافروں سے محبت کرتے ہیں۔

اس زمانے میں سندھ کا اطلاق قریب قریب سارے پاکستان پر ہوتا تھا۔ اس لئے لاہور بھی "من مضافات ملتان"[4] ہونے کی وجہ سے سندھ میں شامل تھا۔ اس زمانے

---

[1] - علی بن حامد کوفی، چچ نامہ، مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۳۹ء، ص ۹

[2] - ابن حوقل، کتاب صورۃ الارض، مطبوعہ لیدن ۱۹۳۹ء، ج ۲، ص ۳۲۲

[3] - مقدسی، احسن التقاسیم، مطبوعہ لیدن ۱۸۷۷ء، ص ۴۸۰

[4] - سید علی ہجویری، کشف المحجوب، مطبوعہ سمرقند ۱۳۳۰ھ، ص ۱۱۵

میں لاہور جیسا بھی تھا علم و ادب کا بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا سمعانی نے "خرج جماعۃ من العلماء" لکھ کر لاہور کے دار العلم ہونے کی گواہی دی ہے[1]۔ اس زمانے میں لاہور میں ابو الحسن علی بن عمر الحکمؒ بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ موصوف بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے اور حدیث پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ ان کے شیوخ حدیث میں ابا علی المظفر بن الیاس بن سعید السعیدی کا نام بھی آتا ہے، جو اپنے عہد میں علم حدیث کے ایک نامور اُستاد تھے۔

ابو الحسن کے تلامذہ میں سے ابو الفضل محمد بن ناصر السلامی الحافظ البغدادی اور ابو الفتوح عبد الصمد بن عبد الرحمٰن الاشعثی اللوہوریؒ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان دونوں حضرات نے چوں کہ سمرقند میں ابو الحسن سے حدیث کی سماعت کی تھی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف کچھ عرصہ کے لئے وہاں بھی تشریف لے گئے تھے۔ ابو الحسن کا انتقال ۵۲۹ھ میں لاہور میں ہوا[2]۔

ابو الحسن کے تلامذہ میں ابو الفتوح عبد الصمد بن عبد الرحمٰن الاشعثی اللوہوریؒ کا ذکر آیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بزرگ بھی لاہور کے رہنے والے اور اپنے زمانے کے نامور محدث تھے۔

ابی موسیٰ عمرو بن سعد اللاہوریؒ کا شمار بھی اسی عہد کے علماء اور محدثین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے شیخ الحافظ ابی موسیٰ المدنی الاصبہانی سے روایت کی ہے[3]۔ ان کے تلامذہ میں سے ابو موسیٰ المدینی محمد بن ابی بکر الاصفہانی بڑے اونچے پایہ کے عالم تھے۔

عمر بن اسحٰق الورشی اللاہوری چھٹی صدی کے ایک نامور عالم اور شاعر تھے۔ سید عبد الحیؒ نے ان کے چند اشعار نقل کئے ہیں[4]۔

---

[1] سمعانی۔ کتاب الانساب، مطبوعہ لیدن ۱۹۱۲ء، ص ۴۹۷ ب
[2] ایضاً
[3] یاقوت الحموی، معجم البلدان، مطبوعہ بیروت ۱۹۵۵ء، ج ۵، ص ۲۷
[4] عبد الحیٔ، نزہۃ الخواطر، مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۴۷ء، ج ۱، ص ۱۰۷

دوش در سودائی دلبر بودہ ام　　　بالب خشک و رخ تر بودہ ام
در شمار مہر محمور او　　　دیدہ بازاز غم چوں مہر بودہ ام
وز نم چشم و تعب دل ہر زمان　　　گوئی اندر آب و آذر بودہ ام
ہمچوں بحر و کان ز آب و خون اشک　　　پُر ز در و پُر ز گوہر بودہ ام

ابوالقاسم محمود بن محمد بن خلف اللہاوری کا شمار لاہور کے علمائے متقدمین میں ہوتا ہے۔ موصوف اپنے عہد کے ایک نامور فقیہ اور مناظر تھے۔ انھوں نے فقہ کی تعلیم اپنے دادا امام ابی علی المظفر سمعانی سے پائی تھی[1]۔ ابوالقاسم کچھ عرصہ کے لئے اسفرائین بھی تشریف لے گئے جہاں بہت سے لوگوں نے ان سے حدیث کی سماعت کی۔ ان کے تلامذہ میں سے ابا الفتح عبدالرزاق بن حسان المنیعی، ابا النصر محمد بن محمد الماہانی، ابا بکر بن خلف شیرازی ابا اسحٰق ابراہیم بن عمر بن ابراہیم اصبہانی، ابا سہل احمد بھی اسمٰعیل بن بشر النہرجانی خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان کے ایک شاگرد ابوسعد نے اسفرائین میں ان کی روایت سے حدیث کی املا بھی کی تھی۔ ابوالقاسم کا انتقال ۴۰۵ھ کے لگ بھگ ہوا[2]۔

محمد بن المامون بن الرشید بن ہبۃ اللہ المطوعی اللہاوری چھٹی صدی کے ایک نامور عالم اور محدث تھے۔ موصوف علم کی طلب میں لاہور سے خراسان تشریف لے گئے جہاں انھوں نے فقہ شافعی میں کمال حاصل کیا۔ نیشاپور میں قیام کے دوران انھوں نے ابی بکر شیرازی اور ابی نصر قشیری سے حدیث کی سماعت کی اور روایت کی اجازت لے کر بغداد چلے گئے جہاں وہ مدت تک مقیم رہے۔ آخر عمر میں موصوف آذربائجان منتقل ہوگئے جہاں انھوں نے سنہ ۶۰۰ھ میں ملاحدہ کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرمایا[3]۔

---

[1] سمعانی، کتاب الانساب، مطبوعہ لیدن ۱۹۱۲ء، ص ۴۹۷ الف
[2] یاقوت الحموی، معجم البلدان، مطبوعہ بیروت ۱۹۵۶ء، ج ۳ ص ۲۷
[3] ایضاً

یہ قدرت کی بڑی ستم ظریفی ہے کہ وہی سندھ جو کبھی علم و ادب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا جس کے ایک ایک شہر اور قصبے سے ایسے ایسے نادرِ روزگار عالم پیدا ہوئے جنہوں نے دنیائے اسلام میں علم کی شمعیں روشن کی تھیں، آج اس پر جہالت اور ادبار کے بادل چھائے ہوتے ہیں اور دُور دُور تک علم کی روشنی نظر نہیں آتی۔

ضروری گذارش

کاغذ کی ہوش ربا گرانی کے باعث برہان کی اشاعت فروری [illegible]ء میں ہی بند ہو جاتی مگر ادارہ کے ممبران اور خریدارانِ برہان کے اصرار پر اشاعت جاری رکھی گئی تھی۔ برہان میں جو کاغذ لگایا جاتا ہے گذشتہ ماہ تک ۵۰ روپے فی رم کے حساب سے مل رہا تھا۔ مگر اب ماہ جون میں وہی کاغذ ۶۹ روپے فی رم سے زیادہ آرہا ہے۔ ٹائٹیل کا کاغذ جو ۶۰ روپے تک آجاتا تھا اب ۱۵۰ روپے رم آیا ہے۔ طباعت جو ۹/- فی پلیٹ دی جارہی تھی۔ اب ۱۴/= فی پلیٹ تک پہنچ گئی ہے ان حالات میں قارئینِ برہان اور ادارہ کے ممبران سے حسبِ ذیل امور میں تعاون درکار ہے۔

(۱) برہان کا چندہ اور ممبری کی فیس بروقت ادا فرمائیں۔

(۲) یاد دہانی کے خطوط ارسال ہوتے ہیں۔ قارئین ان خطوط پر کم توجہ فرماتے ہیں۔ اگر رسالہ برہان جاری رکھنا چاہتے ہیں تو فوراً ادائیگی فرمائیں ورنہ سلسلہ منقطع کرنے کی بروقت ہدایت دیں۔

(۳) خریدارانِ برہان اور ادارہ کے ممبران نئے خریدار اور نئے ممبروں کی توسیع کے لئے کوشش فرمائیں۔

(۴) دفتر کو خطوط روانہ کرتے وقت یا منی آرڈر ارسال کرتے وقت اپنا خریداری نمبر تحریر کرنا نہ بھولیں تاکہ جواب یا تعمیل میں تاخیر نہ ہو۔ پتہ صاف صاف تحریر فرمائیں۔

(۵) ادارہ کی فہرست طلب فرمایئے تاکہ آپ خود ادارہ کی مطبوعات سے متعارف ہوں اور دوسروں کو متعارف کرائیں۔

نیاز مند

منیجر برہان دہلی

کچھ المامون کی اولیات کے بارے میں

(از شبیر احمد خاں غوری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش)

(۲)

(۲) اعتزال مامون سے پہلے

فاضل مقالہ نویس نے خلیفہ مامون کو یہ شرف بھی بخشا ہے کہ اُس کے تفلسف پسند رجحان کے نتیجے میں

"معتزلہ بھی پیدا ہوئے"

مگر یہ بات قطعاً غلط ہے کیوں کہ یہ فرقہ اسی نام کے ساتھ مامون کی پیدائش سے تقریباً سوا سو سال پہلے وجود میں آچکا تھا اور اُس کے برسر اقتدار آنے سے کوئی نصف صدی پیشتر نہ صرف اسلامی سماج بلکہ خود عباسی دربار میں بھی فروغ حاصل کر چکا تھا نیز اکابر معتزلہ کا اس سے کہیں پہلے نبوغ ہو چکا تھا، بلکہ انھیں کے زیر اثر اُس نے اس مذہب کی اشاعت میں انتہائی تعصب سے کام لیا۔ مزید تفصیل حسب ذیل ہے۔

معتزلہ کی ابتدا کے بارے میں عام خیال | علامہ تفتازانی نے "شرح عقائد نسفی" میں لکھا ہے کہ کسی شخص نے حضرت حسن بصریؒ سے مرتکب کبیرہ کے بارے میں سوال کیا۔ وہ جواب دینے بھی نہ پائے تھے کہ واصل بول پڑا "وہ نہ کافر ہے اور نہ مومن، بلکہ دونوں منزلوں کے درمیان کی منزل میں ہے" اور یہ کہہ کر وہاں سے کنارہ کش ہو گیا۔ اس پر وہ اور اُس کے

متبعین "معتزلہ" کہلائے

اس وجہ تسمیہ کو تفتازانی کے علاوہ اور بہت سے علماء نے بھی بیان کیا ہے مثلاً ابن قتیبہ نے "عیون الاخبار" میں، ابن رستہ نے "الاعلاق النفیسہ" میں، مسعودی نے "مروج الذہب" میں، عبدالقاہر بغدادی نے "الفرق بین الفرق" میں سید مرتضیٰ نے "امالی" میں، سمعانی نے "کتاب الانساب" میں، شہرستانی نے "الملل والنحل" میں ابن خلکان نے "وفیات الاعیان" میں مقریزی نے "الخطط" میں، مرتضیٰ زیدی نے "کتاب المنیۃ والامل" (طبقات المعتزلہ) میں، قاضی عضدالدین الایجی نے "المواقف فی الکلام" میں۔ نیز "قاموس" "تاج العروس" اور "لسان العرب" میں "عزل" کے مادہ کے تحت۔

لہذا اگر یہ وجہ تسمیہ صحیح ہو تو فرقۂ معتزلہ مامون کے برسر اقتدار آنے سے کوئی ایک صدی پہلے وجود میں آچکا تھا کیوں کہ وہ ۱۹۵ھ میں خلیفہ ہوا اور ۲۰۴ھ کے قریب بغداد آیا۔ اُدھر سیدنا حضرت حسن بصریؒ کا سال وفات ۱۱۰ھ ہے اور ظاہر ہے مذکورالصدر واقعہ اس سے کہیں پہلے ظہور میں آیا ہوگا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ "معتزلہ" کا فرقہ اس سے بھی کہیں پہلے (پہلی صدی ہجری کے وسط کے قریب) پیدا ہو چکا تھا اور "معتزلہ" کا نام تو اور بھی پہلے (۳۶ھ کے قریب) سننے میں آنے لگا تھا۔

<u>لفظ معتزلہ کا قدیم ترین ذکر (معتزلۂ اولیٰ)</u> "معتزلہ" اور "اعتزال" کے الفاظ بعینہ تو قرآن مجید میں نہیں آئے۔ مگر موخرالذکر کے مشتقات ضرور ملتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والتسلیم نے اپنی قوم سے فرمایا تھا۔ "واعتزلکم وما تدعون من دون اللہ" (سورہ مریم - ۴۸) خود معتزلہ کا قول ہے کہ یہ لفظ احادیث نبوی میں بھی آیا ہے چنانچہ مرتضیٰ زیدی نے اس قسم کی دو حدیثیں نقل کی ہیں۔

۱۔ من اعتزل من الشر سقط فی الخیر

(۲) ستفترق امتی علی بضع وسبعین فرقۃ ابرھا و اتقاھا الفئۃ المعتزلۃ

لیکن دونوں محل نظر ہیں ممکن ہے ثانی الذکر کسی صحیح حدیث کی روایت بالمعنی کا نتیجہ ہو۔

تاریخ میں سب سے پہلے اس لفظ کا استعمال ان اکابر صحابہ کے لئے ہوا جو سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ کی شہادت کے بعد حضرت علی اور حضرت طلحہ وزبیر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی نزاع میں غیر جانبدار ہو گئے تھے۔ چنانچہ ابوالفدا نے ان کے بارے میں لکھا ہے:۔

"وسموا ھؤلاء المعتزلۃ لاعتزالھم بیعۃ علی"

دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"ھؤلاء سموا جمیعاً باسم المعتزلۃ"

اسی طرح امام ابن جریر طبری نے ان کے بارے میں لکھا ہے:۔

"لیسموا المعاھدون الذین لایبغون نصر فریق علی آخر باسم القوم المعتزلین"

بعد میں عہد حاضر کی طرح "ناوابستگی" (NON ALIGNMENT) کی یہ پالیسی ایک "سیاسی بدی" (POLITICAL EVIL) بن گئی چنانچہ جب مغیرہ بن شعبہ نے حضرت عمرو بن عاص سے اپنی جماعت "معتزلہ" (یعنی غیر جانبدار و کنارہ کش) کے بارے میں پوچھا "کیف ترانا معشر المعتزلہ"

تو انہوں نے برجستہ جواب دیا:۔

"انکم معشر المعتزلۃ خلف الابرار وامام الفجار"

اس طرح یہ انداز ناوابستگی و کنارہ کشی (اعتزال) ہدف ملامت بنتے بنتے نسیاً منسیاً اور اس کا تسمیہ متروک ہو گیا

فرقہ معتزلہ کا آغاز (معتزلہ ثانیہ) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد آپ کے جانشین سیدنا حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ ہوئے مگر چھ ماہ بعد ہی حالات سے مجبور ہو کر انہیں امیر معاؔ

رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہونا پڑا۔ اب دودمانِ مرتضوی کے ہوا خواہوں کے لئے ملکی سیاست اور معاملاتِ حکومت میں حصہ لینے کا کوئی موقعہ نہیں رہ گیا۔ لہٰذا انھوں نے اپنا وقتِ عزیز عبادتِ الٰہی اور علمی شاغل کے لئے وقف کردیا اور اس غرض سے "گوشہ نشین و عزلت گزین" ہو گئے۔ اسی بنا پر یہ حضرات "معتزلہ" کہلاتے چنانچہ ابو الحسین الملطی نے "رد الاہواء والبدع" میں لکھا ہے

" وھم سموا انفسھم معتزلۃ۔ وذلک عند ما بایع الحسن بن علی معاویۃ وسلم الیہ الامر، اعتزلوا الحسن ومعاویۃ وجمیع الناس وکانوا من اصحاب علی۔ ولزموا منازلھم ومساجدھم وقالوا نشتغل بالعلم والعبادۃ فسموا المعتزلۃ "

اور ان لوگوں نے خود کو معتزلہ کے نام سے موسوم کیا۔ اور جس وقت کہ حضرت امام حسن رضؓ نے امیر معاویہؓ سے بیعت کرلی اور انھیں حکومت سونپ دی تو ان لوگوں نے امام حسن رضؓ اور امیر معاویہ رضؓ نیز سارے لوگوں سے کنارہ کشی کرلی حالانکہ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی کے پیرو تھے اور اپنے گھروں اور مسجدوں میں جا بیٹھے اور کہتے تھے اب ہم صرف علم اور عبادت ہی میں مشغول ہوں گے۔ اس لئے "معتزلہ" کہلاتے۔

تاریخ نے یہ تفصیل محفوظ نہیں رکھی کہ یہ رجحان ان لوگوں میں کب پیدا ہوا یا یہ کہ اسں "معتزلہ" کے نام سے یہ فرقہ کب موسوم ہوا۔ صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کے ایک صاحبزادے محمد بن حنفیہؒ نے (جو بی بی فاطمہ کے علاوہ کسی اور بیوی کے بطن سے تھے) اعتزال کی بنیاد ڈالی چنانچہ ابن رستہ نے "الاعلاق النفیسہ" صفحہ ۲۰ میں لکھا ہے:۔

" اول من تکلم فی الاعتزال محمد بن الحنفیہ "

محمد بن حنفیہ کی وفات پر اُن کے جانشین اور اس فرقہ کے سربراہ اُن کے صاحبزادے

ابوہاشم عبداللہ ہوتے۔ انھیں کا شاگرد واصل بن عطاء الغزال تھا جس نے متعارف اور اصطلاحی فرقہ معتزلہ (معتزلہ ثالثہ) کی بنیاد ڈالی۔ واصل سیدنا حسن بصریؒ کے حلقہ درس میں بھی شریک ہوتا تھا مگر شاگرد حقیقی معنوں میں محمد بن حنفیہؓ کے صاحبزادے ابوہاشم عبداللہ ہی کا تھا، چنانچہ مرتضیٰ زیدی نے "طبقات المعتزلہ" کے طبقۂ ثانیہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد و احفاد میں سے ابوہاشم عبداللہ کے بارے میں لکھا ہے:-

"ومن اولاد علی علیه السلام ابوہاشم عبد الله بن محمد بن الحنفیه وهو الذی اخذ عنه واصل وکان معه فی المکتب فاخذ عنه وعن ابیه	اور اس طبقہ کے جو لوگ) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد و احفاد میں (سے تھے، اُن میں) ابوہاشم عبداللہ بن محمد بن حنفیہ (بھی) تھے۔ انھیں سے واصل بن عطاء نے علم حاصل کیا تھا۔ وہ اُن کے ساتھ مکتب میں تھا، لہذا اُس نے اُن سے اور اُن کے بلند بزرگوار سے علم حاصل کیا۔

اسی طرح شہرستانی نے "الملل والنحل" میں لکھا ہے:-

"ویقال اخذ واصل من ابی هاشم عبد الله بن محمد بن حنفیه"	کہا جاتا ہے کہ واصل نے ابوہاشم عبداللہ بن محمد بن حنفیہ سے علم حاصل کیا۔

بہرحال عام مورخین کے بیان سے جو مترشح ہوتا ہے کہ سیدنا حسن بصریؒ کے حلقہ درس میں مرتکب کبیرہ کے لئے "المنزلہ بین المنزلتین" کا قول تراشا تھا، اس نئے قول کے احداث کی بنا پر وہ اور اُس کے متبعین "معتزلہ" کہلائے اور اس طرح فرقہ معتزلہ کا آغاز ہوا، ناقابلِ تسلیم ہے۔ فرقہ معتزلہ کا آغاز حسب تصریح ابوالحسین الملطی سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مصالحت (۴۱ھ) کے بعد ہوا اور حسب تصریح ابن رستہ اس کے پہلے سربراہ اور بانی محمد بن حنفیہ تھے۔ غرض پہلی صدی ہجری کے سرے پر کہ واصل کے

عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا (جبکہ وہ اپنی متکلمانہ سرگرمیوں کے نتیجے میں ایک مناسب مذہبِ فکر کی تلاش میں تھا) "اعتزال" ایک مشہور و معروف مکتبِ فکر تھا جسے واصل نے اور اُس کی تبعیت میں عمرو بن عبید نے اختیار کیا چنانچہ ابو الفرج اصفہانی نے "کتاب الاغانی" میں نقل کیا ہے:-

"کان بالبصرۃ ستۃ من اصحاب الکلام: عمرو بن عبید و واصل بن عطاء و بشار الاعمی و صالح بن عبد القدوس و عبد الکریم بن ابی العوجاء و رجل من الازد - قال ابو احمد یعنی جریر بن حازم ــ فکانوا یجتمعون فی منزل الازدی و یختصمون عندہ فاما عمرو و واصل فصارا الی الاعتزال و اما عبد الکریم و صالح فصححا التوبہ و اما بشار فبقی متحیرا مخلطا و اما الازدی فمال الی قول السمنیہ ــ وھو مذھب من مذاھب الھند ــ وبقی ظاھرہ علی ما کان علیہ"

شہر بصرہ میں علم کلام کے ماہرین میں سے چھ شخص رہتے تھے: عمرو بن عبید، واصل بن عطاء، بشار بن برد جو نابینا تھا، صالح بن عبد القدوس، عبد الکریم بن ابی العوجاء اور ایک قبیلۂ ازد کا شخص - ابو احمد یعنی جریر بن حازم نے کہا ہے کہ یہ لوگ ازدی شخص کے مکان پر جمع ہو کر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے - پس ان لوگوں میں سے) عمرو بن عبید اور واصل بن عطاء الغزال تو اعتزال کی جانب چلے گئے - رہے عبد الکریم بن ابی العوجاء اور صالح بن عبد القدوس تو ان کی توبہ صحیح ثابت ہوئی اور بشار (اپنی تفکیری سرگرمیوں کے نتیجے میں) متحیر اور متشکک بنا رہا - اور رہا ازدی تو وہ فرقۂ سمنیہ (بدھ مت) کی طرف مائل ہو گیا اور یہ ہندوستان کا ایک مذہب تھا اور اس طرح وہ بظاہر اُسی مسلک پر قائم رہا جس پر پہلے تھا۔

اس تصریح سے واضح ہے کہ ان اصحاب ستہ کی مذہبی بحث و تحیص کے زمانہ میں جو یقیناً

اُن کی جوانی کا وقت ہوگا (بالفاظ دیگر پہلی صدی کے خاتمہ کے قریب) اعتزال ایک جانا پہچانا مذہب تھا جسے دیگر مروجہ کلامی مذاہب کے مقابلے میں واصل بن عطاء اور عمرو بن عبید نے ترجیح دی اور اختیار کیا جیسا کہ اغانی کے حسب ذیل الفاظ سے واضح ہے

"فاما عمرو و واصل فصارا الی الاعتزال"

واصل اور اعتزال کی تجدید (معتزلۂ ثالثہ) غرض واصل فرقہ معتزلہ کا بانی نہیں ہے۔ یہ فرقہ ۶۱ھ کے کچھ بعد وجود میں آیا تھا اور اس کے بانی محمد بن حنفیہ تھے۔ پہلی صدی کے سرے پر واصل نے اسے اختیار کیا۔ البتہ اختیار کرنے کے بعد اس کی تجدید ضرور کی اور اس شدت سے کی کہ اُس کی شخصیت کے مقابلے میں اعتزال کے بانیوں کی شخصیتیں اور اُن کی سرگرمیاں بھولی بسری داستان بن گئیں اور عوام میں واصل ہی اس کا سردار ("راس") اور داعی اعظم محسوب ہونے لگا چنانچہ امام عبدالقاہر بغدادی نے اس کے بارے میں لکھا ہے

"واصل بن عطاء الغزال راس المعتزلہ وداعیھم الی بدعتھم بعد معبد الجھنی وغیلان الدمشقی"

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خود واصل کی شخصیت بھی اس غیر معمولی شہرت کی مستحق تھی اُس کی فعال تنظیم اور انتھک کوششوں سے یہ مذہب جلد ہی پورے عالم اسلام میں روشناس ہوگیا۔ اُس نے اس مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے مختلف اقطار عالم میں اپنے شاگرد کو بھیجا جن کی کوششوں سے بہت سے مسلمانوں نے اس مذہب کو اختیار کرلیا۔

واصل ہی کی طرح اعتزال کا سرگرم ترجمان اُس کا دست راست عمرو بن عبید تھا جو علمی سرگرمیوں کے علاوہ زہد و تقویٰ اور اپنی سیاسی سرگرمی کے لئے بھی مشہور تھا چنانچہ شہرستانی نے لکھا ہے:-

"وکان عمرو من رواۃ الحدیث معروفاً بالزھد"

دوسری جگہ لکھتا ہے:-

" وکان عمرو من دعاۃ یزید الناقص ایام بنی اُمیۃ ثم والی المنصور وقال بامامتہ "

بہرحال دوسری صدی ہجری کے ربع اول کے خاتمہ کے وقت [ابھی خلیفہ مامون کو برسرِاقتدار آنے اور اعتزال کی حمایت کرنے میں پون صدی باقی تھی] فرقہ معتزلہ ایک انتہائی اہم فرقہ تھا۔ اور مقامات کو چھوڑ دیجئے جو دارالحکومت دمشق سے دور تھے اور جہاں اس قسم کی بدعتیں بڑی سرگرمی اور آزادی کے ساتھ جاری رہ سکتی تھیں، خود دمشق اور اُس کے گرد و نواح میں جہاں مروانیوں کا " ملک عضوض " اس قسم کی تحریکوں کو پنپتا نہیں دیکھ سکتا تھا، اعتزال نے اتنے ہمنوا بلکہ سرفروش ہمنوا پیدا کر لئے تھے کہ اُن کی مدد سے یزید بن ولید نے اپنے پیشرو ولید بن یزید کا تختہ اُلٹ دیا۔ اس بات کی اہمیت یہ معلوم کر کے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے لے کر ولید بن یزید تک جتنے خلفاء ہوئے تھے سب نجیب الطرفین تھے نیا خلیفہ یعنی یزید بن ولید کنیز زادہ تھا جسے عرب بالخصوص مروانی اشرافیہ بنظر حقارت دیکھنے کے عادی تھے۔ مگر ساتھی معتزلہ کی سرفروشی کی مدد سے یزید اپنے خروج میں کامیاب ہو گیا اور ولید کا تختہ اُلٹ کر خود خلیفہ ہو گیا چنانچہ مسعودی نے لکھا ہے :-

" قال المسعودی : ثم کان خروج یزید بن الولید بدمشق مع سالیۃ من المعتزلہ وغیرھم من اہل داریا والمزۃ من غوطۃ دمشق علی الولید بن یزید لما ظہر من فسقہ "

مسعودی نے کہا ہے کہ یزید بن ولید نے دمشق میں خروج کیا (علم بغاوت بلند کیا) اور یہ اُس نے غوطہ دمشق کے علاقہ داریا اور مزہ کے کچھ معتزلیوں وغیرہ کی مدد سے ولید بن یزید کے مقابلہ میں کیا کیونکہ ولید بن یزید کا فسق و فجور مشہور ہو چکا تھا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ واصل کا دست راست عمرو بن عبید یزید بن ولید کے دعاۃ میں سے تھا اس طرح معتزلہ کو سرکاری دربار میں دخل حاصل ہو گیا اور اسی تقرب کی وجہ سے مولی

جیا برہ میں سے فرقۂ معتزلہ یزید ابن ولید کا بہت زیادہ احترام کرتا ہے حتیٰ کہ بقول مسعودی وہ لوگ یزید بن ولید کو حضرت عمر بن عبدالعزیز پر [جو متفقہ طور پر مائۃِ اولیٰ کے مجددِ ملّت ہیں -] فضیلت دیتے ہیں -

• والمعتزلۃ یفضّل فی الدیانہ یزید بن الولید علی عمر بن عبدالعزیز

یہ ۱۲۶ھ کی صورتِ حال تھی یا پانچ سال بعد واصل نے وفات پائی - اگلے سال عالمِ اسلام میں انقلاب ہی آگیا - امویوں کا استیصال ہوگیا - اور عباسی برسرِ اقتدار آئے پہلا عباسی خلیفہ ابوالعباس سفاح تھا جس کا زمانہ بازانقلابی تحریکوں کے کچلنے میں گذرا - سفاح نے ۱۳۶ھ میں وفات پائی اور اس کا بھائی ابوجعفر منصور خلیفہ ہوا - اس نے یکے بعد دیگرے اپنے تمام مخالفین کو ختم کردیا - ان مخالفین میں سب سے عظیم شخصیت امام نفس زکیہ (اور ان کے بھائی ابراہیم) کی تھی - یزید ابن ولید کے مرنے پر جو سیاسی انتشار برپا ہوا تھا - اس میں اسلام پسند عناصر نے امام نفس زکیہ سے بیعت کرلی تھی - اور اس بیعت کا طوق منصور اور عمرو بن عبید کی گردن میں بھی تھا - مگر خلیفہ ہوجانے پر منصور اس کا منکر ہوگیا - اور اس کے ساتھ عمر بن عبید بھی اپنے زہد و اتقا کے باوجود بیعت اول سے منحرف ہوگیا - آخر میں امام نفس زکیہ نے خروج کیا مگر ناکام رہے - منصور کی کامیابی بہت کچھ اس کے حسن تدبر کا نتیجہ تھی - مگر تاریخی واقعات کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عمرو بن عبید کی بے لوث دعوتی سرگرمیوں کا بھی بڑا حصہ تھا - وہ منصور کا داعی بن گیا تھا - اور اپنے اثر و رسوخ سے بصرہ میں اس کے خلاف کوئی شورش نہیں ہونے دی - منصور بھی اس کے خلوص کا معترف تھا اور کہا کرتا تھا -

"نثرت الحب للناس فلقطوا غیر عمرو"

واصل نے ۱۳۱ھ میں (عباسیوں کے برسرِ اقتدار آنے سے ایک سال قبل) وفات پائی مگر اس کی انتھک کوششوں سے "اعتزال" وقت کی اہم تحریک بن گیا تھا - اس

کے فیض تربیت نے بہت سے شاگردوں کو تیار کیا جنھوں نے استاد کے کام کو مزید تندہی کے ساتھ جاری رکھا۔ مرتضیٰ زیدی نے ان میں سے بعض تلامذہ کا ذکر کیا ہے جن پر واصل کو اعتماد تھا اور اُس نے اُنھیں اقطاع ملک میں اپنے مسلک کی تبلیغ کے لئے بھیجا تھا۔

۱۔ عثمان بن خالد الطویل: واصل نے آرمینیہ کی طرف بھیجا تھا، وہ ابوالہذیل العلاف کا اُستاد تھا جو آگے چل کر "شیخ المعتزلہ" کہلایا۔ عثمان بن خالد الطویل کی جلالتِ قدر کے بارے میں مرتضیٰ زیدی لکھتا ہے:-

"ولہ فی الفضل والعلم منزلۃ لا یخفی"

۲۔ حفص بن سالم: اُسے خراسان بھیجا تھا وہاں اُس کا جہم بن صفوان کے ساتھ مناظرہ ہوا اور حفص نے جہم کو مناظرہ میں ہرا دیا۔ کثیر التعداد لوگ اُس کے ہم نوا ہو گئے [اجابہ خلق کثیر]

۳۔ قاسم بن سعدی: واصل نے اُسے یمن بھیجا تھا۔

۴۔ عمرو بن حوشب:-

۵۔ قیس بن عاصم:-

۶۔ عبدالرحمٰن بن برہ:-

۷۔ عبدالرحمٰن کا بیٹا ربیع:-

۸۔ حسن بن ذکوان: اُس نے اُستاد کے حکم سے کوفہ میں اعتزال کی تبلیغ کی اور خلق کثیر نے اُس کی دعوت قبول کر لی۔

"اجابہ فی الکوفۃ خلق کثیر"

ان شاگردوں سے زیادہ باا ثر اُس کا دست راست عمرو بن عبید تھا۔ وہ خلیفہ وقت پر بھی حاوی تھا اور وہ (منصور) اُس کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا یہاں تک کہ جب اُس کی وفات کے بعد اُس کی قبر کے پاس سے گزرا تو اُس پر نماز پڑھی۔

"وکان المنصور العباسی یبالغ فی تعظیمہ ومر لقبرہ فی مران فصلی علیہ"

اُس کے علم وفضل کے بارے میں ابن یزداد نے لکھا ہے :۔

"کان عمرو بن عبید من اعلم الناس بامر الدین والدنیا"

ایک دوسرے مورخ ابن بخج نے لکھا ہے :۔

"ما رأیت احداً اعلم من عمرو بن عبید"

جاحظ نے اُس کے زہد و تقویٰ کے بارے میں لکھا ہے کہ عمرو بن عبید نے چالیس سال تک مغرب کی نماز کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی تھی اور چالیس بار پیادہ حج کئے تھے جب کہ وہ اپنی سواری کے اونٹ کو دوسرے عاجز حجاج کے لئے وقف کئے رہتا تھا۔

ایسے عابد و زاہد اور عالم و فاضل شخصیت کا وجود سماج پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اُس کے علم وفضل سے متاثر ہوکر بہت سے لوگوں نے اُس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جن میں مرتضیٰ زیدی نے خالد بن صفوان، حفص بن القوام، صالح بن عمرو، حسن بن حفص بن سالم، بکر بن عبدالاعلیٰ، ابن السماک، عبدالوارث بن سعید، ابوغسان، بشر بن خالد، عثمان بن الحکم، سفیان بن حبیب، طلحہ بن زید اور ابراہیم بن یحییٰ المدنی کا خصوصیت سے نام لیا ہے۔ ان میں سے موخرالذکر (ابراہیم بن یحییٰ مدنی) نے ہارون الرشید تک کا زمانہ پایا جب کہ وہ امام ابو یوسف کے ساتھ اُس کے دربار میں جایا کرتے تھے۔ ابراہیم بن یحییٰ امام شافعی کے اُستاد بھی تھے۔ اُن کے دوسرے اُستاد مسلم بن خالد زنجی بھی اسی زمانہ کے معتزلی تھے۔

لیکن وقت کے سیاسی۔ مذہبی تقاضوں نے بھی اعتزال کے فروغ میں مدد دی۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ عباسی ایرانیوں کی مدد سے برسر اقتدار آئے تھے لہٰذا اُنھوں نے موخرالذکر کے باب میں نرم تر رویہ اختیار کیا۔ اس طرح ایرانی "احیائیت پسندوں" (Revivalists) نے عباسی خلفاء بالخصوص منصور کے نرم رویہ سے قوی دل ہوکر اپنے قدیم مذہب کے احیاً کی بڑی شدت سے تحریک شروع کردی۔ اس تحریک نے مختلف شکلیں اختیار کیں جو "زندقہ" کہلاتی ہیں اس قسم کی ایک خطرناک تحریک خود منصور کے عہد خلافت میں رونما

ہوئی۔ یہ "راوندیہ" کا خروج تھا۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس کا استیصال کر دیا گیا۔ پھر بھی "زندقہ" کو کلی طور پر مستاصل نہ کیا جا سکا۔ قابلِ اعتماد وجوہ و اعیانِ مملکت یا اُن کے اعزّہ اس سے متاثر تھے بلکہ بعضے تو اس کے سرگرم مبلغ بن گئے۔ اس "ایران نوازی" کا ثمرِ تلخ منصور کے جانشین مہدی (۱۵۸ - ۱۶۹ھ) کو چکھنا پڑا۔ "زندقہ" محض کسی دینی و فکری بے راہ روی ہی کا نام نہ تھا۔ یہ ایک سیاسی انقلاب کا بھی پردہ تھا۔ زنادقہ کا نصب العین جہاں ایک طرف دینِ اسلام کو ختم کر کے قدیم مجوسی مذاہب کا احیا رتھا وہیں دوسری جانب عرب حکومت کا تختہ اُلٹ کر قدیم ساسانی حکومت کو بھی بحال کرنا تھا۔ ہذا باپ (منصور) سے زیادہ اس خطرے کا احساس بیٹے (مہدی) نے کیا چنانچہ ایک جانب اُس نے زنادقہ کی دارو گیر کے لئے ایک خصوصی پولس افسر "صاحب الزنادقہ" کا تقرر کیا جو چُن چُن کر اس تحریک کے وابستگان کو موت کے گھاٹ اُتارتا تھا، دوسری جانب اُن کی اصلاحِ فکر کے لئے متکلمین کو بلا کر اُن کے (زنادقہ) کے رد میں اور اُن کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لئے کتابیں لکھوائیں۔ چنانچہ مسعودی نے لکھا ہے:۔

" وکان المھدی اول من امر الجدلیین من اھل البحث من المتکلمین بتصنیف الکتب فی الرد علی الملحدین ممن ذکرنا من الجاحدین وغیرھم واقاموا البراھین علی المعاندین وازالوا شبہ الملحدین فاوضحوا الحق للشاکّین

مہدی پہلا خلیفہ تھا جس نے متکلمین کی جماعت میں سے مناظرہ کرنے والے جدلیات کے ماہرین کو اُن ملحدین کے رد میں کتابیں تصنیف کرنے کا حکم دیا جن کا منکرینِ اسلام میں سے ہم نے ذکر کیا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے معاندوں کے خلاف دلائل و براہین قایم کئے اور ملحدوں کے شکوک کو دور کیا۔ اس طرح ان (متکلمین) نے متشککین کے واسطے حق کو واضح کیا۔

دربارِ خلافت کی ہمت افزائی اور خلیفۂ وقت کا تقرب متکلمین کے حوصلوں کو بلند کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے اور واقعہ ہے کہ مہدی (۱۵۸-۱۶۹ھ) کے عہد خلافت نے (جو مامون کے پیدا ہونے سے سال بھر پہلے ہی ختم ہو چکا تھا) فرقہ معتزلہ کے اندر صف اول کے متکلمین کو پیدا کیا جن کی نظیر پیش کرنے سے آنے والا زمانہ قاصر رہا۔

مگر یہ متکلمین؟

متکلمینِ علم کلام" کے ماہرین کو کہتے ہیں اور بعد میں علم کلام اسلامی تعلیمات کی عقلی توجیہ کے مترادف تھا چنانچہ قاضی عضدالدین الایجی نے "المواقف فی الکلام" کے اندر "علم کلام" کی تعریف بدینطور کی ہے :-

"الکلام علم یقتدر معہ اثبات العقائد الدینیۃ بایراد الحجج ودفع الشبہ"۔

کلام وہ علم ہے جس کے ذریعہ دینی معتقدات کو ثابت کرنے کی قدرت حاصل ہوتی ہے بایں طور کہ ان کی تائید میں دلائل و براہین بیان کئے جائیں اور اس کے خلاف شبہات رفع کئے جائیں

مگر ابتدا میں یہ کلام باری تعالیٰ کے متعلق غور و خوض کرنے، بالخصوص قرآن کریم کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی بحث کا نام تھا جو ایک وسیع تر مسئلہ "صفات باری تعالیٰ" کا جزء تھا اس مسئلہ کا آغاز "نوفلاطونی" (NEOPLATONISTS) اور یونانی یہودی (GRECO JEWISH) فلسفہ میں ہوا تھا۔ بعد میں مدینہ منورہ اور حران کے یہودیوں کی وساطت سے یہ مسئلہ اسلامی فکر میں بھی در آیا۔ اسلامی فکر کی تاریخ میں اس کا سب سے پہلا علمبردار جعد بن درہم تھا جس سے جہم بن صفوان نے اس بدعت کو اخذ کیا اور جہم کی اس بدعت سے واصل بن عطا [illegible] کے متبعین متاثر ہوئے جیسا کہ امام احمد بن حنبل نے کتاب "الرد علی الزنادقۃ والجہمیۃ" میں لکھا ہے۔

"واتبعه علی قوله رجال من اصحاب ابی حذیفة واصحاب عمرو بن عبید بالبصرة"

اور جہم کے قول (نئے مذہب نفی صفات باری) کا شہر بصرہ میں ابوحذیفہ (واصل بن عطاء الغزال) اور عمرو بن عبید کے پیروؤں نے اتباع کیا۔

اس طرح متکلمین "(باری تعالیٰ کی صفت کلام کے منکرین یا قرآن کے مخلوق ہونے کے قائلین) اور معتزلہ و قدریہ میں ربط بڑھنے لگا اور اس کے نتیجے میں موخرالذکر کی فکری سرگرمیاں جو اپنے فکری موافقت کی عقلی توجیہ کے مترادف تھیں "کلام" کے نام سے موسوم ہونے لگیں مثال کے طور پر ابوالہذیل العلاف نے اپنے مخالفین کے رد میں جو کتابیں لکھیں، مرتضیٰ زبیدی نے اُن کا موضوع "کلام دقیق" اور "کلام جلیل" ہی بتایا ہے۔

"وحکی عن یحییٰ بن بشر ان لابی الهذیل ستین کتابا فی الرد علی المخالفین فی دقیق الکلام وجلیله"

یحییٰ بن بشر سے حکایت بیان کی گئی ہے کہ ابوالہذیل العلاف کی اپنے مخالفین کے رد میں "کلام دقیق" اور "کلام جلیل" کے اندر ساٹھ کتابیں ہیں۔

جاحظ نے ابو اسحٰق النظام کے علم و فضل کی تعریف یہی کہہ کر کی ہے کہ میں نے "کلام" اور "فقہ" میں اُس سے زیادہ عالم نہیں دیکھا۔

"قال الجاحظ ما رأیت احداً اعلم بالکلام والفقه من النظام"

بہرحال دوسری صدی کے وسط سے کلامی تفکیر کے اہم ترین نمایندے معتزلہ ہی تھے۔

اور یہ بھی واقعہ ہے کہ مہدی اور ہارون کے عہدِ خلافت میں جو معتزلی متکلمین ہوتے بعد میں اُن کے علمی پایہ کے معتزلی نہ پیدا ہو سکے۔ مامون کے زمانہ میں اور اُس کے بعد بھی مشاہیر معتزلہ پیدا ہوئے جیسے ابو علی الجبائی، اُس کا بیٹا ابو ہاشم، ابوالحسین الخیاط، کعبی بلخی، جاحظ، ابوالحسین بصری وغیرہ۔ بے شک یہ معتزلی متکلمین کے اندر مخصوص و منفرد مقام رکھتے ہیں صاحب مذاہب جدیدہ بھی ہیں اور معتزلی فکر کی ثروت میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے مگر ان میں سے کوئی بھی ابوالہذیل العلاف، ابو اسحٰق النظام اور اُن کے معاصرین کی ٹکر کا نہ تھا۔ (باقی)

سنہ ۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت ۔
تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

سنہ ۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم ، سلاطین ہند کی
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

سنہ ۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت دطبع جدید دلپذیر ترتیب ، جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم ، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

سنہ ۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم ، صدیق اکبر ، تاریخ ملت حصہ یازدہم ، سلاطین ہند دوم ، انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

سنہ ۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم ، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ، تاریخ گجرات ، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

سنہ ۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، مصائب اور ان کا علاج

سنہ ۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفہ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

سنہ ۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول ، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ۔ اسلامی کتب خانے ، عرب و ہند
تاریخ ہند پر نئی روشنی

سنہ ۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ، معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔

سنہ ۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم ۔ تاریخ ردہ ، سرکشی ضلع بجنور ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اول

سنہ ۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم ، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ، عرب و ہند عہد رسالت میں ۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

سنہ ۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لادینی دور کا تاریخی پس منظر ۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

سنہ ۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ۔ رموز عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

سنہ ۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم ، تفسیر مظہری اردو جلد ششم ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

سنہ ۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ، تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

سنہ ۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم ، تاریخ الفخری ، حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

سنہ ۱۹۷۰ء حیات عبدالحی ، تفسیر مظہری اردو جلد نہم ، مآثر و معارف ۔ احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت

سنہ ۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم ، بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

سنہ ۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

Regd. No. D. (D) 231 Phone 262815 JULY 19..

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ -
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق وفلسفۂ اخلاق - فہم قرآن - تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" - صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اوّل - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج وزوال - تاریخ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ" -

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اوّل - اسلام کا نظامِ حکومت - سرمایہ - تاریخ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اوّل - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت - مسلمانوں کا عروج وزوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ" - تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اوّل"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے) (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر -

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر ومغربِ اقصیٰ" تدوینِ قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد -
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا -

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اوّل (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے - کتابتِ حدیث -

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت - قرآن اور تعمیرِ سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

برہان

جلد ۷۳ | ماہ رجب المرجب ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۴ء | شمارہ ۲

نظرات

افسوس ہے، گذشتہ ماہ عالم اسلام کی ایک اور نہایت بلند پایہ شخصیت، یعنی مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی ۷۷ برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وانا الیہ راجعون۔ وہ ۱۸۹۷ء میں قدس کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، ابتدائی اور ثانوی تعلیم وطن مالوف میں ہی پائی، اس کے بعد مصر چلے گئے اور وہاں جامعہ ازہر میں علوم دینیہ و اسلامیہ میں تکمیل کے مدارج و مراتب طے کئے، جنگِ عالمگیر اول (۱۹۱۸-۱۹۱۴) کے دوران ترکی افواج سے وابستہ رہے، ۱۹۲۱ء میں فلسطین کے مفتی اور ۲۲ء میں وہاں کی مجلس اعلیٰ اسلامی کے صدر مقرر ہوئے، ۳۱ء میں قدس میں جو موتمر عالم اسلامی ہوئی تھی اُس کے صدر منتخب ہوئے، ۳۶ء میں جب انگریزوں کی مداخلت بیجا کے باعث فلسطین میں شورش اور ہنگامے بپا ہوتے تو وہ لبنان آگئے اور ۳۷ء سے ۳۹ء تک یہاں مقیم رہے، پھر عراق چلے گئے اور سید رشید عالی الگیلانی نے انگریزوں کے خلاف جو بغاوت کی تھی اُس میں بڑی سرگرمی اور جوش سے حصہ لیا۔ لیکن جب یہاں کے سیاسی حالات میں انقلاب رونما ہوا تو وہ بھاگ کر پہلے ایران اور پھر وہاں سے جرمنی گئے، اور ۱۹۴۱ء سے ۴۵ء جب کہ دوسری عالمگیر جنگ

میں جرمنی کو شکست فاش ہوئی اور اتحادیوں نے اُس پر قبضہ کر لیا۔ وہاں مقیم رہے۔ جنگ کے خاتمہ پر فرانس میں قید ہو گئے، ۱۹۴۶ء میں رہا ہو کر مصر آگئے، مرحوم کی پوری زندگی فلسطین کی آزادی و خود مختاری اور یہودیوں کو وہاں سے بے دخل کرنے کے لئے وقف تھی، چنانچہ پہلی جنگِ عالمگیر کے خاتمہ پر جب مجلس اقوام متحدہ کی ایک قرارداد کے مطابق ۱۹۲۲ء میں فلسطین پر برطانوی انتداب قائم ہوا تو اُس وقت اس کی مخالفت میں اور اس کے بعد ۱۹۴۸ء کے خاتمہ پر جب فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کے قیام کا فیصلہ ہوا تو اب اُس کی مقاومت میں کوئی سیاسی اور جنگی تدبیر ایسی نہیں تھی جو انھوں نے اختیار نہ کی ہو، وہ ہر محاذ پر لڑے، ہر مورچہ پر انھوں نے دادِ شجاعت دی، ناکامی پر ناکامی ہوتی رہی۔ لیکن انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ ان غیر معمولی مجاہدانہ سرگرمیوں کے علاوہ مرحوم علم و فضل، تقویٰ و طہارت اور عمل و کردار کے اعتبار سے بھی ایک بلند مرتبہ و مقام کے مالک تھے اور وہ اتحادِ عالم اسلامی کے بھی بہت بڑے علم بردار تھے، اس بنا پر نہ صرف عرب بلکہ پورے عالم اسلام میں ان کو بڑی قدر و منزلت اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سخت افسوس ہے آپ کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کسی سے پُر نہیں ہو سکتا!

مفتیٔ اعظم مرحوم سے راقم الحروف کی پہلی ملاقات عجب ڈراماتی انداز میں ہوئی۔ غالباً ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۴ء تھا کہ مفتی اعظم مرحوم اور مصر کے وزیر اوقاف محمد علی علوبہ اپنے کسی ایک مشن کے سلسلہ میں ہندوستان آئے تھے اور ملک کا دورہ کر رہے تھے، اس سلسلہ میں یہ دونوں آگرہ بھی آئے، میں ان دنوں اپنے وطن میں ہی مقیم تھا۔ لیکن مجھ کو ان حضرات کے ورودِ ہند تک کی اطلاع نہیں تھی، اتفاق سے ایک دن شہر گیا اور عصر کی نماز ادا کرنے کے لئے جامع مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا کہ دو عرب کھڑے ہیں اور چند مسلمان

ان کے اردگرد جمع ہیں۔ مجھ کو عربوں سے ملنے اور عربی میں بات چیت کرنے کا شوق تو تھا ہی، میں بھی وہاں پہنچا اور گفتگو شروع کر دی، جب ان سے تعارف ہوا تو چونکہ مفتی اعظم کے کام اور نام سے عربی جرائد و رسائل کے ذریعہ پہلے سے واقف تھا اس لئے اب ان کو اپنے سامنے اور اُن کے ساتھ مصر کے وزیر اوقاف کو بھی دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، لیکن ان دونوں کو بھی مجھ سے ملاقات کر کے کچھ کم خوشی نہیں ہوئی! مفتی اعظم نے فرمایا: کل یہیں جامع مسجد میں ہماری تقریریں ہیں، لیکن اب تک کوئی ترجمان نہیں ملا تھا۔ اس لئے ہم سخت پریشان تھے، اب خدا کا شکر ہے تم مل گئے تو اس کام کو تم ہی کرنا۔ ہم کو بڑا اطمینان ہو گیا، مجھے اس میں کیا عذر ہو سکتا تھا! چنانچہ دوسرے دن عصر کی نماز کے بعد آگرہ کے مشہور ایڈوکیٹ مسٹر اختر عادل مرحوم کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ میں والد صاحب قبلہ مرحوم کے ساتھ اس میں شریک تھا، دونوں معزز مہمانوں نے (ایک نے مصری اور دوسرے نے شامی لب و لہجہ میں) عربی میں تقریر کی اور میں فی البدیہہ ان کا ترجمہ کرتا گیا۔ آخر میں جناب صدر کی فرمائش پر اہل آگرہ کی طرف سے دس پندرہ منٹ میں نے عربی میں شکریہ کی تقریر کی، جلسہ ختم ہوا تو مفتی اعظم اور وزیر محمد علی دونوں نے بڑی تعریف کی اور فرمایا: جب سے ہم ہندوستان میں ہیں۔ ہماری ایسی ترجمانی اور عربی میں تقریر کراچی میں مولوی نور الحق ندوی الازہری[1] نے کی تھی اور اس

[1] یہ میرے عزیز دوست ہیں، اصلاً پشاوری ہیں، ندوۃ العلما لکھنؤ سے فراغت کے بعد سیٹھ عبداللہ یوسف ہارون (کراچی) کے وظیفہ پر قاہرہ گئے، جامعۂ ازہر میں تعلیم پائی، وہیں ایک مصری خاتون سے شادی کی، واپس آ کر کراچی کے سندھ مدرسہ میں مدرس ہو گئے پھر اسلامیہ کالج پشاور میں دینیات کے ڈین ہو گئے، اس سے سبکدوش ہو کر جامعۂ عباسیہ بہاولپور کے وائس چانسلر ہو گئے، اب سنا ہے کہ اس سے بھی سبکدوش ہو گئے ہیں، ایک زمانہ میں برہان کے مستقل خریدار اور اس کے بڑے قدردان تھے۔

کے بعد یہ دوسرا موقع ہے کہ ہماری خاطرخواہ ترجمانی اور عربی میں تقریر تم نے کی ہے،

اس واقعہ کے عرصۂ دراز بعد مفتی اعظم سے میری آخری ملاقات ۱۹۶۷ء میں حجازِ مقدس میں ہوئی تھی جب کہ میں وہاں گورنمنٹ آف انڈیا کے حج ڈیلی گیشن کے ممبر کی حیثیت سے گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندو پاک جنگ ہو چکی تھی، مرحوم کو اس جنگ کا سخت ملال اور صدمہ تھا۔ جب مجھ سے گفتگو ہوئی تو وہ اس صدمہ کو چھپا نہیں سکے، اُن کے دل میں مسلمانانِ عالم کے موجودہ حالات، باہمی تشتت و تفرق، سیاسی عدم استحکام اور دینی و اخلاقی انحطاط کا بڑا درد اور غم تھا۔ وہ ہر وقت انھیں کے افکار اور معاملات و مسائل میں غلطاں پیچاں رہتے تھے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃً۔

عہدِ نبوی کے
غزوات و سرایا اور اُن کے مآخذ پر ایک نظر

از سعید احمد اکبر آبادی

(۳)

حافظ ابن عبد البر کا بیان ہے کہ عقبۂ ثالثہ کی بیعت ختم ہو جانے کے بعد ہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا حکم دیا تو سب سے پہلے ابوسلمۃ بن عبد الاسد المخزومیؓ روانہ ہوئے۔ ان کی بیوی ام سلمۃؓ بنت ابی امیہ اس وقت ان کے ساتھ نہیں جا سکی تھیں۔ یہ مکہ میں ہی رہ گئیں، کم و بیش ایک برس کے بعد جب ان کو اجازت ملی تو عثمان بن ابی طلحہ جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے انھوں نے اُن کو اپنی حفاظت میں مدینہ پہنچایا۔ ابوسلمہ کی ہجرت کے بعد مسلمان مردوں اور عورتوں کے قافلے یکے بعد دیگرے روانہ ہوئے۔ یہ سب حضرات عزیز قریب، مال و متاع جاگیر اور جائداد۔ غرض اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ چھاڑ کر بے سرو سامان چلے جا رہے تھے اور ان کی حالت اس وقت مولانا محمد علی مرحوم کے اس شعر کا مصداق تھی:۔

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا ۔۔۔ سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

لہ بعض روایات میں ہے کہ سب سے پہلے مہاجر مصعب بن عمیرؓ ہیں

ان مہاجرین میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ بن عفان۔ حضرت حمزہؓ۔ حضرت زبیرؓ بن عوام، اور خواتین میں حضرت زینب بنت جحشؓ اور ان کی دونوں بہنیں بھی تھیں، مدینہ میں انصار کی آبادی منتشر تھی، ان کا ایک قبیلہ بنی عمرو بن عوف قبا میں آباد تھا جو مدینہ سے تین میل کی مسافت پر تھا۔ اکثر مہاجرین نے قیام یہیں کیا۔ بعض حضرات عوالی میں مقیم ہوئے، کوئی کسی کے پاس ٹھہرا اور کوئی کسی کا مہمان ہوا[1]۔ غرض اب تک جو مرد اور عورتیں مسلمان ہو چکے تھے اور مکہ میں موجود تھے، وہ سب ایک ایک کر کے خاموشی سے مدینہ پہنچ گئے۔

اب مکہ میں صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے تھے جو مسلمان افلاس وتنگدستی یا کسی اور مجبوری کے باعث ہجرت نہ کر سکے تھے، قرآن مجید میں ان کی نسبت ارشاد ہوا:۔

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ	اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا	(تم کیوں جنگ نہیں کرتے) جو کہتے ہیں کہ اے
مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا	ہمارے پروردگار تو ہمیں اس آبادی سے نکال
مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ	جس کے باشندے ظالم ہیں۔ اے رب تو خود ہی
نَصِيْرًا۔ (النساء)	کسی کو اپنی طرف سے ہمارا حامی اور مددگار بنا

ہجرت نبوی اب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہجرت سے مانع کیا امر ہو سکتا تھا لیکن آپ حکم الٰہی کے منتظر تھے اور ادھر اللہ تعالیٰ کو کفار قریش پر اپنی حجت کو تمام کرنا تھا۔ اُس کی صورت

---

[1] حافظ ابن عبدالبر نے اور ان کے تتبع میں ابن حزم نے مجموع السیر میں ان مہاجرین اور مہاجرات کے نام لکھے ہیں، لیکن اس سے صحیح تعداد کا پتہ نہیں چل سکتا، کیوں کہ ان کے لکھنے کا انداز یہ ہے مثلاً: بنو جحش کے ساتھ بنو اسد کی ایک جماعت نے بھی ہجرت کی اور ان میں یہ اصحاب بھی تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر قبیلہ کے نمایاں مردوں اور عورتوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

یہ ہوئی کہ عقبۂ ثالثہ میں بیعت اور مدینہ کی طرف ہجرت کا فیصلہ اس خاموشی کے ساتھ ہوا تھا کہ قریش تو درکنار انصار میں بھی اب تک جو لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے انھیں بھی کانوں کان اس کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ ابن ہشام اور دوسرے ارباب سیر کا بیان ہے کہ آخرکار جب انھیں اس کا علم ہوا کہ انصار میں ایک بڑی تعداد مسلمان ہوگئی ہے اور مکہ میں پہلے سے جو مسلمان تھے وہ بھی سب مدینہ پہنچ گئے ہیں اور اس طرح اسلام کے قدم مدینہ میں مضبوط ہوگئے ہیں تو چوں کہ قریش کے تجارتی قافلے جو شام آتے جاتے تھے، مدینہ طیبہ ان کی گذرگاہ میں پڑتا تھا اس بنا پر ان کو اندیشہ ہوا کہ مسلمان ان قافلوں سے تعرض کریں گے۔ ظاہر ہے یہ معاملہ ان کے لئے موت وحیات کا مسئلہ تھا۔ اس لئے انھوں نے دارالندوہ میں ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی، قریش کے تمام اکابر اور ارباب رائے موجود تھے، اصل معاملہ پر جب بحث ہوئی تو ابوالبختری بن ہشام نے رائے دی کہ حضور کو قید کردیا جائے، ابوالاسود ربیعہ بن عمیر نے کہا کہ آپ کو جلاوطن کیا جائے۔ لیکن مجمع نے ان دونوں رایوں کو رد کردیا اور آپ کے قتل کردینے پر سب متفق ہوگئے، اس کی صورت انھوں نے یہ نکالی کہ قریش کے ماتحت جو چھوٹے چھوٹے قبیلے ہیں اُن میں سے ہر قبیلہ اپنا ایک بہادر نوجوان منتخب کرے اور یہ سب بیک وقت حضور پر حملہ آور ہوکر (شُلّتْ ایدیہم) آپ کا کام تمام کردیں۔ اس طرح بنو ہاشم کا سب سے مقابلہ کرنا دشوار ہوگا۔

اور اگر خون بہا دینا بھی پڑا تو وہ سب پر تقسیم ہوجائے گا، ادھر ان لوگوں نے یہ منصوبہ تیار کیا اور اُدھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ترکِ وطن کا حکم دیا۔ چنانچہ جس شب میں ان لوگوں نے کاشانۂ نبوی کا محاصرہ کیا کہ صبح کو آپ گھر سے نکلیں گے تو یہ اپنے ارادہ کی تکمیل کریں گے اسی شب میں آپ کے پاس لوگوں کی جو امانتیں تھیں انھیں حضرت علیؓ کے سپرد کیا کہ وہ ان کے مالکوں کو واپس کردیں اور پھر مدینہ کا ارادہ کریں اور انھیں اپنے بستر پر لٹا کر شب کے آخری حصہ میں جب کہ عموماً نیند کا غلبہ ہوتا ہے، آپ مکان کی اس کھڑکی (خوخۃ) سے جو حضرت ابوبکرؓ کے مکان کی پشت کی جانب کھلتی تھی، باہر تشریف لاتے۔ حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر پہنچے، وہ پہلے سے چشم براہ تھے اور کئی مہینے سے دو

اونٹنیوں کو خوب کھلا پلا کر تیار کر رکھا تھا۔ انھوں نے عرض کیا: حضورؐ! ایک اونٹنی آپ پسند فرمائیں"
ارشادِ گرامی ہوا: "بہت اچھا! مگر قیمت لینی ہوگی"[1] صدیق اکبرؓ کو انکار کی کیا مجال ہوسکتی تھی" چونکہ
پروگرام یہ تھا کہ آپ اور حضرت ابوبکرؓ دونوں تین روز تک غارِ ثور میں روپوش رہیں گے اس لئے
عبداللہ بن اریقط جو اگرچہ کافر تھا مگر آپ نے اُس کو مدینہ کے سفر میں رہنمائی کے لئے مقرر فرمایا تھا۔
دونوں اونٹنیاں اُس کے سپرد کیں اور آپ کعبہ پر حسرت کی نگاہ ڈال اور اسے الوداع کہہ کر مکہ سے
روانہ ہوگئے، تین روز غارِ ثور میں قیام فرمایا۔ اس کے بعد عبداللہ بن اریقط حسبِ قرارداد
دونوں اونٹنیاں لے کر آگیا تو آپ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور اُن کے غلام عامر بن فہیرہ کی معیت
اور عبداللہ بن اریقط کی رہنمائی میں روانہ ہوئے، اربابِ سیر نے اس سفر کی ایک ایک منزل کی
روئداد نقل کی ہے، لیکن یہاں اُس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے، بہرحال عجیب منظر تھا ایک
شہنشاہِ عرب و عجم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ نامانوس وادیوں کے نشیب و فراز سے گذرتا
اور دشت وجبل کی خاموشیوں کو اپنی سواریوں کی رفتار سے جگاتا روانہ چلا جارہا تھا اور مبدأ
فیاض کے حریم قدس سے دشمنوں کی سعی ناکام پر یہ اعلانِ عام ہورہا تھا۔

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝ (الانفال)

اور اے محمدؐ آپ اُس وقت کو یاد کیجئے جب کفار آپ کے متعلق یہ داؤ چلنا چاہتے تھے کہ وہ آپ کو گرفتار کرلیں، قتل کردیں یا جلاوطن کردیں، تو وہ اپنی جیسی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

---

[1] آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اصرار سے اُن علماء اور مشائخ کو عبرت ہونی چاہیئے جو اپنے مریدوں اور معتقدوں کی آمدنی کے بل بوتہ پر عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے اور امیرانہ طرز بود و ماند رکھتے ہیں۔

بارہ تیرہ دن میں یہ سفر تمام ہوا تو آپ بروز دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول[1] کو قبا میں داخل ہو کر قبیلہ بنو عمرو بن عوف کے ایک سردار کلثوم بن الہدم کے مہمان اور حضرت ابو بکرؓ خبیب بن اساف جو بنو الحارث بن الخزرج سے تعلق رکھتے تھے اُن کے ہاں قیام فرما ہوئے، یہاں دو ہفتہ قیام کے بعد آپ شہر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے، یہ جمعہ کا دن تھا، محلہ بنو سالم سے گذر رہے تھے کہ نماز جمعہ کا وقت ہو گیا، آپ نے نماز یہیں ادا کی اور خطبہ دیا۔ یہ پہلی نماز جمعہ تھی جو آپ نے پڑھی، اس کے بعد آپ پھر جب روانہ ہوئے اور شہر میں داخل ہوئے تو مختلف حضرات کا اصرار تھا کہ حضورؐ میزبانی کا شرف ان کو عطا فرمائیں۔ لیکن آپ نے اس معاملہ میں حکم اپنی اونٹنی کو بنا دیا کہ وہ جہاں بیٹھ جائے گی آپ وہیں قیام فرمائیں گے۔ اونٹنی چلتی رہی اور آخر کار جہاں اب مسجدِ نبوی ہے اُس سے متصل حضرت ابو ایوب انصاری کا مکان تھا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ بنو نجار سے تھے اور حضورؐ کے ساتھ ان لوگوں کا ددھیالی رشتہ تھا۔ ناقہ انھیں کے مکان کے سامنے آکر بیٹھی اور حضورؐ نے حضرت ابو ایوب انصاری کو شرفِ میزبانی سے نوازا۔ ساتویں مہینے آپ کا مکان جس کی کل کائنات کچی اینٹیں۔ کھجور کے پتے اور ٹہنیاں تھیں تعمیر ہو گیا تو آپ اس میں منتقل ہو گئے، بعد میں حسب ضرورت اس میں اضافہ ہوتا رہا۔

مواخات اب سماجی اور اقتصادی اعتبار سے سب سے بڑا مسئلہ مہاجرین کی آبادکاری کا تھا آج جب کہ تہذیب و تمدن اور وسائلِ معیشت میں ترقی کے اعتبار سے دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے پناہ گزینوں کی آبادکاری کا معاملہ اور اُس سے سیاسی، سماجی اور اقتصادی جو مسائل پیدا ہوتے ہیں وہ اقوامِ عالم کے لئے دردِ سر بنے ہوئے ہیں اور اُن کے حل کے لئے

---

[1] اکثر مورخین سیرت نے قبا میں داخلہ کی تاریخ ۸ ربیع الاول ۱۳ نبوی لکھی ہے لیکن حافظ ابن عبد البر نے بارہ لکھی ہے اور ہمارے نزدیک مکہ سے روانگی کی تاریخ، غار ثور میں قیام اور سفر کی منزلوں کی تعداد کے پیشِ نظر یہی قرین قیاس ہے۔

مجلس اقوامِ متحدہ کے ماتحت ایک مستقل شعبہ ہے، اس لئے دیکھنا چاہیئے کہ اس اہم مسئلہ کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس خوش اسلوبی سے اور کس قدر جلد حل فرمایا۔ بقول مولانا شبلی کے کوئی شبہ نہیں کہ "یہ بھی شانِ نبوت کی خصوصیات میں سے ہے" (سیرت النبی ج ۱ ص ۲۹۰)

اس لئے ہم بھی اس داستان کو ذرا تفصیل سے سناتے ہیں۔

مواخات کی حکمت | جیسا کہ آج کل بھی عام قاعدہ ہے آبادکاری کی ایک یہ شکل بھی ہو سکتی تھی کہ ان کے لئے الگ زمینیں خرید کر مکانات بنوا دئے جاتے اور معاش کے لئے کاروبار یا کھیتی باڑی کا انتظام کیا جاتا۔ اور اس مقصد کے لئے جتنے سرمایہ کی ضرورت ہوتی اُس کا کچھ بند وبست تو خود بعض مہاجرین بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ خود حضرت ابوبکرؓ جب مدینہ پہنچے ہیں تو چالیس ہزار درہم آپ کے ساتھ تھے۔ اور یہی حال بعض اور متمول مہاجرین کا تھا۔ اور مزید رقم جو درکار ہوتی اُس کا انتظام انصار بطیبِ خاطر کر سکتے تھے۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آبادکاری کے اس طریقہ کے بجائے مواخات کی صورت اختیار فرمائی! اس میں مندرجۂ ذیل حکمتیں اور مصلحتیں آپ کے پیشِ نظر تھیں:۔

(۱) مہاجر قدیم الاسلام اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پُرانے صحبت و تربیت یافتہ تھے اور اُن کے بالمقابل انصار نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، اس بنا پر حضور نے چاہا کہ دونوں ایک گھر میں رہیں گے تو اس سے انصار کو دینی تعلیم و تربیت میں بہت کچھ مدد ملے گی۔

(۲) مہاجر اور انصار اگرچہ اسلام کے رشتہ وحدت سے منسلک تھے، لیکن طبیعت کی افتاد اور مزاج کے اعتبار سے دونوں میں بہت فرق تھا۔ مہاجرین تجارت پیشہ لوگ تھے نظم و نسق کی صلاحیت بھی ان میں بہت اچھی تھی اور ان کا معیارِ زندگی اونچا تھا۔ اس کے برخلاف انصار مجموعی حیثیت سے فلاحت و زراعت کا پیشہ رکھتے تھے اور یہ ظاہر ہے ان دونوں طبقوں کا مزاج اور طبیعت یکساں نہیں ہوتے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ دونوں ہر وقت ایک ساتھ رہیں گے تو اختلافِ طبع کی خلیج بہت کم ہو جائے گی۔

(۳) دنیا کو نبی اُمّی کی سیاسی دانشمندی اور دوراندیشی کی قسم کھانی چاہیئے، آپ کو یہ محسوس ہوا کہ انصار جس ماحول میں رہتے ہیں اُس کے پیشِ نظر بعید نہیں کہ انھیں کے کنبہ برادری میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو منافق ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے لئے مارِ آستین ثابت ہوں (چنانچہ بعد میں ایسا ہوا بھی) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ انصار اور مہاجر دونوں ایک جگہ اور ایک ہی گھر میں رہیں گے تو منافقوں کو من مانی کرنے کا موقع زیادہ نہیں ملے گا اور اسلام کے خلاف ان کی خفیہ ریشہ دوانیاں پردۂ راز میں نہ رہ سکیں گی۔

(۴) مہاجر قبیلے دو قبیلے تھے، یہی حال انصار کا تھا۔ اوس اور خزرج تو بڑے قبیلے تھے جن میں عرصہ سے شدید کشمکش چلی آرہی تھی، ان کے علاوہ اور چھوٹے چھوٹے قبیلے مثلاً عبدالاشہل، زفر، حارثہ، عمرو بن عوف، اوس منات، بنو نجار، الحارث، بعل الحبلی اور قواقلہ، مساعدہ، سلیمہ زریق، بیاضہ وغیرہ تھے جن میں باہم سیاسی رقابت اور چشمک تھی، اس بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ مہاجرین جو اسلام کی تعلیمات میں منجھے ہوتے ہیں انصار شب و روز اُن کے ساتھ یکجا رہیں گے تو عہد جاہلیت کی یہ یادگاریں اُن کے دل و دماغ کی لوح سے یکسر محو ہو جائیں گی اور وہ سب اللہ کے مومنِ قانت و مخلص بندے بن جائیں گے۔[1]

(۵) اس مقصد کے پیشِ نظر مواخات صرف انصار و مہاجرین تک محدود نہ تھی۔ بلکہ بعض مہاجر مہاجر کے اور بعض انصار خود انصار کے بھائی بنائے گئے۔

مواخات دو مرتبہ ہوئی | یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مواخات دو مرتبہ ہوئی ہے، ایک تو یہی جو مشہور ہے

---

[1] اب ذرا اس پس منظر میں غور کیجئے کہ بنگلہ دیش کیوں بنا؟ اور آج پاکستان میں مہاجرین کا کیا حال ہے؟ اور ان سب حالات کی وجہ سے آج پاکستان اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے کیوں گذر رہا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے صرف عبادات میں اسوۂ حسنہ ہیں اور (معاذ اللہ) معاملات اور سیاسیات اور معاشیات میں نہیں ہیں۔

اور جس کا ذکر ابن ہشام، ابن سعد، امام بخاری، ابن حبیب، ابن کثیر، ابن عبد البر، ابن سید الناس، وغیرہ سب نے کیا ہے، یہ مواخات ورودِ مدینہ کے پانچ ماہ بعد انجام پذیر ہوئی، لیکن ابن عبد البر (ص ۱۰۰) اور اُن کے تتبع میں ابن سید الناس (جلد اول ص ۱۹۹) نے اس مواخات کے علاوہ ایک اور مواخات کا تذکرہ کیا ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے قبل (۱) حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ (۲) حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ، (۳) حضرت عثمانؓ اور حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف (۴) حضرت زبیرؓ اور حضرت عبد اللہؓ بن مسعود، (۵) حضرت عبیدہؓ بن الحارث اور حضرت بلالؓ (۶) حضرت مصعبؓ بن عمیر اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص (۷) حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت سالم مولی ابی حذیفہ۔ (۸) حضرت سعیدؓ بن زید اور حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ میں کرائی تھی اس مواخات میں یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہے کہ مندرجۂ بالا فہرست میں حضرت بلال اور حضرت سالم دونوں آزاد کردہ غلام ہیں اور اُن کی مواخات اُن حضرات کے ساتھ کرائی جا رہی ہے جو قریش کے معزز افراد ہیں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس مواخات میں کیا حکمت و مصلحت تھی۔

دونوں میں فرق | لیکن دونوں مواخاتوں میں بہت بڑا فرق ہے جیسا کہ ابن عبد البر نے لکھا ہے پہلی مواخات حق اور مواسات پر مبنی تھی لیکن ہجرت کے بعد کی مواخات کا مقصد تو افراد و اشخاص متعلقہ کو حقیقی اور نسبی بھائیوں جیسا بنانا تھا چنانچہ ان میں توارث بھی ہوتا تھا۔ آیت ذیل میں یہی حکم بیان کیا گیا ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (انفال)	بے شبہ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے ان لوگوں کو ٹھکانہ دیا اور مدد کی، یہ سب آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں،

حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے اور یہی جمہور علماء و مفسرین کی رائے ہے کہ اس

آیت کے نزول کے بعد توارث کا دارومدار ہجرت پر تھا۔ لیکن اس کے بعد جب

أُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ (انفال) ارباب قرابت نسبی ایک دوسرے کے (مال میں) زیادہ حقدار ہیں

نازل ہوئی تو وراثت کا مبنیٰ نسبی تعلق ہو گیا۔

اس مواخات کی عملی شکل یہ ہوئی کہ ایک روز نوے صحابہ حضرت انس بن مالک کے گھر میں جمع تھے ان میں مہاجرین اور انصار نصف نصف تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے انصار کو مخاطب کر کے مہاجرین کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: یہ سب تمھارے بھائی ہیں۔ اس کے بعد ایک ایک انصاری اور ایک ایک مہاجر کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر فرماتے گئے کہ یہ اس کا بھائی ہے، لیکن یہ مواخات انھیں نوّے حضرات کے درمیان محدود نہ تھی جو اس وقت یہاں موجود تھے۔ بلکہ جو سرے سے مدینہ میں ہی موجود نہ تھے جیسے حضرت جعفر بن ابی طالب جو اس وقت حبشہ میں تھے حضور نے اُن کے اور ایک انصاری کے درمیان بھی مواخات کرائی۔ چنانچہ ابن ہشام نے جو نام گناتے ہیں ابن عبد البر نے اُن پر بیزرہ حضرات کے ناموں کا اور اضافہ کیا ہے اور یہ تعداد ایک سو بیس تک پہنچ گئی ہے۔

انصار و مہاجرین کا ردّعمل اس مواخات کے زیر اثر انصار نے جس اخوت و محبت، فیاضی اور ایثار کا اور مہاجرین نے جس احسان شناسی، خود اعتمادی اور عزم و ہمت کا مظاہرہ کیا ہے وہ تاریخ میں پناہ گزینوں اور آباد کاروں کے لئے ہمیشہ آئینۂ عبرت اور سرمایۂ بصیرت بنا رہے گا۔ انصار کا حال یہ تھا کہ جوں ہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ مہاجرین کے ہاتھ میں دیا۔ انصار مہاجرین کو گھر لے گئے اور ایک ایک چیز دکھا کر بولے کہ آدھی ہماری ہے اور آدھی تمھاری۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی مواخات حضرت سعد بن الربیع سے ہوئی تھی۔ یہ حضرت عبد الرحمٰن کو لے کر گھر آئے اور بولے۔ میں اپنی ہر مملوکہ چیز میں نصف کا

مالک آپ کو بناتا ہوں یہاں تک کہ میری دو بیویاں ہیں، اُن میں سے ایک کو طلاق دیتا ہوں۔ تاکہ عدت گذرنے کے بعد آپ اُس سے نکاح کرسکیں، لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ آپ کے اہل و مال میں برکت عطا فرماتے، یہ سب چیزیں آپ کو مبارک ہوں، مجھے تو آپ بازار کا راستہ بتا دیجئے، جب انھیں بازار کا راستہ معلوم ہوگیا تو انھوں نے تجارت شروع کردی اور اُس میں نفع ہوا[1]۔

انصار کے غیر معمولی حسن سلوک کا مہاجرین پر یہ اثر تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: "یارسول اللہ! ہم نے انصار سے بڑھ کر شریف اور فیاض کوئی قوم نہیں دیکھی ہم کو اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارا ثواب بھی انھیں کو نہ مل جائے۔" آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! ایسا نہیں ہوگا! تم لوگ جو انصار کے احسان و کرم کا شکریہ اور اُن کے لئے دعائیں کرتے ہو، بس تمھاری طرف سے یہی اُن کے احسان کا بدلہ ہے[2]۔

یہ سلوک تو انصار کا تھا، مہاجرین کا معاملہ یہ تھا کہ ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہ انصار پر بوجھ بن کر رہیں۔ انصار کھیتی باڑی کا مشغلہ رکھتے تھے، انھوں نے چاہا کہ اپنی زمینوں کو نصفا نصفی تقسیم کرلیں، لیکن چوں کہ مہاجرین اس فن سے ناواقف تھے اس بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مہاجرین کی طرف سے اس کی معذرت فرمائی اور پیداوار میں شرکت کی قرارداد ہوگئی، لیکن مہاجرین نے اس پر قناعت نہ کی۔ یہ تجارت پیشہ لوگ تھے، انھوں نے مدینہ میں بھی اسے شروع کردیا۔ اور اُس میں خوب ترقی کی۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی تجارت کے فروغ کا یہ عالم تھا کہ اُن کا سامانِ تجارت سات سات سو اونٹوں پر لدکر آتا تھا اور جس روز یہ کارواں مدینہ میں داخل ہوتا شہر میں غلغلہ برپا ہوجاتا تھا[3]۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب المناقب باب اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مسند امام احمد ساعاتی اڈیشن ج ۲۱ ص ۷

[2] مسند امام احمد ج ۲۱ ص ۱۰۔

[3] مسند امام احمد ج ۲۲ ص ۲۷۸

ایک مرتبہ انھوں نے اپنی ایک جائداد چالیس ہزار دینار میں حضرت عثمان کے ہاتھ فروخت کی اور اس میں ایک حصّہ انھوں نے امہات المومنین کا بھی رکھا، جب حضرت عائشہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ان کو دعا دی اور فرمایا: اے اللہ! عبدالرحمن بن عوف کو جنّت کی نہر سلسبیل کا پانی پلا ساتھ ہی ان کو یہ خوشخبری بھی سنائی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے، ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: "میرے بعد تم سب (ازواج مطہرات) بی بیوں کی خبرگیری وہی لوگ کریں گے جو سچے اور نیک عمل ہوں گے"۔

(مسند امام احمد ج ۲۲ ص ۲۷۸)

اسی طرح حضرت ابوبکر نے مدینہ کے نواح کے ایک مقام سخ میں اپنی ایک فیکٹری قائم کی تھی۔ حضرت عثمان بنو قینقاع کے مشہور تجارتی بازار میں کاروبار کرتے تھے۔ اور اس میں وہ ترقی کی کہ غنی اُن کے نام کا جز ہو گیا، علاوہ ازیں حضرت عمر بن الخطاب، حضرت زید بن حارثہ اور بعض اور مہاجرین کی نسبت طبقات ابن سعد اور اسد الغابہ اور صحیح بخاری کی کتاب البیوع سے تجارت اور کاروبار کرنے کا ثبوت ملتا ہے، انصار کا پیشہ اگرچہ فلاحت وزراعت تھا۔ اور اس کی وجہ سے ان میں بھی بڑے بڑے رئیس اور دولتمند تھے۔ لیکن مہاجرین کے دیکھا دیکھی ان میں بھی کاروبار کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت ابوہریرہ پر بعض حضرات کو یہ اعتراض تھا کہ وہ روایات کثرت سے کرتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ کو جب اس کا علم ہوا تو فرمایا: "لوگ" بازار میں کاروبار کرتے تھے اور میں شب و روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتا تھا۔

کوتاہ نظر سمجھتے ہیں کہ مدینہ میں آنے کے بعد غزوات اور سرایا کا جو سلسلہ شروع ہوا اُس کا ایک محرک مالِ غنیمت کا لالچ بھی تھا، لیکن ابھی جو کچھ عرض کیا گیا اُس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے، جو قوم خود محنت مزدوری کر کے اپنی معاش پیدا کرنے کا جذبہ رکھتی ہو اور اُس میں خود کفالتی ہو اُسے کیا پڑی ہے کہ لوٹ مار کر کے اپنی روزی حاصل کرنے کا سامان

رے، مالِ غنیمت کا حصول جنگ کا نتیجہ تو ہو سکتا ہے، ان لوگوں کے لئے اس کا مقصد ہرگز نہیں ہو سکتا، اور پھر اسلام کی تعلیم بھی یہی تھی، ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا: بہترین ذریعۂ معاش کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "الکسب بالید" محنت مزدوری کر کے اپنی معاش پیدا کرنا۔ (البلاغ المبین لحافظ ابن حجر کتاب التجارۃ)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر سیاسی مسائل

اب جب کہ مہاجرین کی آبادکاری ہو گئی اور وہ سب اپنے اپنے ٹھکانے لگ گئے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہم اور بنیادی امور و مسائل کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔ اصولی طور پر یہ معاملات دو قسم کے تھے:۔

(۱) داخلی اور اندرونی تحفظ: (Internal Security)

(۲) خارجی اور بیرونی تحفظات:۔ (External and Territorial Security)

ظاہر ہے سیاسی اعتبار سے آپ کے سامنے سب سے بڑا مرحلہ کفارِ قریش سے نمٹنے کا تھا، لیکن جب تک اندرونی معاملات میں اطمینان اور داخلی تحفظات نہ ہوں بیرونی دشمنوں سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں، اس بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے داخلی امن و تحفظات پر توجہ فرمائی، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ خطرہ اور اندیشہ مدینہ سوسائٹی کے دو طبقوں سے ہو سکتا تھا: (۱) ایک منافقین جن کو سیاسی اصطلاح میں کالی بھیڑ (Black Sheep) کہہ سکتے ہیں اور (۲) دوسرے یہود جن کی فطرت کو تاریخی تسلسل نے غداری، حیل و فریب اور فتنہ پردازی کے سانچہ میں ڈھال دیا تھا۔ مدینہ میں یہ دونوں طبقے مسلمانوں کے لئے سخت خطرناک بھی تھے اور وہاں کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں ان کا عمل دخل اور اثر بھی بہت زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جس کثرت سے ان دونوں طبقوں اور اُن کی دسیسہ کاریوں . . . .

. . . .

کا تذکرہ ہے (کفار مکہ کے علاوہ) کسی اسلام دشمن جماعت یا گروہ کا اس کثرت سے نہیں کیا ان میں سے ایک طبقہ مار آستین تھا اور دوسرا گرگِ باراں دیدہ، اب آئیے، یہ دیکھیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا :-

المنافقون| یہ وہ لوگ تھے جو زبان سے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کرتے، لیکن درحقیقت اُن کو اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ اور اس لئے پوشیدہ طور پر وہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور اُن کے ساتھ استہزا اور تمسخر کا معاملہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے، بنو عبدالاشہل کا قبیلہ تو ایسا تھا کہ اُس میں نہ کوئی مرد منافق تھا اور نہ کوئی عورت! اس کے علاوہ اَوس اور خزرج اور اُن کے ماتحت چھوٹے چھوٹے قبیلے مثلاً بنی عمرو بن عوف، بنی اُمیہ بن زید، بنو حارثہ، بنو النجار، اور یہود ان سب میں تھوڑے بہت منافق تھے، ان سب کا سردار عبداللہ بن اُبَی بن سلول تھا یہ بنی عوف بن الخزرج سے تعلق رکھتا تھا، یہی وہ شخص ہے جس نے غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر کہا تھا کہ "مدینہ واپس لوٹ کر ہم مسلمانوں کو مدینہ سے نکال باہر کریں گے"، اسی پر قرآن مجید کی سورۂ المنافقون نازل ہوئی جس میں ان لوگوں کی دسیسہ کاریوں کا پردہ چاک کیا گیا اور اس شخص کے خاص مذکورۂ بالا فقرہ کا اس آیت میں جواب دیا گیا ہے:-

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

یہ منافق کہتے ہیں کہ ہم مدینہ پہنچے نہیں کہ عزت والا وہاں سے ذلیل کو نکال دے گا، حالانکہ اصل عزت تو اللہ، اُس کے رسول اور مومنوں کی ہے۔ لیکن منافق نہیں جانتے۔

اسی سورۃ کی ایک اور آیت میں فرمایا گیا :

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ

یہی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس ہیں اُن پر خرچ نہ کرو، یہاں تک کہ وہ تتر بتر ہو جائیں حالانکہ آسمانوں اور

الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں۔ لیکن منافق نہیں سمجھتے،

ان تمام باتوں کے باوجود یہ لوگ کسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آکر بیٹھتے، سراپا گوش اور ہمہ تن خشوع و خضوع بن کر ارشادِ ذاتِ گرامی کو سنتے، اور حضور بھی ان کے بہروپیے پن کی وجہ سے جب یہ کوئی بات کہتے تو توجہ سے سنتے تھے، قرآن نے اس پوری سرگذشت کو نہایت بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ

اور اے محمد جب آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں تو اُن کے ڈیل ڈول آپ کی نظروں میں کھپ جاتے ہیں اور (اسی وجہ سے) وہ کوئی بات کہتے ہیں تو آپ اُس پر کان دھرتے ہیں، یہ (بیٹھتے ہیں تو اس ادب و احترام کے ساتھ) گویا بے حس و حرکت ٹیک لگی لکڑی ہیں اور (ان کی نمائشی خشیت کا یہ عالم ہے) کوئی سی ہی چیخ ہو، یہ سمجھتے ہیں کہ اُس کا نشانہ وہی ہیں۔

اب اللہ تعالیٰ ان کے مکر و فریب اور دورخی کا پردہ چاک کرتا اور حضور کو ان سے ہشیار رہنے کا حکم کرتا ہے:

هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ؗ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

(اے محمد) یہ لوگ آپ کے دشمن ہیں اس لئے آپ ان سے ہوشیار رہیں ان لوگوں پر خدا کی مار، یہ بہکے بہکے کدھر جارہے ہیں،

اللہ تعالیٰ کی اس تنبیہ اور اعلان کے مطابق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے متعلق جو رویہ اختیار فرمایا وہ یہ تھا کہ

(۱) آپ ہمیشہ ان کی طرف سے چوکنے اور ہوشیار رہتے ۔ ان کے اعمال و افعال پر کڑی نظر رکھتے اور اُن کے حرکات و سکنات کی نگرانی کرتے تھے ۔

(۲) اسلام یا مسلمانوں کی نسبت یہ لوگ جو بیہودہ باتیں کہتے رہتے تھے، نام لیے بغیر قرآن ان کی تردید کرتا رہتا تھا ۔

(۳) لیکن بظاہر عجیب بات یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی کسی منافق کو قتل کیا نہ جلا وطن کیا اور نہ کبھی کوئی سزا دی ، یہ سب کچھ تو درکنار ! آپ نے ان لوگوں کے جنازہ کی نماز پڑھی اور اُن کے لئے استغفار کی ہے ، پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پر ٹوکا اور یہاں تک جتا دیا کہ اگر آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تو اللہ تب بھی ان منافقوں کی مغفرت ہرگز نہیں کرے گا " تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے رُک گئے ۔

ہمارے مفسرین اور مورخین منافقوں کے ساتھ حضور کے اس معاملہ اور برتاؤ پر سرسری طور پر گذر گئے ہیں ۔ حالانکہ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جس سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے رک گئے ۔

ہمارے مفسرین اور مورخین منافقوں کے ساتھ حضور کے اس معاملہ اور برتاؤ پر سرسری طور پر گذر گئے ہیں ۔ حالانکہ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جس سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ تدبر و سیاست اور غیر معمولی حلم و فراست کا ثبوت ملتا ہے ہمارے نزدیک اس کے وجوہ و اسباب حسب ذیل تھے :-

(۱) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منظور کلمہ کی لاج رکھنا تھا ۔ ان لوگوں کے دلوں میں اسلام اور حضور کی نسبت کیسا ہی کینہ کپٹ ہو بہرحال زبان سے یہ کلمہ پڑھتے اور مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے حضور کو یا آپ کے ہر وقت کے ساتھیوں اور محرمانِ راز کو تو معلوم تھا کہ قرآن جن لوگوں کو بار بار منافق کہہ رہا اور اُن کے شر سے آگاہ کر رہا ہے اُس کا مصداق کون ہیں ۔ لیکن عام مسلمانوں اور غیر مسلموں کو اس کا علم نہیں تھا ۔ اس بنا پر

حضور کو خیال ہوا کہ اگر آپ نے ان لوگوں کے ساتھ تشدد کا معاملہ کیا تو اس سے ناواقف مسلمانوں میں بددلی پیدا ہوگی اور غیر مسلموں کو زبانِ طعن دراز کرنے کا موقع ملے گا، چنانچہ ایک روایت میں حضور نے اس خیال کا اظہار فرمایا بھی ہے۔

(۲) رحمتِ عالم کی افتادِ طبع اور مزاج ہی کچھ ایسا تھا کہ جس نے جھوٹ موٹ کو بھی کلمہ پڑھ لیا آپ اُس کے ساتھ وسعتِ قلب اور مدارات و رواداری کا معاملہ کرتے تھے۔ چنانچہ مولفۃ القلوب اور اعراب مدینہ جن کے متعلق قرآن میں قالت الاعراب آمنا، قل لم تومنوا..... الآیۃ فرمایا گیا ہے ان کے ساتھ بھی حضور نے تسامح اور اغماض وچشم پوشی کا ہی معاملہ کیا اور اسی بنا پر ایک موقع پر آپ نے "ھلا شققت قلبہ" "تو پھر تو نے اُس کا دل چیر کر کیوں نہیں دیکھ لیا" فرمایا

(۳) منافقوں کی انصار سے قرابت اور رشتہ داریاں تھیں، آپ نے خیال فرمایا کہ اگر ان کو سزائیں (جلاوطنی یا قتل) دی گئیں تو طبعی طور پر انصار کو اس کا ملال اور رنج ہوگا۔

(۴) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو توقع تھی کہ اسلام کی طاقت و قوت میں جوں جوں اضافہ ہوگا اور منافقوں کو آپ کی صحبت میں بیٹھنے اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کے مواقع جتنے زیادہ ملیں گے اسی قدر ان لوگوں کی اصلاح ہوتی رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہو بھی، اسلام کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس جماعت میں کمی ہوتی رہی۔ (باقی)

گذارش

خریداری برہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلہ میں خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر نہ ہو ـــــــ ادارہ کے قواعد و ضوابط مفت طلب فرمائیے۔

قبسات القباس

(محمد عباس رفعت شروانی کی ایک فارسی تصنیف)

(از جناب سید حیدر عباس صاحب رضوی لکچرر شعبہ اردو سیفیہ کالج، بھوپال)

محمد عباس رفعت شروانی کا نام ادبی حلقوں میں تلمیذ مرزا غالب کی حیثیت سے بخوبی متعارف ہے۔ وہ عربی اور فارسی میں قدرتِ کاملہ رکھتے تھے اور نظم و نثر دونوں ان کے قلم فکر کی جولانگاہ تھے۔ عربی فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے لیکن ان کی شہرت کا انحصار شاعری سے زیادہ نثر نگاری پر ہے۔ اس کا ایک سبب تو شاید یہ ہے کہ ان کی شاعری کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہے اس لئے کہ شاعری سے وہ ایک مرتبہ ایسے بے زار ہوئے کہ اپنا تمام شعری سرمایہ غرقِ آب کر دیا حالاں کہ بعد کو انھیں اس پر افسوس بھی ہوا۔ اس واقعہ کے بعد جو تھوڑے بہت اشعار انھوں نے کہے انھیں مختلف تصانیف میں درج کرتے گئے چنانچہ نور دیدہ کے رقعہ اول میں تحریر کرتے ہیں :-

"از ابتدائے سن تمیز تا کمالِ ایامِ جوانی در زرشِ سخن موزوم و دریکہ تازان ایں میدان دمِ آمدم روزے از نا ہنجاری جہل کہ دریں عالم بیشتر از و آرائد برآشفتم و سفینہ چند ہزار شعر در آب انداختم ازاں وقت تا ایں وقت اتفاقاً آنچہ گفتہ ام متفرق در رسائل خود نوشتہ ام[1]۔"

---

[1] نور دیدہ قلمی (مسودہ) محمد عباس رفعت :

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ رفعت کے ادبی سرمایہ میں نثر کی تعداد نظم کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ نوردیدہ کے رقعہ چہارم میں رفعت نے اپنی تصانیف کی جو فہرست درج کی ہے اس میں نثری تصانیف زیادہ ہیں۔

رفعت نے نوردیدہ میں اپنی ستائیس تصانیف کے نام درج کئے ہیں[1]۔ ان میں سے پندرہ کو انھوں نے "مفقود است" لکھا ہے۔ مفقود تصانیف کے نام اس طرح ہیں:۔

۱۔ خیر العمل (در فقہ) ۲۔ سرمن رائے (رسالہ در کلام) ۳۔ شہنشاہ نامہ (مثنوی اُردو در غزوات نبوی) ۴۔ خیالات رفعت (دیوان غیر مرتب بود در آب رفت) ۵۔ گلزار رفعت (در وقائع سیر دکن) ۶۔ گل نسرین (در علم اخلاق) ۷۔ مراسلات عبایہ (انشاء) ۸۔ چار باغ رفعت (حکایات) ۹۔ نور مشتری ترجمہ اخلاق ناصری ۱۰۔ سراج الاقبال (در تاریخ) ۱۱۔ گل صد برگ (انشائے فارسی بے آمیزش عربی) ۱۲۔ تاج اللطائف (در لطائف و ظرائف) ۱۳۔ انوار الغزالہ (در ذکر اہل بیت) ۱۴۔ جواب باصواب (در کلام) ۱۵۔ صفات جہانگیری (در مدح نواب جہانگیر محمد خاں) اور موجود تصانیف کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ قبسات الاقتباس (انشاء) ۲۔ قیصر نامہ (تاریخ روم) ۳۔ دل فروز (مثنوی) ۴۔ زینت الانشاء (انشاء) ۵۔ عمدۃ الاخبار (تاریخ بوہرا) ۶۔ انیس الجلیس (در فنِ تاریخ) ۷۔ رواں افزا (در فنِ تاریخ) ۸۔ ہوش افزا (در فنِ تاریخ) ۹۔ چشمہ نوش (آئین شاہی) ۱۰۔ قلائد الجواہر (انشاء) ۱۱۔ سلک گوہر اور ۱۲۔ نوردیدہ۔

نوردیدہ کے دیباچہ میں رفعت کی ایک اور تصنیف "قرۃ العین" کا ذکر بھی ملتا ہے۔

---

[1] "بھوپال اور غالب" میں اُستاذی عبدالقوی دسنوی صاحب نے رفعت کی ۲۶ تصانیف کی فہرست درج کی ہے ممکن ہے کہ اس میں سے بیشتر تصانیف نوردیدہ کی تکمیل کے بعد عالم وجود میں آئی ہوں۔

جس کے بیشتر مطالب بعد کو انھوں نے اپنی تصنیف "تاج الاقبال" میں شامل کر دیئے تھے۔ اس کے علاوہ بھوپال سے دستیاب شدہ خطوطِ غالب میں سے فارسی خط پر لکھی ہوئی عبارت سے رفعت کے ایک اور رسالہ "نور العین" کے وجود پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ رفعت نے نور دیدہ کے دیباچہ میں تذکرہ کے باوجود اپنی تصانیف کی فہرست میں قرۃ العین اور تاج الاقبال کو محسوب نہیں کیا اور رسالہ نور العین کو بھی فراموش کر دیا!

رفعت کا وہ ادبی سرمایہ بھی جو نور دیدہ کی تصنیف کے وقت موجود تھا دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ان کی ایک تصنیف "قبسات القباس" حال ہی میں دستیاب ہوئی ہے۔ اوائل ۱۹۶۹ء میں سیفیہ کالج بھوپال نے شعبہ اُردو کے لئے بھوپال کتاب گھر سے رفعت کی تصنیف "نور دیدہ" کے دو قلمی نسخے جن میں سے ایک مسودہ ہے اور دوسرا مبیضہ خرید کئے۔ مسودہ بہت زیادہ خستہ حالت میں ہے اس کا بیشتر حصہ خط شکست میں لکھا گیا ہے اور اس کی عبارت میں ترمیم و تنسیخ بھی بہت کی گئی ہے۔ مبیضہ بہت صاف اور خوشخط ہے چنانچہ مبیضہ ہی کو عام طور پر مطالعہ کے لئے استعمال کیا جاتا رہا اور مسودہ کو محفوظ کر دیا گیا ۱۹۷۰ء میں نور دیدہ کے مبیضہ کے درج شدہ ایک تحریر کی تصدیق کے سلسلہ میں مسودہ کو دیکھنے کی ضرورت پیش آئی تو اندازہ ہوا کہ مسودہ اور مبیضہ میں بعض اختلافات ہیں مثلاً یہ کہ بعض حواشی براہِ راست مبیضہ میں بڑھا دیئے گئے ہیں مسودہ میں ان کا کہیں پتہ نہیں ہے مبیضہ رجسٹر سائز کے لائن دار لیجر پیپر پر ہے جب کہ مسودہ میں مختلف اقسام کے سادہ کاغذ استعمال کئے گئے ہیں۔ مسودہ میں کہیں کہیں درمیان میں سادہ صفحات بھی ملتے ہیں۔ مسودہ اور مبیضہ دونوں میں نور دیدہ کے بعد رفعت کے والد شیخ محمد احمد یمنی کی تصنیف "خلاصہ نافعہ" کی نقل بھی شامل ہے۔ مسودہ میں اس کے بعد رفعت کے چند فارسی خطوط کی جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں کے نام لکھے نقلیں اور دیگر فارسی تحریریں شامل ہیں مسودہ کی عام حالت کے پیشِ نظر یہ بھی نور دیدہ کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ اسے مجموعہ رقعات[1] کہا جا سکتا ہے۔ لیکن درحقیقت

---

[1] راقم الحروف نے اپنے مضمون "بنام غالب" مشمولہ مجلہ سیفیہ غالب نمبر ۱۹۷۰ء میں اس کو مجموعہ رقعات ہی لکھا ہے۔

یہ رفعت کی تصنیف "قبسات القباس" ہے

قبسات القباس ۱۰۵ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں کاغذ کو ہر دو جانب سے لکھنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے اوراق نور دیدہ کے مسودہ کے عام اوراق کے مقابلہ میں کچھ چھوٹے ہیں یعنی نور دیدہ کے مسودہ کا سائز ۷ × ۱۱ ہے جب کہ قبسات القباس کا سائز ½۶ × ۱۰ ہے

نور دیدہ کے مسودہ پر "انشائے نور دیدہ"[1] درج ہے اور رفعت کے والد شیخ محمد احمد مکینی کی تصنیف سے پہلے جلی قلم سے "خلاصہ نافعہ" تحریر ہے لیکن قبسات القباس سے پہلے کوئی عنوان نہیں لکھا گیا ہے مسودہ کی جلد کے اوپر ٹھیک درمیانی حصہ میں سفید کاغذ چسپاں کر کے مشمولات کی تفصیل درج کی گئی ہے[2] اس میں بھی اس رسالہ کو "کتاب لامعلوم الاسم ــــ ۱۱۶ صفحہ"[3] لکھا گیا ہے۔

قبسات القباس کا پہلا صفحہ بالکل سادہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے عنوان لکھنے کے لئے سادہ چھوڑ دیا گیا ہے صفحہ نمبر کے لحاظ سے یہی پہلا صفحہ ہے اس کی پشت پر صفحہ نمبر "۲" درج ہے صفحہ نمبر "۲" کے زیریں نصف حصہ میں بسم اللہ الرحمان الرحیم کے بعد فارسی رسم الخط میں بزبان عربی مختصر تمہید ہے جس میں حمد و نعت و منقبت کے بعد کتاب کا نام اور غرض تصنیف تحریر ہے :-

"الحمد للّٰہ لمن کرمنا بجواھر العقل والحواس جلت قدرتہ عن الحصر والقیاس والصلوٰۃ والسلام علی مولانا طیب الانفاس الذی وجبت علینا طاعتہ بالعین والراس اعنی سیدنا و نبینا محمدؐ اشرف الناس وآلہ المنزھین عن الادناس المطھرین من الارجاس وصحبہ المنتجبین الاکیاس وبعد فیقول محرر ھذا الکراس عجل احمد المینی

---

[1] "انشائے نور دیدہ" بھوپال کتاب گھر کے مالک جناب اسماعیل صاحب کا تحریر کردہ ہے

[2] یہ تفصیلات بھی بھوپال کتاب گھر کے مالک جناب اسماعیل صاحب کی تحریر کردہ ہیں

[3] رسالہ میں صرف ۱۰۵ تک صفحہ نمبر لکھے ہوئے ہیں آخری تین صفحات سادہ ہیں ان پر کوئی نمبر بھی نہیں ہے۔

المدعو لجباس ھذا شی من نتائج فکری سمیتہ قبسات القباس
وتمعنہ علی بیاض ھذا القرطاس بسواد علی الحود ابالانفاس لعلی
ابوالقاسم الفراس طول اللہ عمرہ کعمرالیاس وزرقہ فہما لامعا
کضوالنبراس بحرمتہ خیرالبشر وائمہ الا ثنی عشر الذ ینہم لدین نبسط اس
وکل منہم فی غایات مراتب ودای الودیٰ ھرماس "

رسالہ میں تاریخ تصنیف کہیں درج نہیں ہے کہ اس کے زمانہ تصنیف کا اندازہ ہو سکے نیز اس میں شامل تحریروں کی ترتیب بھی غیر تاریخی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ رسالہ میں چار جگہ سن موجود ہے ایک منشور منشور میں جو صفحہ ۳۲ سے ۳۴ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں رفعت نے آغاز آفرینش سے اپنے دور تک کے حالات اور اپنے مذہبی عقائد وغیرہ اجمالی طور پر تحریر کئے ہیں اس تحریر کے درمیان میں سن ۱۲۷۵ھ تحریر ہے :-

"از زمان آدم صفی تا ایں دم کہ آغاز سال ۱۲۷۵ھ ہجری ست ہزاراں سلاطین وحکام در وجود آمدند"

یہ تحریر واضح طور پر آغاز سال ۱۲۷۵ھ ہجری کی ہے ۔ دوسرے منشی سروپ نرائن کے نام تحریر کردہ خط میں ۱۲۸۰ھ ہجری کا حوالہ موجود ہے ۔ یہ خط تقریباً تین صفحات پر مشتمل ہے اور صفحہ ۵۲ سے ۵۵ تک ہے ۔ اس خط میں رفعت نے منشی سروپ نرائن کو احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور اُن کے دہلی جانے کی اطلاع دی ہے :-

"جناب محتشم ہم ایں ماہ ۱۲۸۰ھ ہجری بدہلی نہضت نمودند و داغ جدائی بر دل ہوا خواہاں نہادند"

اس خط میں "ہم ایں ماہ ۱۲۸۰ھ ہجری" سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط اسی ماہ کی کسی تاریخ کو تحریر کیا گیا ہے اور ۱۲۸۰ھ ہجری سے متعلق ہے ۔ تیسرے منشی سید واصل کے مکان پر منعقدہ دعوت اور مشاعرہ کے بیان کے آخر میں ۱۲۵۹ھ ہجری تحریر ہے :-

"وکان انعقاد ھذہ المجلس فی لیل التاسع من شھر رجب ۱۲۵۹ ہجری۔"

یہ تاریخ انعقاد مجلس کی ہے اسے تحریر کی تاریخ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چوتھے نواب صدیق حسن خاں کے نام ایک خط میں ۱۲۷۲ ہجری کا حوالہ موجود ہے :-

"تازہ خبر این است کہ ایاغ لکھنؤ شکست بست و ششم جمادی الاولی ۱۲۷۲ ہجری نصور تش بجا ماندو نہ ہیولی۔"

"تازہ خبر" اس بات کی دلیل ہے کہ تحریر ۱۲۷۲ ہجری کی ہے۔

محولہ تحریروں میں سنین موجود ہیں لیکن ان کی ترتیب تاریخی نہیں ہے ۱۲۷۵ اور ۱۲۸۰ ہجری کے بعد ۱۲۷۲ ہجری کی تحریر ہے ان تاریخوں سے رسالہ کے زمانہ تصنیف کے بارے میں کسی قطعی رائے کے قائم کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ قبسات القباس میں رفعت کی تحریر کردہ ایک ادبی مجلس منعقدہ ۱۲۵۹ ہجری کی روئداد شامل ہے نیز یہ کہ رفعت نے اپنی تصنیف نور دیدہ میں، جو بست و یکم محرم ۱۲۹۰ھ، کو شروع ہو کر" ماہ ذی الحجہ الحرام ظہید روز عید غدیر" کو مکمل ہوئی، اس رسالہ کو ایک منفرد تصنیف کی حیثیت سے درج کیا ہے چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ۱۲۹۰ ہجری سے قبل ہی یہ رسالہ پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

قبسات القباس میں رفعت کی اٹھاون تحریریں شامل ہیں۔ ان میں سے پہلی تحریر ایک خط ہے جو ارسطو جاہ مولوی رجب علی خاں بہادر کے نام ہے اور آخری تحریر بھی ایک خط ہے جس کے مکتوب الیہ شجاع الدولہ مختار الملک نواب میر تراب علی خاں سالار جنگ والی حیدر آباد ہیں۔ قبسات القباس کی تحریروں کی تفصیل اس طرح ہے :-

۱۔ ارسطو جاہ مولوی رجب علی خاں بہادر ـــ ۵ خطوط، ۲۔ سید تفضل حسین عطا منشی بارگاہ سالار جنگ شجاع الدولہ ـــ ۳ خطوط، ۳۔ منشی سید کریم علی ـــ ۱ خط، ۴۔ مرزا غالب ـــ ۲ خطوط اور ایک فارسی غزل، ۵۔ مولوی محمد نواز مدرس مدرسہ سیہور ـــ ۱ خط، ۶۔ لالہ لال جی خزانچی بھوپال ـــ ۱ خط، ۷۔ شمس الامراء بہادر

— اخط، ۸ - منشی کنج بہاری لال — اخط۹۔حاجی محمد خاں میر منشی ریزیڈنٹی اجمیر — ۴ خطوط، ۱۰ - منشی احمد علی میر منشی نواب فوج دار محمد خاں بہادر — اخط، ۱۱۔مولوی سید گلشن علی جون پوری — اخط، ۱۲۔میر اسد علی حیدر آبادی — اخط، ۱۳۔منشی سروپ نرائن میر منشی سنٹرل انڈیا — اخط، ۱۴۔منشی محمد الیاس مدراسی — اخط، ۱۵ - پیر عبداللہ شاہ صوفی — اخط، ۱۶ - نواب سلطان الدولہ رئیس الملک بہادر میر جہاں گیر علی خاں سلیماں جاہ حیدر آباد دکن — اخط، ۱۷۔منشی محمد جان رئیس پونہ — اخط، ۱۸ - قاسم علی خاں — اخط، ۱۹ -لالہ چرونجی لال — اخط، ۲۰ - محمد احمد مرحوم (برادر رفعت) — اخط، ۲۱ - منشی سید اعظم علی اورنگ آبادی — اخط، ۲۲ -میر ناصر علی نصیر — اخط، ۲۳ -میر واصل علی — اخط، ۲۴ -منشی محمد اسحاق شاہ جہاں پوری — اخط، ۲۵ -منشی مظہر علی خاں — اخط، ۲۶ - منشی سید حسین علی — اخط، ۲۷ - منشی غلام صفدر — اخط، ۲۸ - منشی حبیب المجیب — اخط، ۲۹ - منشی عبدالوہاب — اخط، ۳۰ - علی جان نقاش — اخط، ۳۱ - مولوی صدیق حسن خاں میر دبیر ریاست بھوپال — ۲ خطوط، ۳۲ - سید حافظ علی — اخط، ۳۳ - مولوی محمد عمر صوفی — اخط، ۳۴ - مولوی امداد علی خیر آبادی — اخط، ۳۵ - شجاع الدولہ مختار الملک نواب تراب علی خاں سالار جنگ وزیر والیٔ حیدر آباد دکن — اخط، ۳۶ - شخصے جنرل سید — ۲ خطوط، ۳۷ - شخصے بنام شخصے — اخط، ۳۸ - دوسروں کی فرمائش پر — ۵ خطوط، ۳۹ - منشور منثور — ایک، نیز ۴۰ - روداد دعوت ومشاعرہ — ایک -

رفعت کے مکتوب الیہم میں غالب، ارسطوجاہ، نواب صدیق حسن خاں اور تراب علی خاں سالارِ جنگ کے علاوہ تقریباً سب غیر معروف ہیں۔ ان میں سے جن کا تعلق شعر گوئی سے ہے ان کے حالات مختصراً ایک ایک دو دو جملوں میں رفعت نے نور دیدہ کے رقعۂ اول میں جس کی نوعیت تذکرہ کی سی ہے تحریر کئے ہیں چنانچہ ارسطوجاہ

کے متعلق تحریر کرتے ہیں :-

"ارسطو جاہ مولوی سید رجب علی خاں بہادر از مقربین دولت انگلشیہ بود ۲۰ رجمادی الثانی ۱۲۸۶ھ ہجری بعارضہ تپ و سرسام برکوہ شملہ انتقال نمود شیعہ غالی است و صاحب فکر عالی نظمش بسیار خوب و نثرش بغایت مرغوب"

منشی سید تفضل حسین عطا کا ذکر اس طرح کیا ہے :-

"منشی سید تفضل حسین عطا اثنا عشری المذہب مرد مہذب و فاضل ناظم و ناثر کامل در حیدر آباد دکن نوکر شجاع الدولہ مختار الملک نواب تراب علی خاں سالار جنگ وزیر مختار سرکار نظام الملک آصف جاہ والی دکن بود ۱۲۸۵ھ ہجری مراحل عمر عزیز طے نمود۔"

منشی کنج بہاری لال کے متعلق لکھتے ہیں :-

"ثانی بہار و مسرت منشی کنج بہاری لال خلف شاگرد مرزا رفیع الدرجات نزہت رام پوری در ایام دولت نواب جہانگیر محمد خاں بہادر شمشیر جنگ پیش میر واصل علی پیش دست نائب ریاست بر عہدہ منشی گری در بھوپال روشناس بود باز حسب الطلب نواب محمد سعید خاں بہادر والی رام پور استعفا داد و بخدمت نواب مذکور شتافت ہنوز در رام پور زندگانی بعزت بسر می برد۔"

مولوی محمد عمر صوفی کے متعلق بیان فرماتے ہیں :-

"از اقربائے نواب والا جاہ ارکاٹ مرد ذی استعداد بود گاہے شعر ہم می گفت داعی تخلص می نمود ۱۲۸۶ھ ہجری برائے گزاردن حج رواں شد در بندر بمبئی داعی اجل را لبیک اجابت گفت۔"

مولوی امداد علی خیر آبادی کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں :-

"امداد علی امداد متوطن خیر آباد حنفی مذہب از دوستان راقم الحروف بود

در ۱۲۸۵ھ ہجری انتقال نمود"

مرزا غالب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

"نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بغالب اکبر آبادی المولد دہلوی المسکن ست نسبتش بافراسیاب وجمشید منتہی می شود دیوان اردو و دیوانِ کلیات فارسی مہر نیم روز ماہ نیم ماہ پنج آہنگ دستنبو قاطع برہان تیغ تیز عود ہندی درفش کاویانی گوہر افشان قادر نامہ سپاچین مشتمل قصائد و اشعار کہ بدطبع کتابت خود فرمودہ است دیوانِ شیریں زربوئے معنی دلائل اعجاز فضل و کمال اقتل ہستند گروہ کثیر از مہایانہ کمالاتش ساغر ادب کشیدہ سرخوش مستند راقم الحروف غائبانہ بدبدن کلام مبینش معتقد گشت واز دور سر فرود آوردہ در حلقہ شاگرداں زانو شکست جناب ممدوح از راہ اخلاق بے پایاں مانند حکمائے اشراقیاں چند مرتبہ توجہ دلی فرمود و اشعار بندہ را کہ ذریعہ نیالش نامہ ہا فرستادہ بودم اصلاح نمود ..... دوم ماہ ذیقعد ۱۲۸۵ھ در دہلی مرحمت حق پیوست و در خلد بریں زیر سایہ طوبیٰ نشست "

مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ سید واصل علی کا مختصر تعارف بھی نور دیدہ میں ملتا ہے۔ رقعۂ دوئم میں رفعت نے اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے قصبہ سیہور میں ان سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور ان کا تعارف اس طرح درج کیا ہے :-

"سید واصل قاضی زادہ شجاعلپور کہ مقرب سرکار نظیر الدولہ جہانگیر محمد خاں بہادر شمشیر جنگ نواب بھوپال و از دوستان والد من بود . . ."

قیسات القیاس کے خطوط کے مکتوب الیہم اپنے مراتب و مشاغل، معیار علم و طرز فکر نیز مزاجی کیفیات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف و ممیز تھے اور رفعت کے تعلقات بھی تمام لوگوں سے یکساں نوعیت کے نہ تھے لیکن خطوط میں شخصیتوں کا یہ امتیاز و اختلاف بہت زیادہ نمایاں نہیں ہے بلکہ بیشتر خطوط میں گہری مماثلت پائی

جاتی ہے مثلاً ارسطو جاہ مولوی رجب علی کو لکھتے ہیں :۔

"طغرائے عزائے کامرانی منشور لامع النور شادمانی گنج شائگان مراد خزانۂ عامرہ نقود و اتحاد فروغ جبہۂ اقبال نور ناصیۂ اجلال تاج تارک افتخار اوج طالع اعتبار نسخۂ شفائے علیل رائحۂ انفاس صاحب انجیل . . . . ."

القاب و آداب کے پیرایہ میں مدح خوانی کا یہ سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے ارسطو جاہ کے نام رفعت کے پانچ خطوط ہیں اور ہر خط میں اندازِ تحریر یہی ہے ۔ غالب کے نام تحریر کردہ خطوط بھی اسی اندازِ تحریر میں ہونے کے سبب ارسطو جاہ کے نام لکھے گئے خطوط سے گہری مماثلت رکھتے ہیں ۔ مرزا غالب سے مخاطبت کا انداز ملاحظہ فرمائیے :۔

"عقیدت پیوند عباس مستمند گنج شائگان ضراعت و سپاس راسرمایۂ سعادت دوجہاں و نگارش دگزارش نیاز و نیایش راوسیلۂ اجابت مدعا شناختہ بحضرتِ استاذ شعرائے نامی ملاذ سخنوراں گرامی سلطانِ روم فصاحت خاقانِ چین بلاغت . . حضرت اسد اللہ غالب باصد ہزار فروتنی و نیاز مندگانی عرض پرداز ست . . ."

مرزا غالب کے نام دوسرے خط میں بھی عقیدت مندی کا یہی انداز ہے :۔

"کلاہ گوشۂ نازش بہ غنتیں سپہری شکنم کامروز آرزو مندنامہ نگاری بجناب بابا سان شمّ گل زمیں ہندوستان بودہ ام نے نے غلطم بلکہ پیچ جبہ سائی سر نیاز و شکستگی بر آستانِ فیض نشاں شہریارِ عجم خدا اند تیغ و قلم قیصر روم معنی طرازی خاقان چین نکتہ پردازی بہمگی استوار کردہ ام . . . . ."

مولوی گلشن علی جون پوری کے نام تحریر کردہ خط کا اندازِ تحریر بھی دیکھئے :۔

"امروز اگر فرقِ افتخار خود را برتر از مع سموات ذات البروج دانم بجاست و مرتبۂ اعتبار خود را اگر فوق فلک الافلاک شمارم روا ست کہ خامۂ یوسفی ہنگامہ بہ آہنگ نامہ نگاری بنام سید والا جاہ برداشتہ خود را از حصولِ ایں سعادت

عظمیٰ ہمسر ملبند بختان سلیمان بارگاہ پنداشتہ ام ......"

میر ناصر علی نصیر کے خط کا ابتدائی حصہ بھی ملاحظہ فرمائیے :-

" قیصر روم انشا پردازی، خاقانِ چین سخن طرازی خسرو ایران فصاحت امام صنعائے یمن بلاغت اجلہ خاندانِ سیادت و شرف سلالۂ سلسلہ جناب شاہ نجف ...."

دراصل رفعت کو فکرِ معاش دامن گیر تھی اور وہ اپنی انشاپردازانہ صلاحیتوں کے سہارے انگریزی حکومت یا کسی ریاست میں ملازمت حاصل کرنا چاہتے تھے قبسات القباس کے بیشتر خطوط میں ان کی اس غرض کا اظہار ملتا ہے وہ ارسطو جاہ مولوی سید رجب علی کو تحریر کرتے ہیں :-

"..... امروز فرمانروایان ہند و سران ایں کشور پذیرفتن اشارہ گرامی را سرمایہ راحت خودمی دانند و ہویداست کہ بسیار شرفا بدولت سامی فائز المرام بودہ اند من اگر ہم بجائے رسم واز ایں شودہ بوم شوم کہ دیاس حجاج برائے من است رفت کشم و بقیہ انفاس را جائے بآرام گزرانم جا دارد دوردستاں را باحسان یاد کردن ہمت ست، ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند "

حاجی محمد خاں کو تحریر کرتے ہیں :-

" اگر بدولت والا در راحبتان کدام صورت روزگار برآید عین تمنائے من است ...."

شمس الامرا بہادر کے نام ایک مختصر خط رفعت کی تلاش معاش اور ان کی خودداری دونوں کا بیک وقت اظہار کرتا ہے :-

" شریفیم از شرفائے نامدار منشیم مدعانگار و متصدیم کارگزار سر بازم بہنگام کار اگر قابل سرکار باشم کافی والا جواب صافی "

تلاش معاش کے پیشِ نظر رفعت نے اپنے خطوط میں زباں دانی اور انشاء پردازی کے جوہر دکھائے ہیں اس امید پر کہ یہ خطوط شاید تلاش معاش میں سہارا بن جائیں اور یہی

سبب ہے کہ یہ خطوط اپنے مکتوب الیہم کے مراتب و مشاغل کے فرق کے باوجود آپس میں حیرت انگیز مماثلت رکھتے ہیں۔ قبسات القیاس کے خطوط میں رفعت کی طبیعت کے دیگر نقوش بھی دیکھے جا سکتے ہیں مثلاً ادب سے ان کے ربط و تعلق کا اندازہ ان کے بعض خطوط اور تحریروں سے ہوتا ہے۔ منشی کنج بہاری لال کے نام خط میں تحریر کرتے ہیں :۔

"در تذکرہ مراۃ الخیال نوشتہ است کہ روزے در ایوان نور جہاں بیگم شعرا جمع آمدند بیگم فرمائش غزل کرد و شعرا بسبب تنگیٔ قافیہ کہ بیگم گفتہ بود متامل شدند نواب قاسم خاں شوہر منیژہ بیگم خواہر نور جہاں سہ شعر گفتہ بسمع بیگم رسانید بیگم شاد شد و صد بخشید شعرا تحسین نمودند و آں ہر سہ شعر این است :

گر شوی سایہ نشیں روزے بہ بخت باغباں — سایہ بر خورشید اندازد درخت باغباں

فاختہ چوں دید بے گل باغ را نالید و گفت — از چہ رو با گل نرفت ایں جان سخت باغباں

جشن نوروز است و فراش بہار از فیض طبع — طرح کرد از سبزہ و گل تاج و تخت باغباں

منشی غلام مرتضیٰ لکھنوی کتاب خاں کہ در نظم و نثر خیلے ماہر و در عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ از مردم نامی بود شعر چہارم گفتہ :

غنچہ دل تنگ است و بلبل را فغاں گل سینہ چاک — غالباً تنگ انداز و منع کرخت باغباں

راقم الحروف محمد عباس شعر پنجم گفتہ غزل تمام نمود :۔

از وفور سبزہ و گل در فضائے آں سال — می نماید زرد و سرخ و سبز رفت باغباں

ایک خط میں رفعت کی اپنے ایک دوست کے بیٹے سے ملاقات کا ذکر ہے اس خط سے رفعت کی نرم دلی انسانیت اور بے لوث دوستی کا اظہار ہوتا ہے :۔

" حبیب الحبیب ادیب اریب سلمہ الحیّ المجیب بعد سلام در پیہ وصاد دی کہ عید سعید ماہ صیام بود عبد المجید پسر عبد الحمید مرحوم بے ریا آمد بر سیدم کہ حالا کجائی و چہ کار داری گریہ کرد و جواب داد کہ پدرے کہ بہ بود بر آمدہ ام بیماری مرا پامال

کردو چہار ماہ علاج طبیب کردم رفتے بہی دیدم حالا مرادریا بیدیکجاں بے برگی
رسیدہ ام برحال دے بسیار کہ بدیدہ گردیدم وسی روپیہ دادم وایما کردم کہ بریدر
دبرادر بیعود در بدر آبرد ندہ یدم طبیبا دب بوسیدہ وداع کردم راہی گردید"

رفعت نے اپنی ضمانت پر کسی صراف سے علی جان نقاش کو کچھ رقم قرض دلوادی تھی۔ رقم
وقت پر واپس نہ ہوتی صراف نے رفعت کو یاد دہانی کرائی انھوں نے نقاش کو جو خط
لکھا ہے وہ دلچسپ ہے :

امروز تقاضائے صراف بابت دراہم کہ ایشاں بضمانت فقیر گرفتہ اند بیش از نیش
ست دسرایں بے سروپا از خجالت وعدہ خلافی شما نگوں در پیش خدا شاہد کہ
مزاجم از ہجو ریش ست و وضع ارباب دنیا چوں گرگ در کسوت میش تمیدانستم
کہ شمارا چنیں کیش ست کہ ظاہر شما نوش و باطن نیش امروز زر دادن باعث عیش
است ورنہ فردا ہنگامہ رنج وطیش "

قبسات القباس میں ہجو نگاری کے بھی کئی نمونے ہیں ان میں سے ایک ملاحظہ فرمائیے :۔

" افتاد طشت از بام و مرد چراغ از سر شام عصمت بی بی از بے چادری بود
ایدوں جوہر ذاتی رونمود سال نوازش بہار پیدا دپیوست فظا غلیظ القلب
ہویدا شد وصنوئے بیخ شکست پیرو رع رخت بست . . . . چوں نفس
امارہ شدہ در حقیقت بے چارہ شدہ بست بریدی ہا کمر خود حیث فراواں
قحبہ زناں راحیت دست خیانت درامانت دراز کرد وباب آب ریختن
ما زانجام ایں آغاز معلوم وآخر ایں اوّل قرین سایہ بوم "

مختصر یہ کہ قبسات القباس میں رفعت کی زندگی کے متعدد پہلو دیکھے جا سکتے ہیں۔
ان تحریروں میں ان کی دوستی کا خلوص بھی ہے، رسمی ملاقات کا کھردرا پن بھی اور غصہ کی گرمی
بھی؛ ان میں خود شناسی بھی ہے خودداری بھی اور حرف مدعا کا اظہار بھی ہے؛ ان میں تعریف

وتوصیف بھی ہے اعتراف حقیقت بھی اور ہجو بھی؛ ان میں ادب بھی ہے تہذیب بھی اور حدودِ ادب وتہذیب سے تجاوز بھی۔

قبسات القیاس کی ایک نمایاں صفت نثر کے درمیان اشعار کا استعمال ہے رسالہ میں ابتدا سے انتہا تک بمشکل چند تحریریں ایسی ہوں گی جن میں اشعار کا استعمال نہیں ورنہ بیشتر تحریریں اشعار سے آراستہ وپیراستہ ہیں اور اشعار کا استعمال اکثر ایسا برمحل ہے کہ اس سے نثر کا حسن دوبالا ہوگیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رفعت کو اشعار کے استعمال کا صرف شوق ہی نہیں سلیقہ بھی ہے (مضمون کی طوالت کے پیش نظر صرف دو مثالیں کافی ہوں گی۔) مرزا غالب کا خط نہ آنے اور خیریت معلوم نہ ہونے پر اپنی طبیعت کے اضطراب کو ایک شعر کے ذریعہ ظاہر کیا ہے:۔

بجستجوے خبر جانم از دریچہ گوش زماں زماں بسر راہ کاروان آید

ایک خط میں بھوپال میں اپنی ناکامی اور یہاں سے دل بر داشتگی کا اظہار کرتے ہوتے دو شعر تحریر کئے ہیں:۔

ہر چند کہ خوں شد ز تپیدن نفسِ ما صیاد بنا ریخت بہ گلبن قفسِ ما
تا دامنِ گل بس کہ نشد دسترسِ ما چوں غنچہ گرہ شد بدلِ ما ہوسِ ما

رفعت نے صرف اشعار کے استعمال ہی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ بعض خطوط میں پوری پوری غزلیں نقل کر دی ہیں اس میں شک نہیں کہ اشعار کے برمحل استعمال سے نثر کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے نثر میں اشاریت پیدا ہوجاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اشعار کے کثرت استعمال سے نثر کی شگفتگی کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا اور تاثر مجروح ہوجاتا ہے یہاں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ قدیم نثر نگاری میں اشعار کا استعمال ایک وصف سمجھا جاتا تھا اور قبسات القیاس کی نثر میں یہ وصف بدرجہ اتم موجود ہے۔

قبسات القیاس کی نثر سے رفعت کی مہارت عبارت آرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

رسالہ فارسی میں ہے اور فارسی بھی وہ جس میں عربی کی گہری آمیزش ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رفعت کو عربی و فارسی دونوں زبانوں پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی اس رسالہ کی عبارت میں نہ صرف عربی و فارسی الفاظ ایک دوسرے میں شیر وشکر کی طرح گھلے ملے نظر آتے ہیں بلکہ عربی و فارسی کی مفرد و مرکب تراکیب کا استعمال فراوانی سے ہوا ہے کوئی سطر ترکیبوں سے خالی نہیں ہے۔ عربی و فارسی ترکیبوں کے ساتھ ساتھ رفعت نے قافیہ پیمائی کا ثبوت بھی دیا ہے چنانچہ رسالہ ابتدا سے انتہا تک مقفیٰ و مسجع نثر میں ہے جس میں تشبیہ در تشبیہ اور استعارہ در استعارہ بات کہنے کے اسلوب نے وقت اور رنگینی پیدا کر دی ہے۔ رفعت نے پامال قوافی کے استعمال سے حتی الامکان گریز کیا ہے اور اکثر اس میں کامیاب ہوئے ہیں لیکن جہاں کہیں یہ گریز حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے عبارت معمہ بن گئی ہے۔ رفعت نے عبارت آرائی کے شوق اور قافیہ پیمائی کے ذوق میں عربی و فارسی کے نامانوس الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ دونوں زبانوں کے نامانوس الفاظ کا استعمال کر کے رفعت نے اپنی زباں دانی کا سکہ تو بٹھا دیا لیکن اس سے اسلوب تحریر میں پیدا ہونے والی اجنبیت اور ثقالت کو دور نہ کر سکے۔

مغلیہ سلطنت کا زوال ہندوستان میں فارسی زبان کے زوال کا پیش خیمہ تھا ۱۸۵۷ء صرف مغلیہ سلطنت کے ختم ہو جانے ہی کا اعلان نہیں تھا اس کے ساتھ ساتھ فارسی کی امتیازی حیثیت کے ختم ہو جانے کا اعلان بھی تھا سرکاری اور درباری حیثیت ختم ہو جانے کے بعد فارسی صرف ادبی تہذیبی زبان ہو کر رہ گئی تھی اور اس کی جگہ اردو نے حاصل کر لی تھی اردو نے ۱۸۵۷ء سے قبل ہی اپنے دائرہ اثر کو وسیع کر لیا تھا فارسی کے ادیب شاعر اردو کی طرف متوجہ ہو گئے تھے فارسی کی بالادستی ختم ہو رہی تھی اور اس کے قدرداں بھی کم ہوتے جا رہے تھے چنانچہ فارسی نثار پردازوں میں طرز نو ایجاد کرنے کا حوصلہ بھی باقی نہ رہا تھا صرف پرانے اسلوب بیان کی کامیاب تقلید ہی کو سند کمال سمجھا جانے لگا تھا رفعت اس حیثیت سے قابل تعریف ہیں کہ وہ قدیم فارسی اسلوب انشا پردازی کے کامیاب مقلد تھے اور قبسات لقباس ان کی انشا پردازانہ صلاحیتوں کا ایک کامیاب نمونہ ہے۔

جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول
اور اُس کے مُصنّف

(از مولٰنا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، ایڈیٹر البلاغ، بمبئی)

پہلی صدی میں علم حدیث کا رواج روایت کے طور پر تھا، اور خاص خاص صحابہ اور تابعین کے پاس ان کی مرویات واحادیث کے کُراسے اور مجموعے تھے، حتیٰ کہ اس صدی کے خاتمہ پر ان کو مدوّن کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور دوسری صدی کے نصف تک احادیث پر مستقل تصانیف کا سلسلہ جاری ہوگیا، اس کے بعد مؤطات، مسانید، معاجم، جوامع اور دیگر اصناف واقسام پر احادیث جمع کی گئیں، احادیث کے سماع وروایت کے لئے عالمِ اسلام میں اسفار و رحلات کا عام ذوق پیدا ہوا، مگر اب تک اصولِ حدیث کے اصطلاحی نام سے کوئی خاص علم اور فن مدوّن نہیں ہوا تھا، بلکہ احادیث کی کتابوں میں متفرق طور سے اس فن سے متعلق باتیں پائی جاتی تھیں، بعد میں ان ہی اصولی باتوں کی روشنی میں محدثین نے اصولِ حدیث کا فن مرتب و مدوّن کیا، عام خیال ہے کہ اس موضوع پر سب سے پہلی مفصل مدوّن کتاب امام قاضی ابو محمد حسن بن عبدالرحمٰن بن خلاد رامہرمزی متوفی ۳۶۰ھ کی کتاب "المحدث الفاصل بین الراوی والداعی" ہے جس میں ابن خلاد رامہرمزی نے اس فن سے متعلق تمام باتوں کو ابواب و فصول کے تحت جمع کر دیا یہ کتاب ایک ہزار سال کے بعد

پہلی مرتبہ ۱۳۸۲ھ میں بیروت سے چھپ کر شائع ہوئی ہے۔

اس کے بعد دوسرے ائمہ حدیث نے اس فن میں مستقل کتابیں تصنیف کیں، چنانچہ امام ابوعبداللہ حاکم نیساپوری متوفی ۴۰۵ھ نے "معرفۃ علوم الحدیث" لکھ کر اس فن کو وسعت دی، خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ نے "الکفایہ فی قوانین الروایہ" اور الجامع لآداب الشیخ والسامع کے علاوہ اصولِ حدیث کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھیں، حتیٰ کہ حافظ ابوبکر بن نقطہ نے کہا کہ انصاف کی بات یہ ہے کہ تمام محدثین خطیب بغدادی کی کتابوں کے رہین منت ہیں، قاضی عیاض بن موسیٰ یحصبی اندلسی متوفی ۵۴۴ھ نے الالماع فی ضبط الروایۃ وتقیید السماع، ابوحفص عمر بن عبدالمجید میانجی متوفی ۵۸۰ھ نے "مالا یسع المحدث جہلہ" تصنیف کی، ان سب حضرات کے بعد حافظ ابوعمرو تقی الدین عثمان بن عبدالرحمٰن بن الصلاح شہرزوری متوفی ۶۴۳ھ نے اپنی کتاب "علوم الحدیث" لکھی جو مقدمہ ابن صلاح کے نام سے علمی حلقہ میں متعارف ہے، ابن صلاح نے اس کتاب میں قدماء کی ان تمام کتابوں کے مضامین کو سمیٹ لیا جو ان سے پہلے اصولِ حدیث پر لکھی گئی تھیں۔

خطیب کی الکفایۃ اور حاکم کی معرفۃ علوم الحدیث ہندوستان میں چھپ چکی ہیں، اور مقدمہ ابن الصلاح متعدد بار مصر اور ہندوستان میں چھپی ہے، قاضی عیاض کی الالماع حلب کے کتب خانہ ظاہریہ میں اور خطیب کی الجامع دار الکتب المصریہ میں موجود ہے۔

ابن صلاح نے اپنی کتاب کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ مہذب و منقح اور مبوب و مفصل طریقہ پر لکھا جس کی وجہ سے قدماء کی کتابوں کے مقابلہ میں اس کے ساتھ علماء و محدثین نے خوب اعتناء کیا، اس کی شرحیں لکھیں، اس پر معارضہ اور استدراک کیا، کئی حضرات نے اسے منظوم بھی کیا، ان میں امام ابوزکریا محی الدین یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ کے مختصر و ملخص کو قبولِ تام حاصل ہوا، امام نووی نے مقدمہ ابن صلاح سے دو خلاصے تیار کئے، ایک کا نام "الارشاد الی علوم الاسناد" رکھا پھر "الارشاد" کا خلاصہ "التقریب

والتیسیر لمعرفۃ سنن البشیر والنذیر" کے نام سے کیا جو تقریب النووی کے نام سے مشہور ہے، علماء و محدثین نے اس کو بڑی اہمیت دی، امام زین الدین عبدالرحیم بن حسین عراقی متوفی ۸۰۶ھ امام سخاوی متوفی ۹۰۲ھ امام برہان الدین بقاعی حلبی متوفی ۸۸۵ھ اور امام جلال الدین عبدالرحمن بن ابوبکر سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے اس کی شرحیں لکھیں، ان میں سیوطی کی "تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی" بہت مشہور و متداول کتاب ہے۔

اور بہت سے علماء و محدثین نے تقریب النووی کا اختصار کیا، ان میں شیخ بدرالدین محمد بن ابراہیم بن جماعۃ کنانی متوفی ۷۳۳ھ) کے اختصار کا نام "المنہل الروی فی الحدیث النبوی" ہے، اور ابو الفداء عماد الدین اسمٰعیل بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ کی کتاب "الباعث الحثیث لمعرفۃ علوم الحدیث" ہے اسی طرح شیخ علاء الدین ماردینی، شیخ بہاء الدین اندلسی، اور شیخ ابو الفیض محمد بن محمد بن علی فارسی المعروف بہ فصیح الہروی حنفی متوفی بعد رمضان ۸۳۷ھ نے تقریب نووی کا اختصار کیا، موخر الذکر کی کتاب کا نام "جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول" ہے یہاں اسی کتاب کا ذکر مقصود ہے۔

یہ کتاب تقریب النووی کا مختصر ملخص ہونے کے باوجود اس میں اصول حدیث اور علم حدیث کی کئی کتابوں سے مدد لی گئی ہے، حاکم کی معرفۃ علوم الحدیث اور المدخل، خطیب کی الکفایہ اور دیگر کتب سے اخذ و اقتباس ہے۔ کہیں ان ائمہ اور ان کی کتابوں کے ناموں کی تصریح کے ساتھ اور کہیں بغیر تصریح کے، اسی طرح ابن صلاح ذہبی، ابن جوزی، ماوردی، ابن خلاد، بیہقی، جوینی، بغوی، ابن ابی حاتم، ابن حبان، طیبی، خطابی وغیرہ کی تصانیف بھی اس کا ماخذ ہیں، اس کے باوجود یہ کتاب تقریب النووی کا خلاصہ ہے اور اس کی اکثر عبارتیں اس سے ماخوذ ہیں، کہیں معمولی فرق ہے اور کہیں یہ بھی نہیں ہے، جواہر الاصول اور تقریب میں مقابلہ کرنے کے بعد یہی بات واضح ہوتی ہے۔ مصنف نے اس کو صاف اور واضح انداز میں لکھ کر نہایت مفید اور جامع کتاب بنا دیا ہے، عبارت، ترتیب،

جامعیت اور طرز بیان کے اعتبار سے بہت خوب ہے پوری کتاب ایک فاتحہ، چار اقسام اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے،

فاتحہ میں سات لوامع ہیں اور ہر لامعہ میں اصولِ حدیث سے متعلق باتیں درج ہیں،

قسم اول متن حدیث اور اس کے انواع و اقسام کے بیان میں،

قسم ثانی سند کے بیان میں،

قسم ثالث حدیث کے نقل و تحمل اور اس سے متعلق انواع و اقسام کے بیان میں

قسم رابع اسماء الرجال اور طبقات العلماء وغیرہ کے بیان میں،

خاتمہ محدث کے صدق و اتقان اور حدیث کی تحقیق وغیرہ کے بیان میں،

ان چند عنوانات کے ماتحت اصولِ حدیث کے جملہ مباحث کو مختلف ابواب و فصول اور انواع و اقسام کے ذیل میں نہایت مستوعب انداز میں ذکر کیا گیا ہے، اور چونکہ مصنف ادیب و فصیح عالم ہیں اس لئے عبارت نہایت سہل، اطناب مُمل اور ایجاز مخل سے خالی، اور اختصار کے باوجود ہمہ مضامین پر محتوی و مشتمل ہے، اس کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ پرانی کتابوں میں کہیں اس کا نام تک نظر نہیں آتا حتی کہ چلپی نے کشف الظنون میں اس کا تذکرہ نہیں کیا، اور نہ اس کے مصنف کا حال ملتا ہے۔ متاخرین میں صرف شیخ اسمٰعیل باشا بابانی بغدادی نے اپنی کتابوں میں اس کتاب کا اور اُس کے مصنف کا تذکرہ کیا ہے، وہ بھی مختصر طور پر جو لبا غنیمت ہے، راقم کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے چند رسائل و دیگر کتب کے مجموعہ میں تھا جو حضرت مولانا شاہ غلوم علی صاحب دہلوی متوفی ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے، اس کے آخر میں جواہر الاصول ہے جس کا آخری ورق غائب ہو چکا ہے، اس مجموعہ میں پہلی کتاب "فتح الخبیر بما لا بد منہ فی علم التفسیر" ہے، اس کے خاتمہ پر یہ عبارت ہے۔ "تمام شد بتاریخ ہفتدم رجب سنہ ۱۲۱۲ ہجری بمقام شاہ جہان آباد" عروض و قوافی میں ایک رسالہ ہے،

اس کے خاتمہ پر یہ عبارت ہے "والحمدللہ رب العالمین روز جمعہ ۹ شعبان ۱۲۱۲ھ ہجری مقام شاہجہاں آباد بید اضعف العباد شیخ غلام علی عفی اللہ عنہ"، تراجم ابواب البخاری کے آخر میں ہے "تم التعلیقات التی وجدنا قل المنقول عنہ بخط الشیخ قدس سرہ علی النسخۃ الشریفۃ" شرح نخبۃ الفکر کے آخر میں ہے "تمام شد روز جمعہ تاریخ ۹ شعبان ۱۲۱۲ھ ہجری مقام شاہجہاں آباد" اس کے بعد آخر میں جواہر الاصول ہے جس کا آخری ورق غائب ہے، میرے پاس اصولِ حدیث کی مطبوعہ کتابوں میں سے الکفایہ خطیب بغدادی، معرفۃ علوم الحدیث حاکم، شرح نخبۃ الفکر ابن حجر، الباعث الحثیث ابنِ کثیر، مقدمۃ ابن صلاح، تدریب الراوی سیوطی، مختصر الجرجانی، الرفع والتکمیل مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی، الاجوبۃ الفاضلۃ ایضاً موجود ہیں اور میں ان سب سے استفادہ کرتا رہتا ہوں اس لئے مجھے جواہر الاصول کی اہمیت و افادیت کا احساس زیادہ ہوا، اور میں نے سوچا کہ اس کتاب کو مختصر تعلیق و تحشیہ کے ساتھ شائع کرنا چاہیئے، مگر مصنّف کے حالات نہ ملنے سے ایک گونہ تردد رہا اور بعض اہلِ علم سے خط و کتابت کی، ان میں مولانا ابوالوفا صاحب افغانی صدر لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے یہ جواب تحریر فرمایا۔

"جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول کا ایک نسخہ بانکی پور کے کتب خانہ میں بھی ہے، قلمی کتابت ۱۱۱۰ھ ۳۴ ورق میں ہے ذیل کشف الظنون ج ۱ ص ۳۷۵ میں اس نام کی کتاب درج ہے، لیکن صرف جواہر الاصول ہے، مصنف کا نام ابوالفیض محمد بن علی بن علی الفارسی درج ہے، سنہ وفات ندارد، نہ معلوم ابوالفیض فارسی کون ہیں، میں نے اب تک اس کتاب

کو دیکھا نہیں، نہ اُس کی طباعت کا علم ہے، طباعت کی عجب دنیا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ کتاب طبع نہیں ہوتی، یکایک کہیں سے پتہ چلتا ہے کہ اسّی سال سَو سال قبل طبع ہوئی تھی، غرض کہ اگر قدیم زمانہ میں طبع ہوئی تو بھی اب اس کا نسخہ کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے، اگر کتاب عمدہ ہے تو ضرور طباعت کی کوشش کی جائے، طبع ہونا آسان ہے، کیوں کہ کتاب مختصر ہے، پوری کتاب کا مطالعہ کیا جائے شاید اس سے مصنف کی کوئی نشانی مل سکے"

اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے تحریر فرمایا

"جواہر الاصول بہت نفیس کتاب ہے، حافظ تقی الدین فارسی معاصر حافظ ابن حجر صاحب شفاء الغرام وغیرہ اس کے مصنف ہیں، اس کے متعدد نسخے میں نے دیکھے ہیں، ازاں جملہ ایک نسخہ ندوہ میں بھی ہے، ایک آدھ منتشر اوراق غالباً میرے پاس بھی ہیں، تلاش کروں گا"

اس کے بعد مجھے جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں اس کتاب کا ایک نسخہ ملا، جو مکمل تھا اور اس کے آخر میں یہ عبارت تھی "قال الجامع الجانی یدارکہ اللہ تعالی بلطفہ الکافی ابو الفیض محمد بن محمد بن علی الفارسی اعاذہ اللہ تعالی من القلب القاسی" اتنی عبارت سے مولانا ابوالوفا صاحب افغانی کے مکتوب کی تائید ہوئی مگر مصنف کے حالات اب بھی پردۂ خفا میں رہے، اس لئے "صدق جدید" میں اہلِ علم سے گذارش کی کہ ابوالفیض محمد بن محمد بن علی الفارسی کے حالات

بہم پہونچائیں، اس کے نتیجہ میں صرف محترم جناب پروفیسر عبدالمنان بیدل صاحب نے پٹنہ سے خط لکھا جس میں بانکی پور والے نسخہ کی نشان دہی فرمائی۔

اس درمیان میں میں نے جواہر الاصول کے دونوں نسخوں (اپنے اور جامع مسجد بمبئی والے) کا مقابلہ کر کے مناسب تعلیق کی، اور شرف الدین الکتبی واولادہ بمبئی نے اسے طبع کرنے کی تیاری بلکہ طباعت شروع کردی اسی اثنار میں اللہ تعالی کے خاص فضل و کرم سے تیسری بار حج وزیارت کی سعادت نصیب ہوئی اور حرمین شریفین کے کتب خانوں میں اس کے مزید نسخوں اور مصنف کے حالات کی تلاش رہی، ۲۱ر رمضان سے ۱۲ر شوال تک مدینہ منورہ کے دوران قیام میں مکتبۂ علمیہ میں فہرست معہد المخطوطات للدول العربیہ قاہرہ، الاعلام زرکلی، اور معجم المولفین عمر رضا کحالہ وغیرہ کو دیکھا مگر جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول اور اس کے مصنف کا تذکرہ کسی کتاب میں نظر نہیں آیا، واپسی پر مکتبۃ الحرم المکی الشریف میں بالالتزام استفادہ کا سلسلہ جاری رہا، جہاں الحمدللہ کہ ۲۳ر ذوقعدہ کو دونوں باتوں میں کامیابی ہوئی، جواہر الاصول کا ایک مخطوطہ بھی ملا اور مصنف کا حال بھی، مگر اس مخطوطہ پر بحیثیت مصنف کے مکہ مکرمہ کے مشہور عالم الشیخ المرحوم ابوالفیض عبدالستار بن عبدالوہاب الدہلوی المولود بمکۃ سنہ ۱۲۸۶ والمتوفی بہا ۱۳۵۵ھ کا قبضہ تھا، یہ ۱۰ر رجب ۱۳۲۱ھ کا مکتوبہ ہے اور کتب مصطلح الحدیث میں اس کا نمبر ۲۷ ہے اور سرورق پر اس کا نام یوں درج ہے "ھذا کتاب جواھر الاصول الی اصطلاح علم حدیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم"

اس کے نیچے یہ عبارت ہے "جمع العبد الفقیر ذوالعجز والتقصیر الراجی لطفہ الوفی ابوالفیض عبد الستار الصدیقی الحنفی بن الشیخ عبدالوھاب بن خدا یار و معناہ حبیب اللہ بن الشھاب احمد یار بن تاج الدین حسین یار بن علاء الدین علی بن الجمال محمد بن البرھان ابراھیم ابن الشمس بن محمد بن العصام عبد الملک بن نورالدین علی بن امام الدین علی الاول بن مبارک شاہ البکری الخ

کتاب کے مقدمہ میں بھی بسم اللہ اور حمد و صلوۃ کے بعد فیقول العبد المذنب الفقیر ذوالعجز والتقصیر الراجی من ربہ لطفہ الوفی ابوالفیض عبدالستار الخ مذکورہ بالا پورا سلسلۂ نسب درج کرنے کے بعد لکھا ہے، ھذہ فصول فی اصول الحدیث یفتقر الیہ کل من تصدی للروایۃ والتحدیث موسومۃ بجواھر الاصول الی اصطلاح حدیث الرسول الخ الغرض اندر باہر... ہر جگہ اس کتاب پر اصل مصنف کے بجائے دوسرے کی چھاپ پڑی ہوتی ہے، حالانکہ پوری کتاب حرف بہ حرف ابوالفیض محمد بن محمد بن علی فارسی کی ہے، چنانچہ مکتبۃ الحرم المکی الشریف کے مرحوم ناظر شیخ معلمی یمانی نے اس کے سرورق پر لکھ دیا ہے،

"ھذا الکتاب لیس من مولفات الشیخ عبدالستار بل ھو من مولفات ابی الفیض محمد بن محمد بن علی الفارسی المدعو بفصیح الادیب الحنفی فقدہ فی ذیل کشف الظنون و ترجم لہ فی ھدیۃ العارفین وقال :

کان حیا ۱۳۳۳ھ کما ذکرہ السید صدیق حسن خاں فی اٰخر کتاب العَلَم الخفّاق فی علم الاشتقاق ناسبًا الی الفارسی ھذا وانہ من جملۃ الکتب التی اشتراھا ودخلت فی مکتبۃ، شیخنا الشیخ عبد الستار کیف اجاز لنفسہ ھذا فی حین ان لدیہ نسخۃ اخریٰ منسوبۃ الی مولفھا فی اٰخرھا فمحاہ وکتب اسمہ بدلہ"

مکتبۃ الحرم المکی کے اس نسخہ اور اس کے مندرجات سے کئی باتیں معلوم ہوئیں جن میں سب سے اہم بات مصنف کے تذکرہ کی نشاندہی ہے، ذیل کشف الظنون کا نام ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون ہے، یہ اور ہدیۃ العارفین اسماء المولفین و آثار المصنفین دونوں کتابیں شیخ اسمٰعیل پاشا بن محمد امین بن میر سلیم البابانی اصلاً، والبغدادی مولداً و مسکناً کی تصنیف ہیں اور دونوں ہی پہلے استانبول میں پھر فوٹو کے ذریعہ طہران میں چھپی ہیں، اور مکتبہ الحرم میں موجود ہیں،

صرف ان ہی دونوں کتابوں میں جواہر الاصول اور اس کے مصنف کے بارے میں مختصر طور سے معلومات حاصل ہوئیں جو بسا غنیمت ہیں، اس سے کتاب کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی اور اب یہ مجہول المصنف نہیں رہی، ایضاح المکنون میں صرف اتنا ہے

جواھر الاصول لابی الفیض محمد بن محمد بن علی الفارسی المتوفی . . . . . (ج ا ص۳۷۹)	جواہر الاصول ابو الفیض محمد بن محمد بن علی فارسی متوفی ــــــہ کی کتاب ہے -

اس عبارت سے مصنف کا وہی نام و نسب معلوم ہوتا ہے جسے

انھوں نے خود جواہر الاصول کے آخر میں تال الجامع الجانی الخ سے بیان کیا ہے البتہ شیخ اسماعیل باشا بابانی بغدادی نے ہدیۃ العارفین میں ان کا تذکرہ نسبۃً تفصیل سے کیا ہے، ملاحظہ ہو،

(فصیح الھروی) ابوالفیض محمد بن محمد بن علی الفارسی، نزیل هراة المدعو بفصیح الادیب الحنفی، کان حیًّا فی رمضان سنة سبع و ثلاثین و ثمانمائة ۸۳۷ھ له من الکتب احصاء الاخلاق، إلجام العتاة وإلزام الغلاة وأن الحسنات یذھبن السیئات، حقائق التوحید، رسالة فارسیة، فضل الکلم الطیب فی استنزال مطر الفضل الصیب فی کلمة التوحید، منهاج الیقین أمور النظیم فی حاشیة بسم الله الرحمٰن الرحیم،

(ج ۲ صـ۱۸۹ و ۱۹۰، ط استانبول)

فصیح ہروی کا نام ابوالفیض محمد بن محمد بن علی فارسی ہے، وہ ہرات میں آکر آباد ہو گئے تھے "فصیح" کے لقب سے مشہور ہیں، ادیب تھے اور حنفی مسلک کے عالم تھے، رمضان ۸۳۷ھ تک ان کے زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے، ان کی تصنیفات یہ ہیں۔ (۱) إحصاء الاخلاق۔ (۲) إلجام العتاۃ (۳) حقائق التوحید فارسی زبان میں (۴) فضل الکلم الطیب توحید کے بیان میں۔ (۵) منہاج الیقین (۶) امور النظیم حاشیہ بسم اللہ الخ

اس مختصر اور مجمل تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابوالفیض محمد بن محمد، فارس کے کسی

مقام کے رہنے والے تھے مگر انھوں نے ہرات کو مستقل وطن بنا لیا تھا، وہ اپنے زمانہ کے مشہور ادیب اور فصیح و بلیغ عالم تھے حتیٰ کہ فصیح ہروی کے لقب سے مشہور ہیں، نویں صدی ہجری کی چوتھی دہائی تک موجود تھے، اس کے بعد ان کا انتقال ہوا، وہ حنفی مسلک کے علماء میں سے تھے، عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ان کی تصانیف ہیں، وہ زہد و طریقت کے ذوق سے آشنا تھے، یعنی ان کا شمار اپنے دور کے مشائخ علماء میں ہوتا تھا، جواہر الاصول اور امہ النظیم کے علاوہ ان کی کتابوں کے ناموں سے ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے،

جیسا کہ معلوم ہوا، اس کے قلمی نسخے کمیاب ہیں مگر نایاب نہیں، اور ہندوستان میں اس کے کئی نسخے مختلف مقامات میں موجود ہیں، ضرورت تھی کہ اس کی اشاعت اور تعلیق و مقابلہ کے وقت ان سے مدد لی جاتی، مگر شخصی اور ذوقی خدمت میں اس کا موقع نہ مل سکا، اور میں نے اپنے اور جامع مسجد بمبئی کے نسخوں کو سامنے رکھ کر تصحیح و مقابلہ کر لیا، اختلافِ نسخ کے نقل کرنے میں کتابت کی غلطی و زلاتِ قلم کو نقل کر کے خواہ مخواہ تطویل نہیں کی، البتہ جن عبارتوں سے معانی و مطالب میں اختلاف ظاہر ہوتا ہے ان کو نقل کر دیا ہے، تصحیح کے سلسلہ میں مقدمہ ابن صلاح اور تدریب الراوی سے خاص طور سے مدد لی ہے، اور کتاب کے مضامین و محتویات کی توضیح و تشریح کے لئے کفایہ، معرفۃ علوم الحدیث، شرح نخبۃ الفکر کی طرف رجوع کیا ہے اور اصولِ حدیث کی ان پانچ کتابوں سے اخذ و اقتباس کر کے جواہر الاصول کی توضیح و تشریح اور تعلیق و تصحیح کی ہے، اور کوشش کی ہے کہ حواشی زیادہ طویل نہ ہوں کیوں کہ ایسی صورت میں افادیت کے باوجود نفس کتاب کی اشاعت میں رکاوٹ ہو سکتی تھی، اسی خیال سے مفصل تحشیہ کو مختصر کر کے دوبارہ نقل کیا، الحمد للہ کہ یہ کتاب چھپ گئی ہے، اثنائے طباعت میں سفر حجاز کی وجہ سے بعض اغلاط کے علاوہ مقدمہ ابتدا کے بجائے آخر میں چھپ گیا، ویسے ابتدا میں مختصر سا مقدمہ لکھ کر اس میں مصنف کے حالات درج کئے، اصل کتاب مع تعلیقات ۱۴۵ صفحات میں آئی ہے، اس کے بعد ۵ صفحات کا مقدمہ ہے، جو خاتمۃ الطبع بن گیا ہے، پھر ۳ صفحات میں فہرست [illegible] ، بہت [illegible] مشہور [illegible] ، ۲۰۰ صفحات پر بھی ہے کاغذ سفید عمدہ، طابع و ناشر شرف الدین الکتبی

مولانا حکیم فضل الرحمٰن صاحب صواتی
کا
ایک مفید اور اہم مکتوب

از جناب مولانا قاضی محمد عمران خاں صاحب مفتی ٹونک

"برہان" ماہ اپریل سنہ ء کے شمارے میں جناب خان غازی خاں کابلی کا مضمون "جنگِ آزادی کے دو جلیل القدر مجاہد" اور ماہ فروری سنہ ء کے شمارے میں جناب حفیظ الرحمٰن صاحب العمری کا مضمون "ایک مشہور گمنام کی وفات" پڑھے گئے دونوں مضامین، مولانا حکیم فضل الرحمٰن صاحب صواتی سے متعلق ہیں۔ میرے پاس حکیم صاحب مرحوم کا ایک خط محفوظ ہے۔ چوں کہ یہ مکتوب، حکیم صاحب مرحوم کی سرگذشت پر بھی مشتمل ہے، اس لئے قارئین "برہان" کا بھی اس سے باخبر ہونا مفید سمجھا گیا۔

۱۹۶۶ء کی بات ہے کہ میں اپنے والد صاحب مرحوم مولانا قاضی حکیم محمد عرفان[1] خاں صاحب ناظم شریعت ٹونک کے انتقال کے بعد اپنے اجداد اور خاندان کے ذی علم افراد کا تذکرہ "تاریخ عرفانی" کے نام سے ترتیب دے رہا تھا کہ "معارف" یا "برہان" کے کسی مضمون کے ذریعہ حکیم صاحب مرحوم سے غائبانہ تعارف پیدا ہوا

---

[1] المتوفی ۱۹۶۲ء

ہمارا خاندان بھی چوں کہ پکلیٔ اور تورو علاقہ صوات سے منتقل ہو کر رام پور اور ٹونک آباد ہوا تھا، اس لئے "سوات" کے اس رشتہ، سے، میں نے، سابق کسی تعارف کے بغیر، خاندان کے چند قدیم ترین افراد کے نام لکھ کر، مولانا مرحوم سے کچھ معلومات فراہم کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مرحوم نے اگرچہ اس سلسلہ میں مزید کوئی رہنمائی نہیں فرمائی لیکن اپنے اخلاق کریمانہ کے تحت، اس خط میں وہ تاریخی باتیں تحریر فرمادیں جو شاید آسانی سے فراہم نہ ہو پاتیں۔

مکتوب ہذا میں مولانا مرحوم کی ابتدائی سرگذشت، سنین کے تعین کے ساتھ بالاختصار آگئی ہے، اس لئے پورا خط، قارئین "برہان" کے مطالعہ کے لئے پیش ہے تاکہ اس طرح تاریخ کے صفحات پر بھی محفوظ رہ سکے۔ اصل خط اس طرح ہے:-

ہوالرحمٰن

۱۳ چیمبکار اسٹریٹ ۵/دسمبر ۱۹۶۶ء

امبور — (این اے)

عزیز محترم و فاضل افخم محمد عمران صاحب زید مجدہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ایک ماہ قبل آپ کا مکتوب گرامی نظر سے گذرا تھا۔ دوسرے روز میں مدراس کو علاج معالجہ کے سلسلہ میں گیا۔ ایک ہفتہ بعد واپس امبور آیا۔ لیکن آپ کا والا نامہ گھر میں موجود نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ میرا پسر خورد جو میسور گیا ہوا ہے وہ اپنے ساتھ آپ کے والانامہ کو بھی لے گیا ہے۔ دس بارہ دن کے بعد میسور سے ایک شخص کا خط آیا

کہ آپ کا فرزند میسور آکر سخت علیل ہوگیا ہے اور اب ہسپتال میں زیرِ علاج ہے۔ دو ہفتے تک ہسپتال میں زیرِ علاج رہا اب صحت یاب ہوکر ۲ر دسمبر کو وہاں سے روانہ ہوکر ۳ر دسمبر کو امبور آگیا۔ اور آپ کا والا نامہ مجھے دے دیا۔ اب آپ کے مکتوبِ گرامی کا جواب دے رہا ہوں۔ میں تھانہ سوات ایجنسی مالاکنڈ کا باشندہ ہوں۔ میری پیدائش ۱۳۱۳ھ کی ہے۔ تمام علوم سے فارغ ہوا تو طب پڑھنے کے لئے ۱۹۱۱ء کو دہلی آیا۔ ایک سال تو دہلی میں تعلیم پاتا رہا۔ پھر لکھنؤ جاکر وہاں تعلیم پاتا رہا۔ ۱۹۱۴ء میں سند ملی۔ اس وقت جنگ عمومی شروع تھی۔ پھر حکومتِ ترکی نے جرمنی کا ساتھ دے کر انگریزوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوئی۔ ہندوستان کے اکثر مسلمانوں نے "انما المؤمنون اخوۃ" پر عمل کیا اور انگریزی حکومت کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کیا۔ میں لکھنؤ سے پشاور گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ مولانا سیف الرحمٰن صاحب (ٹونکی) صدر مدرس مدرسہ رحمانیہ دہلی نے حاجی صاحب ترنگزئی کو آمادۂ جہاد کر دیا ہے۔ حاجی صاحب موصوف کے مرید تمام سرحد کے باشندے تھے۔ میں بھی اُن میں شامل ہوگیا اور براہِ سدم بُنیر پہنچے اور بُنیر کے تمام مسلمانوں کو آمادۂ جہاد کر دیا اور انگریزی

---

[1] جناب حفیظ الرحمٰن صاحب العمری نے اپنے مضمون میں حکیم صاحب مرحوم کی تاریخ پیدائش شوال ۱۳۰۱ھ تحریر کی ہے۔ یہاں اس خط میں مولانا اپنے قلم سے ۱۳۱۳ھ تحریر فرماتے ہیں۔ صحت ضروری ہے۔ سال انتقال بھی کاتب کی غلطی سے صحیح درج نہیں ہوا ہے اس کی تصحیح بھی ہوجانا چاہیئے۔

حکومت سے نبرد آزما ہو گئے۔ دو مہینہ تو یہی حالت رہی اور انگریزی فوج
کو بہت نقصانات پہنچانے اور بہت سا اسلحہ ہاتھ آیا۔ پھر انگریزی
حکومت نے بنیر کے لوگوں کو خفیہ طریقہ سے رشوت دی اور بنیر کے
باشندے ہم سے الگ ہوگئے اور جہاد سے بر طرف ہوگئے نتیجہ یہ
نکلا کہ مجاہدین کو سخت نقصانات ہوئے۔ مجبوراً بنیر سے براہ سوات ہم
لوگ باجوڑ گئے اور وہاں کے لوگوں کو آمادۂ جہاد کر دیا۔ تین ماہ تک
شاندار طریقہ سے جہاد اور انگریزی حکومت کو بہت نقصان ہوا۔ پھر
یہاں بھی انگریزی حکومت نے باشندگان باجوڑ کو رشوتیں دیں اور وہ ہم
سے الگ ہوگئے۔ مجبوراً ہم مہمند چلے گئے اور تین مہینہ خوب جہاد
میں مصروف رہے۔ پھر یہاں کے باشندوں کو بھی رشوت دے کر ہم
سے الگ کر دئے۔ حاجی صاحب ترنگزی تو مہمند میں رہے۔ البتہ مولانا
سیف الرحمٰن صاحب کے ساتھ میں بھی افغانستان گیا۔ کچھ دن جلال آباد
میں اور کچھ دن کابل میں قیام رہا۔ اتنے میں جنگ عمومی ختم ہوگئی اور
جرمنی کو شکست ہوگئی اور انگریز کامیاب ہو گئے۔ مولانا سیف الرحمٰن
صاحب کے بال بچہ ریاست ٹونک میں تھے۔ جب سے جہاد میں
شریک ہوئے، اپنے بال بچہ کا کچھ حال معلوم نہ تھا اور نہ اُن کے
خورد و نوش کا علم تھا۔ مجبوراً انھوں نے مجھے آمادہ کر دیا کہ میں ہندستان

---

[1] آپ، مولوی دوست محمد صاحب کابلی، ناظم عدالت شرعیت
ٹونک المتوفی ۱۳۳۹ھ کے داماد تھے، اُس وقت مولوی سیف الرحمٰن
صاحب کی اہلیہ محترمہ اور بچے ٹونک ہی میں مقیم تھے۔

جا کر ان کے بال بچے جو ریاست ٹونک میں مقیم ہیں اُن کے حالات سے اطلاع دوں اور تین آدمیوں کا پتہ دیا کہ ان سے مل کر میرے بال بچے کے واسطے ان سے رقم حاصل کر کے ٹونک لے جا کر بال بچے کو دے دیں - چنانچہ میں آیا اور دہلی اور بمبئی سے ڈیڑھ ہزار روپیہ ٹونک لے جا کر اُن کے وہاں دے دیا۔ واقعی وہ بہت تکلیف میں مبتلا تھے - پھر جب گورنمنٹ کا کمیونک شائع ہوا کہ بنیر، باجوڑ اور مہمند کی لڑائی میں جو کوئی شریک تھے اب ان پر کوئی پابندی نہیں ہے - یہ دیکھتے ہی میں فوراً وطن گیا۔ پھر ۱۹۱۸ء میں دہلی کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس تھے، ان میں شرکت کے لئے میں دہلی آگیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مسلم لیگ کے استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے انھوں نے خلافت کی تحریک بہت زور سے کی تھی اور ہر صوبہ کو نمائندے بھیجے تھے کہ اس تحریک کو خوب چلا دیں۔ انھوں نے مجھے مدراس بھیج دیا کہ خلافت کی تحریک، میں، صوبۂ مدراس میں شروع کروں - چنانچہ میں مدراس آیا اور تحریک خلافت میں نے بڑے شوق سے شروع کی اور ۱۹۲۲ء میں جیل گیا۔ اُس وقت سے میں اب تک مدراس اور کبھی واشباڑی اور کبھی ملیبار اور کبھی امبوڑ میں رہا اور اب تو عرصۂ دراز سے امبور میں اقامت پذیر ہوں - وطن کو نہیں گیا ہوں - ۱۹۱۹ء سے دہلی سے جب جنوبی ہند آیا ہوں پھر واپس نہیں گیا ہوں اس لئے گذارش ہے کہ آپ نے جن بزرگوں کا نام لیا ہے، ان کے حالات سے واقف نہیں ہوں - زیادہ والسلام -

العبد المذنب
فضل الرحمن سواتی

تبصرے

نذرِ عابد مرتبہ جناب مالک رام تقطیع متوسط ضخامت جلد اول (اردو) ۳۸۳ صفحات، کتابت وطباعت اور کاغذ اعلیٰ وضخامت جلد ثانی (انگریزی) ۱۸۰ صفحات، ٹائپ جلی اور روشن، طباعت اور کاغذ اور گرٹ اپ سب اعلیٰ اور دیدہ زیب، قیمت -/25 فی جلد، پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی - دہلی - بمبئی اور علی گڈھ۔

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب برصغیر ہند وپاک کے مشہور اور بلند پایہ اردو زبان کے صاحبِ طرز ادیب، مترجم اور انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے نامور مصنف اور نقاد ہیں۔ موصوف کا اشہبِ قلم نصف صدی سے زیادہ سے مصروفِ جولانی ہے اور اس طویل مدت میں فلسفہ۔ سیاست۔ علمِ اخلاق۔ تعلیم تنقید شعر وادب، تاریخ، افسانہ اور ڈراما۔ نظم وغزل۔ جرنلزم، غرض کہ اس میں سے کوئی میدان نہیں ہے جسے اُس نے سر نہ کیا ہو اس بنا پر اُن کے احباب اور قدر شناسوں نے اُن کی ۸۰ ویں سالگرہ کے موقع پر اُن کو ایک کتاب نہایت اہتمام وانتظام کے ساتھ پیش کرنے کا بندوبست کیا اور کوئی شبہ نہیں کہ وہ بہ وجوہ اس کے مستحق تھے۔

چنانچہ یہ کتاب وہی ہے، جلد اول دو حصوں پر تقسیم ہے، تذکرہ اور مقالات، تذکرہ کے ماتحت چار مضمون ہیں۔ ان میں سے تین علی الترتیب خواجہ غلام السیدین مرحوم۔ صالحہ عابد حسین اور مالک رام صاحبان کے قلم سے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی

شخصیت اور ان کے علمی و عملی اوصاف وکمالات اور عادات واطوار پر ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تینوں مضامین ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ موثر اور سبق آموز ہیں، لیکن ہمارے نزدیک بیگم صالحہ عابد حسین کا مضمون اس اعتبار سے اردو ادب کا شاہکار ہے کہ بیگم مہدی حسن کی طرح بعض خواتین نے اپنے شوہروں کے متعلق مضامین ضرور لکھے ہیں لیکن شوہر کی شخصیت کا جو گہرا مطالعہ اور اس سے متعلق اپنے تاثرات وجذبات کا جو بے تکلف اور بے ساختہ مگر پرکار انہ اظہار وبیان اس مضمون میں ہے وہ کسی میں نہیں۔ یہ مضمون کیا ہے؟ بحر بلاغت وادب کے آبدار موتیوں کی ایک مالا ہے جو بیوی نے سالگرہ کے موقع پر اپنے جیون ساتھی کے نذر کی ہے، اس سلسلہ کے چوتھے مضمون میں جمیل الدین قریشی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی تصنیفات اور مقالات کی جامع فہرست بقید سنِ اشاعت وغیرہ مرتب کی ہے جو بجائے خود بہت مفید ہے، مقالات کے حصہ میں بارہ مقالے ہیں جو مشاہیر ارباب قلم کے لکھے ہوئے ہیں، ان میں تحقیقی مقالات بھی ہیں اور ادبی تنقیدی اور سوانحی بھی، اور سب معیاری ہیں، یہی حال دوسری جلد کا ہے جو انگریزی کے مقالات کے لئے مخصوص ہے، یہ مقالات بھی تعداد میں بارہ ہیں لکھنے والوں میں مشہور مستشرقین اور بلند پایہ ہندو مسلمان اور سکھ مصنفین وارباب قلم شامل ہیں۔ اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے یہ کتاب ارباب علم وادب کے لئے ایک تحفۂ گراں مایہ اور لائق مطالعہ ہے۔

سیرت نبوی کی ابتدائی کتابیں اور ان کے مؤلفین | تقطیع متوسط، ضخامت ۲۱۱ صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت مجلد 7/50 پتہ: ادارۂ ادبیات دلی ۲۰۰۹، گلی قاسم جان، دہلی —۶۔

عرصہ ہوا مشہور جرمن مستشرق پروفیسر جوزف ہوروِتس نے مذکورۂ بالا عنوان سے ایک نہایت جامع اور محققانہ مقالہ جرمن زبان میں لکھا تھا۔ جس کا اُس زمانہ کے علمی حلقوں میں بڑا چرچا اور شہرہ ہوا تھا۔ اس کی اہمیت کے باعث مسٹر مارماڈیوک پکتھال

جس زمانہ میں "اسلامک کلچر" حیدرآباد کے اڈیٹر تھے۔ انھوں نے اس مقالہ کو انگریزی کا جامہ پہنایا اور اپنے مجلہ میں شائع کیا اس کے بعد عرب فضلا بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور پروفیسر حسین نصار نے اسی کو عربی میں منتقل کیا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب اردو زبان کے مشہور ادیب اور محقق جناب نثار احمد صاحب فاروقی استاذ عربی، دلی کالج، دہلی نے اس کا ترجمہ اُردو میں کر دیا ہے، ترجمہ کی بے ساختگی اور زبان کی برجستگی و شگفتگی کے لئے لائق مترجم کا نام سب سے بڑی ضمانت ہے، موصوف نے ترجمہ کے علاوہ کہیں کہیں نوٹ بھی لکھے ہیں جن میں کسی غلطی کی تصحیح ہے یا کسی ابہام کی توضیح، اصل مقالہ کس جامعیت، تحقیق اور دیدہ وری سے لکھا گیا ہے اُس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے جہاں تک سیرت نبوی کے اصل مآخذ کا تعلق ہے۔ ہمارے نزدیک اس موضوع پر اب تک مولانا شبلی کا مقدمۂ سیرت النبی اور پروفیسر جوزف ہورووِتس کی یہ کتاب حرف آخر کا حکم رکھتے ہیں۔ امید ہے ارباب علم و ذوق اس کے مطالعہ سے شادکام ہوں گے۔

اردو ترجمہ سنن ترمذی | تقطیع کلاں، ضخامت ۰۰۰ہم صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت جلد اول -/20 پتہ :- ربانی بک ڈپو۔ کٹرہ شیخ چاند، لال کنواں۔ دہلی

سنن ترمذی صحاح ستہ میں جس اہمیت کی کتاب ہے، ارباب علم پر مخفی نہیں زیر تبصرہ کتاب اُس کا اُردو ترجمہ ہے اور یہ کتاب کی جلد اول ہے جو ابواب طہارۃ سے لے کر ابوالولام والھبۃ تک مشتمل ہے اور جس میں عبادات، معاملات، آداب اور جہاد وغیرہ کی احادیث آگئی ہیں۔ ترجمہ سلیس و شگفتہ اور مستند ہے مگر افسوس ہے کہ مترجم کے نام کے نہ ہونے سے کتاب مشتبہ ہو گئی ہے، شروع میں مختصر طور پر امام ترمذی کے حالات ہیں اور ایک صفحہ میں احادیث کے اقسام کا بیان ہے، مولوی محمد عبداللہ صاحب طارق جنھوں نے اس کی تقریب لکھی ہے اُن کے بقول کتب احادیث کا اُردو ترجمہ ایک حیثیت

سے خطرناک ہے لیکن اشاعتِ علم کے لئے اُس کی ضرورت سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ امید ہے کہ طلبا اور عام اُردو خواں حضرات اس سے مستفید ہوں گے۔

اکابرِ تعلیم از جناب ڈاکٹر سعید انصاری، تقطیع متوسط ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ کتابت و طباعت بہتر، قیمت -/12 پتہ:- مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

فاضل مصنف مشہور ماہر تعلیم ہیں، برسوں تک جامعہ ٹریننگ کالج کے پرنسپل رہے ہیں، انھوں نے اس کتاب میں افلاطون سے لے کر گاندھی جی تک مشرق و مغرب کے دس ماہرین تعلیم اور ان کے افکار و نظریات کا تعارف کرایا ہے، زبان صاف و سلیس اور رواں و دواں ہے، آخر میں تشریحات اور کتابیات کے دو باب ہیں، جو بجائے خود بہت مفید ہیں، مغربی زبانوں میں تو فنِ تعلیم پر کتابوں کا انبار لگا ہوا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اُردو کا دامن اس سے تہی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ اس کتاب کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا لیکن اس کتاب میں یہ بڑی خامی نظر آئی کہ اس میں کسی مسلمان مفکر اور ماہر تعلیم کا تذکرہ نہیں ہے، حالانکہ عہد جدید میں ایسے مسلمان مفکرین کی کمی نہیں ہے جنھوں نے جدید تعلیم اور اُس کے عملی پہلوؤں سے متعلق بڑے عمدہ افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے، مثلاً سرسید، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد شریف، ڈاکٹر رفیع الدین اور مفتی محمد عبدہ۔ علاوہ ازیں سابق صدر جناب رادھا کرشنن کی اس مجموعہ میں غیر موجودگی بھی کھٹکتی ہے۔

۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت ۔
تاریخ صقلیہ ۔ تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند (جلد اول)
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم ۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم ۔ صدیق اکبرؓ ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم ، انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم ۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ۔ تاریخ گجرات ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، بمصائب سرور کونینؐ ۔

۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اُردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول ۔ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ۔ اسلامی کتب خانے ، عرب و دنیا ۔
تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اُردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ۔ معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔

۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اُردو جلد سوم ۔ تاریخ ردہ ، پیر کشتی ضلع بجنور ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اوّل

۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اُردو جلد چہارم ۔ حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ۔ عرب و ہند عہد رسالت میں ۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر ۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اُردو جلد پنجم ۔ رموز عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم ، تفسیر مظہری اُردو جلد ششم ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ۔ تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اُردو جلد ہشتم ۔ تاریخ الفخری ، حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء حیات عبدالحیٔ ، تفسیر مظہری اُردو جلد نہم ۔ مآثر و معارف ۔ احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اُردو جلد دہم ۔ بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

egd. No. D. (D) 231 Phone 262815 AUGUST 1

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ -
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق و فلسفۂ اخلاق - فہم قرآن - تاریخِ ملت حصہ اول 'نبی عربی صلعم' - صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال - تاریخِ ملت حصہ دوم 'خلافتِ راشدہ' -

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول - اسلام کا نظامِ حکومت - سرمایہ - تاریخِ ملت حصہ سوم 'خلافتِ بنی امیہ'

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت - مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخِ ملت حصہ چہارم 'خلافتِ ہسپانیہ' - تاریخِ ملت حصہ پنجم 'خلافتِ عباسیہ اول'

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم 'خلافتِ عباسیہ دوم' بصائر -

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم 'تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ' تدوینِ قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد -
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخِ ملت حصہ ہشتم 'خلافتِ عثمانیہ' جارج برنارڈ شا -

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
ازسرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے - کتابتِ حدیث -

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت - قرآن اور تعمیرِ سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

برہان

جلد ۷۳ | ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۴ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۴ء | شمارہ ۳

نظرات

جناب فخرالدین علی احمد صاحب کا صدارت کے لئے انتخاب جس گرم جوشی اور اتحاد دیک جہتی کے ساتھ ہوا ہے وہ بے شبہ ہندوستان میں سیکولرزم اور جمہوریت کی روایات و رجحانات کی ایک شاندار کامیابی اور اس بنا پر ملک کے لیے ایک نیک فال ہے، اس کے اثرات ملک میں اور بیرونِ ملک بھی خوش گوار ہوں گے اور اقلیتوں میں اس سے خود اعتمادی کے پیدا ہونے میں مدد ملے گی، پنڈت جواہر لال نہرو، لال بہادر شاستری، مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی کی طرح جناب فخرالدین علی احمد صاحب کا کیرکٹر سیاسیات اور ملکی معاملات میں ہمیشہ بے داغ اور ایک کھلی کتاب رہا ہے، ان کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس معاملہ میں ان پر خیانت یا اپنے عہدہ سے اپنی ذات کے لئے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا الزام نہیں لگا سکتا، انھوں نے ملک و وطن کے لیے جو قربانیاں دیں اور اس راہ میں انھوں نے جس بے لوث ایثار سے کام لیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے، ایک کامیاب بار۔ایٹ۔لا کی حیثیت سے ان کی لیاقت و قابلیت اور ان کی قانونی مہارت اور سیاسی تدبر اپنے اور پرائے سب کے نزدیک مسلم رہا ہے، مرکز میں

آنے سے پہلے وہ تقسیم سے قبل اور اس کے بعد بھی آسام کی سیاست پر اس درجہ حاوی اور غالب تھے کہ وہ اس ریاست کے مردِ آہن کہلاتے تھے، ایک زمانہ تھا جب کہ آسام کے مسلمانوں کو پاکستانی دخیل کار کہہ کر آسام سے نکالنے کا منصوبہ بن رہا تھا اور وہاں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی، اس موقع پر موصوف نے جس جرأت اور ہمت سے ان لوگوں کی مدد کی وہ کل کی سی بات ہے۔ اس سلسلہ میں فرقہ پرستوں نے موصوف کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر موصوف نے ان کی ذرا پروا نہ کی اور آخر مسلمانوں کا انخلاء رکوا کر دم لیا۔

جو لوگ جناب فخرالدین علی احمد صاحب سے ذاتی طور پر واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ موصوف ایک ایسے اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو اپنی شرافت و نجابت ثروت۔ ذوقِ علم و ادب حبِّ وطن اور ساتھ ہی دینداری اور اسلامی و مشرقی عادات و اطوار کی رعایت میں ممتاز رہا ہے اور موصوف کو اور ان کے سب متعلقین کو بھی ان روایات کا ایک حِصّہ وافر حِصّہ میں ملا ہے۔ ہم موصوف کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ ان کا عہدِ صدارت ملک میں امن و امان۔ خوش حالی اور اطمینان اور ترقی کا کامیاب عہد ہو۔ اور ملک اور قوم کو ان کی ذات سے دیرپا اور مستقل فائدہ پہنچے۔

گذشتہ ماہ اگست کی ۲۰ رتاریخ کو علی الصباح سوویت روس کے سفر پر مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی اور راقم الحروف دونوں روانہ ہوئے اور ۵ر ستمبر کو واپس پالم پہنچے۔ سولہ دن کا یہ سفر الحمدللہ بہمہ وجوہ بخیریت و عافیت اور کامل اطمینان و راحت سے بسر ہوا۔ ہماری قدیم تاریخوں میں جس علاقہ کو ترکستان و خراسان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ ایک بہت بڑا اور وسیع علاقہ تھا۔ عہدِ جدید میں اسی کو اقوام و قبائل پر تقسیم کرکے متعدد جمہوریتوں کی شکل میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ان دور دراز علاقوں پر عرب کی تاخت و تاراج پہلی صدی ہجری کے اوائل میں شروع ہو گئی تھی اور اسی زمانہ میں یہ سب علاقے اسلام کے زیرِ نگیں آ گئے تھے۔ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی حضرت قثم بن العباسؓ بن عبدالمطلب جو سعید بن عثمان فاتح سمرقند و بخارا کی فوج کے ساتھ تھے اُن کا مزارِ پُر انوار بھی سمرقند میں مرجع عوام و خواص ہے اور ہمیں بھی اُس پر حاضری اور فاتحہ و سلام کی سعادت حاصل ہوئی۔ غرض کہ یہ وہ علاقے ہیں جو شروع سے اسلام کی آغوش میں رہے ہیں اور اس بنا پر ان کے چپہ چپہ پر اسلامی تاریخ کے نہایت اہم اور عظیم الشان آثار و مآثر پھیلے پڑے ہیں، ان سب کو دیکھنے کے لئے کم از کم ایک ماہ کی مدت درکار تھی اور ہمارے قیام کی مدت کل دو ہفتہ تھی۔ اس لئے اس قلیل مدت میں جو کچھ دیکھ سکتے تھے، وہ دیکھا۔ مفتی صاحب کے لیے اس سفر کی حیثیت قند مکرر کی تھی، کیوں کہ وہ ۱۹۶۳ء میں بھی یہاں آ چکے تھے۔ میرے لئے

یہ پہلا موقع تھا ۔ اس لئے دل اور دماغ دونوں کی آنکھیں کھول کر جو چیزیں دیکھی جا سکتی تھیں انھیں جی بھر کر دیکھا اور کبھی سینہ سے آہ نکلی اور کبھی زبان سے واہ کی آواز بلند ہوئی ان زیارتوں کے علاوہ سائنس اور ٹکنالوجی کی حیرت انگیز صناعی و مشاطہ کاری اور انسانی محنت اور اُس کے ذہن اور دماغ کی بوقلموں صنعت کاریوں کے عجیب و غریب نمونے بھی دیکھے ۔ ہر قسم اور ہر سوسائٹی کے لوگوں سے ملاقات کر کے ان سے تبادلۂ خیال کیا ، ان کا نقطۂ نظر سمجھنے کی اور اپنا نقطۂ نظر اُن کو سمجھانے کی کوشش کی ۔ وہاں کے اخبارات کو انٹرویو بھی دیا اور ریڈیو پر بھی تقریر کی ، لیکن یہ سب چیزیں سفرنامہ کا موضوع ہیں ، ان صفحات میں ان کو بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ افسوس ہے اس سفر اور اُس کی تیاری کے باعث اس مرتبہ غزوات پر میرے مقالہ کی چوتھی قسط اور تبصرے نہیں آ رہے ہیں ۔

ضروری گذارش

کاغذ کی ہوش ربا گرانی کے باعث برہان کی اشاعت فروری ۱۹۷۴ء میں ہی بند ہو جاتی مگر ادارہ کے ممبران اور خریداران برہان کے اصرار پر اشاعت جاری رکھی گئی تھی ۔ برہان میں جو کاغذ لگایا جاتا ہے گذشتہ مہینوں ۵۵ روپے فی رم کے حساب سے مل رہا تھا ۔ پھر جون میں وہی کاغذ ۶۴ روپے فی رم سے زیادہ آنے لگا تھا اب اس وقت زاید از ۷۵ روپے آ رہا ہے ۔ اسی طرح دوسرے طباعت کے مصارف کا حال ہے ان حالات میں قارئین برہان اور ادارہ کے ممبران سے حسب ذیل امور میں تعاون درکار ہے :

۱ ۔ خریداران برہان اور ادارہ کے ممبران نئے خریدار اور نئے ممبروں کی توسیع کے لئے کوشش فرمائیں ۔

۲ ۔ برہان کا چندہ اور ممبری کی فیس بر وقت ادا فرمائیں ۔ ۳ ۔ یاددہانی کے خطوط ارسال ہوتے ہی قارئین ان خطوط پر فوری توجہ فرمائیں ۔ ۴ ۔ دفتر کو خطوط روانہ کرتے یا منی آرڈر ارسال کرتے وقت اپنا خریداری نمبر تحریر فرمانا نہ بھولیں تاکہ جواب یا تعمیل میں تاخیر نہ ہو ۔ پتہ صاف صاف تحریر فرمائیں ۔ نیاز مند منیجر برہان دہلی

کچھ سورۃ کہف اور ذوالقرنین کے متعلق

(از جناب مولانا امتیاز علی عرشی صاحب رضا لائبریری رام پور)

قرآنِ مجید کی سورتوں میں سورۃ کہف اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں تین معنی خیز قصے بیان کئے گئے ہیں: قصۂ اصحابِ کہف، قصۂ ملاقاتِ موسیٰ و خضر اور قصۂ ذوالقرنین۔

شانِ نزول | اس سورت کی شانِ نزول میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا بیان ہے کہ مشرکینِ مکہ نے یہودِ مدینہ کے پاس ایک وفد بھیجا اور دریافت کرایا کہ کیا اُن کے پاس ایسا علم ہے، جس کی مدد سے محمدؐ کے دعویٔ نبوت کی تصدیق یا تکذیب کی جاسکے۔ علماءِ یہود نے وفد سے کہا کہ تم اپنے مدعیٔ نبوت سے یہ تین سوال کرو:-

(۱) اصحابِ کہف کا قصہ کیا ہے؟ (۲) اُس مردِ جہاں گشت کا کیا واقعہ ہے جو زمین کے مشرق و مغرب تک گیا؟ اور (۳) روح کیا چیز ہے؟

اگر وہ اِن کے صحیح جواب دے دے، تو اُس کا کہا مانو۔ ورنہ جھوٹا قرار دے کر جو سلوک چاہو کرو۔

وفد نے واپس آکر قوم کے روبرو یہ تجویز رکھ دی۔ سب نے اسے پسند کیا، اور رسولِ پاک سے ان کے جواب طلب کئے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ مذکورۂ بالا سوال یہودِ مدینہ نے رسولِ پاک سے براہِ راست مدینۂ منورہ میں کیے تھے۔

چوں کہ سورۂ کہف بالاتفاق مکے میں نازل ہوئی تھی، اس لئے دوسرا قول ناقابلِ التفات ہے۔

جہاں تک قولِ اوّل کی سندوں کا تعلق ہے، مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے قصص القرآن (ج ۲/ ۱۱۳) میں لکھا ہے کہ " محدثین نے اس روایت کے مختلف طریقوں کو بیان کرکے اس کی تحسین فرمائی ہے"۔ مولانا نے اس موقع پر اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا، اس لئے اس روایت کی اسناد کی حیثیت کے بارے میں تفصیلی اور فیصلہ کن بحث ممکن نہیں۔ ہاں، اُنھوں نے ابن اسحٰق کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ سے مذکورۂ بالا وفد کا جو قصہ نقل کیا ہے، اُس پر اظہار رائے کیا جا سکتا ہے

یہ روایت سیرۃ ابن ہشام (ج ۱/ ۳۲۱) میں موجود ہے مگر اس میں سند محذوف ہے۔ شارحِ سیرتِ مذکور ابوالقاسم السہیلی نے بھی الروض الأنف میں اس کی سند سے بحث نہیں کی۔ ہاں، طبری نے اپنی تفسیر (ج ۱۵/ ۱۱۸) میں پوری سند کے ساتھ اس روایت کو درج کیا ہے[1]۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں: حدثنا ابوکریب ثنا یونس بن بُکیر عن محمد بن اسحٰق ثنی شیخ من اھل مصر، قدم منذ بضع واربعین سنۃ، عن عکرمۃ عن ابن عباس الخ۔ اس سند میں ابن اِسحٰق کے استاد کی شخصیت مجہول ہے۔ نیز جب ابن اسحٰق نے اس حدیث کو یونس بن بکیر سے بیان کیا ہے، تو شیخ مصری سے اُن کی ملاقات کو چالیس برس سے زائد زمانہ گزر چکا تھا، اس لئے یونس کے واسطے اس مجہول شخصیت کا ڈھونڈھ نکالنا آسان کام نہ تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ابن اسحٰق کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

الدر المنثور (ج ۵/ ۲۱۰) میں علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو ابن المنذر، ابونعیم اور البیہقی نے بھی اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے اور آخری دو مصنفوں کی کتابوں کے نام دلائل النبوۃ بتائے ہیں۔ سیوطی نے حسبِ عادت یہاں بھی سندیں حذف کر دی ہیں۔ میرے پاس صرف ابونعیم کی دلائل النبوۃ کا مطبوعہ نسخہ ہے مگر اُس میں یہ حدیث نہیں ملی۔ اس لئے ان

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۳/ ۷۱ میں بھی ابن اسحٰق سے ابنِ عباس تک سند مذکور ہے جو بظاہر طبری سے منقول ہے۔

کتابوں کی سندوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

الدرالمنثور میں ابونعیم کی دلائل النبوۃ سے مذکورۂ بالا مضمون کی ایک اور حدیث نقل کی گئی ہے۔ سوءِ اتفاق سے یہ بھی مطبوعہ دلائل میں موجود نہیں۔ مگر سیوطی نے اُس کی سند میں یہ الفاظ نقل کر دئے ہیں: من طریق السدی الصغیر عن الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس الخ۔

اس سند میں سُدّیِ صغیر غالی شیعہ ہے، کلبی کے بارے میں ابوحاتم کہتے ہیں کہ اس کو تمام محدثین نے چھوڑ دیا تھا۔ ابنِ حبان نے کہا ہے کہ یہ سبائی تھا، اور یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ حضرت علیؓ فوت نہیں ہوئے۔ وہ دنیا میں واپس آئیں گے اور اُسے جور کی جگہ عدل سے بھردیں گے۔ یہ ابوصالح کی وساطت سے حضرت ابنِ عباس سے تفسیر بیان کرتا تھا، جب کہ اس کو ابوصالح سے سماع کا موقع نہ ملا، اور ابوصالح نے ابنِ عباس کو دیکھا تک نہ تھا[1]۔

کلبی اور ابوصالح کے بارے میں اربابِ جرح و تعدیل کے مذکورہ اقوال کے پیشِ نظر اس روایت کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک درایت کا تعلق ہے، قولِ اول اس معیار پر بھی پورا نہیں اُترتا۔ مثلاً

(۱) یہ روایتیں بتاتی ہیں کہ اصحابِ کہف، ذوالقرنین اور روح کی حقیقت کے متعلق سوال ایک ہی وقت میں کیا گیا تھا، جس کے جواب میں سورۂ کہف کا نزول ہوا۔ مگر اس سورت میں روح سے متعلق سوال وجواب موجود نہیں، بلکہ یہ مسئلہ اس سے پہلی سورت بنی اسرائیل میں مذکور ہوا ہے۔ اگر یہ ذوالقرنین اور اصحابِ کہف کے ساتھ پوچھا گیا ہوتا، تو اس کا جواب بھی سورۂ کہف ہی میں دیا جاتا۔ لہذا وہ روایتیں قابلِ نظر ہوں گی جن میں مذکورۂ بالا تین سوالوں کا ایک ساتھ ہونا بیان کیا گیا ہے۔

---

[1] خاتمہ تفسیر الثوری ۲۰۔۲۱

(۲) قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر سائلوں کے سوال اور اُن کے جواب نظر آتے ہیں مگر ایسی جگہوں پر پہلے "یسئلونک" سے سوال دہرایا گیا ہے، اور پھر اُس کا جواب عطا ہوا ہے مذکورہ روایات کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحابِ کہف کے بارے میں بھی سوال کیا گیا تھا، تو چاہیے یہ تھا کہ اس کا آغاز بھی "یسئلونك عن اصحاب الکهف" سے ہوتا، لیکن اس کا آغاز ہوا ہے ان الفاظ سے "ام حسبت ان اصحاب الکهف والرقیم کانوا من اٰیاتنا عجبا" اور عام روشِ قرآنی سے عدول کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی۔ لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ یہ مسئلہ کفارِ قریش کے سوالات کا جز نہ تھا، ورنہ اس کا آغاز بھی ذوالقرنین کے قصے کی طرح ہوتا۔

(۳) اصحابِ کہف کے بارے میں سوال یہود کا بتایا ہوا ہوتا، تو اُن کا تعلق یہود سے ہونا چاہیئے تھا۔ بلکہ ضروری تھا کہ یہود کی معتبر کتابوں میں اُن کا مذکور بھی ہوتا، تاکہ رسول اللہؐ کے جواب کی تصدیق یا تکذیب کے وقت علماء یہود اس نوشتے کو پیش کرتے مگر تمام مفسرین اصحابِ کہف کو عیسائی قرار دیتے ہیں، جو اپنا دین بچانے کے لئے ایک غار میں پناہ گزین ہو گئے تھے، ظاہر ہے کہ اُن کا قصہ اپنی صحیح شکل میں مشرکینِ مکہ کے سامنے آتا، تو انھیں عیسائیوں سے ہمدردی اور یہودیوں سے جو عیسائیوں کو کافر قرار دیتے تھے، نفرت پیدا ہوتی، جسے یہود کسی طرح پسند نہیں کر سکتے تھے، علاوہ ازیں کسی یہودی کتاب میں ان غار والوں کا ذکر نہیں، لہٰذا یہودی قرآنِ مجید کے بیان کی تصدیق یا تکذیب سے یکسر قاصر تھے، اور جس امر کے بارے میں اُن کے پاس علم نہ تھا اُس کو بطور سوال پیش کرنے کی کس طرح جرأت کر سکتے[1]

---

[1] ابراہیم ولفنسن نے اپنی عربی کتاب تاریخ الیہود فی بلاد العرب ص ۹۰ (طبع مصر ۱۹۲۷ء) میں ابن ہشام کی روایت نقل کر کے لکھا ہے کہ تلمود کا ایک قصہ اصحابِ کہف کی داستان کے مشابہ ہے۔ یہود نے اسی کو اپنے سوال کی بنیاد بنایا ہوگا۔ اس سلسلے میں تلمود کی کتاب بَبَا بَتْرا دیکھی جائے میں عرض کرتا ہوں کہ تلمود (ج ۷/ ۲۰۵) میں جو قصہ مذکور ہے، وہ مختصراً یہ ہے کہ ایک یہودی نے وادئ سینا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کے چند مردے اصلی حالت میں چت لیٹے دیکھے تھے۔ اگر یہود نے اس کے پیشِ نظر سوال کیا ہوتا، تو وہ قرآنِ مجید کے جواب کی تکذیب کرتے۔ حالاں کہ اس طرح کی کوئی بات ماخذوں میں نہیں ملتی۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سوال یہود کی طرف سے تھا ہی نہیں۔

(۴) ذوالقرنین کے بارے میں سوال بھی یہود کا بتایا نہیں معلوم ہوتا، کیوں کہ توریت کے کسی صحیفے میں ذوالقرنین لقب کے کسی بادشاہ کا ذکر نہیں۔ اور نہ کسی ایسے فرمانروا کا ذکر ہے جس نے وہ تین مہمیں سر کی ہوں، جن کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ کسی ایسے فرمانروا کا حال دریافت کراتے جس کا نہ اُن سے کوئی تعلق اور نہ اُن کی کتابوں میں اُس کا مذکور تھا۔

۵۔ ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق یہودی علماء نے وفد سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تمھارا مدعیِ نبوت ان سوالوں کے جواب دے دے تو اُسے نبی مانو، اور اُس کی اطاعت کرو، ورنہ جھوٹا سمجھو اور جو سلوک مناسب جانو، کرو۔

عقلاً یہ بات بھی علماء یہود کے کہنے کی نہ تھی، کیوں کہ وہ کسی غیر یہودی کو نبی ماننے کو آمادہ نہ تھے، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ صرف اُس کو نبی مان سکتے تھے، جس کی علامات اُن کے نبیوں کے صحیفوں میں درج تھیں، اور رسولِ پاک کے سلسلے میں کفارِ قریش کو جو نشانیاں بتائی تھیں، وہ اُن کے منتظر نبی کی نہ تھیں۔ اور اگر تھیں، تو اُن کو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ تمھارے مدعی نبوت نے صحیح جواب دے دیئے، تو ہم تم سب اُن پر ایمان لے آئیں گے۔

۶۔ کلبی کی روایت میں ہے کہ علماء یہود نے رسولِ پاک کے تمام حالات سُن کر کہا کہ "ہم اس کے اوصاف اور بعثت کا ذکر تورات میں پاتے ہیں۔ پس تم نے جو اوصاف بیان کیئے ہیں اگر وہ ایسے ہی ہیں تو انھیں نبیٔ مرسل مانو اور اُن کے کام کو حق سمجھ کر اُن کا اتباع کرو۔ البتہ تین باتیں ان سے پوچھ دیکھو۔ اگر وہ نبی ہیں تو دو کا جواب دیں گے اور تیسری کو لاجواب چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ ہم نے مسیلمہ سے یہی سوال کئے تھے۔ وہ کسی ایک سے بھی واقف نہ نکلا"

یہ روایت ابن اسحٰق کی روایت سے بھی کمزور ہے کیوں کہ اس میں یہودی اقرار کرتے ہیں کہ توریت میں منتظر نبی کے جو اوصاف مذکور ہیں وہ تمھارے بیان کے مطابق اس شخص میں موجود ہیں، لہذا اُسے نبی برحق مان کر اتباع کرو۔ بمزید احتیاط تین سوال بھی بتا دیتے ہیں تاکہ اُن کی صداقت

اور پختہ ہو جائے لیکن یہ نہیں کہتے کہ ہم بھی اُن پر ایمان لے آئیں گے، اور نہ خود مزید تحقیق کے لئے آمادہ ہوتے ہیں، اور نہ اُن کے ساتھ یا جُدا گانہ مکے آکر آپ سے ملتے اور آپ میں بیان کردہ توراتی اوصاف کا معاینہ کر کے آپ کی تصدیق یا تکذیب کرتے ہیں، جب کہ از روئے صحائفِ توراۃ اُن پر ایسے نبی کو پا کر اُس پر ایمان لانا فرض تھا۔

(۷) ذوالقرنین سے متعلق ایک روایت میں اُسے بجائے ذوالقرنین کے "رجل طواف بلغ مشارق الارض و مغاربھا" کہا ہے، اور دوسری میں ہے "رجل کان لسیح فی الارض"، سوال کی یہ تعمیم روایت کو ناقابلِ قبول بناتی ہے، کیوں کہ ہوشیار ممتحن اس قسم کا سوال مرتب نہیں کیا کرتا، جس کا متعین جواب نہ ہو۔ ورنہ جواب کی تصدیق یا تکذیب اُس کے بس کی نہیں ہو سکتی۔

۸۔ ابن ابی حاتم نے سدی سے یہ روایت کی ہے کہ یہود نے رسول اللہ صلعم سے کہا کہ آپ ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ وغیرہ انبیاء کا جو ذکر کرتے ہیں، یہ سب آپ نے ہم سے سنا ہے۔ اب ذرا اُس نبی کے بارے میں بتائیے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے توریت میں صرف ایک جگہ کیا ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا، وہ کون ہے؟ یہود نے کہا: ذوالقرنین۔ آپ نے فرمایا، مجھے اس کے بارے میں کوئی (غیبی) خبر نہیں ملی۔ یہ سن کر یہود خوش خوش واپس ہوئے اور یہ سمجھے کہ ہم جیت گئے، مگر ابھی دروازے تک بھی نہ پہنچے تھے کہ جبرئیلؑ متعلقہ آیات لے کر اُتر آئے۔ (الدر المنثور ۴/۲۴۰)

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے اس روایت کی بابت لکھا ہے کہ "اس جگہ راوی نے اختصار سے کام لیا ہے۔ صحیح تفصیل یہ ہے کہ ان سوالات کا انتخاب یہود نے کیا تھا، مگر قریش کی زبان سے ادا کرائے گئے۔ اور ہو سکتا ہے کہ سوال میں لفظ توراۃ دیکھ کر نیچے کے کسی راوی نے اپنے وہم سے ان سوالات کو بلا واسطہ یہود کی جانب سے سمجھ لیا ہو" (قصص القرآن ۳/۱۱۳)۔

میری دانست میں یہ روایت سب سے زیادہ قابلِ اعتراض ہے، کیوں کہ اول تو اس میں علمائے یہود سے ذوالقرنین کو نبی کہلایا گیا ہے، جب کہ یہودیوں کے بارے میں یہ طے شدہ امر

ہے کہ وہ اپنی قوم کے باہر کسی نبی کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے اور نہ ذوالقرنین ہی کو انھوں نے نبی مانا ہے۔ دوسرے یہود نے یہ کہا کہ اس نبی کا ذکر توریت میں ایک جگہ آیا ہے۔ جب کہ ذوالقرنین نام کے کسی نبی کا ذکر توریت میں ایک جگہ بھی نہیں آیا۔ اور حضرت دانیالؑ کے خواب والے ذوالقرنین سے خورس مراد لیا جائے تو اُس کا ذکر ایک آیت میں نہیں دسیوں آیتوں میں ملتا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ راوی کا مقصد یہ ہے کہ ذوالقرنین لقب کے ساتھ صرف ایک بار اُس کا مذکور ہوا ہے، تو جیسا کہ ذوالقرنین کی بحث میں تفصیل سے بیان ہوگا، فردِ واحد متعین کے لئے اس لقب کا استعمال توریت میں مطلقاً نہیں ہوا، بلکہ خوابِ دانیال کے دو سینگوں والے مینڈھے سے ایرانی بادشاہت یا کوئی ایرانی بادشاہ یا شاہانِ ایران مراد ہیں۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سورۂ کہف کی شانِ نزول سے متعلق روایتیں مشکوک ہیں۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہ مذکورۂ بالا سوال ایک وقت میں کئے گئے، نہ سوالوں کی تعداد تین تھی اور نہ سوال کرنے یا کرانے والے یہودی تھے۔ نیز اصحابِ کہف کا قصہ بلا سوال نازل ہوا تھا، اور روح کی بابت سوال کسی اور وقت کا تھا، اس لئے وہ دوسری سورت میں مذکور ہوا۔

ذوالقرنین اس سورہ کا سب سے پیچیدہ قصہ ذوالقرنین کا ہے اور اس پیچیدگی کا تعلق ذوالقرنین کی شخصیت سے ہے۔ چونکہ قرآن مجید میں اس کے نام، عہد اور وطن کا مذکور نہیں ہوا، اس لئے مفسرین قرآن از سلف تا خلف، ان گرہوں کو کھولنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ متقدمین کے چند اقوال یہ ہیں[1]

۱۔ ذوالقرنین سے مراد ایران کا بادشاہ کیقباد یا فریدون ہے۔

---

[1] دیکھئے تفسیر رازی ۵/ ۷۵۰، تفسیر ابن کثیر ۳/ ۱۰۰، تفسیر قرطبی ۱۱/ ۴۵، تفسیر ابی السعود ۲/ ۹۰، الدر المنثور ۴/ ۲۴۰، تاریخ طبری ۲/ ۶، مروج الذہب ۱/ ۱۴۲، الآثار الباقیہ للبیرونی ۴۱ (بحوالہ ازالۃ الرین ۸)، البدایہ لابن کثیر ۲/ ۱۰۵، تاریخ ابی الفداء ۱/ ۷ اور ثمار القلوب للثعالبی ۲۳۴۔

۲۔ ذوالقرنین ابوکرب شمس حمیری کالقب ہے۔
۳۔ ذوالقرنین سکندر یونانی کو کہتے ہیں۔
۴۔ ذوالقرنین فرشتہ تھا۔
۵۔ ذوالقرنین ایک نیکوکار انسان تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت اور سلطنت عطا کی تھی۔
۶۔ ذوالقرنین مرزبانِ مصری تھا۔
۷۔ ذوالقرنین ایک رومی جوان تھا۔

مولانا نقوی | متاخرین میں سب سے پہلے مولانا حکیم محمد حسن نقوی امروہوی (متوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) نے اپنی فارسی تفسیر موسوم بہ معالمات الاسرار (ج ۲/ ۲۳) میں لکھا ہے:

"واضح باد کہ نسبتِ ذوالقرنین در اہلِ اسلام روایت مختلف است حاجت بیان نیست، حق آن است گوناوان معترض شوند کہ مرادِ ذوالقرنین کیقباد بادشاہ فارس ومدیان است، چناں کہ در درس ۲ و ۳ فصل ۸ دانیال است۔ پس خلاف برخاست، کہ مطابق درسِ ا فصل ۵ ۴ یشعیا، مسیح کورس، کیقباد عجب بادشاہ مشرق ومغرب راخوانند، اہلِ اسلام تسلیم کنند یا نکنند۔
وچون ذوالقرنین لقبِ کوروش کے است و کے معنی روح و فرشتہ است، نظر براں فاروق اکبرؓ فرمودہ "آیا راضی نشدید بنامہای انبیاءؑ تا آں کہ نام فرشتگان می نہید"

یہ تفسیر مطبع رضوی دہلی میں ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں طبع ہوئی تھی، اس لحاظ سے حکیم صاحب کا یہ قیاس کہ ذوالقرنین سے مراد کوروش بادشاہِ فارس ومیڈیا ہے، اور صحیفۂ دانیال و صحیفۂ یشعیا اس کے موید ہیں، ۱۸۷۶ء سے پہلے کا ہے۔

اس تفسیر کے بعد حکیم صاحب نے ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) میں ایک اردو تفسیر بنام غایۃ البرہان

لکھی۔ اس میں "یسئلونک عن ذی القرنین" کے تحت لکھتے ہیں: " اور سوال کریں تجھ سے کفار ذوالقرنین کے حال سے کہ اس نے کیا کیا۔ فصل ۸ دانیال کے خواب دانیال میں نظر اس کے کہ میڈو فارس کا بادشاہ تھا دو سینگ کا مینڈھا نظر آیا تھا۔ باقی وجوہات تراشیدہ کا اعتبار نہیں۔ قل ساتلوا علیکم منہ ذکرا وقولہ، جلد پڑھوں تمہارے اوپر اس سے ذکر انشاء اللہ تعالیٰ کہ وہ ۷۲ سال کی عمر میں بعد ۲۲ سال کی سلطنت کے ۵۳۶ ق م میں بابل کا بادشاہ ہوا اور قید بابل سے قوم یہود کو خلاص کیا" (ج ۲/ ۵۷)

اس تفسیر سے اور واضح ہوگیا کہ حکیم صاحب سائرس (خورس یا کیخسرو) کو ذوالقرنین مانتے ہیں اور اس لقب کا مبنیٰ اُن کی رائے میں خوابِ دانیال ہے۔

حکیم نورالدین | حکیم نورالدین صاحب قادیانی متوفی ۱۳۳۲ھ (۱۹۱۴ء) نے اپنی کتاب موسوم بہ "تصدیق براہین احمدیہ" ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۰ء) میں لکھی ہے[1]۔ اس کا جو ایڈیشن نومبر ۱۹۲۳ء میں قادیان سے شائع ہوا اس کے صفحہ ۴۹ پر لکھا ہے:

" دانیال کی کتاب میں جو بائبل کے مجموعہ میں ۲۷ ویں کتاب ہے، اُس کے ۸ باب، ۴ آیت میں حضرتِ دانیال نبی کا مکاشفہ ہے . . . . . اور اس مکاشفے میں یہ بات مندرج ہے، "تب میں نے اپنی آنکھ اٹھا کر نظر کی، تو کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے آگے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ تھے۔ اور وہ دو سینگ اونچے تھے اور ایک دوسرے سے بڑا تھا۔

" پھر دانیال کو جبرئیل نے اُس مکاشفے اور خواب کی تعبیر بتائی کہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اُس کے دو سینگ ہیں سو وہ مادا اور فارس کی بادشاہت ہے۔ (دانیال ۸ - ۲۰)":

اس کے بعد "حتی اذا بلغ مغرب الشمس،" الآیۃ کی تفسیر میں فرماتے ہیں "یہ بادشاہ جو دانیال کے خواب میں دو سینگ کا مینڈھا دکھائی دیا، اور فارس اور ماد کا حکمراں ہوا، اُس کا

---

[1] اس کتاب کے صفحہ ۲۰۳ پر مصنف نے ۲/ اپریل ۱۸۹۰ء کو اپنے قادیان جانے کا ذکر کیا ہے۔ اور ۱۳۰۸ھ کا اختتام ۱۶/ اگست ۱۸۹۰ء کو ہوتا ہے۔ لہذا اس کتاب کو ۲/ اپریل اور ۱۶/ اگست کے درمیان انجام کو پہنچنا چاہیے۔

نام خورس ہے" (ص ۵)

اس کے بعد پھر لکھا: "کورس یا خورس کا تسلط تمام زمین پر ہوا۔۔۔۔۔ جب خورس بلوچستان میں پہنچا" (ص ۵۱)

بعد ازاں "حتی اذا بلغ بین السدین الآیۃ" کی تفسیر میں لکھا ہے: "یہ وہ مقام ہے جو ایران کے شمال میں دربند کر کے مشہور ہے، اور اُس کے قریب اب تک قبہ نام کی ایک بستی اسی کیقباد خورس کے نام سے قرآن کی تصدیق کے لئے موجود ہے" (ص ۵۲)

سرسید | سرسید احمد خاں متوفی ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۸ء) نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مطبوعہ ۷ر جون ۱۸۹۰ء (۱۳۰۷ھ) میں ایک مقالہ بنام "ازالۃ الغین عن قصۃ ذی القرنین" شائع کیا تھا[۱] جو اسی سال کتابی شکل میں مطبع مفید عام آگرہ میں چھپا۔ اس رسالے میں سرسید نے یہ ثابت کیا ہے کہ ذوالقرنین سے مراد چین کا بادشاہ چی وانگ ٹی ہے، جس نے دیوارِ چین بنائی ہے۔ یہ غلط ق م تعمرا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ سرسید مذکورۂ بالا خیالات سے واقف نہ تھے، ورنہ اُن پر ضرور اظہار خیال کرتے۔

مولانا حقانی | غالباً سرسید کا مقالہ گزٹ میں پڑھ کر مولانا عبدالحق دہلوی متوفی ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۷ء) صاحبِ تفسیرِ حقانی نے ایک رسالہ بنام "ازالۃ الریب عن قصۃ ذی القرنین" لکھ کر میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد کے نام معنون کیا، اور حکیم اجمل خاں وغیرہ دوستوں کی فرمائش سے فخر المطابع دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔

مولانا نے سرسید کی تردید کے ساتھ ساتھ مذکورۂ بالا مفسروں کی رائے کو تسلیم نہیں کیا۔ اور سب کے برخلاف لکھا کہ "جمہور محققین کا اسی پر اتفاق ہے کہ ذوالقرنین تبع حمیری ہے، اور وہ دیوار جو اُس نے بنائی، وہی ہے جو کوہِ یورال[۱] میں واقع ہے"

---

[۱] دیکھئے ازالۃ الریب عن قصۃ ذی القرنین ۱۴۔

مگر مولانا نے حضرت دانیال کی خواب کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ " اس بنا پر ذوالقرنین فارس کے بادشاہوں میں سے کوئی بادشاہ ہے تباد وغیرہ جو دو سینگ والے سے یہود میں مشہور ہے، جس کا ترجمہ عربی میں ذوالقرنین ہوا "

تفسیر حقانی (ج ۵/۱۴۲) میں یہی عبارت لکھنے سے پہلے فرمایا ہے کہ " بلکہ پہلے بادشاہوں میں سے کوئی ہوگا کیخسرو کیقباد اس قول کے مطابق تو یہی بادشاہ ذوالقرنین قرار پاتا ہے اور اس کی سند بھی کتاب دانیال کے ۸ ویں باب سے ملتی ہے "

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا اس رائے سے باخبر تھے۔ یہ اطلاع مفسر امروہوی کی کتابوں سے پہنچی یا اُن کی کتابوں کے ساتھ حکیم نورالدین صاحب کی کتاب بھی پیش نظر تھی، اس بابت یقین کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے۔ مگر یاجوج وماجوج کے سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے کہ " بعض صاحبوں کا یہ خیال کر لینا کہ یاجوج سے انگریز اور ماجوج سے روسی لوگ مراد ہیں، محض غلط ہے نہ اس کی کوئی سند ہے، نہ اس کا کوئی عاقل قائل ہے " یاجوج وماجوج کا یہ مطلب حکیم صاحب نے اپنی مذکورہ بالا کتاب کے صفحہ ۲۵ اور ۵۴ پر بیان کیا ہے۔ لہذا مولانا کے سامنے یہ کتاب بھی ہونا چاہئے۔

<u>مولانا عمادی</u> مولانا عبداللہ العمادی متوفی ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) نے تاریخ عرب قدیم (ص ۱۰۴) میں لکھا ہے:

قصہ مختصر ہماری رائے میں ذوالقرنین عرب تھا، اس لئے کہ

۱۔ اہل عرب علانیہ اس کے مدعی تھے۔

۲۔ خاندان آذوار کے تمام سلاطین کے القاب اسی طرح کے ہوا کرتے تھے۔

۳۔ بند باندھنا اور پہاڑوں کے بیچ میں دیواریں کھینچنا اہل عرب کے خصوصیات میں تھا جس کا شائبہ سد ذوالقرنین میں بھی نظر آتا ہے۔

۴۔ قرآن میں جتنے قصے مذکور ہیں، یا تو عرب اور اُن کے آباء واجداد کے ہیں، یا بنی اسرائیل

کی کچھ سبق آموز داستانیں ہیں، جن کا عرب سے بہت قریبی تعلق تھا۔"

یہ کتاب کب لکھی گئی اور کس سنہ میں چھپی، اس کا پتہ نہ چل سکا۔ مگر اس کی تاریخِ تمہید ۷/ مارچ ۱۹۱۵ء بتاتی ہے کہ اس کی تالیف و طباعت اس سے پہلے کی ہے۔

مولانا عباسی | مولوی احمد مکرم عباسی چریاکوٹی نے ایک کتاب "حکمتِ بالغہ" نام سے لکھی تھی تاریخ تصنیف کا ذکر کتاب میں نہیں۔ لیکن سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلس اشاعت العلوم حیدرآباد نے مطبع دائرۃ المعارف النظامیہ میں ۱۲/ ربیع الاول ۱۳۳۲ھ (۱۹۱۴ء) کو طبع کرائی۔

اس میں مولف نے یاجوج و ماجوج اور ذوالقرنین کی بھی تحقیق کی ہے۔ موخرالذکر کے بارے میں لکھا ہے:

"ذوالقرنین دنیا کے کئی بادشاہوں کا لقب ہوا ہے۔ لیکن قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے وہ کیقباد فاتح فارس ہے ... اس کا نام کیقباد اخشویرش ہے، اور کورش اول، اور سائرس کبیر کے لقب سے مشہور ہوا۔" (پھر حضرت دانیال کا خواب لکھنے کے بعد فرمایا ہے) اس خواب کی تعبیر یہ بتائی گئی کہ کورش اول اخشویروش کیقباد جو حضرتِ دانیال کا ہم عصر تھا، فارس وغیرہ کا زبردست بادشاہ ہوگا... کورش اول کیقباد ذوالقرنین ۷۲ برس کی عمر میں ۲۲ سال کی سلطنت کے بعد ۵۳۶ ق م میں بابل پر فتح یاب ہوا، اور مظلوم یہودیوں کو قیدِ بابل سے رہا کر کے ممالک بیت المقدس میں آباد کیا۔"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عباسی کے نزدیک قرآنی ذوالقرنین سائرس یا کورش اول ہے، اور یہ رائے انھوں نے مولانا نے امروہوی کی اُردو تفسیر دیکھ کر قائم کی ہے۔

مولانا محمد علی لاہوری | مولوی محمد علی احمدی لاہوری متوفی ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) نے ۱۹۱۶ء میں اپنا انگریزی ترجمۃ القرآن شائع کیا اس میں انھوں نے دارا تے اول ہخامنشی کو رویائے دانیال کا مصداق ٹھہرایا ہے۔

بعدازاں ۱۳۴۵ھ (۱۹۲۲ء) میں بیان القرآن نام سے اُردو تفسیر لکھی جو دو تین جلدوں میں ۱۳۴۲ھ تک لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں انگریزی ترجمے کی بات کو ان الفاظ میں دُہرایا ہے:۔

" ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ میں بہت سی روایات ہیں ـــــــ مگر اس کی تعیین کسی نے نہیں کی کہ کون تھا۔ اس عقدے کا حل بائبل سے ہوتا ہے جہاں دانیال کی رویا میں دوسینگ کے مینڈھے کا ذکر ہے اور اُس کی تعبیر بھی وہیں موجود ہے ـــــــ

" وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اُس کے دو سینگ ہیں، سو مادہ اور فارس کے بادشاہ ہیں" (دانیال ۸۔ ۲۰)

مادہ اور فارس کے بادشاہوں میں سے دارائے اول (۵۲۱ تا ۴۸۵ ق م) وہ شخص ہے جس پر قرآن شریف کا بیان جو یہاں ذوالقرنین کے متعلق ہے، صادق آتا ہے ـــــــ دارا اپنے کتبوں کی رُو سے زردشت کے سچے مذہب کا پکا پیرو معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ بڑا مدبر اور بڑا منتظم بھی تھا"۔

(۸) ترجمان القرآن جلد دوم، صفحہ ۳۹۹ میں مولانا ابوالکلام مرحوم نے تحریر فرمایا ہے:

" اس سورت میں تیسرا واقعہ جو بیان کیا گیا ہے، وہ ذوالقرنین کا ہے، کیوں کہ لوگوں نے اس بارے میں سوال کیا تھا۔ تمام مفسرین متفق ہیں کہ سوال یہودیوں کی جانب سے تھا۔ اگرچہ غالباً مشرکین مکہ کی زبانی ہو، کیوں کہ سورت مکی ہے۔

قرآن نے ذوالقرنین کی نسبت جو کچھ بیان کیا ہے، اُس پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے، تو حسب ذیل امور سامنے آجاتے ہیں:

اوّلاً جس شخص کی نسبت پوچھا گیا ہے وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا۔ یعنی ذوالقرنین کا لقب خود قرآن نے تجویز نہیں کیا ہے، پوچھنے والوں کا مجوزہ ہے، کیوں کہ فرمایا

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَيْنِ (۸۳)

ثانیاً اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اُسے حکمرانی عطا فرمائی تھی، اور ہر طرح کا سازوسامان جو

ایک حکمراں کے لئے ہوسکتا تھا اُس کے لئے فراہم ہوگیا تھا۔

ثالثاً اُس کی بڑی مہمیں تین تھیں۔ پہلے مغربی ممالک فتح کیئے، پھر مشرقی۔ پھر ایک ایسے مقام تک فتح کرتا ہوا چلا گیا جہاں پہاڑی دَرّہ تھا، اور اُس کی دوسری طرف سے یاجوج اور ماجوج آکر لوٹ مار مچایا کرتے تھے

رابعاً اُس نے وہاں ایک نہایت محکم سد تعمیر کردی، اور یاجوج وماجوج کی راہ بند ہوگئی۔

خامساً وہ ایک عادل حکمراں تھا۔ جب وہ مغرب کی طرف فتح کرتا ہوا دور تک چلا گیا، تو ایک قوم ملی جس نے خیال کیا کہ دُنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح ذوالقرنین بھی ظلم وتشدد کرے گا۔ لیکن ذوالقرنین نے اعلان کیا کہ بے گناہوں کے لیئے کوئی اندیشہ نہیں ہے، جو لوگ نیک عملی کی راہ چلیں گے، اُن کے لئے ویسا ہی اجر بھی ہوگا۔ البتہ ڈرنا انھیں چاہیئے جو جرم وبدعملی کا ارتکاب کرتے ہیں (۸۵)

سادساً وہ خدا پرست اور راست باز انسان تھا، اور آخرت کی زندگی پر یقین رکھتا تھا (۸۷: ۹۰)

سابعاً وہ نفس پرست بادشاہوں کی طرح طامع اور حریص نہ تھا۔ جب ایک قوم نے کہا، یاجوج اور ماجوج ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ آپ ہمارے اور اُن کے درمیان ایک سد تعمیر کردیں، ہم خراج دیں گے، تو اُس نے کہا "مامکنی فیہ ربی خیر" جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے، وہی میرے لئے بہتر ہے۔ میں تمھارے خراج کا طامع نہیں، یعنی میں خراج کی طمع سے یہ کام نہیں کروں گا۔ اپنا فرض سمجھ کر انجام دوں گا۔

تاریخ قدیم کی جس شخصیت میں یہ تمام اوصاف واعمال پائے جائیں، وہی ذوالقرنین ہوسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کون شخص تھا؟

"سب سے پہلا حل طلب مسئلہ جو مفسرین کے سامنے آیا، وہ اُس کے لقب کا تھا۔ عربی میں بھی اور عبرانی میں بھی قرن کے صاف معنی سینگ کے ہیں پس ذوالقرنین کا مطلب ہوا دو سینگ والا۔ لیکن چوں کہ تاریخ میں کسی ایسے بادشاہ کا سراغ نہیں ملا جس کا ایسا لقب ہو اس لئے مجبوراً قرن کے معنی میں طرح طرح کے تکلفات کرنے پڑے بہرحال مفسرین ذوالقرنین

کی شخصیت کا سُراغ نہ لگا سکے۔

اگر ذوالقرنین کے مفہوم کا کوئی سراغ ملتا تھا، تو وہ صرف ایک دَور کا اشارہ تھا جو حضرت دانیال کی کتاب میں ملتا ہے، یعنی ایک خواب جو انھوں نے بابل کی اسیری کے زمانے میں دیکھا تھا چنانچہ کتاب دانیال میں ہے: میں کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے کنارے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں۔ دونوں سینگ اونچے تھے، لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا، اور بڑا دوسرے کے پیچھے تھا۔ میں نے دیکھا کہ پچھم اور اتر اور دکھن کی طرف وہ سینگ مارتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی جانور اُس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا اور وہ بہت بڑا ہوگیا۔ میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھو پچھم کی طرف سے ایک بکرا آکے تمام روئے زمین پر پھر گیا۔ اُس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب طرح کا سینگ تھا۔ وہ دو سینگ والے مینڈھے کے پاس آیا، اور اس پر غضب سے بھڑکا، اور اُس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے، اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اُس کا مقابلہ کرے (دانیال ۸: ۱)

پھر اس کے بعد ہے کہ جبریل نمایاں ہوا اور اُس نے اس خواب کی تعبیر بتلائی کہ دو سینگوں والا مینڈھا مادہ اور فارس کی بادشاہت ہے، اور بال والا بکرا یونان کی۔ جو بڑا سینگ اُس کی آنکھوں کے درمیان دکھائی دیا ہے، وہ اُس کا پہلا بادشاہ ہوگا (۸ : ۱۵)

چونکہ اس خواب میں میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی، اس لئے خیال ہوتا تھا کہ عجب نہیں فارس کے شہنشاہ کے لئے یہودیوں میں ذوالقرنین کا تخیل پیدا ہوگیا یعنی دو سینگوں والی شہنشاہی، اور وہ اُسے اُسی لقب سے پکارتے ہوں۔ تاہم محض ایک قیاس تھا۔ اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت موجود نہ تھی۔

لیکن ۱۸۳۸ء کے ایک انکشاف نے جس کے نتائج بہت عرصے کے بعد منظرِ عام پر آئے، اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کردیا، اور معلوم ہوگیا کہ فی الحقیقت شہنشاہِ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا، اور یہ محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا، بلکہ خود سائرس کا یا باشندگان

فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ نام تھا۔

اس انکشاف نے شک و تخمین کے تمام پردے اٹھا دئے۔ یہ خود سائرس کا ایک سنگی تمثال ہے جو اصطخر کے کھنڈروں میں دستیاب ہوا۔ اس میں سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اُس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوتے ہیں، اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ اوپر خطِ میخی میں جو کتبہ کندہ تھا، اُس کا بڑا حصہ ٹوٹ کر ضائع ہو چکا ہے۔ مگر جس قدر باقی ہے، وہ اس لئے کافی ہے کہ تمثال کی شخصیت واضح ہو جاتے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ماد اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دینے کا تخیل ایک مقبول اور عام تخیل تھا اور یقیناً سائرس کو ذوالقرنین کے لقب سے پکارا جاتا تھا تمثال میں پروں کا ہونا اُس کے ملکوتی صفات و فضائل کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ نہ صرف پارسیوں میں بلکہ تمام معاصر قوموں میں یہ اعتقاد عام طور پر پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی نوعیت کا انسان ہے۔

دو سینگوں کا تخیل ابتدا میں کیوں کر پیدا ہوا؟ کیا اس کی بنیاد دانیال نبی کا خواب تھا یا بطورِ خود سائرس نے یا باشندگانِ پارس نے یہ تخیل پیدا کیا؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ لیکن اگر تورات کی روایات تسلیم کر لی جائیں تو سائرس سے لے کر ارتازرکسیز (ارتخششت) اول تک تمام شہنشاہانِ پارس انبیاء بنی اسرائیل سے عقیدت رکھتے تھے اور اس لیے ہو سکتا ہے کہ اسی خواب سے ذوالقرنین کا لقب پیدا ہو گیا ہو۔

بہرحال اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ سائرس کو ذوالقرنین سمجھا جاتا تھا، اور یقیناً عرب کے یہودی بھی اُسے اسی لقب سے پکارا کرتے تھے"۔

سائرس کے ظہور کی پیشین گوئیوں کے بارے میں مولانا نے یہ تحریر فرمایا ہے: "اس سلسلے میں سب سے پہلی پیشین گوئی یسعیاہ نبی کی ہے جن کا ظہور سائرس کی فتح بابل سے ایک سو ساٹھ برس پہلے ہوا تھا۔

اس پیشین گوئی میں خدا کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ خورس (سائرس) میرا چرواہا ہوگا، اور میں

نے اُسے اس لیے پکارا ہے کہ بنی اسرائیل کو بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے۔ نیز اُسے خدا کا مسیح بھی کہا ہے (یسعیاہ ۲۱ : ۲۴)

اسی طرح یرمیاہ نبی نے ۶۰ برس پہلے پیشین گوئی کی تھی: " قوموں کے درمیان منادی کردو اور اسے مت چھپاؤ۔ تم کہو، بابل لے لیا گیا۔ بعل رسوا ہوا۔ مردوک سراسیمہ کیا گیا۔ اُس کے بُت خجل ہوئے۔ اُس کی مورتیں پریشان کی گئیں، کیوں کہ اُتّر سے ایک قوم اُس پر چڑھتی ہوئی آرہی ہے جو اُس کی سرزمین اُجاڑ دے گی یہاں تک کہ اُس میں کوئی نہیں رہے گا" (۵۰ : ۱)

یرمیاہ نبی نے اس کی بھی پیشین گوئی کر دی تھی کہ ستر برس تک یہودی بابل میں قید رہیں گے۔ اور اس کے بعد بیت المقدس کی نئی تعمیر ہوگی: " خداوند کہتا ہے، جب بابل پر ستر برس گزر چکیں گے تو میں تمھاری خبر لینے آؤں گا۔ تب تم مجھے پکاروگے اور میں جواب دوں گا۔ تم مجھے ڈھونڈوگے اور مجھے پالوگے۔ میں تمھاری اسیری ختم کردوں گا۔ تمھیں تمھارے مکانوں میں واپس لے آؤں گا" (۲۹ : ۱۰)
اس پیشین گوئی میں خدا نے اپنی رحمت کی واپسی کو فتح بابل کے واقعہ سے وابستہ کیا ہے۔ گویا سائرس کا ظہور اُس کی رحمت کا ظہور ہوگا جو بنی اسرائیل پر پھر لوٹ آئے گی۔

توریت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب سائرس نے بابل فتح کیا، تو دانیال نبی نے (جو شاہانِ بابل کے وزراء میں داخل ہوگئے تھے) اُسے یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی دکھائی کہ ۱۴۰ برس پہلے اُس کے ظہور کی خبر دے دی گئی تھی۔ یہ بات دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوا، اور بیان کیا جاتا ہے کہ اسی کا نتیجہ وہ فرمان تھا جو اُس نے تعمیر ہیکل کے لئے جاری کیا۔

زمانۂ حال کے نقادان پیشین گوئیوں کی اصلیت پر مطمئن نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ پیشین گوئیاں واقعات کے ظہور کے بعد بڑھادی گئی ہیں، خصوصاً یسعیاہ کی پیشین گوئی جس میں صریح خورس (یسائرس) کا نام موجود ہے لیکن وہ اس اشتباہ کی تائید میں عقلی استغراب کے سوا اور کوئی دلیل پیش نہیں کرسکتے، اور محض عقلی استغراب ان صحائف کے خلاف حجت نہیں ہوسکتا جن کی نسبت یقین کیا گیا ہے کہ الہام سے لکھے گئے تھے"

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں "اب غور کرو، قرآن کی تصریحات نے جو جامہ تیار کیا ہے، وہ کس طرح ٹھیک ٹھیک صرف سائرس ہی کے جسم پر راست آتا ہے...... سب سے پہلے اس بات پر غور کرو کہ ذوالقرنین کی نسبت سوال بالاتفاق یہودیوں کی جانب سے ہوا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی غیر یہودی بادشاہ کی شخصیت یہودیوں میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھی جا سکتی تھی، تو وہ صرف سائرس ہی کی تھی، نبیوں کی پیشین گوئیوں کا مصداق، دانیال نبی کے خواب کا ظہور، رحمتِ الٰہی کی واپسی کی بشارت، بنی اسرائیل کا نجات دہندہ، خدا کا فرستادہ چرواہا اور مسیح، یروشلم کی تعمیر ثانی کا وسیلہ! پس اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُسی کی نسبت اُن کا سوال ہو۔

سدی کی ایک روایت میں بھی جو قرطبی وغیرہ نے نقل کی ہے اس طرف صریح اشارہ ملتا ہے: "قال، قالت الیهود، اخبرنا عن نبی لم یذکرہ اللہ فی التوراۃ الا فی مکان واحد قال، ومن؟ قالوا ذوالقرنین" یعنی یہودیوں نے آں حضرت سے کہا، اُس نبی کی نسبت ہمیں خبر دیجئے جس کا نام تورات میں صرف ایک ہی مقام پر آیا ہے، آپ نے فرمایا؛ وہ کون؟ کہا، ذوالقرنین: چوں کہ سائرس کے ذوالقرنین ہونے کا اشارہ صرف دانیال نبی کے خواب ہی میں آیا ہے، اس لئے یہودیوں کا یہ بیان ٹھیک ٹھیک اُسی طرف اشارہ تھا۔

علاوہ بریں سائرس کے تمثال کے انکشاف نے قطعی طور پر یہ بات آشکارا کر دی ہے کہ اُس کے سر پر دو سینگوں کا تاج رکھا گیا تھا، اور یہ فارس اور مادہ کی مملکتوں کے اجتماع واتحاد کی علامت ہے:

اس کے بعد صحائفِ تورات کی تصریحات کے تحت فرماتے ہیں،

"اب چند لمحوں کے لئے اُن تصریحات پر غور کرو جو تورات کے صحائف میں مندرج ہیں۔ س طرح وہ سائرس کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت واضح کر رہے ہیں، اور کس طرح رآن کے اشارات بھی ٹھیک ٹھیک اُن کی تصدیق ہیں۔ یسعیاہ نبی کی کتاب میں ہے کہ "خداوند

کہتا ہے، خورس میرا چرواہا ہے" اور پھر یہ بھی کہا ہے کہ " وہ میرا مسیح ہے " اور یرمیاہ نبی کا بیان اوپر گزر چکا ہے کہ وہ بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے گا - اب دیکھو اس کی شخصیت ٹھیک ٹھیک ایک موعود اور منتظر دہندہ[1] کی شخصیت تھی یا نہ تھی "

پھر ارشاد ہوا ہے کہ "اس سلسلے میں آخری وصف جو ذوالقرنین کا سامنے آتا ہے، وہ اُس کا ایمان باللہ ہے - قرآن کی آیتیں اس بارے میں ظاہر و قطعی ہیں کہ وہ ایک خدا پرست انسان تھا، آخرت پر یقین رکھتا تھا، احکام الٰہی کے مطابق عمل کرتا تھا اور اپنی تمام کامرانیوں کو اللہ کا فضل و کرم سمجھتا تھا - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سائرس کا بھی ایسا ہی اعتقاد و عمل تھا؟
لیکن تمام پچھلی تفصیلات پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ نہیں تھا -

یہودیوں کے صحائف کی واضح شہادت موجود ہے کہ خدا نے اُسے اپنا فرستادہ اور مسیح کہا اور وہ نبیوں کا موعود و منتظر تھا، ظاہر ہے کہ ایسی ہستی خدا کی نافرمان ہستی نہیں ہو سکتی جس کا " ہاتھ خدا نے پکڑا ہو" اور جس کی ٹیڑھی راہیں وہ درست کرتا جاتے " یقیناً وہ خدا کا ناپسندیدہ بندہ نہیں ہو سکتا - خدا صرف اُنھیں کا ہاتھ پکڑتا ہے جو برگزیدہ اور مقدس ہوتے ہیں، اور صرف اُنھیں کو اپنا فرستادہ کہتا ہے جو اُس کے چنے ہوئے اور اُس کی ٹھہرائی ہوئی راہوں پر چلنے والے ہوتے ہیں "

اس کے بعد فرمایا ہے " اگر یہودیوں کا عام اعتقاد یہ تھا، تو کیا ایک لمحے کے لئے یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک بت پرست انسان کی نسبت ایسا اعتقاد رکھنے کی جرأت کرتے؟ ——— وہ سائرس کی فضیلت کے آگے جھک گئے جو اُن کے لئے ہر اعتبار سے اجنبی تھا اور نہ صرف اس کی بزرگی ہی کا اعتراف کیا، بلکہ نبیوں کا موعود اور خدا کا برگزیدہ تسلیم کیا - یہ صورتِ حال اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ سائرس کی شخصیت اُن کے لیے بڑی ہی محبوب شخصیت تھی، اور اُس کی فضیلتیں ایسی قطعی اور آشکارا تھیں کہ اُن کے اعتراف میں نسلی عصبیت کا جذبہ بھی حائل نہ ہو سکا، ظاہر ہے کہ ایک بُت پرست انسان کے لئے جو اجنبی بھی ہو، یہودیوں میں ایسی محبوبیت

[1] شاید لفظ نجات کا لفظ کتابت سے رہ گیا۔

پیدا نہیں ہو سکتی تھی، اگر ایک بُت پرست بادشاہ نے انھیں نجات دلائی تھی، تو وہ اُس کی شاہانہ عظمتوں کی مداحی کرتے، مگر خدا کا مسیح اور برگزیدہ کبھی نہ سمجھتے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائرس کے دینی عقائد کے بارے میں ہماری معلومات کیا ہیں؟

تاریخی حیثیت سے یہ قطعی ہے کہ سائرس زردشت کا پیرو تھا۔ بلکہ غالباً اُسی کی شخصیت ہے جو اس نئی دعوت کی تبلیغ و عروج کا ذریعہ ہوئی۔ اُس نے فارس اور میڈیا میں نئی شہنشاہی کی بنیاد ہی نہیں رکھی تھی بلکہ قدیم مجوسی دین کی جگہ نئے زردشتی دین کی بھی تخم ریزی کی تھی۔ وہ ایران میں نئی شہنشاہی اور نئے دین دونوں کا بانی تھا۔"

اس کے بعد مولانا نے بالواسطہ شہادتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ سائرس زردشتی تھا، جو توحید پرستی پر مبنی ہے، اور مجوسی نہ تھا جو ثنویت سکھاتا ہے۔ اور چوں کہ دارا نے اول موحد ہے، اور سائرس اور دارا کے درمیان تبدیل مذہب کا کوئی حوالہ نہیں ملتا، اس لیے یہ ماننا جائے گا کہ یہ کام سائرس کے وقت میں ہو چکا تھا۔ چنانچہ مولانا کے اپنے الفاظ یہ ہیں "بہرحال سائرس نے اپنی ابتدائی گمنامی کے عہد میں نئی دعوت قبول کی ہو، یا تخت نشینی کے بعد لیکن یہ قطعی ہے کہ وہ دینِ زردشتی پر عامل تھا۔ لیکن اگر ذوالقرنین دینِ زردشتی پر عامل تھا، اور قرآن ذوالقرنین کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا اثبات کرتا ہے، اتنا ہی نہیں، بلکہ اُسے ملہم من اللہ قرار دیتا ہے، تو کیا اس سے لازم نہیں آتا کہ زردشت کی تعلیم دینِ حق کی تعلیم تھی؟ یقیناً لازم آتا ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ اس لزوم سے بچنے کی ہم کوشش کریں، کیوں کہ یہ حقیقت اب پوری طرح روشنی میں آچکی ہے کہ زردشت کی تعلیم سرتاسر خدا پرستی اور نیک عمل کی تعلیم تھی، اور آتش پرستی اور ثنویت کا اعتقاد اُس کا پیدا کیا ہوا اعتقاد نہیں ہے۔ بلکہ قدیم میڈیسی مجوسیت کا ردِّ عمل ہے۔

مولانا نے اس کے بعد "دارا کے فرامین" کے چند اقتباس دیے ہیں جن میں خدا نے

برتراہورمزدہ کا بار بار ذکر آیا ہے ان کو نقل کرکے آپ نے فرمایا ہے: "یاد رہے کہ دارا سائرس کا معاصر تھا اور اُس کی وفات سے صرف ۸ برس بعد تخت نشین ہوا۔ پس دارا کی صداؤں میں ہم خود سائرس کی صدائیں سُن رہے ہیں۔ اُس کا بار بار اپنی کامرانیوں کو اہورمزدہ کے فضل وکرم سے منسوب کرنا ٹھیک ٹھیک ذوالقرنین کے اس طریقِ خطاب کی تصدیق ہے کہ ھذا رحمۃ من ربی"(۹۸)

مولانا کے مذکورۂ اقتباسات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ

(۱) قرآنِ مجید کا ذوالقرنین ایران کے ہخامنشی خاندان کا بانی کوروس (خورس یا کیخسرو) تھا

(۲) قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین نہ صرف مومن اور صالح تھا، بلکہ ملہم من اللہ بھی تھا۔

(۳) توریت کی متعدد کتابیں بھی یہی بتاتی ہیں کہ وہ اللہ کا چرواہا، اُس کا مسیح اور ملہم تھا۔

(۴) کوروس یا سائرس کو نہ صرف یہودی ذوالقرنین کہتے ہیں، بلکہ اُسے ایرانی بھی اسی لقب سے یاد کرتے ہیں۔

کچھ المامون کی اوّلیات کے بارے میں

(از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم ۔ اے ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش)

(۳)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے بُرہان جولائی ء)

بہر حال قبل مامونی دور کے اساطینِ معتزلہ میں سے ہر فاضل اپنے عہد کا عبقریِ وقت تھا ان کا گل سرسبد ابو الہذیل العلاف ہے ۔ وہ ۱۳۵ھ میں پیدا ہوا تھا لہذا جب مامون نے بغداد آ کر اعتزال نوازی شروع کی تو ستر سال کا ہو چکا ہوگا ۔ اس طرح اس کی علمی و فکری سرگرمیوں کا بہترین زمانہ مہدی اور ہارون کے عہد میں گزرا ۔ اُس کے علم و فضل کے بارے میں مرتضیٰ زیدی نے نقل کیا ہے"

"کان نسیج وحدہ وعالم دھرہ ولم یتقدمہ احد من الموافقین له ولا من المخالفین"

قاضی عبد الجبار نے لکھا ہے کہ مجوس و ثنویہ اور دوسرے مخالف اسلام فرقوں کے ساتھ اُس کے مناظرے مشہور ہیں اُس کے ہاتھ پر تین ہزار سے زائد لوگ مشرف باسلام ہوئے ۔ "دقیق الکلام" اور "جلیل الکلام" میں اُس کی دستگاہ عالی اور کثرت تصانیف کے بارے میں مرتضیٰ زیدی کی نقل اوپر مذکور ہو چکی ہے ۔ مگر یہ سب معتزلی معتقدین کے تبصرے ہیں ۔

مخالفین بھی — الفضل ما شہدت بہ الاعداء

کے مصداق اُس کی عظمتِ فکر کے معترف ہیں۔ ابو الحسین الملطی نے "رد البدع والاہواء" میں اُس کے بارے میں لکھا ہے۔

"وابو الھذیل ھذا الحدید لک فی اھل الجدل مثلہ" — اور یہ ابوالہذیل وہ ہے کہ اُس جیسا ماہرین (مناظروں) میں نہیں پایا گیا۔

شہرستانی اُس کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"ابوالھذیل حمدان بن ابی الھذیل العلاف شیخ المعتزلہ ومقدم الطائفہ ومقرر الطریقۃ والمناظر علیھا" — ابوالہذیل حمدان بن ابی الہذیل العلاف فرقہ معتزلہ کا شیخ (سردار) تھا، وہ اس گروہ کا پیشوا تھا، ان کے مسلک کو مستحکم کرنے والا اور ان کی جانب سے مناظرہ کرنے والا۔

دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"ابوالھذیل العلاف شیخھم الاکبر"

ابو اسحٰق النظام کے بارے میں جاحظ کا تبصرہ گذر چکا ہے کہ میں نے علم کلام اور فقہ میں اُس سے زیادہ عالم نہیں دیکھا اقبال کا شعر ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اور یہی بات جاحظ نے نظام کے بارے میں لکھی ہے:۔

قال الجاحظ: الاوائل یقولون فی کل الف سنۃ رجل لا نظیر لہ۔ فان کان ذلک صحیحاً فھو ابو اسحٰق النظام" — جاحظ نے کہا ہے: پہلے لوگ کہا کرتے تھے کہ ہر ہزار سال میں ایک ایسا شخص بھی پیدا ہوتا ہے جس کی مثال و نظیر نہیں ہوا کرتی۔ لیکن اگر یہ بات صحیح ہے تو اس ہزارہ کا وہ شخص نظام ہے

ارسطا طالیسی فلسفہ کی نہایت غامض و عویص کتاب ارسطو کی "مابعد الطبیعیات" (یا

کتاب الحروف) ہے مگر نظام نہ صرف اس کا حافظ ہی تھا۔ وہ اس کا دیدہ ور نقاد بھی تھا اور محض حافظہ کی مدد سے اس کا رد کر سکتا تھا۔ اس کی تفصیل سابق میں مذکور ہو چکی ہے جز لا تجزی کے سلسلے میں ابن سینائی فلسفہ کے اندر جو چار (یا چھ) مذاہب مشہور ہوتے، ان میں سے ایک نظام کی عبقریت کا نتیجہ تھا۔

عہد ہارونی کا تیسرا مشہور مفکر ابو سہل بشر بن المعتمر تھا، اُس کے بارے میں مرتضیٰ زیدی نے لکھا ہے :۔

" وھو رئیس معتزلۃ لبغداد "

اُس نے معتزلہ کے مخالف فرقوں کے رد میں ایک قصیدہ لکھا تھا، جس میں چالیس ہزار بیت تھے۔ ابو سہل بشر کے بارے میں شہرستانی لکھتا ہے :۔

" البشریہ اصحاب بشر بن المعتمر کان من افضل علماء المعتزلۃ "

اس عہد کا ایک اور جلیل القدر معتزلی مفکر معمر بن عباد السلمی تھا۔ ہندوستان کے کسی معاصر راجہ نے ہارون کو لکھا تھا کہ اگر آپ کا مذہب عقل و خرد کے مطابق ہے تو میرے دربار کے سمنی عالم سے مناظرہ کے لئے کسی مسلمان عالم کو بھیجئے۔ ہارون متکلمین سے سخت ناراض تھا لہذا ایک محدث کو مناظرہ کے لئے بھیجا جو سمنی عالم کے سوالوں کا جواب نہ دے سکا اور مسلمانوں کی بڑی سبکی ہوئی۔ ہارون کو جب یہ اطلاع ملی تو قیامت ٹوٹ پڑی اور متکلمین کی تلاش ہوئی ان کے اندر قرعہ فال معمر بن عباد کے نام پڑا۔ وہ ہندوستان گیا جہاں راستہ میں اس کی وفات ہو گئی۔

عہد ہارونی میں اور بھی عظیم المرتبت معتزلی تھے جیسے ابو عثمان اسمٰعیل بن ابراہیم ادیبی جس کے بارے میں مرتضیٰ زیدی نے لکھا ہے

" کان عالماً زاھداً جلیلاً حاذقاً بمسائل الکلام "

ابو سعود عبدالرحمن العسکری جس کے بارے میں لکھتا ہے۔

" وکان . . . . مقدماً فی الکلام والحدیث "

ابوعامر انصاری جس کے بارہ میں لکھتا ہے۔ "کان عظیم القدر فی الفقہ والکلام"

غرض مہدی اور ہارون کا زمانہ معتزلی علم کلام کا دور طلائی Golden Period ہے اور یہ اس کے باوجود کہ ہارون کو علم کلام اور جدلیات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، بلکہ وہ ان سرگرمیوں کو ناپسند کرتا تھا۔ وہ تو صرف شعر و ادب کا رسیا تھا یا فقہاء اُس کے یہاں بار پاتے تھے چنانچہ ابن الاثیر نے "کامل" میں لکھا ہے۔

"ویمیل الی اہل الادب والفقہ ویکرہ المراء فی الدین"

ہارون الرشید کا میلان ادباء و فقہاء کی طرف تھا وہ دین کے معاملہ میں بحث و مباحثہ کو ناپسند کرتا تھا

زیادہ وضاحت مرتضیٰ زبیدی نے کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

وکان الرشید نہیٰ عن الکلام و امر بحبس المتکلمین"

ہارون الرشید نے علم کلام کی ممانعت کردی تھی اور متکلمین کو قید کرنے کا حکم دے دیا تھا

لیکن اس کے باوجود اُس کے عہد نے عظیم المرتبت معتزلی متکلم پیدا کئے جن میں سے ہر ایک اپنے وقت کا عبقری تھا۔ جن کے سامنے عہدِ مامونی کے معتزلی متکلم بونے نظر آتے ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مامون کے زمانہ میں جو اعتزال کی گرم بازاری نظر آتی ہے وہ عہدِ ہارونی کے معتزلی مفکرین ہی کی تفکیری سرگرمیوں کا تسلسل تھی۔

غرض مامون اپنی عقلیت پرستی اور اعتزال نوازی کے باوجود اُس پایہ کے معتزلی نہ پیدا کرسکا جن کا مہدی اور ہارون کے زمانہ میں نبوغ ہو چکا تھا۔

ہارون نے ۱۹۳ھ میں وفات پائی۔ اُس کے بعد امین خلیفہ ہوا جو ۱۹۸ھ میں برادرانہ خانہ جنگی کے نتیجے میں قتل ہوا امین کے بعد اُس کا بھائی مامون سریرآرائے خلافت ہوا۔ امین کو بھی اعتزال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لہٰذا عہد ہارونی کے اساطین معتزلہ اس عرصہ میں خانہ نشین رہے۔ البتہ جب مامون بغداد آیا تو پھر یہ محفل دوبارہ جمی اور پھر کوئی تیس سال تک ر واثق

کے عہدِ خلافت کے آخر تک) دربار پر معتزلہ چھائے رہے تاآنکہ متوکل نے انتصار سنت پر کمر باندھی۔

اس کے بعد فاضل مقالہ نگار کا یہ خیال کہ

"مامون کی تفلسف پسندی کے نتیجے میں معتزلہ پیدا ہوتے"

کسی مزید تبصرہ کا محتاج نہیں رہتا۔ اعتزال کی ابتدا اس سے کہیں پہلے ہو چکی تھی اور مامون کے بیشتر دور کا زمانہ تو فرقہ معتزلہ کی کلامی سرگرمیوں کی تاریخ کا دور طلائی ہے۔

زندقہ مامون سے پہلے

فاضل مقالہ نویس کا خیال ہے کہ خلیفہ مامون کی تفلسف پسندی اور یونانی فلسفہ و حکمت کی کتابوں کے روم سے منگا کر عربی زبان میں ترجمہ کرانے کے نتیجے میں

"زنادقہ پیدا ہوئے"[1]

مگر یہ خیال تاریخی واقعات سے مطابقت نہیں رکھتا، کیوں کہ

(۱) زندقہ مامون کے تختِ خلافت پر متمکن ہونے اور یونانی فلسفہ و حکمت سے اعتنا کرنے سے کہیں پہلے وجود میں آچکا تھا اور جس طرح مامون کے دادا مہدی اور باپ ہارون الرشید کا عہدِ حکومت اعتزال کا عہدِ طلائی ہے، اسی طرح اُس کے دادا اور چچا ہادی کا زمانہ زندقہ کی وبا کی انتہائی شدت کا دور ہے اور ان دونوں کی تادیبی سرگرمیوں نے تقریباً اس کا استیصال کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی الحاد و زندقہ کا ذکر سننے میں آتا ہے، مگر خال خال۔ زنادقہ کی سرگرمیاں جاری رہیں، مگر علانیہ نہیں، بلکہ صرف چوری چھپے طور پر۔

(۲) خود مامون کا جہاں تک تعلق ہے، وہ اس کی نشر و اشاعت کی ہمت افزائی کے

---

[1] برہان بابت مارچ ۱۹۷۷ء صفحہ ۲۰۰ س ۵ و ماقبل

[تصحیح: پہلی قسط میں خلیفہ عبداللہ المامون کے لئے کہیں کہیں "مامون الرشید" لکھا گیا ہے اس میں سے الرشید کو قلم زد کر دیا جائے]

بجائے اپنے دادا اور چچا کی طرح انتہائی سختی کے ساتھ اس کی بیخ کنی کے درپے رہتا تھا۔

اسی اجمال کی تفصیل سطور ذیل میں پیش کی جا رہی ہے۔

زندقہ کا مفہوم اور اشتقاق | "زندقہ" "زندیق" کا اسم ہے۔ مگر "زندیق" عربی الاصل لفظ نہیں ہے، بلکہ عام طور پر فارسی لفظ "زندیک" کا معرب سمجھا جاتا ہے، یعنی "زند" کا قائل۔ "زند" "اوستا" کی تفسیر کا نام ہے جو مجوسیوں کی مقدس کتاب تھی۔

اس طرح ابتداء میں "زندیق" اُس ملحد کو کہتے تھے جس کا رجحان و میلان کسی نہج سے بھی مجوسیت (بالخصوص مانویت) کی طرف ہوتا تھا۔ بعد میں اس کا استعمال ملاحدہ کے جملہ انواع کے لئے ہونے لگا اور آخری زمانہ میں یہ لفظ اُن ملاحدہ کے لئے مخصوص ہو گیا جو بظاہر مومن مگر بباطن کافر ہوتے تھے۔[1]

قدیم علمائے لغت کے نزدیک "زندیق" فارسی الاصل لفظ "زندیک" کا معرب ہے چنانچہ جوالیقی نے ابنِ درید سے نقل کیا ہے "قال ابن درید: قال ابو حاتم: الزندیق فارسی معرب"[2] ابن درید نے ابو حاتم کا قول نقل کیا ہے کہ زندیق فارسی کا لفظ ہے جو معرب ہو گیا ہے جہاں تک اس کے اشتقاق کا تعلق ہے:-

(الف) عربی کے قدیم اہلِ لغت کے دو خیال ہیں:-

۱۔ ابنِ درید نے ابو حاتم سے اس کی اصل "زندہ کرد" نقل کی ہے [زندہ کرد بمعنی عمل] یعنی وہ شخص جو دہر کی ہمیشگی کا قائل ہو۔

"قال ابنِ درید: قال ابو حاتم . . . . . کان اصلہ عندہ زندہ کرد۔ زندہ الحیاۃ وکرد: العمل اے یقول بدوام الدہر"[3]

۲۔ دوسرا قول جیسے صاحبِ قاموس نے لکھا ہے یہ ہے کہ یہ "زن دین" کا معرب ہے

---

[1] "دستور العلماء" اور "شرحِ مقاصد" کی شہادتیں آگے آ رہی ہیں

[2] و [3] جوالیقی:- المعرب من الکلام الاعجمی واصلاح ماتغلط بالعامۃ، صفحہ ۱۶۶ ـ ۱۶۷

یعنی عورتوں کا دین :-

"الزندیق . . . .ھو معرب زن دین لے دین المرأۃ"[۱]

(ب) عہدِ حاضر میں بھی اس کے ماخذ کے بارے میں دو رائیں ہیں :-

۱- عام رائے یہ ہے کہ یہ "زندیک" کا معرب ہے "زندیک" یا "زندی" بمعنی "زند" کو ماننے والا- جیسا کہ اوپر مذکور ہوا "زند" "اوستا" کی تفسیر کا نام ہے جو مجوسیوں کی کتاب مقدس تھی اور چونکہ پیروانِ مانی غیر مذہب کی الہامی کتابوں کی تاویل اپنے حسب منشا کیا کرتے، لہٰذا یہ لفظ اُن کے لئے (اور بعد میں مزدک کے پیروؤں کے لئے بولا جانے لگا)۔

"وقیل انه تعریب زندیک وھو الذی یعمل بموجب ما ھو مسطور بکتاب الزند"[۲]

کہا گیا ہے کہ یہ لفظ (زندیق) "زندیک" کا معرب ہے جو کتاب "زند اوستا" کے لکھے ہوئے کے بموجب عمل کیا کرتا تھا۔

۲- پروفیسر بیون کا خیال ہے کہ یہ ارامی زبان کے لفظ "صدیقا" کا مفرس ہے جو پیروانِ مانی کے مراتبِ پنجگانہ میں سے ایک مرتبہ کا نام تھا۔[۳]

قواعد تفریس کی رو سے حرف مشدد کی پہلی آواز "نون" سے بدل جاتی ہے جیسے "سبّت" کا بائے مشدد فارسی میں آکر "نب" سے بدل گیا [باقی حروف میں سے س شین سے اور ت ذال سے بدل گیا] اس طرح "سبّت" فارسی قدیم میں آکر "شنبذ" ہوگیا جو متداول

---

[۱] مجدالدین الفیروزآبادی : القاموس المحیط، الجزو الثالث صفحہ ۲۵۰ - ۲۵۱ (المطبع المصطفی البابی الحلبی بمصر- الطبعۃ الثانیہ ۱۳۷۱ھ)

[۲] السیدادی شیر رئیس اساقفہ سعرد الکلدانی : کتاب الالفاظ الفارسیہ صفحہ ۸

[۳] مانی کے متبعین کے پانچ مراتب تھے : المعلمین، المشمیسین، القبیسین، الصدیقین، اور السماعین- ان میں السماعین سب سے نیچے کا درجہ تھا، اس کے بعد "الصدیقین" کا مرتبہ تھا جو فقر و فاقہ، تجرد اور ریاضت و مجاہدہ کے باب میں مانویت کی پوری تعلیم پر عمل پیرا ہونے کی ذمہ داری لیتے تھے۔ اس طرح شدہ شدہ یہ "صدیقین" یا "زندیک" کا لفظ مانوی مذہب کے پیروؤں کے لئے بولا جانے لگا اور چونکہ مانوی ملحد سمجھے جاتے تھے اس لئے "زندیق" کا لفظ ملحد کے مترادف ہوگیا۔

فارسی میں "شنبہ" (بمعنی سنیچر) ہے [1]

اسی طرح ارامی کا "صدیقا" "زندیک" ہوگیا [ص ز سے، دال مشدد ند سے اور ق کاف سے بدل گئے]

زندیق کے مصادیق | اسلامی نظام مصطلحات میں "زندیق" کے مندرجہ ذیل مصداق تھے:۔

۱۔ ثنوی یعنی دو اصلوں (نور وظلمت یا یزدان واہرمن) کا قائل،

۲۔ دہریہ جو باری تعالیٰ (خالقِ کائنات) اور آخرت پر ایمان نہ رکھتا ہو، اور

۳۔ جو ظاہر میں مومن ہو مگر بباطن کافر۔

چنانچہ مجدالدین فیروزآبادیؒ نے "القاموس" میں لکھا ہے۔

"الزندیق = بالکسر منؔ الثنویۃ والقائل بالنور والظلمۃ اوؔ من لا یومن بالآخرۃ والربوبیۃ ومنؔ یبطن الکفر ویظہر الایمان" [2]

اسی طرح متاخرین میں تھانوی نے "کشاف اصطلاحات الفنون" میں لکھا ہے

"الزندیق = بالکسر وسکون النون وکسر الدال

۱۔ ثنوی کہ قائل دو صانع است وازاں ہر دو بنور وظلمت و یزدان واہرمن تعبیر کنند خالق خیر را یزداں گویند وخالق شر را اہرمن یعنی شیطان،

۲۔ وآں کہ بحق تعالیٰ وآخرت ایمان نداشتہ باشد،

۳۔ وآنکہ ایمان ظاہر کند ودر باطن کافر باشد" [3]

آخری زمانہ میں اس لفظ کا اطلاق مندرجہ بالا مصادیق میں سے صرف آخری مصداق کے ساتھ مخصوص ہوگیا چنانچہ "دستور العلماء" میں علامہ تفتازانی سے نقل کیا ہے [4]:۔

---

[1] Brown. E.G.- History of Persian Literature. Vol. I. P. 147

[2] مجدالدین الفیروزآبادی: القاموس المحیط الجزء الثالث صفحہ ۲۰۰-۲۰۱

[3] تھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون - الجزء الثالث صفحہ ۶۱۷

[4] دستور العلماء المجلد الثانی صفحہ ۱۵۶

"وفی شرح المقاصد وان کان اعترافہ بنبوۃ النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم واظہارہ شعائر الاسلام ویبطن العقائد التی ھی کفر بالاتفاق خص باسم الزندیق"

"شرح مقاصد" میں ہے اگر اُس شخص کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار ہو اور شعائر اسلام کا اظہار کرتا ہو مگر ایسے معتقدات باطن میں رکھتا ہو جن کے کفر ہونے پر علماء کا اتفاق ہے تو اُسے "زندیق" کے نام سے مخصوص کیا جائے گا۔

لیکن ابتداء میں بالخصوص مامون کے خلیفہ ہونے سے پہلے یہ لفظ "مانویوں" کے لئے مستعمل تھا جن کا مذہب "مانویت" اور "مزدکیت" و "اباحت" کی معجون مرکب تھا۔ زندقہ اسلام سے پہلے | اُصولاً "زندقہ" مانوی مذہب کا نام تھا، جس کی بنیاد مانی نے ڈالی تھی، "مانویت" ثنویت یا مجوسیت کی بے شمار شکلوں میں سے ایک شکل ہے۔ یہ مختلف شکلیں دو بڑی جماعتوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ وہ اشکال جو مجوسیت کے داخلی اختلافات کا نتیجہ ہیں جیسے مزدائیت، زرادشتیت، کیومرثیت، مزدکیت وغیرہ۔

۲۔ وہ اشکال جو مسیحیت اور مجوسیت کے درمیان تطبیق کی کوشش سے پیدا ہوئیں یا مجوسیت کے مسیحیت سے متاثر ہونے کے نتیجہ میں ظہور میں آئیں۔ ان میں تین شکلوں کی زیادہ شہرت ہوئی۔ مرقونیہ، دیصانیہ، اور مانویہ غرض "مانویت" مجوسیت اور مسیحیت کے درمیان سمجھوتے کے نتیجہ میں پیدا ہوئی، چنانچہ شہرستانی نے "الملل والنحل" میں لکھا ہے

"المانویۃ: اصحاب مانی بن فاتك ..... اخذ دینا بین المجوسیۃ والنصرانیۃ"[۱]

مانویہ: مانی بن فاتک کے پیروؤں کا نام ہے ..... مانی نے مجوسیت اور مسیحیت کے درمیان ایک مذہب جاری کیا۔

چنانچہ وہ ایک جانب زردشت کو نبی مانتا تھا اور دوسری جانب سیدنا حضرت عیسیٰ علی نبینا

[۱] شہرستانی: الملل والنحل القسم الاول صفحہ ۶۱۹ (مطبوعہ ازہر الطبعۃ الاولی)

وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی نبوت کا بھی قائل تھا لہٰذا اُس نے مجوس سے اُن کی "ثنویت" (عالم کی دو اصلوں نور و ظلمت کے عقیدہ) کو لیا اور مسیحیت سے اُس کی رہبانیت کو لیکن زیادہ زور اپنے مسالک کے وجودیاتی COSMOGONICAL اور کونیاتی ONTOLOGICAL پہلوؤں پر دیتا تھا اور اسی کو مقالات نویسوں نے نمایاں کیا ہے چنانچہ شہرستانی نے ابو عیسیٰ ورّاق سے (جو خود مجوسی الاصل تھا اور اس لئے اس مذہب کے مختلف فرقوں کی تعلیمات سے واقف تھا) نقل کیا ہے:

"ان الحکیم مانی زعم ان العالم مصنوع مرکب من اصلین قدیمین احدهما النور والآخر ظلمة - وانهما ازلیان لم یزالا ولن یزالا ..... وهما مع ذلك فی النفس والصورة والعقل والتدبیر متضادان وفی الحیز متحاذیان تحاذی الشخص والظل"[1]

حکیم مانی کا خیال تھا کہ عالم دو اصلوں سے بنا ہے جو قدیم ہیں: - ایک نور دوسرا ظلمت اور یہ کہ یہ دونوں ازلی ہیں ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ دونوں نفس، صورت، عقل اور تدبیر میں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور حیز میں ایک دوسرے کے اس طرح مقابل ہیں جس طرح شخص OBJECT اور اُس کا ظل یا سایہ IMAGE ہوتے ہیں۔

اس کے ساتھ اُس نے مسیحی رہبانیت کو جو مغربی ایشیا کے خصوصی اور دوسرے قدیم غیر الہامی مذاہب کے زہد یا فرار عن الحیاۃ کا نصرانی چربہ تھی، اسی وجودیاتی تفکیر کے ساتھ ملا دیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:-

دنیا کے دیگر مذاہب کی طرح مجوسیت و ثنویت میں بھی اہم ترین مسئلہ کائنات کے آغاز و انجام کا تھا۔ مجوسیت کے نزدیک کائنات کا آغاز ان دونوں اصلوں (نور و ظلمت) کے امتزاج سے ہوا اور انجام اس ممزوجہ سے دونوں کے افتراق یا نور کے ظلمت سے خلاصی پانے پر ہوگا۔ اور نور کے ظلمت سے استخلاص میں جن چیزوں سے مدد ملتی ہے اُن میں سب سے

---

[1] شہرستانی: الملل والنحل صفحہ ۶۲۰

اہم "اعمال صالحہ" ہیں، چنانچہ ابن الندیم نے "کتاب الفہرست" میں مانوی مذہب کی تعلیمات کے ضمن میں لکھا ہے

" قال مانی: ثم خلق الشمس والقمر لاستصفاء مافی العالم من النور... بتصاعد ذلک مع مایرتفع من التسابیح والتقادیس والکلام الطیب واعمال البر قال فیدفع ذلک الی الشمس ثم ان الشمس تدفع ذلک الی نور فوقھا ... فیسیر فی ذلک العالم الی النور الاعلی الخالص[1]"

مانی نے کہا ہے: خالق تعالیٰ نے سورج اور چاند کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ عالم میں جو کچھ نور ہے اُسے صاف اور منتخب کریں...... پھر تسبیح و تقدیس، کلام نیک اور افعال خیر کے جو نیک نتائج بلند ہوتے ہیں اُن کے ہمراہ یہ کائنات کا نور بھی بلند ہوتا ہے اور سورج تک پہنچتا ہے۔ پھر سورج اسے اپنے اوپر والے نور کی طرف منتقل کر دیتا ہے..... پس وہ اس عالم میں خالص نور اعلیٰ کی طرف چلا جاتا ہے۔

اس طرح انسانوں کی نیکوکاری کے نتیجہ میں نور کا بہت بڑا حصہ ظلمت سے خلاصی پاکر نورِ اعلیٰ میں جا ملے گا صرف ایک قلیل حصہ باقی رہ جائے گا جو ملائکہ کی جدوجہد سے آخر کار آزاد ہو جائے گا۔ اس کے بعد ظلمت ایک قبر میں دفن کر دی جائے گی

بہر حال ثنوی و مجوسی مفکرین کی تفکیری سرگرمیوں کا محور یہی نور و ظلمت کے امتزاج اور آخر میں نور کے ظلمت سے خلاصی پانے کے مسائل تھے، چنانچہ شہرستانی نے لکھا ہے:۔

"ومسائل المجوس کلھا تدور علی قاعدتین احدھما بیان سبب امتزاج النور بالظلمۃ والثانیۃ سبب خلاص النور من الظلمۃ

مجوسی مذہب کے اختلافی مسائل دو اُصولوں پر گردش کرتے تھے ایک یہ کہ نور و ظلمت کے امتزاج کا سبب (کیا ہے؟) اور دوسرے یہ کہ نور کے ظلمت سے چھٹکارا پانے کا سبب (کیا ہوگا؟)

---

[1] ابن الندیم: کتاب الفہرست صفحہ ۴۶۱

وجعلوا الامتزاج مبدأ والخلاص معاداً[1] امتزاج کو وہ مبدء بتاتے تھے اور خلاص اور چھٹکارے کو معاد۔

جس طرح نیک اعمال نور کے ظلمت سے خلاصی پانے کے لئے ساز گار ہیں اسی طرح بدکاری نور کے ظلمت کے پھندے میں مزید جکڑنے کا موجب ہے اور اکثر بدکاریاں لین دین، شادی بیاہ اور دوسرے اجتماعی وظائف میں جھگڑوں اور نزاعات کے باعث پیدا ہوتی ہیں لہذا مانویت اجتماعی زندگی کی ہمت افزائی نہیں کرتی۔ مگر چوں کہ نہ تو جنسی تقاضوں کو دبایا جاسکتا ہے اور نہ معاشی و معاشرتی مقتضیات سے صرفِ نظر کیا جاسکتا ہے، لہذا بعد میں "مزدکیت" نے جو مانویت ہی کی ایک نئی شکل تھی اس اشکال کا حل زر، زن، زمین کے اشتراک میں ڈھونڈ لیا اور اس طرح محرمات کی حرمت بالکل اٹھ گئی اور اس نے انتہائی گھناؤنی شکل اختیار کرلی۔ یہی موقف بعد میں پیروانِ مانی نے بھی اختیار کیا جس کی تفصیل عباسی خلیفہ مہدی کی زبانی آگے چل کر تحریر ہوگی۔

بہر حال مانویوں کا یہ اجتماعیت بے زار مسلک مزدائیت کے لئے جو ساسانی عہد میں ایران کا مملکتی مذہب تھی سم قاتل تھا لہذا موبدوں (مجوسی پیشواؤں) نے بڑی شدت سے اس کی مخالفت کی۔ یہاں تک کہ شاپور جو شروع میں مانی کا عقیدت مند تھا، اُس سے اتنا برگشتہ ہوگیا کہ اُسے جلاوطن کر دیا اور تاکید کر دی کہ دوبارہ اس سرزمین پر قدم نہ رکھے۔ لہذا وہ ماوراء النہر چلا گیا۔ شاپور کے مرنے پر ہرمز اور اُس کے مرنے پر بہرام ایران کا بادشاہ ہوا۔ بہرام لہو ولعب کا رسیا تھا لہذا مانی کے پیروؤں نے جو ایران میں باقی رہ گئے تھے، اسے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھانے اور ایران واپس آنے کا مشورہ دیا۔ مانی آیا۔ مگر نقضِ وعدہ کے الزام میں بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا اور اس کے پیرو چُن چُن کر مارے گئے۔ لہذا مانوی ماوراء النہر چلے گئے۔ تاہم[2] یہ باور

[1] شہرستانی: الملل والنحل القسم الاول صفحہ ۵۶۶ - ۵۶۷ -
[2] ابن الندیم: کتاب الفہرست صفحہ ۴۷۲

کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ پھر بھی کچھ مانوی ایران میں رہ گئے جنھوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو جاری رکھا، اگرچہ خفیہ طور پر۔

اس کے بعد مجوسی مذہب میں اور فرقے پیدا ہوئے، مگر ان میں سب سے اہم "مزدکیت" تھا جو نوشیرواں کے باپ قباد کے عہد میں پیدا ہوا۔ بظاہر "مزدکیت" ایک مستقل مذہب تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ "مانویت" کی تجدید تھا کیوں کہ دونوں میں زیادہ فرق نہیں ہے چنانچہ شہرستانی نے ابو عیسیٰ وراق سے نقل کیا ہے :۔

حکی الوراق ان قول المزدکیۃ کقول کثیر من المانویہ فی الکونین والاصلین[1]	ابو عیسیٰ وراق نے نقل کیا ہے کہ کونین و اصلین (نور و ظلمت) کے باب میں مزدکیہ فرقے کے عقائد و اقوال بہت سے مانویوں کے مانند ہیں۔

صرف نور و ظلمت کے طریقۂ امتزاج کے بارے میں کچھ فرق تھا۔ لیکن زیادہ فرق اجتماعی تعلیمات میں تھا، بالخصوص دو باتوں میں :۔

ا۔ مزدک کا خیال تھا کہ لوگوں میں مخالفت جو آخرکار جدال و قتال کی شکل اختیار کر لیتی ہے صرف زر، زن اور زمین کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، لہذا اُس نے یہ سب چیزیں لوگوں میں مشترک کر دیں جیسا کہ شہرستانی نے لکھا ہے :۔

"وکان مزدک ینھی الناس عن المخالفۃ والمباغضۃ والقتال۔ ولما کان اکثر ذلک یقع بسبب النساء والاموال، فاحل النساء واباح الاموال وجعل الناس شرکۃ فیھا کاشتراکھم	مزدک لوگوں کو مخالفت و دشمنی اور جدال و قتال سے منع کرتا تھا اور چوں کہ اکثر جھگڑے عورتوں اور مال کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں، لہذا اُس نے عورتوں کو (سب مردوں کے لئے) حلال کر دیا اور مال و دولت کو (سب کے لئے) جائز کر دیا اور مال

---

[1] شہرستانی : الملل والنحل : القسم الاوّل صفحہ ۶۳۱

فی الماء والنار والکلاء[1] (دولت اور عورتوں کو) لوگوں میں مشترک کر دیا جس طرح پانی آگ اور چراگاہیں سب میں مشترک ہیں

۲۔ وہ اجتماعی زندگی کی بھی ہمت شکنی کرتا تھا، کیوں کہ ظاہر ہے جتنی انسانی آبادی بڑھے گی گناہ و آثام کی بھی کثرت ہوگی جس سے نور کو ظلمت کے غلبہ سے خلاصی پانے میں دشواری ہوگی۔ لہذا وہ انسانی نسل کو ختم کرنے کی ترغیب دیتا تھا اور اپنے پیروؤں کو قتل کرنے تک کا حکم دیتا تھا، چنانچہ شہرستانی نے لکھا ہے :۔

"وحکی انہ امر بقتل الانفس لیخلصها من الشر ومزاج الظلمة[2]" یہ بھی حکایت کی گئی ہے کہ وہ لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دیتا تھا تاکہ وہ بُرائی اور ظلمت کے امتزاج سے چھٹکارا پائیں۔

ظاہر ہے کوئی دانشمند فرد یا سماج اس کی اجازت نہیں دے سکتا، لہذا حکومت تو درکنار عوام کا بھی اس سے بے زار ہونا فطری تھا۔

اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی جو رعایا کو مذہبی آزادی دینے میں انتہائی فراخ دل تھے، زندقہ کے استیصال پر کمربستہ ہونا پڑا۔

اسلام میں زندقہ کی ابتدا (الف) ایران میں مانویوں کی واپسی :۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ بہرام بن ہرمز کی سخت گیری سے خائف ہو کر پیروان مانی ماوراء النہر چلے گئے تھے جہاں صدیوں تک وہ خان کے کنف حمایت میں رہے مگر جب اکاسرہ کی سلطنت کے استحکام میں ضعف آیا اور کچھ دن بعد عرب اس پر قابض ہو گئے تو فاتحین نے دوسرے مذاہب کے پیروؤں کو جو آزادی دی تھی، مانویوں نے بھی اُسے سنا۔ لیکن چوں کہ بہرام کی سخت گیری اُنھیں ابھی بھولی نہیں تھی، لہذا احتیاطاً وہ ایک صدی تک ایران واپس آنے کی جرأت نہ کر سکے۔

[1] و [2] شہرستانی، الملل والنحل : القسم الاول صفحہ ۶۳۱-۶۳۲

البتہ جب دوسری صدی ہجری کے آغاز میں کچھ دن بعد خالد بن عبداللہ القسری عراق کا گورنر مقرر ہوا تو چوں کہ وہ مانویوں کے متعلق دل میں نرم گوشے رکھتا تھا، بلکہ غالباً خود بھی بباطن "زندیق" (مانوی) تھا جیسا کہ ابن الندیم لکھتا ہے :-

" فانہ کان یرمی اعنی خالد بالزندقۃ وکانت امہ نصرانیۃ "[۹]	وہ یعنی خالد بن عبداللہ القسری زندقہ کے ساتھ متہم تھا اور اُس کی ماں عیسائی مذہب کی تھی۔

تو مانویوں نے ایران و عراق واپس آنے کی جرأت کی جہاں وہ تقریباً مہدی اور ہادی کے زمانہ تک مقیم رہے اور اس عرصہ میں اپنی ملحدانہ سرگرمیوں کے ذریعے مسلمان حتیٰ کہ عرب جوانوں کو بھی گمراہ کرتے رہے تا آنکہ مہدی اور ہادی نے اس کا استیصال کیا۔ مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

(ب) الحادو فکری بےراہ روی کا آغاز : جب ایک جانب اسلام کی معقولیت پسندی و انسان دوستی اور دوسری جانب مجاہدینِ اسلام کی سرفروشی کے نتیجہ میں دشمنانِ اسلام اس دینِ متین کو مٹانے سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے اس کے اندر غیر اسلامی تعلیمات کے جوڑ پیوند لگانا شروع کئے جو اکثر حالات میں کفر و الحاد کے مترادف ہوتے تھے۔ یہ نامبارک کام زیادہ تر مجوسی الاصل نو مسلموں نے انجام دیا۔ چنانچہ امام عبدالقاہر بغدادی نے لکھا ہے :-

وما ظہرت البدع والضلالات فی الادیان الا من ابناء السبایا[۱۰]	مذاہب و ادیان میں جو بھی بدعتیں اور گمراہیاں پیدا ہوئیں وہ انھیں جنگی قیدیوں کی اولاد نے داخل کی تھیں۔

افساد فی الدین کی اس سعی مشئوم میں سرفہرست عبداللہ بن سبا کا نام ہے جس نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ میں " روح اللہ کے حلول " کا دعویٰ کیا۔ حضرت علیؓ نے بعض سیاسی مصالح کی بنا پر اُسے سخت سزا دینے کے بجائے صرف جلا وطن کرنے پر اکتفا کیا۔ مگر اس طرح اسلام کے اعتقادی نظام میں " حلول " کا عقیدہ سرایت کر گیا جو ایک طرح سامانی

---

[۹] ابن الندیم : کتاب الفہرست صفحہ ۴۷۳

[۱۰] عبدالقاہر بغدادی : الفرق بین الفرق صفحہ ۲۷

وکیت کی " فرکیانی " کا جدید ایڈیشن تھا[1]۔

ایرانی تاجدار اسی " فرکیانی " کے سہارے خود کو دیوتا اور خدا کی آسمانی نسل سے ہونے کا دعویٰ کیا کرتے تھے چنانچہ حاجی آباد کے کتبہ میں اردشیر بابکان کا بیٹا شاپور اپنے بارے میں لکھتا ہے :-

" یہ میرا فرمان ہے ، پرستار مزدا ، شاپور کا ، جو دیوتاؤں کی صف میں ہے ، ایران اور غیر ایران کے بادشاہوں کا بادشاہ ، اور خدا کی آسمانی نسل سے ہے "

مگر یہ انداز فکر اسلامی مزاج کے منافی تھا ، کیوں کہ تو یہاں ملوکیت تھی اور نہ روح ملوکیت ۔ پھر سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد امجاد کا رشتہ تو بی بی شہر بانو کے ذریعہ قدیم ایرانی تاجداروں سے جوڑا جا سکتا ہے اور انھیں اس " فرکیانی " کا وارث بتایا جا سکتا تھا ، لیکن پہلے تین اماموں (سیدنا حضرت علی ، امام حسن اور امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے استحقاق امامت کا ثبوت اس سے کس طرح مل سکتا تھا ، لہذا

---

[1] " فرکیانی " کا عقیدہ ایران میں صدیوں سے پرورش پا رہا تھا ، چنانچہ " کارنامک ارتخشیر پاپکان " میں مذکور ہے کہ جب اردوان اشکانی اردشیر کے تعاقب میں روانہ ہوا تو دو مرتبہ اُدھر سے آنے والوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اردشیر تو اردوان کی کنیز گلنار کے ہمراہ آندھی طوفان کی رفتار سے اُڑا جا رہا ہے ، مگر " فرکیان " ایک خوبصورت مینڈھے کی شکل میں اس کے پیچھے دوڑ رہی ہے لیکن ہنوز اُس تک پہنچ نہیں پائی ۔ دستور (وزیر) نے اس کی یہ توجیہ کی کہ ابھی اردشیر کو آسمانی تائید حاصل نہیں ہوئی لہذا ابھی اُمید ہے کہ اُس کی بادشاہت پر تائید یزدانی کی توثیق سے پہلے اُسے گرفتار کیا جا سکے اور حکومت اُردوان ہی کے قبضہ میں رہے ۔ مگر جب جب تیسری مرتبہ آنے والوں نے بتایا کہ وہ مینڈھا اردشیر کے پیچھے جا بیٹھا ہے تو پھر دستور اعظم مایوس ہوگیا اور اردوان کو مشورہ دیا کہ اب تعاقب بے کار ہے کیوں کہ " فرکیانی " (آسمانی تائید) اب اردشیر کو حاصل ہو چکی ہے اور اس کی بادشاہت پر کارکنان قضا و قدر نے بھی مہر توثیق ثبت کر دی ہے ، بقول فردوسی

کرمتش بیں پشت او در نشست — ازیں تافتن باد باشد بدست
چو بشنید ز اردواں ایں سخن — بدانست کاں کار او شد کہن

بعد میں دستور اعظم سے معلوم ہوا کہ یہ مینڈھا (غرم) ہی جو پہلے اردشیر کے پیچھے دوڑ رہا تھا اور آخر میں اس کے پیچھے جا بیٹھا " فرکیانی " ہے جو تائید آسمانی کی علامت ہے فردوسی لکھتا ہے ۔

بدستور گفت آں زماں اردواں — کہ ایں غرم بارے چرا شد رواں
چنیں داد پاسخ کہ ایں فرّ اوست — بشاہی و نیک اختری پر اوست

فتنہ پرداز دشمنان دین نے "حلول" کا ڈھکوسلا گھڑا کہ "روحِ الوہیت" نے مختلف پیغمبروں کے اجسادِ مطہرہ سے منتقل ہو کر حضرت علیؓ اور آن کی اولاد امجاد میں اور آخر کار ان مدعیان دروغ بافت کے اندر حلول کیا اور اس ڈھکوسلے سے ان لوگوں کا مقصد افساد فی الدین تھا، چنانچہ امام عبدالقاہر بغدادی نے لکھا ہے :-

"الحلولیة . . . . غرض جمیعها القصد الی افساد القول بتوحید الصانع . . . . وذلك أن السبائیة والبیانیة والجناحیة والخطابیة والنمیریة باجمعها حلولیة . . . . اما السبائیة فانما دخلت فی جملة الحلولیة لقولها بان علیاً صار الٰها بحلول روح الالٰه فیه وکذلك البیانیة زعمت ان روح الالٰه دارت فی الانبیاء والائمة حتی انتهت الی علی ثم دارت الی محمد بن الحنفیة ثم صارت الی ابنه ابی هاشم ثم حلت بعده فی بیان بن سمعان وادعوا بذلك الٰهیة بیان بن سمعان [1]"	حلولیہ . . . . اس (انداز فکر کے سب فرقوں) کا مقصد توحید باری تعالیٰ کے عقیدہ کو خراب کرنا تھا . . . . . اس کی تفصیل یہ ہے کہ سبائیہ، بیانیہ، جناحیہ، خطابیہ، نمیریہ سب کے سب حلولیہ (حلول الوہیت) INCARNATION کے قائل ہیں۔ جہاں تک فرقہ سبائیہ کا تعلق ہے وہ فرقہ حلولیہ میں اس وجہ سے داخل ہے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ روح الوہیت کے حضرت علی میں حلول کرنے کی وجہ سے وہ (حضرت علی) خدا بن گئے۔ اسی طرح فرقہ بیانیہ کا گمان ہے کہ روح الوہیت انبیاء اور ائمہ کرام میں منتقل ہوتی ہوئی حضرت علی تک پہنچی پھر محمد ابن حنفیہ میں منتقل ہوئی پھر ان کے صاحبزادے ابی ہاشم میں اور ان کے بعد اس نے بیان بن سمعان میں حلول کیا اور اس وجہ سے وہ بیان بن سمعان کی الوہیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

کچھ ایسا ہی اندازِ فکر "حلولیہ" کے باقی فرقوں جناحیہ، خطابیہ اور نمیریہ وغیرہ کا تھا۔

سائنٹیفک طور پر عبداللہ بن سبا نے توریت "وصی" کا تصور ڈھونڈ کر شیعان علی کو بتایا جس

---

(۱) امام عبدالقاہر بغدادی : الفرق بین الفرق ص ۱۵۴

سے انھوں نے اپنے مذہب کی تائید و تبلیغ میں کام لیا۔ مرجیہ نے یہود سے **لا تضر مع الایمان معصیۃ** کا تصور لیا۔ سوسن نصرانی سے معبد جہنی نے "قدر" کا عقیدہ لے کر اس بدعت کی تبلیغ کی۔ اور دوسری صدی کے آغاز میں جعد بن درہم نے سمعان یہودی سے خلق توریت کا عقیدہ لے کر خلق قرآن کے فتنہ کا آغاز کیا۔

مگر ان سب میں خطرناک ترین "حلول" کا عقیدہ تھا۔ جس نے عباسی خلافت کے زمانہ میں بڑی خطرناک شکل اختیار کرلی۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔

(ج) ۔ زنادقہ کی ابتداء :۔ حلول و تناسخ کے قائل ملاحدہ کے علاوہ دوسری صدی شروع ہوتے ہی زنادقہ بھی ملنے لگتے ہیں۔ سب سے پہلا شخص جو اس بدعت کی سربراہی کرتا ہوا ملتا ہے جعد بن درہم ہے۔ وہ "خلق قرآن" اور "انکار صفات باری تعالیٰ" کے علاوہ زندیق بھی تھا۔ چنانچہ ابن الندیم نے "کتاب الفہرست" کے نویں مقالہ میں

"اسماء وذکر رؤساء المنانیۃ فی دولۃ بنی العباس وقبل ذلک"

کے ذیلی عنوانات کے تحت دولۃ اسلام میں فرقہ مانویہ کا پہلا رئیس جعد بن درہم ہی کو بتایا ہے۔ جو آخری اموی خلیفہ مروان الحمار کا استاد تھا۔ جعدی کے زیر تعلیم مروان بھی زندیق ہوگیا چنانچہ ابن الندیم اسی ذیلی عنوان کے تحت آگے چل کر لکھتا ہے۔

"کان الجعد بن درھم الذی ینسب الیہ مروان بن محمد فیقال مروان الجعدی وکان مودباً لہ ولولدہ فادخلہ فی الزندقۃ"[1]

جعد بن درہم جس کی طرف (آخری مروانی خلیفہ) مروان بن محمد منسوب ہے اور اسی وجہ سے اسے مروان جعدی کہا جاتا ہے اس مروان جعدی اور اس کے بیٹے کا استاد تھا۔ لہٰذا اس نے اسے زندیق بنالیا۔

بہرحال دوسری صدی کے ربع اول میں ابن الندیم نے تین شخصوں کو زندیق بتایا ہے

[1] ابن الندیم : کتاب الفہرست صفحہ ۴۷۲۔

۱۔ جعد بن درہم جو بدعتی (خلقِ قرآن) اور انکارِ صفاتِ باری کے قائل ہونے کے علاوہ پکا زندیق تھا۔ جیسا کہ ابن الاثیر نے لکھا ہے۔

"قیل ان الجعد کان زندیقا وعظہ میمون بن مھران فقال لشاہ قباذ احب الیّ مما تدین بہ" [1]

کہا گیا ہے کہ جعد بن درہم زندیق تھا۔ ایک مرتبہ میمون بن مہران نے اسے وعظ و نصیحت کی تو کہنے لگا کہ شاہ قباذ مجھے اس مذہب سے زیادہ عزیز ہے جس کے تم پیرو ہو

۲۔ مروان الحمار آخری اموی خلیفہ جو جعد کا شاگرد تھا اور اسی کی صحبت میں زندیق ہوا۔ بلکہ حافظ ابن تیمیہ کی تصریح کے مطابق اسی زندقہ کی نحوست میں اپنی جان اور حکومت کھو بیٹھا۔

۳۔ خالد بن عبداللہ القسری جس کے بارے میں ابن الندیم لکھتا ہے۔

"انہ کان یرمی (اعنی خالد) بالزندقۃ وکانت امہ نصرانیۃ" [2]

وہ یعنی خالد بن عبداللہ القسری کو زندیق ہونے کی تہمت لگائی جاتی تھی اور اس کی ماں مسیحی المذہب تھی۔

خالد بن عبداللہ القسری ہی نے زندقہ کی طرف میلان کی بنا پر مانویوں کو تین صدی کے بعد عراق میں بسنے کی اجازت دی تھی۔ ابن الندیم ان مانویوں کی واپسی کے بارے میں لکھتا ہے

---

(۱)۔ ابن الاثیر: الکامل الجزو الخامس ص ۱۶۰

(۲)۔ ابن الندیم: کتاب الفہرست ص ۴۷۳

"فعادوا الی هذه البلاد .. .. . فان خالد بن عبداللہ القسری کان یعنی بهم"[1]	پس یہ (مالوی فرقہ کے) لوگ ان شہروں (عراق وغیرہ) کی طرف واپس آئے ... کیونکہ (عراق کا گورنر) خالد بن عبداللہ القسری ان لوگوں کا بہت زیادہ خیال کرتا تھا۔

ہشام کے حکم سے خالد بن عبداللہ القسری نے جعد بن درہم کو انکارِ صفاتِ باری تعالیٰ کے الزام میں قیدخانہ میں ڈالدیا تھا۔ جب قید کی مدت طویل ہوگئی تو جعد کے اہل و عیال نے ہشام سے جاکر شکایت کی۔ ہشام سمجھتا تھا کہ خالد نے اُسے قتل کرڈالا ہوگا۔ اب جو معلوم ہوا تو اس نے اُسے حکم بھیجا کہ جعد کو قتل کردے[1] اور خالد بن عبداللہ القسری نے (غالباً بادلِ ناخواستہ) بقرعید کے دن اُسے ڈرامائی انداز میں قتل کردیا۔

پچھلی قسط میں ذکر آچکا ہے کہ بصرہ میں چھ متکلموں کی ایک جماعت تھی: واصل بن عطار، عمرو بن عبید، عبدالکریم بن ابی العوجا، صالح بن عبدالقدوس، بشار بن برد شاعر اور ایک ازدی شخص جس کے مکان پر یہ لوگ بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ ان میں سے واصل اور عمرو بن عبید معتزلی ہوگئے۔ ازدی میزبان نے بدھ مت ("سمنیت") اختیار کرلیا[3]۔

---

[1] ابن الندیم: کتاب الفہرست صفحہ ۴۷۲

[2] ایضاً ص ۴۷۳

[3] ابوالفرج اصفہانی۔ کتاب الاغانی

عبدالکریم بن ابی العوجاء (جسے ابن الندیم نعمان ابن ابی العوجا بتاتا ہے؟) صالح بن عبدالقدوس اور بشار بن برد کو ابن الندیم زنادقہ کا رئیس اور زندقہ کا علمبردار و ترجمان لکھتا ہے[۳]۔ غالباً اس زمانہ میں ان تین کے علاوہ اور بھی زنادقہ تھے جو بظاہر مسلمان تھے۔ اور بباطن زندیق، چنانچہ ابن الندیم

"ومن رؤساهم المتکلمين الذين يظهرون الاسلام ويبطنون الزندقة"

کے زیر عنوان لکھتا ہے۔

"ابن طالوت، ابو شاکر، ابن اخی شاکر، ابن الاعدی، الحریزی نعمان بن ابی العوجاء (غالباً عبدالکریم بن ابی العوجاء) صالح بن عبدالقدوس[۴]"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے خالد بن عبداللہ القسری کی پشت پناہی اور حمایت سے اور بعد میں امویوں اور عباسیوں کی خانہ جنگی نیز ابو مسلم وغیرہ کی بغاوت اور علویوں کے خروج سے قوی دل ہو کر ان لوگوں نے جارحانہ طور پر اپنے مذہب (مالویت) کی تائید میں کتب و رسائل لکھنا اور متکلمین اسلام نے ان کے رد میں جو کچھ لکھا تھا اس کا کاٹ کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ بن الندیم ان کے ناموں کی فہرست دینے کے بعد ان کی دعوتی سرگرمیوں کے بارے میں لکھتا ہے:-

"وھؤلاء کتب صنفاة فی نصرة الاثنین ومذاھب اھلھا وقد نقضوا الکتبا کثیرة" — اور ان لوگوں (زنادقہ کے پیشوا اور ترجمانوں) نے "ثنویت" (نور و ظلمت

---

(۳) - ابن الندیم: کتاب الفہرست ص ۴۷۳

(۴) - ایضاً صفحہ ۴۷۳

صنفھا المتکلمون فی ذلک"
(ابن الندیم۔ کتاب الفہرست ص۴۷۳)

کے عقیدہ) اور اس کے ماننے والوں کے مذاہب کی تائید و نصرت میں کتابیں تصنیف کیں۔ نیز ان کتابوں کے رد بھی لکھے جنھیں اس باب میں متکلمین اسلام نے مرتب کیا تھا۔

اس تفصیل سے واضح ہوجاتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے ثلث اول میں یعنی مامون کی تخت نشینی سے سکستر سال پہلے زنادقہ کی سرگرمیوں نے بڑی شدت اختیار کرلی تھی۔ (باقی آئندہ)

سمرقند میں امام بخاریؒ کا دوازدہ سالہ جشنِ ولادت

(سعید احمد اکبر آبادی)

گذشتہ ماہ اگست میں سمرقند کے مشہور اسلامی اور تاریخی شہر میں حضرت امام محمد بن اسماعیل البخاری المتولد ۱۹۴ھ والمتوفی ۲۵۶ھ کا دوازدہ صد سالہ جشنِ ولادت جس کا ذکر ہندوستان کے اخبارات میں آچکا ہے، بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے منایا گیا اس کا اہتمام و انتظام مسلمانوں کے اُن مذہبی اداروں نے مِل جل کر کیا تھا جو سوویت روس کے ماتحت ایشیا متوسطا ور قازقستان اور سائبیریا، سوویت روس کے یورپین حصہ میں شمالی قفقاز اور اس کے پچھلے حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن کی مجموعی تعداد ستو کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ ان میں سب سے بڑا مرکزی اور فعال ادارہ وہ ہے جو ادارۂ دینیہ برائے مسلمانان ایشیائے متوسط و قازاقستان کہلاتا ہے اس کا صدر دفتر ازبکستان کے دار الحکومت شہر تاشقند میں ہے اور اس کے صدر سوویت روس کے نہایت مشہور اور بلند پایہ عالم و فاضل مفتی ضیاء الدین باباخان ہیں، چنانچہ اس جشن کے اہتمام و انتظام کے لئے جو تیاری کمیٹی بنی تھی اُس کے صدر بھی مفتی صاحب موصوف تھے اور انھیں کی طرف سے جشن میں شرکت کے دعوت نامے بھیجے گئے تھے، یہ جشن ۲۰ر اگست سے ۲۳ر اگست تک جاری رہا اور اس میں مذکورۂ بالا ملکی اداروں کے نمائندہ حضرات کے علاوہ بیرونِ ملک سے چھبیس ۲۶ ممالک کے وفود نے شرکت کی جن کے نام حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق حسب ذیل ہیں: افغانستان، انڈونیشیا،

اُردن، پاکستان، بنگلہ دیش، بلغاریا، تنزانیا، ٹیونس، توحو، سری لنکا، سوڈان، سنغال، شاد، صومالیہ، عراق، کویت، لیبیا، لبنان، مملکت عربیہ سعودیہ، مملکت جمہوریہ مصر مراکش، نائجیریا، ہندوستان اور یمن، ہندوستان کی طرف سے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور ایڈیٹر برہان دونوں نے مفتی ضیاءالدین باباخاں کے شخصی دعوت نامہ پر شرکت کی۔ مہانوں کے قیام کا انتظام سمرقند ہوٹل میں تھا جو یہاں کا سب سے بڑا اور نہایت شاندار ہوٹل ہے۔

کانفرنس کا افتتاح ۲۰؍ اگست کو دس بجے صبح یوبیلونی نام کے ایک نہایت وسیع اور اور کشادہ کانفرنس ہال میں ہوا جو الغ بیگ کے قدیم تاریخی مدرسہ کی عظیم الشان عمارت کے بالکل سامنے واقع ہے، جلسہ کا آغاز قرآن مجید کی تلاوت سے ہوا۔ اس کے بعد مفتی ضیاءالدین باباخان نے خیر مقدمی تقریر کی۔ اُس کے جواب میں ہر وفد کے ایک ایک شخص نے شکر و سپاس کا اظہار کیا۔ اس کے بعد مفتی ضیاءالدین باباخان نے امام بخاری پر ایک طویل فاضلانہ مقالہ عربی زبان میں پڑھا اب بارہ بج گئے تھے، اس لئے پروگرام کے مطابق سب لوگ ٹورسٹ بسوں اور کاروں کے ذریعہ خرتنگ کے لئے روانہ ہوگئے۔ یہ مقام سمرقند سے بیس کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے کہنے کو پہلے بھی گاؤں تھا اور اب بھی ایک قریہ ہی ہے، لیکن اس کا سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ امام بخاری جیسا محدث عظیم المرتبت اس کی خاک میں آسودۂ سکون ہے، یہ قبر شروع سے محفوظ چلی آرہی اور مرجع عوام و خواص رہی ہے، لیکن ابھی حال میں اس کو وسیع مقبرہ کی شکل میں تعمیر کیا گیا ہے، قبر بالکل سادہ ہے، لیکن سرہانے کی طرف ایک طویل سیاہ پتھر کا کتبہ لگا ہوا ہے جس پر عربی زبان میں امام بخاری کا تعارف کرایا گیا ہے، قبر پر ایک شامیانہ نما خوبصورت مگر سادہ عمارت حال میں بنی ہے مقبرہ کے پیچھے ایک مسجد بھی زمانہ قریب کی تعمیر ہے جو روسی عمارتوں کی طرح سادہ مگر سبک اور مضبوط ہے۔ اس مسجد کا صحن اور اندرونی حصہ اتنا بڑا ہے کہ ایک ہزار آدمی اس میں نماز ادا کر سکتے ہیں، روسی عمارتوں کی عام خصوصیت کے مطابق مسجد کے ساتھ ایک باغیچہ بھی ہے اور جنوب کی جانب جہاں سے مسجد میں داخل ہوتے

ہیں، چند بڑے بڑے کمروں کی مع ان کے برآمدوں کے ایک قطار ہے یہ کمرے ضروری فرنیچر، مثلاً قالین، غالیچے اور تکیوں سے آراستہ ہیں اور ان کا مقصد یہی ہے کہ کوئی شخص اگر دور دراز سے امام بخاری کے مزار کی زیارت کے لئے آئے تو وہاں قیام کر سکے،

خرتنگ پہنچ کر سب لوگ امام بخاری کے مزار پہ حاضر ہوئے، پہلے بخارا ہی کے ایک نہایت خوش الحان قاری نے تلاوت قرآن کی، پھر عربی کا ایک قصیدہ ترنم کے ساتھ سنا کر امام عالی مقام کی بارگاہِ عقیدت میں پیش کیا گیا اور اس کے بعد ہر شخص فاتحہ و سلام میں مشغول ہو گیا، یہ پورا منظر بے حد رقت انگیز تھا، لوگ زار و قطار رو رہے تھے اور آہ و فغاں کر رہے تھے، بعض بعض کی تو ہچکی بندھ گئی تھی، اب ظہر کی اذان ہو چکی تھی، اس لئے سب لوگ مسجد میں آ گئے، اس موقع پر مقامی مسلمان بھی سینکڑوں کی تعداد میں آ گئے تھے - ان سب نے جماعت سے نماز ادا کی، اس وقت پوری مسجد اندر اور باہر بھری ہوئی تھی اور عید کی سی چہل پہل نظر آتی تھی، نماز کے بعد لنچ کا انتظام یہیں تھا اور اس میں بھی مقامی مسلمانوں کی ایک معتدبہ تعداد شریک تھی، اس پر آج کے جلسے کی کارروائی ختم ہو گئی اور مندوبین کو اس کا موقع دیا گیا کہ اب وہ آرام کریں یا چاہیں تو سیر و تفریح کریں -

دوسرے دن یعنی ۲۱ر اگست کو کانفرنس ۹½ بجے صبح پھر شروع ہوئی اور اب مندوبین کے مقالات یا تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا - مندوبین کے نام حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق پکارے جاتے تھے، اس لئے انڈونیشیا، پاکستان اور بنگلہ دیش کے مندوبین کے مقالات پہلے ہو گئے اور لیبیا، مملکت سعودیہ، مصر اور ہندوستان وغیرہ کے مندوبین کے مقالات آخری نشستوں میں ہوئے، مقالات اکثر و بیشتر عربی زبان میں بعض انگریزی میں اور ایک دو فرانسیسی زبان میں تھے، فوری ترجمہ کا انتظام موجود تھا، آپ مذکورۂ بالا تینوں زبانوں میں سے جس زبان میں چاہیں تقریریں سن سکتے ہیں ۱۲½ بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد سب حضرات نے خواجہ زود مراد کی مسجد میں ظہر کی نماز پڑھی۔ اس

مسجد کو چھ سو برس کی پرانی مسجد کہا جاتا ہے۔ لیکن اس میں توسیع اور تعمیر نو کا کام برابر جاری رہا۔ حسب معمول ہم لوگوں کے ساتھ مقامی مسلمان بھی بڑی تعداد میں جماعت میں شریک تھے اس سے فراغت ہوئی تو ہوٹل میں واپس آکر لنچ کھایا اور کچھ دیر آرام کیا، چار بجے شام کو پھر کانفرنس شروع ہوئی، مقالات پڑھے گئے اور تقریریں ہوئیں ½ ۶ بجے کانفرنس ختم ہو گئی۔

تیسرے دن یعنی ۲۲ / اگست کو ½ ۹ بجے کانفرنس پھر شروع ہوئی، لیکن چوں کہ آج مقالات یا تقریروں کا آخری دن تھا اور مقررین کی بڑی تعداد باقی تھی، اس لئے شروع میں ہی صدر جلسہ نے اعلان کر دیا کہ حضرات مقررین وقت کی تنگی کا خیال رکھ کر مقالات مختصر طور پر پڑھیں، ہندوستانی وفد کی باری سہ پہر کے اجلاس میں آئی، مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کا مقالہ عربی زبان میں امام بخاری پر اور میرا مقالہ انگریزی میں Social Justice in Islam پر تھا۔ اور یہ دونوں کافی طویل مقالے تھے اور ان کا خلاصہ ممکن نہیں تھا، اس بنا پر مفتی صاحب کی تجویز کے مطابق ہم دونوں نے پڑھے بغیر مقالات تو جناب صدر کے حوالہ کر دئے اور میں نے ہندوستانی وفد کی طرف سے عربی میں تقریر کی جس میں امام بخاری کی عظمت وجلالت شان، کانفرنس کی اہمیت و افادیت اور سمرقند کی گذشتہ تاریخی اور اسلامی عظمت پر روشنی ڈال کر داعیانِ کانفرنس کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

گذشتہ دو دنوں کی طرح آج بھی صبح کی نشست ختم ہونے پر سب لوگوں نے ظہر کی نماز ایک اور نئی مگر قدیم تاریخی مسجد جو خواجہ عبید اللہ احرار کی مسجد کہلاتی ہے اس میں ادا کی حسب معمول یہاں بھی ارباب موتمر کے ساتھ مقامی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد شریک نماز تھی، معلوم ہوا کہ اس طرح کی بارہ تاریخی اور قدیم مسجدیں ہیں جو پہلے ایک عرصہ تک بند رہیں، لیکن اب وہ مسلمانوں کے حوالہ کر دی گئی ہیں، چنانچہ ان میں قالین بچھے ہوتے ہیں، امام

مقرر ہیں، وضو وغیرہ کا بندوبست ہے اور ان میں باقاعدہ نماز ہوتی ہے، پنجوقتہ نماز میں اکثر و بیشتر سن رسیدہ حضرات ہی ہوتے ہیں، لیکن جمعہ کی نماز میں نوجوان اور نئی نسل کے لوگ بھی خاصی تعداد میں شریک ہوتے ہیں، یہ مسجد بھی قدیم مسلمانوں کے ترکستانی فن تعمیر کا نمونہ ہے، مسجد کے جنوب میں ایک بڑا قبرستان ہے، قبرستان میں داخل ہوتے ہی ایک سنگ مرمر کا بڑا کتبہ خواجہ عبیداللہ احرار کی قبر کا نظر آتا ہے اس قبرستان میں یقیناً اور بھی چند بزرگوں اور مشہور افراد کی قبریں ہوں گی۔ لیکن اس تحقیق کا وقت نہیں تھا۔ اس لئے ہم لوگ چلے آئے، یہاں سمرقند، بخارا، تاشقند اور الماسا میں جہاں کہیں ہم کو مسجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ہم نے یہ بات یکساں دیکھی کہ یہاں کے مسلمان دو چیزوں کا بڑا التزام کرتے ہیں، ایک تحیۃ المسجد کا اور دوسرے نماز سے فراغت کے بعد قرآنِ مجید کی تلاوت اور اُس کے بعد دعا کا۔

آج کے سہ پہر کے اجلاس کے بعد جس کے آخر میں حسب معمول میزبان اور مہمانوں کی رسمی تقریریں ہوئیں اور ایک تجویز منظور ہوئی جس میں ظلم اور ناانصافی کے خلاف عالم اسلام کے مسلمانوں سے اتحاد و یکجہتی کی اپیل کی گئی تھی، یہ کانفرنس ختم ہوگئی، دوسرے دن جمعہ تھا اس لئے سب لوگ پھر خرتنگ گئے، اور امام بخاری کے مزار پر فاتحہ وسلام کے بعد جمعہ کی نماز ادا کی، پھر حسب دستور نہایت شاندار لنچ یہیں کھایا، اس کے بعد ادارۂ دینیہ (تاشقند) نے اس موقع پر صحیح بخاری کو دو جلدوں میں اور ایک قرآن مجید (تیسری مرتبہ) نہایت اہتمام سے طبع کرائے ہیں ان دونوں کا ایک ایک نسخہ تمام مندوبین کو مفتی ضیاء الدین بابا خان نے ہدیہ کیا، شب میں خود مفتی صاحب کی طرف شخصی طور پر ہوٹل میں ہی مندوبین، دوسرے مہمان اور شہر کے معزز مسلمانوں کا ایک نہایت پرتکلف ڈنر تھا۔ جیسا کہ قاعدہ ہے اس ڈنر کے درمیان اور اس کے شروع ہونے سے پہلے اور اس کے بعد بھی تقریریں ہوتی رہیں یہ کانفرنس کی آخری تقریب تھی، اس کے بعد ملک کی سیر و سیاحت کے لئے مندوبین کو اُن کی اپنی خواہش کے مطابق چار حصّوں میں بانٹ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے پسندیدہ شہر دیکھ سکیں۔

ہم دونوں نے سمرقند سے بخارا، تاشقند، الماسا (جمہوریۂ قازاقستان کا پایۂ تخت) اور ماسکو دیکھنا پسند کیا۔ چنانچہ ۲۴ر سے مندوبین اپنے اپنے پسند کے مقامات کے لئے روانہ ہونے لگے، یہ دس روز کا پروگرام تھا، اس سیر و سیاحت میں ہم نے کیا کیا دیکھا؟ کن کن لوگوں سے ملاقات اور گفتگو ہوئی؟ وغیرہ وغیرہ! یہ سفرنامہ کا موضوع ہیں تاہم چند اشارے کر دینا ضروری ہیں:-

۱۔ جشنِ امام بخاری کے سلسلہ میں داعی حضرات نے جو نہایت فیاضانہ اور شاہانہ اخراجات برداشت کئے ہیں جن کا اندازہ لاکھوں سے کم کا ہرگز نہیں ہے ان کے متعلق نائب مفتی ضیاءالدین بابا خان جناب شیخ اسماعیل مخدوم نے اپنی ایک تقریر میں بتایا کہ یہ سب اخراجات سوویت روس کے مسلمانوں نے اپنی جیب سے کئے ہیں، البتہ حکومت کی امداد اور تائید بھی شامل رہی ہے چنانچہ پورے سفر میں ہر جگہ ہمارے ساتھ V.I.P. لوگوں کا معاملہ کیا گیا۔ سمرقند کے میئر MAYOR نے بہت پر تکلف ڈنر دیا اور جس ادارہ میں بھی ہم گئے اُس کے حکام اعلیٰ نے ہمارا استقبال کیا۔

۲۔ سوویت روس جن پندرہ جمہوریتوں پر مشتمل ہے اُن میں سے مندرجۂ ذیل پانچ جمہوریتیں مسلمان کہلاتی ہیں، کیوں کہ ان کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے، ان کے نام یہ ہیں:-

نام	دارالحکومت
۱۔ جمہوریۂ اوزبکستان	تاشقند
۲۔ جمہوریۂ تازاقستان	الماسا
۳۔ جمہوریۂ قیرغزستان	فرترہ
۴۔ جمہوریۂ ترکمانستان	اسقاباد (عاشق آباد)
۵۔ جمہوریۂ تاجکستان	دوشنبہ ؟

ان کے علاوہ دو اور جمہوریتیں جن میں اگرچہ آبادی کے اعتبار سے مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں لیکن آبادی کا ایک اہم حصہ ہیں یہ ہیں ؟

۶ - جمہوریۂ آذربائجان باکو

۷ - جمہوریۂ تاتار اوفا اور قازان

ان سب جمہوریتوں میں اسلام کی تاریخ ماضی کے اوراقِ زرّیں جگہ جگہ مآثر و آثار کی شکل میں بکھرے پڑے ہیں - پنجاہ سالہ انقلاب نے اسباب و وسائلِ معیشت کو نہایت حیرت انگیز ترقی دے کر ان جمہوریتوں کے شہروں اور دیہاتوں کے بھی زمین آسمان بدل دئے ہیں لیکن جو مسلمان ہیں وہ اپنی متاعِ دین کو اب بھی سینہ سے لگائے بیٹھے ہیں اور اس آگ کی چنگاریاں اب تک ان کے نہاں خانۂ قلب میں سلگ رہی ہیں بہرحال قدیم اور جدید، پرانی نسل اور نئی نسل میں جو فرق عالمِ اسلام کے ہر بڑے شہر میں پایا جاتا ہے، وہ یہاں بھی ہے - جن شہروں میں ہم یہاں گئے اُن میں پرانی اور نئی دونوں قسم کی آبادیاں نظر آئیں، پرانی آبادیوں میں مکانات کچے ہیں - مردوں اور عورتوں لڑکوں اور لڑکیوں کے لباس اور اُن کے عادات و اطوار بھی سب روایتی، پرانے اور قومی ہیں - مسجدیں اور اسلامی شعائر انھیں کے دم سے آباد اور قائم ہیں، ہم کبھی اس منظر کو فراموش نہیں کر سکتے کہ ہم جب کبھی ان آبادیوں سے گذرتے تھے تو یہاں کے مرد اور حور شمائل عورتیں بچے اور بچیاں راستہ میں دو رویہ قطار بنا کر ہجوم در ہجوم کھڑے ہو جاتے اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ یا مرحبا مرحبا کے ساتھ نہایت جوش و خروش اور محبت کے ساتھ ہمارا استقبال کرتے تھے، لیکن پرانی نسل کے ختم ہو جانے کے بعد اسلام کا اس ملک میں کیا حشر ہوگا ؟ یہ سوال یہاں اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ عالمِ اسلام کے بعض اعلیٰ ترقی یافتہ شہروں میں ہے،

۲ - امیری اور غریبی یہاں بھی ہے، لیکن کوئی ایک شخص بھی یہاں ایسا نہیں ہے جو زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم ہو، ہر شخص سرخ و سفید، فربہ، توانا اور مستعد نظر آتا ہے، اشیائے خورد و نوش بافراط تمام - پھر بالکل خالص - ملاوٹ کا نام و نشان نہیں، ہر چیز پر گورنمنٹ کا کنٹرول - ہر شے کی قیمت مقرر اور اُس پر لکھی ہوئی، ذخیرہ اندوزی،

بلیک مارکٹنگ، اور سٹہ بازی وغیرہ کا کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا۔

۴۔ پورے ملک میں گھوم جائیے آپ کو نہ کہیں کسی وزیر اعظم کا مجسمہ نظر آئے گا اور نہ کسی صدر حکومت کا البتہ لینن کے مجسمے جگہ جگہ ہیں اور ہر مجسمہ کے نیچے اُس کا کوئی نہ کوئی قول یا اُس کی تحریر کا اقتباس کندہ ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں اشخاص و افراد کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور لینن کے مجسمہ کے ذریعہ یہاں اور وہاں لوگوں کو ہر وقت یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ اس ملک کی حکومت اور یہاں کی سوسائٹی اُس نظریہ پر قایم ہے جو ان کو لینن نے دیا ہے۔

سنہ ۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔
تاریخ صقلیہ ۔ تاریخ ملت جلد نہم
سنہ ۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی
سنہ ۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید لپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات
سنہ ۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم صدیق اکبرؓ تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد
سنہ ۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات۔ تاریخ گجرات جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم
سنہ ۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مصائب و درگزین۔
سنہ ۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اُردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔
سنہ ۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اوّل مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ۔ اسلامی کتب خانے عرب دنیا۔
تاریخ ہند پر نئی روشنی
سنہ ۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اُردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔
سنہ ۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اُردو جلد سوم۔ تاریخ ردہ سرکشی ضلع بجنور ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اوّل
سنہ ۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اُردو جلد چہارم حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط عرب و ہند عہد رسالت میں۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔
سنہ ۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر ۔ ایشیا میں آخری نو آبادیات
سنہ ۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اُردو جلد پنجم ۔ رموز عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔
سنہ ۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم تفسیر مظہری اُردو جلد ششم ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ
سنہ ۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ۔ تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔
سنہ ۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اُردو جلد ہشتم ۔ تاریخ الفخری حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر
سنہ ۱۹۷۰ء حیات عبدالحیٔ تفسیر مظہری اُردو جلد نہم ۔ مآثر و معارف ۔ احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت۔
سنہ ۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اُردو جلد دہم بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان
سنہ ۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

Regd. No. D. (D) 231 Phone 262815 SEPTEMBR 197

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ



حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ -
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق و فلسفۂ اخلاق - فہم قرآن - تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" - صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال - تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ" -

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول - اسلام کا نظامِ حکومت - سلطیہ - تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت - مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ" - تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے) (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر -

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ" - تدوینِ قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد -
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" - جارج برنارڈ شا -

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے - کتابتِ حدیث -

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت - قرآن اور تعمیرِ سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

برہان

جلد ۷۳ | ماہ رمضان المبارک و شوال المکرم ۱۳۹۴ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۴ء | شمارہ ۴

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے پروفیسر اے۔ ایم خسرو کے تقرر پر یونیورسٹی کے اندر اور باہر جس غیر معمولی مسرت اور اطمینان کا مظاہرہ ہوا ہے وہ تقسیم کے بعد سے اب تک کسی کے لئے نہیں ہوا۔ اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا کیوں کہ پروفیسر خسرو جس طرح اپنے خاص مضمون "معاشیات" میں نہ صرف ہندوستان کی ایک نامور شخصیت ہیں، بلکہ بیرونی ممالک میں بھی عزّت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اسی طرح وہ مضبوط کیرکٹر کے انسان ہیں۔ کھلا دل اور روشن دماغ رکھتے ہیں اور حق بات کہنے اور کرنے میں انھیں کوئی لالچ یا کسی کا خوف مانع نہیں ہوتا۔ چنانچہ اپنے عہدہ کا چارج لینے سے پہلے علی گڈھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ایک استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے جو کچھ کہا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی حیثیت اور اُس کے موجودہ مسائل و معاملات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اس تقریر میں موصوف نے یہ ایک بہت اہم اور بنیادی حقیقت بیان کی کہ "مسلم یونیورسٹی صرف ایک تعلیم گاہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک روایت بھی ہے۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ یونیورسٹی کی خود مختاری کو گذشتہ چند برسوں میں جو صدمہ پہنچا ہے موصوف اُس کو بحال کرنے کی مقدور بھر کوشش کریں گے۔

دوسری اہم بات آپ نے یونیورسٹی میں تعلیم اور ریسرچ کے معیار کو اونچا کرنے کے متعلق کہی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں تک ان دونوں چیزوں کا تعلق ہے تقسیم کے بعد سے اب تک یونیورسٹی بحیثیت مجموعی اُن توقعات کو پورا کرنے سے قاصر رہی ہے جو ملک وملّت کو اُس سے بجا طور پر ہونی چاہئے تھیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض اندرونی اور داخلی اور کچھ بیرونی اور خارجی حالات کے باعث یہاں ایک عام فضا یہ رہی ہے کہ جن اساتذہ نے اپنے مضمون میں کبھی کوئی قابلِ ذکر کارنامہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سال بھر میں اپنے لکچر بھی پورے نہیں کئے، لیکن بساطِ سیاست کے شاطر رہے وہ ترقی کرکے کہاں سے کہاں پہنچ گئے اور اس کے برخلاف جو حضرات ایک صحیح استاذ کی طرح ہمیشہ تعلیم وتعلم میں لگے رہے اور سیاست سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رکھا وہ جہاں تھے وہیں رہے، یونیورسٹی کا حال ایک گھرانہ کا سا ہے، جن خاندانوں میں تعلیمی فضا قائم ہوتی اور اُن کے افراد میں علم وادب کا ذوق ہوتا ہے اُن خاندانوں کے بچے بھی تعلیم میں ترقی کرتے ہیں اور جہاں یہ بات نہیں ہوتی وہاں کے بچوں سے کچھ زیادہ توقعات قایم نہیں کی جا سکتی ہیں۔

تقسیم کے بعد پروفیسر خسرو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر ہیں جن کا مشغلہ حیات درس وتدریس اور مطالعہ وتحقیق کے سوا اور کچھ نہیں رہا اور سیاست سے وہ ہمیشہ کنارہ کش رہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ پروفیسر راؤ (جو دہلی یونیورسٹی میں پہلے معاشیات کے پروفیسر تھے پھر یہاں کے وائس چانسلر اور اُس کے بعد مرکز میں وزیر تعلیم ہوئے) نے جب پہلی مرتبہ شملہ کے ایک سیمینار میں پروفیسر خسرو کا (جو اُس زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی میں لکچرر تھے) مقالہ سُنا اور ان سے گفتگو کی تو اس درجہ متاثر ہوئے کہ وہ اُن کو حیدرآباد سے براہ راست پروفیسر کی جگہ پر دہلی لے آئے اور مہینوں اُن کو اپنے مکان پر رکھا، ہماری دعا ہے اور امید بھی کہ وہ یونیورسٹی کی اس فضا کو جس کا ذکر اوپر ہوا ہے بدلنے اور یونیورسٹی کو تعلیم، ریسرچ اور اخلاق و

کردار کے اعتبار سے ایک مثالی یونیورسٹی بنانے میں کامیاب ہوں آمین

خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں کی جو گفتگو پچھلے دنوں اسلام آباد میں ہوئی تھی وہ کامیاب رہی اور امید ہے کہ اب جلد ہی دونوں ملکوں میں مراسلت اور آمد و رفت کی راہ کھل جائے گی اس طرح گویا شملہ معاہدہ کی تکمیل میں مزید پیش رفت ہوئی ہے اور اس سے سرحد کے دونوں طرف ان لاکھوں درد مند انسانوں کو یک گونہ تسلی اور تشفی ہوگی جو تین برس سے زیادہ سے اپنے عزیزوں قریبوں کی ملاقات کی براہ راست اُن کی خیریت کے دو حرف سننے کو ترس گئے ہیں۔ لیکن تعلقات کو معمول پر لانے اور اُن میں دوستی کا رنگ بھرنے کے لئے ابھی دونوں حکومتوں کو بہت کچھ کرنا ہے، اس سلسلہ میں سب سے اہم اور ضروری سفارتی تعلقات کی بحالی اور باہمدگر اعتماد، بھروسہ اور دوستی کی فضا پیدا کرنا ہے، یہ فضا اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب کہ دونوں ملکوں میں صرف مراسلت اور آمد و رفت کا تعلق نہ ہو۔ بلکہ تجارتی اور ثقافتی روابط بھی ہوں، خدا کرے یہ دن بھی جلد آئے اور دونوں نہیں، بلکہ بنگلہ دیش کو بھی شامل کرکے تینوں ملک امن و امان اور اتحاد و یگانگت کے ساتھ رہنے کے قابل ہوں۔

افسوس ہے اس مرتبہ صفحات میں تبصروں کے لئے گنجائش نہیں نکل سکی۔

کچھ سورۂ کہف اور ذوالقرنین کے متعلق

(۲)

جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی، رضا لائبریری رامپور

مولانا حفظ الرحمٰن

مولانا کی یہ تحقیق بظاہر نئی ہونے کے باوجود اتنی مدلل تھی کہ مولینٰا حفظ الرحمٰن مرحوم نے قصص القرآن (جلد سوم صفحات ۱۰۷ تا ۱۴۴) میں اس کو من و عن تسلیم فرمالیا، اور لکھا کہ "ان سب اقوال سے جدا مولانا ابوالکلام نے اس سلسلے میں جو تحقیق فرمائی ہے البتہ وہ ضرور قابلِ توجہ ہے۔ بلکہ دلائل و براہین کے لحاظ سے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی تحقیق بلاشبہ صحیح اور قرآن کے بیان کردہ اوصاف اور تاریخی حقایق کی مطابقت کے پیش نظر ہر طرح لائق ترجیح ہے۔"

چونکہ مولانا حفظ الرحمٰن نے انھیں دلائل کو دہرایا یا کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے؟ مولانا ابوالکلام لکھ چکے تھے اس لئے یہاں ان کے الفاظ دہرانے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

مولانا پرویز

مولانا غلام احمد پرویز نے بھی معارف القرآن (ج ۳/۴۴۲) میں جو جولا ۱۹۴۵ء کی تالیف ہے، ذوالقرنین کے بارے میں مولانا آزاد مرحوم بیان کا خلاصہ احتیاط کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"زمانۂ حال کے اثری مکتشفین کی سعی و کاوش سے کچھ ایسے نقوش ابھر کر سامنے ہیں، جن سے بعض قیاسات، یقینیات کی طرف رخ کئے نظر آتے ہیں اور اب اس کا اندازہ ہے کہ قرآن کریم نے جو تفاصیل و خصوصیات ذوالقرنین کی طرف منسوب کی ہیں ان کا

انتساب ایران کے اس شاہنشاہ کی طرف کیا جا سکتا ہے جسے یونانی مورخ سائرس یہودی خورس اور عرب کیخسرو کے نام سے پکارتے ہیں۔

لیکن اتنی تحقیق و کاوش کے باوجود یہ قیاس ابھی حقیقت کی صورت اختیار نہیں کر سکا ہو سکتا ہے کہ مزید اثری مکتشفات ان مدفون حقیقتوں سے مٹی کے اور تودے اٹھائیں اور وہ صورتیں جو قرنہا قرن سے خاک میں پنہاں چلی آ رہی ہیں، بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں۔ بہرحال اس وقت تک قیاسات کا رخ اسی سمت جا رہا ہے کہ ذوالقرنین سے مراد ایران کا کیخسرو ہی ہے۔"

اس کے بعد صحائفِ تورات کی پیشین گوئیاں بیان کر کے لکھا ہے (ص ۴۴۶):

"سائرس کا انتقال ۵۲۹ ق م میں ہوا، اور اس کے بعد اس کا بیٹا کیقبات تخت نشین ہوا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ سائرس دین زردشتی کا متبع بلکہ بہت بڑا مبلغ تھا۔"

مولانا دریابادی | مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تفسیر اردو میں، جس پر نظر ثالث ۱۳۶۹ھ ۱۹۵۰ء میں فرمائی، لکھا ہے کہ ذوالقرنین کے بارے میں "قرآنی تصریحات سے اتنا تو بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی دیندار اور بڑے فاتح کشورکشا تھے مگر اس سے زیادہ تعین قرآن میں نہیں، آگے شارحین و مفسرین کے قیاسات ہیں غالب خیال یہ ہے کہ مراد مشہور تاریخی فاتح سکندر یونانی (متوفی ۳۲۳ ق م) ہے۔ دوسرے اقوال جو ایران کے شاہ عظیم سائرس یا خورس یا کیخسرو (متوفی ۵۲۹ ق م) وغیرہ سے متعلق ہیں، ان کے ماننے میں تاریخی دقتیں کچھ کم حائل نہیں ہیں۔" (ص ۶۱۹)

چونکہ آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں مولانا نے ذوالقرنین کو سکندر ہی قرار دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قول اول کو ترجیح دیتے ہیں۔

مولانا مودودی | مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن (ج ۳، ۴۲) میں ذوالقرنین سے متعلق لکھا ہے:

"یہ مسئلہ قدیم زمانہ سے اب تک مختلف فیہ رہا ہے کہ یہ "ذوالقرنین" جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے کون تھا۔ قدیم زمانے میں بالعموم مفسرین کا میلان سکندر کی طرف تھا لیکن قرآن میں اس کی جو صفات و خصوصیات بیان کی گئی ہیں، وہ مشکل ہی سے سکندر پر چسپاں ہوتی ہیں۔ جدید زمانے میں تاریخی معلومات کی بنا پر مفسرین کا میلان زیادہ تر ایران کے فرمانروا خورس (خسرو یا سائرس) کی طرف ہے اور یہ نسبتاً زیادہ قرین قیاس ہے، مگر بہر حال ابھی تک یقین کے ساتھ کسی شخصیت کو اس کا مصداق نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔"

اس کے بعد ذوالقرنین کی قرآنی خصوصیات و علامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"ہم یہ تو ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ نزولِ قرآن سے پہلے جتنے مشہور فاتحین عالم گزرے ہیں ان میں سے خورس ہی کے اندر ذوالقرنین کی علامات زیادہ پائی جاتی ہیں۔ لیکن تعین کے ساتھ اُسی کو ذوالقرنین قرار دینے کے لئے ابھی مزید شہادتوں کی ضرورت ہے۔ تاہم دوسرا کوئی فاتح قرآن کی بتائی ہوئی علامات کا اتنا بھی مصداق نہیں ہے جتنا خورس ہے۔"

ان متاخر مفسرین میں سے مولانا عبداللہ العمادی کی رائے میں ذوالقرنین یمن کے ان بادشاہوں سے تعلق رکھتا ہے، جن کے نام لفظ "ذو" سے شروع ہوتے ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی سکندر یونانی کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں، مولانا محمد علی لاہوری اور میرزا بشیرالدین محمود کے نزدیک وہ دارائے اول شاہ ایران ہے، بقیہ مفسروں کی رائے میں قرآن نے سائرس (کیخسرو یا خورس) کو اس لقب سے یاد کیا ہے، مولانا پرویز اور مولانا مودودی کی رائے ظن پر اور بقیہ کی یقین پر مبنی ہے۔ چونکہ مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن نے اس مسئلے پر سب سے زیادہ مفصل اور مدلل بحث کی ہے اس لئے اگلے صفحات میں تفسیر کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے۔

تنقیحات | ان بزرگوں کی سابق الذکر بحثیں پڑھ کر حسب ذیل تنقیحیں قائم کی جا سکتی ہیں:

(۱) کیا ذوالقرنین کی بابت سوال احبار یہود نے کرایا تھا؟

(۲) کیا یہودیوں میں کوئی بادشاہ ذوالقرنین لقب سے مشہور تھا؟
(۳) کیا ایرانی یہودی یا یونانی ایران کے مشہور بادشاہ سائرس (کیخسرو یا خورس) کو ذوالقرنین کہتے تھے؟
(۴) کیا کیخسرو (سائرس یا خورس) خداپرست اور آخرت کی زندگی کا قائل تھا؟
(۵) کیا اصطخری تمثال خسرو کا ہے؟

پہلی تنقیح پہلی تنقیح کے سلسلہ میں عرض ہے کہ جیسا کہ شانِ نزول کی بحث میں گزر چکا ہے، ذوالقرنین کی بابت احبارِ یہود نے سوال کرایا ہوتا تو ضروری تھا کہ یہودی کتابوں میں ذوالقرنین کا ذکر ہوتا اور بار بار ہوتا کیونکہ وہ یہود کو بابل کی غلامی سے نجات دینے والا تھا۔ لیکن ذوالقرنین لقب کے ساتھ کسی بادشاہ کا ذکر نہ توریت کے کسی صحیفے میں ہے، نہ تالمود میں اور نہ جوزیفس کی تاریخ میں۔

نیز یہ سوال پیش کرانے والے احبارِ یہود ہوتے، تو ضروری تھا کہ جواباً قرآن مجید میں ذوالقرنین کی زندگی کے وہ واقعات بیان کیے جاتے جن کا یہود سے تعلق تھا، اور جن کی وجہ سے یہود ذوالقرنین کی قدر کرتے تھے۔ مگر قرآن مجید میں اس کی بابت جو کچھ نازل ہوا نہ اس کا کوئی یہود سے تعلق ہے۔ اور نہ وہ واقعات یہودی کتابوں میں مذکور ہیں، اس صورت میں یہود کے لیے رسولِ پاکؐ کے جواب کی تصدیق یا تکذیب ممکن نہ تھی، اور نتیجۃً اہلِ مکہ کا مقصد حاصل ہونا محال تھا۔

دوسری تنقیح جہاں تک یہودیوں میں ذوالقرنین لقب کے ساتھ کسی بادشاہ کی شہرت کا تعلق ہے، تو بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہودی صحیفوں یا تاریخی کتابوں میں نہ صرف یہ کہ اس لقب سے کوئی بادشاہ مشہور نہیں، بلکہ کسی خاص بادشاہ کے لیے یہ لقب ایک بار بھی استعمال نہیں ہوا۔

ہاں حضرت دانیال نے خواب میں دو سینگوں والا ایک مینڈھا دیکھا تھا مگر مولانا کے

نزدیک اس سے مراد میڈیا اور فارس کی "بادشاہت" ہے، اور مولانا حفظ الرحمٰن نے "بادشاہت" کی جگہ "بادشاہ" بصیغۂ مفرد لکھا ہے، چونکہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے تمام مستند نسخوں میں "بادشاہ" بحیثیت صیغۂ جمع آیا ہے اور عبرانی نسخے میں بھی ملوخے (ملوکے) بصورت جمع استعمال ہوا ہے، اس لئے دو سینگوں والی مینڈھے سے ایران کی بادشاہت یا ایران کے بادشاہ تو مراد ہو سکتے ہیں، لیکن ایک مخصوص بادشاہ مراد نہیں ہو سکتا، چنانچہ اسی خواب میں بالوں والے بکرے سے بھی یونانی سلطنت مراد ہے، سکندر مراد نہیں۔ سکندر کے لئے وہ سینگ بطور نشان استعمال ہوا ہے جو اس کے ماتھے پر دونوں آنکھوں کے درمیان نکلا ہوا تھا اس صورت میں یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ذوالقرنین لقب کے ساتھ کوئی بادشاہ یہودیوں میں مشہور تھا۔

تیسری تنقیح یہودیوں کی طرح ایرانیوں میں بھی کیخسرو (سائرس) کے لئے ذوالقرنین یا دو شاخیا کوئی دوسرا مترادف لقب استعمال نہیں ہوا، نہ اس کے عہد میں اور نہ زمانہ مابعد میں پسارگید یا (مرغاب) کے باقی ماندہ ستونوں میں سے ایک پر خطِ میخی میں لکھی ہوئی ایک عبارت کا ترجمہ یہ ہے[۱] "میں کورشِ ہخامنشی ہوں۔ کورش آقا، بادشاہ، دنیا کا حکمراں" "یہاں کورش مدفون ہے شاہان شاہ"

ایک اور تحریر اس کے مقبرے پر کندہ تھی، جو اب مفقود ہے، مگر سکندر کی فتح ایران تک موجود تھی۔ اسٹرابو اور پلوٹارک نے اس کا جو متن نقل کیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے[۲]:-

"او انسان، میں کورش ہوں، کیقباد کا بیٹا مملکت ایران کا بانی اور ایشیا کا حکمراں۔ اس لئے مجھ سے اس عمارت کی بدولت حسد نہ کرنا۔

"او انسان، تو کوئی بھی ہو، اور کہیں سے بھی آیا ہو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تو آئے گا

---

[۱] کتاب نقش قدیم ایران تصنیف آر۔ کے ڈی۔ کیاش: ۱۵۵، طبع بمبئی ۱۸۸۹ء

[۲] کتاب مذکور: ۱۶۱۔

ضرور) میں کورش ہوں مملکت ایران کا بانی، تو اس قطعہ زمین پر جو مجھے چھپائے ہوئے ہے رشک نہ کرنا۔[1]

تیسری تحریر ایک اور ستون پر کندہ ہے، جس کے نیچے ایک پردار انسان منقوش ہے اس کا ترجمہ ہے، "میں کورش ہخامنشی ہوں"[1]۔

چوتھی تحریر کیخسرو کا فرمان ہے جو فتح بابل کے بعد جاری کیا گیا تھا، اس کی ابتدائی عبارت کا ترجمہ ہے[1]:-

"میں کورش ہوں، بادشاہِ جہاں، بادشاہِ بزرگ، بادشاہِ مقتدر، بادشاہِ بابل، بادشاہِ سرزمین سومر واکد، در بادشاہ چہار دانگِ عالم، پسر کیقباد بادشاہِ بزرگ الخ"

ان میں سے کسی کتبے میں بھی کیخسرو کو ذوالقرنین یا دوشاخہ نہیں لکھا گیا ہے۔ اگر وہ اپنے ملک میں اس لقب سے مشہور ہوتا، تو کسی نہ کسی تحریر میں اس کا ضرور مذکور ہوتا۔

یونانی مورخوں میں زینوفن اور ہیروڈوٹس نے بھی اس لقب کا ذکر نہیں کیا۔ ورنہ چیمبرس انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار ضرور حوالہ دیتا جس نے مذکورہ بالا مورخوں کو سامنے رکھا ہے[2]۔ یہی صورت حال انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کی ہے کہ اس میں بھی یونانی مورخوں کے حوالے ہوتے ہوئے لقبِ ذوالقرنین کا ذکر نہیں آیا[3]۔

یہاں یہ سوچنے کی بھی ضرورت ہے کہ سائرس یا اس کے جانشین ذوالقرنین لقب کو پسند بھی کر سکتے تھے؟ میری دانست میں یہ بادشاہ اس لقب کو کبھی پسند نہ کرتے، کیونکہ اس کی بنا صرف حضرت دانیال کا خواب ہے۔ اس خواب میں انھیں جو کچھ دکھایا گیا تھا، اس کی تعبیر یہ بتائی گئی کہ ابتدا میں ایرانی سلطنت خوب پھلے پھولے گی، اور اس کے بعد یونان کے پہلے بادشاہ (یعنی سکندر) کے ہاتھوں تباہ ہو جائے گی۔

[1] کتاب قدیم نقش ایران ۱۴۴۔ [4] کتاب دانیال، دیباچہ، ۳۸، طبع کیمبرج ۱۹۱۲ء (زبان انگریزی) [2] دیکھیے جلد ۳، ص ۶۴۶۔ [3] دیکھیے جلد ۱، ص ۲۷۰۔

یہ خواب ایرانی سلطنت کی ترقی اور تباہی دونوں کی ایک ساتھ پیشگوئی کرتا تھا۔ کیا حضرت دانیالؑ کو یہ چاہیئے تھا کہ اپنی قوم کے نجات دہندے کو ایسا تکلیف دہ خواب سنا کر پریشان و غمگین کرتے۔ اور اگر کسی مصلحت سے ایسا کرتے بھی، تو کیا سائرس اس منحوس خواب کی بنا پر اپنے لئے ذوالقرنین یا دوشاخہ لقب پسند کرتا۔ یہی نہیں، بلکہ دارا ثانی کی سکندر سے شکست تک کوئی ایرانی، یہودی اور یونانی سائرس یا اس کے جانشین کو مذکورہ خواب کے پیش نظر ذوالقرنین نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایرانی حمیت قومی کے تحت، یہودی جذبۂ احسان مندی کی خاطر اور یونانی ایران پر غلبہ پا جانے کے پیش نظر۔

اس خواب کو نبوکدنضر (بخت نصر) کے خوابوں جیسا نہ سمجھنا چاہیئے، جن کی تعبیریں حضرت دانیال نے اس کی پروا کیے بغیر بتائی تھیں کہ یہ بادشاہ کے مزاج کے خلاف ہونگی وجہ یہ ہے کہ اس موقع پر خواب دانیال نے نہیں بلکہ بخت نصر نے دیکھا اور حضرت دانیال سے اس کی تعبیر چاہی تھی۔ اگر وہ خواب کی تعبیر بتانے سے انکار کرتے، تو باشاہ کے معتوب ہوتے۔ اور غلط تعبیر دیتے، تو بادشاہ کے علاوہ اپنے رب کے بھی مغضوب قرار پاتے۔

اسی طرح بلشفر بادشاہ نے جشن کے موقع پر ایک غیبی ہاتھ کو محل کی دیوار پر کچھ لکھتے دیکھا تھا[1]۔ یہ تحریر کسی سے نہ پڑھی گئی، تو حضرت دانیال طلب ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کا جو مطلب بیان کیا تھا، وہ بھی بادشاہ کے خلافِ مزاج تھا۔ مگر ہم ذوالقرنین سے متعلق خواب کو اس پر بھی قیاس نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ غیبی تحریر بھی خود دانیال کی نہیں، بادشاہ کی دیکھی ہوئی تھی۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ کتاب دانیال کے مصحح اور محشی نے جس کا نام ایس، آر، ڈرائیور ہے، اپنے دیباچے (ص ۴۷) میں مصنف اور زمانۂ تصنیف سے بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب نہ حضرت دانیال کی تصنیف ہے، اور نہ اُن کے

[1] کتاب یسعیاہ، باب ۴۵، آیت ۱تا۶۔

زمانے میں تالیف ہوئی تھی، بلکہ کسی شخص نے ۱۶۸ اور ۱۶۵ قبل مسیح کے درمیان لکھ کر ان کی طرف منسوب کر دی ہے مسٹر ڈرائیور نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں تاریخی اور لسانی دونوں قسم کے دلائل پیش کئے ہیں۔ توریت کے دوسرے عالم ان دلیلوں کو تسلیم نہیں کرتے، اور کتاب کو دانیال ہی کا الہام مانتے ہیں۔ مگر میں کتاب دانیال کی اس عبارت کو غور طلب جانتا ہوں۔ "میں نے دیکھا کہ پچھم، اُتر اور دکھن کی طرف وہ سینگ مارتا ہے۔" کیوں کہ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین مینڈھا مغرب، شمال اور جنوب کے ممالک کو زیر کرے گا، مشرقی علاقے اس کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے کہ ذوالقرنین نے مغربی، مشرقی اور شمالی مہمیں سر کی تھیں۔

کتاب دانیال اور قرآن مجید کا یہ اختلاف، جس میں تاریخ قرآن مجید کی موید ہے، کتاب دانیال کو مزید مشکوک بنا دیتا ہے۔

چوتھی تنقیح جہاں تک مذہبی اور تاریخی دستاویزوں کا تعلق ہے، کیخسرو خدا پرست بادشاہ نہیں معلوم ہوتا۔ چنانچہ یسعیاہ میں ارشاد ہوا ہے کہ "خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ ــــــ میں گاڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دوں گا تاکہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تیرا نام لے کے بلایا ہے۔ میں نے اپنے بندے یعقوب اور اپنے برگزیدے اسرائیل کے لئے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا۔ میں نے تجھے مہربانی سے پکارا گو کہ تو مجھ کو نہیں جانتا میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں میرے سوا کوئی خدا نہیں میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہ پہچانا۔"[1]

یرمیاہ میں فرمایا ہے: "تم قوموں کے درمیان ــــــ منادی کرو، مت چھپاؤ، کہو کہ بابل لے لیا گیا۔ بیل رسوا ہوا۔ مردوک سراسیمہ کیا گیا۔ اس کے بت خجل ہوئے۔ اس کی مورتیں پریشان کی گئیں۔ کیونکہ اُتر سے ایک قوم اس پر چڑھتی ہے۔"

[1] کتاب یسعیاہ باب ۴۵ آیت ۱ تا ۴

جو اُس کی سرزمین کو اجاڑ کرے گی، یہاں تک کہ کوئی اس میں نہ رہے گا" (باب ۵۰ آیات ۱۔۳)۔
دیکھ میں اتر کی زمین سے بڑی قوموں کے ایک گروہ کو برپا کروں گا اور بابل پر لے آؤں گا کسدستان لوٹا جائے گا" (باب مذکور، آیت ۹ و ۱۰)۔

"دیکھو وے دن آتے ہیں کہ میں بابل کی تراشی ہوئی مورتوں سے انتقام لوں گا اور اس کی ساری سرزمین گھبرا جائے گی، اور اس کے سارے مقتول اس کے درمیان پڑے ہوئے ہوں گے۔ اس وقت آسمان اور زمین اور سب کچھ جو ان میں ہے بابل کے اوپر شادیانے بجائیں گیں، کیونکہ غارت گر اُتر سے آکے اس پر چڑھیں گے" (باب مذکور، آیات ۴۷ و ۴۸)۔

"خداوند کہتا ہے کہ میں اس کی تراشی ہوئی مورتوں کو سزا دوں گا، اور اس کی ساری ولایت میں گھایل کراہیں گے ـــــ اس لئے کہ غارت گر اُس پہ ہاں بابل چڑھ آیا ہے" (ایضاً آیات ۵۲۔۵۶)۔

یسعیاہ اور یرمیاہ کے مذکورۂ بالا اقتباسوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خورس (کیخسرو) خدا ناشناس تھا، اور وہ اور اس کا لشکر غارت گر اور لٹیرے تھے کیا خدا ناشناس غارت گر کو مومن باللہ و بالیوم الآخر قرار دیا جا سکتا۔

رہیں یسعیاہ وغیرہ کی وہ آیتیں جن میں اسے مسیح، خدا کا چرواہا، اس کی مرضی پوری کرنے والا یا خدا کا دست گرفتہ کہا گیا ہے۔ تو یہ سب استعارتی صفات ہیں، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اِی تھکس (ج ا۔ ۵۵۶ کالم ۲) کے مقالہ نگار نے لفظِ مسیح کے سلسلے میں لکھا ہے کہ سائرس کے لئے اس لفظ کا استعارۃً استعمال ہوا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ جس الوہی صفت (رحم وغیرہ) سے متصف ہے اس کے مطابق کام بھی کرے گا۔ خود مولانا آزاد وغیرہ بھی یہی رائے رکھتے تھے، ورنہ وہ کیخسرو کو نبی ماننے پر مجبور ہوتے اس لئے کہ "خدا کا مسیح" اپنے حقیقی مفہوم میں توریت کے اندر صرف نبی کے لئے

استعمال ہوا ہے:

مورخوں سے زینوفن (XENOPHEN) نے جو سقراط کا شاگرد اور کیخسرو دوم کا معاصر ہے اپنی داستان میں کیخسرو کے متعلق لکھا ہے کہ وہ چڑھاوے چڑھاتا تھا اور "ماگی" سے مدد مانگتا تھا جن دیوتاؤں کے حضور میں وہ نذر پیش کرتا تھا اور وہ یونانی اصطلاح میں زِی اس (ZEUS) ھیلی اس (HELIOS) گی (GI) اور ھستیا (HESTIA) ہیں مزید برآں وہ "ان دوسرے دیوتاؤں" یا "سب دیوتاؤں" اور محافظ مقدس ہستیوں کو بھی پوجتا تھا جن کی پرستش اسیریا، سیریا، میدیا اور پارس میں کی جاتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کیخسرو مظاہر فطرت کا پجاری تھا۔

ہیروڈوٹس اور اسٹرابو نے عام ایرانیوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سورج، چاند، دھرتی، آگ، جل، ہوا اور آسمان کی پوجا کرتے تھے جسے زِی اس کہتے تھے۔

یہ بیان بظاہر کیخسرو کا مذہب نہیں بتاتے، لیکن انھیں زینوفن کے بیان اور کیخسرو کے اپنے اعتراف کے ساتھ پڑھا جائے جس کا متن آگے آتا ہے، تو یہ بھی کیخسرو کا مذہب متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

کیخسرو کا مذکورہ بالا اعتراف اس کے ایک فرمان میں ہوا تھا، جو ایک بیلن نما مٹی کے کتبے کی شکل میں برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس کتبے کے پیش نظر چیمبرس انسائیکلو پیڈیا (ج ۳، ص ۴۶۳، طبع ۱۸۸۹ء) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ یہ کتبہ پوری صفائی کے ساتھ ظاہر کرتا ہے کہ سائرس مشرک اور بت پرست تھا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ بنونیدس شاہ بابل، جن دیوتاؤں کی مورتیاں بابل لے آیا تھا، میں نے وہ سب ان کی پرستش گاہوں کو واپس کردیں۔ اور ان سے دعا کی کہ وہ سب نیبو (NEBO) اور مردوک خدائے بزرگ سے میری اور میرے بیٹے کیمبی سز (کیقباد) کی سفارش کریں۔

محولہ بالا کتبے کا فارسی ترجمہ ایرانی حکومت کے ڈھائی ہزار سالہ جشن کے موقع پر

مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوا تھا۔ میں ذیل میں وہ ترجمہ لکھتا ہوں، جو ایران کے مشہور و معروف رسالہ بررسیہای تاریخی میں "متن فرمانِ آزادی بخش کوروشِ بزرگ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اور مجھے مکرمی ڈاکٹر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی وساطت سے ملا تھا وہ اپنے اصلی فارسی الفاظ میں یوں شروع ہوتا ہے:

"منم کوروش پادشاہِ جہان، پادشاہِ بزرگ، پادشاہِ مقتدر، پادشاہِ بابل، پادشاہِ سرزمین "سومر" و "اکد" و پادشاہِ چہار گوشۂ (جہان) پسر کمبوجیہ پادشاہ بزرگ، پادشاہِ "انشان" نوادۂ کوروش پادشاہِ بزرگ، پادشاہِ انشان، از اعقاب "چیش پیش" پادشاہِ بزرگ، پادشاہِ انشان، از دودمانِ سلطنتی پایان ناپذیر کہ "بعل" و "نبو" سلطنت شان را گرامی میدارند، و اینان برای خشنودیِ دلِ خود سلطنت شان را خواہانند۔

وقتی من با وضعِ خوبی واردِ بابل شدم، درمیانِ جشن و شادمانی مقرِ حکومت خود را درکاخِ شاہی استوار کردم۔ مردوک خدای بزرگ، سبب شد کہ سکنۂ گشادہ دل بابل مرا...... کنند۔ من ہر روز بہ پرستشِ او ہمت گماشتم سپاہیان بیشمار من بدون مزاحمت درمیانِ شہرِ بابل حرکت کردند۔ من ہیچ کس اجازہ نمیدادم کہ سرزمینِ "سومر" و "اکد" را دچارِ ہراس کند۔ من نیازمندی ہای بابل و ہمہ معابدش را در نظر داشتم و در بہبود وضع شان کوشیدم۔ من یوغِ ناپسندِ مردم بابل۔۔۔ را برداشتم۔ خانہ ہای مخروبۂ آنان را آباد کردم۔ من بہ بدبختی ہای آنان پایان بخشیدم مردوک خدای بزرگ از کردارم خشنود شد و بمن، کوروش پادشاہ کہ او را می پرستیدم و بہ کمبوجیہ فرزندم کہ زادۂ کمر من است و تمام سپاہیانِ من از روی لطف برکت بخشید و، بارو حیہ نیکو، مقام "الوہیت" شانرا ادا لبی تجلیل نمودیم۔ تمام پادشاہانی کہ در بارگاہ ہای خود بر تخت نشستہ اند در سرتاسر چہار گوشۂ جہان از دریای علیا تا سفلی، کسانیکہ در۔۔۔ مسکن داشتند، تمام پادشاہان کشورِ

باختر کہ در خیمہ ہا مسکن داشتند، خراج سنگینی بہ ایم آور وند و در بابل بر پایم بوسہ زوند۔ از.... تا شہرہای "آشور" و "شوش" "آکادہ" "اشنونا" و شہرہای "زمبان" "میورنو" "در" تا ناحیہ سرزمین "گوتیوم" و شہرہای مقدس ماوراء ای دجلہ کہ مد تہای مدیدی — معابد شان دستخوش ویرانی بود، خدایانی کہ مسکن شان درمیان ایشان بود، ہمہ اینہا را بجای خود شان برگردانده و در منزل گاہ پایداری جادام۔

من ہمہ ساکنان آنہارا جمع آوری کردہ و منازل شان را بدانہا باز گردانم۔

خدای سومر و اکد، کہ "نابونیدس" آنہارا بہ بابل آوردہ، و خدای خدایان را خشمناک ساختہ بود، من بخواست مردوک خدای بزرگ با صلح و صفا بجای گاہ پسندیدہ خود شان باز گردانم۔ باشد کہ تمام خدایانی کہ من در پرستشگاہ ہای شان مستقر ساختہ ام روزانہ بسود من در پیشگاہ بعل و بنو مراد عا کنند تا عمر من دراز شود و باشد کہ بمردوک بگویند "کورش پادشاہ کہ ترا گرامی میدارد و فرزندش کمبوجیہ... بادا!

(۲) فرمان کے خط کشیدہ جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ۔

(الف) بعل اور بنو سائرس کے خاندان کی حکومت کو دوست رکھتے تھے اور اس کی بقا کے خواہاں تھے۔

(ب) سب سے بڑے خدا، مردوک نے اہل بابل کے دل میں سائرس کی محبت ڈال دی تھی۔

(ج) سائرس نے مردوک کی پوجا شروع کردی تھی۔

(د) خدائے بزرگ، مردوک، سائرس کے کام سے خوش ہوا، اور اس نے سائرس کو جو اس کا پجاری تھا اور اس کے بیٹے کمبوجیہ کو اور اس کی فوج کو برکت بخشی۔

(ہ) سائرس اپنے معبود مردوک کی الوہیت کے مقام بلند کا معترف تھا۔

(و) بادشاہ بابل نے جو بہت سے بت دوسرے مقامات سے لاکر بابل میں رکھ دیئے تھے،

اس سے خدائے خدایاں (مردوک) کو غصہ تھا۔ سائرس نے اُن سب کو مردوک کی مرضی کے مطابق اُنکے اصلی استھانوں پر بھیج دیا۔

(ز) سائرس کو توقع تھی کہ یہ سب دیوتا بعل اور بنو کے دربار میں اس کی درازیٔ عمر کی سفارش کریں گے۔ اور مردوک سے بھی عرض کریں گے کہ سائرس بادشاہ کو جو مردوک کی تعظیم کرتا ہے اور اس کے بیٹے کمبوجیہ کو (عمر دراز عطا کرے)۔

بعل، بنو اور مردوک کون تھے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ تینوں اہل بابل کے دیوتا تھے[1]۔

ان میں مردوک سب سے بڑا دیوتا شمار ہوتا تھا۔ یہ پہلے دارالسلطنت کا خدا تھا رفتہ رفتہ ساری مملکت میں پوجا جانے لگا اور بنو اور بعل کے اختیارات بھی اسی کو حاصل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ سائرس کے منقولۂ بالا فرمان میں اُسے "خدائے بزرگ" کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

پانچویں تنقیح

اصطخری میں جو تمثال ملتی ہے اس کے متعلق رالنسن کا قول ہے کہ یہ سروش کی ہے۔ سرکیرپورٹر (KER PORTER) نے پروفیسر ہیرن (HEBRON) کی رائے نقل کی ہے کہ یہ کوئی بالاتر روح ہے[2]۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مقالہ نگار نے اسے کیخسرو کا بتایا ہے، کیونکہ اس کے اوپر جو ناقص کتبہ ہے اس کا ترجمہ ہے "میں کورش ہخامنشی ہوں"[3]۔ مولانا آزاد اس آخری قول کے مؤید ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اس تمثال کے سر کے دو سینگوں اور پردار بازوؤں کا خیال صحیفۂ دانیال کے دو سینگوں والے مینڈھے اور صحیفۂ یسعیاہ کے عقاب سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] دیکھئے ایم۔ اے۔ کینی کی انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن: ۵۶، ۲۳۱، ۲۵۷، انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا، بیبی لونین ریلیجن اینڈ مائی تھالوجی، تصنیف ایل۔ ڈبلیو۔ کنگ ۱۸۷ تا ۱۹۱ طبع ۱۸۹۹ء

[2] قدیم نقش ایران ۱۶۷۔ [3] کتاب مذکور، ج ۱، ص ۱۸۸، کالم ۲۔

لیکن برادرِ محترم اسحٰق النبی خاں علوی کے بقول جو بابلی، مصری اور ایرانی اثریات پر وسیع نظر رکھتے ہیں "کسی انسانی مجسمے کو پر دار بازو والا نہیں بنایا جاتا تھا خواہ وہ کسی دینی رہنما کا ہو یا دنیوی بادشاہ کا" خود میری تحقیق کے مطابق کسی دیوتا یا جن یا فرشتے کو چار بازو والا نہیں دکھایا گیا بجز مردوک کے جو خود کیخسرو کا بھی خدائے بزرگ بن گیا تھا لہٰذا اصطخری تمثال کو کیخسرو کی جگہ مردوک کا قرار دینا چاہیئے۔

داراکا مذہب آخر میں دارا کے مذہب کے متعلق اور عرض کر دوں۔ مولانا محمد علی لاہوری اور میرزا بشیر الدین محمود صاحب کی رائے یہ ہے کہ قرآنی ذوالقرنین کا مصداق دارائے اول ہے، اور اس لئے وہ اسے موحد تسلیم کرتے ہیں۔ مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن اسے ذوالقرنین تو نہیں مانتے لیکن خدائے واحد کا پرستار ضرور جانتے ہیں

ان حضرات کے نزدیک دارا کی توحید پرستی کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ وہ اپنے فرامین میں صرف اہورمزدہ کا نام لیتا ہے۔

مگر بنظرِ غائر دیکھا جائے، تو اس سے شرک کی نفی نہیں ہوتی ہوسکتا ہے کہ دوسرے مشرکوں کی طرح دارا بھی اہورمزدہ کے ساتھ اور معبودوں کی بھی پوجا کرتا ہو، چنانچہ وہ اپنے ایک فرمان میں اہورمزدہ کو "ایک بڑا خدا" بتاتا ہے۔ دوسرے کئی کتبوں میں اسے "سب خداؤں سے بڑا خدا" لکھا ہے۔

ان دونوں سے زائد صریح وہ بیان ہے جو مصر کے ایک کتبے میں منقوش ہے۔ اس کا مطلوبہ اقتباس یہ ہے۔

"دارا (نیت [illegible]) کا فرزند (RA) جب وہ ماں کے پیٹ میں تھا، اور ابھی زمین پر اس کا ظہور تک نہ ہوا تھا نیت دیوی نے اسے اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ اور اس کے سامنے

له براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا، ۱/۹۱۔ ٢ه انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس ۴/۲ کالم ۲

اپنا وہ بازو پھیلا دیا تھا جس میں کمان تھی، تاکہ ہمیشہ کے لئے اس کے دشمنوں کو تباہ کر دے جیسا کہ وہ اپنے بیٹے را (R A) دیوتا کے لئے کر چکی تھی ـــــ وہ اس کا بیٹا ہے قوی اور دانا"

یہ امر طے شدہ ہے کہ نیت مصریوں کے عقیدے میں جنگ کی دیوی اور اس کا بیٹا را سورج دیوتا ہے۔ دارا اپنے آپ کو نیت کا منہ بولا بیٹا کہتا، اور اسے دشمنوں کے مقابلے میں اپنا معین و مددگار بتاتا ہے۔ کیا یہ شرک نہیں، اور کیا نیت کے فرزند کو قرآن کے موحد ذو القرنین کا مصداق مانا جا سکتا ہے۔ میرے ہی نہیں، کسی کے نزدیک بھی اس تضاد کو تسلیم کرنا محال ہے۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کیخسرو ہو یا دارا وسکندر ہوں، یہ قرآنی ذوالقرنین کا مصداق نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ لہٰذا ہمیں ذوالقرنین کی تشخیص کے بارے میں اپنی کوشش جاری رکھنا چاہیئے۔

ـــــ لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔ ـــــ

ضروری گذارش

کاغذ کی ہوشربا گرانی کے باعث برہان کی اشاعت فروری ۱۹۷۰ء میں ہی بند ہو جاتی مگر ادارہ کے ممبران اور خریداران برہان کے اصرار پر اشاعت جاری رکھی گئی تھی۔ برہان میں جو کاغذ لگایا جاتا ہے گذشتہ مہینوں میں ۵۵ روپے فی رم کے حساب سے مل رہا تھا۔ پھر جون میں وہی کاغذ ۶۶ روپے فی رم سے زیادہ آنے لگا تھا اب اس وقت زائد از ۷۰ روپے آرہا ہے اسی طرح دوسرے طباعت کے مصارف کا حال ہے ان حالات میں قارئین برہان اور ادارہ کے ممبران سے حسب ذیل امور میں تعاون درکار ہے ـــــ (۱) خریداران برہان اور ادارہ کے ممبران نئے خریدار اور نئے ممبروں کی توسیع کے لئے کوشش فرمائیں۔ (۲) برہان کا چندہ اور ممبری کی فیس بروقت عطا فرمائیں۔ (۳) یاددہانی کے خطوط ارسال ہوتے ہیں قارئین ان پر فوری توجہ فرمائیں۔ (۴) دفتر کو خطوط روانہ کرتے یا منی آرڈر ارسال کرتے وقت اپنا خریداری نمبر تحریر کرنا نہ بھولیں تاکہ جواب یا تعمیل میں تاخیر نہ ہو۔ پتہ صاف صاف تحریر فرمائیں ـــ (نیازمند: منیجر برہان دہلی ۶)

کچھ المامون کی اولیات کے بارے میں

(شبیر احمد خاں غوری ایم اے۔ ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش)

(۴)

زندقہ مامون سے پہلے (جاری)

عباسی عہد کے آغاز میں زندقہ کی شدت:

(الف) پیروان مانی ایران میں:- اوپر ذکر آچکا ہے کہ خود خالد بن عبداللہ القسری کا میلان زندقہ کی جانب تھا۔ لہٰذا اس کی پشت پناہی سے قوی دل ہو کر پیروان مانی ماوراء النہر سے عراق واپس آئے اور یہیں بس گئے۔ جیساکہ ابن الندیم کی شہادت اوپر گذری:-

"فعادوا الی ھذہ البلاد... ... فان خالد بن عبد اللہ القسری کان یعنی بھم"[1]	پس وہ (مالزیہ) ان ممالک میں واپس آگئے ...... کیونکہ خالد بن عبداللہ القسری ان لوگوں کا بہت زیادہ خیال کرتا تھا۔

بلکہ اس نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ خالد بن عبداللہ القسری زندقہ کے ساتھ متہم تھا۔

انہ کان یرمی اعنی خالد بالزندقۃ[2]	خالد بن عبداللہ القسری کو زندقہ کی تہمت لگائی جاتی تھی۔

اس حمایت و پشت پناہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مانویوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ

---

[1] ابن الندیم کتاب الفہرست ص ۴۷۲ - [2] ایضاً صفحہ ۴۷۳ -

اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔ چنانچہ ان کے علمبرداروں نے "ثنویت" کی تائید میں متعدد کتابیں تصنیف کیں جن سے بہت سے لوگ گمراہ ہونے لگے۔

جب تک خالد بن عبداللہ القسری عراق کا گورنر رہا، مانویوں کو اس کی پشت پناہی حاصل رہی۔ سنہ ۱۲۰ھ میں وہ معزول ہوا۔ مگر اتنے میں نزاریہ و یمانیہ کی نزاع شروع ہو گئی جس کے فرو کرنے میں حکام اس درجہ مشغول ہوئے کہ مانویوں کی تبلیغی سرگرمیاں تو در کنار، ابومسلم خراسانی کی خفیہ شورش کا بھی انہیں پتہ نہ چل سکا۔ جب ۱۳۲ھ میں عباسی خلافت شروع ہوئی تو چوں کہ عباسی "شعوبیوں" (قوم پرست ایرانیوں) کی مدد سے برسر اقتدار آئے تھے، حکمراں طبقے نے نئے حامیتیوں کے بارے میں نرم تر پالیسی اختیار کی۔ یوں بھی پہلے عباسی خلیفہ ابوالعباس سفاح کا زیادہ وقت امویوں کے استیصال میں صرف ہوا، اور دوسرے خلیفہ ابوجعفر منصور کا ابومسلم سے نجات پانے اور امام نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کی بربادی میں گزرا۔ باقی وقت اس نے علوم حکمیہ کو ترقی دینے میں گزارا۔

البتہ جب منصور کا بیٹا مہدی خلیفہ ہوا تو اُسے ملاحدہ وقت بالخصوص مانوی زنادقہ کی سرگرمیوں کے خطرے کا احساس ہوا اور اس نے پہلے افہام و تفہیم کے ذریعے صورتحال کی اصلاح کی کوشش کی اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو پھر سختی کے ساتھ اس بڑھتے ہوئے فتنہ کو دبانے پر مجبور ہوا۔ مہدی نے ۱۶۹ھ میں وفات پائی اور اس کا بیٹا ہادی اس کا جانشین ہوا۔ ہادی نے بھی باپ کی روایت کو قائم رکھا اور باپ کی وصیت کے مطابق باپ سے زیادہ شدت کے ساتھ زنادقہ کے خلاف سختی کی اور اگرچہ وہ تقریباً ایک سال ہی خلیفہ رہا مگر ان باپ بیٹوں کی سخت گیری کا نتیجہ یہ نکلا کہ مانوی قلمرو کے خلافت سے فرار ہونے پر مجبور ہوئے۔ وہ اتنے خائف ہوئے کہ ہادی کے بھائی اور جانشین ہارون الرشید کے عہد میں بھی واپس آنے کی جرأت نہ کر سکے۔[1]

لیکن اگلی صدی میں متوکل علی اللہ کے قتل کے بعد جو ترک گردی شروع ہوئی

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ الرسل والملوک (مطبوعہ دار المعارف مصر) جز ۸ ص ۲۲۰۔

اور اس کے نتیجے میں جو انتشار و اختلال رونما ہوا تو جہاں دوسری فکری بے راہ رویوں کو سر اٹھانے کا موقعہ ملا، مانوی لوگ بھی شاید واپس آئے کیوں کہ ابن الندیم لکھتا ہے کہ وہ آخری مرتبہ مقتدر باللہ (۲۹۵ھ - ۳۲۰ھ) کے عہدِ خلافت میں جلاوطن کئے گئے۔

وآخر ما اجلوا فی ایام المقتدر[1] — آخری مرتبہ فرقہ مانویہ مقتدر باللہ (۲۹۵ - ۳۲۰) کے عہد میں جلاوطن کیا گیا۔

لیکن نہ تو مامون کے زمانہ میں انہوں نے سر اٹھایا (زنادقہ کے معاملے میں مامون اپنے دادا اور چچا سے کم سخت گیر نہیں تھا)، اور نہ اس کی تفلسف پسندی سے ان کے فتنہ کو شہ ملی۔ مزید تفصیل آگے آ رہی ہے۔

(ب) اجارہ داری الحاد :- جب تک عرب حکومت باقی رہی اور اموی جبّاریت و استبداد کا دور دورہ رہا، روح امامت کی منتقلی اور "حلول" کی بدعت خفیہ دسیسہ کاری سے زیادہ شدت اختیار نہ کر سکی۔ مگر عباسیوں کے برسرِ اقتدار آتے ہی جن تلواروں نے انہیں امویوں سے خلافت دلائی تھی، اس الحاد کی تائید میں بھی علم ہونا شروع ہو گئیں۔ ابو مسلم جو پہلے کیسانی مذہب کا قائل تھا، بعد میں سیّدنا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مایوس ہو کر محمد بن علی، پھر ابراہیم بن محمد اور آخرکار ابو العباس سفاح کی خلافت کے لئے سرگرمِ کار ہو گیا[2] لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاید خود اس منصبِ جلیل کا خواہاں تھا اور اسی خطرے کے سدباب کے پیشِ نظر خلیفہ ابو جعفر منصور نے اسے قتل کرا دیا۔ اس کے عقیدت مندوں کی ایک جماعت خراسان بھاگ گئی، جہاں انہوں نے "رزامیہ" کے نام سے ایک نئے فرقے کی بنیاد ڈالی[3]۔ فرقہ رزامیہ "روح امامت" کے ابو مسلم میں منتقل ہونے کا قائل تھا۔ امام عبد القاہر بغدادی نے لکھا ہے۔

---

[1] ابن الندیم، کتاب الفہرست ص ۴۷۲ — [2] الشہرستانی، کتاب الملل والنحل، الجزء الاول ص ۲۰۰ — [3] الشہرستانی، کتاب الملل والنحل، الجزء الاول ص ۲۰۰

واما الرزامية فقوم بمرو افرطوا	رہا فرقہ رزامیہ پس یہ مرو کی ایک قوم تھے جو
فی موالاۃ ابی مسلم	ابومسلم خراسانی سے بہت زیادہ موالات رکھتے
زعموا ان الامامۃ بعد السفاح	تھے ان کا گمان تھا کہ خلیفہ ابو العباس سفاح
صارت الی ابی مسلم[1]	کے بعد امامت ابومسلم کی طرف منتقل ہو گئی تھی،

بلکہ ان کا ایک گروہ جو " ابومسلمیہ " کہلاتا تھا، ابومسلم کی الوہیت کا قائل تھا۔ امام عبدالقاہر نے آگے چل کر لکھا ہے:۔

فرقۃ منھم یقال لھم ابومسلمیہ...	ان میں سے ایک فرقہ " ابومسلمیہ " کہلاتا تھا...
... زعموا انہ صار الٰہا	.... ان کا گمان تھا کہ روح الوہیت ابومسلم
بحلول روح الالٰہ فیہ[2]	میں حلول کر گئی تھی، جس کی وجہ سے وہ خدا بن گیا تھا۔

اسی فرقہ رزامیہ کا پیرو عطار بن حکیم تھا جو " مقنع " کے نام سے مشہور ہے اور جس نے شہر نخشب میں مصنوعی چاند بنایا تھا۔ اس مصنوعی چاند کا قصہ مشہور ہے لہٰذا اس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ مقنع نے بھی خلیفہ وقت کے خلاف بغاوت کی تھی اور ایک مضبوط قلعہ میں متحصن ہو گیا تھا۔ چودہ سال تک لشکر اسلام اس کی سرکوبی کے لیئے پریشان رہا۔ آخر میں جب مسلمان قلعہ پر قابض ہوئے تو اس نے اس سے پہلے ہی خود کو ایک تنور کے اندر پگھلتے ہوئے تانبے میں گھلا کر ہلاک کر لیا تھا۔ بہر حال اس کے بارے میں امام عبدالقاہر نے لکھا ہے:

واما المقنعیۃ، فھم المبیضۃ	رہے مقنعیہ تو وہ ماوراء النہر کے سفید پوش تھے
بماوراء النھر.... وکان زعیمھم المعروف	.... ان کا سردار وہ تھا جو مقنع کے نام سے

[1] عبدالقاہر بغدادی: الفرق بین الفرق، مکتب نشر الثقافۃ الاسلامیہ ص ۱۵۵۔

[2] ایضاً ص ۱۵۵۔

بالمقنع رجلاً اعور قصاراً بمرو... وكان على دين الرزامية بمرو ثم ادعى لنفسه الالهية ...... ودامت فتنته على المسلمين مقدار اربع عشرة سنة ...... هزم عساكر كثيرة من عساكر المسلمين في ايام المهدي ... وكان المقنع قد اباح لاتباعه المحرمات ..... واسقط عنهم الصلوٰة و الصيام ... وزعم لاتباعه انه هو الاله[1]

مشہور تھا، مرو کا ایک کانا دھوبی تھا... پہلے وہ رزامیہ کے مذہب کا پیرو تھا، پھر اپنی ذات کے لئے خدائی کا دعویٰ کرنے لگا، مسلمانوں کے خلاف اس کا فتنہ چودہ سال تک برابر رہا.. ..... مہدی (۱۵۸-۱۶۹ھ) کے عہد خلافت میں مسلمانوں کے ایک لشکر جرار نے اُسے شکست دی ..... مقنع نے اپنے پیروؤں کے لئے محرمات شرعیہ کو حلال کر دیا اور ان کے اوپر سے نماز روزہ کو ساقط کر دیا ..... اپنے پیروؤں کو اس نے اس گمان میں مبتلا کر دیا کہ وہ خدا ہے

(ج) زندقہ کی گرم بازاری اور استیصال :- اوپر ذکر آچکا ہے کہ شروع میں خالد بن عبداللہ القسری کی پشت پناہی سے اور اس کی معزولی کے بعد یمانیہ و نزاریہ کی خانہ جنگی سے اور عباسی عہد میں ایک جانب حکمراں طبقہ کی (جو احیائیت پسند قوم پرست ایرانیوں کی مدد سے برسر اقتدار آیا تھا) مداہنت اور نرمی اور دوسری جانب ان کے سیاسی بغاوتوں کے فرو کرنے میں انہماک سے قوی دل ہو کر زندقہ کی تحریک روز افزوں ترقی کرتی رہی۔ عباسی حکمرانوں کی دی ہوئی مذہبی آزادی سے مانویوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور وہ اندر ہی اندر اپنے الحاد و زندقہ کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرم رہے۔ یہ تبلیغ و اشاعت عوام و خواص دونوں طبقوں میں ہو رہی تھی۔

عوام میں اُن کے اغواء و تدلیس کے طریق کار کا تجزیہ خود خلیفہ مہدی نے کیا تھا۔ مگر اس کے ذکر سے پیشتر یہ جان لینا مستحسن ہوگا کہ زندقہ کی ترویج و اشاعت میں زنادقہ کی

[1] عبدالقاہر بغدادی: الفرق بین الفرق، مکتب نشر الثقافة الاسلامیة ص ۱۵۵۔

تبلیغی سرگرمیوں میں حالات کی معاونت بھی شامل تھی۔ دنیوی ترقی اور مادی خوش حالی اور اس کے نتیجہ میں اہل دول کی عیش کوشی و عقبیٰ فراموشی ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی اس کا ردِ عمل بھی فطری تھا لہٰذا لوگوں کی توجہ اسلام نیز غیر اسلامی مذاہب کی ایسی تعلیمات کی طرف مبذول ہو رہی تھی جو کسی نہ کسی درجہ میں زہد و ترک دنیا رہبانیت اور فسرار عن الحیاۃ نیز نیکوکاری کی تلقین کرتی تھیں۔ ان میں مانوی مذہب بھی تھا جس کے فرائض عشرہ حسب تصریح ابن الندیم ترک عبادت اصنام، ترک دروغ گوئی، ترک قتل، ترک زنا، ترک سرقہ و تعلیم حیل و سحر وغیرہ تھے[1] ظاہر ہے اجتناب فواحش، زہد اور خوفِ اخروی ایسے امور ہیں جن کی جانب انسانی فطرت بالطبع مائل ہوتی ہے۔ اس لئے خواہی نخواہی لوگوں کی رغبت مانویت کی طرف بڑھنے لگی پھر چونکہ رقت قلبی جانداروں کی ایذا رسانی سے طبعاً مانع ہے لہٰذا نئے عقیدت کیشوں کو گوشت خوری وغیرہ چھوڑنے میں بھی زیادہ حرج نہ معلوم ہوتا اور جب ان امور میں پختہ ہو جاتے تو پھر ان کے اصولی نظریات IDEALOGY پر بھی کچھ لوگ ایمان لے آتے۔ یہ اصولی نظریات "ثنویت" DUALISM یا نور و ظلمت کے عقیدہ و پرستش کا دوسرا نام تھی اور جب کوئی شخص اسلام کی توحید کو چھوڑ کر جو "اصل دین" ہے نور و ظلمت کی پرستش کرنے لگے تو پھر حلال و حرام کی تفریق کی کوئی منطقی اساس باقی نہیں رہتی اس کے بعد "اباحت" میں جو عموماً مجوسی فرقوں کی مشترک تعلیم ہے، کیا باک ہو سکتا تھا۔ اس طرح اجتناب فواحش کی نیکوکارانہ تعلیم سے شروع کر کے انسان آخرکار اباحت کی شیطنت کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ خلیفہ مہدی نے اپنے بیٹے اور ولیعہد ہادی کو مانویہ کے طریق کار کے بارے میں بتایا تھا:

..... (تفادا ے الفرقۃ المانویہ) یہ فرقہ مانویہ لوگوں کو بظاہر اچھی باتوں کی طرف دعوت دیتا ہے جیسے فواحش و منکرات
تاریخ الطبری لعاس ابی طاھر حسن کا جلناب

[1] ابن الندیم: کتاب الفہرست صفحہ ۴۶۵۔

الفواحش والزهد فی الدنیا والعمل | سے بچنا، دنیا سے بے رغبتی، آخرت
للآخرة۔ ثم تخرجها الی تحریم | کے لئے تیاری پھر انہیں گوشت حرام کرنے
اللحوم ومس الماء الطهور وترك | آب پاکیزہ کو چھونے اور کیڑے مکوڑے (جانداروں)
قتل الهوام تحرجاً۔ ثم تخرجها | کا قتل چھوڑنے کی تعلیم دیتا ہے۔ پھر دو خداؤں
الی عبادة اثنین احدهما النور | کی عبادت کرنے کی تلقین کرتا ہے جن میں سے
والآخر الظلمة ثم تبیح بعد | ایک نور ہے دوسرا ظلمت۔ پھر بہن بیٹی کیساتھ
هذا نکاح الاخوات والبنات | نکاح کرنے کو جائز قرار دیتا ہے نیز پیشاب سے
والاغتسال بالبول وسرقة | غسل کرنے اور بچے چرانے کو مباح قرار دیتا
الاطفال من الطرق لتنقذهم | ہے تاکہ اس طرح انہیں ظلمت کی گمراہی سے نور
من ضلال الظلمة الی هدایة النور[1] | کی ہدایت کی طرف نجات کا راستہ بتلائے۔

اس طرح مانویت خاموشی کے ساتھ سادہ لوح لوگوں میں اندر ہی اندر گھر کر رہی تھی۔

ادھر علماء بالخصوص متکلمین نے ان کی ان دسیسہ کاریوں کا پردہ چاک کرنے کی غرض سے ان کی تعلیمات کو قیل وقال کا موضوع بنایا۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لئے مانویوں کے رؤسار واہل قلم نے بھی اپنی تعلیمات مذہبی کی تائید میں کتابیں لکھیں نیز متکلمین اسلام نے ان پر جو ردود و نقوض وارد کئے تھے ان کی تردید وابطال کی سعی مشئوم کی۔ اس طرح انہوں نے اپنے مسلک کی معقولیت کو طبقۂ خواص میں بھی مقبول بنانے کی کوشش کی چنانچہ ابن الندیم نے ان کی سرگرمیوں کے سلسلے میں لکھا ہے:۔

ولهؤلاء کتب مصنفة فی | ان لوگوں نے ثنویت اور اس کے پیروؤں
نصرة الاثنین ومذاهب | کے مذاہب کی تائید میں کتابیں تصنیف کیں
اهلها۔ وقد نقضوا کتباً | اور متکلمین اسلام نے اس باب میں جو کتابیں

[1] طبری: تاریخ الرسل والملوک۔ الجزء الثامن۔ ۲۲۰

کثیرۃ ضعفھا المتکلمون فی ذالک[1] لکھی تھیں ان میں سے بہت سی کتابوں کا رد لکھا
منصور جس وجہ سے بھی ہو مانویت اور زندقہ میں مضمر خطرات کو اہمیت نہ دے سکا حالانکہ
یہ نہ صرف توحید باری تعالٰی کے انکار اور "ثنویت" کی تلقین ہی پر اصرار کرنے تھے بلکہ اباحت
مطلقہ کی اخلاقی نراجی کے ساتھ ساتھ سیاسی مزاج اور نسل کشی کی جانب منجر ہوتے تھے۔
البتہ منصور کے جانشین مہدی نے ان خطرات عواقب کا اندازہ بروقت لگا لیا مگر وہ بالطبع
رقیق الطبع تھا اور قتل و خونریزی سے بالخصوص ہاشمی خاندان کے افراد کے قتل کے لئے
تیار نہ تھا۔ لہذا اس نے افہام و تفہیم کے ذریعے زنادقہ و ملاحدہ کو راہ راست پر لانے کی
کوشش کی اور اس کے لئے متکلمین کی خدمات حاصل کیں۔ مسعودی لکھتا ہے:۔

وکان المھدی اول من امر الجدلیین	اور مہدی پہلا خلیفہ تھا جس نے طبقۂ متکلمین
من اھل البحث من المتکلمین	میں سے مناظرہ کرنے والے اہل جدل کو بلا کر
بتصنیف الکتب فی الرد علی الملحدین	ان ملحدوں کے رد میں کتابیں تصنیف کرنے
ممن ذکرنا من الجاحدین وغیرھم	کا حکم دیا جن کا منکرین باری تعالٰی وغیرہم فرقوں
واقاموا البراھین علی المعاندین	کے سلسلے میں ہم نے ذکر کیا ہے اور انہوں نے
وازالوا شبہ الملحدین فاوضحوا	مخالفین اسلام کے مقابلہ میں دلائل و براہین
الحق للشاکین[2]	قائم کئے، ملاحدہ کے شبہات دور کئے اور متشککین
	کے لئے حق کو واضح کیا۔

مگر مقابلہ مانوی زنادقہ سے تھا جو اس قسم کے مناظروں کے کہنہ مشق کھلاڑی تھے۔ لہذا
حسب تصریح ابن الندیم انہوں نے متکلمین کی اصلاحی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ وقد نقضوا
کتبا کثیرۃ ضعفھا المتکلمون فی ذلک۔

---

[1] ابن الندیم: کتاب الفہرست صفحہ ۴۰۳

[2] مسعودی: مروج الذہب و معادن الجواہر جلد ۲ صفحہ ۴۰۱۔

مجبوراً مہدی کو تشدد کا سہارا لینا پڑا اور اس فتنہ کے سدباب کے لئے دار وگیر کا سلسلہ شروع ہوا یہ سلسلہ مہدی کے عہد خلافت کے آخر میں (۱۶۳ھ) سے شروع ہوتا ہے اور مہدی کے جانشین ہادی کے زمانہ میں انتہائی عروج کو پہنچ جاتا ہے (تفصیل جلد آتی ہے) ویسے زنادقہ کی سرکوبی کے واقعات جستہ جستہ منصور ہی کے زمانہ سے ملتے ہیں اگرچہ یہ منصور کے خلافِ مرضی ہوئے تھے۔

معتزلہ کے سلسلے میں پچھلی قسط (برہان جولائی ۱۹۷۰ء) میں بصرے کے آزاد خیال متکلمین کا ذکر آچکا ہے ان میں سے تین کو ابن الندیم نے "ومن رؤساء ہم المتکلمین الذین یظہرون الاسلام ویبطنون الزندقة"[1] کے ذیلی عنوان میں ذکر کیا ہے یعنی نعمان بن ابی العوجاء (غالباً عبدالکریم بن ابی العوجاء)، صالح بن عبدالقدوس اور شاعر بشار بن برد۔ ان میں سے اوّل الذکر عبدالکریم بن ابی العوجاء بہت بڑا انشاء پرداز تھا اتنا کہ بآسانی احادیث نبوی کے انداز پر حدیثیں گڑھ سکتا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے اس قسم کی چار ہزار حدیثیں مشتہر کی ہیں جن کے ذریعے حلال کو حرام حرام کو حلال گردانا ہے[1]۔ چنانچہ مورخ طبری نے ۱۵۵ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ کوفہ میں محمد بن سلیمان کی گورنری کے زمانہ میں عبدالکریم بن ابی العوجاء اپنی زندیقانہ و ملحدانہ سرگرمیوں کی بنا پر گرفتار ہو کر آیا۔ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا بلکہ مشہور معن بن زائدہ کا ماموں تھا جو اکابر وجوہ و اعیان مملکت میں سے تھا لہٰذا دار الخلافہ میں بہت سے اکابر نے منصور سے اس کی رہائی کی سفارش کی۔ ان کے دباؤ سے مجبور ہو کر خلیفہ نے گورنر محمد بن سلیمان کو لکھا کہ تاحکم ثانی عبدالکریم کو کوئی سزا نہ دی جائے۔ خلیفہ کے خط کی اطلاع عبدالکریم کو بھی ہو گئی اور اس نے ایک شخص عبدالجبار کو بلا کر کہا کہ اگر

---

[1] تاریخ الطبری: الجزء الثامن (مطبوعہ دار المعارف بمصر ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء) صفحہ ۴۸ ذکر الخبر عن سبب عزل المنصور محمد بن سلیمان بن علی۔ لقد وضعت اربعة آلاف حديث احرم فيها الحلال واحل فيها الحرام۔ والله لقد فطرتكم في يوم صومكم وصومتكم في يوم فطركم۔

امیر محمد بن سلیمان، تین دن کی مہلت دے دیں تو ایک لاکھ آپ کی خدمت میں اور ایک
لاکھ تمہیں عن ملت عبدالجبار نے گورنر محمد بن سلیمان، سے کہا تو بولے میں تو بھول ہی گیا،
اچھا ہوا آپ نے یاد دلا دیا۔ ذرا جمعہ کی نماز پڑھ آؤں تو یاد دلانا۔ نماز جمعہ سے واپسی پر جب
عبدالجبار نے یاد دہانی کی تو گورنر محمد بن سلیمان نے عبدالکریم کو قتل کرانے کے لئے بلایا
تو جب اُسے اپنے قتل کئے جانے کا یقین ہو گیا تو اس نے اپنی حرکت (وضع احادیث) کا
اقرار کیا، جب منصور کا حکمنامہ گورنر کے پاس پہونچا تو اس نے قاصد کو اس کی لاش دکھا دی۔
جب منصور کو اس کی اطلاع ہوئی تو بہت ناراض ہوا اور اُسے معزول کرنے کا حکم کیا مگر عیسیٰ
بن علی نے سمجھایا کہ محمد بن سلیمان نے اُسے زندقہ کے جرم میں قتل کیا تو کہیں جا کر اس کا غصہ
فرو ہوا[1]

اس تفصیل سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ منصور نے اس فتنہ میں جو خطرات مضمر ہیں انہیں
کوئی اہمیت نہیں دی۔ لیکن اس باب میں مہدی نے زیادہ بیدار مغزی سے کام لیا۔ اس نے
پہلے افہام وتفہیم کے ذریعہ اس فتنہ کے سدباب کی کوشش کی اور متکلموں کو بلا کر ان ملاحدہ
وزنادقہ کے اصلاح عقائد کے لئے کتابیں لکھوائیں مگر جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو مجبوراً
تشدد کا سہارا لیا۔ اس دار و گیر کا سلسلہ اس نے ۱۶۶ھ سے شروع کیا چنانچہ اس سال
بہت سے لوگ زندقہ کے الزام میں ماخوذ ہو کر اس کے سامنے پیش ہوئے۔ ان میں بہت
سے وجوہ واعیان مملکت کے عزیز واقارب بھی تھے جیسے بصرہ کے گورنر روح بن حاتم کا
بیٹا داؤد دوسرے مشاہیر میں اسماعیل بن مجالد محمد بن ابی ایوب مکی اور محمد بن طیفور کا خصوصیت

---

[1] تاریخ الطبری: الجزء الثامن (مطبوعہ دار المعارف بمصر ۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۶ء) صفحہ ۴ (دیکھیں حاشیہ ص۱۹۷)،

سے مؤرخین نے ذکر کیا ہے۔[1] ان لوگوں نے اپنے زندیق ہونے کا اقرار کیا۔ قاعدے کے مطابق ان سے توبہ کرنے کے لئے کہا گیا اور توبہ کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔ گورنر بصرہ کے بیٹے داؤد کو اس کے باپ کے پاس اصلاح و تادیب کے لئے بھیج دیا۔

لیکن اس سے بھی اس فتنہ میں کمی نہیں ہوئی۔ لہٰذا اگلے سال ۱۶۷ھ میں مہدی نے زنادقہ کی تلاش و تجسس میں زیادہ سرگرمی سے کام لیا اور انہیں گرفتار کر کے قتل کرایا۔ مؤرخ طبری نے ۱۶۷ھ کے واقعات میں لکھا ہے:۔

وفیہا جد المہدی فی طلب الزنادقۃ والبحث عنہم فی الآفاق وقتلہم۔[2]

مہدی نے اس باب میں اتنا اہتمام برتا کہ اس کام کے لئے ایک خصوصی پولیس افسر "صاحب الزنادقہ" کے نام سے مقرر کیا اور اس عہدے پر عمر الکلواذی کا تقرر کیا۔[3] اس نے منصور کے کاتب یزید بن فیض کو اس جرم میں گرفتار کیا۔ یزید نے زندقہ کا اقرار کر لیا اور قید خانہ میں ڈال دیا گیا مگر کسی طرح وہاں سے فرار ہو گیا اور پھر ہاتھ نہیں آیا۔[4]

اگلے سال (۱۶۸ھ) میں عمر الکلواذی کا انتقال ہو گیا اور مہدی نے اس کی جگہ محمد بن عیسیٰ احمدویہ کو مقرر کیا۔[5] زنادقہ کی تلاش و جستجو میں بہت زیادہ شدت ہو گئی اور بقول مؤرخ طبری، مہدی نے بہت سے زندیقوں کو قتل کیا۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ بصرہ کے آزاد خیالوں کی ٹولی میں مشہور شاعر بشار بن برد بھی تھا۔ اسے ابن الندیم نے زنادقہ کے ان اکابر میں شمار کیا ہے جو بظاہر مسلمان تھے مگر بباطن زندیق۔

---

[1] تاریخ طبری (بتفصیل بالا) الجزء الثامن صفحہ ۱۶۳ نیز الکامل لابن الاثیر الجزء السابع صفحہ ۴۷

[2] تاریخ طبری الجزء الثامن صفحہ ۱۶۵ نیز الکامل لابن الاثیر الجزء السابع صفحہ ۵۰۔ "اس سال مہدی نے زنادقہ کی تلاش و جستجو اور ان کے قتل میں بہت زیادہ کوشش کی۔"

[3] تاریخ طبری الجزء الثامن صفحہ ۱۶۵

[4] ایضاً صفحہ ۱۶۵ [5] ایضاً صفحہ ۱۶۷

بشار رجعت کے عقیدے کے ساتھ آتش پرستی کا بھی قائل تھا جس کی تائید میں اس کا مندرجہ ذیل شعر پیش کیا جاتا ہے:-

والارض مظلمة والنار مشرقة   والنار معبودة مذ كانت النار[1]

بہرحال ۱۶۸ھ میں وہ بھی ختم کرا دیا گیا۔[2]

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مہدی کی اس کوشش میں بھی مزید شدت پیدا ہوتی گئی چنانچہ ۱۶۹ھ میں جس سال اس نے وفات پائی یہ تلاش و جستجو انتہا کو پہونچ گئی اور کثیر تعداد میں لوگ اس جرم کے اندر ماخوذ ہو کر قتل ہوئے بقول ابن الاثیر:

و فيها اشتد طلب المهدى للزنادقة فقتل منهم جماعة[3]	اور اس سال مہدی کی زنادقہ کی تلاش بہت زیادہ بڑھ گئی اور اس نے ان میں سے ایک جماعت کو قتل کرا دیا۔

ان سزائے موت پانے والوں میں عام وجوہ و اعیان ملک کے علاوہ بنو ہاشم بھی تھے جو خاندان خلافت میں مخصوص وجاہت و نباہت رکھتے تھے۔ ان میں دو شخص خصوصیت سے قابل ذکر ہیں: یعقوب بن الفضل جس کا سلسلہ نسب عباسی خلفاء کے مورث اعلیٰ عباس بن عبدالمطلب کے بھائی حارث بن عبدالمطلب تک پہنچتا تھا اور عبداللہ بن داؤد بن علی بن عبداللہ بن عباس دونوں نے زندقہ کا اقرار کیا مگر توبہ نہیں کی لہٰذا قید خانہ میں ڈال دیئے گئے، داؤد بن علی مہدی کے وفات پانے سے قبل ہی مر گیا مگر یعقوب بن الفضل زندہ رہا اور مہدی کے بیٹے اور جانشین موسیٰ الہادی نے باپ کی وصیت کے مطابق اسے قتل کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مہدی اپنی زندقہ بیزاری کے باوجود رقیق القلب تھا اور کم از کم بنو ہاشم کو قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایسا کرنے کی قسم بھی کھائی تھی چنانچہ جب یعقوب بن الفضل نے زندقہ کا اقرار کیا اور اس سے توبہ

[1] زمین تاریک ہے اور آتش روشن ہے اور آتش جب سے آتش ہے رہی ہمیشہ سے معبود رہی ہے۔

[2] تاریخ طبری الجزء الثامن ص ۱۸۱ [3] کامل لابن الاثیر الجزء السابع صفحہ ۹۸

کرنے سے انکار بلکہ اس پر سختی سے قائم رہنے پر اصرار کیا تو بقول ابن الاثیر مہدی نے کہا:-

واللہ لولا انی جعلت علی نفسی ان لا اقتل ھاشمیاً لقتلتک[1]	خدا کی قسم اگر میں نے یہ عہد نہ کیا ہوتا کہ کسی ہاشمی کو قتل نہیں کروں گا تو یقیناً تجھے قتل کر دیتا۔

لہٰذا اس نے اپنے بیٹے اور جانشین موسیٰ الہادی کو وصیت کی:

یا موسیٰ اقسمت علیک بحقی ان ولیت ھذا الامر بعدی لا تناظرھما ساعۃ واحدۃ[2]	اے موسیٰ میرا تیرے اوپر جو حق ہے تجھے اسی کی قسم دیتا ہوں اگر تو میرے بعد اس منصب خلافت پر فائز ہو تو گھڑی بھر کی بھی ان دونوں کو مہلت نہ دیجیو۔

چنانچہ جب موسیٰ الہادی خلیفہ ہوا اور اُسے یہ وصیت یاد آئی تو یعقوب کو بلا کر اس پر فرش ڈلوا دیا گیا جس پر آنے والے بیٹھتے رہے۔ یہ گرمی کی ایک دوپہر تھی۔ رات تک اس کی لاش پھول گئی اور اس کے بھائی اسحاق بن الفضل کو دے دی گئی چوں کہ لاش اس درجہ خراب ہو چکی تھی کہ غسل کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اس لئے اسی طرح دفن کر دی گئی[3]

مہدی کو زنادقہ کے قتل و بیخ کنی میں اس درجہ اہتمام تھا کہ وہ خواب میں بھی کچھ اسی قسم کی باتیں دیکھا کرتا تھا۔ چنانچہ جس سلسلۂ گفتگو میں اس نے اپنے بیٹے ہادی سے گروہ زنادقہ کے اغوا و تدلیس کے طریقۂ کار کا بیان کیا تھا، اسی میں اپنے ایک خواب کا بھی ذکر کیا کہ میں نے اپنے مورث اعلیٰ عباس بن عبدالمطلب کو خواب میں دیکھا انھوں نے میری کمر میں دو تلواریں باندھیں تاکہ میں ان سے ان "ثنویوں" (مانوی زنادقہ) کو قتل کروں[4]

---

[1] کامل لابن الاثیر الجزء السابع ص ۸۹۔

[2] تاریخ طبری الجزء الثامن صفحہ ۱۹۰۔　　[3] ایضاً صفحہ ۱۹۰۔

[4] تاریخ طبری، الجزء الثامن ص ۲۲۰۔ "انی رأیت جدک العباس فی المنام قلدنی سیفین وامرنی بقتل اصحاب الاثنین"

ویسے بھی یہ زنادقہ سماج کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا تھے بظاہر اجتناب فواحش اور زہد و رہبانیت اور ترک دنیا ان کا شعار تھا، مگر ان میں بدکاری اور اباحت حدود حد تک پہونچ گئی تھی اور حرام و حلال کے شرعی و فطری ضابطوں سے بھی خود کو بے قید بنا لیا تھا۔ یعقوب بن الفضل کے ساتھ اس کے گھر کی خواتین بھی گرفتار ہو کر آئی تھیں، مہدی نے ان کا معائنہ ریطہ بنت ابو العباس السفاح سے کرایا اور یعقوب کی بیٹی نے اقرار کیا کہ اسے باپ کا حمل ہے نعوذ باللہ منہا اور جب اُسے لعنت ملامت کی تو کہنے لگی کہ مجھے اس بات پر بالجبر مجبور کیا تھا۔ اس پر کہا گیا کہ کیا یہ بناؤ سنگھار اور مہندی، سرمہ بھی اسی جبر و اکراہ کا حصہ تھا؟[1] بہر حال دونوں ماں، بیٹی کے سروں پر ایک حربہ رعبوب مارا گیا اور وہ خوف سے مر گئیں۔ جب ہاشمی النسب زندیقوں کی بدکاری کا یہ عالم ہو تو مجوسی الاصل زنادقہ کا کیا کہنا جن کی قوم میں "محرمات" کا لفظ ہی بے معنی تھا۔ مہدی نے ۱۶۹ھ میں وفات پائی اور ہادی اس کا جانشین ہوا۔ باپ کی وصیت کے مطابق[2] اسے زنادقہ کی تلاش و جستجو اور ان کے استیصال پر اپنی پوری قوت صرف کر دی۔ ہادی نے جس بیدردی سے یعقوب کو قتل کرایا پیچھے اس کا تذکرہ آ چکا ہے۔ اگلے سال اس

---

[1] تاریخ طبری الجزء الثامن ص ۱۰۹ :- "فادخلت فاطمة وامرأة يعقوب بن الفضل... فاقرتا بالزندقة واقرت فاطمة انها حامل من ابيها فارسل بهما الى ريطة بنت ابي العباس فرأتهما مكحلتين مختضبتين فعذلتهما واكثرت على الابنة خاصة - فقالت اكرهني، قالت فما بال الخضاب والكحل والسرور ان كنت مكروهة ولعنتها.... فخبرت انهما فزعتا فماتتا فزعاً ضرب على رؤسهما بشئ يقال له الرعبوب، ففزعتا منه فماتتا۔

[2] ایضاً ص ۲۲۰ :- ان المهدى قال لموسى..... يا بنى ان صار لك هذا الامر فتجرد لهذه العصابة يعنى اصحاب مانى فانها فرقة تدعو الناس الى ظاهر حسن ..... ثم تخرجها الى عبادة اثنين .... ثم تبيح بعد هذا نكاح الاخوات والبنات..... فارفع فيها الخشب وجرد فيها السيف وتقرب بامرها الى الله لا شريك له۔

نے اپنی سرگرمیوں کو انتہائی طور پر شدید کر دیا[1]۔ چناں چہ متوقعہ مجرموں کو پھانسی دینے کے لئے ایک ہزار درختوں میں سولیاں نصب کرائیں مگر بدقسمتی سے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی مر گیا[2]۔

دیہ بھی واضح رہے کہ ہادی کے بھائی اور حریف ہارون کا اتالیق یحییٰ بن خالد برمکی تھا، جس کے خاندان کو بعد میں خود ہارون نے بڑی سختی سے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ برامکہ پر جو الزامات تھے ان میں سے ایک الزام زندقہ کا بھی تھا اور یہ بات بہت زیادہ مشہور تھی۔ چناں چہ ابن الندیم نے عہد عباسی کے زنادقہ کی فہرست کا افتتاح ہی برامکہ سے کیا ہے، وہ کتاب الفہرست میں ذکر من کان یرمیٰ بالزندقۃ من الملوک والرؤساء" کے زیر عنوان لکھتا ہے: "قیل ان البرامکۃ باسرھا الا محمد بن خالد بن برمک کانت زنادقۃ"[3]

یہ بھی واضح رہے کہ جب ہادی نے ہارون کو اپنے بیٹے عیسیٰ کے حق میں ولیعہدی سے دستبردار ہونے کے لئے مجبور کیا تو یہ یحییٰ بن خالد برمکی ہی کی ذات تھی جس نے ہارون کو ہادی کی اس دھمکی میں نہ آنے دیا اور وہ اپنے حق سے دستبردار نہ ہوا۔ آخر کیوں؟ کیا برامکہ ہادی کی زندقہ سوزی سے خائف تھے اور آخر میں یہ بھی واضح رہے کہ ہادی نے صرف ڈیڑھ سال کی مختصر حکومت کے بعد بڑے پُراسرار حالات میں وفات پائی، کیا اس میں اس کی ماں خیزران

---

[1] تاریخ طبری: الجزء الثامن ص ۱۹۰ "فی ھذہ السنۃ اشتد طلب موسیٰ الزنادقۃ فقتل منھم فیھا جماعۃ" نیز ص ۲۲۰: "اما واللہ لئن عشت لاقتلن ھذہ الفرقۃ کلھا حتی لا اترک منھا عینا تطرف"

[2] ایضاً ص ۲۲۰: "ویقال انہ امر ان یھیأ الف جذع... ومات بعد شھرین"

[3] ابن الندیم: کتاب الفہرست ص ۴۷۳۔ کہا گیا ہے کہ برمکی خاندان پورے کا پورا سوائے محمد بن خالد بن برمک کے زندیق تھا۔

کے علاوہ اور کسی کا بھی ہاتھ تھا؟ ۔

اگرچہ ہادی کا استیصالِ زندقہ کا منصوبہ پورا نہ ہو سکا مگر اس سے ملاحدہ و زنادقہ میں ایک دھاک ضرور بیٹھ گئی اور جو لوگ اس مذہب کے پیرو رہ گئے تھے وہ یا تو فرار ہو گئے یا پھر چھپ گئے لہٰذا ہادی کے جانشین ہارون کی عام معافی کے اعلان کے باوجود کسی زندیق نے دوبارہ واپس آنے کی جرأت نہ کی چنانچہ طبری نے ۱۷۰ھ کے واقعات میں لکھا ہے :۔

وفیھا آمن من کان ھاربا	اور اس سال سب مجرم، لوگوں کو خواہ
او مستخفیا غیر نفر من الزنادقۃ	مفرور ہوں یا چھپے ہوئے امان دی گئی
منھم یونس بن فروۃ ویزید	سوائے چند زندیقوں کے جن میں یونس بن
بن الفیض[1]	فروہ اور یزید بن فیض قابل ذکر ہیں۔

مہدی اور ہادی نے زنادقہ کے خلاف جو دار و گیر کی اس کا خوف ان لوگوں پر عرصہ دراز تک چھایا رہا۔

زندقہ ہادی کے بعد اور مامون سے پہلے

ہارون کے پورے عہد خلافت میں بجز دو واقعوں کے زنادقہ کا ذکر سننے میں نہیں آتا :۔

ایک جب کہ ۱۸۰ھ میں فرقۂ محمرہ نے جرجان میں بغاوت کی تو وہاں کے والی علی بن عیسیٰ بن ماہان نے خلیفہ کو لکھا کہ انہیں ورغلانے میں ایک زندیق عمر بن محمد العمر کا ہاتھ تھا، لہٰذا خلیفہ کے حکم سے اُسے شہر مرو میں قتل کیا گیا[2]

دوسرا واقعہ برامکہ کے متوسلین میں سے ایک شخص انس بن شیخ کا ہے، جس رات کو برمکی وزیر جعفر بن یحییٰ قتل کیا گیا اس کی اگلی صبح کو انس بن شیخ کو خلیفہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن مصعب نے خلیفہ کو خبر دی تھی کہ انس بن شیخ زندیق ہے بہرحال انس بن شیخ قتل کر دیا گیا[3]

---

[1] تاریخ طبری الجزء الثامن ص ۲۳۴۔ [2] ایضاً ص ۲۶۴۔ [3] ایضاً ص ۲۹۷۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برامکہ کے متوسلین میں زنادقہ بھی تھے۔ بہرحال پھر زنادقہ کا ذکر سننے میں نہیں آتا۔ ہارون کے بعد اس کا بیٹا امین تخت نشین ہوا۔ وہ "عرب کے سوتوں" کا آخری نمائندہ تھا، لہذا اس کے زمانہ میں زندقہ کا کیا سوال۔ البتہ سانپ نکل گیا اور لوگ لکیر کو پیٹا کرتے تھے۔ لہذا اب اگر دربار خلافت میں کسی کو معتوب کرنا ہوتا تو اس پر زندقہ کا الزام لگا دیا جاتا۔ چنانچہ امین مشہور شاعر ابونواس سے ناراض تھا اور اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اُسے وہ ایک حبہ بھی انعام نہ دے گا۔ ابونواس عربی ادب میں اپنی خمریات کے لئے مشہور ہے اور ساتھ ہی شعرائے مجّان میں بھی محسوب ہوتا ہے۔ اس کا ایک شعر ہے:-

فجاء بها زیتیۃ ذھبیۃ فلم نستطع دون السجود لھا صبراً

امین کو اس شعر کی اطلاع دی گئی اور اس نے اس شعر کو بہانہ بنا کر ابونواس کو قید خانہ میں ڈلوا دیا اور کہا:-

ایہ انت کافر وانت زندیق[1]

شعر ملحدانہ ضرور ہے مگر فارسی اور اردو میں خیام اور جوش نے، اس سے زیادہ کفر سرائی کی ہے حتیٰ کہ مومن خاں مومن اپنے تشدد فی الوہابیت کے باوجود شراب نہ سہی شاہد کے پاؤں پر سجدہ کرتے نہیں جھکتے:-

یہ ہم سجود پائے صنم پر دم وداع مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

دوسری روایت یہ ہے کہ ابونواس خلیفہ امین کے پاس آیا تو امین نے کہا کہ خدا کی قسم تجھے میرے خزانے سے کچھ بھی نہیں ملیگا۔ ایک حاشیہ نشین سلیمان بن جعفر نے نمک مرچ لگایا کہ امیرالمومنین یہ تو بہت بڑا ثنوی زندیق ہے (ھومن کبار الثنویہ) خلیفہ کو اپنی ناراضگی کے لئے ایک وجہ جواز ہاتھ آگئی اور حکم دیا کہ اس پر گواہ پیش کرو گواہوں میں سے ایک شخص نے ابونواس کی مے نوشی کا ذکر کیا کہ ایک دن جب بارش ہو رہی تھی تو اس نے (ابونواس نے) جام مے کو آسمان کے نیچے

[1] تاریخ طبری الجزء الثامن ص ۵۲۵۔

رکھدیا اور کہا: "کہتے ہیں کہ ہر قطرۂ باران کیساتھ ایک فرشتہ کا نزول ہوتا ہے اب تم دیکھو گے میں کتنے فرشتوں کو بے جا رہا ہوں۔ امین نے اس بات کو بہانہ بنا کر ابو نواس کو قید کر دیا"[1]

اس تفصیل سے واضح ہو گیا ہو گا کہ زندقہ مامون کے تخت خلافت پر متمکن ہونے اور فلسفہ کے ساتھ اعتنا کرنے سے کہیں پہلے وجود میں آچکا تھا اور خلیفہ کے دادا مہدی اور چچا ہادی کا عہد حکومت زندقہ کی وبا کی شدت کا زمانہ تھا اور ان دونوں نے اُسے اس سختی سے دبایا کہ یہ تقریباً مستاصل ہی ہو گیا۔ اس کے بعد صرف نام ہی کے لئے اس کا ذکر سننے میں آتا ہے۔

مامون اور زندقہ بیزاری

مذکور الصدر تفصیل سے واضح ہے کہ زندقہ کی ابتدا اور ترقی و شدت مامون کی فلسفہ نوازی کی کسی طرح رہین منت نہیں تھی بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اپنی تفلسف پسندی کے باوجود مامون بھی زندقہ سے اتنا ہی بیزار تھا جتنا کہ اس کے دادا، چچا، باپ اور بھائی جیسا کہ سطور ذیل سے واضح ہو گا۔

امین و مامون کی برادرانہ خانہ جنگی کے نتیجہ میں جو سیاسی انتشار و اختلال رونما ہوا، اس کے نتیجے میں فکری بے راہ روی کو بھی شہ ملی۔ چناں چہ اُس عہد میں فرقہ مانویہ کا رئیس و پیشوا ایک مجوسی یزدان بخت تھا۔ وہ رے میں رہتا تھا۔ غالباً مانویوں اور دوسرے ثنوی فرقوں کو دار الخلافہ بغداد میں داخل ہونے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ مامون نے اس فرقہ کی دعوتی سرگرمیوں کے لئے بغداد بلایا۔ پہلے تو اُسے باضابطہ امان دی تاکہ لوگ (بالخصوص اس کے عقیدت مند) یہ دیکھ لیں کہ وہ کمال اطمینان اور بے خوفی کے ساتھ اپنے مذہب کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ ازاں بعد متکلمین سے علی رؤس الاشہاد اس کا مناظرہ کرایا۔ اس مناظرہ میں متکلمین کا پلہ بھاری رہا اور یزدان بخت کو خاموش ہونا پڑا، قانونی طور پر اب جب کہ اسلام کی حقانیت کی حجت اس پر قائم ہو چکی تھی اس کا اپنے کفر سے تائب ہونا اور اسلام قبول کرنا فرض تھا۔ لہذا مامون نے اس سے کہا یزدان بخت! اب ایمان لے آؤ کیونکہ اگر ہم تمہیں امان نہ دے چکے ہوتے تو جو کچھ تمہارا حشر ہوتا ظاہر ہے

---

[1] تاریخ طبری الجزء الثامن ص ۵۱۸۔

یزدان بخت[1] خلیفہ کے سلجھے ہوئے ذہن سے واقف تھا بولا امیر المؤمنین! آپ کی نصیحت اور ارشاد سر آنکھوں پر لیکن آپ ان حکمرانوں میں نہیں ہیں جو اپنی رعایا کو بجبر و تشدد اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں۔" مامون نے اس کا عذر قبول کر لیا لیکن چوں کہ عوام زنادقہ سے بیزار تھے لہذا اندیشہ تھا کہ کہیں ہجوم یزدان بخت پر (جو مانوی زنادقہ کا رئیس و پیشوا تھا، حملہ کر دے لہذا اسے ایک محفوظ مقام پر ٹھیرا کر وہاں محافظ مقرر کر دیئے۔

اس طرح ایک جانب مامون نے اپنے حسن تدبر سے ثابت کر دیا کہ ملک میں رعایا کو پورے طور پر مذہبی آزادی حاصل ہے، دوسری جانب دلیل و برہان کے باب میں فرقہ مانویہ کی تہی دستی و بے مائگی دکھا کر ان کے مسلک (زندقہ) کو معاشرہ میں قطعاً غیر مقبول اور ناقابل اعتبار بنا دیا باایں ہمہ پھر بھی ملک میں کچھ لوگ تھے جو خفیہ طور سے اس مسلک (زندقہ) پر قائم تھے۔ اور ایسے لوگ ہمیشہ رہے ہیں خود عہد رسالت میں منافق موجود تھے جو بظاہر مومن تھے مگر بباطن کافر مامون کے زمانہ میں بھی زنادقہ تھے بالخصوص بصرہ جیسے شہروں میں جہاں مختلف مذہبوں اور ملتوں کے لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ لیکن اپنے دادا اور چچا کی طرح مامون نے بھی ان کے استیصال و بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مشہور معتزلی متکلم ثمامہ بن اشرس سے جو خلیفہ المامون کا منہ چڑھا درباری تھا مسعودی نے ایک طفیلی کا قصہ نقل کیا ہے جو زنادقہ کی ایک جماعت کے ساتھ ہو لیا تھا۔ مامون کو اس کے مخبروں نے اطلاع دی تھی کہ بصرہ میں دس زندیقوں کی ایک جماعت ہے جو بظاہر مسلمان ہیں مگر بباطن مانوی۔ مامون نے "امتحان" کے لئے انہیں بغداد پکڑوا بلوایا۔ طفیلی بھی جو دعوت کھانے کا شوقین تھا ان کے ساتھ ہو لیا"

---

[1] ابن الندیم: کتاب الفہرست ص ۴۷۳: "یزدان بخت وهو الذی احضره المامون من الری بعد ان امنه فقطعه المتکلمون ...... فقال المامون: اسلم یا یزدان بخت فلولا ما اعطیناك ایاه من الامان لكان لنا ولك شان - فقال له یزدان بخت نصیحتك یا امیر المؤمنین مسموعة وقولك هذا - ولكنك ممن لا یجبر الناس ترك مذاهبهم فقال المامون اجل وكان انزله ... ووكل به حفظة"

کیونکہ ان کی خوش پوشی اور بشاشت سے اُسے یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ لوگ کہیں دعوت میں مدعو ہیں اور اسی لیئے اس طرح ہنستے بولتے جارہے ہیں[۱]۔ قصہ اپنی جگہ دلچسپ ہے مگر ہمارے موضوع سے قطعاً غیر متعلق۔ اس میں صرف دو باتیں قابل غور ہیں:۔

پہلی بات ہے زندقہ کے الزام میں ماخوذ ہونیوالوں کا امتحان جھوٹ سے بچنا (ترک کذب) مانویوں کے فرائض مذہبی میں داخل تھا[۲]۔ چنانچہ مہدی اور ہادی کے زمانہ میں زنادقہ پیش ہوتے تھے اور بلا تکلف اپنے زندقہ کا اقرار کر لیتے تھے پھر ان سے توبہ کرنے کو کہا جاتا تھا، جو لوگ توبہ کر لیتے تھے چھوڑ دیئے جاتے، جو نہ کرتے بلکہ زندقہ ہی پر اصرار کرتے انھیں قتل کر دیا جاتا۔ طبری نے ۱۶۶ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ جب داؤد بن روح بن حاتم وغیرہ زندقہ کے الزام میں ماخوذ ہو کر آئے تو انہوں نے اپنے زندقہ کا اقرار کر لیا مگر جب توبہ کرنے کو کہا گیا تو توبہ کر لی اور چھوڑ دیئے گئے۔ "اُخِذَ داؤد... فاقروا فاستتابهم المهدی وخلّی سبیلهم[۳]۔" دوسری جگہ لکھا ہے کہ جب مہدی کے سامنے ایک زندیق پیش ہوا اور خلیفہ نے اس سے توبہ کرنے کو کہا تو اُس نے منع کر دیا۔ اس پر خلیفہ نے اس کو قتل کرا دیا۔ "قُدِّمَ الیہ زندیق فاستتابہ فابی ان یتوب فضُرِبَ عنقہ وامر بصلبہ[۴]۔"

لیکن بعد میں زنادقہ نے تقیہ کا سہارا لیا۔ اب وہ اپنے زندقہ کو چھپانے کے لئے خود کو مسلمان کہتے تھے لہذا جھوٹ کا پردہ چاک کرنے کے لئے:۔

۱۔ ان کے سامنے مانی کی تصویر رکھی جاتی تھی اور ان سے کہا جاتا تھا کہ اس پر تھوکیں، لعنت بھیجیں اور اس سے بیزاری کا اظہار کریں۔

۲۔ ایک آبی پرندہ دراج انہیں دیا جاتا کہ اُسے ذبح کریں۔ واضح رہے کہ کسی جاندار کو اذیت نہ پہونچانا، مانویوں کے مذہبی فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ جب مامون کے سامنے یہ جماعت (زنادقہ) پیش ہوئی تو ان کے اسلام کا بھی اسی طرح امتحان لیا گیا اور جب انہوں نے حکم ماننے سے انکار کیا

[۱] المسعودی: مروج الذہب ومعادن الجواہر (طبع بالمطبع البہیۃ المصریہ) الجزء الثانی ص ۲۲۰۔ [۲] کتاب الفہرست ص ۴۶۵۔ [۳] طبری: تاریخ الرسل والملوک۔ الجزء الثامن ص ۱۴۳۔ [۴] ایضاً ص ۱۴۲۔
[۵] المسعودی: مروج الذہب ومعادن الجواہر۔ الجزء الثانی ص ۲۴۰۔

تو انہیں قتل کرا دیا گیا۔

فلما وصلوا الی بغداد ادخلوا علی	پس جب وہ بغداد پہنچے تو مامون کے سامنے پیش کئے
المامون یدعو بأسمائهم رجلاً رجلاً	گئے خلیفہ مامون ایک ایک شخص کو نام بنام بلاتا اور اس سے
فسأله عن مذهبه فیجیبه بالاسلام	اس کا مذہب دریافت کرتا وہ جواب دیتا اسلام۔
فیمتحنه ویدعوه الی البرأة من	اس پر خلیفہ اس کا امتحان لیتا اور اسے مانی پر تبرا
مانی ویظهر له صورته ویامره ان	بھیجنے کے لئے کہتا، مانی کی تصویر دیتا اور حکم دیتا کہ اس پر
یتفل علیها والبراءة عنها وغیر	تھوکو اور اس سے بیزاری کا اظہار کرو اور اسی قسم کے
ذالك ـ فیابون فیامرهم	دوسرے امتحانات، اس پر یہ لوگ منع کر دیتے تو انہیں قتل
علی السیف[۱]	کرا دیتا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مامون اس لعنت کے استیصال میں کتنی شدت برتتا تھا۔ زندقہ سے اسکی بیزاری اور بیدار مغزی کا یہ عالم تھا کہ جب اسے بصرہ کے اندر ان زندیقوں کی اطلاع ملی تو اس نے نام بنام ان کے گرفتار کرنے کے حکم جاری کئے مسعودی لکھتا ہے:۔

فامر بحملهم الیه بعد ان سموا	خلیفہ نے حکم دیا کہ وہ اس کے پاس لائے جائیں بعد اس کے
واحداً واحداً[۲]	کہ ایک ایک کی نام بنام تفصیل بتائی گئی۔

اور جب انکا مقدمہ پیش ہوا اور انہیں قتل کرا چکا اور گیارہواں شخص (طفیلی) پیش ہوا تو اس نے پوچھا یہ کون ہے[۳]؟ کیونکہ نہ تو مامون کو اس کے زندقہ کی اطلاع ملی تھی اور نہ اس نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا تھا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مامون کو بھی زنادقہ و ملاحدہ کے استیصال کے ساتھ اتنا ہی شغف تھا جتنا کہ اس کے دادا مہدی اور چچا ہادی کو۔

---

[۱] المسعودی مروج الذہب و معادن الجواہر الجزء الثانی ص ۳۲۰۔ [۲] ایضاً ص ۳۲۰۔ [۳] ایضاً ص ۳۲۰۔

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب اُس طفیلی سے پوچھا گیا کہ تم کون ہو اور اس جماعت کے ساتھ کیوں ہو، تو اُس نے اپنے طفیلی ہونے کا اقرار کر لیا۔[1] پھر اس کا بھی "امتحان" لیا گیا تو اس نے بلا تامل مانی کی تصویر پر لعنت بھیج دی۔[2] زاں بعد "مانویت" کے بارے میں اپنی "معلومات" کا بدیں طور اظہار کیا :۔

واللہ ما ادری ما مانی	خدا کی قسم مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔
اکان یہودیًا ام مسلمًا[3]	میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ مانی یہودی تھا یا مسلمان۔

غرض خلیفہ مامون کے زمانے میں مانوی مذہب اور زندقہ اس درجہ ناپید اور غیر معروف ہو چکے تھے کہ عام لوگ مانی کے نام اور اس کے مذہب تک سے ناواقف تھے۔

اس لئے فاضل مقالہ نگار کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مامون کے زمانہ میں زنادقہ پیدا ہوئے یا اُس کی "تفلسف پسندی کے نتیجہ میں زندقہ کو فروغ ہوا :۔

زنادقہ مامون سے کہیں پہلے پیدا ہو چکے تھے اور اس کے تخت نشین ہونے اور یونانی فلسفہ کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرانے سے کہیں پہلے اپنی فتنہ سامانیوں سمیت ختم ہو چکے تھے۔ پھر بھی اگر کوئی اکا دکا زندیق باقی رہ گیا تھا تو مامون نے اس کے استیصال اور بیخ کنی میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔

---

[1] المسعودی :۔ مروج الذہب و معدن الجواہر، الجزء الثانی۔ صفحہ ۳۲۰۔
[2] ایضاً صفحہ ۳۲۱۔
[3] ایضاً صفحہ ۳۲۱۔

عہدِ نبویؐ کے
غزوات و سرایا اور ان کے ماخذ پر ایک نظر

(۴)

سعید احمد اکبرآبادی

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو برہان ماہ اگست ۷۴ء

یہودِ مدینہ اب رہے یہود! ان کے متعلق یہ بات تو یقینی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ پہونچے ہیں تو اس وقت، خاص مدینہ اور اس کے قرب وجوار میں یہود کے چھوٹے بڑے متعدد قبیلے آباد تھے، لیکن یہ لوگ کون تھے؟ وہیں کے اصل باشندے تھے یا کہیں سے ہجرت کرکے آئے تھے؟ مسلمان محققین اور مستشرقین دونوں نے اس موضوع پر دادِ تحقیق دی ہے لیکن جو کچھ ہے قیاسات اور اندازے ہیں قطعی بات کوئی نہیں کہہ سکا ہے لیکن ہمارے موضوع سے اس تحقیق کا کوئی تعلق نہیں، اس لئے ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ یہ بات مسلم ہے کہ یہ یہود دو قسم کے تھے ایک وہ جو پہلے فلسطین اور شام میں آباد تھے لیکن جب وہاں رومن شہنشاہیت عیسائی مذہب کے زیر اثر آگئی اور یہود نے اس کے خلاف سازشیں کیں اور بغاوت کرنی چاہی تو ان کو وہاں سے جلاوطن کردیا گیا اور اب انہوں نے یثرب، تیما اور خیبر میں پناہ لی اور یہاں اپنی آبادیاں قائم کرلیں دوسری قسم ان یہود کی تھی جو عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے اور یہیں کے اصل باشندے تھے لیکن انہوں نے یہودی مذہب اختیار کرلیا تھا، سمہودی کا بیان ہے کہ اس علاقہ میں جو یہود آباد تھے وہ مختلف قلعوں اور آبادیوں[1] میں بستے تھے۔ ان قبیلوں کی تعداد تیس کے لگ بھگ

[1] اس موقع پر عربی الفاظ "حصون و آکام" ہیں۔ حصون کے معنی تو قلعے ہیں، "آکام" کا صحیح ترجمہ انگریزی میں [illegible] ہوگا۔ اردو میں اس کا ترجمہ "آبادی یا بستی" ہونا چاہئے۔

تھی، ان میں مشہور قبیلوں کے نام یہ ہیں: بنو النضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع، بنو بہدل، بنو عکرمہ، بنو ثعلبہ، بنو محمر، بنو زعورا، بنو زید، بنو عوف اور بنو القصیص اور خالص عرب نسل کے جو قبیلے ان لوگوں کے ساتھ خلا ملا اور ربط وضبط رکھتے تھے ان کے نام یہ ہیں: بنو الحرمان ریہین کا قبیلہ ہے، بنو مرثد، یہ بلی کی شاخ ہے، بنو نیف، یہ بھی قبیلۂ بلی کی شاخ ہے، بنو معاویہ، بنو الحارث، بنو الشطبہ، یہ قبیلۂ غسان کی شاخ ہے[1]

آہنگری، زرگری اور تجارت یہود کے خاص پیشے اور مشغلے تھے، آہنگری کے سلسلہ میں یہ لوگ آلاتِ زراعت اسلحہ یعنی زرہیں اور تلواریں بناتے تھے۔ زرگری کی نسبت سے سونے چاندی کے زیورات بناتے اور تجارت کے سلسلہ میں غلہ اور اناج کی تجارت کرتے اور اپنے قافلے شام اور حجاز بھیجتے رہتے تھے، عرب قبائل کا ذریعہ معاش جو کچھ تھا کھیتی باڑی کا کام تھا، وہ یہود کے ذرائع معاش سے نفور اور دور رہتے۔ اسی کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ یہود بیحد مالدار تھے اور عرب قبائل غریب تھے، سودی لین دین کرنا یہود کی فطرت ہے چنانچہ یہ لوگ سود پر اپنا روپیہ عرب قبائل کو دیتے تھے اور جیسا کہ قاعدہ ہے اس بنا پر عرب قبائل ہمیشہ ان کے مقروض اور دست نگر رہتے تھے، قرآن مجید میں یہود کی اس صفت کا تذکرہ بصورت وعید آیا ہے۔

علاوہ ازیں یہ لوگ اہل کتاب تھے، دین کے مبادی اور اصول موضوعہ سے واقف تھے اور تورات پڑھتے پڑھاتے تھے، اس مقصد کے لئے ان کے اپنے مدارس تھے جن کو عہد جاہلیت میں "المدارس" "بیت المدارس" اور "المدرش"[2] کہا جاتا تھا، ان میں تورات، تلمود، مشنا، زبان، ادب، اخبار وقصص وغیرہ کی باقاعدہ تعلیم ہوتی تھی اور جس کو مسلمان اپنی اصطلاح میں عالم کہتے ہیں۔ یہود اس کو "درشن" کہتے تھے، قرآن مجید میں علماء یہود کے لئے دو لفظ آئے ہیں، ایک احبار اور دوسرا ربانیون، علمائے لغت کے مطابق ان دونوں

---

[1] خلاصۃ الوفاء باخبار دار المصطفیٰ ص ۸۰ ۔ [2] عبرانی لفظ ہے درش سے مشتق عربی کے درس کے ہم معنی

نفظوں کی اصل بھی عبرانی ہے۔ پہلا لفظ حُبَر تھا اور اس کی جمع جریم آتی تھی اور دوسرا لفظ "ربن" (RIBBON) کی عربی شکل ہے[۱]

بہرحال یہ لوگ لکھے پڑھے اور ارباب علم وفضل تھے اور ان کی اس حیثیت کو قرآن مجید نے بھی تسلیم کیا ہے، لیکن ان کی اصل فطرت یہاں بھی بروئے کار آئی یعنی یہ اپنے پر اس درجہ گھمنڈ کرنے لگے کہ اپنے سوا کسی کو نظر میں نہیں لاتے اور دوسروں کی تحقیر و تذلیل کرتے تھے جناں چہ عرب قبائل کو ازراہِ استخفاف واستحقار "امیون" کہتے تھے جن کے معنی ان کے نزدیک "ان پڑھ" اور "بے کتاب" تھے، اسی لئے قرآن مجید میں اللہ تعالٰے نے اپنی قدرت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اثبات واظہار کے لئے فرمایا:

هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتٰب والحکمة، وان کانوا من قبل لفی ضلالٍ مّبین۔

یہ وہی خدا ہے جس نے امیوں میں (جو کچھ نہیں جانتے تھے اور اس بنا پر یہود ان کا مذاق اڑاتے اور ان کی تحقیر کرتے تھے،) انہیں میں سے ایک ایسا رسول پیدا کر دیا جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا، ان کا تزکیہ نفس کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

ان "امیون" کی ان لوگوں کی نگاہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی، اور نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ کرنے میں کسی اخلاقی ضابطہ اور قاعدہ وقانون کی پابندی ضروری تھی، وہ کسے اپنا حق سمجھتے تھے کہ جو چاہیں کریں، آیت ذیل میں اللہ تعالٰے نے امیوں کے ساتھ یہودیوں کی اس بدمعاملگی کو ہی بیان فرمایا ہے:

ومنهم من ان تأمنه بدینارٍ — اور یہود میں بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر تم ان

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ العرب قبل الاسلام جواد علی ج ۶ ص ۹۴ تا ۱۱۵۔

لا یؤدہ الیک الا مادمت علیہ قائما ذالک بانھم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل ویقولون علی اللہ الکذب وھم یعلمون ۰

(آل عمران)

کے پاس ایک اشرفی بطور امانت رکھو تو وہ تم کو تمہاری امانت اس وقت تک واپس نہیں دیں گے جبتک تم ہر وقت ان کے سر پر سوار نہ رہو۔ ان کا یہ رویہ اس لئے ہے کہ وہ کہتے ہیں امیوں کا ہم پر کوئی حق نہیں ہے اور ہمیں کھلی چھوٹ ہے کہ ان کے ساتھ جو معاملہ چاہیں کریں، یہ لوگ جان بوجھ کر اللہ پر طوفان جوڑتے ہیں۔

جیسا کہ گذر چکا ہے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ فلسطین اور شام سے اجڑ کر یہ لوگ یثرب میں کب آکر آباد ہونا شروع ہوئے البتہ یہ یقینی ہے کہ جب اوس اور خزرج جنوب کی طرف سے ہجرت کر کے یہاں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ اس پر یہود کا غلبہ ہے، ان کے دوش بدوش بعض عرب قبائل رہتے تھے لیکن یہ ان سے کمزور تھے۔ چنانچہ تیرہ بستیاں (آطام) عربوں کی تھیں تو انسٹھ (۵۹) آبادیاں یہود کی تھیں۔ عرب قبائل ان کے جوار (حفاظت) میں رہتے تھے یا ان کے حلیف تھے۔

عربوں کے ساتھ ان لوگوں کا تحقیر و تذلیل کا معاملہ یہاں تک تھا کہ یہودیوں کے قبیلۂ بنو ثعلبہ کے فطیان نامی ایک سردار نے قبیلۂ خزرج کی شاخ بنو عوف پر یہ پابندی لگائی تھی کہ جب ان کی کسی لڑکی سے شادی ہوگی تو دلہن پہلی شب ان کے ساتھ بسر کریگی۔ اس رسم بد کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ ایک مرتبہ جب مالک بن عجلان کی بہن کا نکاح ہوا اور اس نے اس رسم کے خلاف سخت احتجاج کیا اور مردوں کو ان کی بے غیرتی اور بے حمیتی پر سخت عار اور شرم دلائی تو مالک بن عجلان نے فطیان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور اپنے قبیلے کو اس مصیبت عظمیٰ سے نجات دلائی۔

اوس اور خزرج چوں کہ یہودیوں کی غیر مزروعہ زمینوں پر آباد ہوئے تھے، اس بنا پر اول اول ان کی حیثیت یہودیوں کے باج گزار اور ان کے ماتحت کی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کی طاقت وقوت میں اضافہ ہوتا رہا چنانچہ ہجرت نبوی کے وقت یثرب کی زمام اقتدار اوس[۱] اور خزرج کے ہاتھوں میں آچکی تھی اور اب وہ یہود کی رعایا نہیں بلکہ ان کے حریف اور مدمقابل تھے۔

تاہم یثرب کی سوسائٹی میں یہود ایک مستقل حیثیت کے مالک تھے، یہ صاحب رسوخ و اثر تھے اور تجارت اور اہل کتاب ہونے کے رشتہ سے حجاز اور شام و فلسطین کے لوگوں سے بھی ان کے تعلقات اور مراسم تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہونچنے سے قبل اپنے بعض نمائندے یہود مدینہ کے پاس بھی بھیجے تھے اور ان کو دعوت اسلام دی تھی[۲]۔ اس دعوت کا اثر اکے دکے چند اشخاص پر ضرور ہوا لیکن مجموعی طور پر انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسلام کی مخالفت اور دشمنی میں ان کا رویہ روز بروز سخت اور نہایت معاندانہ ہوتا رہا۔ پھر تاریخ نے غداری اور خیانت کے جس سانچہ میں ان کی فطرت کو ڈھالا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بے خبر نہیں ہوسکتے تھے، اس بنا پر تدبیر، سیاست اور دور اندیشی، ان میں سے ہر ایک کا تقاضا تھا کہ قریش مکہ کی طرف متوجہ ہونے سے قبل یہود کے ساتھ کوئی معاملہ کرلیا جائے۔

دوسرے قبائل پھر صرف ایک یہود کا معاملہ ہی تو نہ تھا، مکہ سے لے کر ایران اور شام کی سرحد تک پچاسوں قبیلے آباد تھے، ان میں وہ بھی تھے جن کے قریش مکہ

---

[۱] MUHAMMAD IN MEDINA : WATT. MONTGOMERY, P. 192/193

[۲] علاوہ ازیں خود قرآن اہل کتاب کے تذکرہ اور ان کے پیغمبروں اور کتابوں کی تعریف سے جو پُر ہے اس سے قرآن کا ہر طالب علم باخبر ہے۔

سے براہ راست تعلقات تھے، بعض قبیلے ایرانی اور رومی حکومتوں کے زیر اثر یا ان کے باجگذار تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نظر انداز نہیں کرسکتے تھے ان قبائل کے نام یہ ہیں:۔

مکہ اور مدینہ کے مغرب میں آباد قبائل

(۱) خزاعہ (اسلم، کعب، عمرو اور المصطلق کے ساتھ)
(۲) کنانہ: بکر بن عبد منات
(۳) ضمرہ: (غفار کے ساتھ) لیث، الدیل، مدلج، الحارث بن منات (الاحابیش کا ایک جز)
(۴) مزینہ
(۵) جہینہ
(۶) عبد شمس (دوس کے ساتھ)

مکہ اور مدینہ کے مشرق میں آباد قبائل

(۱) خزیمہ (بن مدرکہ) اس کی ایک شاخ کنانہ ہے۔
(۲) اسد بن خزیمہ (عضل، القارہ) غزوۂ خندق کے موقعہ پر اس قبیلہ نے کفار قریش کی مدد کی تھی۔
(۳) طے (نبہان کے ساتھ)
(۴) ہذیل بن مدرکہ
(۵) لحیان
(۶) محارب بن خصفہ
(۷) غطفان
(۸) اشجع ـــــ غزوۂ خندق کے موقعہ پر کفار قریش کی مدد کی تھی۔
(۹) فزارہ " " " "

(۱۰) مرۃ ـــــ غزوۂ خندق کے موقعہ پر کفار قریش کی مدد کی تھی

(۱۱) ثعلبہ۔

(۱۲) ہوازن: یہ قبیلہ بھی اسلام کا سخت دشمن تھا۔

(۱۳) عامر بن صعصاع: البکاع، ہلال، کلاب، ربیعہ،

(۱۴) جشم: نصر، سعد بن بکر، ثمالہ،

(۱۵) ثقیف (بن مالک یعنی احلاف) اور باہلہ

وہ قبائل جو مدینہ کے شمال میں آباد تھے

(۱) سعد ہذیم، عذرہ

(۲) جذام

(۳) قضاعہ (جرم، القین اور سلمان کے ساتھ)

(۴) بالی۔

(۵) بہرا۔

(۶) لخم (دارہ کے ساتھ)

(۷) غسان۔

(۸) کلب۔

جو قبائل مکہ کے جنوب میں آباد تھے

(۱) خثعم ساان کے قریب ہی ازدشنوءہ آباد تھے،

(۲) مذحج۔

(۳) النس، جعفی، خولان، النخاع، رہاء، سعد العشیرۃ (زبیدہ کے ساتھ) سودا

(۴) بجلۃ۔

(۵) ہمدان۔

(۶) الحارث بن کعب (نہد کے ساتھ) ۔
(۷) مراد ۔
(۸) کندہ (تجیب کے ساتھ)

وہ قبائل جو عرب کے دوسرے حصوں میں آباد تھے

(۱) مہرہ ۔
(۲) ازد (عمان) عبدالقیس (بحرین میں)
(۳) حنیفہ ۔
(۴) تمیم ۔
(۵) وائل ۔
(۶) بکر (شیبان کیساتھ) تغلب[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منصوبہ امن و جنگ

اب غور کرنا چاہیئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں بیچارگی و بے بسی اور اور مظلومیت کے تیرہ برس گذارنے کے بعد ابھی مدینہ آئے ہیں اور آپ کے متبعین کی تعداد چند سو سے بھی متجاوز نہیں ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود سیاسی اعتبار سے کتنے اور کیسے اہم اور صبر آزما مراحل ہیں جن سے آپ کو عہدہ برآ ہونا ہے۔ پھر جس عظیم کامیابی اور فتحمندی کے ساتھ آپ ان تمام منزلوں سے گذر گئے ہیں وہ بلا شبہ اعلیٰ قسم کے تدبر اور سیاسی حزم و دور اندیشی کا نہایت حیرت انگیز شاہکار ہے

اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین محاذ تھے۔

(۱) سب سے بڑا محاذ تو قریش مکہ ہی کا تھا۔ ان کے ساتھ جنگ کے نہ صرف جواز بلکہ

---

[1] ان قبائل کے شجرہائے نسب اور ان کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے (۱) تاریخ العرب قبل الاسلام ڈاکٹر جواد علی جلد ۵ ۱۶۵ اور (۲) MOHAMMAD IN MEDINA باب ۲ WATT. MONTGOMERY

وجوب کے لئے وہ معاملہ ہی کافی تھا جو انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمان مردوں اور عورتوں کے ساتھ کیا تھا۔ اس پر مزید یہ ہوا کہ ہجرت نے ان کی آتش غیض وغضب پر جلتی پر تیل کا کام کیا تھا، اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے، جیسا کہ بیعت عقبۂ ثالثہ اور اس کے نتیجہ میں پوشیدہ طور پر مسلمانوں کے مدینہ پہونچ جانے کا علم ہونے پر قریش کے بعض سرداروں نے کہا بھی تھا۔ انہیں اس کا یقین تھا کہ اگر مسلمانوں کے قدم مدینہ میں جم گئے تو وہ ان لوگوں کی تجارتی لائن کو کاٹ دیں گے اور شام کی آمد ورفت روک دیں گے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ اندیشہ بے اصل تھا بھی نہیں۔ کیونکہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے تو ہجرت کی بھی تھی اس منصوبہ اور پلان کو ذہن میں رکھتے ہوئے۔ اور آپ کے علاوہ مسلمان بھی عام طور پر اس سے خالی الزہن نہیں تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ ہجرت کے بعد ہی سعد بن معاذ جو انصار میں ایک بڑی حیثیت کے شخص تھے، عمرہ کے ارادہ سے مکہ گئے اور دیرینہ تعلق کے باعث امیہ بن خلف کے مہمان ہوئے۔ انہوں نے امیہ سے اپنے ارادے کا ذکر کیا تو ایک روز دوپہر کے وقت امیہ ان کو لیکر نکلا۔ اتفاق سے راستے میں ابوجہل مل گیا۔ ابوجہل کو جب معلوم ہوا کہ یہ سعد بن معاذ ہیں تو اس نے بگڑ کر ان سے کہا۔ "تم لوگوں (انصار مدینہ) نے سر پھروں (صابیوں) یعنی مسلمانوں کو مدینہ میں پناہ دی ہے اور یہاں تم اطمینان سے طواف کر رہے ہو۔ یہ میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ خدا کی قسم! اگر تم امیہ کی پناہ میں نہ ہوتے تو مدینہ واپس نہیں جا سکتے تھے" حضرت سعد بن معاذ نے گرج کر جواب دیا۔ خدا کی قسم! اگر تم لوگوں نے ہمارا کعبہ کا آنا جانا روکا تو ہم تم لوگوں کی شام کی آمد ورفت (تجارت کے لئے) روک دیں گے اور یہ تمہارے لئے سب سے بڑا حادثہ ہوگا۔[1]

---

[1] باب ذکر النبی من یقتل ببدر۔

بہرحال ایک یہ اندیشہ جوان کے لئے درحقیقت زندگی اور موت کا سوال تھا اور دوسری طرف اسلام کا ایک عظیم الشان انقلابی تحریک کی حیثیت سے ترقی کرنا، یہ دو چیزیں تھیں جنہوں نے قریش کو اور زیادہ سراسیمہ اور چراغ پا کر دیا اور اب انہوں نے جو ایک طرف مدینہ کے سربرآوردہ لوگوں کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر اُکسایا اور دوسری جانب جو قبائل ان کے زیر اثر تھے ان کو اسلام سے باز رکھنے اور حضور ؐ کی خدمت میں حاضری سے روکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ہجرت کے فوراً بعد ہی قریش نے عبداللہ بن ابی کو جو انصار میں اقتدار اعلیٰ رکھتا تھا ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

انکم آویتم صاحبنا وانا نقسم	تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی
باللہ لتقاتلنہ او تخرجنہ	ہے ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اس سے
او نسیرن الیکم باجمعنا	جنگ کرو یا اس کو وہاں سے نکال باہر کرو
حتی نقتل مقاتلتکم ونستبیح	ورنہ ہم سب تم پر چڑھائی کر دیں گے یہاں تک
نساءکم[1]	کہ تمہارے جنگ آزماؤں کو قتل کر دیں
	اور تمہاری عورتوں کو اپنے لئے جائز بنالیں۔

قریش نے اسی مضمون کا ایک خط بنو قریظہ کو بھی لکھا تھا جس کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔ علاوہ ازیں قبیلے قبیلے ان کے کارندے گھومتے رہتے اور اسلام کے خلاف ان کو مشتعل کرتے رہتے تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس وقت سب سے بڑا محاذ قریش مکہ کا تھا اور آپ کے لئے ان سے جنگ کرنا ناگزیر تھا۔ لیکن جنگ کب شروع ہو گی اور اس کا طریقہ کیا ہو گا؟ اس کا اعلان و اظہار کرنے سے پہلے

[1] سنن ابوداؤد۔ باب خبر النضیر۔

ضروری تھا کہ آپ دوسرے محاذوں کی طرف سے اطمینان حاصل کر لیں۔

دوسرا محاذ یہود کا اور تیسرا محاذ قبائل کا تھا۔ یہود کے چھوٹے بڑے اگرچہ بہت سے قبیلے تھے۔ لیکن ان میں بڑے اور اہم تین ہی قبیلے تھے۔ بنو النضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ۔ اب رہے قبائل ان میں مندرجہ ذیل دو قسم کے قبیلے بہت اہم تھے

۱۔ ایک وہ جو سمندر کے کنارے کنارے مکہ اور مدینہ کے درمیانی مقامات میں آباد تھے، ظاہر ہے ان قبائل کو اپنے اعتماد میں لیے بغیر قریش سے جنگ کرنا چند در چند دشواریوں اور دقتوں کا باعث ہو سکتا تھا۔

۲۔ دوسرے وہ قبیلے جو مختلف بیرونی مملکتوں کے ساتھ حلیفانہ تعلق رکھنے کے باعث ان کے لیے بطور ایجنٹ کے تھے اور اس لیے حضورؐ کے واسطے وہ کبھی قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتے تھے۔ مثلاً قبیلۂ غسان بازنطینی حکومت کا، لخم، ساسانی حکومت کا اور حِمیر، سلطنت حبشہ کا حلیف اور دوست تھا اور ان تینوں حکومتوں کے جو عزائم اور ارادے عرب کے متعلق تھے، تاریخ عرب کا ہر طالب علم اس سے باخبر ہے۔

اسلام کی دعوت ایک دعوتِ عام تھی اور ہر شخص اس کا مخاطب تھا۔ جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا وہ خود بخود اسلامی سماج کا جزء ہو گئے۔ لیکن جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا وہ دو قسموں میں منقسم تھے (الف) ایک وہ جو مسلمان نہ ہونے کے باوجود اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض و عناد کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے اور (ب) دوسرے وہ جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے اور عملاً اس کا مظاہرہ کرتے بھی رہتے تھے۔

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے جزیرۃ العرب کی سیاسی صورت حال کو پیشِ نظر رکھ کر جو طریق العمل منصوبہ اور نقشہ ذہن میں بنایا اس کے خاص عناصر ترکیبی یہ تھے۔

(۱) قریش سے جنگ کا آغاز ان کی تجارتی لائن پر جو مکہ سے مدینہ ہوتی شام اور عراق کی طرف نکل جاتی ہے، قبضہ کرنے اور اس کو ان کے لیے غیر محفوظ بنا دینے سے کیا جائے۔

(۲) جو قبائل مکہ کے ارد گرد یا مکہ اور مدینہ کے درمیان آباد ہیں اور انھوں نے اسلام کے ساتھ دشمنی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا ہے ان کے ساتھ معاہدہ کیا جائے۔

(۳) مدینہ میں جو یہود قبائل آباد ہیں ان میں اور مسلمانوں میں معاہدہ کرایا جائے۔

(۴) شام اور عراق کی سرحد پر رومی اور ایرانی سلطنتوں نے جن عرب قبائل کو اپنا باجگذار مطیع و فرماں بردار بنا رکھا ہے۔ اگر یہ سلطنتیں اسلام قبول نہ کریں تو ان عرب قبائل کو ان کے پنجۂ استبداد و ستم سے آزاد کرایا جائے۔

قبائل سے معاہدہ اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا عملی اقدام یہ کیا کہ جو قبائل قریش کے ساتھ جنگ کے نقطۂ نظر سے جغرافیائی اعتبار سے نہایت اہم مقامات پر آباد تھے، آپ نے معاہدہ کے ذریعہ ان کو اپنا حلیف بنا لیا۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنی قابلِ قدر اور محققانہ عربی تالیف "مجموعۃ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب کی جو فصل قبائل عرب کے لئے مخصوص ہے اس کے مطالعہ سے قاری کو معلوم ہوگا کہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا یہ تھا کہ مکہ کے ارد گرد جو قبائل آباد تھے ان کو مسلمان بنا کر ورنہ عہد و پیماں کے ذریعہ اپنا حامی بنا کر انہیں قریش سے الگ کر دیں۔ چنانچہ نبوت کے بعد آپؐ نے جو پہلا سیاسی کارنامہ انجام دیا ہے وہ یہ ہے کہ ان قبائل سے معاہدہ کیا ہے جو مدینہ اور سمندر کے ساحل کے درمیان آباد تھے مثلاً جُھَینَہ، ضَمْرَۃ اور غِفَار، ان

سلہ ڈاکٹر صاحب نے قبائل سے معاہدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت کے بعد سب سے پہلا سیاسی اقدام کہا ہے، ہمارے نزدیک یہ کہنا مطلقاً صحیح نہیں ہے مثلاً ضمرۃ سے معاہدہ ہجرت کے دوسرے برس ماہ صفر میں ہوا ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے خلاف پروگرام کے مطابق اپنی کارروائی شروع کر دی ہے، درحقیقت واقعات اس طرح باہم گڈ مڈ ہیں اور ہمارے مؤرخین سیرت و مغازی نے تاریخ لکھنے کا اہتمام نہیں کیا ہے کہ قطعیت کے ساتھ کسی تاریخ کا متعین کرنا امر دشوار ہے۔

قبائل کی آبادیاں اُس راستہ پر واقع تھیں جس پر سے قریش کو موسم گرما میں شام اور مصر کی طرف اپنا کاروانِ تجارت لے جانے میں گذرنا ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قریش کا یہ راستہ بند کر دیا اور اس میں ان قبائل میں سے جو آپ کے حلیف تھے، انھوں نے آپکی مدد کی اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خزاعہ، اور اسلم وغیرہ اُن قبائل سے معاہدہ کیا جو کہ اردگرد رہتے تھے۔"

علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب اپنی ایک اور کتاب "عہدِ نبوی کے میدان جنگ" میں لکھتے ہیں:۔

"ہجرت کے ساتھ ہی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آس پاس کے قبائل سے معاہدے حلیفی اور معاونت کے معاہدے کرنے شروع کر دیئے تھے، چنانچہ ۱ھ میں جہینہ کے بعض سرداروں سے معاہدہ ہوا تھا۔ ۲ھ میں ینبوع (مکہ اور مدینہ کے درمیان مشہور بندرگاہ) کے آس پاس بسنے والے بنو ضمرہ، بنو مدلج، بنو زرعہ اور بنو ربعہ سے دوستی اور اعانت یا غیر جانبداری کے معاہدے ہو گئے تھے۔ خوش قسمتی سے تاریخ نے ان معاہدوں کے متن کو محفوظ رکھا ہے اور ان معاہدوں کے ساتھ ہی قریش پر راستہ بند کیا جاسکا کیوں کہ یہ سب قبائل مدینے اور بحر قلزم کے مابین بستے تھے اور انہیں کی سرزمین سے قریشی کاروانوں کو گذرنا پڑتا تھا۔ (ص ۳۵، ۳۶)

مستشرقین کا غلط تاثر

یہ بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ آنحضرت صلعم ابھی ابھی اپنے "بے خانماں" ساتھیوں کے مدینہ آئے ہیں اور ابھی آپ نے طاقت و قوت کا کوئی مظاہرہ بھی نہیں کیا ہے اور اس کے باوجود چند در چند قبائل ہیں جو قریش جیسی طاقت کے خلاف آپ سے معاہدے کر رہے ہیں، چنانچہ اس موقع پر بعض مستشرقین نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت قریش کے خلاف جو مہم شروع کرنے والے تھے اس میں شریک کرنے کی غرض سے آپ یہ معاہدے کر رہے تھے اور قبائل کو یہ لالچ تھا کہ وہ ان مہموں میں شریک ہوں گے تو انہیں لوٹ مار کرنے کا بڑا موقعہ ملے گا۔[1]

---

1. MUHAMMAD IN MEDINA - P.9

لیکن ہم نے اوپر جو کچھ لکھا ہے اس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے علاوہ ازیں معاہدوں کی اصل عبارتیں محفوظ ہیں، ان کے دیکھنے سے دو باتوں کا اندازہ ہوتا ہے (۱) ایک یہ کہ سب نہیں تو بعض قبیلے اس وقت مسلمان ہو گئے تھے اور (۲) دوسرا یہ کہ معاہدہ میں جس بات کا خاص طور پر تذکرہ ہے وہ جنگ کے وقت باہمی مدد ہے چنانچہ جہینہ کی شاخ بنو زرعہ اور بنو ربعہ سے آپ نے جو معاہدہ کیا اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

انھم آمنون علی انفسھم	یہ لوگ اپنی جان اور اپنے مال میں محفوظ رہیں گے
واموالھم وان لھم النصر علی	اور اگر کوئی ان پر ظلم کرے گا یا ان سے جنگ کرے گا
من ظلمھم او حاربھم الا	تو اس کے برخلاف ان کی مدد کی جائے گی البتہ ہاں
فی الدین والاھل، ولاھل	دین یا متعلقین کے لئے جو جنگ ہوگی وہ اس
بادیتھم من برّ منھم واتقی	سے مستثنیٰ ہے، اور ان کے دیہات والوں کے
ما للحاضر تھم۔	(بشرطیکہ وہ نیک ہوں) وہی حقوق ہونگے جو ان کے
(الوثائق السیاسیہ ص ۱۳۸)	شہر والوں کے ہیں۔

بنو ضمرہ کے ساتھ معاہدہ کے الفاظ یہ تھے :۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم! یہ دستاویز ہے محمد رسول اللہ کی طرف سے بنو ضمرہ کے لئے اس بات کی کہ یہ لوگ اپنی جان اور مال میں محفوظ رہیں گے اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا ہم ان کی مدد کریں گے مگر ہاں! جب ان سے اللہ کے دین کے بارے میں جنگ کی جائے اور ہاں جب نبی ان کو اپنی مدد کے لئے بلائے گا تو یہ اس کو قبول کریں گے۔"

(ص ۱۴۳)

بنو ضمرہ کے سردار مجدی بن عمرو سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کا مضمون یہ تھا :۔

"محمد رسول اللہ بنو ضمرہ سے جنگ نہیں کریں گے اور نہ بنو ضمرہ آپ سے جنگ کریں گے اور نہ وہ محمد رسول اللہ کے خلاف کسی جماعت یا گروہ کی مدد کریں گے (ص ۱۴۴)

۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ اسلام و استعمار ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت ۔
تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند مغلیہ
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم ۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم ، صدیق اکبر ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم ، انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم ، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ۔ تاریخ گجرات ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ۔ مصائب و مورخین ۔

۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول ، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ۔ اسلامی کتب خانے ، عرب و دنیا ۔
تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ، معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔

۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم ۔ تاریخ روہیلکھنڈ ، ضلع بجنور ۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم ، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ، عرب و ہند عہد رسالت میں ۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر ۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ۔ رموز عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم ، تفسیر مظہری اردو جلد ششم ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ، تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم ، تاریخ الفخری ، حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء حیات عبدالحی ، تفسیر مظہری اردو جلد نہم ۔ مآثر و معارف ۔ احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت ۔

۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم ، بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

d. No. D. (D) 231 Phone 262815 OCTOBER 1974

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ

تفسیر مظہری عربی

کتب خانوں، مدرسوں اور علماء و طلبہ کیلئے قابلِ قدر تحفہ

تالیف حضرت قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

مختلف خصوصیتوں کے لحاظ سے تمام تفسیروں میں بہترین تفسیر جس کے بعد کسی تفسیر کی ضرورت نہیں رہتی احادیث و آثار کے بیان، کلامِ الٰہی کے مطالب کی تفہیم اور احکامِ شرعیہ کی تشریح و تفصیل کے اعتبار سے قاضی صاحب کی یہ تفسیر اپنا جواب نہیں رکھتی، اس بے نظیر تفسیر کا ایک مکمل نسخہ بھی دستیاب نہیں ہوتا تھا بڑی جد و جہد کے بعد بہت سا روپیہ خرچ کرکے اس کا قلمی نسخہ حاصل کیا گیا اور اس عظیم الشان خدمت کا بیڑا اٹھایا گیا، الحمد للہ کہ اب اس گوہر نایاب کی تمام جلدیں مکمل ہوگئی ہیں، پوری کتاب دس جلدوں میں سمائی ہے، ہدیہ کم سے کم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے شروع کی متعدد جلدیں بہت کم تعداد میں رہ گئی ہیں

اپنے مدرسوں اور کتب خانوں کی ضرورت اور زینت کے لئے جلد فرمائش روانہ فرمائیے

جلد		سائز	صفحات	ہدیہ غیر مجلد
المجلد اوّل	سورہ فاتحہ و بقرہ کامل	۲۲ × ۲۹	صفحات ۴۴۸	۱۲/۰ روپے
” دوم	سورۂ آلِ عمران سورۂ نساء کامل	”	” صفحات ۴۹۶	۱۲/۰ روپے
” سوم	سورۂ مائدہ سورۂ انعام سورۂ اعراف	”	” صفحات ۵۱۲	۱۴/۰ روپے
” چہارم	سورۂ انفال سورۂ توبہ کامل	”	” صفحات ۳۴۰	۸/۰ روپے
” پنجم	سورۂ یونس تا ختم سورۂ اسراء	”	” صفحات ۵۰۴	۱۴/۰ روپے
” ششم	سورۂ کہف تا ختم سورۂ نور	”	” صفحات ۵۰۲	۱۴/۰ روپے
” ہفتم	سورۂ فرقان تا ختم سورۂ احزاب	”	” صفحات ۴۳۸	۱۲/۰ روپے
” ہشتم	سورۂ سبا تا ختم سورۂ حم	”	” صفحات ۴۳۸	۱۳/۰ روپے
” نہم	سورۂ فتح تا ختم سورۂ تحریم	”	” صفحات ۳۸۴	۹/۰ روپے
” دہم	سورۂ ملک تا ختم قرآن	”	” صفحات ۳۸۴	۱۲/۰ روپے

ہدیہ کامل ۱۲۰ روپے

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں پرنٹر پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر
دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ اسلام کا اقتصادی نظام ۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام ۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت ۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام ۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق ۔ فہمِ قرآن ۔ تاریخِ ملت حصہ اول' نبی عربی صلعم ۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول ۔ وحی الٰہی ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول ۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال ۔ تاریخِ ملت حصہ دوم' خلافتِ راشدہ ۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول ۔ اسلام کا نظامِ حکومت ۔ سرایہ ۔ تاریخِ ملت حصہ سوم' خلافتِ بنی امیہ'

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم ۔ لغات القرآن جلد دوم ۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم ۔ قرآن اور تصوف ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول ۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو ۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت ۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم ۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم ۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم' خلافتِ ہسپانیہ' تاریخِ ملت حصہ پنجم' خلافتِ عباسیہ اول'

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم' خلافتِ عباسیہ دوم' بصائر ۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم' تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ' تدوینِ قرآن ۔ اسلام کا نظامِ مساجد ۔
اشاعتِ اسلام ، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا ۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم ۔ عرب اور اسلام ۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم' خلافتِ عثمانیہ' جارج برنارڈ شا ۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر ۔ فلسفہ کیا ہے ؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ کتابتِ حدیث ۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت ۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت ۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ ۔

برہان

جلد ۷۳ | ماہ ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ مطابق نومبر ۱۹۷۴ء | شمارہ ۵

فہرست مضامین

نظرات

قارئین کی نظر سے سید اوصاف علی صاحب ایم، اے سکریٹری انڈین انسٹیٹوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی کی وہ تحریر نظر سے گزری ہوگی جو ابھی پچھلے دنوں بعض انگریزی اور اردو کے اخبارات میں شائع ہوئی ہے اور جس میں موصوف نے مسلمان ارباب ثروت و دولت کو آمدنی اور جائداد کی تحدید سے متعلق عنقریب بننے اور نافذ ہونے والے ملکی قوانین کی طرف متوجہ کر کے مذکورۂ بالا انسٹیوٹ کی مالی اعانت و امداد کی درخواست کی ہے۔ باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ یہ انسٹیوٹ جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی کے نہایت بلند تخیل اور غیر معمولی عالی ہمتی اور فیاضی کا ایک عملی پیکر ہے، جناب حکیم صاحب اپنے عمل اور کردار کے اعتبار سے ایک مثالی شخصیت ہیں انکے فن اور انکی بڑی محنت اور مشقت سے کمائی ہوئی دولت سے لاکھوں انسان مستفیض ہو رہے ہیں، انھوں نے تقسیم کے بعد جو نہایت عظیم الشان ادارے قائم کئے ہیں اور جنھیں وہ عمر کی اس منزل میں بھی نہایت مستعدی، سرگرمی اور جوش و انہماک سے کامیابی اور روز افزوں ترقی کے ساتھ چلا رہے ہیں وہ ان لوگوں کیلئے ہزار درجہ سرمایۂ عبرت و بصیرت ہیں جو کہتے ہیں کہ مسلمان قومی ادارے کے ساتھ چل نہیں سکتے۔

انہیں اداروں میں سے ایک یہ انسٹیٹیوٹ ہے جس کے لئے حکیم صاحب نے نئی دہلی کے ایک تاریخی مقام پر تیس ایکڑ زمین خرید کر وقف کر دی ہے اور اب پلان کے مطابق اس انسٹیٹیوٹ کی لائبریری بلڈنگ کم و بیش ساٹھ لاکھ کی لاگت سے بنکر تیار ہو گئی ہے

اور اب دوسری عمارتوں کی تعمیر کا کام شروع ہونے والا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس روز حکیم صاحب کا یہ منصوبہ پورا ہوگیا وہ عالمِ اسلام کا عظیم ترین معہدِ دراسات و تحقیقات اسلامیہ ہوگا حکیم صاحب قبلہ جو کچھ اپنی ذات سے کر سکتے تھے وہ کر چکے اور کر رہے ہیں اور بلاشبہ اتنا کیا ہے کہ ریاستیں ہی کرتی ہیں اب مسلمان اربابِ ثروت و دولت کا فرض ہے کہ وہ اس اہم کام میں حکیم صاحب کے مدد و معاون اور شریک و سہیم ہوں۔

ڈھاکے کے ایک خط سے ابھی چند روز ہوئے یہ معلوم کرکے بیحد افسوس ہوکہ مولانا مفتی سید عمیم الاحسان صاحب مجددی برکتی داعی اجل کو لبیک کہہ کر اس خاکدان عالم سے رخصت ہوگئے، مولانا اپنے زمانے کے بلند پایہ اور وسیع النظر و محقق عالم تھے فقہ و حدیث آپ کے خاص فن تھے جن میں بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ درس کے علاوہ افتا اور تصنیف و تالیف کا بھی مشغلہ تھا، اور اسی سلسلے میں متعدد اہم کتابیں آپ کے قلم کی مرہون رقم ہیں۔ علاوہ ازیں نہایت متقی، متورع اور صاحب باطن بھی تھے۔ زندگی کا ایک بڑا حصہ کلکتہ میں بسر ہوا۔ تقسیم کے بعد ڈھاکہ چلے گئے اور وہاں کے مدرسہ عالیہ میں پروفیسر حدیث و فقہ ہوگئے تھے۔ ڈھاکہ میں عید کی نماز مولانا نے ہی پڑھائی تھی۔

اس کے بعد طبیعت خراب ہوگئی جس کا سلسلہ دس روز تک چلتا رہا یہاں تک کہ ۲۷ اکتوبر کو ۴ بجے صبح طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ ناظم ندوۃ المصنفین اور اڈیٹر برہان سے بڑی محبت کرتے اور خلوص رکھتے تھے، اس لئے ہم لوگوں کے لئے یہ ذاتی حادثہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت عطا کرے۔ اور ان کے مدارج و مراتب بڑھائے۔ آمین ثم آمین۔

عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا اور اُن کے مآخذ

(۵)

سعید احمد اکبر آبادی

ایک سوال اور اس کا جواب مستشرقین سے قطع نظر! ایک سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ قبائل جن سے معاہدہ ہوا تھا انہیں اس بات کا اندازہ تو ضرور ہوگا کہ عن قریب قریش میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جنگ برپا ہونیوالی ہے۔ اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ قریش کا قبیلہ دولت و ثروت تنظیم اور شجاعت و بہادری کے اعتبار سے سب میں ممتاز تھا اور اسی کے بالمقابل دنیوی اسباب اور مال و متاع کے لحاظ سے مسلمانوں کی بے سروسامانی بھی ظاہر تھی، تو پھر آخر وہ کیا اسباب و دواعی تھے جن کے باعث ان قبائل نے قریش کے مقابلہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ یہ معاہدہ کیا۔

جواب یہ ہے کہ اس کے اسباب و وجوہ دو تھے:۔

(۱) ایک یہ کہ اگرچہ یہ قبائل اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے عمل و کردار اور اخلاق و شمائل کے باعث اسلام ان کے قلب و دماغ کے دروازہ پر دستک دینے لگا تھا اور اندرونی طور پر یہ اس کی طرف ایک کشش محسوس کرنے لگے تھے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ قریش کی چودھراہست اور آج کل کی اصطلاح میں ان کی سرمایہ دارانہ ذہنیت نے ان تمام قبائل کو پریشان اور خوف زدہ کر رکھا تھا، اور ساتھ ہی یہ قبائل اپنی

باہمی خانہ جنگیوں اور غیر مطمئن زندگی سے سخت تنگ آچکے اور بیزار ہو چکے تھے اس بنا پر اب مستقبل کے افق پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زیر قیادت اسلام کی صورت میں ایک نئی طاقت وقوت ابھرتی ہوئی نظر آئی تو اس سے متاثر ہونا اور قریش اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان جنگ کی صورت میں کم از کم غیر جانبدار رہنا امن کے لئے طبیعت کا ایک تقاضا تھا۔

یہود سے معاہدہ | قبائل مذکورہ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے بھی معاہدہ کیا اس میں اختلاف ہے کہ یہ معاہدہ کب ہوا تھا؟ ولہاسن (Wellhausen) کا خیال ہے کہ یہ معاہدہ غزوۂ بدر کے بعد ہوا تھا لیکن ہوبرٹ گرم (Hubert Grimme) اور پروفیسر کیتانی (Caetani) دونوں کی رائے ہے کہ یہ واقعہ بدر سے پہلے کا ہے[1]۔ اور ہمارے نزدیک صحیح اور اقرب الی الصواب یہی ہے۔ اصل یہ ہے جیساکہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ معاہدہ کی بعض دفعات میں جہاد فی سبیل اللہ اور قریش کے برسرِ پرخاش ہونے کا تذکرہ ہے اس سے ولہاسن نے قیاس کیا ہے کہ معاہدہ بدر کے بعد واقع ہوا ہے۔ حالانکہ ان دفعات میں اُن واقعات کا بر سبیل حفظ ماتقدم تذکرہ کیا گیا ہے جن کا وقوع مستقبل میں متوقع ہے، چنانچہ پروفیسر کیتانی نے اس بنیاد پر ولہاسن کے خیال کی تردید کی ہے علاوہ ازیں جیساکہ پروفیسر مونٹگمری نے لکھا ہے اس دستاویز میں مسلمانوں اور یہودیوں کو ایک قوم (امۃ واحدۃ) کہا گیا ہے، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ بدر سے پہلے کا ہے۔

دستاویز معاہدہ | اگرچہ یہ سیاسی دستاویز سینتالیس (۴۷) دفعات پر مشتمل اور بہت طویل ہے، لیکن چونکہ بہت اہم ہے اس لئے ہم بجنسہٖ اس کا ترجمہ نقل کرتے ہیں:۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(۱) یہ ایک تحریر ہے محمد رسول اللہ کی طرف سے قریش کے مومنوں اور مسلمانوں کے درمیان

---

(1) Mohammad in Madina, P. 225, 226.

اور اہل یثرب کے اور ان لوگوں کے درمیان جو ان کے تابع ہوں، ان سے ملحق ہوں اور جو ان کے ساتھ جہاد کریں ۔

(۲) یہ سب لوگ اور لوگوں کو مستثنیٰ کرکے ایک قوم (امتہ واحدۃ) ہیں ۔

(۳) مہاجرین قریش اپنی سابقہ حالت کے مطابق باہمی طور پر اپنا خون بہا ادا کریں گے اور وہ (بحیثیت ایک جماعت کے) اپنے قیدیوں کا فدیہ، راستبازی اور عدل بین المؤمنین کے ساتھ ادا کرینگے ۔

(۴) بنو عوف حسب سابق اپنا پہلا خون بہا ادا کرینگے اور ہر شاخ معروف اور عدل بین المومنین کے ساتھ اپنے قیدیوں کا زرفدیہ ادا کریگی ۔

(۵) (۶) (۷) (۸) (۹) (۱۰) خزرج کے بنو الحارث، بنو ساعدۃ، بنی جشم، بنو النجار، بنو عمرو بن عوف، بنو النبیت اور بنو الاوس یہ سب دفعہ نمبر ۳ کے مطابق اپنا اپنا خون بہا اور قیدیوں کا زرفدیہ ادا کریں گے ۔

(۱۱) مؤمنین اپنے کسی قرضخواہ کو زرفدیہ یا خون بہا ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرینگے ۔

(۱۲) کوئی مومن کسی دوسرے مومن کے مولیٰ (client) کو اسکی اجازت کے بغیر اپنا حلیف نہیں بنائیگا۔

(۱۳) اللہ سے خوف کرنیوالے مومنین متحدہ طور پر اس ہر شخص کے خلاف ہونگے جو انمیں سے ظلم و زیادتی کریگا، یا کسی معصیت اور مومنین کے درمیان فساد انگیزی کا مرتکب ہوگا، اگرچہ یہ شخص الکا بیٹا ہی ہو۔

(۱۴) کوئی مومن کسی مومن کو کسی کافر کی وجہ سے قتل نہیں کریگا اور نہ کسی مومن کے خلاف کسی کافر کی مدد کرے گا ۔

(۱۵) اللہ کی حفاظت سب کے لئے یکساں ہے، ہمسائگی کی پناہ مومنین کے ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کیلئے بھی ہے، اور مومنین اور لوگوں کو مستثنیٰ کرکے باہم دگر ایکدوسرے کے معاون اور مددگار ہونگے ۔

(۱۶) یہود میں سے جو لوگ ہمارے تابع ہونگے ان کی مدد کی جائیگی اور ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو مومنین کے ساتھ کیا جائیگا ۔ نہ ان پر ظلم کیا جائیگا اور نہ ان کے برخلاف ان کے دشمن کو مدد دیجائیگی۔

(۱۷) مؤمنین کا نظام امن ایک ہے، جہاد فی سبیل اللہ کے معاملہ میں کوئی ایک مومن دوسرے مومن کو نظر انداز کر کے صلح نہیں کریگا۔ مگر ہاں سب مؤمنین کی مرضی اور عدل کی اساس پر صلح ہو سکتی ہے۔

(۱۸) ہمارے ساتھ مل کر جو جماعتیں جنگ میں حصہ لیں گی وہ نوبت بنوبت حصہ لے سکتی ہیں۔

(۱۹) جو مومن اللہ کے راستے میں اپنی جان دینگے ان کا انتقام لینے کا حق مومنین کو باہمدگر ہوگا۔

(۲۰ الف) اللہ سے خوف کرنے والے مومنین بہترین ہدایت اور راستبازی پر قائم رہیں گے۔

(۲۰ ب) کوئی مشرک قریش کے کسی شخص کی ذات یا اس کے مال کو پناہ نہیں دیگا اور نہ مومن کے خلاف اس کی مدد کریگا۔

(۲۱) اگر کوئی مؤمن کو ناحق قتل کریگا اور اس کا ثبوت بھی موجود ہوگا تو اس سے قصاص لیا جائیگا، مگر ہاں اگر مقتول کے ورثاء رضامند ہوں تو اس کا خون بہا بھی لیا جا سکتا ہے بہرحال مومن سب قاتل کے خلاف ہونگے، اور ان کے لئے یہی جائز ہے۔

(۲۲) جو مومن اس دستاویز کے مندرجات کا اعتراف کرتا اور اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی فتنہ گر کی مدد کرے یا اس کو ٹھکانہ دے، اور جو ایسا کریگا اس پر قیامت کے دن اللہ کی لعنت اور اس کا غضب ہوگا۔ اور اسکے بدلے میں اس سے کوئی چیز قبول نہیں کی جائیگی۔

(۲۳) تم جب کبھی کسی معاملہ میں اختلاف کروگے تو اس کا فیصلہ اللہ اور محمدؐ سے کرانا ہوگا

یہاں تک دستاویز میں ان تعلقات کا تذکرہ تھا جو مسلمانوں اور اہل یثرب کے درمیان تھے اور جن میں یہود بھی شامل تھے، اب اس کے بعد کا جو حصہ ہے وہ یہود کے لئے مخصوص ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

(۲۴) یہود مومنین کے ساتھ خرچ کرینگے جب تک وہ (مسلمان) برسر جنگ رہینگے

(۲۵) بنو عوف قبیلہ کے یہود اور مومنین ایک قوم ہیں، یہود کے لئے ان کا دین ہے

اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین۔ اس میں جو جس کا مولی ([illegible]) ہے اس کا حکم بھی وہی ہے۔ مگر وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو ظلم یا کسی معصیت کا ارتکاب کریں، ایسے لوگ اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کے لئے ہی ہلاکت کا باعث ہونگے۔

(۲۶) (۲۷) (۲۸) (۲۹) (۳۰) یہود بنو النجار۔ یہود بنو الحارث۔ یہود بنو ساعدہ۔ یہود بنو جُشَم، یہود بنو الاوس ان سب کے لئے وہی حقوق و مراعات ہونگے جو یہود بنو عوف کیلئے ہیں۔

(۳۱) یہود بنو ثعلبہ کے لئے وہی حقوق و مراعات ہیں جو یہود بنو عوف کے لئے ہیں مگر ہاں! ان میں جو شخص ظلم کریگا یا معصیت کا مرتکب ہوگا وہ خود اپنے نفس کو اور گھر والوں کو ہی ہلاک کریگا۔

(۳۲) جفنہ جو ثعلبہ کی ایک شاخ ہے اون کا حال ثعلبہ جیسا ہوگا۔

(۳۳) بنو شطیبہ کے لئے وہی حقوق و مراعات ہیں جو بنو عوف کے لئے ہیں اور انکا دارو مدار نیکی (بر) پر ہے نہ کہ معصیت پر۔

(۳۴) موالی ثعلبہ بھی انھیں جیسے ہوں گے۔

(۳۵) یہود کے عزیز قریب اور ان کے دوست احباب (لطانہ) جو ان سے نسلی رشتہ نہیں رکھتے ان کے حقوق اور مراعات بھی وہی ہوں گے جو یہود کے ہیں۔

(۳۶) جو لوگ ایک امت میں داخل ہیں ان میں کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اجازت کے بغیر کسی سے جنگ نہیں کریگا۔

(۳۶ ب) البتہ ہاں! اگر کسی کو کوئی زخم پہنچا ہے تو اس کو انتقام لینے کی اجازت ہے اور جو کوئی شخص بے سوچے سمجھے کوئی کام کریگا اس کے لئے وہ خود اور اسکے گھر کے لوگ ذمہ دار ہونگے۔ مگر ہاں اس وقت نہیں جب کہ اس شخص پر ظلم کیا گیا ہو اللہ اس دستاویز کا سب سے زیادہ سچا گواہ اور اسے پورا کرنیوالا ہے۔

(۳۷) یہود اپنا خرچ اٹھائیں گے اور مسلمان اپنا خرچ اٹھائیں گے اور جن لوگوں کا ذکر اس دستاویز

میں ہے اُن سے اگر کوئی گروہ جنگ کریگا تو ان کے برخلاف یہود اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کی مدد کرینگے، اور یہود اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خیراندیشی، خیرسگالی اور نیکی کا معاملہ کرینگے، نہ کہ معصیت کا۔

(۳۷ ب) کوئی شخص اپنے حلیف کی معصیت کے باعث ماخوذ نہیں ہوگا اور مظلوم مدد کا مستحق ہوگا۔

(۳۸) جب تک مسلمان جنگ جاری رکھیں گے مسلمانوں کے ساتھ یہود بھی اسکا خرچ اٹھائیں گے۔

(۳۹) جو قبیلے اس دستاویز میں شریک ہیں ان کے لئے یثرب حرم ہے۔

(۴۰) پڑوسی کا حق وہی ہے جو اس شخص کا ہے جس کے پڑوس میں وہ ہے، بشرطیکہ وہ نقصان نہ پہونچائے اور معصیت کا مرتکب نہ ہو۔

(۴۱) کسی عورت کو اس کے متعلقین کی اجازت کے بغیر پناہ نہ دی جائیگی۔

(۴۲) اس دستاویز کے لوگوں میں جب کبھی کوئی اختلاف یا نزاع ہوگا تو اس معاملہ میں اللہ اور محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اللہ اس دستاویز کا سب سے زیادہ سچا گواہ اور اس کی نگرانی کرنیوالا ہے۔

(۴۳) قریش یا ان کے اعوان و انصار کو پناہ نہیں دی جائیگی۔

(۴۴) جو گروہ یثرب پر حملہ کریگا اسکے برخلاف اس دستاویز کے سب لوگ ایک دوسرے کی مدد کرینگے

(۴۵) جب ان کو صلح کی دعوت دیجائیگی تو یہ صلح قبول کرینگے اور اسے نافذ کرینگے اور جب اہل صحیفہ میں سے کوئی خود صلح کی دعوت دیگا تو اس کو ایسا کرنے کا حق ہوگا اور مسلمانوں پر اس کی پابندی لازمی ہوگی۔ مگر ہاں اس وقت نہیں کہ جب کہ جنگ دین کے لئے ہو۔

(۴۵ ب) تمام لوگوں کو (جنگ میں) اپنا وہ حصہ پورا کرنا ہوگا جو ان کی طرف نکلے۔

(۴۶) قبیلۂ اوس کے یہود اور ان کے موالی کے حقوق اور مراعات وہی ہونگے جو اس صحیفہ (دستاویز) کے لوگوں کے ہیں، بشرطیکہ وہ نیکی کے راستے پر گامزن رہیں۔ معصیت کوش آدمی خود اپنے کو ہلاکت میں ڈالتا ہے اور اللہ اس صحیفہ کا سب سے زیادہ سچا گواہ ہے۔

(۴۷) یہ دستاویز کسی ظالم یا بدانسان کو پناہ نہیں دیگی، جو شخص مدینہ سے باہر جائے یا مدینہ میں رہے وہ محفوظ ہے، مگر ظالم یا بدانسان کے لئے کوئی پناہ نہیں، بے شک اللہ اور محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کے لئے پناہ ہیں جو نیک اور متقی ہیں [۵۱]

مدینہ کی پہلی اسٹیٹ تعجب ہے کہ ابن اسحاق، ابن ہشام اور ابن کثیر کے علاوہ مؤرخین سیرت نے اس دستاویز کے ساتھ زیادہ اعتنا نہیں کیا، انھوں نے سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں کیا ہے تو جزوی اور ضمنی طور پر، حالانکہ یہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے، جیسا کہ مستشرقین میں پروفیسر ڈلہاوزن اور پروفیسر منٹگمری نے اور محققین علمائے اسلام میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے لکھا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک اسٹیٹ قائم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ اسکو فیڈرل یعنی وفاقی ریاست کہتے ہیں جس کے صدر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے[۵۲] اور یہ دستاویز اس مملکت کا دستور (Constitution) تھا جس کی رو سے شہر مدینہ ایک حرم اور سیاسی وحدت یا ایک شہری مملکت قرار دیا گیا۔

چند تنقیحات اس سلسلے میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا جواب دینا ضروری ہے (۱) پہلا سوال یہ ہے کہ اس دستور میں یہود کے تمام قبیلوں کا ذکر ہے لیکن ان کے تین مشہور قبائل بنو النضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ کا ذکر نہیں ہے، اس کی کیا

---

[۵۱] الوثائق السیاسیۃ۔ ڈاکٹر محمد حمید ص ۴۱ تا ۴۷

[۵۲]۔ الوثائق السیاسیۃ ص ۲۰۰ و عہد نبوی کے میدان جنگ ص ۲۰۔

وجہ ہے؟ کیا یہ قبیلے معاہدہ میں شریک نہیں تھے، جواب یہ ہے کہ جیسا کہ روایات سے ثابت ہے۔ ان تینوں قبیلوں سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاہدہ تھا چنانچہ علامہ ساعاتی لکھتے ہیں :-

وقد کان الکفار بعد الہجرۃ مع مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی ثلاثۃ اقسام، قسم وادعھم علی ان لا یحاربوہ ولا یالبوا علیہ عدوہ وھم طوائف الیھود الثلاثۃ، قریظۃ والنضیر وبنو قینقاع (حاشیہ مسند امام احمد بن حنبل۔ ج ۲۱ ص ۷۴۔

ہجرۃ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معاملہ رکھنے والے کفار تین قسم کے تھے، ان میں ایک قسم ان لوگوں کی تھی جن سے حضورؐ نے اس بات کا معاہدہ کیا تھا کہ وہ آپ سے جنگ نہیں کریگے اور نہ آپ کے دشمن کو شہ دینگے اور یہ لوگ یہود کے تین طبقے قریظہ، النضیر اور بنو قینقاع تھے۔

لیکن اس کے باوجود زیر بحث دستاویز میں ان کے نام جو نہیں ہیں تو ہمارے نزدیک جیسا کہ پروفیسر منٹگمری نے لکھا ہے، یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے اس دستور میں یہود کی گروپ بندی ان عرب قبائل کے اعتبار سے کی ہے جن کے علاقوں میں یہ رہتے تھے۔ اس بنا پر بنو النضیر اور بنو قریظہ اوس اور ثعلبہ کے یہود میں شمار ہونگے، کیونکہ یہ لوگ ان کے درمیان رہتے تھے[1] اب رہے بنو قینقاع! تو چونکہ یہ بھی ان دونوں کے بیچ میں رہتے تھے[2] اس لئے یہ بھی ان میں شامل ہوں گے، علاوہ ازیں جب معاہدہ کے شروع میں ہی اہل یثرب فرما دیا گیا تو یہ تینوں قبیلے بھی اوس میں آگئے۔

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دستاویز میں مدینہ کو حرم فرمایا ہے اسکی کیا حقیقت ہے؟ اسکی توضیح میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں :-

حرم کی اصطلاح ایک نیم مذہبی اور نیم سیاسی مفہوم رکھتی ہے، .....

(1) Mohammad in Madina P. 226-227

(۲) تاریخ العرب قبل الاسلام جواد علی ج ۴ ص ۱۸۔

اس کا مذہبی مفہوم یہ تھا کہ وہاں کی ہر چیز کو ایک تقدس حاصل ہے۔ وہاں کے چرند پرند کا شکار نہ کیا جائے، وہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں، وہاں خونریزی نہ کی جائے اور وہاں آنیوالوں کو دورانِ قیام میں امن اور پناہ میں سمجھا جائے خواہ وہ مجرم ہی کیوں نہ ہو، حرم کا سیاسی مفہوم یہ تھا کہ وہ اس شہری مملکت کی حدود کا تعین کرتا تھا۔ [1]

(۳) تیسرا سوال یہ ہے کہ یہ عہد نامہ ایک ہی مرتبہ ہوا ہے، یا مختلف اوقات میں جستہ جستہ ہوا ہے۔ اس میں کافی اختلاف ہے، لیکن ہمارے نزدیک زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ معاہدہ مختلف اوقات میں ہوا ہے اور ابن اسحٰق نے ان سب معاہدوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں بعض دفعات مکرر ہوگئی ہیں۔

سریہ اور اوس کی حقیقت اب جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندرونی مسائل و معاملات کی تنظیم و ترتیب اور داخلی تحفظات کے انتظام و انصرام سے فارغ ہوگئے تو آپ نے وقت کے سب سے اہم مسئلہ یا قریش کی طرف توجہ کی، اس سلسلہ میں آپ کا پہلے سے سوچا اور سمجھا ہوا منصوبہ یہ تھا کہ قریش کی تجارتی لائن کو منقطع کر دیا جائے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو آج کل کی اصطلاح میں معاشی اور اقتصادی مزاحمت (Economic Blockade) کہتے ہیں۔ قریش کی طاقت و قوت کا دار و مدار جو کچھ تھا وہ تجارت اور نہایت وسیع پیمانہ پر کاروبار تھا اور شام و ایران وغیرہ جانے کے لئے قریش کے تجارتی قافلوں کا مدینہ کے راستے سے گذرنا ضروری تھا جس پر اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبضہ تھا اور اقتصادی مزاحمت (Economic Blockade) کا مقصد کہیں بھی ابتداءً جنگ شروع کر دینا نہیں ہوتا۔ بلکہ دشمن کو تنگ اور

---

(۱) عہد نبوی کے میدان جنگ صلا۔

پریشان کرکے اوس کو اس معاندانہ روش سے باز رکھنا ہوتا ہے جو اوس نے اختیار کر رکھی ہے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ آپ اقتصادی مزاحمت کی جو مہم شروع کرنیوالے ہیں اس کے نتیجے دو ہی ہو سکتے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ قریش تنگ آکر اور پریشان ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور ہونگے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کے خلاف اپنی سوتت معاندانہ روش سے باز آجائیں گے اور آزادی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے آپ کے حق کو تسلیم کرلیں گے (۲) اور دوسرا یہ کہ قریش اس اقتصادی مزاحمت کو اعلان جنگ سمجھ کر برسرپیکار ہونگے۔

اقتصادی مزاحمت کے نتیجے اگرچہ دونوں ہو سکتے تھے۔ لیکن بدر کی جنگ جس طرح اچانک شروع ہوئی اور مسلمان اس میں جس بے سروسامانی کے عالم میں شریک ہوئے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رجحانِ خاطر پہلے نتیجہ کی طرف تھا اور آپ کو توقع تھی کہ قریش مجبور ہو کر صلح کرلیں گے اور اپنی حرکات سے باز آجائیں گے۔

بہرحال اب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "سرایا" مقرر کئے، سرایا جمع سریۃ کی ہے اور اس کا مادۂ اشتقاق "سَرِیٰ" ہے جس کے معنی رات کو چلنا اور سفر کرنا ہیں۔ مؤرخین سیرت نے غزوہ اور سریہ دونوں کو خلط ملط کر دیا اور سریہ پر بھی بے تکلف غزوہ کے لفظ کا اطلاق کر دیتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ غزوہ کے معنی جنگ ہیں جو دن کے وقت اور دوبدو ہوئی ہے اور اس میں دشمن سے کھلا مقابلہ ہوتا ہے، اس کے برخلاف سریہ کا کام اور اس کی نقل و حرکت پوشیدہ ہوتی ہے۔ سریہ کا ٹھیٹ ترجمہ اور اس کی حقیقت وہ ہے جو انگریزی میں لفظ *Reconnaissance* کی ہے اور جیسے ہم اردو میں "گشتی دستہ" یا "چھاپہ مار دستہ" کہہ سکتے ہیں۔ اس دستہ کے مقاصد حسب ذیل تھے:۔

(۱) دشمن کی نقل وحرکت کی خبر رکھنا اور اُن کی ٹوہ لینا۔

(۲) جاسوسی کرنا۔

(۳) بے خبری میں دشمن پر چھاپہ مارنا۔

(۴) جو لوگ فتنہ انگیزی اور فساد پروری کر رہے ہوں ان کی سرزنش کرنا۔

ان مقاصد کے ماتحت سریہ کے لوگوں کی تعداد متعین نہیں تھی، اس کا انحصار اس مقصد پر تھا جس کے لئے سریہ بھیجا جاتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رجب ۲ھ میں حضرت عبداللہؓ بن جحش کی سرکردگی میں جو دستہ بھیجا گیا تھا اس میں حسب روایات کم از کم سات اور زیادہ سے زیادہ بارہ آدمی تھے۔ پھر علی الترتیب اسی سنہ کے ماہ رجب اور شعبان میں عصماء اور ابوعفک کی سرکوبی کے لئے جو دستے بھیجے گئے وہ صرف ایک ایک شخص یعنی عمیرؓ اور سلیمؓ پر مشتمل تھے۔ ۳ھ میں بماہ ربیع الاول کعب بن اشرف یہودی کے قتل کے لئے جو دستہ حضرت محمد بن مسلمہؓ کی سرکردگی میں گیا تھا وہ پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ غرض کہ سرایا کا اسی حیثیت سے جائزہ لیجئے تو ایک سریہ میں آپ کو کہیں تھوڑے اور کہیں زیادہ افراد ملیں گے۔ سب سے بڑا سریہ غالباً وہ ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنی سرکردگی میں قریش کے کاروانِ تجارت کی ٹوہ میں ۲ھ کے ماہ صفر میں ابواء لے گئے تھے۔ اور جس کو مورخین وارباب سیرت عام طور پر غزوہ ابواء یا غزوۂ وَدّان[1] کے نام سے ذکر کرتے

[1] ابواء اور ودان مدینہ سے مکہ کے راستے پر دو گاؤں تھے۔ یاقوت حموی کے بیان کے مطابق ان دونوں میں آٹھ میل کا فاصلہ تھا۔ ودان میں قبیلہ ضمرہ، غفار اور کنانہ آباد تھے۔

صراطِ مستقیم (انگریزی)

دی بلینڈ فیے کے نام سے انگریزی زبان میں اسلام کی صداقت پر ایک معزز یوروپین نو مسلمہ خاتون کی یہ مختصر اور بہت اچھی کتاب۔ محترم خاتون نے اپنے اسلام قبول کرنے کے مفصل وجوہ بھی تحریر کئے ہیں۔ یہ ایڈیشن نہایت اہتمام سے صحت کے ساتھ طبع کرایا گیا ہے۔ جلد خوبصورت (فل کلاتھ بائنڈنگ) قیمت [illegible] روپے۔

ہیں۔ اس سریہ میں ساٹھ افراد شامل تھے [۱]

غزوات وسرایا کی تعداد | غزوات وسرایا کی تعداد کیا تھی؟ اس بارہ میں اختلاف ہے امام احمد بن حنبل نے ان سب روایات کو یکجا کردیا ہے اور ابن سعد نے بالترتیب انھیں نام بنام لکھا ہے لیکن ہمارے زمانے کے علمائے محققین کا جس پر اتفاق ہے اور جو ابن سعدؒ کے بیان پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ وہ غزوات جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شریک ہوئے ہیں ان کی تعداد ستائیس ۲۷ ہے۔ ان میں سے سات غزوات میں آپؐ نے خود جنگ میں بھی حصہ لیا ہے، ان کے نام یہ ہیں:۔

بدر۔ احد۔ المریسیع۔ خندق۔ قریظہ۔ خیبر۔ فتح مکہ۔ حنین اور الطائف اور جو دستے اور سرایا آپ نے روانہ کئے ہیں۔ وہ گنتی میں سینتالیس ۴۷ ہیں۔

"لیکن یہاں دو باتیں ملحوظ خاطر رکھنے کی ہیں"

(۱) ایک یہ کہ اوپر جن کو غزوات یا سرایا کہا گیا ہے ضروری نہیں کہ ان سب میں جنگ اور قتل وقتال کی نوبت آتی ہو۔ مثلاً فتح مکہ صلحاً ہوا ہے نہ کہ عنوۃً، اور سرایا میں تو ایک دو نہیں، بلکہ اس کی مثالیں کثرت سے ہیں۔

(۲) دوسری یہ کہ جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ نے فوجوں کی کمان (Command) اور ان کی قیادت اور صفوں کی ترتیب وغیرہ کی ہے،

---

[۱] واضح رہنا چاہیئے کہ یہ ہماری ذاتی رائے ہے، ورنہ ہمیں معلوم ہے کہ کتب تاریخ وسیر میں ساٹھ سے زیادہ افراد پر مشتمل دستہ پر بھی سریہ کا اطلاق کیا گیا ہے مثلاً ۸ھ میں غزوہ سیف البحر جسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کی سرکردگی میں تین سو آدمیوں کا جو لشکر بھیجا تھا ارباب سیر نے اس کو بھی کہیں غزوہ کہا ہے اور کہیں سریہ کہا ہے۔ حالانکہ درحقیقت نہ وہ غزوہ ہے اور نہ سریہ، بلکہ وہ ایک فوجی دستہ تھا جو (صلح حدیبیہ کے بعد) قریش کے کاروان تجارت کی قبیلۂ جہینہ سے حفاظت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس قسم کے دستوں کے لئے صحیح لفظ "بعوث" ہے جو سیرت کی بعض کتابوں میں مستعمل بھی ہوا ہے۔

ورنہ آپؐ کی شانِ رحمۃ للعالمین کا یہ بھی ایک عجیب قدرتی مظاہرہ ہے کہ اتنی لڑائیاں ہوئیں، سخت سے سخت معرکے پیش آئے۔ لیکن کہیں کسی روایت سے ثابت نہیں ہے کہ آپ نے کسی دشمن پر تلوار اٹھائی یا اسے قتل کیا ہو، غزوۂ احد میں نصیبِ دشمناں کیا کچھ نہیں ہوا! دشمن تیر برسا رہے تھے۔ ایک بدبخت نے یہاں تک جرأت کی کہ قریب آکر تلوار سے ایسا وار کیا کہ تلوار خود پر پڑی اور اس سے چہرۂ مبارک پر خراش آگئی لیکن اس وقت بھی جاں نثاروں کے حلقہ میں گھرے ہوئے رحمت عالم کی زبان مبارک "ربّ اغفر قومی فانھم لا یعلمون" اے میرے پروردگار میری قوم کو بخشدے کیونکہ وہ جانتے نہیں ہیں" کی صدائے لاہوتی سے توزمزمہ سنج تھی لیکن دستِ اقدس کو کسی نے نہیں دیکھا کہ اس میں تلوار لہرائی ہو۔"

مہم کا آغاز بہرحال اب وقت آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مہم یعنی قریش کے کاروان تجارت سے تعرض (Interception) کو شروع کرنے کا عزم فرمالیا اس سلسلہ میں آپ نے مختلف اوقات میں مختلف دستے روانہ کئے جن کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) سب سے پہلا دستہ جس میں خود آپ بھی تھے ماہ صفر ۲ھ میں وَدّان یا ابواء کے لئے روانہ ہوا۔ اسمیں کہیں قریش سے دوچار ہونے کا موقع نہیں ہوا۔ بنی ضمرۃ بن عبد مناۃ قبیلہ اس جگہ کے آس پاس ہی رہتا تھا۔ آپ نے اُن سے مصالحت کرلی جس کا ذکر گذرچکا ہے۔ اس کے بعد آپ واپس آگئے۔[۱]

ارباب سیر کا عام طریقہ ہے کہ ہر وہ مہم (Ex Pedition) جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوں اس کو غزوہ کہتے ہیں اس بنا پر انھوں نے اس کو بھی غزوۂ ودان یا غزوۂ ابواء کہا ہے حالاں کہ جب دشمن سے مڈبھیڑ بھی نہیں ہوئی تھی تو

---

[۱] ابن ہشام ج ۲ ص ۲۴۱۔

اس پر غزوہ (جنگ) کے لفظ کا اطلاق اصطلاحًا ہی ہوسکتا ہے حقیقتًہ نہیں ۔

(۲) اس کے کچھ دنوں بعد آپ نے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی سرکردگی میں تیس مہاجر کا ایک دستہ سمندر کے ساحل (سیف البحر) کی طرف عیص کے نواح میں بھیجا، اس دستہ کی مڈبھیڑ ابوجہل کے ساتھ ہوئی جو کفار مکہ کے تین سو سواروں کے ساتھ تھا۔ لیکن مجدی بن عمرو الجہنی نے بیچ میں پڑکر معاملہ رفع دفع کرادیا اور جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ [۵۱]

(۳) انھیں دنوں میں آپ نے ایک اور دستہ حضرت عبیدۃ بن الحارث کی سرکردگی میں ساٹھ یا اسّی مہاجرین کا بمقام [۵۲] ثنیۃ المرۃ کی گھاٹی کے نشیب میں ایک جگہ کا نام ہے روانہ کیا، لیکن یہاں بھی کوئی جھڑپ نہیں ہوئی، البتہ حضرت سعد بن ابی وقاص ایک تیر سے زخمی ہوگئے اور ادھر دو مسلمان جو مکہ میں پھنسے ہوئے تھے اور اس وقت ابوجہل کی جمعیت میں تھے وہ موقع پاکر مسلمانوں سے آملے۔ ان کے نام مقداد بن عمرو اور عتبۃ بن غزوان ہیں۔

(۴) اسی سن کے ماہ ربیع الآخر (بعض روایات کے مطابق ربیع الاول) میں قریش کے قافلہ، تجارت کی جستجو میں جس کا امیر کارواں امیہ بن خلف تھا بمقام بواط (ینبع کے قریب جہینہ کا ایک پہاڑ) تک دو سو مسلمانوں کا ایک دستہ لے کر خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، لیکن اس میں بھی دشمن سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی اور واپس آگئے ارباب سیر نے اپنی عادت کے مطابق اسے بھی غزوہ کہا ہے۔

(۵) ماہ جمادی الاولیٰ کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ڈیڑھ سو یا

---

[۵۱] ابن ہشام ج ۲ ص ۲۴۲ ۔ [۵۲] عام مراجع میں مقام کا نام احیاء لکھا ہوا ہے لیکن ڈاکٹر شوقی ضیف نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے (کتاب الدرر والمغازی حاشیہ ص ۱۰۴)۔

بعض روایت کے مطابق دوسو مہاجرین کا ایک دستہ اسی مقصد کے ماتحت لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے اور مقام عشیرہ تک تشریف لے گئے۔ بنو مدلج یہیں رہتے تھے۔ آپ نے ان سے معاہدہ کیا اور واپس آگئے۔ جنگ کی نوبت اس مرتبہ بھی نہیں آئی، حالانکہ ارباب سیر نے اسے بھی غزوہ شمار کیا ہے

(۶) انھیں دنوں میں کرز بن جابر الفہری جو بعد میں مسلمان ہو کر مدینہ آگئے تھے۔ انھوں نے مدینہ کی چراگاہوں پر حملہ کیا اور کچھ جانور لے بھاگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تعاقب میں حضرت سعد بن وقاص کو بیس مہاجرین کی معیت میں روانہ کیا، لیکن کرز بن جابر ہاتھ نہیں آیا اور حضرت سعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقام خرار (مکہ اور مدینہ کے درمیان) ایک وادی تک جاکر واپس آگئے۔

(۷) اسی سلسلہ میں ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ سے نکلے اور وادی سفوان تک گئے تھے، لیکن کرز آپ کے ہاتھ بھی نہیں آیا اور پہلو بچا کر نکل بھاگا اور آپ مدینہ واپس آگئے۔ ارباب سیر اسکو بھی غزوۂ بدر اولیٰ کہتے ہیں۔[۱]

ارباب سیر جو نام چاہیں دیں، لیکن آپ نے دیکھا کہ مذکورۂ بالا سات مہموں میں سے کسی مہم میں بھی نہ جنگ ہوتی ہے، نہ لوٹ مار ہوتی ہے اور نہ دشمن سے کوئی سابقہ (Engagement) ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیا فعل عبث تھا۔ جیساکہ مولانا شبلی نے بہ طور طنز لکھا ہے (سیرت النبی ج۱ حاشیہ ص۳۱۲)

جواب یہ ہے کہ ہرگز ایسا نہیں تھا اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

---

[۱] اوپر جن مہموں کا ذکر ہوا ہے ان سب کا تذکرہ تمام ارباب سیر ابن ہشام ابن سعد، ابن حزم ابن سید الناس، طبری، ابن کثیر وغیرہم نے کیا ہے اور بعض بعض کی روایت صحیح بخاری اور مسند امام احمد بن حنبل میں بھی موجود ہے لیکن ہم نے اس موقع پر حافظ ابن عبد البر کی مغازی خاص طور پر پیش نظر رکھی ہے۔

(۱) اگرچہ بنیادی طور پر مرکز توجہ قریش تھے لیکن اس سلسلے میں دوسرے کام بھی تو کرنے کے تھے، مذکورہ بالا مہموں کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمبر ۱ و ۵ میں بنوضمرہ اور بنو مدلج سے معاہدہ کیا۔ اور یہ بجائے خود بہت اہم ہے۔ نمبر ۲ میں اگرچہ جنگ نہیں ہوئی لیکن ابوجہل اور دوسرے سرداران قریش کو یہ جتا دیا کہ اب مسلمانوں کے دم خم کیا ہیں۔ جنگ کے نقطۂ نظر سے یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں نمبر ۳ کا فائدہ یہ ہوا کہ مکہ میں پھنسے ہوئے دو مسلمان ادھر آگئے۔

(۲) نمبر ۴، ۶، اور ۷ میں اگرچہ کوئی واقعہ پیش نہیں آیا لیکن ان کا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مسلمانوں کو یہ تعلیم مل گئی کہ (الف) وہ قریش کے کاروان تجارت کی تاک میں رہیں اور جب کبھی ان کو اس کی کن بھن ملے وہ اس کو چیلنج کرنے کے لئے روانہ ہوں اور (ب) دوسری تعلیم یہ ملی کہ پورا مدینہ ایک حرم اور ایک مملکت ہے، اس بنا پر جو شخص اور جو گروہ بھی مدینہ کی چراگاہ یا اس کی کسی چیز پر دست درازی کرے گا وہ تادیب اور سرزنش کا مستحق ہوگا باقی

تہذیب کی تشکیل جدید

مؤلف مولانا محمد تقی امینی

اخلاق وعادات حسن ذوق وعمل قوموں کے اصول وقوانین اُن کی زندگی کے نصب العین وغیرہ یہ چیزیں ہیں جو تہذیب کے دائرے میں آتی ہیں۔ مغربی تہذیب دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، ایک گروہ تو وہ ہے جو مشرق کو مغرب میں دراندازی کا موقعہ دینا نہیں چاہتا دوسرا گروہ وہ ہے جو تکوین و تشکیل کے ہر مرحلے میں مشرق ہی کو اثرانداز مانتا ہے اس افراط و تفریط کی وجہ قومی عصبیت صلیبی جنگیں مطالعہ و تحقیق کی کمی وغیرہ ہے۔ اس کتاب میں تشکیل جدید کے بنیادی خد و خال بیان کرنے کے ساتھ یہ کوشش کی گئی ہے کہ زندگی میں مغربی تہذیب کے اثرات کا کسی قدر تفصیلی ذکر ہو جائے تاکہ دونوں کے تقابلی مطالعے میں سہولت ہو مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لئے ایک محققانہ کتاب ہے کتاب کے مطالعے سے تہذیب کی تشکیل جدید کے تمام عنوانات روشن ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

مولانا احمد علی محدّث سہارنپوری

از جناب سید محبوب صاحب رضوی، دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا احمد علی محدثِ سہارنپوری رح اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم اور نامور محدّث تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا سیّد محمد علی مونگیری رح اور علامہ شبلی رح جیسے مشاہیر اور یگانۂ روزگار علمار ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل تھے۔

ولادت اور نسب سنہ ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں سہارن پور[1] کے انصاری خاندان میں پیدا ہوئے، ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ مولانا احمد علی بن شیخ لطف اللہ بن شیخ محمد جمیل بن شیخ محمد خلیل بن شیخ احمد بن شیخ محمد بن شیخ بدرالدین بن شیخ صدرالدین بن شیخ الاسلام ابوسعید انصاری رح۔

تعلیم اوائل عمر میں تعلیم کا شوق نہ تھا، ۱۸ سال کی عمر میں تحصیل علم پر متوجہ ہوئے، اور میرٹھ میں قرآن شریف حفظ کیا، پھر سہارنپور میں مولانا سعادت علی سہارنپوری سے کچھ کتابیں پڑھیں، آخر میں دہلی پہنچ کر استاذالاساتذہ حضرت مولانا مملوک نانوتوی رح (وفات سنہ ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ صحیح بخاری کا اکثر حصہ شیخ وجیہ الدین صدیقی رح سے سہارن پور میں پڑھا، شیخ وجیہ الدین، مولانا عبدالحی رح کے واسطے سے شاہ عبدالقادر دہلوی رح کے سلسلۂ سند واجازت میں شامل تھے، کتب حدیث کی

[1] سنہ [illegible]ھ میں بعہد غیاث الدین تغلق ایک بزرگ شاہ ہارون چشتی رح کے قیام سے سہارنپور کی آبادی کا آغاز ہوا؛ چنانچہ ابتدا میں شاہ ہارون پور کے نام سے موسوم رہا، پھر رفتہ رفتہ کثرتِ استعمال سے سہارنپور ہوگیا "شہر پر زیب" اس کا تاریخی نام ہے، سہارنپور اترپردیش کا شمالی مغربی ضلع اور نادرن ریلوے کا جنکشن ہے (تاریخ دیوبند ص ۴۲)

تکمیل سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں مکہ مکرمہ میں حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ کی خدمت بابرکت میں رہ کر کی ان کے حدیث پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد سے ظہر تک حرم شریف میں بیٹھ کر احادیث کی نقل کرتے اور ظہر سے عصر تک نقل کی ہوئی احادیث حضرت شاہ صاحبؒ سے پڑھتے تھے۔ حدیث کی تمام کتابیں اسی طرح سے پڑھیں، ان کا خط نہایت پاکیزہ تھا، ابوداؤد کا ایک مکمل نسخہ جو محدث سہارنپوری کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، مولانا خلیل احمد انبیٹھوی کے پاس موجود تھا، بذل المجہود کی تالیف کے دوران یہی نسخہ مؤلف کے سامنے رہا ہے[1]

صحیح بخاری کا جو نسخہ تصحیح کے بعد محدث سہارن پوریؒ نے شایع کیا تھا اس کے مقدمہ میں اپنی تعلیم کی نسبت لکھا ہے:-

"عبد ضعیف خادم حدیث نبوی احمد علی بحیثیت وطنیت سہارن پوری اور بحیثیت تلمذ اسحاقی ہے، صحیح بخاری کا اکثر حصہ میں نے شیخ وجیہ الدین محسنی صدیقی سہارنپوری سے سہارن پور میں پڑھا، ان کو صحیح بخاری کی اجازت مولانا عبد الحیؒ سے اور انہیں مولانا عبد القادرؒ سے اور انہیں اپنے بھائی شاہ عبد العزیزؒ سے اور انہیں اپنے والد شاہ ولی اللہؒ سے حاصل ہے۔ پھر میں نے دوبارہ شاہ محمد اسحٰقؒ سے مکہ مکرمہ میں پڑھا ہے[2]"

مطبع احمدی دہلی

مشہور روایت یہ ہے کہ محدث سہارن پوریؒ نے ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۵ء) میں حجاز سے واپس آکر دہلی میں مطبع احمدی کے نام سے ایک پریس جاری کیا اس

---

[1] تاریخ مظاہر مؤلفہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب ص ۴۰، ۴۱ و اوجز المسالک جلد اول ص ۵۴ مطبوعہ مکتبہ یحیوی سہارن پور

[2] مقدمہ صحیح بخاری جلد اول مطبوعہ اصح المطابع دہلی،

زمانے میں پریس کا آغاز ہندوستان میں نیا نیا ہوا تھا، فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کے بیان کے مطابق ممالکِ مغربی شمالی میں سب سے پہلا لیتھوگراف مطبع ۱۸۳۷ء/۱۲۵۲ھ میں دہلی میں قایم ہوا تھا[1] مطبع احمدی دہلی سے حدیث کی کتابوں کی اشاعت کا خوب کام ہوا اور ہندوستان میں پہلی مرتبہ حدیث کی کتابیں طبع ہوکر عام ہوئیں اس سے پہلے یہ کتابیں ہاتھ کی لکھی ہوئی ہوتی تھیں اور صرف خاص خاص لوگوں کے پاس پائی جاتی تھیں، ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں سب سے پہلے جامع ترمذی چھپی، ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء میں صحیح بخاری اور پھر ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں مشکوٰۃ المصابیح طبع ہوئی، ہندوستان میں حدیث کی یہ پہلی کتابیں ہیں جو زیور طبع سے آراستہ ہوئیں مطبع احمدی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس مطبع کی چھپی ہوئی کتابیں صحت کے لحاظ سے مثالی سمجھی جاتی ہیں، بعد کے تمام ناشرین حدیث نے صحت کے لئے انہی کتابوں کو معیار قرار دیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مطبع احمدی کو سخت نقصان پہونچا تو محدث سہارنپوری نے اسے دہلی سے میرٹھ منتقل کر دیا۔

---

[1] ترجمہ خطبات گارساں دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ص ۱۷۸۔

[2] راقم سطور کے فاضل دوست پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھا ہے کہ مطبع احمدی دہلی ۱۲۶۲ھ میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے حجاز سے واپس آکر قایم کیا تھا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں یہ مطبع ختم ہوگیا۔" (مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۲۱۰ و ۲۱۲) مگر حقیقت یہ ہے کہ مطبع احمدی سب سے پہلے نواح کلکتہ میں سید عبداللہ ابن میر بہادر علی حسینی نے قایم کیا تھا، میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے شعبہ تصنیف و ترجمے سے وابستہ تھے، اولاً اس مطبع میں نستعلیق ٹائپ میں طباعت ہوتی تھی، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں تقویۃ الایمان مصنفہ مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کا وہ نسخہ موجود ہے جو ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء میں کلکتہ میں نستعلیق رسم الخط کے ٹائپ میں چھپا ہے، اس کے بعد شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں اسی مطبع میں بمقام دہلی طبع ہوا ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ سے مطبع احمدی دہلی منتقل کر دیا گیا ہوگا، اور محدث سہارنپوریؒ نے اسے سید عبداللہ سے خرید لیا ہو اور سابقہ نام ہی باقی رکھا ہو، جس طرح بعد میں مولوی عبدالاحد مرحوم

مطبع احمدی دہلی کی چھپی ہوئی صحیح بخاری اور مشکوٰۃ المصابیح کے نسخے دار العلوم دیوبند کے کتب خانے میں موجود ہیں، ان کے حواشی کی نسبت راقم سطور کا خیال ہے کہ یہ خود حضرت محدث سہارن پوری کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں البتہ حدیث کا متن کاتب کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

درس و تدریس اور کتب حدیث پر حواشی | شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب اوجز المسالک کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

"علوم سے فراغت کے بعد پڑھانے میں مشغول ہو گئے، دہلی میں مطبع احمدی جاری کیا اُس میں حدیث کی کتابیں چھاپیں اور ان پر مفید حاشیے لکھے، خاص طور سے صحیح بخاری کا نہایت عمدہ حاشیہ لکھا ہے، بخاری کے آخری پانچ پاروں کے حواشی ان کی فرمائش پر حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی بے نظیر رسالے بھی لکھے ہیں، جن میں سے ایک رسالہ الدلیل القوی علیٰ ترک قرأۃ للمقتدی ہے۔"

مولانا عبدالحیٔ لکھنویؒ نے نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے:۔

"مکہ مکرمہ سے واپس آکر تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے، ذریعۂ معاش تجارت تھا، حدیث میں پوری بصیرت رکھتے تھے، اپنی عمر صحاح ستہ بالخصوص صحیح بخاری

(باقی حاشیہ پچھلے صفحہ کا)، نے مطبع مجتبائی منشی ممتاز علی سے خریدا تھا، مگر مجتبائی نام جوں کا توں باقی رکھا۔ دار العلوم دیوبند کی روداد ۱۲۸۴ھ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مطبع احمدی دہلی سے میرٹھ منتقل ہو چکا تھا (روداد ۱۲۸۴ھ ص ۲۳) میرٹھ سے پھر کسی وقت یہ مطبع دہلی منتقل ہو گیا، جہاں ۱۳۰۲ھ میں موضح قرآن کا جو ایڈیشن محمد ثابت علی و سید غلام حسین کے اہتمام میں چھپا ہے اس پر مطبع احمدی دہلی چھپا ہوا ہے، موضح قرآن کا مطبع احمدی دہلی کا یہ مطبوعہ نسخہ دار العلوم دیوبند کے کتب خانے میں موجود ہے۔ سید محبوب رضوی۔

کے پڑھانے میں صرف کردی، دس سال صحیح بخاری کی تصحیح میں لگے بخاری پر مفصل حاشیہ لکھا[1]"

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب نے لکھا ہے کہ:۔

" کتب حدیث میں بین السطور حاشیے کے بعد جہاں جہاں ۱۲۔ مولانا کا لفظ آتا ہے اس کے لکھنے والے یہی مولانا احمد علی صاحب ہیں اور "مولانا" کے مصداق حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب ہیں[2]۔"

کتب حدیث پر محدث سہارن پوری کے حواشی یکساں طور پر تمام علماء میں مسلّم اور مقبول ہیں، انہوں نے اپنے حواشی میں مطالب حدیث کی توضیح کے علاوہ اسماء الرجال کے تلفظ یعنی صحتِ اعراب، رُواتِ حدیث کی کُنیتوں اور نسب وغیرہ امور پر بھی کلام کیا ہے، صحیح بخاری کی تصحیح اور اس پر حاشیہ لکھنے میں انہوں نے جو محنت شاقہ اور جگر کاوی کی ہے اس کی نسبت اپنے حاشیے کے خاتمہ پر لکھا ہے:۔

" اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار اور حدیثِ نبوی کا خادم احمد علی کہتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی مدد سے سید المحدثین شیخ الاسلام امام محمد بن اسمٰعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کی طباعت کا کام اتمام کو پہونچا، جس کے لئے میں نے اپنی عمر کا بڑا حصّہ صرف کیا، دنوں کو بے آرام رہا، اور راتوں کو جاگ کر کاٹا، بخاری کے معنیٰ کی تصحیح و توضیح، مطالب کی تنقیح، اسماء الرجال کی حرکات اور ان کے نسبُ اور کنیتوں اور القاب وحالات کے پیش نظر دن رات ایک کردیئے۔"

صحیح بخاری کی طباعت کا سن مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۲۶۷ھ لکھا ہے، چنانچہ حیاتِ شبلی میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۳۴ [2] تاریخ مظاہر ص ۴۱۔

"مولانا سہارن پوری کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ حدیث کی قلمی کتابوں کو سخت محنت سے صحیح کر کے چھاپ کر عام کیا، چنانچہ سنہ ۱۲۶۵ھ میں جامع ترمذی اور سنہ ۱۲۶۷ھ میں صحیح بخاری شایع کی[1]"

مگر راقم سطور کے نزدیک صحیح بخاری کا سنِ طباعت سنہ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء ہے، چنانچہ بخاری کا جو نسخہ سنہ ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں دہلی کے مطبع مجتبائی میں نہایت صحت و اہتمام کے ساتھ چھاپا گیا ہے اس کے آخر میں مطبع مجتبائی کی جانب سے یہ لکھا ہوا ہے:-

"در تصحیح اصل کتاب و تحریر حواشی نایاب کارہا نموند کہ رقبۂ احسانش برقبۂ علماء تا قیامت خواہد ماند و در سنہ ۱۲۷۰ھ طبع کنانیدہ اشاعتِ عام فرمودند بعد ازاں صاحب زادگانِ ایشاں کہ از علوم نقلیہ و عقلیہ و اخلاقِ محمدیہ بہرہ وافی دارند در سنہ ۱۲۸۸ھ باز سنہ ۱۳۰۰ھ ہجری حلیۂ طبع پوشانیدند[2]"

صحیح بخاری کے آخر میں اس کی طباعت کا جو مادہ تاریخ کا لکھا ہوا ہے اس سے بھی سنہ ۱۲۷۰ھ کی تائید ہوتی ہے لکھا ہے:-

"ھٰذہٖ مادۃ تاریخ ختم الطبع استخرجہا المولوی محمد عمر بن المولوی احمد سعید المجددی قد طبع اصح کتب بعد کتب اللہ ۱۲۷۰"

اس لئے صحیح بخاری کی طباعت سنہ ۱۲۷۰ھ ہی میں سمجھنی چاہیئے، اس اختلاف کا یہ سبب ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۲۶۷ھ سے طباعت کا آغاز ہوا ہو اور سنہ ۱۲۷۰ھ میں تکمیل کی نوبت آئی ہو، صحیح بخاری جیسی ضخیم کتاب کے لئے ایسا ہونا کچھ مستبعد نہیں ہے۔

---

[1] حیات شبلی ص ۸۵

[2] محولہ عبارت صحیح بخاری مطبوعہ مجتبائی دہلی سنہ ۱۳۲۲ھ کے سرورق کے صفحہ ۴ پر درج ہے۔

محدث سہارن پوری نے صحیح بخاری کا یہ حاشیہ مفتی صدر الدین آزردہ[1] کو بھی دکھلایا ہے، چناں چہ مفتی صاحب نے اس پر ایک گراں قدر تقریظ تحریر فرمائی ہے جو صحیح بخاری کے آخر میں درج ہے۔

تجارت اور سخاوت

محدث سہارن پوری کا ذریعۂ معاش کتابوں کی تجارت تھی جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے انہوں نے کتابوں کے چھاپنے کے لئے خود مطبع قایم کیا تھا، اس سے بڑی آمدنی تھی اور خوب فراغت اور مرفہ حالی کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، روزانہ نئی پوشاک زیب تن کرتے اور اتارے ہوئے کپڑے غریبوں کو تقسیم کر دیئے جاتے تھے، معمول یہ تھا کہ رمضان شروع ہونے سے پہلے سال بھر کے دنوں کی تعداد کے مطابق کرتے، پاجامے اور ٹوپیاں سلوالی جاتی تھیں، علی الصباح جو سائل سب سے پہلے مکان پر پہونچ جاتا اُسے تینوں کپڑے دیدئے جاتے تھے۔

---

[1] مفتی صدر الدین آزردہ ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، حضرت شاہ عبد العزیز، شاہ عبد القادر اور شاہ محمد اسحق صاحب دہلوی سے علوم کی تکمیل کی، دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے صدر الصدور اور مفتی کے منصب پر فائز تھے اور بطور خود مکان پر طلبا کو بھی پڑھاتے تھے، بعد ازاں دہلی کے قدیم مدرسہ دار البقا کو از سر نو جاری کیا، طلبا کے جملہ مصارف کی کفالت خود کرتے تھے، عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، ان کے پاس ایک بیش قیمت کتب خانہ بھی تھا جس کی مالیت کا اندازہ تین لاکھ روپے کیا گیا ہے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتوے پر دستخط کرنے کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے، جائیداد اور کتب خانہ ضبط ہو گیا، بڑی مشکل سے کئی مہینے کے بعد رہائی ہوئی، کچھ جائیداد بھی واگذار ہو گئی تھی مگر کتب خانہ ہاتھ نہ آسکا۔

تقریظ کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کو عربی زبان و ادب میں اچھی دستگاہ حاصل تھی۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء بروز پنجشنبہ دہلی میں انتقال ہوا۔

۱۸۵۷ء میں جب مطبع احمدی تباہ ہو گیا تو کچھ دنوں تک سہارنپور میں آپ کا قیام رہا، پھر میرٹھ میں مطبع احمدی از سرِ نو قائم کیا، بعد ازاں کلکتہ چلے گئے۔ علامہ شبلی کا بیان ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے دنیوی دولت سے متمتع فرمایا تھا، کتبِ حدیث کی طباعت و اشاعت فرمائی اس کام میں اللہ تعالیٰ نے برکت دی ۱۸۵۷ء میں سب کچھ لٹ گیا، دو برس تک اپنے مکان پر بیٹھ کر درس دیتے رہے، پھر شیخ الٰہی بخش رئیس میرٹھ کی طرف سے کلکتہ جا کر کاروبار جاری کیا، جس سے آپ کو پانچ سو روپے ماہوار کی آمدنی تھی، اس زمانے میں صبح سے ۹ بجے تک مسجد حافظ جمال الدین میں درس دیتے تھے، تقریباً دس سال کلکتہ میں قیام رہا[1]۔ یہ وہی مسجد ہے جس میں بعد میں مولانا حفظ الرحمٰن نے بھی کچھ عرصہ درسِ قرآن دیا ہے۔

قیام کلکتہ کے زمانے میں وطن میں آمد و رفت رہتی تھی، تاریخ مظاہر میں لکھا ہے کہ جب کلکتہ سے تشریف لاتے تو مدرسہ مظاہر علوم کی ہر نوع کی ہمت افزائی اور دستگیری فرماتے[2]۔ مظاہر علوم کے دو طلبا کا کھانا آپ کے یہاں سے مقرر تھا، سالانہ جلسوں میں طلبا کو انعام میں بخاری کے نسخے تقسیم فرمایا کرتے تھے، اور اس میں بڑی حوصلہ مندی سے کام لیتے تھے، چنانچہ مظاہر علوم کی ابتدائی عمارت اور مسجد کے لیے دس ہزار روپے کی خطیر رقم زیادہ تر انہی کی کوشش کا نتیجہ تھی[3]۔

دار العلوم دیوبند کے ابتدائی چندہ دہندگان میں بھی اُن کا اسم گرامی نظر آتا ہے[4]۔

سہارنپور میں قیام

۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء میں محدث سہارنپوری کلکتہ سے وطن چلے آئے اور مستقل طور پر سہارنپور میں مقیم ہو گئے۔ تاریخ مظاہر میں ۱۲۹۱ھ کے حالات میں لکھا ہے کہ اس سال اراکین مدرسہ میں ایک قابل قدر اضافہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری نے اس سال کلکتہ سے قطع تعلق کر کے سہارنپور میں

---

[1] حیاتِ شبلی ص ۸۶ [2] و [3] تاریخ مظاہر ص ۷، و ص ۱۴

[4] روداد دار العلوم دیوبند ۱۲۸۴ھ ص ۳۳

مستقل قیام فرمایا، اور مدرسہ کی غیر موقت امداد فرمائی۔ مدرسہ کے ساتھ حضرت ممدوح کی اعانت اور توجہات قیام کلکتہ ہی کے زمانے سے شروع ہو چکی تھیں، جب کبھی تشریف لاتے مدرسہ کی ہر نوع کی تربیت فرماتے، حضرت مولانا سعادت علی صاحب کے وصال کے بعد سے اب تک مدرسہ کی نیابت کسی کے سپرد نہیں ہوئی تھی، حضرت ممدوح کی تشریف آوری پر مولانا مرحوم کی جگہ حضرت کا اسم گرامی لکھا جانے لگا۔[1]

آگے چل کر لکھا ہے کہ: حضرت مولانا مولوی حافظ احمد علی صاحب محدث سہارنپوری نے جن کے تقدس اور کمال کے آوازے سے ہندوستان گونج رہا ہے مدرسہ کی سرپرستی کا بار اپنے دوش پر اٹھایا اور ایک خاص بڑی جماعت کو مدرسہ کی مسجد میں بیٹھ کر بلا معاوضہ صحاح ستہ کا درس دیا۔"

دارالعلوم دیوبند کا سنگِ بنیاد

۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں جب دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی عمارت تعمیر ہوئی جو "نودرے" کے نام سے موسوم ہے تو اس کا سنگِ بنیاد حضرت محدث سہارنپوریؒ کے دستِ مبارک سے رکھوایا گیا، روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں لکھا ہے کہ: اول پتھر بنیاد کا جناب مولانا مولوی احمد علی صاحب نے اپنے دستِ مبارک سے رکھا، اور بعد میں جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب و مولانا مولوی رشید احمد صاحب اور مولانا مولوی محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ رکھی۔[2]"

تلامذہ

محدث سہارنپوریؒ اپنے زمانے کے نامور عالم اور ممتاز محدث تھے، اس عہد میں اُن کو بڑی مرکزیت و مرجعیت حاصل تھی، اکثر علماء تکمیلِ علوم کے بعد اجازت حدیث کے سلسلہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اس عہد کا مشکل سے کوئی ممتاز عالم ہوگا

---

[1] تاریخ مظاہر ص ۲۷ و ۳۰۔ [2] ایضاً ص ۶۸۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جس نے محدث سہارنپوری سے سند و اجازت حاصل نہ کی ہو۔ اُن کی ساری عمر خدمتِ حدیث میں گزری۔ جس میں دس سال صرف صحیح بخاری کی تصحیح و تحشیہ میں صرف ہوئے۔[۱] اُن کے تلامذہ کا بڑا وسیع حلقہ تھا، جس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا اسم گرامی سرِ فہرست ہے، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ مؤسس دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور علامہ شبلی مرحوم بھی ان کے تلامیذ میں شامل ہیں، اُن کے آخری دور کے ایک شاگرد مولانا محمد صدیق دیوبندیؒ (وفات ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء) تھے، راقم سطور کو مولانا موصوف سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں محدثِ سہارنپوریؒ نے جن کتابوں کا درس دیا اُن کی تفصیل یہ ہے:۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، شمائل ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح، موطا امام محمد، جامع صغیر، جلالین، ترجمہ قرآن مجید، احیاء العلوم، درمختار، سراجی، قدوری اور شرح جامی۔

محدثِ سہارنپوری مظاہر علوم کے طلباء کو اپنے مکان کے علاوہ مدرسہ میں بھی پڑھاتے تھے، تاریخ مظاہر میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب اب تک اپنے دولت کدہ پر تدریس فرماتے تھے، اس سال سے مدرسہ میں قیام فرما کر تعلیمی و تدریسی سلسلہ شروع فرما دیا، حضرت کی شہرت نواحِ ہند میں جیسی ہونی چاہیئے تھی وہ ظاہر ہے، اس لیے طلبائے حدیث میں بہت اضافہ ہوا اور پچیس[۲۵] طلباء حدیث کی تکمیل کر کے اطراف ہند میں مصلحِ ہدایت بنے۔[۲]"

(حاشیہ صفحہ گذشتہ کا) [۱] رو داد دار العلوم ۱۲۹۲ھ دیوبند ص ۱۰۔ یہ دار العلوم دیوبند کی سالانہ رو داد کا بیان ہے مگر ارواحِ ثلاثہ کی روایت میں ہے کہ سنگِ بنیاد حضرت میاں جی منے شاہ صاحبؒ نے رکھا تھا، ظاہر ہے کہ رو داد کا بیان زیادہ صحیح اور لائق استناد ہے۔ (حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] سیرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ص ۲۶

[۲] تاریخ مظاہر ص ۳۰ و ۳۱۔

۱۲۹۵ھ میں طلبائے حدیث کی تعداد ۳۸ تک پہنچ گئی تھی، روداد میں لکھا ہے کہ ان سب حضرات نے حضرت مولانا احمد علی صاحب سے صحاح ستہ پڑھ کر سند حاصل کی[1] اُن کے درسِ حدیث کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں صرف پانچ طلبار دورۂ حدیث میں شریک تھے، ۱۲۹۱ھ سے ۱۲۹۷ھ تک آپ کا درس حدیث مظاہر علوم میں جاری رہا[2]

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس میں برکت بخشی تھی، سیکڑوں علمار اس فیض سے سرفراز ہوئے، اُس زمانے میں علمائے حدیث میں موصوف سے بڑھکر علم حدیث کا کوئی عالم ہندوستان میں نہ تھا' اس زمانے کے اکثر بڑے بڑے علمار احناف محدثِ سہارنپوریؒ کے شاگرد تھے اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عمل اور عمل کے ساتھ دولت کی برکت بھی عطا فرمائی تھی[3]

تواضع علامہ شبلی مرحوم کا بیان ہے کہ محدثِ سہارنپوریؒ بے حد منکسرالمزاج، متواضع اور نیک تھے، کبھی مسجد میں امامت نہیں کی، چپکے سے مسجد میں جاتے اور نماز میں شامل ہوکر واپس آجاتے، بازار سے سودا خرید کر خود لاتے تھے مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ بازار میں مولانا کو میں نے دیکھا تو پیچھے پیچھے ساتھ ہولیا کہ سودا لے لوں' مگر مولانا کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے، اور خود اپنے ہاتھ سے لے کر گھر آئے[4]

محدثِ سہارنپوریؒ کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ اپنے شاگردوں کا بھی ایسا احترام کرتے جیسے شاگرد اپنے استاد کا کرتے ہیں، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کا بیان ہے کہ: درس سے فارغ ہوکر اپنے مکان میں لیٹ جاتے تھے، میں حاضر ہوتا تو اُٹھ کر بیٹھ جاتے، ایک دن

---

[1] تاریخ مظاہر ص ۳۵ [2] ایضاً ۱۷

[3] حیاتِ شبلی ص ۸۵ [4] ایضاً۔

میں نے عرض کیا کہ: میں آپ کا ادنیٰ شاگرد ہوں، سیکڑوں علما آپ کے شاگرد ہیں، عمر میں بھی آپ میرے والد سے زائد ہیں، اس عمر میں آپ سارے دن پڑھا کر لیٹ جاتے ہیں، اور پھر میری حاضری میں اُٹھ بیٹھتے ہیں، اس کا کچھ جواب نہ دیا[1]

وفات

محدثِ سہارنپوری پر آخر عمر میں فالج کا حملہ ہوا اسی میں ۶ رجمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ م ۱۷راپریل ۱۸۸۰ء بروز شنبہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا، ۷۲ سال کی عمر پائی، سہارنپور میں عیدگاہ کے قریب اپنے آبائی قبرستان میں آسودۂ خواب ہیں۔

وفات پر سرسید کا تاثر

آپ کی وفات پر سرسید مرحوم نے اپنے دلی تاثرات کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:۔

" مولوی محمد قاسم صاحب کے واقعے کی خبر ہم لکھ ہی چکے ہیں کہ دفعتہً ہم کو دوسری ویسی ہی حسرت ناک خبر جناب مولوی احمد علی صاحب محدثِ سہارنپوری کے واقعہ حال کا کی پہنچی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولوی محمد قاسم صاحب کے واقعے کے متصل اس واقعہ کا ہونا اور بھی زیادہ حسرت اور افسوس کا باعث ہے، ایک ہی وقت میں دو ایسے بزرگانِ دین کا اٹھ جانا درحقیقت نہایت اندوہ ناک واقعات ہیں، مولوی احمد علی صاحب اگرچہ اب بہت ضعیف ہو گئے تھے لیکن بایں ہمہ بہت غنیمت تھے، انھوں نے حدیث کو اس طریق پر حاصل نہیں کیا تھا جس طرح سے اور اکثر علمار کا دستور ہے کہ سند کے سلسلے کو درست کرنے کی نیت سے کسی کتاب کے چند ورق یا چند جز کسی صاحبِ سند عالم سے پڑھ لئے اور بے فکر ہو گئے۔

جناب مولوی احمد علی صاحب نے تمام کتبِ صحاح اور بعض دیگر کتبِ حدیث کو من اولہ والی آخرہ جناب مولوی محمد اسحٰق صاحب سے سبقاً سبقاً پڑھا تھا، اور جب کہ

---

[1] سیرتِ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ص ۲۷۔

مولوی محمد اسحٰق صاحب نے دہلی سے ہجرت فرمائی تو مولوی احمد علی صاحب مکہ معظمہ کو تشریف لے گئے اور خاص حرم بیت اللہ میں حدیث کی کتابوں کو مولوی محمد اسحٰق صاحب سے تمام کیا اور اس کے بعد ہندوستان واپس آئے، اور یہاں پہنچ کر انہوں نے حدیث کی کتابوں کو نہایت عمدگی اور صحت سے چھاپا اور اُن کو مشتہر کیا۔ خصوصًا بخاری کو جس خوبی اور عمدگی سے انہوں نے چھاپا وہ اُن کی ایک بے نظیر کوشش تھی۔

آخر عمر میں جناب ممدوح نے اپنے آپ کو مدرسہ اسلامیہ سہارنپور کی خدمات کے لیے جو کچھ اُن سے اُس وقت ممکن تھا وقف کردیا تھا، اور اسی شغل میں اُن کا حُسنِ خاتمہ ہوا، خدا غریقِ رحمت کرے، یہی راہ سب کو چلنی ہے، جو اس وقت زندہ ہیں اُنکی نسبت بھی کسی وقت سُنا جاوے گا کہ نہیں ہیں۔ کل من علیہا فان[1]۔"

اولاد محدثِ سہارنپوری کے چھ صاحبزادے تھے، اور ایک صاحبزادی، مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا حکیم عبدالرحمٰن، مولانا حکیم عبدالغنی یہ تینوں حضرات حیدر آباد چلے گئے تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ۱۳۰۷ھ سے ۱۳۱۳ھ تک مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں صدر مدرس رہے، ۱۳۱۴ھ میں ریاست حیدرآباد دکن میں مفتیٔ اعظم کے منصبِ جلیل پر فائز ہوئے، درس و تدریس کے علاوہ اُن کے علمی کاموں میں مُسند امام اعظم کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۳۰۸ھ میں چھپا ہے، ترجمے کی زبان رواں دواں، سلیس اور شگفتہ ہے، مولانا حکیم عبدالحیٔ لکھنوی نے اپنے سفرنامہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے سہارنپور میں اپنی ایک ملاقات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ: میں نے پوچھا آج کل آپ کیا پڑھاتے ہیں؟

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اشاعت ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء ص ۲۶۸ و ۲۶۹۔

فرمایا: چار برس سے اہل شہر کے اصرار سے میں نے مظاہر علوم سے تعلق پیدا کر لیا ہے، آج کل صحاح ستہ و توضیح و تلویح و ہدایہ و بیضاوی وغیرہ پڑھاتا ہوں۔"

حکیم صاحب پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: مولوی صاحب شکل و صورت کے بہت وجیہہ، قد و قامت میں درست، مہذب، متین، خوش پوشاک اور شوقین ہیں، پانچ چھ روپے کا پنجابی جوتہ پہنے ہوئے، گھڑی ہاتھ میں باندھے ہوئے، پان رکھنے کی تین تین ڈبیاں جیب میں، ایک جرمن سلور کی جس میں پان، دوسری ربڑ کی جس میں چھالیا ہے، تیسری بلور کی جس میں بنارس کی بسی ہوئی تمباکو کی گولیاں رکھی ہیں۔[1]

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اپنے دور میں علم و فضل اور ذہانت و ذکاوت میں بے نظیر تھے، اُن کی زندگی کے عجیب و غریب اور حیرت انگیز واقعات مشہور ہیں، ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

مولانا حکیم عبدالرحمٰن صاحب درس و تدریس کے ساتھ مطب بھی کرتے تھے نظام دکن کے شاہی طبیب تھے، "دواخانہ رحمانی" حیدرآباد میں ان کی یادگار ہے، ان کے ذریعے سے دکن میں علم حدیث کا فیض خاص طور سے پہنچا، اُن کے ایک شاگرد مولانا عبداللہ صاحب تھے جو محدث دکن کے لقب سے مشہور تھے، جن کی تالیف زجاجۃ المصابیح[2] حدیث کی ایک اہم کتاب ہے، مولانا حکیم عبدالرحمٰن صاحب کے خلف الرشید مولانا عبدالقیوم اور مولانا عبدالحئی تھے، مؤخر الذکر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں عربی زبان کے پروفیسر تھے۔ انہیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔

مولانا عبدالغنی صاحب حیدرآباد میں وکالت کرتے تھے، اُن کے ایک فرزند

---

[1] دہلی اور اس کے اطراف، سفرنامہ مولانا حکیم عبدالحئی لکھنوی رح ص ۱۲۶۔

[2] زجاجۃ المصابیح، مشکوٰۃ المصابیح کے طرز پر حنفیہ کے لیے احادیث نبوی کا ایک جامع اور مستند ذخیرہ ہے جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، یہ کتاب حیدرآباد دکن کے تاج پریس میں چھپی ہے، اس کی پہلی جلد ۱۳۷۱ھ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی ہے۔

محمود الغنی تھے، انہیں بھی حضرت تھانویؒ نے خلافت سے سرفراز فرمایا تھا۔ یہ مجذوب صفت اور صاحبِ حال بزرگوں میں سے تھے، مرشد تھانویؒ سے غیر معمولی تعلق بلکہ عشق تھا، اُن کو دیکھ کر حضرت تھانویؒ کے مریدین میں اپنے مرشد کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔[1]

ان حضرات کی اولاد حیدرآباد سے پولس ایکشن کے بعد پاکستان منتقل ہوگئی ہے۔ ایک صاحبزادہ مظہر الحق تھے جو لاولد فوت ہوئے۔

چھٹے فرزند عطاء الرحمٰن تھے ان کا نوجوانی ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔

محدث سہارنپوری کی ایک صاحبزادی نبتین تھیں، یہ دیوبند میں مولانا فصیح الدین عثمانیؒ سے بیاہی تھیں، یہ راقم سطور کی والدہ کی نانی ہوتی تھیں۔

مولانا خلیل الرحمٰن صاحب بڑے پیمانے پر عمارتی لکڑی کا کاروبار کرتے تھے، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی مجلسِ منتظمہ کے ممبر تھے، اس کے علاوہ مدت تک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم رہے، ذی علم اور باوقار علماء میں تھے، اُن کے فرزندوں میں مولانا منظور النبی مرحوم تحریک آزادی ہند کے قائدین میں سے تھے، دوسرے فرزند مولانا عقیل الرحمٰن صاحب ندوی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں دینیات کے اُستاذ تھے، اُن کے بچے بھی پاکستان چلے گئے ہیں۔

مولانا منظور النبی مرحوم کے ایک صاحبزادے ظہیر النبی ایم اے، ایل ایل بی ہیں، جو حکومت یو۔پی کے محکمۂ خوراک میں ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ راقم سطور کا یہ ننھیالی خاندان ہے۔

مآخذ و مراجع

(۱) اوجز المسالک : شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، مطبوعہ سہارنپور

(۲) ارواحِ ثلاثہ : مجموعہ حکایات امیر شاہ خاں، مطبوعہ آزاد پریس دیوبند

[1] ماہنامہ "البلاغ" کراچی بابت ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ ص ۳۵۔

۴) تاریخ مظاہر: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ، ناشر کتب خانہ اشاعت العلوم سہارنپور

۵) تاریخ دیوبند: سید محبوب رضوی، ناشر علمی مرکز دیوبند۔

۶) ترجمہ مسند امام اعظم: مترجمہ مولانا حبیب الرحمٰن سہارنپوری، مطبوعہ ۱۳۰۸ھ

۶) تقویۃ الایمان: مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ، مطبوعہ کلکتہ ۱۲۴۲ھ ۱۸۲۶ء

۷) حاشیہ و مقدمہ بخاری شریف: مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۲۲ھ

۸) حیات شبلی: مولانا سید سلیمان ندوی، مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ

۹) خطبات گارسان دتاسی: مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۵ء۔

۱۰) الدلیل القوی علی ترک قرأۃ المقتدی: مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ

۱۱) دہلی اور اس کے اطراف: سفرنامہ مولانا حکیم عبدالحیؒ لکھنوی مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۵۸ء

۱۲) روداد دار العلوم دیوبند ۱۲۸۴ھ، ۱۲۹۲ھ، ۱۲۹۵ھ: شائع کردہ دار العلوم دیوبند۔

۱۳) زجاجۃ المصابیح: مولانا سید عبد اللہؒ، مطبوعہ تاج پریس حیدر آباد ۱۳۷۱ھ۔

۱۴) سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری: سید محمد الحسنی، مطبوعہ لکھنؤ شاہی پریس ۱۹۶۴ء۔

(۱۵) علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ: مطبوعہ ۱۸۸۰ء۔

۱۶) موضح قرآن: شاہ عبد القادر دہلویؒ، مطبوعہ مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۷ھ

۱۷) مولانا محمد احسن نانوتوی: محمد ایوب قادری ایم۔ اے، مطبوعہ کراچی۔

۱۸) ماہنامہ البلاغ کراچی: محمد تقی عثمانی ۱۳۸۷ھ۔

(۱۹) مجموعہ مکاتیب غیر مطبوعہ: مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، خطوط کا یہ مجموعہ راقم سطور کی ماموں زاد بہن اہلیہ [illegible] مترجم حیات شیخ احمد [illegible] کے پاس موجود ہے۔

(۲۰) مذکورہ ماخذ و مصادر کے علاوہ خاندانی یادداشتوں اور خاندان کے بزرگوں سے سنی ہوئی باتوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

شاہ ابوالرضا الہندیؒ

خاندان ولی اللّٰہی کے ایک مُربّی ومحسن

جناب مولوی عبدالحی صاحب فاروقی ایم، اے۔ تغلق آباد نئی دہلی

سترہویں صدی عیسوی کے ایک مقدس بزرگ شاہ وجیہ الدین شہیدؒ کے فرزندوں میں شاہ ابوالرضا محمدؒ سب میں بڑے تھے، آپ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۶۲ — ۱۷۰۳ء) کے عم بزرگوار اور ان کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم دہلویؒ (۱۷۲۱ — ۱۶۴۴ء) کے حقیقی بڑے بھائی تھے۔ آپ ہی نے شاہ عبدالرحیمؒ کو پڑھایا لکھایا اور تعلیم وتربیت دی تھی، موصوف میں جو بھی کمالات اور اعلیٰ اخلاق وعادات پائے جاتے تھے وہ سب آپ ہی کی بے مثال تربیت اور پرورش کا نتیجہ تھے، اس لحاظ سے خاندان ولی اللہی کو چار چاند لگانے میں شاہ ابوالرضا محمد الہندیؒ (۱۱۰۰ — ۱۰۴۵ھ) کا بہت زیادہ ہاتھ تھا، آپ کے حالات وکوائف میں شاہ ولی اللہؒ صاحب نے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جس کا نام شوارق المعرفۃ ہے، اس سلسلہ میں تمام تذکرہ نگاروں کا یہی ماٰخذ ہے چنانچہ میں بھی اسی رسالہ کو سامنے رکھ کر آپ کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

ولادت ابوالمظفر شہاب محمد شاہجہاں (۱۶۵۸ — ۱۶۲۸ء) جس عہد میں ہندوستان کا وارث تخت وتاج تھا اور سلطنت مغلیہ کا ستارۂ عروج واقبال اپنے معراجِ کمال پر تھا ٹھیک اسی دور میں شاہ وجیہ الدین شہیدؒ کے گھر میں لگ بھگ ۱۰۴۵ھ میں ایک فرزند گرامی تولد ہوا۔ جو آگے چل کر شاہ ابوالرضا الہندی کے نام سے مشہور ہوا[1] جس زمانے میں آپ کی پیدائش

[1] حیات ولی - مولوی رحیم بخش دہلوی۔ ص۱۷۳ افضل المطابع دہلی ۱۳۱۹ھ۔

ہوئی اس زمانے میں شاہ وجیہہ الدین دنیاوی اعتبار سے ایک معمولی حیثیت کے آدمی تھے مگر جوں جوں دورِ شاہجہانی کے اختتام کا زمانہ قریب آتا گیا اور اورنگ زیب عالمگیر غازیؒ (۱۷۰۷ — ۱۶۵۸ء) کا نیرِ اقبال بلند تر ہوتا گیا شاہ وجیہہ الدین کی قبولیت اور شہرت میں اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ عالمگیر کے عہد میں آپ کو شجاعت و بہادری کی بنا پر دربارِ شاہی میں ایک معزز و مقتدر مقام حاصل ہو گیا، اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ ابوالرضا کا بچپن جو اب تک تنگدستی اور عسرت میں بسر ہوتا تھا نہایت خوشحالی اور فارغ البالی میں بسر ہونے لگا۔

تعلیم و تربیت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ شاہ ابوالرضا محمد نے ظاہری علوم و فنون حافظ بصیر دہلویؒ سے حاصل کئے جو اپنے عہد کے مشہور علماء و فضلاء میں شمار کئے جاتے تھے۔ بقول شاہ صاحبؒ آپ کو اللہ تعالیٰ نے وہبی طور پر تمام علوم و فنون سے بہرہ ور فرمایا تھا اور قدرتاً آپ میں جملہ علمی کمالات بدرجہ اتم موجود تھے مگر پھر بھی تکوینی قوانین کا لحاظ رکھتے ہوئے آپ نے بھی ایک عام طالب علم کی حیثیت سے حافظ بصیر دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا[1] تھوڑے ہی عرصہ میں علوم متداولہ سے فراغت حاصل کر لی۔ درسیات سے فارغ ہونے کے بعد اپنے آبا و اجداد کی روش کے مطابق تصوف کی طرف راغب ہوئے لہٰذا سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور و معروف بزرگ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ قدس اللہ سرہٗ (۱۶۰۳ — ۱۵۶۳ء) کے سب سے چھوٹے صاحبزادے خواجہ عبداللہ المعروف بہ خواجہ خردؒ[2]

---

[1] شوارق المعرفۃ شاہ ولی اللہؒ (مشمولہ انفاس العارفین)۔

[2] خاندان نقشبندیہ کے پیش رو خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے دو فرزند تھے ایک خواجہ عبیداللہ المعروف بہ خواجہ کلاں اور دوسرے عبداللہ المعروف بہ خواجہ خرد تھے۔ آپ حضرت خواجہ کی دوسری بیوی کے بطن سے ۶ رجب ۱۰۱۰ھ کو پیدا ہوئے تعلیم و تربیت حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کی آغوشِ شفقت میں رہ کر حاصل کی انہیں سے طریقۂ نقشبندیہ کو اخذ کیا اور اس سلسلہ کی اجازت لے کر وطن مالوف دہلی واپس آگئے۔ یہاں آپ نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ کے خلیفہ خواجہ حسام الدینؒ اور شیخ اللہ داد کی خدمت میں رہ کر کسبِ فیض کیا اور پھر درس و تدریس و رشد و ہدایت میں مشغول ہو گئے۔ اس دور کے اکثر اکابر

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے علاوہ کچھ کتب مروجہ کے باطنی علوم بھی حاصل کئے[1]
لیکن روضۃ القیومیۃ کے مصنف نے شاہ عبدالرحیم اور شاہ ابوالرضا الہندیؒ کو حضرت
امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے مشہور خلیفہ شیخ آدم بنوریؒ کا مرید لکھا ہے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

"شیخ عبدالرحیم، شیخ محمد رضا، دونوں شیخ آدم کے معتبر خلفاء میں سے ہیں نہایت مستقیم الاحوال تھے، صاحب کرامت و خوارق تھے، اپنے وقت کے مشہور مشائخ خیال کئے جاتے تھے۔ حضرت قیوم رابع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ان کی بہت تعریف کی ہے اب ان کا سلسلہ بہت جاری ہے ان کے مرید ہزاروں کی تعداد میں ہیں ان کی اولاد کا سلسلہ دو جگہ پر ہے ایک پرانی دلی میں دوسرا شاہجہان آباد کے قریب پھلت نام کے قصبہ میں ہے[2]"

بیعت و ارادت

بہرکیف آپ نے چاہے خواجہ خُرد رحمۃ اللہ علیہ سے روحانی فیوض حاصل کئے ہوں یا شیخ آدم بنوریؒ سے مگر تصوف کی اصطلاح میں تھے آپ اویسی المشرب یعنی براہ راست اکابر اولیاء اللہ اور مشائخ کی ارواح مقدسہ سے فیض یافتہ تھے جیسا کہ خود فرماتے تھے کہ ایک بار میں خواجہ خُرد کی خدمت میں حاضر تھا کہ شیخ تاج سنبھلی جو خواجہ باقی باللہ کے اجل خلفاء میں تھے، کے مریدوں میں سے ایک شخص آیا جو ترک دنیا اور فقر و قناعت میں درجہ کمال رکھتا تھا اور اس پر غیبت طاری تھی خواجہ خُردؒ اس سے کچھ دریافت کرتے تھے تو اس کا جواب وہ غلبہ حال کی وجہ سے رک رک کر دیتا تھا، اسی اثنا میں خواجہ کی زبان سے نکلا کہ جو شخص معرفتِ خدا کا طالب ہو وہ اِس شخص کی صحبت اختیار کرے چناں چہ میرے دل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) علماء آپ کے حلقہ درس میں شریک ہوتے تھے جن میں شاہ ابوالرضا محمدؒ اور شاہ عبدالرحیم دہلویؒ قابل ذکر ہیں۔ آپ صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے چناں چہ تصوف میں مختلف رسائل سپرد قلم فرمائے ہیں ۱۰۷۱ھ میں بمقام دہلی آپ کی وفات ہوئی اور اپنے والد ماجد کے مقبرے کے اندر مدفون ہوئے (ملخص از زبدۃ المقامات ص ۶۸۔۷۰ و علماء ہند کا شاندار ماضی حصہ اول ص ۳۹۰)

[1] حیات ولی۔ حافظ رحیم بخش دہلوی ص ۱۷۹۔

[2] روضۃ القیومیہ ص ۳۵۴۔۳۵۵ رکن اول مترجم مصنفہ ابوالفیض کمال الدین محمد احسانؒ

میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس شخص کی طرف رجوع کروں لہذا استخارہ کی نیت سے حضرت غوث الاعظم کی روح مبارک کی طرف متوجہ ہوا، خواب میں آپ کی زیارت ہوئی مجھے دیکھ کر فرمایا۔ شیخ ابوالرضا! ادھر آؤ۔ اس کے بعد میرے اوپر کچھ عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور میں یہ یاد نہ رکھ سکا کہ پھر کیا ہوا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اس شخص کی کشش جو میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی زائل ہو گئی۔[1]

ایک دوسرے خواب کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت غوث الاعظمؒ کو خواب میں دیکھ کر عرض کیا کہ حضور! میں ایک ایسے شخص سے بیعت ہونا چاہتا ہوں جس نے آپ سے اخذ طریقت کیا ہو، آپ میری رہنمائی فرمائیں کہ کون اس کا اہل ہے۔ فرمایا، ٹھہرو، تمہیں عنقریب امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی بیعت حاصل ہوگی، لہذا کچھ دنوں کے بعد خواب میں دیکھا کہ میں کسی راستہ پر جا رہا ہوں جہاں کوئی دوسرا راہ گیر نہیں تھا البتہ کچھ نشانات قدم ضرور نظر آتے ہیں۔ کچھ دور جاکر میں نے دیکھا کہ ایک نہایت نورانی شکل وصورت والے بزرگ راستہ کے درمیان تشریف فرما ہیں، انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ میں علی ہوں اور مجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے بھیجا ہے کہ میں تمہیں لیجا کر ان کی خدمت میں حاضر کر دوں۔ چنانچہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہمراہ روانہ ہو گیا اور جناب سرور کائنات ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ کے نیچے رکھ کر اپنا ہاتھ حضور سرور کائنات ﷺ کے دست مبارک میں دیدیا اور فرمایا۔ یارسول اللہ ھذا ید ابی الرضاء محمد پھر حضور ﷺ نے بیعت فرمائی، اس کے بعد حضرت علیؓ نے مجھ سے فرمایا کہ تمام اولیاء اللہ کے سلسلہ بیعت میں میں اسی طرح وسیلہ بنتا ہوں اس کے بعد آپ نے اشغال واذکار کی تعلیم دی اور خطاب وتوجہ سے سرفراز فرمایا، جس کے بعد تمام مراحل سلوک میرے لئے آسان ہو گئے۔[2]

---

[1] شوارق المعرفہ مشمولہ انفاس العارفین، شاہ ولی اللہؒ ص ۸۸ – ۸۹ –

[2] ایضاً ص ۸۹ –

فقر و قناعت تعلیم و تربیت سے فارغ ہونے کے بعد اپنے والد محترم کے ایما پر امرار اور ممتاز روقت کے یہاں آمد و رفت اختیار کی جس کے نتیجہ میں دربار شاہی میں آپ کا ایک معزز عہدہ مقرر ہو گیا، مگر قدرت کو اور ہی کچھ منظور تھا، چنانچہ فطری استعداد ظاہر ہونے لگی، شاہی ملازمت اور دنیادی طمطراق سے طبیعت اچاٹ ہو گئی لہذا ملازمت ترک کر کے عزلت نشینی اور توکل علی اللہ اختیار کر کے عوام و خلائق سے دور گوشۂ تنہائی اختیار کر لیا۔ اس موقع پر شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب آپ نے دنیاوی علائق سے کنارہ کشی اختیار کی تو اپنی بی بی صاحبہ سے فرمایا کہ دیکھو! جس راستہ کو ہم نے اپنایا ہے وہ انتہائی خطرناک اور دشوار گذار ہے مگر باوجود شدائد و مصائب کے ہم اس کو چھوڑ بھی نہیں سکتے لہذا اگر تمہیں میری رفاقت منظور ہے تو ان تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا، لذیذ اور مزیدار غذاؤں اور لباس فاخرہ سے اجتناب کرنا ہوگا نیز اپنے اعزہ و اقرباء سے ترک تعلق کرنا پڑے گا۔ اگر یہ شرائط منظور ہیں تو نبھا ورنہ پھر تمہیں اختیار ہے۔ اس نیکدل بی بی نے آپ کی یہ باتیں سنکر بیک جنبش وہ گوش تمام زیورات اور قیمتی کپڑے جسم سے علیحدہ کر دیئے اور دنیاوی آرام و آسائش سے منہ موڑ کر ایک نیلی پیراہن زیب تن کر کے ہر قسم کی سختیوں کو جھیلنے کے لئے تیار ہو گئیں مگر آپ کی رفاقت چھوڑنے کے لئے آمادہ نہ ہوئیں شیخ ابوالرضارؒ، بی بی صاحبہ کو اپنے ہمراہ لے کر آبائی مکان سے نکل کھڑے ہوئے اور فیروز آباد کی مسجد کے قریب ایک تنگ و تاریک حجرہ بنا کر سکونت اختیار کر لی اور دن رات عبادت الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ان ایام میں ان دونوں حضرات کو دو دو تین تین فاقے ہو جایا کرتے تھے، اگر تھوڑا بہت کہیں میسر ہو جاتا تو وہ بھی چھاچھ اور جو کی روٹی کے علاوہ کچھ نہ ہوتا[۱] اگر کبھی کسی مخلص کے ذریعہ آپ کو کچھ مل جاتا تو اس میں سے بہت قلیل مقدار میں خود تناول فرماتے اور باقی فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیتے۔ آپ کے گھر میں چولہا چکی کے قسم کا کوئی ساز و سامان نہ تھا۔

---

[۱] شوارق المعرفہ مشمولہ انفاس العارفین، شاہ ولی اللہؒ ص ۸۸۔

استغنا اور توکل مزاج میں کوٹ کوٹ کر داخل تھا۔ ہر شخص کے ساتھ نہایت تواضع انکساری اور خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ دولتمندوں اور امراءِ وقت سے بیحد متنفر تھا سلطان اورنگ زیب عالمگیر غازیؒ (۱۶۵۸ء — ۱۷۰۹ء) جیسے پابند شریعت بادشاہ نے متعدد بار دولت کدہ پر حاضر ہو کر شرف قدمبوسی حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی مگر آپ نے اس درخواست کو بالکل درخورِ اعتنا نہ خیال کیا اور سلطان موصوف کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہیں دی[1]۔

اسی طرح امراء و متمول حضرات اگر کبھی تحفے تحائف بھیجتے تو قبول نہ فرماتے لیکن اگر کوئی غریب اور دیندار مسلمان معمولی سا بھی ہدیہ لاکر نذر کرتا تو بڑی خوشی سے قبول فرمالیتے اور اسکے حق میں دعا خیر فرماتے۔

زہد و ورع

آپ کی پوری زندگی تقویٰ، طہارت اور زہد و ورع کا مکمل نمونہ تھی چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ، شیخ منظفر رہتکیؒ کے حوالہ سے ایک روایت بیان فرماتے ہیں کہ جب وہ رہتک سے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ان کے لئے مصری کے کوزے ہدیۃً لایا کرتے تھے مگر آپ انہیں ازراہ تقوے قبول نہ فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ گاؤں اور قصبوں کے رؤسا کی بیع و شرا قانون شریعت کے مطابق نہیں ہوتی اس لئے میں اس قسم کے تحفوں کو قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ شیخ منظفر نے اپنی یہ عادت ترک کر دی مگر کبھی کبھی مصری کے کوزے شیخ کے بچوں کو لاکر پیش کر دیتے۔ ایک بار اتفاقاً اس میں سے تھوڑی مصری شیخ نے بھی تناول کرلی، بہت پسند آئی، فرمایا، شیخ منظفر! ہم نے تمہاری لائی ہوئی مصری کھائی، واقعی بہت عمدہ تھی۔ اب ہم تو رعایت زائدہ ترک کرتے ہیں اور شریعت حقہ جن ظاہری معاملات کا حکم دیتی ہے بس اسی پر عمل کرنا چاہیے[2]۔

تقرب الی اللہ کے لئے ضروری ہے کہ سنت نبوی کا کوئی گوشہ بھی عمل پیرا ہونے سے بچ نہ جائے اس لئے آپ نے کبھی کسی سنت کو ترک نہیں کیا، چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ آپ جب مسجد میں تشریف لاتے تو دروازے پر تھوڑی دیر خاموشی سے کھڑے ہو جاتے پھر بایاں پیر جوتے سے نکال کر اس پر رکھ لیتے اس کے بعد دایاں پیر مسجد میں داخل فرماتے اسطرح سے مقصود

---

[1] حیات ولیؒ، حافظ رحیم بخش دہلوی ص ۱۸۴۔ [2] شوارق المعرفۃ مشمولہ انفاس العارفین، شاہ ولی اللہ ص ۹۲۔

یہ تھا کہ ان دونوں حدیثوں لیکن الیمنی او لھما تنعل و اخراھما تنزع اور کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحب التیامن فی شانہ کلہ پر پورا پورا عمل پورا ہو جائے۔

مکاشفات و تصرفات

شاہ ولی اللہ نے شوارق المعرفہ میں آپ کے بہت سے مکاشفات و تصرفات کا ذکر فرمایا ہے اس وقت صرف ان واقعات کو پیش کرنا ہے جن سے آپ کی شخصیت کا کوئی خاص ربط و تعلق ہے۔

ایک بار آپ نے زہد و تقویٰ اور نفس کشی کے خیال سے یہ ارادہ کیا کہ ایک ایسا دبیز موٹا لباس اختیار کرنا چاہیے جو زیادہ دنوں تک چل سکے اور تکلفات سے بالاتر ہو چنانچہ اپنے ایک کشمیری معتقد سے مذکورہ لباس مہیا کرنے کے لئے کہا، کچھ دنوں بعد انہوں نے حسب فرمائش لاکر پیش خدمت کیا، آپ نے بڑی مسرت کیساتھ اس کو زیب تن کیا اور مستقل پہنتے رہے ایک روز بعد نماز چاشت چہرہ پر مسکراہٹ ظاہر ہوئی، شیخ محمد پھلتی" جو خدمت اقدس میں اکثر حاضر رہا کرتے تھے اور کچھ بے تکلف بھی تھے انہوں نے اس تبسم کا سبب دریافت کیا تو فرمایا،

حق سبحانہ تعالیٰ الہام فرستاد کہ در خزانۂ ما قصورے ہست کہ ایں جامہ اختیار کردی متکفل جمیع احوالِ شما ایم میخواہیم کہ بناز و نعمت داریم ایں را بنزع کنید و عنقریب لباس لائق شما فرستیم آں را بر کشید پوشید[1]

حق سبحانہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ القا فرمایا کہ کیا ہمارے خزانے میں کچھ کمی تھی کہ جو تم نے یہ لباس اختیار کیا، ہم ہر حال میں تمہارے کفیل و کارساز ہیں ہم تمہیں دنیا میں ناز و نعمت سے رکھنا چاہتے ہیں تم اس لباس کو اتار ڈالو ہم عنقریب تمہاری شان کے لائق لباس بھیج رہے ہیں اسے پہنو۔

اس بشارت کے بعد نئے لباس کے منتظر ہو گئے، تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑھیا عورت نے آکر دروازہ پر دستک دی جب وہ اندر آئی تو بڑی فصاحت و بلاغت سے گفتگو شروع کی پھر اس نے بہت آراستہ و مکلف لباس حاضر خدمت کیا، آپ نے وہ لباس فاخرہ بہ خوشی پہنا اور خدا کا شکر بجالائے، اس واقعہ کے بعد سے آپ ہمیشہ بیش قیمت کپڑے پہن کر باہر نکلا کرتے تھے۔

---

[1] شوارق المعرفہ مشمولہ انفاس العارفین، شاہ ولی اللہ ص ۹۱

اسی طرح شیخ رحمت اللہ کفش دوز بیان کرتے ہیں کہ جس زمانے میں شیخ ابوالرضا محمد فیروز آباد کی مسجد میں تشریف رکھتے تھے ایک شخص نے عرض کیا کہ سنا جاتا ہے کہ شیخ بایزید بسطامیؒ بعض اوقات کسی شخص پر اپنی خاص نظر ڈالتے تھے تو وہ قوتِ جذب وحدتِ نظر سے مر جاتا تھا آج کے دور میں اگرچہ شیوخ کا جذبہ تو بہت ہے مگر اب کسی میں ایسی باطنی قوت نہیں پائی جاتی یہ سنکر شیخ ابوالرضاؒ کی غیرت حمیت حرکت میں آئی اور آپ نے بے اختیاری کے عالم میں فرمایا بیشک سلطان بایزید بسطامی ارواح کو جذب کر لیتے تھے مگر ان ارواح کو دوبارہ جسموں میں ڈالنے کی قوت ان میں نہ تھی پھر اس کے بعد فرمایا :۔

دل مرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برعذار دل خود تربیت فرمودہ است و آں قوت دادہ کہ اگر خواہم جذب کنم روح کسے را و اگر خواہم رد کنم او را[۱]	میرے دل کو رسول اللہؐ نے اپنے قلب مبارک کے تقابل سے تربیت دی ہے اور ایک ایسی قوت عطا فرمائی ہے کہ اگر چاہوں تو کسی شخص کی روح جذب کر لوں اور چاہوں تو اسکو واپس کر دوں۔

یہ کہہ کر شیخ نے مجھ پر ایک نظر خاص ڈالی اور میری روح کو جذب کر لیا، میں مردہ ہو کر زمین پر گر گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک گہرے دریا میں ڈوب رہا ہوں جب میری یہ کیفیت ہوئی تو شیخ نے میری طرف اشارہ کر کے سائل سے پوچھا کہ دیکھو یہ زندہ ہے کہ نہیں ؟ اس نے میرا ایک حصہ ٹٹول کر عرض کیا کہ بالکل مردہ ہے، پھر فرمایا کہ اگر کہو تو اسے اسی حالت میں چھوڑ دوں اور کہو تو دوبارہ اس کے قالب میں روح کو واپس کر دوں، اس نے مبہوت ہو کر عرض کیا کہ اگر یہ زندہ ہو جائے تو کمالِ عنایت ہو گی چنانچہ آپ نے دوبارہ توجہ کی اور میں زندہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

غرض کہ اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ ابوالرضا انتہائی روشن ضمیر اور صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی ؒ کے مستند و معتبر سوانح نگار حافظ رحیم بخش دہلوی لکھتے ہیں :۔

" اگرچہ شیخ ابوالرضا محمد کے باطنی تصرف و کشف کی یہ ظاہر مثالیں ہیں لیکن جب غور سے دیکھا

---

[۱] شوارق المعرفہ دشمول انفاس العارفین، شاہ ولی اللہؒ ص ۹۵/۹۶۔

جاتا ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سنِ رشد کے زمانے سے عہد انتقال تک جو بات بھی آپ کی زبان سے نکلی وہ بجائے خود ایک سچا کشف اور معجز نما کرامت تھی[1]

علمی کمالات شیخ کے اوقاتِ شب و روز ذکر و فکر اور عبادت الٰہی میں صرف ہوتے تھے اور پھر اس سے جو وقت بچتا تھا وہ علمی مشاغل اور درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا۔ آپ کے حلقہ درس میں ہر طبقہ کے طلباء حاضر ہوتے تھے اور ہر قسم کے علوم و فنون سے اپنے دامنِ طلب کو بھرتے تھے۔ ابتداءً تمام کتب متداولہ درس میں شامل رہتی تھیں مگر آخر عمر میں تفسیر بیضاوی اور مشکوۃ شریف کے علاوہ اور کسی کتاب کا درس دینا پسند نہیں فرماتے تھے، ہر جمعہ کو بعد نماز مسجد میں وعظ فرمایا کرتے تھے جس میں معمول تھا کہ پہلے قرآن مجید کی کوئی عبرت خیز آیت کی تلاوت فرماتے تھے پھر تین حدیثیں نہایت ترتیل کے ساتھ درد انگیز لہجہ میں پڑھتے تھے اس کے بعد آیت قرآنی اور احادیث کا فارسی میں ترجمہ بڑی شرح و بسط سے بیان کر کے وعظ و نصیحت شروع کر دیتے تھے۔ آپ کے وعظ میں علما، صوفیا اور رؤسا سب ہی پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم دہلوی کے علاوہ قطب دہلی شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی (۱۶۵۰-۱۷۲۹ء) بھی آپکے ارشد تلامذہ میں تھے چنانچہ اس موقع پر پروفیسر نظامی لکھتے ہیں :-

"شیخ ابوالرضا اپنے زمانے کے جید عالم تھے علوم عقلی اور نقلی کے ہر گوشہ پر کامل عبور تھا۔ طبیعت کا زیادہ رجحان تصوف کی طرف تھا، اکثر اوقات اشغال و اذکار میں انہماک رہتا تھا، ساتھ ہی درس و تدریس کا بھی شوق تھا اور جو شائقین علم حاضر ہوتے تھے ان کی مشکل کو دور کرنے کے لئے اس طرف متوجہ ہو جاتے تھے"[2]

آپ کے علمی کارناموں میں آپ کے بہت سے مکتوبات ہیں جن میں آپ نے تصوف، حدیث آیاتِ قرآنی کی تفسیرات اور بہت سے دقیق علمی مسائل پر خامہ فرسائی کی ہے ان مکتوبات سے یہ بھی

---

[1] حیات ولی، حافظ رحیم بخش دہلوی ص ۱۸۹ [2] تاریخ مشائخ چشت۔ پروفیسر خلیق نظامی ص ۴۰۰ ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۵۳ء

ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا مذاقِ شعری بھی بہت اعلیٰ تھا، اکثر عربی کے قدیم شعراء کے اشعار کی بڑی اچھی توضیح و تصریح کی ہے اور بعض مسائل کا جواب بھی اشعار ہی میں دیا ہے بہت ممکن ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی میں جو مذاقِ سخن اور شاعرانہ کمالات تھے وہ آپ ہی کے تعلق اور اثر کا نتیجہ ہوں۔ مکتوبات عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں جن کی عبارت نہایت سلیس عام فہم اور دلنشین ہے، مضامین کی ہمہ گیری۔ اور الفاظ کا اختصار آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ عربی کے ایک مشہور ادیب، مورخ اور سوانح نگار نے آپ کو ان الفاظ کے ساتھ کان قوی العلم فصیح اللسان عظیم الورع واسع المعرفة.... وکان صاحب مقامات علیة وکرامات جلیة ومعارف خاصة ومواجید صادقة یستغرق دائماً فی بحار التوحید[1]۔ خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

مسئلہ وحدۃ الوجود تصوف کے مسائل میں ایک نہایت اہم اور دقیق مسئلہ ہے اور ہر دور میں علماء و صوفیاء کے درمیان معرض بحث بنا رہا ہے بعض حضرات نے تو اس میں انتہائی غلو سے کام لیا ہے جس کا اسلام سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ مولانا اکبرآبادی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں مسئلہ وحدۃ الوجود کی بابت لکھا ہے:۔

"مسلمانوں میں اس عقیدے کا بانی شیخ محی الدین بن عربی کو سمجھا جاتا ہے اگرچہ یہ صحیح نہیں ہے تاہم اس میں شبہ نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم میں اس سلسلہ میں متفرق مقامات پر بڑی قوت اور یقین کے ساتھ جو کچھ لکھا ہے اس نے وحدۃ الوجود کو ان کا ایک خاص فن بنا دیا ہے۔ ان کے نزدیک واقعہ میں صرف ذات باری کا وجود اصلی اور ذاتی ہے اس کے علاوہ باقی تمام چیزیں اس معنی میں موجود ہیں کہ ذات باری کی ہستی کے آثار اور پرتو ہیں۔ ذات باری کی ہستی سے علیحدہ ان کی اپنی کوئی ہستی نہیں ہے[2]۔"

---

[1] نزہتہ الخواطر، الجزء السادس، علامہ عبدالحی حسنی ص ۹ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۹۵۸ء [2] غالب کے مسائل تصوف۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ماخوذ از عرفان غالب ص ۱۱۵، یونیورسٹی پبلی کیشن، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۱۹۷۳ء

یہ نظریہ ہندوستان کے فلسفہ ویدانت سے بھی بہت کچھ ملتا جلتا ہے جس کے سب سے بڑے علمبردار اور مبلغ شری شنکر آچاریہ تھے۔ اس نظریہ نے مشرق اور مغرب کے ہر اس شخص کو متاثر کیا جس کو تصوف سے ذرا بھی دلچسپی تھی، اس مکتب فکر کے اثرات بہت دور رس اور ہمہ گیر تھے اس سے جس طرح عیسائیت نے اثر قبول کیا، اسی طرح اسلامی تصوف بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہندوستان کے فلسفہ ویدانت کے نظریہ وحدۃ الوجود نے بھی اسلامی تصوف کو متاثر کیا۔ لیکن ابن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود اور شنکر آچاریہ کے فلسفہ میں کوئی مماثلت نہ تھی۔ شنکر آچاریہ کے نزدیک تمام کائنات مایا، یعنی ایک خیالی نقش ہے لیکن اس کے برعکس ابن عربی کے نزدیک پوری کائنات اگرچہ حق کی ہی ذات کا پرتو ہے لیکن کائنات کے تعینات اور تشخصات بھی حقیقی اور واقعی ہیں۔[1]

اس طرح یہ نظریہ ہر دور کے مختلف مفکرین و موحدین کے خیالات اور طرز فکر کو اپنے اندر سموتا ہوا عرب سے ایران اور ایران سے ہندوستان میں اسلامی دھارے کے ساتھ داخل ہوا، یہاں جتنے بھی صوفی، درویش، دانشور، علمار اور شعرار پہونچے یا پیدا ہوئے وہ سب کے سب کسی نہ کسی حد تک وحدۃ الوجود کے قائل اور پیرو رہے یہاں تک کہ شیخ ابوالرضار الہندیؒ بھی نظریہ وحدۃ الوجود کے قائل تھے اور صرف قائل ہی نہیں بلکہ اس کے مبلغ بھی تھے مگر آپ کے اندر غلو کا مادہ نہ تھا۔ اور نہ ہی اس معاملہ میں متشدد تھے، ایک موقع پر آپ نے فرمایا،

در محفل عظیم از علمار و عرفار مسئلہ	ایک بار علمار و عرفار کی ایک بڑی جماعت
وحدۃ الوجود اثبات کردم و بعبارت	میں، میں نے مسئلہ وحدۃ الوجود کو متکلمین
عقائد متکلمین تمسک نمودم و دلائل	کی عبارتوں سے تمسک کر کے ثابت کیا

[1] غالب کے مسائل تصوف۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ماخوذ از عرفان غالب ص ۱۱۵ - ۱۱۶، یونی ورسٹی پبلی کیشن، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ۱۹۷۳ء

عقلیہ و نقلیہ بیان کردم اما تلفظ بلفظ "وحدۃ الوجود" نکردم ہمہ قبول کردند یعنی اہل رسوم تعصب ایشاں بالفاظ بیشتر ست[1]

اور عقلی و نقلی دلائل پیش کئے لیکن لفظ "وحدۃ الوجود" استعمال نہیں کیا۔ سب نے اس کو قبول کر لیا (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ) اہل رسوم کا تعصب الفاظ سے کس طرح زیادہ ہوتا ہے۔

آگے چل کر سپھر فرماتے ہیں کہ :-

وجود عالم در مرتبۂ وہم است و حق تعالیٰ وجود صرف ست عارفی گفتہ الوجود فی الکل ساری والتعینات امور اعتباریۃ۔ پس عالم دور ترین اشیاء است از حق عز وجل زیرا کہ موجود حقیقی و موہوم صرف باہم تضاد دارند و درمیان ایشاں جامع نیست در رنگ آنکہ گویند سراب دور ترین اشیاء ست از بحر زیرا کہ سراب بسبب لمعان نور الشمس بصورت بحر بر آمدہ حال آنکہ بتحقیقت درمیان انہا تباین کلی ست[2]

وجود عالم وہم کے مرتبہ میں ہے اور حق تعالےٰ شانہٗ وجود خالص ہے ایک عارف نے کہا ہے کہ وجود کل میں ساری ہے اور تعینات امور اعتباریہ میں سے ہیں لہٰذا عالم حق تعالےٰ عزوجل سے بعید تر اشیاء میں سے ہے کیوں کہ موجود حقیقی اور موہوم میں باہم تضاد ہے اور ان کے درمیان کوئی جامع نہیں ہے جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ سراب دریا سے بعید ترین اشیاء میں سے ہے کیوں کہ نور شمس دریا کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے حالانکہ حقیقت میں ان کے درمیان بالکلیہ بُعد ہے۔

---

[1] انفاس العارفین۔ شاہ ولی اللہؒ ص ۱۰۱ [2] ایضاً ص ۱۰۲، ۱۰۳

شاہ ابوالرضا محمد کی تصنیفات میں سے اب صرف ایک رسالہ کا پتہ چلتا ہے جس کا نام اصول الولایۃ ہے، اس میں آپ نے باطنی علوم و معارف کے دریا بہائے ہیں۔ ایک جگہ آیۃ: یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ ولایت کبریٰ کے حصول کے لئے چھ چیزیں ضروری ہیں جن میں چار شرطیں نص قرآنی کی ترتیب کے مطابق ہیں، اول، ایمان بہ تصدیق دل وبہ اقرار زبان، دوم، تقوی بذریعہ پابندی احکامات و اجتناب منہیات، سوم، طلب شیخ کہ جس کی بدولت راہ وصول حاصل ہوتی ہے، چہارم جہاد، بذریعہ فنائے انانیت واثبات باری تعالیٰ۔ بقیہ دو شرطیں یہ ہیں، ایک تو اپنی ذات سے چھٹکارہ حاصل کرنا اور دوسری دوام مشاہدۂ دوست۔ یہی ولایت کبریٰ حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔

اسی رسالہ میں آپ نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ یہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک مرید صادق کو کس طرح شب وروز عبادت الٰہی میں صرف کرنا چاہئے اور کیا کیا عبادتیں اور کن کن ادعیہ ماثورہ کا ورد کرنا چاہیئے۔ اس طرح ایک سالک کے لئے آپ نے پورے چوبیس گھنٹہ کا ایک پروگرام تیار کرکے پیش کیا ہے اس رسالہ میں آپ نے جن اصول و فرائض کا ذکر کیا ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی خود اپنی عملی زندگی کس اعلیٰ پیمانے کی ہوگی۔

ملفوظات شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے شوارق المعرفۃ میں آپ کے بہت سے ملفوظات تحریر فرمائے ہیں۔ ان سب کو تو یہاں ذکر کرنا مناسب نہیں البتہ ان میں سے چند کا تذکرہ مناسب ہوگا۔

۱۔ فرمایا — ایمان کی ایک حد معین ہوتی ہے جب وہ اس حد تک پہونچ جاتا ہے تو پھر کبھی اس کا زوال نہیں ہوتا، اسی طرح اعمال کی ایک حد ہوتی ہے کہ جب وہ وہاں تک عروج کر جاتے ہیں تو پھر مردود نہیں ہوتے۔ ایمان کی ادنےٰ حد یہ ہے کہ ایمان دار کے سینہ میں ایک محسوس نور ظاہر ہوجائے جس کی روشنی اور چمک سے اس کے باطنی آثار

اچھی طرح نمودار ہو جائیں ـــ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں نے ایک رات اپنے سینہ میں ایک نور دیکھا جو چراغ کی طرح روشن تھا اور اس کی روشنی میں مجھے گھر کے سارے گوشے اور سارا سازوسامان اچھی طرح دکھائی دے رہا تھا، اسی اثنار میں خدا تعالےٰ نے مجھ پر الہام فرمایا کہ ادنیٰ درجہ کا ایمان جو میرے یہاں مقبول ہے وہ اسی نور کے مانند ہے جسے میں کسی ایماندار سے سلب نہیں کرتا۔

۲۔ فرمایا ـــ انسان فلاح دارین اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب کہ عقاید میں انبیار علیہم السلام کی تقلید کرے اور بلاکم وکاست پیروی کرے جیسا کہ قدمار اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے، لیکن یہ شرط ہے کہ کسی صاحب کشف کی صحبت حاصل کرے جو ان عقائد کی تفصیل و تحقیق پر پوری طرح متوجہ کرتا رہے۔

۳ـــ فرمایا ـــ تمام ریاضتوں میں عمدہ اور بہتر ریاضت یہ ہے کہ آدمی دائمی توجہ کے ساتھ کھانے پینے میں اعتدال کا راستہ اختیار کرے اور افراط و تفریط سے ہمیشہ مجتنب ومحترز رہے۔

۴۔ فرمایا ـــ اہلِ سنّت والجماعت اور معتزلہ وشیعہ کے درمیان دیدار الٰہی کے سلسلے میں جو نزاع ہے وہ صرف لفظی نزاع ہے، معتزلہ اور شیعہ اس وجہ سے انکار کرتے ہیں کہ اس سے رویۃ خداوندی جہت کا تقاضا کرتی ہے اور خدا تعالےٰ جہت سے پاک ومنزہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ انکشافِ اتم بر رفع حجب کو ثابت کرتے ہیں، مگر اہلِ سنت اس بات کے قائل ہیں کہ دیدار الٰہی بے کیف وجہت ہوگا اور یہی عین انکشاف اتم ہے۔

۵۔ فرمایا ـــ جو چیز عام لوگوں کو قیامت کے دن نصیب ہوگی وہی اولیار اللہ کو دنیا میں میسر ہو جاتی ہے، چناں چہ وہ دنیا ہی میں دیدار الٰہی سے مشرف ہو جاتے ہیں، وہ اس کی ذات مقدس کو اشکال سے منزہ دیکھتے ہیں۔ اس بارے میں مختلف

بزرگوں کے مختلف

مقامات ہوتے ہیں، بعضوں کو صرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک بجلی ادھر سے ادھر کوند کر چلی گئی، اور کسی کو اس سے کسی قدر زائد، لیکن جو حضرات کامل اور اکمل ہیں، ان کا رتبۂ ولایت معراجِ کمال کو پہونچ جاتا ہے وہ ہمیشہ دیدار الٰہی میں محو رہتے ہیں۔ جیسا کہ امیر المؤمنین حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ لم اعبد ربًا لم اراہٗ۔

۶۔ فرمایا — ہمارے عرفاء زمانہ کو ذاتی تجلی میسر نہیں ہے ورنہ اپنے اور اپنی اولاد و عزیز و اقارب کی حصولِ اغراض کے لئے سلاطین کے محتاج نہ ہوتے۔

۷۔ فرمایا — جس کو ذوقِ مشاہدہ حاصل ہوجاتا ہے تو پھر وہ کسی معصیت سے زائل نہیں ہوتا۔

۸۔ ایک دفعہ یہ عبارت اذا تحیرتم فی الامور فاستعینوا باصحاب القبور — آپ کے پیش نظر تھی جس کی تفسیر و توضیح آپ نے یہ بیان فرمائی کہ اصحاب قبور سے مدد چاہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے حالات یاد کرکے عبرت پذیر ہوں کیوں کہ مُردوں کے حالات یاد کرنے اور ان سے عبرت حاصل کرنے سے دنیاوی تعلقات کی رگ کٹ جاتی ہے اور فکر معاش مضمحل ہوجاتی ہے۔

۹۔ حدیث ان الدنیا اقبح من جیفۃ منتنۃ کی تفسیر میں فرمایا کہ دنیا انسان کو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے روکتی ہے کیوں کہ انسان کا دلی تعلق اس کے ساتھ دل بستہ ہوتا ہے بخلاف مردار کے کہ اس میں یہ صفت نہیں پائی جاتی ہے اس لئے دنیا مردار سے زیادہ قبیح و شنیع ہے۔

۱۰۔ فرمایا — شریعت کے مخالف کوئی بات منہ سے نکالنا کذب فی الاقوال اور شریعت کے خلاف کوئی بات کرنا کذب فی الافعال ہے — اسی طرح ایک حال سے دوسرے حال کی طرف متلون ہونا کذب فی الاحوال ہے۔

سفرِ آخرت | شیخ محمد ظفر رہتکیؒ جو شاہ ابو الرضا محمد کے بہت زیادہ عقیدت مند

اور ہم نشیں تھے بیان کرتے تھے کہ شاہ صاحبؒ اپنی عمر کے ابتدائی زمانے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میری عمر پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان ہوگی چنانچہ جب آپ نے پچاس سال کی زندگی کا عرصہ طے کر لیا تو مجھے اکثر اس بات کا خدشہ لگا رہتا تھا، بالآخر وہ وقت آہی گیا، ابتداءً کچھ کسل اور تکان عارض ہوا، پھر اشیاء خورد و نوش سے بے رغبتی پیدا ہوگئی لہٰذا مسلسل تین روز تک کچھ تناول نہ فرمایا اس عرصہ میں تمام دنیاوی امور سے انتہائی بے تعلقی ظاہر ہونے لگی اسی حالت میں جب کئی روز گذر گئے تو لوگوں کو تشویش ہونے لگی۔ ۷ ار محرم الحرام ۱۱۰۱ھ کو نماز عصر کے وقت جب مسجد تشریف لانے لگے تو گھر والوں کو رخصت کرتے ہوئے چند الوداعی کلمات ارشاد فرمائے جس سے پورے ماحول پر ایک گہرے رنج وغم کی فضا طاری ہوگئی۔ نماز عصر سے فراغت کے بعد مقامات خواجہ نقشبند طلب فرمائے، جستہ جستہ اس میں سے کچھ پڑھا اور نہایت فرحت و شادمانی کے ساتھ تکیہ پر سہارا دے کر بیٹھ گئے اسی عالم میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

آپ کے بعض مخلصوں نے فی البدیہ آپ کی تاریخ وفات "آفتاب حقیقت" سے نکالی ہے۔ آپ کے صاحب زادوں میں صرف شیخ فخر العالمؒ کے نام کا پتہ لگتا ہے جو خود بھی صاحب علم وفضل تھے۔

تبصرے

سفینۂ زرگل از جناب فضا ابن فیضی، تقطیع کلاں، ضخامت ۲۷۰ صفحات، کتابت وطباعت اور کاغذ اعلیٰ پتہ :- دانش کدہ پبلیکیشنز، متوناتھ بھنجن۔ (یو پی)

جناب فضا پختہ کلام اور کہنہ مشق شاعر ہیں، ایک ربع صدی سے زیادہ سے علمی وادبی مجلات ورسائل کی فضا ان کے نغموں اور زمزموں سے گونج رہی ہے۔ ہماری شاعری اور خصوصاً غزل نے عہدِ حاضر میں جو غیر معمولی اور نہایت عظیم الشان ترقی کی ہے، فضا کی شاعری اُس کی ایک جیتی جاگتی اور روشن مثال ہے، چنانچہ ان کے تغزل میں داخلیت، خارجیت اور رمزیت سب ایک پیکرِ حسین وجمیل میں ملبوس ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ شعر وادب کے آسمان پر برسات کے دنوں میں جھٹپٹے کے وقت قوسِ قزح کے طلوع کا سماں پیدا ہو گیا ہے، موصوف کی شاعری میں سوز وگداز۔ وجدان، وفکر حسنِ تعبیر وبیان، قدرتِ اظہار۔ غمِ جاناں اور غمِ روزگار۔ جوش وسرمستی، ہلکا ہلکا طنز، اور دردِ نہاں، یہ سب اوصاف بیک وقت اس شدت اور ندرت وجدت کے ساتھ پائے جاتے ہیں کہ ان کا کلام ہمہ گل ومل اور ہمہ نغمہ وموسیقی بن گیا ہے، افسوس ہے، گنجائش نہیں، ورنہ اُن کے کلام کے بعض نہایت حسین اور انتہائی موثر نمونے نقل کرنے کو جی چاہتا تھا۔ بہرحال زیرِ تبصرہ کتاب جناب فضا کا مجموعۂ کلام ہے جو غالباً پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، یہ صرف غزلیات اور رباعیات

پر مشتمل ہے، سب ایک سے ایک بڑھ کر جاذب و دل کش اور موثر، امید ہے کہ ارباب ذوق وادب اُس کے مطالعہ سے شادکام ہوں گے، البتہ بعض الفاظ جیسے "پروائی" (ص ۲۹) اور "نابصیری" (ص ۳۰) کھٹکتے ہیں۔

نیم باز از ڈاکٹر عنوان چشتی، تقطیع خورد ضخامت ۱۲۷ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ، قیمت چار روپیہ، پتہ :- اردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵

ڈاکٹر عنوان چشتی اصلاً ایک نامور ادیب اور بلند پایہ محقق ہونے کی حیثیت سے اُن چند گنے چنے جواں سال اساتذۂ اردو میں سے ہیں جو گذشتہ دس پندرہ برس کی مدت میں ابھرے ہیں اور جو اپنی علمی اور تحقیقی کاوشوں کے باعث اردو زبان وادب کے مستقبل کے لئے نیک فال ہیں شاعری ان کا ضمنی مشغلہ ہے، پیشہ نہیں، اسی لئے مختصر اور جذبۂ دل سے مجبور ہو کر کہتے ہیں لیکن جو کچھ کہتے ہیں اُس میں فنکارانہ صنعت اور وجدان وشعور کی پختگی اور بصیرت ہوتی ہے، طبعاً وہ طرزِ قدیم کے پیرو ہیں، لیکن ماحول کے اثر سے جدید اور ترقی پسند شاعری کے میدان میں بھی "سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی" کے مطابق گلگشت کر لیتے ہیں۔ لیکن طبع سلیم چوں کہ رہنما ہے اس لئے جدید شاعری کی تاریک بھول بھلیوں میں گم نہیں ہوتے اور خیریت وعافیت کے ساتھ اُس سے نکل آتے ہیں، چنانچہ اس مجموعہ میں ان کی دونوں قسم کی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں، ان میں جذباتیت بھی ہے اور عقلیت وتفلسف بھی اور تاریخی تلمیحات بھی ہیں جو وسعت مطالعہ کی دلیل ہیں، شروع میں جو مقدمہ ہے وہ بھی شاعری کی تعریف اور اُس کے معیارِ حسن وقبح پر ایک نہایت دل پذیر اور بصیرت افروز محاکمہ ہے، اس حیثیت سے اردو شاعری کے موجودہ ذخیرہ میں یہ مجموعۂ کلام ہر چند کہ مختصر ہے مہدی افادی کے بقول "خاصہ کی چیز" اور لائق مطالعہ ہے۔

صدائے زخم از جناب اعزاز افضل، تقطیع کلاں - کتابت وطباعت

اور کا غذ اعلیٰ ـ ضخامت ۱۲۸ صفحات قیمت مجلد 7/50 پتہ :- تنویر پبلیکیشن، ۹۸، لور چیت پور روڈ، کلکتہ ـ ۱

آج اُردو شاعری کی صنفِ نازک یعنی غزل نے جو غیر معمولی ترقی کی اور حیرت انگیز عروج پایا ہے اُس کی وجہ درحقیقت یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں صرف ایک غمِ جاناں تھا جس کی کیفیات اور واردات کا بیان غزل کا واحد موضوع تھا ـ لیکن آج کے شاعر نے غمِ روزگار کو بھی غمِ جاناں بنا کر اپنے دل میں سمو لیا ہے اور چوں کہ یہ غم ایک نہیں بلکہ ہزار غموں اور دکھوں کے مجموعہ کا نام غمِ روزگار ہے، اس لئے تخیل پیمائی کے لئے عہدِ جدید کے شاعر کے سامنے جو وسیع اور لق و دق میدان ہے وہ اُس کے پیش رو کے سامنے نہیں تھا، پھر علوم و فنون کی غیر معمولی ترقی اور ترقی یافتہ ادبیاتِ عالم نے نوجوان طبقہ کے ذہن اور دماغ پر جو اثرات ڈالے ہیں اُس کی وجہ سے اُردو غزل میں بھی اظہار و بیان اور ادائے مطلب کے نئے نئے اسالیب و طرق پیدا ہوئے ہیں، ان دونوں کا مجموعی اثر یہ ہے کہ اب غزل کی ٹکنک ہی یکسر بدل گئی ہے جو ہمارے خیال میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ موضوعی اور حقیقت سے قریب ہے، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ غزل میں حسن اور دِل کشی اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اُس کا آہنگ غزل کی قدیم روایات سے قرین نہ ہو، جو غزل ایسی نہیں ہے وہ معشوقۂ فرنگ ہو سکتی ہے، ناظورۂ ہندوستان نہیں ہو سکتی، یہ وہ نکتہ ہے جو جدید شاعری

کے پرستاروں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اِس بنا پر جناب اعزاز افضل لائق مبارک باد ہیں کہ ان کی غزلیں معنوی طور پر تغزلِ جدید کی تمام خوبیوں پر مشتمل ہیں، لیکن ان کا آہنگ اور ہیئت قدیم ہے، ان دونوں چیزوں نے مل جُل کر اُن کے کلام کو مئے دوآتشہ بنا دیا ہے، پھر موصوف محض شاعر نہیں بلکہ زبان اور اُس کے ادب کے مستند عالم اور اُستاد اور جمیل مظہری اور پرویز مشاہدی (جن کے ساتھ اُردو کے ادیبوں اور نقادوں نے اپنی دھڑے بندی کی وجہ سے انصاف نہیں کیا) ایسے سرخیل شعرائے روزگار کے باقاعدہ صحبت یافتہ ہیں اس لئے اُن کے کلام میں درد و کرب اور سوز و گداز کے ساتھ زبان کی صحت و صفائی، محاورہ بندی اور قواعد کی پابندی کا جوہر بھی پایا جاتا ہے، یہ وہ وصف ہے جو آج کل کے نو وارد شاعروں میں مفقود ہوتا جا رہا ہے اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اُردو "پڑھے" بغیر اُس میں شاعری شروع کر دیتے ہیں۔ اعزاز افضل کو غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے، لیکن غزل سے فطرتاً انھیں زیادہ لگاؤ ہے زیرِ تبصرہ کتاب صرف غزلوں کا مجموعہ ہے، ان غزلوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں طنز اور رمزیت بلا کے ہیں، لیکن ان کی سرحد کہیں نغز گوئی سے ملنے نہیں پائی ہے اس لئے معنوی طور پر بھاری بھرکم مگر ظاہری طور پر سبک اور ہلکی پھلکی ہیں۔

برہان

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی، مذہبی اور ادبی ماہنامہ

"برہان" کا شمار اوّل درجے کے علمی، مذہبی اور ادبی رسالوں میں ہوتا ہے۔ اس گلدستے میں نفیس اور بہترین مضمونوں کے پھول بڑے سلیقے سے سجائے جاتے ہیں۔ نونہالانِ قوم کی ذہنی تربیت کا قالب درست کرنے میں "بُرہان" کی قلم کاریوں کا بہت بڑا دخل ہے۔ اس کے مقالات سنجیدگی، متانت اور زورِ قلم کا لاجواب نمونہ ہوتے ہیں۔ اگر آپ مذہب و تاریخ کی قدیم حقیقتوں کو علم و تحقیق کی جدید روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم آپ سے "بُرہان" کے مطالعے کی سفارش کرتے ہیں، یہ علمی اور تحقیقی ماہنامہ ۳۷ سال سے پابندیِ وقت کے ساتھ اس طرح شائع ہوتا ہے کہ آج تک ایک دن کی تاخیر نہیں ہوئی۔

"برہان" کے مطالعے سے آپ کو "ندوۃ المصنفین" اور اُس کی مطبوعات کی تفصیل بھی معلوم ہوتی رہے گی، آپ اگر اس ادارے کے حلقۂ معاونین میں شامل ہو جائیں گے تو "برہان" کے علاوہ اس کی مطبوعات بھی آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں گی ـــــ صرف برہان کا بدلِ اشتراک (چندہ) جنوری ۷۵ء سے پندرہ ۱۵ روپے سالانہ ہوگا۔

● ـــــ قیمت فی پرچہ ـــــ ایک روپیہ پچاس پیسے

دوسرے ملکوں سے ایک پاؤنڈ سالانہ

حلقۂ معاونین کی کم سے کم سالانہ فیس پچاس روپے

ادارہ کی فہرست مفت طلب فرمائیے

۱۹۵۴ء حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ اسلام اور استعمار ۔ اسلام کا نظامِ عفت و عصمت ۔
تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند مغل
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظامِ حکومت طبع جدید دلپذیر ترتیب ، جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم ، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم ، صدیق اکبر ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم ، انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم ، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ، تاریخ گجرات ، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، بصائر ، یورپ کو ٹن ۔

۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اُردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول ، مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط ، اسلامی کتب خانے ، عرب دنیا ،
تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اُردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ، معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔

۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اُردو جلد سوم ۔ تاریخ ردّہ ، سرکشی ضلع بجنور ۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی اوّل

۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اُردو جلد چہارم ، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ، عرب و ہند عہدِ رسالت میں ۔
ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں ۔

۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لادینی دور کا تاریخی پس منظر ۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اُردو جلد پنجم ۔ رموزِ عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم ، تفسیر مظہری اُردو جلد ششم ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ۔ تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ ۔

۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اُردو جلد ہشتم ، تاریخ الفخری ، حیات ذاکر حسین ۔ دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء حیاتِ عبدالحی ، تفسیر مظہری اُردو جلد نہم ، مآثر و معارف ، احکامِ شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اُردو جلد دہم ، بیماری اور اس کا روحانی علاج ، خلافتِ راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

d. No. D. (D) 231 Phone 262815 NOVEMBER 1

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ



حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں پرنٹر پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر
دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا۔

۱۰ سرشکوہ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ -
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق وفلسفۂ اخلاق - فہم قرآن - تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" - صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج وزوال - تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ" -

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول - اسلام کا نظامِ حکومت - سرمایہ - تاریخ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت - مسلمانوں کا عروج وزوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ" - تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر -

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر ومغربِ اقصیٰ" - تدوینِ قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد -
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا -

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
ازسرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے - کتابتِ حدیث -

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت - قرآن اور تعمیرِ سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

برہان

جلد ۷۳ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ مطابق دسمبر ۱۹۷۴ء | شمارہ ۶

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نظرات

اس مرتبہ جماعتِ اسلامی ہند کا پانچواں آل انڈیا اجتماع دہلی میں ۸ تا ۱۰ ؍ نومبر اس قدر شاندار اور وسیع پیمانہ پر ہوا کہ تقسیم کے بعد سے اب تک کسی اسلامی تنظیم کا اس طرح پر نہیں ہوا تھا گاندھی درشن کے نہایت وسیع مگر الگ تھلگ میدان میں جہاں یہ اجتماع منعقد ہوا ایک اچھا خاصہ شہر آباد ہو گیا تھا۔ جس میں ہر قسم کی دکانیں، رستوران، ہوٹل، پندرہ ہزار کے لگ بھگ مرد و زن مندوبین کی قیام گاہیں جماعت اسلامی کے دفاتر، نہایت وسیع پنڈال، شفاخانہ، اور دارالطعام وغیرہ برپا تھے، دور دراز کے مندوبین اسپیشل ٹرین اور مستقل بسوں کے ذریعہ دہلی پہونچے، جو میدان میں قطار در قطار کھڑی ہوئی ہر شخص کے لیے جاذبِ توجہ تھیں، اور اس لحاظ سے یہ اجتماع بالکل منفرد تھا کہ مندوبین کی اس نہایت وسیع تعداد کے ساتھ ہی عرب ممالک، افریقہ، امریکہ، اور جنوب مشرقی ایشیا کی اسلامی جماعتوں اور تنظیموں کے نمائندہ حضرات کی ایک قابلِ ذکر تعداد نے بھی اس میں شرکت کی اور تقریریں کیں، جماعتِ اسلامی کے امیر جناب مولانا محمد یوسف صاحب نے جو خطبۂ صدارت پڑھا وہ بھی نہایت پُر مغز، مدلل، معتدل و متوازن اور بصیرت افروز تھا، آج کل کے حالات میں اتنا بڑا اجتماع کرنا خصوصاً جبکہ حکومت کا کوئی تعاون نہ ہو، سخت صبر آزما اور دشوار کام ہے۔ لیکن جماعت جس خوبی، خوش سلیقگی اور نظم و ترتیب سے اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئی ہے وہ اُس کے کارکنوں کے اخلاص، ولولہ و جوش اور عزم و ہمت کی روشن دلیل ہے۔ جس پر وہ بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ہندوستان میں جو اسلامی تنظیمات کام کر رہی ہیں جماعت اسلامی نسبتہً اُن میں کم عمر ہے اور وہ شروع سے ہی اپنوں اور غیروں کا ہدف مطاعن اور نشانۂ ملامت رہی ہے۔ لیکن اس کے

باوجود وہ دن دونی رات چوگنی رفتار سے ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک بامقصد جماعت ہے۔ اس نے اپنا سفر "حکومت الٰہی" کے بے معنی نعرہ سے شروع کیا تھا لیکن اسے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور اُس نے پاکستان میں اسلامی نظام حکومت کا قیام اور ہندوستان میں مذہبی شعور و وجدان کا احیا اپنا مقصد بنا لیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں یہ جماعت قبل از وقت سیاست کے خارزار میں اُلجھ کر رہ گئی اور کوئی شبہ نہیں کہ اس سے اس کی ساکھ اور کارکردگی کو عظیم نقصان پہونچا، اس کے برخلاف ہندوستان کی جماعت اسلامی اب جس مقصد کی حامل ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنے اعمال وافعال کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ ہونے کا عقیدہ رکھنا چاہیئے اور عمل و کردار کے میدان میں اسے اس عقیدے کے مطالبات ومقتضیات کو پورا کرنا چاہیئے، یعنی سیاست ہو یا اخلاق، سماجیات ہوں یا معاشیات بہرحال ہر ایک چیز کی بنیاد خدا پر عقیدہ اور اس کے مطابق احتساب نفس پر قائم ہونی چاہیئے۔ مسلمانوں کے حق میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے پکے اور سچے مسلمان ہوں اور جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے وہ اپنے ضمیر اور روح کی بیداری کو اپنا شعار بنائیں اور لامذہب سیاست سے کنارہ کش رہیں۔ ظاہر ہے ایک مسلمان کے لیے تو یہ پیغام منشاء حیات ہے ہی کہ اس کی زندگی اور بقا کا راز اسی میں منحصر ہے، لیکن غیر مسلموں میں بھی ایسے حضرات کثرت سے ہیں جن کے لیے اس پیغام میں دلکشی اور کشش ہے۔ چنانچہ گاندھی جی عمر بھر اسی کا پرچار کرتے رہے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھاکرشن نے اپنی اکثر وبیشتر کتابوں، مقالات اور تقریروں میں اسی پر زور دیا اور اسے سراہا ہے، ایک اور سابق صدر راجندر پرشاد اور لال بہادر شاستری کا مسلک یہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلموں کی ایک خاصی تعداد جماعت اسلامی سے وابستہ ہے اور اس کانفرنس میں ان کی نمائندگی تھی بھی۔

علاوہ ازیں جماعت کے کارکنوں میں خلوص اور ایثار پیشگی ہے، امیر جماعت سے لیکر ایک رضاکار تک ہر ایک کی زندگی سادہ ہے، اپنے مقصد کے ساتھ والہانہ انہماک اور دلچسپی

ہے، پھر جماعت کی تنظیم، اور اس کا تبلیغ و اشاعت کا کام بھی نہایت منضبط اور وسیع ہے، چنانچہ اُردو روزنامہ اور ہفتہ وار انگریزی مجلہ کے علاوہ تقریباً ملک کی ہر زبان میں اس کا لٹریچر شائع ہو رہا ہے، اس کے مبلغین برابر ملک کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ ملکی و قومی مسائل پر آئے دن اِدھر اُدھر سیمینار منعقد ہوتے ہیں جن میں غیر مسلم حضرات بھی حصہ لیتے ہیں، ان کے اپنے اسکول اور تربیت گاہیں ہیں نوجوان طلبہ اور خواتین سے رابطہ پیدا کرنے اور ان کی تنظیم قائم کرنے کا خاص اور وسیع نظام ہے اس کے علاوہ جماعت کی سوشل خدمات بھی کم نہیں اور وقیع اور قابلِ قدر ہیں، غرض کہ یہ اسباب و وجوہ ہیں جن کے باعث آج جماعتِ اسلامی ہند، ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم ہے اور اس کی آواز بیرونِ ملک عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں میں بھی سنی جاتی ہے۔ اس وقت جماعت کا سب سے بڑا کارنامہ جس پر وہ مبارکباد کی بجا طور پر مستحق ہے یہ ہے کہ وہ اپنے معتدل و متوازن تنقیدی لب و لہجہ کے ذریعہ مسلمانوں میں خود اعتمادی، جذبۂ تعمیرِ حیات اور اپنے دینی و دنیوی، ملی اور ملکی و قومی مسائل و معاملات پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے اور بگے بندھے چند نعروں پر انحصار کرنے کے بجائے سنجیدگی فکر سے حالاتِ گرد و پیش کا جائزہ لینے کی امنگ اور ولولہ پیدا کر رہی ہے۔

دسمبر اور جنوری کے مہینے کانفرنسوں اور سیمیناروں کے خاص موسم کا زمانہ ہیں۔ چنانچہ دسمبر میں پہلے حیدرآباد میں ایک وسیع اور کل ہند پیمانہ پر حکومت ہند کی سرپرستی میں اقبال صدی کی تقریبات کا افتتاح ہو رہا ہے، اس کے بعد کلکتہ میں جشنِ میر انیس کی تقریبات ہوں گی پھر جنوری میں گورنمنٹ کے ہی زیرِ اہتمام امیر خسرو کے سات سو سالہ جشن ولادت کی تقریبات دہلی میں ہو رہی ہیں۔ راقم الحروف اِن تینوں تقریبات میں شرکت اور مقالہ پڑھنے کی دعوت قبول کر چکا ہے، اس لیے افسوس ہے برہان کی یہ اشاعت "عہدِ نبوی کے غزوات" کی قسط سے خالی جا رہی ہے۔

صعالیک

شعرائے جاہلیت کا ایک نرالا طبقہ

از: مولانا عبدالحلیم ندوی ایم اے - صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ - نئی دہلی

شعرائے جاہلیت کے معروف و مشہور طبقات میں اکثر وہ ہیں جو عام طور سے اپنے خاندان - قبیلہ اور سماج سے نہ صرف متعلق رہے تھے بلکہ ان کے قابل ذکر فرد بھی ان شعراء میں قابل ذکر اصحاب[1] معلقات اصحاب المجمہرات وغیرہ ہیں جنھیں عربی داں طبقہ عام طور سے جانتا ہے۔ یہ لوگ اپنے قبیلوں کے رسم رواج قوانین اور ریت کو مانتے۔ ان پر فخر کرتے اور ان کے گن گاتے تھے جس کی وجہ سے یہ شعراء" اپنے قبیلوں اور خاندان کی آنکھ کا تارا اور اپنے معاشرہ کے معزز و محترم اور بھاری بھرکم اشخاص بن کر چکے اور اس کی وجہ سے باہر کی دنیا میں بھی بڑی وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن آج ہم شعرائے جاہلیت کے ایسے طبقہ کا ذکر کرتے ہیں جو مذکورہ بالا شعراء کے طبقوں سے بالکل مختلف۔ نرالا اور اپنے انداز و اطوار میں بالکل اچھوتا ہے اور شاید عربی زبان وہ واحد سامی زبان ہے جس میں اس قماش کے شعراء کا طبقہ پایا جاتا ہے اور یہ طبقہ ہے "صعالیک الشعراء" یا "خانماں برباد شعرا" کا طبقہ۔

صعالیک کون تھے

"صعلوک" کے لغوی معنی ہیں "مفلس و قلاش" کے[1] ادبی اصطلاح میں "صعلوک" اس مفلس و قلاش کو کہتے ہیں جو ایک طرف اپنی غربت و افلاس

---

[1] "الصعلوك" الفقير الذی لا مال له وقد تصعلك الرجل - اذا كان كذلك لسان العرب طبعة بولاق سنه ۱۳۰۳ھ -

کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا اور دوسری طرف اپنی عزتِ نفس و شرفِ ذات کو برقرار رکھنے اور اپنی حیثیت اور وجود کو ثابت کرنے اور اپنی قوت کو حاصل کرنے میں لگا رہتا ہو۔"[1]

"صعالیک الشعراء" یا خانماں برباد شعراء وہ منچلے آزاد منش سخت جان و سخت کوش نوجوان شعرا "تھے جن میں سے اکثر کے عزیز و اقارب خاندان قبیلہ سب کچھ تھا لیکن انھوں نے ان سب سے یا تو از خود یا مجبور ہو کر رشتہ توڑ لیا تھا اور صحرا نوردی اور قتل و غارت گری اپنا پیشہ بنا لیا تھا اور تن بتقدیر و جان بتدبیر زندگی گزارتے تھے اور اس طرح ساری زندگی فاقہ مست اور خانماں برباد رہتے۔ اس دنیا میں سوائے ان کے اپنے ہم جنسوں کے نہ ان کا کوئی یار تھا نہ مددگار نہ دوست نہ غمگسار اور اسی کسمپرسی اور خانماں بربادی کی حالت میں مر گئے۔

صعلوک بننے کی وجہ

یہ نوجوان "صعالیک" کیسے بن گئے؟ اس کے مختلف اسباب تھے جیسا کہ معلوم ہے بدوی عرب معاشرہ میں اقتصادی بدحالی اور معاشی تنگدستی کی وجہ سے قتل و غارت گری اور لوٹ مار کی دبا عام تھی۔ ہمارے ان شعراء میں سے بعض کو قدرت نے بڑی طاقت و توانائی اور بڑا عزم و حوصلہ دے رکھا تھا۔ اس عزم و حوصلہ اور طاقت و توانائی کی جولان گاہ بالکل اسی طرح محدود تھی جس طرح ان کا معاشرہ۔ چنانچہ ان کو قدرت کی بخشی ہوئی ان طاقتوں کو صالح اور پاک مقصدِ حیات پر لگانے کا موقع نہ مل سکا۔ پھر معاشرہ میں جرم و سزا کا نہ کوئی واضح ضابطہ اور مقرر قانون تھا اور نہ انھیں نافذ کرنے کا کوئی ایسا فعال ادارہ جو انھیں خوفِ سزا یا پاداشِ عمل کے تازیانے سے اپنی توانائیوں کو غلط راستے پر لگانے سے روک سکتا۔ چنانچہ ان کے یہ بلند حوصلے اور ابھرتی ہوئی توانائیاں غلط راستے پر لگ گئیں اور انھوں نے اپنا پیشہ قتل و غارت گری رہزنی اور لوٹ مار بنا لیا۔ جب ان کے جرائم اتنے بڑھ گئے کہ ان کے خاندانوں کی عزت و آبرو پر حرف آنے لگا اور وہ ان کے جرائم کا تاوان دیتے دیتے تھک گئے اور اب اس کی سکت نہیں رہ گئی کہ ان کی ناعاقبت اندیشیوں کی مزید سزا بھگت

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے " الشعراء الصعالیک " لدکتور حسین عطوان۔ شایع شدہ مجلۃ العربی ماہ اکتوبر ۱۹۷۱ء

سکیں اور اسی کے ساتھ ان کی جان کی بھی حفاظت کر سکیں تو انھوں نے عاجز آ کر ایسے نوجوانوں کو" برادری سے باہر" کر دیا۔ ایسے شخص کو اصطلاح میں" خلیع " یا "طرید" کہتے تھے جب کسی کے متعلق خلیع یا طرید ہونے کا اعلان کر دیا جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب یہ شخص اس خاندان یا قبیلہ کا فرد نہیں رہا۔ اس لیے اس کے کسی فعل یا عمل کا ذمہ دار اس کا خاندان یا قبیلہ نہیں۔ اب اگر کوئی اسے کسی جرم کی سزا میں مار ڈالے تو خاندان اس کے خون کا مطالبہ نہیں کرے گا اور قاتل سے "ثار" یعنی خون کے بدلے خون کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ اور اس طرح ایسے آدمی کا خون "ہدر" یعنی مباح ہو جاتا۔ ظاہر ہے جب کوئی اس طرح برادری سے باہر ہو جاتا تو اس کو ہر وقت اپنی جان کا خطرہ رہتا اور کوئی قبیلہ یا شخص اس کو اپنے یہاں پناہ دینے پر تیار نہ ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ایسا شخص مجبور ہو کر صحراؤں اور پہاڑوں کے دامنوں میں پناہ لیتا۔ جہاں اس کے ساتھی جنگلی جانور یا اس کے ہم جنس خلعاء یعنی برادری باہر نوجوان ہوتے اور قتل و غارت گری اور رہزنی سے اپنی زندگی چلاتا۔

ان میں سے بعض کے صعلوک ہونے کا سبب یہ ہوا کہ باپ کے مرجانے یا خاندان کی سخت معاشی تنگدستی کی وجہ سے قبیلہ نے ان سے آنکھیں پھیرلیں اور سخت تکلیف و پریشانی کے عالم میں بچپنے کے دن گزرے یا کسی معرکہ میں گرفتار ہو کر فاتح قبیلہ کے یہاں غلامی اور ذلت کی زندگی گزاری اور جب جوان ہوئے اور عزت نفس خودداری اور خودی نے گوش و ہوش کی آنکھیں کھولیں اور اپنے انجام کو دیکھا تو اس قبیلہ اور خود اپنے قبیلہ کے خلاف نفرت و بغاوت کا سخت جذبہ پیدا ہو گیا اور غلامی و ذلت کی ساری زنجیریں توڑ کر صحراؤں اور بیابانوں کی راہ لی۔ اور یہاں فطرت کی آغوش میں خودمختاری و خودداری اور خودی کی زندگی گزارنے لگے کیوں کہ خود بقول شنفری:

وفی الأرض منأیٔ للکریم عن الأذی   وفیها لمن خاف القلی متحول

لہ خلیع: برادری یا ٹاٹ باہر شخص جسے سب نے چھوڑ دیا ہو۔ طرید۔ دھتکارا ہوا شخص۔ بھگایا ہوا شخص۔

یعنی۔ "چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا"

ان صعالیک کا خیال تھا کہ اس معاشرہ کے لوگ بڑے خود غرض مطلب پرست اور چھوٹے دل و دماغ کے لوگ ہیں۔ ہمارے ایسے اولوالعزم حوصلہ مند نوجوان ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ہم نے جنگلی جانوروں اور درندوں کو اپنا خاندان بنا لیا ہے کیوں کہ یہ انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل بھروسہ ہیں وہ دوسروں کے راز افشا نہیں کرتے اور اگر ان کا کوئی فرد جرم کر بیٹھے تو اسے دوسروں کے حوالے نہیں کرتے اور یہ قابل اعتماد افراد خاندان ہیں ایک "سید عملس" یعنی بڑا خوفناک بھیڑیا "دوسرا" ارقط زہلول" یعنی دھاری دار چکنا چیتا اور تیسرا "عرفا جیئل" یعنی بد بودار بجو یہ ہیں ہمارے خاندان کے افراد اور ہم انھیں کے ساتھ خوش ہیں۔ شنفری ان کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ولی دونکم أھلون سید عملس وأرقط زھلول وعرفا جیئل

ھم الرھط لا مستودع السر شائع لدیھم ولا الجانی بما جر یخذل

مگر یہ افراد خاندان اپنی فطری مجبوریوں کی وجہ سے ہم دم و دمساز اور مرنے جینے کے ساتھی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ہم نے ہر حال میں ساتھ دینے والے اپنے تین جگری دوست بھی پیدا کئے ہیں اور وہ ہیں ایک۔ بیباک اور نڈر دل۔ دوسرے سفید چمچاتی ہوئی تیز تلوار اور تیسرے پیلے رنگ کی ایک لمبی کمان:

ثلاثۃ أصحاب، فؤاد مشیع وأبیض اصلیت وصفراء عیطل

یہ صعالیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر آدمی صرف اپنے اوپر بھروسہ کر لینا سیکھ لے تو پھر اس کے لیے خدا کی زمین تنگ نہیں ہے جیسے شنفری نے اپنی زبان میں یوں کہا ہے:

لعمرك ما فی الأرض ضیق علی امرئ سری راغباً أو راھباً وھو یعقل

ملک خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست۔

اور اس خاندان اور اپنے ان تین جگری دوستوں کے ساتھ یہ نوجوان صحراؤں میں

آسمان کی چھت کے نیچے زندگی گزارنے لگتے اور لوٹ مار اور راہ زنی سے اپنا پیٹ بھرتے جہاں رات ہوئی وہیں بستر جما دیا اور سوختہ سامانی کا یہ عالم تھا کہ بستر کی جگہ صرف زمین کا بچھونا ہوتا اور اس پر اپنی سوکھی اور مڑی ہوئی پسلیوں کے بل لیٹ جاتے اور تکیہ کی جگہ اپنے کھردرے سوکھے اور ہڈیاں ابھرے ہوئے ہاتھ رکھ لیتے۔

وأألف وجہ الأرض عند إفتراشھا بأھدأ تنتیہ سناسِ قحّل

کیونکہ یہ صعالیک زندگی کو حریر و پرنیان یا اطلس و کمخواب نہیں سمجھتے تھے۔ زندگی میں انسان کو ہر قسم کی نرم گرم جھیلنے کی عادت ڈالنی چاہیئے مصیبتوں میں رونا دھونا نہیں چاہیئے اور جب فارغ البالی ہو تو اترانا نہیں چاہیئے شنفری کہتا ہے:

فلا جزع من خلۃ متکشف ولا مرح تحت الغنی أتخیّل

اور وہ کسی درخت کے نیچے کہیں بیابان میں. گزر رہی جائے گی ہم خانماں خرابوں کی" دوست احباب اگر بے وفائی کریں تو بھی ہم کو غم نہیں. ہم اس پر افسوس نہیں کرتے. ان کے غم میں روتے دھوتے نہیں یا ان کی بے وفائی و سرد مہری کا گلہ نہیں کرتے۔ بقول تابطؔ شراً۔

ولا اقول إذا ما خلّۃ صرمت یا ویح نفسی من شوق وإشفاق

اس طرح اپنی عزت و شرف۔ خودی و خودداری اور اعلیٰ اقدار کو ترجمان بنائے ہوئے موت آجائے اور ہمیں رونے والا کوئی بھی نہ ہو تو ہمیں مطلق غم نہ ہوگا کیوں کہ ہمارا اس دنیا میں سوائے اپنی ذات اور اپنی قوت بازو کے ہے کون؟ نہ خالائیں نہ چچیاں اور نہ عیادت و غمگساری کرنے والے دوست اپنا سب کچھ میں ہوں اور میری تگ و دو. بقول شنفری:

اذا ما اتتنی منیتی لم ابالھا ولم تذرخالاتی الدموع وعمتی

ألا لاتعدنی إن تشکیت خلتی شفائی باعلی ذی البریقین علّتی

یعنی:

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی آکے شمع جلائے کیوں

کوئی چار پھول چڑھائے کیوں میں وہ بےکسی کا مزار ہوں

جب ان کی مہموں اور آزاد کوشیوں کے قصے ان آبادیوں میں آتے تو انکے منچلے نوجوانوں کے دلوں میں بھی آزاد زندگی گذارنے کی امنگیں انگڑائیاں لینے لگتیں اور ان میں سے بعض ان سے جا ملتے اور اس طرح ہمسفر آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

عام طور سے یہ نوجوان بڑے طاقتور بڑے بہادر اور بڑے سخت جان تھے۔ صحرا کی چلچلاتی سخت دھوپ میں یا خون جما دینے والی سخت سرد اور تاریک راتوں میں میلوں اور مدتوں سفر کرنا ان کے لیے معمولی بات تھی خطرے کے موقعوں پر ہرنوں سے زیادہ میلوں تیز بھاگنا۔ مدتوں بغیر کھائے پئے چلتے رہنا اور ہر وقت جان کو ہتھیلی پہ لئے رہنا ان کی زندگی کے معمولات میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ لوگ غریب۔ مفلس اور قلاش تھے۔ لیکن ان میں غربت و فلاکت سے پیدا شدہ بیماریاں جیسے اوچھا پن۔ خودی و ضمیر کا فقدان اپنی بے وقعتی یا احساس کمتری ذرہ برابر نہ تھی۔ اپنی تہی مائیگی و سوختہ سامانی کے باوجود یہ لوگ بڑے غیرت مند فیاض ایک دوسرے کے غمگسار دوست نواز صلح جو دل کے جیالے اور عزم و ارادہ کے پختہ نوجوان تھے۔

حالات نے انہیں مادی وسائل سے محروم کر دیا تھا لیکن قدرت نے ان میں سے بعض کو ایسا ذہن رسا اور ایسا ذوق سلیم اور ایسی حس لطیف اور باریک نظر عطا کی تھی کہ باوجود اپنی سخت کوشی اور بے رہرویوں کے دنیائے شعر و شاعری میں روشن ستارے بن کر چمکے۔

ان صعالیک نے اپنی شاعری میں ایک طرف اپنی مخصوص زندگی سے حاصل شدہ تجربات کی روشنی میں زندگی کے بعض لافانی حقائق کی نشان دہی کی ہے، اور ازلی قدروں کے گیت گاتے ہیں. فقر و غنا کے رمز کو سمجھانے اور موت و حیات کے چہرے سے نقاب ہٹانے کی کوشش کی ہے اور دوسری طرف دکھ درد کی ماری زندگی اور اپنے پیاروں اور اعزہ و اقارب سے دوری و مہجوری کے جان گسل لمحات نے ان کے دل کے تاروں کو جب جھنجھنایا تو اس کی صدائے بازگشت ہجر و فراق کے ان دل خراش اشعار میں سنائی دی جن کی کسک اب بھی دل والوں کے رگ جان پر نشتر کا کام کرتی ہے اور یہ سب کچھ ان کے ان سلبے قصیدوں میں ملتا ہے جو اب بھی

بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اپنی سلاست وروانی شگفتہ بیانی اور فصاحت وبلاغت میں نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔

دور جاہلی کے طبقہ صعالیک میں پانچ نوجوان بہت مشہور ہوتے۔ الشنفری۔ تابط شراً سلیک بن السلکۃ۔ عمرو بن براق اور اسید بن جابر۔ ان میں سے اول الذکر تین صعالیک نے میدان شعروشاعری میں بھی بڑا نام پیدا کیا۔ ایک الشنفری اور دوسرے تابط شراً اور تیسرے سلیک بن السلکۃ

عجیب بات یہ ہے کہ ان شعراء کی ان امتیازی خصوصیات کے باوجود اردو زبان تو کیا' عربی زبان میں بھی ان کے حالات ان کے کلام اور ان کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا اور یہ اور ان کا کلام تذکرہ کی گنی چنی کتابوں کے بھولے بسرے صفحات میں کھو کر رہ گیا ہے۔

آج کی صحبت میں مذکورہ بالا شعراء صعالیک میں سے صرف " الشنفری " پر تفصیلی گفتگو کی جاتی ہے۔

الشنفری م ۵۱۰ء

الشنفری خالص عرب قحطانی یمنی اور قبیلہ ازد کا فسرد اور صعالیک الشعراء" میں ایک ممتاز پرگو شاعر ہے[1]۔ تذکرہ کی کتابوں میں جابجا متفرق طور سے اس کی زندگی کے جو حالات ملتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا باپ بچپنے ہی میں مار ڈالا گیا تھا اور اس کے خاندان والوں نے نہ صرف یہ کہ اس کے خون کا بدلہ نہیں لیا بلکہ باپ کے مرتے ہی آنکھیں بھی پھیرلیں۔ ماں نے جب یہ دیکھا کہ مصیبت کے یہ دن سسرال میں نہ بیت سکیں گے تو الشنفری اور اس کے ایک چھوٹے بھائی کو لے کر اپنے میکہ قبیلہ فہم میں چلی آئی۔ لیکن یہاں بھی اسے وہ سکون چین اور عزت نہ نصیب ہو سکی جس کی اسے توقع تھی۔ چنانچہ جب شنفری بڑا ہوا تو اسے اپنے ددھیالی اور ننھیالی دونوں خاندانوں سے سخت

[1] سلسلہ نسب یوں ہے۔ الشنفری بن ربیعہ بن الاواس بن الحجر بن الہن ابن الازد۔ آگے جاکر سلسلہ نسب بنو الحارث سے جاملتا ہے۔

نفرت اور عداوت پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے نہ صرف اس نے ان سب سے رشتہ توڑ لیا بلکہ بعد میں انھیں قبیلوں پر سخت حملے کرتا رہا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ الشنفری کے قبیلہ ازد نے اس کے ننہالی قبیلہ فہم کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ جب ان لوگوں نے خون بہا کا مطالبہ کیا تو ازدیوں نے الشنفری اس کی ماں اور اس کے چھوٹے بھائی کو بطور رہن ان کے حوالے کر دیا اور ان کی کسمپرسی اور بے چارگی کی وجہ سے خون بہا ادا کر کے ان کو آزاد نہیں کرایا۔ چنانچہ شنفری انھیں کے یہاں بڑی ذلت و خواری کی حالت میں پلا بڑھا اور جب جوان ہوا تو ان لوگوں کی طرف سے سخت نفرت و عداوت کے جذبات اس کے دل میں پیدا ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے اپنی غارت گری اور حملہ کا نشانہ انھیں کو بناتا تھا اور ان میں سے جو بھی مل جاتا اسے جان سے مار ڈالتا مفضل ضبی نے روایت کی ہے کہ الشنفری کے ننہالی قبیلہ " فہم بن قیس بن عیلان کی ایک شاخ " بنو شبابہ " نے اسے بچپنے میں قید کر لیا۔ چنانچہ الشنفری ان کے یہاں رہنے لگا۔ ایک دفعہ بنو سلامان بن مفرج نے جو بنو ازد (شنفری کا ددیہالی خاندان) کا ایک بڑا خاندان تھا بنو شبابہ کے ایک آدمی کو جو بنو فہم (شنفری کا ننہالی خاندان) کا ایک فرد تھا کہیں گرفتار کر لیا جب بنو شبابہ نے اپنے آدمی کو واپس مانگا تو بنو سلامان نے اس کے بدلے میں دوسرا آدمی مانگا۔ چنانچہ انھوں نے الشنفری کو بدلے میں دے کر اپنا آدمی چھڑا لیا۔ اور شنفری اب ان کے یہاں رہنے سہنے لگا اور یہ سمجھتا رہا، کہ وہ انھیں کے خاندان کا فرد ہے۔ لیکن ایک دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس سے اس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا اور اسے اپنی ذلت و خواری کا ایسا احساس ہوا جو اسے ہمیشہ انتقام کی آگ میں جلاتا رہا۔ ہوا یہ کہ ایک دفعہ اس نے اپنے خیالی باپ کی لڑکی سے یہ کہا کہ " اے بہن ذرا میرا سر تو دھو دو " تو اس نے چٹاخ سے اس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کر دیا اور بولی کہ تو مجھے اپنی بہن کہتا ہے۔ تیری یہ مجال؟ اس پر وہ غصہ میں بھرا ہوا اپنے خیالی باپ کے پاس گیا اور بولا کہ یہ بتاؤ کہ میں کون ہوں، کس کا بیٹا ہوں؟ تو اس آدمی نے کہا کہ تم دراصل " اواس بن حجر " کے خاندان کے فرد ہو۔ میرے بیٹے نہیں۔ یہ سن کر اس کے

تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس نے اس کو مخاطب کرکے کہا کہ تم نے مجھے غلام بنا کر جس طرح ذلیل وخوار کیا ہے اس کے بدلے میں تمہارے سو آدمی جب تک جان سے نہ مار لوں گا اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا۔

یہ بھی روایت ہے کہ اس کے باپ کو ازدہی کے قبیلے کے ایک آدمی حرام بن جابر نے قتل کیا تھا جس کی وجہ سے اسے ساری ذلتیں اٹھانی پڑیں اور دربدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے منی کے مقام پر موقع پاکر جابر بن حرام کو قتل کیا اور اس کے بعد جو بھی ازدی اس کے ہاتھ لگ جاتا اسے زندہ نہ چھوڑتا۔

غرضیکہ شنفری کی خانماں بربادی اور صعلوکیت اختیار کرنے کے مختلف اسباب راویوں نے بیان کئے ہیں۔ ان کو غور سے پڑھ کر ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شنفری کے ساتھ نہ تو اس کے ننہیالی رشتہ داروں نے اور نہ ہی اس کے اپنے خاندان ازد نے محبت خلوص اور اپنائیت کا سلوک کیا بلکہ اسے ہر جگہ ذلیل سمجھا گیا اسے غلام بنایا گیا اسے یتیمی اور کسمپرسی کی زندگی پر مجبور کیا گیا اور ان حالات کا ردعمل شنفری پر یہ ہوا کہ وہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا اسے عزیز و اقارب خاندان حتیٰ کہ اس معاشرہ سے بھی نفرت پیدا ہوگئی جس نے اسے اس طرح تباہ و برباد ہوتے دیکھا لیکن اس کی دادرسی نہیں کی۔ ظالموں کو سزا نہ دی۔ اور مظلوموں کی فریاد نہ سنی۔

قدرت نے اسے بڑے اچھے ہاتھ پاؤں دیئے تھے۔ بڑا ہوکر بڑا گرانڈیل تنومند اور طاقتور جوان نکلا اور دوڑنے میں تو اتنا برق رفتار تھا کہ بڑے سے بڑا صبا رفتار گھوڑا بھی اس کی گرد کو نہیں پہونچ سکتا تھا۔ تابطؔ شرا کی نگاہ دوربین نے، جو خود بھی ایک صعلوک تھا اور رشتہ میں اس کا ماموں اس نوجوان کی تیکھی نگاہوں اور دل و دماغ میں ابلتے جذبات کو تاڑ لیا اور اپنی جمیعت "خانماں برباداں" میں شامل کرلیا۔ اور ساری عمر بڑی محبت اور خلوص کا سلوک کرتا رہا۔ شنفری بھی اپنے قبیلہ ازد کی ریت کے مطابق اسے اپنی "ماں" یعنی گرو کہا

کرتا تھا" ذازدی اپنے سردار کو" الام" یعنی" ماں "کے لقب سے پکارتے تھے) اور مرتے دم تک اس کا ہمدم و دمساز رہا اور رزم و بزم ہر جگہ اس کا شریک و سہیم۔

الشنفری اپنی جسمانی طاقت و توانائی کے ساتھ عرب قوم کا سب سے تیز دوڑنے والا شخص بھی تھا۔ ان صعالیک میں تین یعنی الشنفری۔ تابّط شرا اور سلیک بن السلکہ ایسے تیز دوڑنے والے مشہور تھے کہ ان کو گھوڑے بھی نہیں پکڑ سکتے تھے۔ چنانچہ بسا اوقات وہ لوٹ مار کرکے اتنی تیزی سے بھاگ جاتے کہ گھوڑ سوار ان کی گرد راہ ہی میں الجھ کر رہ جاتے۔ روایتوں میں یہاں تک آتا ہے کہ یہ لوگ ہرنوں کے غول کو جب دیکھتے تو اس میں سے سب سے موٹے ہرن کو چن لیتے اور پھر غول کو دوڑانا شروع کرتے اور آخر کار اسی موٹے ہرن کو پکڑ کر دم لیتے۔ اسے ذبح کرتے اور خوب سیر ہو کر کھاتے۔

کہتے ہیں کہ قدرت کسی کے ساتھ ظلم یا زیادتی نہیں کرتی۔ اگر کسی کو کسی چیز سے محروم کرتی ہے تو کوئی دوسری نعمت بے بہا ایسی عطا کر دیتی ہے کہ ساری محرومیوں کی نہ صرف تلافی ہو جاتی ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی مل جاتا ہے۔ شنفری کو قدرت نے بچپنے ہی سے باپ سے محروم کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس نے جگہ جگہ کی ٹھوکریں کھائیں ذلت و خواری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوا لیکن دوسری طرف قدرت نے اسے تنومند و توانا جسم کے ساتھ بلا کا ذہن عطا کیا تھا۔ ابھی پوری طرح وہ جوان بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے شعر کہنا شروع کر دیا اور سب سے پہلا شعر جو اس نے کہا اس کی تقریب یہ ہوئی کہ اس کا چھوٹا بھائی مرگیا اس حادثے پر اس کی ماں رونے دھونے لگی تو اس نے کہا

لیس لوالدة همها　　ولا قیلها لابنها دع دع

تطوف وتحذ راحواله　　وغیرك أملك بالمصرع

شنفری جب جوان ہوا تو اس نے ذلت و نکبت، غلامی و خواری کی یہ زندگی چھوڑ کر صحراؤں اور پہاڑوں کی راہ لی۔ اپنے اس عزم کا اظہار اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی مہم کے سلسلے میں اس نے ایک لمبا قصیدہ بھی کہا ہے جس میں ننھیال والوں کو مخاطب کرکے اس عزم و

ارادہ کے اسباب بتلاتے ہیں اور زندگی سے متعلق اپنا فلسفہ واضح کیا ہے۔ قصیدہ کا مطلع ہے:
٭ اقیموا بنی امی صدور مطیکم (اس کا تجزیہ بعد میں آئے گا)۔ اس نئی دنیا میں شنفری تنہا نہ تھا بلکہ اس جیسے کچھ اور بھی دل جلے، جیسے تابط شرا اسلیک بن السلکہ اور دوسرے منچلے اور چھچھورے نوجوان اسے مل گئے تھے اور اس طرح یہ فطرت کی آغوش میں آزاد اور قید و بند سے دور زندگی گزارنے لگا۔

خاندان اور اس کی چیرہ دستیوں سے آزاد ہونے کے بعد اس نے انھیں کو اپنا نخچیر بنایا اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اس نے اپنے منہ بولے باپ قبیلہ بنو سلامان کے اس آدمی سے اس وقت کہدیا تھا جب اس کی لڑکی نے طمانچہ مار کر اس کی ہتک عزت کی تھی کہ جب تک میں تم میں سے سو آدمی نہ مار لوں گا چین و سکون سے نہ بیٹھوں گا۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ان پر مختلف اوقات میں مختلف حملے کئے جن میں بہتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بنو سلامان پر اس قسم کے حملوں کے دوران ہی وہ واقعہ پیش آیا جس میں ایک سلامی ان کے ڈر سے بھیڑیئے کے شکار کرنے کے گڈھے میں کود پڑا تھا اور جسے ان لوگوں نے تیروں سے چھلنی کر کے بھیڑیئے کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا، اور جس کے بعد سلامیوں سے بہت سخت معرکہ ہوا اور اس معرکہ کی یاد شنفری کا وہ قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے۔

أرى أم عمرو أجمعت فاستقلت ۔۔۔ وما ودعت جيرانها اذ تولت

(اس قصیدہ کا تجزیہ بعد میں آئے گا)

ادھر سلامی بھی شنفری کے آئے دن کے حملوں سے تنگ آکر اس کی جان کے دشمن ہو گئے تھے اور جہاں موقع ملتا تھا گھات لگا کر اس کو قتل کر دینے کی ترکیبیں کرتے رہتے لیکن شنفری ہمیشہ ان کے جال سے نکل بھاگتا اور وہ منہ تکتے رہ جاتے۔

مفضل ضبی نے مورج سے روایت کی ہے کہ شنفری نے بنو سلامان کے ننانوے (۹۹) آدمی قتل کر دیئے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ کسی سلامی کو زندہ پکڑ لیتا تھا تو اس سے کہتا تھا کہ بول اب

تیری آنکھیں چھوڑ دوں؟ اور اس کے بعد تاک کر اس کی آنکھ میں تیر مارتا اور اس کے بعد اسے قتل کر دیتا۔ سلامی جب خود اس کو پکڑنے میں ناکام ہو گئے تو انھوں نے ایک دوسرے قبیلہ بنو الرمد کو اس کام پر مامور کیا۔ چنانچہ جب شنفری ایک دن ان پر حملہ کرنے کے لئے آیا تو وہ سب اس پر ٹوٹ پڑے لیکن وہ ان سے پیچھا چھڑا کر ایسا بھاگا کہ یہ لوگ اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اسکے تعاقب میں حبیش نامی ایک کتے کو چھوڑ دیا لیکن وہ بھی اس کو نہ پاسکا اور شنفری صاف بچکر نکل گیا۔

شنفری کے اس قسم کے معرکوں میں ایک اور بہت نامی معرکہ کا ذکر آتا ہے۔ شنفری کے باپ کو حرام بن جابر نے جو خود شنفری کے قبیلہ ازد کا ایک فرد تھا قتل کر دیا تھا۔ اس کا باپ غریب آدمی تھا اس لیے کسی نے اس کے خون کا مطالبہ نہیں کیا۔ باپ کے اس طرح بے دردی سے قتل ہو جانے اور پھر بدلہ نہ لینے پر اس کا دل بہت دکھا اور اس نے اس سلسلہ میں کچھ شعر بھی کہے جس میں اس کی بے کسی اور کسمپرسی کا ذکر کر کے اس وقت اپنی غیر موجودگی پر اظہار افسوس کیا ہے اور اپنے خاندان والوں کو غیرت دلائی ہے[1]۔ اتفاق سے حرام بن جابر حج کے دوران اسے منیٰ کے مقام پر مل گیا اور اس نے وہیں اسے قتل کر ڈالا۔ لوگ جب اس پر جھپٹے تو سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا اور کسی کے ہاتھ نہ آیا اس موقع پر اس نے فخریہ ایک شعر بھی کہا۔

قتلت حراما مهديا بملبد   ببطن منى وسط الحجيج المصوت

یعنی حرام کو میں نے عین حالت احرام میں وادی منیٰ میں لبیک کہنے والے حاجیوں کے درمیان ایک دوسرے احرام باندھے ہوئے شخص (اسکا والد) کے بدلے میں قتل کر ڈالا۔ اس واقعہ کی خبر حرام کے بھائی اسید بن جابر کو جو خود بھی بہت نامی اور بہادر سردار تھا ایک آدمی نے سنائی اور یہ بھی کہا کہ میں نے ابھی اسے حباشہ کے بازار میں دیکھا ہے۔ اسید نے اس سے پوچھا کہ تم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے کہ وہ شنفری ہی تھا اس پر اس آدمی نے کہا کہ خدا کی قسم وہی تھا یہ سن کر اسید بولا کہ خدا کی قسم وہ جب تک اپنے کرتوتوں کا مزہ نہ چکھ لے گا بچ کر نہیں جا سکتا۔

---

[1] اشعار مفضلیات ابن ضبی کے صفحہ ۱۹ پر ملاحظہ فرمائیے۔ تحقیق کارموس یعقوب لایل۔

چنانچہ اس نے اپنے مقتول بھائی حرام کے دو لڑکوں کو ساتھ لیا اور سب رات کی تاریکی میں شنفری کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ جب رات بھیگ گئی تو شنفری کے آنے کی آہٹ ہوئی مگر اس طرح کہ اس کے ایک پاؤں میں جوتا تھا اور دوسرے پاؤں سے ننگا تھا۔ یہ چال اس نے اس لیے چلی تھی کہ کسی کو آدمی کی چال کا شک نہ ہونے پاتے چنانچہ آہٹ جب اور قریب ہوئی تو اسید کے بھتیجوں نے کہا کہ بخدا یہ انسان کی چاپ نہیں یہ تو بجو کی چال ہے۔ مگر اسید نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم یہ وہی کم بخت ہے۔ اس لیے تم لوگ اب تیار ہو جاؤ۔ ادھر شنفری کو جب ان کے سائے دکھائی دیئے تو وہ الٹے پاؤں واپس ہو گیا اس پر لڑکے نے کہا بخدا بڑا چالاک ہے۔ ہماری موجودگی کو بھانپ گیا اور بھاگ لیا۔ اسید نے کہا ہرگز نہیں۔ وہ اپنی اس حرکت سے ہمیں اپنا پیچھا کرنے کی دعوت دے رہا ہے وہ پھر واپس آئے گا تم دیکھ لینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شنفری تھوڑی دیر کے بعد پھر واپس آیا۔ اب کی دفعہ بھی جب اسی جگہ پر اسے ان لوگوں کی موجودگی کا شبہ ہوا تو اس نے تاک کر اس اندھیرے میں ایسا تیر مارا کہ اس کی دونوں پنڈلیوں کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ مگر موقعے کی نزاکت کی وجہ سے اسید نے کوئی حرکت نہیں بلکہ دم سادھے بیٹھا رہا۔ اب شنفری کو اطمینان ہو گیا کہ راستے میں کوئی بے نہیں۔ چنانچہ وہ بے دھڑک آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب ان لوگوں کے برابر پہونچا تو وہ سب اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کو پکڑ کر رسّے سے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور گھسیٹتے ہوتے اپنے قبیلہ میں لائے اور اوندھے منھ زمین پر ڈال دیا جب یہ خبر قبیلہ میں پہونچی تو بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور شنفری کے انجام کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ بعض کا خیال تھا کہ اس کی گردن ماردی جائے مگر غالبًا بڑے بوڑھوں کی رائے یہ ہو رہی تھی کہ یہ ہمارے ہی خاندان کا فرد ہے طاقتور۔ بہادر۔ دوڑنے میں برق رفتار اور ان سب خصوصیات سے بڑھ کر اچھا شاعر بھی ہے اس لئے اس سے صلح کر کے اسے اپنا لیا جائے تاکہ یہ قوت اور اپنی خداداد صلاحیتیں جو یہ ہمارے خلاف استعمال کرتا ہے ہماری طرف سے مدافعت میں استعمال کرنے لگے۔ یہ گفتگو ایک نوخیز لڑکا بھی سن رہا تھا جس کے باپ کو شنفری نے قتل کر دیا تھا۔

اسے یہ خطرہ ہوا کہ یہ بڑے بوڑھے اسے کہیں معاف نہ کردیں اور اس طرح میرے باپ کا خون کا بدلہ رہ جائے، اس نے بغیر کسی کو بتائے خنجر کے ایک وار سے اس کا ہاتھ کاٹ کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ اس ہاتھ کی ہتھیلی میں ایک کالا تل بھی تھا جسے دیکھ کر شنفری نے چند شعر بھی کہے[۱] لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ پھوڑے سے اس کا ہاتھ کٹ گیا ہے تو سمجھ گئے کہ اب اس کا بچنا مشکل ہے۔ چنانچہ اسید بن جابر نے اعلان کیا اگر شنفری پر کسی کا کوئی مطالبہ ہو تو آکر اپنا مطالبہ مانگ لے۔ چنانچہ لوگ جمع ہوتے اور سب کے سامنے اسے ایک درخت سے باندھ دیا گیا اور اسی حالت میں مرگیا۔

ابن ضبی نے ایک دوسری روایت میں بیان کیا ہے کہ اسید بن جابر وغیرہ اسے رسوں سے باندھ کر اپنے قبیلہ میں لائے اور ایک درخت سے باندھ دیا۔ جب صبح ہوئی تو اس سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ اس پر شنفری نے جواب دیا کہ: "إنما النشيد على المُسَرَّة" شعر خوشی کے موقعہ پر اچھا لگتا ہے۔ چنانچہ اس کا یہ جملہ ضرب المثل بن گیا۔ اس کے بعد ایک لڑکے نے اس کا ہاتھ پھوڑوں سے کاٹ کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ اپنی ہتھیلی کے کالے تل پر جب شنفری کی نظر پڑی تو اس نے ایک شعر پڑھا۔ اس کے بعد لوگوں نے اس سے پوچھا کہ سولی پر چڑھانے کے بعد تم کو کہاں دفن کریں تو جواب میں اس نے یہ شعر پڑھے۔

لا تقبروني انّ قبري محرم　　عليكم ولكن أبشري أم عامر
إذا احتملوا رأسي وفي الرأس أكثري　　وغودر عند الملتقى ثمّ سائري
هنالك لا أرجو حياة تسرّني　　سجيس الليالي مبسلا بالجرائم

لوگ مجھے دفن نہ کرنا۔ تم لوگوں پر میرا دفن کرنا حرام ہے۔ البتہ بجو کو بشارت ہو کہ جب لوگ میرا سر کاٹ لے جائیں گے اور باقی دھڑ ڈال جائیں گے تو اسے کھانے کا موقع مل جائے گا۔ اسی حالت میں کہ میں لمبی لمبی راتوں میں بے یار و مددگار جرائم کا بوجھ اٹھائے پڑا رہوں مجھے کسی

---

[۱] شعر مفضلات ابن ضبی تحقیق کارلوس یعقوب لائل کے صفحہ ۱۹۹ پر ملاحظہ کیجئے

خورش کن زندگی کی تمنا نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ جب شعر پڑھ چکا تو ایک سلامی نے سامنے آکر اس سے کہا کہ بول اب تیری آنکھیں پھوڑ دوں؟ پھر اس نے اس کی آنکھوں میں ایک نیزہ مارا اور اس طرح اسے قتل کردیا مرنے سے پہلے شنفری نے اس سے کہا کہ "ایسا ہی میں تم لوگوں کے ساتھ بھی کرتا تھا" جیسا کہ معلوم ہے شنفری نے قسم کھائی تھی کہ قبیلہ ازد کے اس شاخ بنو سلا مان میں سے سو آدمی جان سے ماریگا اب تک وہ ننانوے آدمی مار چکا تھا۔ اس کو قتل کرنے کے بعد سلامیوں نے اس کے سر کو قبیلہ میں ڈال دیا تھا۔ اتفاق سے ادھر سے ایک سلامی گذرا اور اس نے اس کے سر کو ٹھوکر ماری کھوپڑی کی ایک ہڈی اس کے پیر میں چبھ گئی اور اس سے زہر باد پھیل گیا اور وہ مرگیا اور اس طرح سو آدمی مارنے کی شنفری کی قسم پوری ہوگئی۔

شنفری کے مرنے کے بعد اس کے مربی اور دکھ درد کے ساتھی تابطّ شرا نے اس طرح اس کا مرثیہ کہا

على الشنفرى سارى الغمام ورائح غزير الكلى وصيب الماء باكر
عليك جزاء مثل يومك بالجبا وقد رعفت منك السيوف البواتر
ويومك يوم العيكتين وعطفة عطفت وقد مس القلوب الحناجر
تجول ببز الموت فيه كانهم لشوكتك الحدى ضئين نوافر
فانك لو لاقيتني بعد ما ترى وهل يلقين من غيبته المقابر

کہتے ہیں کہ شنفری کا ڈگ (دو قدموں کے درمیان کا فاصلہ) جب ناپا گیا تو معلوم ہوا کہ پہلا ڈگ ۲۱ قدم کا دوسرا ۱۷ قدم کا اور تیسرا ڈگ ۱۵ قدم کا تھا اور اس سے اس کی ہرنوں سے بھی تیز دوڑنے کا راز معلوم ہوجاتا ہے۔

شنفری کے بعض چیدہ اشعار شنفری نے مدح، فخر حماسہ کے علاوہ غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے غزلیہ اشعار اس کی محبوبہ امیمہ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ اس کی غزلیہ شاعری کی مثال اس کے تائیہ قصیدہ میں ملتی ہے۔ جو بہت دل آویز

وصف میں | اور موثر ہے اس قصیدہ میں اپنی محبوبہ کا سراپا کھینچتے ہوئے صرف ایک شعر میں اس کے سارے خط وخال کو ابھار کے رکھ دیا ہے۔ کہتا ہے۔

فدقت وجلت واسبکرت وأکملت فلو جن انسان من الحسن جنت

یعنی اس کا ناک نقشہ بڑا انیکھا۔ اعضا بڑے سبک اخلاق وعادات بہت ہی پیارے اور انداز و اطوار بڑے بانکے اور رقد قدرعنا۔ بس یوں سمجھو کہ قدرت نے اسے ہر طرح سے ایسا مکمل پیدا کیا ہے کہ اگر انسان حسن کو دیکھ کر دیوانہ ہو سکتا ہے تو اس پر صرف ایک نظر ہی پڑ جانے سے عقل وخرد کھو بیٹھے گا۔ چلتے ہیں محبوبہ کی شرم وحیا کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

کأن لها فی الأرض نسیا تقصه علیٰ أمها وإن تکلمك تبلت

یعنی وہ جب راہ چلتی ہے تو اس طرح زمین میں نظریں گڑوئے ہوئے کہ جیسے اس کی کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو اور وہ اسے ڈھونڈ رہی ہے اور اگر تم سے بات کرے تو بس ہکلا کر دو ایک جملے کبھی پورے اور کبھی ادھورے۔

غزل میں | شنفری جیسے صحرا نورد، آزاد منش اور خون کی ہولی کھیلنے والے نوجوان کے دل میں جب محبت اپنی جوت جگاتی تھی تو اس کی لپٹ سے اس کا پتھر جیسا دل بھی سلگ اٹھتا تھا، اور جب ہجر و فراق کے جاں گسل لمحات زندگی کی لذتوں اور بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کو دکھ درد کی کہانی بنا دیتے تو وہ بھی دل پہ ہاتھ رکھ کر آہ سرد بھرتا۔

فواکبدا علی امیمة بعد ما طمعت، فهبه نعمة العیش زلت

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

زندگی نے اور خرد تو نے مجھے بڑے دکھ دئے، مگر میں تجھ کو برا بھلا نہ کہہ سکا۔ تجھ کو بھلا نہ سکا اور جب بھی تیری یاد آگئی تڑپا گئی۔

فیا جارتی وانت غیر ملیمة اذا ذکرت ولا بذات تقلت

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

حکمت وفلسفہ شنفری نے باوجود اپنی جہالت اور صعلوکیت کے حکمت وفلسفہ کی باتیں بھی کہی ہیں۔ اس قسم کے اشعار میں اس کا وہ شعر بہت مشہور رہے جس میں کہتا ہے کہ جب آدمی کو ایک جگہ عزت وآبرو سے رہنا نصیب نہ ہو تو اسے جگہ چھوڑ کر اپنی دنیا الگ بسانی چاہیئے۔

وفی الارض منائ للکریم عن الاذی وفیہا لمن خاف القلی متحول

زندگی نام ہے اونچ نیچ کا۔ کبھی غربت ہے تو کبھی تونگری۔ مگر آدمی کو اس سے ہراساں نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اپنی مہم میں سرگرم رہنا چاہیئے جب فقر وفاقہ ہو تو صبر وسکون اختیار کرے۔ جب فارغ البالی میسر ہو تو پھول نہیں جانا چاہیئے۔

وأعدم أحیانا وأغنی وانما ینال الغنی ذو البعدۃ المتبذل

فلاجزع من خلۃ متکشف ولامرح تحت الغنی أتخیل

عزت نفس وخودداری شنفری نے اپنی غربت وفلاکت کے باوجود جوہر خودی کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کہتا ہے :-

ولکن نفساحرۃ لاتقیم بی علی الذم الاریثما اتحول

گذارش

علم نحو کا ارتقاء

ڈاکٹر محمد رضوان صاحب علوی
پروفیسر و صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی

حجاز کے دونوں شہر۔ مکّہ مکرّمہ اور مدینہ منوّرہ ۔ عہد بنی امیہ میں طرب و نشاط اور عیش و آرام کے گہوارے بن گئے تھے۔ شعر و موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے یہاں کشاں کشاں چلے آتے تھے لیکن عراق کے دو شہروں میں یہی زمانہ انتہائی علمی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ ان شہروں سے مراد کوفہ اور بصرہ ہے جو ان دنوں ثقافتی جد و جہد کے سب سے عظیم اور اہم مرکز تھے۔ علم نحو کی نشو نما انھیں دو شہروں کی رہین منت ہے جو پہلی صدی ہجری میں اہل علم کی آماجگاہ تھے عہد قدیم میں بھی تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح سے متمدن اقوام ہی اس پٹے جو دجلہ اور فرات کی وادی میں جو جنوبی حصے کی سمت واقع تھا جس کی زمین سرسبز اور زرخیز، آب و ہوا معتدل، آبادی اور مدنیت میں تمام روئے زمین پر سبقت رکھتا تھا، حکمرانی کرتی تھیں۔ بابلی، آشوری، کلدانی، ایرانی اور یونانی تمام اقوام نے عراق میں مختلف حکومتیں قائم کیں جو زندگی کے بہت سے شعبوں میں ایک دوسرے سے متباین تھیں۔ عہد قدیم میں عربوں نے بھی اس سرزمین سے پوری پوری واقفیت حاصل کر لی تھی۔ جب حضرت عمرؓ کا دور خلافت آیا تو عربوں نے اس پر دوبارہ قبضہ کیا اور اس میں بصرہ اور کوفہ جیسے شہر آباد کئے جو بہت جلد بین الاقوامی شہرت کے حامل ہو گئے۔ مدائن کے خزانے، بابل اور حیرہ کے تمدنی آثار یہاں منتقل ہو گئے۔ اموی دور میں عراق کی مدنیت ان ہی دونوں شہروں

میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ جب عراق کا لفظ لوگ استعمال کرتے تو اس سے مطلب بصرہ اور کوفہ کے شہری ہوتے تھے بلکہ اکثر ان کے لئے عراقین کا لفظ بول دیا جاتا تھا[1]

امویوں کے دورِ خلافت میں خراسان تک جملہ صوبوں کا مرکز بصرہ تھا جہاں سے ایران کی سرحد قریب تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں یہیں عربی اور اس کے صرف و نحو کی علمی تحقیق و تدریس کی پہل ہوئی۔ ان ہی دونوں شہروں میں نحویوں اور لغویوں کے مختلف دبستان معرض وجود میں آئے۔ پہلی وجہ تحریک تو یہ تھی کہ ان دونوں شہروں میں مختلف قبائل کے باشندے بڑی تعداد میں آباد تھے جن کا لب ولہجہ ایک دوسرے سے متفاوت[2] تھا۔ نہ جانے کتنے کاریگر اور دوسری صنعت و حرفت کے واقف کار فارسی زبان بولتے تھے۔ اس ماحول میں صحیح عربی زبان میں بہت کچھ خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ چنانچہ اس کے تحفظ اور سلامتی کی ضرورت محسوس کی گئی کہ مستقبل میں کلام اللہ میں کسی تحریف کا اندیشہ باقی نہ رہے[3]۔ دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان نومسلموں کی لسانی ضرورت پوری کی جائے جو قرآن مجید پڑھنا اور سرکاری ملازمت میں جانا چاہتے تھے یا خالص عربوں سے جنہیں واسطہ تھا[4] ابوالاسود دُؤلی پہلا شخص تھا جو علم و نحو کی جانب متوجہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ دؤلی کے واسطے خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اصول نحو وضع کئے تھے۔ انھوں نے کلام کے تین جزو متعین کئے: اسم، فعل اور حرف اور ہدایت کی کہ وہ اسی پر پورے صرفی اور نحوی قواعد کو ترتیب دے[5]۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار واضع فن نحو ابوالاسود والی کوفہ و بصرہ زیاد بن ابیہ کے پاس گیا اور کہا" اللہ آپ کے کاموں کو سدھارے میں دیکھ رہا ہوں کہ عرب و عجم کے اختلاط سے زبان عربی بگڑ گئی ہے۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں ان کے لئے کچھ ایسے قواعد ترتیب

---

[1] فجر الاسلام ص ۱۸۰۔ [2] جرجی زیدان ج ۳ ص ۱۱۳۔ [3] تاریخ الأدب شطیب محمود ص ۱۲۲ [4] ابن خلکان ج ص ۲۲۳۔

دے دوں جن کے ذریعہ وہ اپنی زبان کو صحیح کرلیں۔ زیاد نے اسے ایسا کرنے سے روکا۔ مگر بعد میں اجازت دے دی کیوں کہ اس نے خود اپنے کانوں سے ایک شخص کو یہ کہتے سنا تھا "توفی آبانا وترک بنون" چنانچہ ابوالاسود نے ایک باب تعجب کے نام سے مرتب کیا اور پھر فاعل و مفعول کا باب اور پھر جب کبھی کوئی نحوی اور صرفی غلطی سنتا تو اسے درست کرنے کے لئے ایک قاعدہ بنا دیتا۔ آگے چل کر اس کے مرتب کردہ قواعد کو بصرہ و کوفہ کے ادبا رتے لے کر ان کی تکمیل و تفصیل کی[1] مورخین اس امر پر متفق نہیں ہیں کہ ابوالاسود نے اپنی طرف سے نقطے ایجاد کئے بلکہ سریانی زبان سے اس کی واقفیت سے کہیں پہلے اس زبان کی نحو مرتب ہو چکی تھی یا پھر وہ سریانی زبان کے علمار و ادبار کے یہاں آمد و رفت رکھتا تھا جو ان قواعد کے مرتب کرنے میں اس کا ممد و معاون ہوا۔ شروع شروع میں عربی تحریر حرکات اور نقطوں سے مبرا ہوتی تھی جس کی وجہ سے تحریر اور عام بول چال میں بڑی غلطیاں ہونے لگیں اور قرآن خوانوں نے بھی ایسے ہی اندیشوں کا اظہار کیا۔ چنانچہ ابوالاسود نے امیر معاویہؓ کے دور خلافت میں کلام اللہ کے آخری حروف کو نقطوں کے ذریعہ واضح کیا۔ اس نے زبر، زیر، پیش سے اہل علم کو روشناس کرایا۔ پھر لوگوں نے نقطوں کا استعمال شروع کیا مگر کہا جاتا ہے کہ ان نقطوں کے لئے وہ تحریر کے مخالف رنگ کی روشنائی کا استعمال کیا کرتے تھے۔ آگے چل کر خط کی شکلیں تبدیل ہونا شروع ہوئیں اور حروف باہم مشابہ ہونے لگے۔ ج، ح، خ، د، ذ، ر، ز، س، ش، اور ع اور غ میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا تو حجاج بن یوسف نے ابوالاسود کے دو شاگردوں نصر بن عاصم اور یحیٰی بن یعمر کو حکم دیا اور انھوں نے حروف کی پہچان میں آسانی کے لیے نقطے بھی اسی سیاہی سے لکھنے کا طریقہ نکالا جس سے عبارت لکھی جاتی تھی۔ ابوالاسود نے بصرہ کے نحوی مدرسہ کی بنا رکھی جو اہل دانش کی نظر میں کوفی مدرسہ سے بہت سی چیزوں

[1] مذہرج ۲ ص ۱۹۹۔

میں افضل مانا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ بصرہ کے مدرسہ میں منطق پر زور دیا جاتا تھا۔ شاید اسی لئے بصری نحویوں کو اہل منطق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کوفہ کے نحویوں کی مصطلحات بصرہ کے نحویوں کی مصطلحات سے مختلف تھیں اہل بصرہ کا پہلے منطق سے استفادہ کر لینا محض اتفاق نہ تھا بلکہ قدرتی امر تھا کیوں کہ بصرہ میں فلسفیانہ مذاہب کا چلن دوسرے شہروں سے بہت پہلے ہوگیا تھا۔ بصرہ کے نحویوں میں شیعہ اور معتزلہ کی بھرمار تھی جنہوں نے غیر ملکی فلسفہ اور حکمت کا عمیق مطالعہ کیا تھا تاکہ وہ اپنے مذاہب کلامیہ میں اس سے خاطر خواہ استفادہ کر سکیں[۱]۔ بصرہ اور کوفہ کے نحوی علمار میں نحوی اصول و ضوابط کی تشکیل میں بڑا اختلاف رہا ہے۔ بصری علماء "سماع" پر زور دیتے تھے جب کہ کوفی علمار کو اصرار تھا کہ روایت نحوی قواعد کی اساس حقیقی ہے[۲]۔ نحوی اصول کو مرتب کرنے میں ہارون بن موسیٰ نے پہل کی۔ وہ یہودی تھا مگر بعد میں مسلمان ہوگیا تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کا ایک اچھا ادیب تھا مگر کوئی تالیفی کام نہ کر سکا۔ تصنیف کی طرف سب سے پہلے عیسیٰ بن عمر الثقفی متوجہ ہوا۔ وہ بڑا فصیح و بلیغ ادیب تھا اور بات کی تہہ تک بہت جلد پہنچ جاتا تھا۔ اسی کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے دو کتابیں الجامع اور الاکمال لکھیں جن کا ذکر خلیل بن احمد نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ مگر وہ لاپتہ ہیں۔ اس کی موت ۱۴۹ھ / ۷۶۶ء میں واقع ہوئی[۳]۔

عباسی عہد خلافت میں علم نحو کی تعلیم مسجد مسجد ہوتی تھی اور اسے کتابی شکل میں بھی پیش کیا جا رہا تھا اور اس کے اصول و قواعد مرتب ہو رہے تھے لیکن فن نحو کو مستقل فن کی حیثیت سے پیش کرنے کا سہرا البصری علمار کے سر ہے۔ نحوی قوانین سب سے پہلے ابن اسحاق حضری نے بیان کئے۔ جب اس علم کا چرچا بصرہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں ہوگیا تو ان کو دیکھ کر اہل کوفہ نے بھی اس فن میں دلچسپی لی اور بصریوں کے

---

[۱] تاریخ الفلسفہ فی الاسلام (T.G.-D.BOER) ترجمہ عبدالہادی ابوریدہ ص ۳۵ [۲] ترجمہ جرجی زیدان ج ۳ ص ۱۱۲ [۳] الفہرست ص ۶۳

سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بصرہ اور اس کے قرب وجوار کی بستیوں میں فصیح البیان عرب آباد تھے۔ انھیں کے اقوال کو بصری علمار قابل حجت سمجھتے تھے کوفہ چونکہ بغداد سے قریب تھا اس لئے کوفی علمار دربارِ خلافت سے قریب ہے اور قابل ترجیح سمجھے گئے۔ اس ترجیح میں سیاست شروع سے آخر تک کارفرما رہی جس کے نتیجے میں کوفیوں کا قول ہر موقع ومحل پر نقل ہونے لگا۔ ان دونوں دبستانوں کی کشمکش ان کی ویرانی پر منتج ہوئی اور یہاں کے علمار بغداد منتقل ہو گئے اور آگے چل کر ایک دبستان بغداد کے نام معرض وجود میں آگیا جس پر کوفہ وبصرہ دونوں کی چھاپ تھی۔ حسب ذیل نحوی عباسی دور خلافت میں بہت پیش پیش تھے۔

سیبویہ

اس کا پورا نام ابوبشر عمر بن عثمان تھا۔ فارس میں پیدا ہوا مگر بصرہ کے آب وگل میں نشو ونما ہوئی۔ نام سے زیادہ لقب 'سیبویہ' سے مشہور ہوا جس کے معنیٰ رائحۃ التفاح" یعنی سیب کی مہک کے ہیں۔ بصری علمار کا امام تھا۔ شروع میں حدیث شریف وفقہ کا مطالعہ کیا اور لوگوں کو حدیثیں املا کرانے لگا۔ ایک روز وہ حماد بن سلمہ کی املا کرائی ہوئی ایک حدیث نوٹ کر رہا تھا جو اس طرح تھی "لیس من اصحابی احد الاّ لو شئت لاخذت علیہ، لیس أبا الدرداء" سیبویہ نے ابو درداء لکھ دیا۔ اس پر حماد نے خفا ہو کر کہا: سیبویہ تم غلطی پر ہو۔ یہ استثنار ہے تب سیبویہ نے کہا: اب میرے لئے لازم ہے کہ میں وہ علم سیکھوں جس کے بعد کوئی میری زبان میں غلطی نہ نکال سکے۔ پھر نحو کی جانب متوجہ ہوا اور خلیل بن احمد اور عیسیٰ بن عمر سے اس کی تعلیم حاصل کی[1] مادری زبان فارسی تھی مگر اس نے عربی سیکھ کر بڑی معرکۃ الآرا کتاب لکھی۔ فن نحو پر اس کی "الکتاب" نہایت

---

[1] جرجی زیدان ج ۲ ص ۱۱۳۔

اہم اور افضل مانی جاتی ہے جس کی عظمت کا اندازہ ابوالعباس مُبرّد اور ابوعثمان المازنی کے اقوال سے لگایا جا سکتا ہے۔ مبرّد خود بھی اپنے زمانہ کا جید نحوی تھا "الکتاب" کے بارے میں وہ اہل علم سے اس طرح پوچھتا! ھل رکبت البحر؟ (کیا تم نے سمندر (علم) کا سفر طے کیا؟ مازنی نے تو یہاں تک کہہ دیا: "من اراد ان یعمل کتابا کبیرا فی النحو بعد کتاب سیبویہ فلیستحی"[1] متقدمین اور متاخرین میں کوئی بھی علم نحو میں سیبویہ کی ٹکر کا نہ تھا اور نہ "الکتاب" کے مرتبہ کی کوئی کتاب لکھی جا سکی مشہور انشاء پرداز جاحظ کا قول اس سلسلہ میں نقل کیا جاتا ہے کہ ایک بار وہ خلیفہ معتصم عباسی کے وزیر محمد بن عبدالملک زیات کے یہاں جانے کے ارادے سے نکلا تو سوچنے لگا کہ کون سی چیز وزیر کو تحفہ میں پیش کرے تو سیبویہ کی الکتاب سے بہتر کوئی تحفہ میری سمجھ میں نہ آیا جس کا اظہار بھی اس نے وزیر سے کر دیا کہ یہ اس نے مشہور نحوی الفرّاء کے ترکہ میں سے خریدی ہے۔ وزیر نے بھی کہا کہ اس ہدیہ سے بہتر اور کون ہدیہ ہو سکتا ہے میری لائبریری اس کتاب کے نہ ہونے سے سونی تھی۔ یہ تمہارا احسان ہے کہ تم نے مجھے الکتاب کا ہدیہ دیا۔[2]

سیبویہ نے ۱۸۳ھ (۷۹۹ء) بمقام بصرہ وفات پائی اور شیراز میں دفن ہوا اس کی لوح تربت پر چند عربی اشعار کندہ تھے جن میں اسے اپنے زمانہ کا بزرگ تر انسان کہا گیا تھا[3]

مرور زمانہ کے باوجود الکتاب ہنوز سلامت ہے اور اس کے متعدد قلمی نسخے مصر کی خدیولائبریری میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ پیرس سے ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۳ء۔ ۱۸۸۹ء) میں نامور مستشرق دیرنبورج نے دو ضخیم جلدوں میں شائع کی۔ یہ دونوں

---

[1] الفہرست ابن ندیم ص ۷۷ - [2] ابن خلکان، ص ۳۸۵۔

[3] طبقات الادبار ص ۷۱۔

جلدیں ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان کے مسودات کے مطالعہ کے بعد دیر نبو رج نے فرانسیسی زبان میں انتہائی کارآمد مقدمہ لکھا اور اس پر تبصرہ بھی کیا۔ پیرس کے علاوہ مصر ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۶ء) کلکتہ ۱۸۸۷ء سے اس کی نقل مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر یاہن نے ۱۳۱۲-۱۶ھ (۱۸۹۴-۹۸ء) میں اپنے مقدمہ کے ساتھ برلن سے شائع کی جس میں آٹھ سو بیس ابواب تھے۔ اس کا جزء اول کلمے اور اس کے اقسام، فاعل، مفعول پر مشتمل تھا۔ فعل اور اس کا عمل، مصدر کے احکام، حال، ظرف جر، بدل وغیرہ کا حال لکھا گیا تھا۔[1]

کسائی

ابوالحسن علی بن حمزہ جو عام طور سے اپنے لقب کسائی سے مشہور رہا۔ فن نحو، لغت اور قرأت میں امام وقت تھا۔ وہ اپنے وقت کے دانشوروں میں بڑی عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کوفہ میں نشو نما پائی اور فنِ قرأت حمزہ زیّات سے سیکھی اور اس میں کمال پیدا کیا۔[2] قرأت کے ایک خاص اسلوب میں امتیاز حاصل کرنے کی وجہ سے یہ قراء سبعہ میں گنا جانے لگا۔ کسائی کو شعر و سخن سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور یہ مقولہ اس کے بارے میں زباں زدِ خاص و عام ہو گیا "لیس فی العلماء العربیۃ أجھل من الکسائی بالشعر" (عربی کے علماء میں کسائی سے بڑھ کر شاعری سے نابلد کوئی نہیں)، کہتے ہیں کہ ایک دن وہ اپنے عرب طلبا کے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ لمبی مسافت طے کرنے کی وجہ سے ہانپتے ہوئے کہنے لگا "لقد عییت" (میں تھک گیا ہوں) یہ جملہ اس کی زبان سے سن کر اس کے ساتھیوں نے کہا: تجالسنا وانت تلحن (ہمارے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو اور ہماری عربی زبان میں غلطی کرتے ہو) کیف لحنت ؟

[1] جرجی زیدان ج ۳ ص ۱۱۵۔ [2] ابن خلکان ج ص ۳۳۱

میں نے کونسی غلطی کی؟

انھوں نے اسے بتایا کہ اگر تم تھک گئے ہو تو بجائے عییت کے اعییت کہنا چاہیئے تھا۔ اس پر کسائی نے بڑی سبکی محسوس کی۔

نحو کے لئے کسائی کو ابوجعفر رواسی اور معاذ الھرا کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا پڑا۔ کوفہ میں دل نہیں لگا تو بصرہ کی راہ لی اور خلیل بن احمد کی مجلس میں حاضری دی اس کا دریائی علم دیکھ کر کسائی انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔ اس نے خلیل بن احمد سے دریافت کیا" آنی لك هذا العلم"؟ خلیل نے جواب دیا" من بوادی الحجاز ونجد وتهامه (یہ علم آپ نے کہاں سے حاصل کیا؟ خلیل نے بتایا حجاز، نجد اور تہامہ کے قصبات سے) وہ قصباتی قبائل میں نکل گیا اور انھیں میں گھومتا پھرتا رہا اور ان کے فصیح ترین علماء سے ان کی گفتگوئیں سنتا رہا حتی کہ اس نے روایت اور لغت میں وہ سب کچھ حاصل کرلیا جس کی لگن اس کے دل میں تھی۔ خلیفہ ہارون رشید کسائی کی ذہانت ولیاقت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنے بیٹے اور جانشین امین کا استاد مقرر کردیا[۱]۔ کچھ دنوں برامکہ کے یہاں بھی اس کی آمدورفت رہی جنھوں نے اس کی حیثیت اور بلند کردی[۲]۔ اس کے اشارہ پر ایک دن بھرے دربار میں سیبویہ اور کسائی کے درمیان فن نحو کے چند ایک نکات پر مناظرہ بھی ہوا تھا[۳]۔

کسائی نے نحو، قرأت اور ادب پر کئی کتابیں لکھیں مگر ان میں سے کوئی بھی ہم تک نہیں پہونچی اس میں شک نہیں کہ جب تک کسائی بقید حیات رہا کوفہ اور بغداد کی علمی دنیا پر چھایا رہا تقریباً بیس کتابوں کی تصنیف اس سے منسوب کی جاتی ہے جن میں اہم ترین کتاب معانی القرآن ہے۔ اس کے علاوہ کتاب النحو، کتاب النوادر، کتاب الھجا اور رسالہ لحن العامۃ وغیرہ ہیں رسالہ لحن العامہ کا ایک نسخہ برلن کی قومی لائبریری میں بھی موجود ہے[۴]۔

---

[۱] جرجی زیدان ج ۲ ص ۱۱۶ ۔ [۲] الفہرست ص ۲۹ [۳] طبقات الادبار ص ۸۱۔

[۴] جرجی زیدان ج ۲۔ ص ۱۱۶۔

اُستاذ الملک ملّا محمد افضل جونپوری

از مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی استاذ مدرسہ عربیہ قاسم العلوم منگراواں اعظم گڈھ

شرقی عہد ۸۰۰ھ سے مغل بادشاہ محمد شاہ ۱۱۳۱ھ کے زمانہ تک جون پور دیار پورب میں علوم و فنون کا مرکز رہا ہے مصر و شام اور دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں یہاں کے علماء و فضلاء نے اسلامی علوم پر کم کام نہیں کیا ہے[1]۔

جونپور کی تاریخ میں پچاسوں مدرسوں کا پتہ چلتا ہے جن میں ہزاروں طلباء و فضلاء علمی خدمت میں مصروف رہتے تھے ذیل میں یہاں کے مشاہیر علماء و مشائخ کی مختصر فہرست پیش کی جاتی ہے جس سے ناظرین کو اس کی مرکزیت کا کسی حد تک اندازہ ہوگا۔

عہدِ شرقی کے مشاہیر علماء ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی جونپوری متوفی ۸۴۸ھ (۲) قاضی نظام الدین کیکلانی جونپوری مرتب فتاوی ابراہیم شاہیہ متوفی ۸۷۵ھ (۳) شیخ ابوالفتح المعروف بسون بریس جونپوری متوفی ۸۵۱ھ (۴) ملا بہرام منطقی خطیب جامع مسجد ظفرآباد جونپوری (۵) قاضی نصیر الدین گنبدی جونپوری قاضی شہر جونپور (۶) شیخ عیسیٰ بن تاج الدین خلیفہ شیخ فتح اللہ اودھی جونپوری متوفی ۸۴۰ھ (۷) ملا عبد الملک بن عادل جونپوری استاذ ملا الہ داد شارح ہدایہ وغیرہ۔

عہدِ لودھی کے مشاہیر ملا علاء الدین الہ داد جونپوری متوفی ۹۲۳ھ (۲) شیخ حسن بن طاہر جونپوری (۳) شیخ سید نوربخش محمد جونپوری متوفی ۹۱۰ھ (۴) شیخ

---

[1] تاثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۲

معروف چشتی جونپوری مدفون خالص پور ضلع اعظم گڑھ (۵) قاضی صلاح الدین بن خلیل جونپوری

عہد مغل کے مشاہیر

میر سید عبد الاول محدث جونپوری شارح بخاری شریف متوفی ۹۶۸ھ (۲) ملا محمد یوسف المعروف بقاضی خاں ظفر آبادی جونپوری م ۹۷۰ھ (۳) خواجہ محمد ارزانی مولف مدارج الاخبار جونپوری متوفی ۹۸۰ھ (۴) استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری (۵) ملا محمود بن محمد مصنف شمس بازغہ جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ (۶) دیوان محمد رشید مصنف مناظرہ رشیدیہ جونپوری متوفی ۱۰۸۳ھ (۷) ملا ضیاء الدین جونپوری استاذ شاہزادہ بہادر شاہ بن اورنگ زیب عالمگیر۔ (۸) شیخ عبد القدوس قلندر متوفی ۱۰۵۲ھ (۹) قاضی محمد حسین جونپوری محتسب مجلس ترتیب فتاوی عالمگیری (۱۰) شیخ حامد بن ابو حامد جونپوری یکے از مرتبین فتاوی مذکور (۱۱) شیخ محمد جمیل بن عبد الجلیل جونپوری یکے از مرتبین فتاوی مذکور[1] ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نامور علماء و فضلاء اس سرزمین سے ابھرے جنہوں نے اپنے اپنے دور میں مدرسہ اور خانقاہ دونوں کو اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں سے آباد رکھا۔ ان میں اعلم العلماء افضل الفضلاء جامع علوم وفنون قطب زماں استاذ الملک ملا محمد افضل عثمانی جونپوری کی ذات اپنے عہد میں خاص شہرت اور مخصوص مقام کی مالک ہے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے بعد آپ جیسی ہمہ گیر اور جملہ علوم میں ماہر شخصیت سرزمین جونپور سے پیدا نہیں ہوئی۔ زیدی لکھتے ہیں۔

دمیکہ ملک العلماء جارۂ عدم پیمود نداہل جونپور ماتم الوداع علم کردند مگر ندانستند کہ بذات خود ملک العلماء برفت وخلعت فاخرہ علم لبس آئندہ استاذ الملک گذاشت[2] آپ کا حلقہ درس اس قدر وسیع تھا کہ اس زمانہ میں کوئی ذی علم ایسا نہیں تھا جس نے ان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسب فیض نہ کیا ہو۔

تجلی نور میں ہے۔کہ۔

---

[1] علمائے جونپور کا ماضی۔ [2] تجلی نور صفحہ ۴۷

دراں زماں ہیچ کس نبود کہ پیش آں بلاواسطہ زانوئے ارادت تہ نکرد و سبق نہ آموخت
صدہا بفیض درس وتعلیم شاں عالم العلوم وفاضل متبحر گشتند[۳]
اس مقالہ میں اسی فاضل یگانہ کے حالات پیش کئے جائیں گے۔ اس مضمون کی ترتیب
میں حسب ذیل ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔
گنج رشیدی قلمی، گنج ارشدی قلمی، تجلی نور، سبحۃ المرجان، نزہتہ الخواطر، تذکرہ علمائے ہند
ان کے علاوہ ملا افضل کے حالات بحر ذخار قلمی مصنفہ شیخ وجیہہ الدین اشرف لکھنوی، ریاض
جونپور مصنفہ مولوی مہدی بن غلام شاہ جونپوری میں بھی ہیں لیکن یہ دونوں کتابیں انتہائی
کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہوسکیں اس لئے ان سے استفادہ نہیں کیا جاسکا۔

نام ونسب اور تاریخ ولادت نام محمد افضل لقب استاذ العلماء اور استاذ الملک ہے سلسلہ
نسب محمد افضل بن شیخ مفتی حمزہ بن شیخ فریدالدین بن شیخ
بہاء الدین عثمانی ہے شیخ عثمان ہارونی کی اولاد میں ہیں سلسلہ نسب اس سے زیادہ معلوم نہیں
ہوسکا۔
صوبہ اودھ کے مشہور تاریخی قصبہ ردولی میں ۱۶ر رمضان ۹۷۰ھ کو بعہد جلال الدین اکبر
پیدا ہوئے[۲]
آپ کے والد گردش زمانہ سے تنگ آکر اپنے آبائی وطن شہر دماوند مضافاتِ مازندران
کو خیرباد کہہ کر ہندوستان چلے آئے تھے اور ردولی میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔
شیخ حمزہ زیورِ علم سے آراستہ تھے اس لئے عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے
اور آپ کے تفقہ اور علم وفضل کا عملی اعتراف اس طرح کیا گیا کہ آپ کو عہدۂ قضا پر مامور کردیا گیا[۳]

تعلیم وتربیت استاذ الملک نے علم وفضل کے گہوارہ میں آنکھ کھولی تھی آپ کے والد ایک
عالم فقیہہ اور مفتی کی حیثیت سے شہر میں ممتاز تھے گھر میں فراغت ورفاہت

۱؎ تجلی نور ص ۳۴ ۲؎ نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۳۵۹ وتجلی نور ص ۳۴ ۳؎ نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۳۵۹

بھی تھی جس کا اثر استاذ الملک کی نشو نما پر بہت اچھا پڑا۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد کی نگرانی میں حاصل کی اور بہت جلد جملہ علوم وفنون میں دستگاہ پیدا کر لی پھر مزید تکمیل کے لئے دہلی تشریف لے گئے اور شیخ حسین عمری کے حلقۂ درس میں داخل ہوگئے یہاں سے فراغت کے بعد ملا ابوحلیفہ تلمیذ مخدوم الملک اور حکیم گیلانی سے صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث پڑھیں اور ان ہی کی خدمت میں رہ کر مسائل کے استنباط وتحقیق میں مہارت حاصل کی اس طرح بیس سال کی عمر میں تمام علوم مروجہ کی تحصیل وتکمیل سے فراغت پائی[1]۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی تکمیل کے سلسلے میں آپ لاہور بھی گئے تھے۔

تبحر علمی آپ کے تمام تذکرہ نگاروں نے آپ کی تبحر علمی کے سلسلے میں بڑے شاندار الفاظ لکھے ہیں۔

نزہۃ الخواطر میں ہے۔

وجد فی البحث والاشتغال حتی	تعلیم وتحصیل میں نہایت جانفشانی کی
برع فی العلم وافتی ودرس	تا آنکہ تمام علوم میں فاضل ہوگئے اور بیس سال
ولہ نحو عشرین وصار من اکابر العلماء[2]۔	کی عمر میں اکابر علماء میں شمار کئے جانے لگے۔

نورالدین زیدی لکھتے ہیں:۔

"در تحصیل علوم چناں ریاضتہا کشید وجانہا کندید کہ بعمر بست سال فاتحہ فراغ خواند وطبع دقیقش نشتر زن عروق اشکالات وفکر بلیغش گرہ کشائے معضلات گشت[3]"

تذکرہ علمائے ہند میں ہے:۔

"افضل الفضلاء عصر اعلم العلماء دہر جامع علوم عقلیہ ونقلیہ متشرع ومتقی خوش خلق سلیم المزاج بود[4]"

---

[1] تجلی نور ص ۴۴ [2] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۵۹۔ [3] تجلی نور ص ۴۴ [4] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۱

ردولی سے جونپور | تعلیم وتحصیل علوم سے فراغت اور جملہ علوم وفنون مروجہ میں مہارت حاصل ہوجانے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی سلطان محمود عثمانی کو ساتھ لے کر ردولی کا قیام ترک کر کے دارالخیور شہر جونپور کی سکونت اختیار کر لی۔[۱]

استاذ الملک نے ردولی کی سکونت کیوں ترک کی اور جونپور کب آئے اس سے تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں۔

آپ نے ایسے دور میں آنکھیں کھولیں جب جونپور کے علوم وفنون کا غلغلہ پورے ہندوستان میں بلند تھا اس لئے قیاس ہے کہ یہ غلغلہ سن کر استاذ الملک جیسے شائق علوم کے دل میں اس مرکز علمی کی کشش پیدا ہوئی ہوگی اور آپ نے ردولی سے جونپور کا قصد کیا ہوگا پھر یہ سرزمین ایسی دل پسند ہوئی کہ یہیں کے ہو رہے۔

تذکرہ نگاروں کے سیاق کلام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فراغت تعلیم کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں جونپور چلے آئے تھے اس اعتبار سے جون پور میں آپ کی آمد ۸۰۰ھ کے حدود میں ہوئی ہوگی یہ زمانہ جونپور کے علمی شباب کا تھا اور وہاں متعدد مدارس کو تعلیمی مرکزیت حاصل تھی ان میں چند مشہور مدارس یہ تھے۔

(۱) مدرسہ ملا عبدالباری متوفی ۸۳۶ھ (۲) مدرسہ ملا محمد صادق متوفی ۸۶۱ھ (۳) مدرسہ ملا شمس الدین برنومی جونپوری متوفی ۸۴۲ھ (۴) مدرسہ مداریہ ملا مداری متوفی ۸۴۳ھ (۵) مدرسہ ملا خلیل متوفی ۸۶۹ھ (۶) مدرسہ ملا شیخ حامد جونپوری (۷) مدرسہ ملا سید مبارک وغیرہ۔[۲] استاذ الملک نے بھی اپنی قیام گاہ کے متصل دائرہ افضل کے نام سے ایک درس گاہ قائم کر کے تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔

اس مدرسہ نے بہت جلد شہرت ومقبولیت حاصل کر لی اور طلبار کا اتنا رجوعہ ہوا کہ تمام مدرسوں کی رونق سرد پڑ گئی۔

---

[۱] تجلی نور ص ۴۵۔ [۲] علمائے جونپور کا ماضی۔

تم آئے بزم میں اتنا تو میں نے دیکھا پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

سلوک و تصوف استاذ الملک نے پوری زندگی گو علماء کے انداز پر گزاری لیکن قدرت نے انھیں صوفی صافی بھی بنایا تھا اس لئے عمر کے ساتھ ساتھ تصوف کی طرف میلان بڑھتا گیا۔ بالآخر شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے شیخ عبدالقدوس قلندر زہد و تقویٰ اور عشق الٰہی میں خاص امتیاز رکھتے تھے استغنار اور ماسوا اللہ سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھتے تھے جنگلات سے گھاس کاٹتے اور فروخت کر کے بسر اوقات کرتے تھے کھانے میں مشتبہات سے انتہائی اجتناب کرتے اور اکل حلال کا بڑا اہتمام تھا آپ کی ذات مرجع خلائق تھی خواص و عوام سب آپ کی صحبت کو سرمایۂ سعادت سمجھتے تھے اپنے وقت کے مشاہیر علماء نے آپ سے کسب فیض کیا آپ کی ولادت ۹۴۳ھ میں جونپور میں ہوئی آپ کے والد شیخ قیام الدین قطب الدین بینائے دل سے خلافت ملی تھی۔

اپنے مسترشدین کے شوق و طلب کا نہایت سخت امتحان لیتے تھے گنج ارشدی میں ہے کہ جب دیوان محمد رشید بیعت کے لئے حاضر ہوئے تو ان سے بات تک نہ کی تقریباً ایک سال تک برابر دیوان صاحب حاضر خدمت ہوتے رہے مگر رعب کی وجہ سے عرض مدعا کی جرأت نہ ہوئی ایک سال کے بعد ایک دن قلندر صاحب نے فرمایا کہ نصف شب کے بعد آنا خانقاہ دریا کے پار تھی اور نصف شب کے بعد پل کا دروازہ بھی بند ہو جاتا تھا۔ مگر دیوان صاحب دریا پار کر کے حکم کے مطابق پہونچ گئے اس وقت قلندر صاحب نے بیعت کی۔

ایک سو دس برس کی عمر میں ۱۲ ر شوال ۱۰۵۲ھ کو وفات پائی آپ کا مزار جیل خانہ کے جنوب میں سڑک اور جیل کی چہار دیواری کے درمیان واقع ہے[1]۔

---

[1] گنج ارشدی و تجلی نور ص ۶۸

استاذ الملک نے جونپور کے قیام کے زمانہ میں بیعت کی اور تعلیم وتدریس کے ساتھ مجاہدہ وریاضت کا بھی سلسلہ جاری رہا اور مختصر مدت میں تصوف کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے اور قطبیت کے عہدہ سے سرفراز ہوئے۔

گنج ارشد میں ہے مرتب احقر از پیر دستگیر خود شنیدہ فرمود کہ روز وفات استاذ العلماء حضرت بندگی شیخ محمد افضل قدس سرہ درلاہور بہاں روز ملا خواجہ قدس سرہ فرمود امروز قطب جونپور وفات یافت[1]۔ ملا خواجہ سلسلۂ قادریہ کے مشہور مشائخ میں ہیں۔

صاحب تجلی نور لکھتے ہیں:

"قطع نظر علوم ظاہر اہل دل صوفی صافی روشن ضمیر آغاز وانجام حقیقت رابمیزان اعتبار ہم سنجیدہ بود بیعت از شیخ عبد القدوس قلندر جونپوری داشت در کرامت وخوارق بغایت ستر نمودی[2]۔"

آزاد بلگرامی مرحوم نے لکھا ہے۔

انہ کان حصوراً تقیاً حسن الخلق سلیم المزاج — استاذ الملک پاک نفس متقی خوش خلق اور سلیم الطبع تھے[3]

تصانیف استاذ الملک تمام علوم متداولہ وفنون متعارفہ میں امامت وعبقریت کا درجہ رکھتے تھے مگر ان کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں ملتا معلوم ہوتا ہے کہ حلقۂ درس کی وسعت اور مشغولیت سے تصنیف وتالیف کا موقع نہ مل سکا۔

شاعری استاذ الملک بہت عمدہ شاعر تھے اس فن پر آپ کو کافی عبور تھا مگر طبعاً شعر گوئی کی طرف میلان کم تھا کبھی کبھی تفنناً فارسی میں شعر کہتے تھے۔

نمونہ کلام یہ ہے۔

با زلف تو تورہ عنبر چہ کنم	با خال تو مشکنائے اذخر چہ کنم
تو کافر و زلف کافر و دل کافر	من نیم مسلمان بسہ کافر چہ کنم[4]

---

(۱) گنج ارشدی ورق ۲۳ (۲) تجلی نور ص ۴۵ (۳) سبحۃ المرجان ص ۵۰ (۴) تجلی نور ص ۴۵۔

وفات آپ کے شاگرد رشید فخر استاذ ملا محمود جونپوری کا انہتر سال کی عمر میں استاذ الملک کے سامنے انتقال ہوگیا استاذ الملک اس صدمۂ جانکاہ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ چالیس دن تک آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہیں دیکھی گئی اور اکتالیسویں دن اس غم کو سینے سے لگائے ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ کو بعمر چوراسی سال سات ماہ تلمیذ عزیز سے جا ملے استاذ و شاگرد کے تعلق کی یہ ایسی مثال ہے جس کی نظیر شاذ و نادر ہی ملے گی۔[عہ] مزار محلہ سپاہ شہر جونپور میں ریلوے لائن سے مشرق جانب ایک چبوترے پر واقع ہے مقالہ نگار کو کئی بار حاضری کا موقع ملا ہے۔

بعض تذکرہ نویسوں نے تاریخ وفات ۱۹ کے بجائے ۱۳ ربیع الثانی بیان کی ہے۔"
زمحمود و افضل بگو آہ آہ سے استاذ و شاگرد دونوں کا سنہ وفات نکلتا ہے۔

استاذ الملک کے مزاج میں اس درجہ تواضع و انکسار تھا کہ کسی سے خدمت لینا قطعاً پسند نہیں کرتے تھے اپنا کل کام خود ہی انجام دیتے تھے دیوان محمد رشید نقل کرتے ہیں کہ حضرت بندگی میاں محمد افضل ہمہ کارہا خود می کردند حتیٰ کہ چراغ حجرہ خود روشن کردند وکتاب از حجرہ خود می آوردند[۱]

جونپور کے وقائع نگار نے آپ کے علم وفضل کے بارے میں جہاں گیر کو اطلاع دی اس نے ان کو استاذ الملک کا لقب اور جونپور کے شاہی مدرسہ کی مدرسی اور جاگیر کا پروانہ روانہ کیا مگر ملا محمد افضل نے اس کے قبول کرنے سے معذرت کر دی اور پوری زندگی توکل و تدریس میں گذار دی۔[۲]

امراء و حکام کے دربار میں حاضری سے بہت اجتناب کرتے تھے کبھی اپنی غرض لے کر ان کے پاس نہیں گئے اگرچہ حکام آپ کی خدمت باعث سعادت سمجھتے تھے۔

عہ تجلی نور میں ہے۔

۱؎ گنج ارشدی ورق ۱۳۶ ۲؎ معارف اعظم گڑھ جون ۴۳ء ۳؎ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۵۹
۳۷

با وصف چندیں با استدعا و طلب بر در امرا و ملوک نمی رفتی مگر برائے حوائج فقرا و طلبار ہیچو مردم بخانہ چشم منتظراں در آمدی۔ تجلی نور ص۴۵

اولاد و تلامیذ استاذ الملک کی کسی اولاد کا ان کے تذکرہ نگاروں نے ذکر نہیں کیا ہے البتہ ان کے شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے تاریخوں میں منتشر طور پر کچھ لوگوں کا پتہ چلتا ہے جن میں مشاہیر درج ذیل ہیں لیکن ان کی تعیین بھی مشکل ہے۔

ملا محمود بن محمد جونپوری آپ دلید[1] پور ضلع جونپور کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۹۹۳ھ میں پیدا ہوئے تعلیم وتحصیل کی تکمیل استاذ الملک کے زیر نگرانی کی بڑے ذہین، فطین اور علم کے بیحد شائق تھے تعلیم کے زمانہ میں بڑی محنت وجانفشانی کی اور بہت جلد اپنے پیشروؤں سے بھی آگے نکل گئے آپ کے طلب واشتیاق کی قدر استاد الملک بھی کرتے تھے آپ فخر استاذ تھے استاذ الملک کے تمام تلامذہ میں آپ کا اور دیوان محمد رشید کا علمی درجہ بہت اونچا تھا اور بعض علوم میں آپ کو دیوان محمد رشید پر بھی فوقیت حاصل تھی۔ صرف سترہ سال کی عمر میں جملہ علوم وفنون میں مہارت حاصل کر لی بالخصوص فلسفہ میں ایسا کمال پیدا کر لیا کہ متقدمین میں بھی ان کے ہم پایہ کم نظر آتے ہیں متعدد اہم کتابوں کے مصنف ہیں ان میں شمس بازغہ اور فرائد محمودیہ بہت مشہور اور اپنے فن میں نہایت جامع ہیں ایک عرصہ تک یہ دونوں کتابیں داخل نصاب رہ چکی ہیں شمس بازغہ پر متعدد علمار نے حواشی وشروح لکھے۔ شعر وسخن میں بھی ید طولی رکھتے تھے دو دیوان یادگار چھوڑے۔

نمونہ شعر پیش ہیں۔

بر صوفی بے وجد و بال است عبادت   بر شیشہ کہ خالیست زمے سجدہ حرام است

اشکے کہ راز عشق بگوید فشاندنی است   طفلے کہ خوش محاورہ افتد نماندنی است

---

[1] اب دلید پور ضلع اعظم گڑھ میں ہے۔

ملا محمود نے اپنے استاذ کی طرح پوری عمر درس و تدریس میں گذاردی آپ کے مشہور شاگردوں میں ملا عبد الباقی جونپوری خاص شہرت کے مالک ہیں جنہوں نے دیوان صاحب کی مناظرہ رشیدیہ پر استدراک لکھے ہیں۔

ملا محمود کا ۱۰۶۳ھ میں انتقال ہوا مزار چاچک پور شہر جونپور میں ہے[1]۔

دیوان محمد رشید جونپوری بھی استاذ الملک کے ارشد تلامذہ میں ہیں استاذ الملک سے انھیں خاص لگاؤ تھا تکمیل کے بعد بھی ہفتہ میں ایک بار ضرور حاضری دیتے تھے جب تک استاذ الملک نے درس و تدریس کا حکم نہیں دیا اس کا سلسلہ شروع نہیں کیا لوگوں کے اصرار پر فرما دیتے کہ جس جگہ استاذ الملک جیسی ہمہ گیر شخصیت مصروف تدریس ہو مجھ جیسے شخص کے لئے تدریس کی مسند پر بیٹھنا مناسب نہیں۔

دیوان صاحب جملہ علوم میں مہارت رکھتے تھے تعلیم و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی شغل تھا اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں القویم فی احادیث النبی الکریم، مناظرہ رشیدیہ اور شرح اسرار الحکمت نہایت جامع اور اہم ہیں رشیدیہ تو اب تک نصاب میں داخل ہے۔ علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں بھی آپ کا مقام نہایت بلند ہے اس دور میں تصوف کے جتنے سلاسل ہندوستان میں تھے ان سب میں آپ کو خلافت و اجازت حاصل تھی اس وصف میں دیوان صاحب اپنے تمام معاصرین میں ممتاز اور فائق ہیں۔

شاعری میں بھی آپ خاص اہمیت کے مالک تھے شمسی تخلص تھا دیوان شمسی کے نام سے آپ کا قلمی دیوان کتب خانہ خانقاہ رشیدیہ جونپور میں اب بھی موجود ہے۔

نمونہ کلام پیش ہے۔

بر بدن صد زخم خنجر گر زنی — کے بمیرم جان بجائے دیگر است
من بہ یکدم سیر عالم می کنم — روح را دستے و پائے دیگر است

[1] تجلی نور ص ۹۴

گردشو گرد کہ تا گرد دینہ گردی در ساہ　　کے بدانی کہ دریں راہ سوارے باشد

اپنے والد کے جائے مدفن کے بارے میں کیا عمدہ شعر کہا ہے۔

چوں یار بہ بنگالہ شود مسکن و مادیٰ　　شمسی بہ بدخشاں نرود لعل بہ بنگ است

۱۰ ذیقعدہ ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ کو وفات پائی مزار محلہ رشید آباد شہر جونپور میں ہے[1]۔

دیوان صاحب کے مفصل حالات کے لئے راقم کا مقالہ دیوان محمد رشید مطبوعہ معارف، اعظم گڑھ جون و جولائی ۱۹۷۲ء ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) ملا ضیاء الدین جونپوری استاذ الملک کے مشہور شاگرد ہیں جملہ علوم و فنون میں تبحر حاصل تھا۔ حدیث، فقہ اور لغت میں امتیازی شان رکھتے تھے ایک ہزار سے زائد احادیث کے حافظ تھے قاموس مولفہ مجد الدین فیروزآبادی بھی نوک زبان تھی۔ نہایت متقی، اور پرہیزگار تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے شہزادہ بہادر شاہ کی تعلیم و تربیت کیلئے ان کو مامور کیا تھا عین عالم شباب میں وفات پائی۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے[2]

(۴) سلطان محمود عثمانی | آپ سلطان الملک کے برادر حقیقی ہیں ولادت قصبہ ردولی میں ہوئی تعلیم و تربیت استاذ الملک کی نگرانی میں پائی۔ استاذ الملک کے ہمراہ یہ بھی جون پور چلے آئے تھے اور جونپور ہی میں شیخ مبارک بن خیر محمد جونپوری کی صاحبزادی سے عقد ہوا۔

سلطان محمود اپنے وقت کے مشاہیر صوفیا میں ہیں اپنے خسر شیخ مبارک سے بیعت کی اور بہت جلد جملہ مقامات کو طے کر کے اعلیٰ مدارج پر پہونچ گئے۔

آپ نے میر علی بن قوام الدین سرائے میری المعروف بہ علی عاشقان سے بھی کسب فیض کیا تھا اپنے زمانہ میں مرجع خاص و عام تھے اور بیشمار کرامات آپ سے ظاہر ہوئیں

---

[1] گنج ارشدی قلمی و گنج رشیدی قلمی۔ [2] معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۳۰ء

تجلی نور میں ہے طبیعت فقر آشنا بود و از خسر خود حضرت مبارک خیر محمد بیعت نمود و در ریاضت باطنی بر خود کشیدہ باندک زمانہ طے منازل کردہ منازل سلوک و خضر جاوہ مستقیم گشت و از میر علی عاشقان سرائے میری[1] ہم فیض فراواں برگرفت بسیار مردم بر دگر ویدند و بسیار خوارق از و بر گنارند[2]۔ سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا مزار محلہ چاچک پور شہر جونپور میں ہے۔

محمد ارشد بن محمد رشید جونپوری انھیں بھی استاذ الملک سے تلمذ کا شرف حاصل تھا استاذ الملک ان سے بہت محبت کرتے تھے ان کا پہلا نکاح استاذ الملک ہی کی تجویز پر ہوا تھا۔ ولادت ۱۰۴۲ھ میں ہوئی بیس سال کی عمر میں علوم ظاہری و باطنی دونوں میں کمال حاصل کرلیا تھا آپ کا مشغلہ بھی تعلیم و تدریس ہی تھا اور اس میں بڑا انہماک تھا صبح کو درسگاہ میں بیٹھتے تو دوپہر کے وقت اٹھتے اور ظہر کی نماز اول وقت جماعت سے پڑھ کر پھر درس شروع کر دیتے۔ طلبا سے بڑی محبت رکھتے تھے جو خود کھاتے انھیں کھلاتے نہایت متقی پرہیزگار اور متبع سنت تھے اگر کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تو بڑی بشاشت و انبساط کا اظہار فرماتے اور کہتے کہ سنت نبوی پر عمل کی توفیق ہوئی۔

خاندان رشیدی میں دیوان صاحب کے بعد اس درجہ و مقام کا کوئی شخص دوسرا نظر نہیں آتا سہ ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۱۳ھ کو کلمہ لا الٰہ کا ورد کرتے ہوئے واصل بحق ہوئے آپ کا مزار بھی رشید آباد شہر جونپور میں ہے[3]۔

(۶) **شیخ مولا چندن** جملہ علوم و فنون کی تعلیم استاذ الملک سے حاصل کی اس دور کے مشاہیر علمائے محدثین میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

علم حدیث میں بہت شغف رکھتے تھے حرمین شریفین تشریف لے گئے تو وہاں کے محدثین سے بھی حدیث کی تصحیح اور اسکی سند حاصل کی اور اسی سفر میں ۱۰۶۲ھ میں مکہ معظمہ میں وفات پائی اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہ ہو سکی[4]۔

---

(۱) سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں مشہور قصبہ ہے۔ قصبہ سے متصل پچھم سمت علی عاشقان کا مزار آج بھی موجود ہے (۲) تجلی نور ص ۷۷، (۳) گنج ارشدی قلمی ورق ۱۰۲ (۴) معارف مئی ۱۹۳۰ء و تجلی نور۔

مرزا غالب کی فارسی دانی

پروفیسر ڈاکٹر نظام الدین ایس۔ گوریکر ایم۔ اے۔ پی، ایچ، ڈی
صدر شعبۂ فارسی و اردو سینٹ زیویئرس کالج بمبئی ۱

انیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں ایک یادگار زمانہ ہے جب ہمارا ملک ایک زبردست انقلاب سے دوچار ہوا۔ یہ انقلاب نہ صرف سیاسی بلکہ ایک حد تک لسانیاتی بھی تھا۔ آشوبِ وقت نے طبیعتیں آشفتہ کر دی تھیں۔ فارسی کا چراغ آخر مرحلہ پر پہنچ کر اس انتظار میں تھا کہ اس کا شعلۂ آخری اس طرح بھرپور جست لگا کر ختم ہو جائے جس طرح کسی طوفان کے آنے سے پہلے ایک سکون پیدا ہو جاتا ہے اور ایک خلا، محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس صدی کے آغاز میں اگرچہ ہر طرف فارسی زبان و ادب کا بول بالا تھا، دربار و دفاتر میں اسی زبان کا سکہ چلتا تھا اور شعراء و ادباء کی محفلوں میں اسی زبان کے چرچے تھے مگر فارسی کے ماحول میں بالکل وہی کیفیت تھی، کہیں کہیں سرسراہٹ ہوتی مگر رقیب زبان کے نغموں میں ڈوب جاتی۔ دوسرے لفظوں میں زبان اردو کا طنطنہ بلند ہو رہا تھا اور ان دنوں جن اصحابِ ذوق نے طبع آزمائی کی انھوں نے اردو کو مقدم سمجھا اور فارسی کو ثانوی بلکہ تفریحی گردانا۔ اس اعتبار سے فارسی اساتذہ اور شعراء نے اس لسانی اور ادبی انقلاب میں مدد دی۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے آخری ایام میں شاہ سعد اللہ گلشنؔ نے اپنے شاگرد رشید ولیؔ کو مشورہ دیا کہ وہ اردو زبان میں فارسی شعرا کے طرز پر لکھیں: "این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔"

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ جو ابتدا میں اسدؔ تخلص کرتے تھے اس وقت منصۂ شہود پر آئے جب مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی اور حکومت برطانیہ اپنا اقتدار جما رہی تھی، مشرقی تمدن اور بالخصوص مغلیہ ثقافت اپنی چار صد سالہ تابانی کے بعد ماند پڑ چکی تھی اور مغربی تہذیب برسر پیکار تھی۔ بالفاظ دیگر غالبؔ کا عہد ایک سیاسی ردعمل کا عہد تھا' ایک انقلاب کا زمانہ تھا' ایک عبوری عصر تھا۔ غالبؔ نے ایک تمدن کو اجڑتے اور دوسرے کو ابھرتے دیکھا ہے اگرچہ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے تصادم سے قدریں بدلیں اور ایک ذہنی کشمکش پیدا ہوئی تاہم غالبؔ نے حقائقِ زندگی کو نگاہ سے اوجھل ہونے نہیں دیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام ہنگامی دوائر میں نہ گھٹا بلکہ دوامی کیفیت پا گیا۔ غالبؔ دنیا کے ان مشاہیر فن کاروں میں سے ایک ہیں جو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کی ذات میں بیک وقت نہ صرف کئی صفات کا اجتماع نظر آتا ہے بلکہ جن کی ہر صفت ایک امتیازی شان کا مظہر ہوتی ہے بقول غالبؔ ؎

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ　　　چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

غالب ماہ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق دسمبر ۱۷۹۷ء بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ اپنی ولادت کے بارے میں ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

غالبؔ چو ز نا سازیٔ فرجام نصیب　　　ہم بیم عدو دارم و ہم ذوقِ حبیب

تاریخِ ولادتِ من از عالمِ قدس　　　ہم "شورشِ شوق" و ہم لفظ "غریب"
۱۲۱۲ھ　۱۲۱۲ھ

اور ۱۲۸۵ھ ہجری مطابق ۱۸۶۹ء عیسوی میں انتقال کیا اگرچہ مرنے سے بیس سال پہلے تاریخ وفات کا مادہ ہاتھ آیا جو انھیں بہت پسند آیا اور جس کو انھوں نے اس طرح موزوں کیا تھا ؎

من کہ باشم کہ جاوداں باشم　　　چوں نظیریؔ نماند و طالبؔ مرد

در بپرسند در کدامیں سال　　　مرد غالبؔ بگو کہ "غالب مرد"
(۱۲۷۷ھ)

غالب تورانی النسل تھے۔ ان کے آبا و اجداد ترک قوم کے ایک قبیلہ سے تعلق رکھتے

تھے سمرقند میں کاشتکاری و سپاہ گری کیا کرتے تھے اور اپنا سلسلۂ نسب افراسیاب سے ملاتے تھے۔

غالب از خاک پاک تورانیم — لاجرم در نسب افراسیابیم
ترک نژادیم و در نژاد ہمی — بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فن آبادی من کشاورزیست — مرزبان زادۂ سمرقندیم

آقامی بزرگ شیرازی دفا کو اپنے ایک مکتوب میں اپنے نسب کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں

گرفتم کہ از تخم افراسیابم — گرفتم کہ از نسل سلجوقیانم

اسی طرح سراج احمد کو بھی لکھتے ہیں: "ترک نژاد و نسب من بہ افراسیاب و پشنگ می پیوند و بزرگان از آنجا کہ با سلجوقیان پیوند ہم گوہری داشتند"

اپنی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تدریس کے سلسلے میں غالب یوں کہتے ہیں: "میں نے ایام دبستان نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا۔ اس کے بعد لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور، عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔

اگرچہ غالب شروع سے انگریزوں کے وظیفہ خوار اور انگریزی عملداری کے تابع زندگی بسر کرتے تھے تاہم ان میں پرانی ثقافت، تہذیب اور بوئے ریاست کی کشش اب بھی باقی تھی۔

دیدہ ور سلطان سراج الدین بہادر شاہ ظفر — آں شہر بیند کہ پنہاں در رگِ سنگِ من است

اسی دیدہ وری کے صدقہ میں جولائی ۱۸۵۰ء عیسوی میں شاہی ملازمت مل گئی اور مشاہرہ پچاس (۵۰) روپیہ ماہانہ مقرر ہوا جو اپریل ۱۸۵۷ء عیسوی تک ملتا رہا۔ خدمت یہ سپرد ہوئی کہ شاہی طبیب خاص حکیم احسن اللہ خاں تاریخی واقعات کا انتخاب کریں اور وہ (غالب) ان کو الفاظ کا جامہ پہنا دیں۔ دوسرے لفظوں میں حکیم موصوف کی زیر نگرانی غالب نے ۱۸۵۲ء عیسوی میں پہلا حصہ مہر نیم روز کے نام سے لکھ کر باریاب ہوئے اور تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے اور مہر نیم روز

کے دیباچہ کے مطابق بہادر شاہ ظفر نے "غالب سخن سرائی رانجم الدولہ دبیر الملک بہادر نظام جنگ خواند"

اپنے استاد خاقانیٔ ہند شیخ ابراہیم ذوق کی ۱۲۷۱ سنہ ہجری میں وفات کے بعد بہادر شاہ ظفر نے غالب کو اپنے اشعار کی اصلاح کی خدمت پر مامور کیا۔ اس سلسلہ میں والیٔ رام پور کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "پیوند تعلق با بہادر شاہ جز آں نبود کہ از ہفت ہشت سال بہ تحریر تاریخ سلاطین تیموریہ و از دو سال بہ اصلاحِ شعرِ شہریاری پرداختم" اس کے علاوہ شہزادوں کے زیر اہتمام قلعۂ معلیٰ میں جو مشاعرے ہوا کرتے تھے غالب بھی شرکت کرتے اور فارسی اور کبھی اردو غزل پڑھتے۔ بادشاہ کی تعریف میں تین قطعے، ایک مثنوی، سولہ قصیدے اور چند غزلیں ہیں۔ بادشاہ کی مہم و قصد گری، شہزادوں کی پیدائش، شادی اور موت اور دیگر اہم واقعات کو بھی غالب نے نظم کیا ہے۔

خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام غالب نے جولائی ۱۸۵۰ء عیسوی میں شروع کیا جسکا نام پرستان تجویز ہوا تھا۔ پہلے حصہ میں ابتدا سے ہمایوں کے انتقال تک کے حالات درج ہیں اور یہ حصہ مہر نیم روز کے نام سے موسوم ہوا اور ۱۸۵۲ء عیسوی میں مکمل ہو کر ۱۸۵۴ء عیسوی میں شائع ہوا لیکن دوسرا حصہ بنام ماہ نیم ماہ جس میں اکبر کے عہد حکومت سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے واقعات کو رقم کرنا تجویز ہوا تھا شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا کیوں کہ ۱۸۵۷ء عیسوی میں افراتفری شروع ہو چکی تھی۔ اس ضمن میں غالب لکھتے ہیں: "ماہ نیم ماہ می خوانند آں خود اسمی است کہ مسمیٰ ندارد۔ ہر گاہ یک نیمہ از پرستان انجامید و مہر نیم روز نام یافت۔"

اپنی فارسی تصنیف دستنبو میں غالب نے مئی ۱۸۵۷ء عیسوی سے جولائی ۱۸۵۸ء عیسوی تک غدر کے حالات پر تبصرہ کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس تالیف میں پندرہ مہینے کی روداد ہے جو تباہیٔ شہر اور مصنف کی سرگذشت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالب کے نزدیک غدر کسی قومی تحریک کا نتیجہ یا جنگِ آزادی کا مظہر

نہ تھا۔

اس میں ملکہ وکٹوریہ کی شان میں ایک قصیدہ اور ایک قطعہ بھی ہے جو قطعۂ چراغاں کے نام سے مشہور ہے۔

غالب کی ایک اور تالیف پنج آہنگ کے نام سے موسوم ہے جس میں پانچ باب ہیں۔ پہلے باب میں فارسی انشاپردازی پر اظہار خیالات کیا ہے، دوسرے میں فارسی مصادر، محاورات اور الفاظ کی فرہنگ ہے، تیسرے میں شاعر کا انتخاب کلام، چوتھے میں تقریظیں، خطبے اور مضامین اور پانچویں میں متفرق خطوط ہیں۔ یہ ایک عمدہ تصنیف ہے۔

سبد چین میں غالب نے وہ قطعے، قصیدے، غزلیں، مثنویاں اور رباعیاں شامل کی ہیں جو ان کے کلیات نظم فارسی میں شامل نہیں ہیں۔ سبد چین ساڑھے چھ سو شعروں کا مجموعہ ہے۔ اس کے بارے میں غالب اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "ہر آئینہ آنچہ پس از انطباع کلیات فارسی گفتہ شد در اوراق جداگانہ ضبط کردہ شد و آن را سبد چین نام نہادہ ام۔" سبد چین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ غالب نے جسیات کو اس میں شامل کیا ہے اور اس میں ایک طویل ترکیب بند ہے جس میں غالب نے اپنی قید کی بامشقت زندگی کو بہت ہی دلدوز اور پر اثر انداز میں پیش کیا ہے اور جس کو وہ اپنا شہکار تصور کرتے ہیں۔ ؎

در خرابی بجہان میکدہ بنیاد نہم — در اسیری بہ سخن دعوئ اعجاز کنم
بی مشقت نبود قید بشعر آویزم — روز کی چند رسن تابئ آواز کنم
بہ صریر قلم خویش بود مستئ من — اندران بندگر ان بین وسبکدستئ من

اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۷ء عیسوی میں نکلا اور نولکشور پریس لکھنؤ نے ۱۹۲۵ء عیسوی میں اور مکتبہ جامعہ دہلی نے اسے ۱۹۳۸ء عیسوی میں شائع کیا۔

کلیات نظم فارسی جس کا نام بقول قاضی عبدالودود میخانۂ آرزو سرانجام تھا ۱۲۵۱ھ ہجری اور ۱۲۵۳ھ ہجری مطابق ۱۸۳۵ء عیسوی اور ۱۸۳۸ء عیسوی کے درمیان مرتب ہو چکا تھا۔

اس میں غالب کے قصائد، قطعات، مثنویات، غزلیات، رباعیات اور مخمسات کے علاوہ ترکیب بند و ترجیع بند شامل ہیں۔ غالب کے ایک عزیز نواب ضیاء الدین احمد خاں نے غدر کے بعد اسے بڑی محنت سے جمع کیا اور ان کے صاحب زادے شہاب الدین احمد خاں نے ۱۸۶۱ء عیسوی میں منشی نولکشور کے پاس بھیجا جنہوں نے ۱۸۶۳ء عیسوی میں شائع کیا اگرچہ اس سے قبل ایک ایڈیشن ۱۸۴۵ء عیسوی میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی زیر نگرانی مطبع دارالسلام دہلی سے چھپا تھا لیکن وہ معہ دیگر قلمی نسخوں کے غدر میں ضائع ہوگیا۔ نولکشور ایڈیشن کی تقریظ غالب نے لکھی اور اس سلسلہ میں سید بدر الدین احمد کو لکھتے ہیں: "منشی نولکشور نے شہاب الدین احمد خاں کو لکھ کر کلیاتِ فارسی جو ضیاء الدین احمد خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا وہ منگالیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جز ہیں یعنی کوئی مصرع اس سے خالی نہیں" بقول غالب کلیات میں دس ہزار چار سو چوبیس اشعار از قسم مثنوی، غزل، رباعی، قصیدہ، ترکیب بند و ترجیع بند کے ہیں۔ غزل کے اشعار چار ہزار سے زائد اور مثنوی کے لگ بھگ دو ہزار، قطعات کے قریب آٹھ سو اور باقی دیگر اصناف نظم کے اشعار ہیں۔

غزلوں کی تعداد تین سو اٹھائیس ہے، قطعے باسٹھ ہیں جو اکثر ہنگامی حالات سے متعلق ہیں۔ ان میں نوحے بھی شامل ہیں۔ مثنویاں گیارہ ہیں جو موضوعات کے اعتبار سے صوفیانہ بیانیہ، اخلاقی، واقعاتی، مذہبی اور مدحیہ ہیں جن میں سرمۂ بینش (بہادر شاہ ظفر کی مدح میں)، چراغ دیر (بنارس کی تعریف میں)، بادِ مخالف (کلکتہ کے ہنگامہ سے متعلق)، تبرکات اور ابر گہربار (جو مسئلہ امتناع نظیر ختم المرسلین اور غزواتِ نبوی کے تذکروں کا منظوم مقدمہ ہیں) بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ باقی دو ایک قصے، تہنیت نامے اور تقریظیں ہیں۔

مثنوی ـــــ ابر گہربار سب سے بڑی مگر نا تمام ہے اور یقیناً ایران کی مثنویوں کے مقابلے میں کسی طرح بھی کم نہیں۔ دعاء الصباح بھی ایک مثنوی ہے جس کو غالب نے اپنے بھانجے کے اصرار پر لکھا تھا دراصل یہ عربی دعاء الصباح کا منظوم ترجمہ ہے جو حضرت علی

سے منسوب ہے۔ اس کو منشی نولکشور نے غالب کی زندگی ہی میں شائع کیا۔ یہ سچ ہے کہ غالب نے اپنے فارسی کلام کو اپنا بہترین سرمایہ تصور کیا ہے جس کو انھوں نے اپنی عمر کی اڑتالیسویں سال میں ترتیب دیا۔

گل رعنا میں غالب کے فارسی اور اردو شعر ہیں جسکو مولوی سراج الدین احمد نے آئینۂ سکندری کی ایما پر ترتیب دیا اور باغ دودر کو سبد چین کی اشاعت کے بعد غالب نے اپنی نگرانی نے مرتب کیا۔ اس میں صرف ایک سو چھیالیس اشعار سبد چین کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ باقی اشعار وہی ہیں جو سبد چین میں موجود ہیں۔ یہ تقریباً ۱۸۷۰ء عیسوی میں غالب کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں نکات و رقعات میں فارسی گرامر کی اردو میں مختصر صراحت ہے اور چند فارسی خطوط ضمیمہ کے طور پر ہیں۔ اردو میں غالب کا دیوان ان کی عظمت کا نشان ہے اور ان کے خطوط کے مجموعے بنام اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے متفرقاتِ غالب کے نام سے ایک مجموعہ ایک نادر قلمی بیاض کی مدد سے تیار کیا ہے۔ اس میں فارسی خطوط ہیں جو غالب نے کلکتہ کے احباب کے نام لکھے ہیں۔ مثنوی بادِ مخالف کے ساتھ ایک اور مثنوی ہے جو غالب نے ۱۸۵۳ء عیسوی میں بہادر شاہ ظفر کی طرف سے تشیُّع سے برأت کے لئے لکھی تھی۔ اس میں کچھ نظمیں بھی ہیں ۱۹۴۷ء میں اسے ہندوستان پریس رامپور نے چھاپا۔

غالب کے معاصرین کے مطابق انھوں نے اپنے کلام کا خود ہی انتخاب کیا تھا۔ کسی کی فہمائش یا فرمائش پر نہیں بلکہ اپنے ذوقِ سلیم کی بنا پر ترتیب دیا۔ غالب نے اپنے متداول دیوان کے دیباچوں اور کئی خطوں میں اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ انھوں نے ہی اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ نسخہ بھوپال اور نسخہ شیروانی کے پیش نظر اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ انتخاب سوائے غالب کے کوئی اور ترتیب دے ہی نہیں سکتا تھا کیوں کہ انتخاب کے بعض اشعار کی اصلاح کی گئی ہے یا انتخاب میں اصلاح بار بار کی گئی ہے۔

درحقیقت غالبؔ کو فارسی سے ذہنی مناسبت تھی اور اس میں ان کا مطالعہ نہ صرف گہرا تھا بلکہ انھیں اس زبان پر غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ سچ مچ غالبؔ کی فارسی شاعری میں قدیم سرمایہ کا نچوڑ ہے اور حال و مستقبل کے لئے دلبستگی کا پورا سامان موجود ہے یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ جب غالبؔ کی فارسی شاعری کے عروج کا دور تھا اس وقت فارسی زبان جو تقریباً آٹھ سو سال تک ہندوستان میں بحیثیت درباری و ثقافتی زبان کے براجمان تھی، تیزی سے تنزل کی طرف مائل تھی اور سبک ہندی، یعنی اردو زبان ترقی کے منازل طے کر رہی تھی۔ غالبؔ کو اس سے مفر نہیں تھا۔ پچیس سال کی عمر تک اردو میں مشقِ سخن کرتے رہے اور اس طرح اردو شاعری کو معراج کمال پر پہنچایا اس کے بعد فارسی کی طرف متوجہ ہوئے اور پچیس برس تک یہ سلسلہ پورے انہماک کے ساتھ جاری رہا مگر ۱۸۵۰ء عیسوی میں قلعۂ دہلی سے تعلق قائم ہوا اور بادشاہ اور بادشاہ زادوں کے اردو کلام پر اصلاح دینے کی خدمت سپرد ہوئی اور چار و ناچار اردو کی طرف بھی توجہ کرنا پڑی۔ غالب کہتے ہیں: "ہر چند از دیرباز بہ گفتن ریختہ نمی گرایم و بہ پارسی زبان سخن می سرایم لیکن چوں رضای خاطر حضرت ظلِ الٰہی در آنست کہ ایں گونہ گفتار بدان حضرت فلک رفعت ارمغان می بردہ باشم۔ ناچار گاہ گاہ ریختہ ہمی گویم۔"

اس میں شک نہیں کہ غالبؔ کی فارسی دانی کا زعم ایک افسانوی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ غالبؔ خود کو بالواسطہ فارسی کے اہل زبان میں شمار کرتے تھے اور یہ واسطہ ملا عبدالصمد کی متنازعہ فیہ شاگردی تھی اگرچہ تحقیق سے ثابت ہے کہ ملا عبدالصمد غالبؔ کا 'زائیدہ طبع' اور 'فرضی' نام ہے جس کا کوئی خارجی وجود نہیں لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے میں عبدالصمد غیر معمولی قابلیت و استعداد کا مالک تھا اور سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی رشتہ کا راز اس پر کھل چکا تھا۔ عربی کا بھی اسے گہرا علم تھا اور دو سال کی صحبت میں غالب کی ذکاوت طبع نے اس قدر حاصل کیا کہ مدت العمر کافی رہا۔

اس سلسلہ میں غالب ایک خط میں لکھتے ہیں: "میری طبیعت کو فارسی زبان سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ ملے۔ بارے مراد بر آئی اور اکابر فارس سے ایک بزرگ اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی معلوم کئے اب مجھ کو اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔ دعویٰ اجتہاد نہیں" غالب نے ہرمزد کو ملا عبدالصمد بتلایا ہے جس سے فارسی زبان کے اسرار و رموز ان پر منکشف ہوئے اور درفش کاویانی میں اس طرح وہ رقمطراز ہیں: "مولانا ہرمزد عبدالصمد ایں راز بامن گفت"۔ اسی کے پیش نظر غالب فرماتے ہیں:

فارسی بین تابدانی کاندریں اقلیم خیال — مانی و ارژنگم و آں نسخۂ ارتنگ من است

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ غالب کی فارسی دانی کے زعم نے ایک طرف کلکتہ کے مناقشہ کو جنم دیا تو دوسری جانب قاطع برہان کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ کلکتہ کے کسی ایک جلسے میں غالب نے ایک فارسی غزل پڑھی اس میں ایک لفظ پر بعض اشخاص نے اعتراض کیا اور اعتراض کے جواب میں مرزا قتیل کا قول بطور سند پیش کیا۔ غالب چونکہ ہندوستان کے فارسی شاعروں میں امیر خسرو اور کسی حد تک شیخ فیضی کو قابل سند تسلیم کرتے ہیں۔ لہٰذا قتیل کی سند کی پرواہ نہ کرتے ہوئے فرمایا:

من کہ طی کردہ ایں مواقف را — چہ شناسم قتیل و واقف را

اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں: "فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھدیا۔ نظامی، سعدی، وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو ہم اسے مانیں۔ ہندیوں کو کیوں مسلم الثبوت جانیں:" جلسہ میں اکثر قتیل کے شاگرد اور ہمنوا تھے اور ایک جوش و خروش پیدا ہوا۔ غالب کی موقع شناسی نے انھیں مصالحت پر آمادہ کیا اور سلامت روی کا طریقہ اختیار کر کے ایک مثنوی باد مخالف کے نام سے لکھی جس میں معرکہ کا سارا ماجرا نظم کیا ہے اور داد سخنوری دی ہے۔ اعتراض کو سند سے دفع کیا اور اپنی طرف سے انکسار متناسب کے ساتھ معذرت کا حق ادا کیا لیکن جب یہ مثنوی حریفوں کی محفل میں پڑھی گئی تو بجائے اس کے کہ ان کے کمال کو تسلیم کرتے یا مہمان سے اپنی زیادتیوں کا عذر پیش کرتے، ان میں سے ایک نے عمداً کہا کہ اس

مثنوی کا نام کیا ہے؟ معلوم ہوا: بادِ مخالف۔ دوسرے نے گلستان کا فقرہ پڑھا: یکی از صلحا را بادِ مخالف در شکم پیچید۔ اور سب نے ہنس دیا۔ علی ہذا جب غالب نے قاطع برہان فارسی میں لکھی جسمیں برہان قاطع مصنفہ محمد حسین دکنی جیسی مشہور فارسی لغت پر انھوں نے حاشئے لکھے اور غلطیاں بتلائیں جب یہ کتاب ۱۸۶۲ء عیسوی میں شائع ہوئی تو مخالفین کا ایک سیلاب امڈ آیا اور ہر طرف سے جواب لکھے گئے ۱۸۶۶ء عیسوی میں نظر ثانی کرکے دوسری مرتبہ شائع کیا اور نام درفشِ کاویانی رکھا۔ اس کی اشاعت سے علمی دنیا میں پھر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ چونکہ غالب کا لب و لہجہ درشت اور اسلوب سخت تھا اس لئے پرانی طرز کے لوگ بہت چراغ پا ہوئے اور غالب کے خلاف کئی رسائل مثال کے طور پر ساطع برہان، قاطع القاطع، محرق قاطع، موید برہان اور شمشیر تیز تر اور مختلف خطوط شائع ہوئے۔ غالب نے بھی ان کے جواب اردو میں لکھے یا لکھوائے جن میں تیغ تیز، لطائف غیبی، دافع ہذیان، نامۂ غالب اور سوالات عبدالکریم قابل ذکر ہیں۔ اس ضمن میں یہ امر قابل غور ہے کہ جب مخالفین نے غالب پر سب و شتم شروع کیا۔ حتیٰ کہ گالی گلوچ سے بھی کام لیا تو غالب نے غیض میں آکر اپنے مخالفین میں پٹیالہ اسکول کے ایک مدرس امین الدین پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر دیا لیکن موقع شناس غالب نے اپنے دائر کردہ مقدمہ کو راضی نامہ داخل کرکے ختم کر دیا لیکن اپنی شکست کو نہیں مانا۔ ایک مرتبہ اور اسی قبیل کا ایک واقعہ پیش آیا اور وہ اختلاف استادِ شاہ شیخ ابراہیم ذوقؔ سے بروئے کار آیا جب کہ شہزادہ جواں بخت کے سہرے کے مقطع میں غالب نے چیلنج کیا ع دیکھیں کہدے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا۔ بہادر شاہ ظفر یہ سمجھ کر کہ میرے استاد پر تعریض ہے ناگواری محسوس کی۔ لیکن غالب کی موقع شناسی نے فوراً گذارش احوال واقعی، لکھ کر معذرت پیش کی جو یقیناً خلوص پر مبنی تھی۔ بادشاہ نے اس کو منظور کیا۔ اس زمانے کے اخبارات نے بھی غالب کی صلح پسندی اور صاف گوئی کو بہت پسند کیا اور سراہا۔

اگرچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ غالب نے مشق سخن پہلے اردو میں شروع کی اور بعد میں فارسی میں شعر کہنے لگے اور چوں کہ مرزا عبد القادر بیدلؔ کی وفات اور مرزا غالب کی مشق سخن میں صرف ایک سو سال کا وقفہ تھا لہٰذا غالب کی شاعری پر بیدل کا اثر انداز ہونا لازمی تھا اور یہ اثر غالب

کے ابتدائی کلام میں نمایاں ہے جس کا انھوں نے اکثر و بیشتر اعتراف کیا ہے۔

اسدؔ ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے — مجھے رنگِ بہار ایجادیٔ بیدلؔ پسند آیا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ — عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدلؔ کا

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا — اسد اللہ خاں قیامت ہے

اسی طرح غالبؔ نے خدائے سخن میر تقی میرؔ کے صاحبِ کمال ہونے پر نہ صرف ایمان لا[illegible] بلکہ ان کے ہر رنگ کو اپنانے کی ہر امکانی کوشش کی ہے۔

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ — جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

اس ضمن میں یہ لکھنا نامناسب نہ ہوگا کہ نواب حسام الدین حیدر خاں نے غالبؔ کے کلام ہی کو اپنے استاد میر تقی میرؔ کو دکھایا۔ میرؔ نے فوراً کہا کہ اگر اس لڑکے کو استاد کامل مل گیا اور اس [illegible] کا راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔

اپنے معاصرین کے معاملے میں غالبؔ بڑے وسیع المشرب تھے اور بیشتر شعرائے فارسی میں ظہوریؔ، صائبؔ، بیدلؔ، حزیںؔ، نظیریؔ اور عرفیؔ کے کلام سے عقیدت تھی اور ان کے محاسن کا اعتراف اور اظہار کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔

جوابِ خواجہ نظیریؔ نوشتہ ام — خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

بہ نظم و نثر ظہوریؔ زندہ ام غالبؔ — رگِ جاں کردہ ام شیرازۂ اوراقِ کتابش را

ذوقِ فکر غالبؔ را بردہ ز انجمن بیروں — با ظہوری و صائب محوِ ہم زبانی ہاست

ہم چناں آں محیطِ بے ساحل — قلزمِ فیض میرزا بیدلؔ

غالبؔ مذاقِ ما نتوان یافتن زما — رو شیوۂ نظیریؔ و طرزِ حزیںؔ شناس

کیفیتِ عرفیؔ طلب از طینتِ غالبؔ — جامِ دگراں بادۂ شیراز ندارد

گفت بہ حکمِ حسرتی غالبِ خستہ ایں غزل — شاد بہ ہیچ می شود طبعِ وفا سرشتِ ما

غالبؔ بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او   ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

حتیٰ کہ وہ فارسی اور اردو کے معاصر شعرا جن سے غالبؔ کی یک گونہ حریفانہ چشمک کا احتمال ہو سکتا ہے اور جن میں سے بعض ان سے نسبت خوردی و شاگردی رکھتے تھے، غالبؔ نے واضح طور پر تحسین ریں کا اظہار کیا ہے جس سے ان کی عالی ظرفی اور قدر شناسی کا قائل ہونا پڑتا ہے ۔

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود   باد در خلوت شان مشکِ فشان از دمِ شان
مومنؔ و نیرؔ و صہبائیؔ و علویؔ آنگاہ   حسرتیؔ، اشرفؔ و آزردہؔ بود اعظم شان
غالبؔ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار   ہست در بزم سخن و ہم نفس و ہم دم شان

افسوس کا مقام ہے کہ غالب کے زمانہ میں ان کے فارسی کلام کو شعرائے فارس نے صحیح مقام نہیں ان کی شاعری کی قدر نہیں کی گو اس سے انکار نہیں کہ امیر خسروؔ دہلوی کے بعد اگر کوئی ہندی نژاد شاعر ایران کے مشاہیر شعرا کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ مرزا غالبؔ ہیں۔ غالب کو بجا طور ایران سے شکایت رہی کہ انھوں نے اپنے اہل زبان ہونے کے زعم میں غالبؔ کے فارسی کلام مت و اہمیت کی قدر نہیں کی اگرچہ انھوں نے اپنے لب و لہجہ کو اہل فارس سے ہم آہنگ کیا ہے ۔

ذوقِ فکر غالبؔ را بردہ ز انجمن بیرون   با ظہوری و صائب محو ہم زبانی ہا ست

انھیں اس بات کا بھی ملال تھا کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور ایران جانے کی خواہش ری دم تک رہی ۔

بود غالبؔ عندلیبی از گلستان عجم   من ز غفلت طوطیٔ ہندوستان نامیدمش

اگرچہ ایران کے مشہور شاعر مرزا صائبؔ تبریزی ہندوستان کی علم دوستی اور فارسی نوازی سے متاثر ہو کر فرماتے تھے ۔

نیست در ایران زمیں سامان تحصیل کمال   تا نیامد سوی ہندوستان حنا رنگیں نشد

لیکن غالبؔ کے نزدیک ہندوستان میں کوئی سخن سنج نہیں تھا کوئی سخن فہم نہیں تھا اور جو تھے میں اتنا بھی شعور نہ تھا کہ وہ پتھر کو گہر سے اور بہتھ نالک کو کرامت سے الگ کر سکتے ۔

غالب سخن از ہند برون بر کہ کس ازیں جا | سنگ از گہر و شعبدہ از اعجاز ندانست

فن شعر میں غالب تقلید کے شدت سے منکر ہیں۔ انھوں نے جا بجا اس امر کا اظہار کیا ہے کہ وہ کسی ہم فن پیشرو کے خوشہ چین نہیں ہیں۔ وہ اپنے تئیں اقلیم سخن میں منفرد تصور کرتے ہیں اور سرقۂ فکر و شعر کے سخت مخالف ہیں۔ وہ فارسی کی تکمیل اور اس میں عبور حاصل کرنے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ طبیعت کی مناسبت کے ساتھ کلامِ اہلِ زبان کا تتبع از حد ضروری و لازمی ہے اور اسی کے پیشِ نظر ایک قصیدہ میں اپنے اس نظریہ کی صراحت کرتے ہیں ؎

ہر چہ در مبداء فیاض بود آن منست | گل جدا نا شدہ از شاخ بداماں منست

جادۂ عرفی در فتار شفائی دارم | دہلی و آگرہ شیراز و صفاہانِ منست

اور یہی وجہ ہے کہ انھیں اپنی شاعرانہ صلاحیت کا از حد احساس ہے ؎

شد آن کہ ہم قدمان را زمن غباری بود | ز رفتگان بگذشتم بہ تیز رفتاری

چہ ننگ اگر بہ سخن ہم فن است چوں بہ سخن | زدودہ ام ز ورق داغ ننگ ہم کاری

رفتہ در حسرتِ نقشِ قدمی عمر بسر | جادۂ راہ کہ بہ سر منزلِ ما می آید

اور کبھی اپنی شاعری کے اعجاز سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ اسے خدا کی دین تصور کرتے ہیں ؎

غالب قلمت پردہ کشای دم عیسیٰ ست | چوں بر روشِ طرزِ خدا دادِ یحنبد

غالب کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ ان کی طبعِ رسا اور قوتِ تخیل نے الفاظ کی تہہ میں معانی کے ذخائر فراہم کئے ہیں تاکہ لوگ ان سے فیضیاب ہوں ؎

در تہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہٗ | تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

مگر جس آشوب پرور اور رستخیز عنوان زمانے میں غالب نے مشقِ سخن شروع کی اس کے پیشِ نظر انھیں اس بات کی توقع نہ تھی کہ ان کے کلام کو قبولیت عام کی سند ملے گی تاہم یہ ان کا ایمان تھا کہ ان کے کلام کی شہرت ان کے بعد ہوگی جیسا کہ وہ فرماتے ہیں ؎

کوکبم در عدم اوج قبولی بودہ است | شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

غالب کی یہ پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی اور اس کا ثبوت ان کا صد سالہ جشن جو ہندوستان اور بیرونی ممالک میں ۱۹۶۹ء عیسوی میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔

یہاں یہ لکھنا نامناسب نہ ہوگا کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جو فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے، غالب کو ظہوری اور عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب اور کلیم سے بمراتب بالا و برتر سمجھتے تھے اور نواب ضیاء الدین احمد خاں ان کی فارسی سے متاثر ہو کر بہ بانگ دہل کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین یعنی امیر خسرو سے ہوئی اور اس کا خاتمہ ایک ترک ایبک یعنی مرزا غالب پر ہوا۔

غالب کی جدت پسند طبیعت سروش غیبی کے مشابہ تھی۔ وہ اپنے لئے نئی راہیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے اور ابتدا میں وہ اپنی خود ساختہ راہوں پر چلے مگر جلد ہی ان کو محسوس ہوا کہ قدیم اساتذۂ فن سے قطع تعلق کر کے وہ منزلِ مقصود سے دور جا پڑیں گے لہٰذا انھوں نے مشاہیر شعرائے فارسی کے کلام کا مطالعہ کیا لیکن کسی کی کورانہ تقلید نہیں کی۔ اگر کسی کی کوئی بات پسند آئی تو اپنی جدت کے کرشمے بھی دکھاتے رہے۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ غالب نے اپنی شاعری کو جلا دینے اور فن شعر کو تقویت دینے کی غرض سے شعرائے فارسی کے کلام کا مطالعہ کیا جس کا اعتراف وہ اس طرح کرتے ہیں:" شیخ علی حزیں بخندۂ زیر لبی بی راہ روی ہای مرا در نظرم جلوہ گر ساخت، و زہر نگاہِ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آن ہرزہ جنبشہای ناروا در پای راہ پیمانِ من بسوخت، ظہوری بسرگرمیٔ گیرائی نفسِ حرزی ببازو و توشۂ بہ کمر بست، و نظیری لاابالی خرام بہ ہنجار خاصہ خودم بچالش آورد، اکنوں بہ یمن فرہ پرورش آموختگی این گروہ کلک رقاص من بخرامش .... تدرواست و برامش موسیقار، بجلوۂ طاؤس است و بہ پرواز عنقا۔"

غالب کی سلیم الطبعی اور صحیح الخیالی نے فنی اعتبار سے اپنے کلام کو ان تمام بھول بھلیاں سے نکال دیا جس میں متاخرین شعرائے عہد مغلیہ کی شعریت گم ہوگئی تھی اور بالفعل انھوں نے وہ رنگ اختیار کیا جو ان کی شخصیت کا پرتو ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ایک طرف بیدل

کا فلسفہ ہے تو دوسری طرف عرفی کی اپج ہے، ایک جانب فیضی کا زورِ بیان ہے تو دوسری جانب کا تغزل ہے۔ بالفاظِ دیگر غالب نے غزل میں نظیری اور ظہوری کی روش اختیار کی اور قصیدہ عرفی اور انوری کا تتبع کیا ہے لیکن غزل میں سب سے زیادہ متاثر نظیری سے ہیں اور قصیدہ میں عر

غالب میں احساس برتری کا مادہ شدت سے پایا جاتا ہے اور وہ اپنے معاصرین کو اپنا حریف تھے اور کسی سے کم نہیں سمجھتے تھے ع نہ کمترم ز حریفان بہ فنِ شعر و سخن، اور یہ گمان کہ ع فیض حق کمینہ شاگردیم، اور اسی بنا پر وہ اپنے قول کو لسان الغیب کا فرمودہ، اور اپنے کلام کو وحی الہی گردانتے تھے ؎

گر ذوقِ سخن بدھر آئین بودی   دیوان مرا شہرتِ پروین بودی
غالب اگر این فنِ سخن دین بودی   آں دین را ایزدی کتاب این بودی

اس ضمن میں غالب کے احساس برتری سے متعلق مولانا عبدالباری آسی نے اپنے ایک مضمون غالب کی شوخیاں میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ غالب خوش فہمی میں مبتلا نظر نہیں آتے ہیں وہ اپنے تئیں دوسروں سے بہتر اور برتر سمجھتے اور اپنی تعریف سن کر خوش ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ غالب کتب فروش کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ایرانی نوجوان نے دوکان دار سے دریافت کیا غالب داری؟ دوکان دار نے کہا: دیوان غالب ندارم، دیوان ظہوری دارم، دیوان نظیری دارم۔ ا نے کہا۔ ایں ہمہ مطلوب نیست۔ دیوان غالب داری؟ آن قرم بساق خوب می گوید۔ دوکان دار کہا: دیوانِ غالب ندارم، غالب دارم۔ جب اس نے سنا کہ غالب دارم اور غالب کو دیکھا تو بہت شر ہوا۔ غالب نے ہنس کر گلے لگایا اور کہا کہ واللہ ساری عمر میں سچی داد آج ملی ہے۔ اگرچہ اس وا حقیقت ایک لطیفہ سے زیادہ نہیں تاہم غالب کے اشعار ان کے اس احساس کے گواہ ناطق وہ خود کو عدیم المثال بلکہ یکتائے زمانہ تصور کرتے تھے ؎

دانی کہ در سخن بہ کہ مانم ز من مپرس   این دعویٰ مجال کجا کرد روزگار
آنم کہ بہر صنیت صفاتِ کمالِ من   ایجاد و حرف و صوت و عدا کرد روزگار
من خود عدیل خویشتم و نبود عدیل من   چون خود مرا بقصہ فنا کرد روزگار

1954ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت وعصمت۔
تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

1955ء اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

1956ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید مع اضافہ و ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

1957ء لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبرؓ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

195 لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

195 حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب سوز کوین۔

19 تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

1961ء تفسیر مظہری اردو جلد اول مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط۔ اسلامی کتب خانے عرب دنیا۔
تاریخ ہند پر نئی روشنی

1962ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔

19ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم تاریخ ردہ ، سرکشی ضلع بجنور ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اول

1964ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

19ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لادینی دور کا تاریخی پس منظر ۔ ایشیا میں آخری نو آبادیات

196ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ۔ رموز عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

196ء ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

196ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ۔ تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

196ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

19ء حیات عبدالحی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت

19ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

19ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

D. (D) 231 Phone 262815 DECEMBER 1974

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں پرنٹر پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا۔